فہرستِ مضامین

نمبر ۲ — بابت ماہِ فروری ۱۹۲۸ء — جلد ۱۳

تصویر: قدیم مشرقی مصوری کا ایک نادر نمونہ

جہاں نما

دنیا کی سب سے بڑی کتاب

انسان کے معمولی قد سے بھی بڑی یہ ایک اٹلس ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طول اور عرض کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ یہ اٹلس اسٹرڈم کے تاجروں کی طرف سے چارلس دوم شاہِ انگلستان کو بطورِ تحفہ دی گئی تھی اور آج کل لنڈن کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ نقشوں پر عبارت لاطینی حروف میں لکھی گئی ہے اور نقشوں کی پیمایش اُس زمانے کے لحاظ سے تعجب انگیز طور پر صحیح ہے۔ یہ تحفہ چارلس کو اُس وقت ملا تھا جب برطانیہ کی شخصی حکومت کو زوال ہُوا اور ندرلینڈز میں اُسے دوستانہ پناہ ملی +

جاپانی رسم الخط کی تبدیلی

جاپانی زبان کے رسم الخط میں ایک مکمل انقلاب کا اندیشہ ظاہر کیا جارہا ہے۔ کیونکہ قدیم طرزِ تحریر تعلیم کے لئے سدِ راہ سمجھا گیا ہے۔ جامعۂ ٹوکیو کے استادِ علم اللغات نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ملکی رسم الخط میں بچے چھ سال کی عمر سے پہلے لکھ پڑھ نہیں سکتے حالانکہ لاطینی حروف کو وہ چار برس کی عمر سے بھی پہلے بڑی آسانی سے پہچاننے لگ جاتے ہیں وزارتِ تعلیم نے ایک مجلس اس امر پر غور کرنے کے لئے قایم کی ہے جو تحقیقات کے بعد جاپانی حروف کی بجائے لاطینی حروف کو قبول کرنے کے متعلق اپنا فیصلہ سنائے گی۔ اگر جاپانی حروفِ ابجد کی خصوصیات اور مشکلات کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ لاطینی حروف کے استعمال سے ترقیِ تعلیم میں ایک انقلاب رونما ہو جائے گا +

بے اندازہ دولت

کچھ دن ہوئے حکومت ترکی نے سٹاک ہالم کے ایک جوہری مسٹر جین جانسن کو دولتِ عثمانیہ کے خزانوں کی قیمت کا تخمینہ کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ مسٹر جانسن کا بیان ہے کہ میں سابق سلطان کے روایتی خزانوں کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ میں نے اس سے پہلے جواہرات کا ایسا نادر و نایاب مجموعہ کبھی نہیں دیکھا۔ نیلم۔ یاقوت، ہیرے اور موتیوں کے انبار کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ بعض ہیرے غیر معمولی طور پر سُرخ اور نیلے رنگ کے ہیں۔ ایک

خنجر ہے جس کا سارا دستہ نیلم کے صرف ایک ٹکڑے سے تراشا گیا ہے ۔

بعض ہوتی حیرت انگیز طور پر بڑے ہیں۔ خصوصاً وہ جو سلطان کی ایک عجیب وغریب قسم کی دستار پر لگے ہوئے ہیں ۔ قیمتی اشیاء کے اس حیرت انگیز مجموعہ میں سب سے بے بہا سونے کی وہ کرسی ہے جسے بیس ہزار موتیوں اور یاقوت ونیلم کے کئی ہزار ٹکڑوں سے مزین کیا گیا ہے۔ دنیائے مشرق کا یہ بے مثال خزانہ جس کے متعلق سینکڑوں افسانے مشہور ہیں قسطنطنیہ کے شاہی حرم میں محفوظ ہے۔ اور اگر کوئی اس کو دیکھنا چاہے تو اُسے متعدد دروازوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جن کی پاسبانی مسلح سپاہی کرتے ہیں ۔ آخری دروازہ کانسی کا بنا ہوا ہے اور اس قدر بوجھل ہے کہ اس کے کھولنے کے لئے تقریباً آٹھ آدمیوں کی طاقت درکار ہے +

ایک قابل ذکر ہندوستانی فلم

ہندوستان کی تہذیب ، تاریخ اور افسانوں کو سینما کے ذریعہ سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے آج تک جتنی کوششیں بروئے کار لائی گئی ہیں اُن سب سے بڑھ چڑھ کر ایک اور کوشش آج کل زیرِ غور ہے جو نہایت درجہ دلچسپ ہے یہ فلم ہندوستان میں تیار کی جائے گی جس کا قصہ ایک ہندوستانی تصنیف ہوگا اور تمام ایکٹر بھی ہندوستانی ہوں گے صرف اُس کے تیار کرنے میں اہتمام ایک انگریز مسٹر بروس ولف کا ہوگا جو نگرانی کے لئے ہندوستان آ رہے ہیں ۔

افسانہ جس کا نام "شیراز" ہے ، مسٹر نرنجن پال کی تصنیف ہے ایکٹروں میں مشہور ہندوستانی ایکٹر مسٹر ہمنسو رائے اور دوسرے وہ تمام ایکٹر ہوں گے جنہوں نے "نورِ ایشیا" کے خوبصورت اور عظیم الشان فلم میں حصہ لیا تھا۔ "شیراز" وہ شخص ہے جس نے باوجود بصارت سے محروم ہونے کے "تاج محل" کا خاکہ تیار کیا۔ دوسری قابلِ ذکر نقلیں شہنشاہ شاہجہان اور اُس کی بیگم ممتاز محل کی ہوں گی ۔

جرمنی کی یو۔ ایف ۔ اے کمپنی اس فلم کو یورپ ، مصر ، فلسطین اور شام میں تقسیم کرے گی اور برٹش انسٹرکشنل فلمز تمام مقبوضاتِ برطانیہ میں پھیلائیگی۔ اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ یہ فلم امریکا کے سوائے ہر جگہ پیش ہو سکے گی +

گھڑیوں کے ڈائل

گھڑیاں بنانے والوں میں مشہور ہے کہ جیسی گھڑیاں آج کل رائج ہیں اس قسم کی پہلی گھڑی ہنری وِکنے

۱۳۷۰ء میں شاہ فرانس چارلس پنجم کے لئے بنائی تھی جس کا لقب دانشمند تھا۔ اور چارلس حقیقت میں بہت سی باتوں میں دانش مند ثابت ہوُا۔ اُس نے انگلستان سے ملک کا وہ بہت سا حصہ واپس لے لیا جسے ایڈورڈ سوم نے فتح کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے فرانس کے لئے اور بھی بہت سے مفید کام کئے۔ گو اُس کی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ نہ کی گئی تھی پھر بھی اُس کی عقل و دانش کی شہرت تھی اور اس شہرت کو قائم رکھنے کے لئے وہ ضروری سمجھتا تھا۔ کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ کتابی علم سے بے بہرہ ہے۔ اس معاملہ میں وہ حساس بھی بہت واقع ہوُا تھا۔

بادشاہ نے ہنری وِک سے کہا "گھڑی وقت تو ٹھیک دیتی ہے۔لیکن" ——— وہ چاہتا تھا کہ اُس میں کوئی نقص بتائے مگر یہ ایک ایسی چیز تھی جس کے متعلق اُسے کوئی واقفیت نہ تھی۔" اس کے ہندسوں میں ایک غلطی ہے"۔

وِک نے پوچھا "حضور کہاں"؟

بادشاہ نے کہا "اس کے چار کے ہندسے کی بجائے چار ایکے ہونے چاہئیں"۔

وِک نے کہا "حضور آپ اس معاملہ میں غلطی پر ہیں"۔

بادشاہ نے کڑک کر کہا "مجھ سے کبھی غلطی نہیں ہوئی اس کو مٹا دو اور صحیح کر کے لکھو!"

بادشاہ کا حکم تھا، غلطی درست کر دی گئی اور اُس دن سے آج تک ۴ کے ہندسے کو بجائے IV کے IIII لکھا جاتا ہے +

امریکا کی فلک بوس عمارات

امریکا میں بعض عمارات اس قدر بلند ہیں کہ انہیں فلک بوس کہنا بے جا نہ ہوگا۔ نیویارک کی مشہور عمارت ایکوی ٹیبل بلڈنگ کی بہتر لیس ہیں۔ اس میں ہر وقت تقریباً بارہ ہزار آدمی رہتے ہیں۔ اور ہر روز کم از کم ایک لاکھ ستائیس ہزار آدمی اس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

۱۹۱۳ء کی خوفناک آتشزدگی کے بعد یہ ۱۹۱۵ء میں دوبارہ تعمیر ہوئی تھی۔ اُس وقت سے لے کر آج تک پھر اس میں کوئی حادثہ رونما نہیں ہوُا۔ اس میں ترلسٹھ لِفٹ لگے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ سے روزانہ بانوے ہزار انسان اوپر چڑھتے اور نیچے اُترتے ہیں اور یہ لِفٹ اس چڑھنے اور اترنے میں ایک سال کے اندر دو لاکھ چھہتر ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔

اس عمارت کی آبادی انگلستان کے قصبہ وارِک کے برابر ہے اور یہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ مکعب فٹ جگہ گھیرے

قدیم ایشیائی مصوری کا ایک نادر نمونہ

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE

ہے ۔اس کے مکینوں کو ہر روز تریسٹھ ہزار خطوط اور پارسل موصول ہوتے ہیں ۔ اور اٹھاسی ہزار پارسل
لوط باہر بھیجے جاتے ہیں۔
اس کی پانچ ہزار کھڑکیاں ہیں اور دس ہزار دروازے ۔ اور بدرجۂ اقل پندرہ ہزار بجلی کی بتیاں اس میں
لگی ہیں +

مسیح الملک حکیم اجمل خان کی وفات حسرت آیات

ماہِ جنوری کا "ہمایوں" طبع ہوچکا تھا جب ہمیں خبر ملی کہ حکیم اجمل خاں اس دارِ فانی سے
عالمِ جاودانی کو سدھار گئے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

اس سدمۂ جانکاہ کا اثر صرف اُن کے اعزہ ہی تک محدود نہیں بلکہ اس میں تمام عالمِ اسلام
اور ہندوستان کی متحدہ قومیت یکساں طور پر شریک ہے ۔ مسیح الملک کی وفات کسی ایک فردِ قوم کی وفات
نہیں ۔ اُن کی شخصیت کے اُٹھ جانے سے ہم نے ایک عظیم الشان طبیب ، ایک زبردست رہنمائے
قوم ، ایک حقیقی محبِ وطن اور ایک بے مثال ادیب کھو دیا ۔

طبِ یونانی جو بظاہر سکرات کے عالم میں تھی مرحوم ہی کی مسیحائی سے ازسرِ نو زندہ ہوئی ۔ طبیہ
کالج دہلی اُن کی مہتمم بالشان خدمات کی روشن ترین مثال ہے جو محض اُن کے عدیم النظیر ایثار پر قائم
تھا اور رہے گا ۔ مسیح الملک کے یونانی دواخانے کا تمام منافع جو ہر سال لاکھوں روپے ہوتا ہے اس
کالج کی بہبود کے لئے وقف ہے ۔

قوم کو اُن کی وفات سے ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے ۔ اور ممکن نہیں کہ اُن کی جدائی کا
داغ کبھی ہمارے دلوں سے مٹ سکے +

عالمِ خیال

کس کے خوابیدہ تخیّل کی تب و تاب ہوں میں
جو نہ شرمندۂ تعبیر ہو وہ خواب ہوں میں

جو لبِ ہستئ مطلق پہ بن آئے نہ رہا
غمِ ہستی کا وہی نالۂ بے تاب ہوں میں

چشمِ عنقا سے جو انجامِ دو عالم پہ گرا
وہی آنسو ہوں وہی گوہرِ نایاب ہوں میں

ذرّہ ذرّہ میں عیاں ہے غمِ پنہاں میرا
سوزِ خورشید ہوں داغِ دلِ مہتاب ہوں میں

کیا کرے جانے یہ آزادگی و خودبینی؟
جس کا بندہ ہوں اب اُس سے بھی عتاب ہوں میں

آہ کس کس نے زمانے میں مٹایا مجھ کو
ہمہ تن شکوۂ بے مہرئ احباب ہوں میں

حامد علی خاں

مبادیٔ سیاسیات

تمہید

سیاسیات کی تعریف اور اُس کا تعلق دیگر ہم جنس علوم کے ساتھ

سیاسیات کی اہمیت۔ آج کل کے زمانہ میں جب تعلیم اور تعلّم کی ہر طرف ترقی نظر آتی ہے اور جب چند در چند اسباب کی بنا پر امیر اور غریب، بڑا اور چھوٹا، عورت اور مرد، سب کے سب معاملاتِ عامہ میں دلچسپی لینے لگے ہیں، جب روز نئے نئے اخبارات اور رسالے نمودار ہوتے ہیں، جب دنیا میں طرح طرح کی لڑائیوں اور جھگڑوں معاشری اور معاشی بین الاقوامی تغیرات اور انقلابات کا ذکر سننے میں آتا ہے، تو سب سے زیادہ جو لفظ ہمارے گوش زد ہوتا ہے وہ لفظ سیاسیات ہے۔ اور جو اصطلاحیں اور نو ساختہ الفاظ ہم سنتے ہیں اُن میں اکثر کوئی نہ کوئی سیاسی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ یوں تو کسی علم یا کسی اصطلاح، مادی شے یا غیر مادی تخیل کی تعریف یا تعارف اس سے بھی ضروری ہے، لیکن جب چند الفاظ ایسے سننے میں آئیں جو زباں زدِ خاص و عام ہوں تو اُن کی تعریف ازبس لازمی ہو جاتی ہے۔ عوام کے تخیل میں جو معنے کسی خاص لفظ کے ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر اصل مفہوم سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب کسی علم یا فن کی ماہیت دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو تجسس کرنے والے کا اول ترین فرض یہ ہے کہ پہلے صحیح مفہوم خود سمجھ لے اور پھر دوسروں پر ظاہر کرے۔

انسان کی اجتماعی حیثیت۔ سیاسیات میں ایک مخصوص عمرانی ادارہ سے بحث کی جاتی ہے جس کو مملکت کہتے ہیں۔ انسان کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک انفرادی حیثیت یعنی وہ حیثیت جو اس کو بطور ایک فردِ واحد کے حاصل ہے اور دوسرے اجتماعی حیثیت یعنی وہ حیثیت جو اُسے بطور رُکنِ معاشرۃ کے حاصل ہے جس طرح انسان اپنی انفرادی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ بھی قطعاً ناممکن ہے کہ وہ ایسی زندگی بسر کرے جس میں دیگر افراد کو دخل نہ ہو علاوہ خاندانی تعلقات کے جو ہر انسان کو اپنے ماں باپ یا اپنے بیوی بچوں سے ہوتے انسانی فطرت اس کی مقتضی ہے کہ وہ دیگر افراد سے بھی گہرے تعلقات پیدا کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب رابنسن کروسو کو پہلی مرتبہ جزیرے میں

ایک ... آیا ہو گا۔ تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ہو گی، گو اُس نے اپنی زندگی کچھ ایسے قالب میں ڈھال لی تھی جس میں وہ انسانوں کی جگہ اپنے طوطے اور بکری ہی سے دل بہلا لیا کرتا تھا، اور گو اُس کو قطعی معلوم نہ تھا کہ جس شخص کے پاؤں کا نشان بنا ہوا ہے وہ کون ہے۔ لیکن وہ محض انسان ہونے کی وجہ سے اس جستجو میں لگ گیا کہ اُس دوسرے انسان کا فوراً پتا لگائے۔ بہرحال ایک شخص کو نہ صرف اپنی ذات کے متعلق فرائض و حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ رکنِ معاشرہ کی حیثیت سے بھی وہ اپنے اقوال و افعال کا ذمہ دار ہے۔

جہاں تک محض انفرادی ذمہ داری کا تعلق ہے۔ یعنی جہاں تک انسان صرف اپنی ذات کی خدمت کرتا ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے۔ آرام کرتا ہے، وہاں تک اُس کا علمِ سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ سیاسیات کا میدان صرف اُس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان کا ذکر بطور رکنِ معاشرہ کے کیا جائے۔

ترتیب و تنظیم۔ معاشرت کے قیام اور استحکام کے واسطے کسی نہ کسی قسم کی تنظیم و ترتیب کی ضرورت ہے۔ اگر تنظیم و ترتیب نہ ہو گی۔ تو انسانی مجموعے میں تو احد کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ تہذیب کے معنے یہی ترتیب کے ہیں اگر نام نہاد معاشرہ میں کسی قسم کی تنظیم نہ ہو گی تو وہ مجموعۂ افراد سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گا۔ اور اُس میں اجتماعی کیفیت مفقود ہو گی۔ اس اجتماعی کیفیت کے واسطے یہ لازم ہے کہ اُس میں ایک شخصیت ایسی ہو (خواہ وہ شخصیت مفرد ہو یا مرکب) جس کے احکام ہر ایک فرد عام طور پر مانے۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جو ماننے سے انکار کرے تو اس کو مجبور بھی کیا جا سکے۔ گویا کہ اس شخصیت کا حکم ہی قانون کا مرتبہ رکھتا ہو۔ اس منظم جماعت کے قیام کا انحصار کلیتہً اس اصول پر ہو گا۔ معاشرۂ سیاسی کی کیفیت ایسے وقت ممکن ہے جب اس میں ایک حاکم شخصیت اور محکوم جماعت ہو اور اس کے واسطے ایک خاص قسم کی تادیب کا ہونا بھی لازمی ہے جس کے بغیر حقیقی سیاسی زندگی کا وجود ناممکن ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ادارہ جس میں ایک شخصیت کو کلیتہً یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنے من مانے احکام صادر کرے، اور کوئی شخص انہیں تسلیم کرنے سے منکر ہو تو اُس کو جو جی چاہے سزا دے، ایسے ادارے میں آزادی کا فقدان ہو گا۔ لیکن ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب تک ہر ایک فرد ہر دوسرے فرد کی خواہشات اور رجحانات و میلانات کا کماحقہٗ خیال نہ رکھے گا اُس وقت تک اُس کی خواہشات، رجحانات اور میلانات کی اسی طرح دیگر افراد بھی پروا نہ رکھیں گے۔ جس کے باعث ملک میں ابتری اور کشاکش پھیل جائے گی۔ دوسروں کی آزادی کا خیال رکھنے کے یہ معنے ہیں کہ ہر ایک فرد ایک خاص حد تک پابند ہو جائے۔ اور منظم پابندی کا نام ہی تادیب ہے۔ اسی لئے تنظیم اور ترتیب اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک پابندی اور تادیب نہ ہو اور جس طرح انسانی آبادی مملکت کے قیام

کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔ اسی طرح یہ عنصر بھی اس کا جزو لاینفک ہے۔ یہ منظم تادیبی کیفیت ہر ایک مملکت میں حکومت کے ذریعہ سے قایم کی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت چند احکام صادر کرتی ہے۔ جس کو قانون کہتے ہیں اور ان احکام کی پیروی بالجبر لوگوں سے کراتی ہے۔

سیاسیات کی تعریف اور اقسام۔ بہرحال اس نسبتاً پیچیدہ ادارہ یعنی مملکت سے جس علم کا تعلق ہے اور جس میں حکم دینے والے اور محکوم کے باہمی تعلقات کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں اگر حکومت ایک مرکب جماعت ہو تو اس کے اجزا کے مابین تعلق اور اگر حاکم ایک فرد واحد ہو تو اُس کے فرائض و حقوق کا بیان کیا جاتا ہے اور جس میں فی نفسہ مملکت کے حقیقی مقاصد اور اُن کے حصول کے طریقوں پر غور کیا جاتا ہے اس علم کو سیاسیات کہتے ہیں۔

اس تعریف کے دو پہلوؤں میں تفریق بالکل عیاں ہے۔ ایک طرف تو سیاسیات میں مجرد مملکت کی ابتدا اس کے خصوصیات، اس کے مقاصد، نیز اصول حکومت و اصول مدافعت پر بحث ہوتی ہے۔ اور دوسری جانب اس امر پر غور کیا جاتا ہے کہ مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں کس قسم کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اُن کے مقاصد کیا تھے۔ اُن مقاصد کے حاصل کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کی گئیں۔ آیا تصوّری یا مثالی مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا یا اُن سے گریز کیا گیا، آج کل مختلف مملکتیں کس طرف جا رہی ہیں۔ اور اُن کا راستہ سیدھا ہے یا اُن میں کسی قسم کی کجی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں تخیلات کے درمیان بہت بڑا بُعد ہے، ایک میں نفس مملکت پر بلا کسی خاص ملک کے حوالہ کے بحث کی جاتی ہے۔ اور دوسرے میں نتائج کا واقعات پر انطباق کیا جاتا ہے۔ ہم ان کو سیاسیات نظریہ اور سیاسیات منطبقہ کہیں گے۔

طرز استدلال۔ اسی سلسلے میں یہ بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات پر غور کرنے اور سیاسی نتائج اخذ کرنے کے متعدد طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ جتنے علوم دنیا میں اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں اُن کی تقسیم دو شقوں میں ممکن ہے۔ اُن میں سے وہ علوم جن سے تجربہ کے بعد نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی وہ جن کا تعلق ہیولات قدرتی و طبعی سے ہے، اُنہیں علوم متعارفہ کہتے ہیں۔ لیکن جس علم کا تعلق انسان کی دماغی کیفیات، عادات و تعلقات سے ہے اُس میں کسی قسم کے ارادی تجربہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا عمل بنایا جائے جس میں ارادتاً انسانی فطری خصوصیات کا آزادانہ تجربہ کر کے انتاج کیا جا سکے۔ جب تجربہ کا دروازہ مسدود ہو گیا تو دو ہی علمی طریقے باقی رہتے ہیں ایک یہ کہ تجسس کرنے والا خود اپنے دماغ پر زور ڈال کر نفس مملکت کے آغاز اس کے ارتقا اور اس کے مقاصد پر غور کرے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دنیا کے گذرے ہوئے اور موجودہ دساتیر کا مقابلہ کر کے ایسے نتائج اخذ کرے جو اس کو سیاسی تحقیقات میں مدد دے سکیں

مفصلہ بالا بیان سے خود بخود اس اعتراض کا جواب مل جائیگا جو بعض مرتبہ سیاسیات پر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ

سیاسیات کو مدون علم کا رتبہ حاصل نہیں۔ اگر مدون علم کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح ریاضی و طبعیات و دیگر ہم جنس علوم میں ہم چند اشیا پر ایک خاص عمل کر کے چند عالمگیر نتائج پر پہنچ جاتے ہیں تو یقیناً سیاسیات کو مدون نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی عادات و اطوار دماغی کیفیات یا فطری خواص، جغرافی اثرات اور تاریخی روایات میں اتنا عظیم الشان تنوع پایا جاتا ہے کہ اِن کے متعلق کسی کلیّہ کا قیام ناممکن ہے۔ جو سیاسی ادارہ ایک قوم کے لئے مفید ہوگا وہ ممکن ہے کہ دوسری قوم کے لئے مضر ہو۔ اور اغلب ہے کہ اتنا مفید نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نہایت ممتاز سیاسیین سیاسی استدلال کے تاریخی یا مقابلتی طریقے کو بے کار سمجھتے ہیں۔ تاریخی طرزِ استدلال تو وہ ہے جس میں ایک ہی ملک یا ایک ہی قوم کی درجہ بدرجہ سیاسی ترقی اور مختلف طرز ہائے حکومت پر جو اس ملک میں قائم ہوئے غور کیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس قوم یا ملک کے سیاسی مقاصد کیا سے کیا ہو گئے اور اِن مقاصد کی کس حد تک تکمیل کی گئی۔ یہ طرزِ استدلال درحقیقت مقابلتی طرز کا ایک شعبہ ہے جس میں ایک ہی ملک کے مختلف زمانوں کے طرز ہائے حکومت اور مختلف ممالک کے موجودہ دساتیر کا مقابلہ کر کے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ کسی خاص ملک یا کسی خاص حصۂ دنیا کی سیاسی روش کیا ہے۔ اور اس کو مدِ نظر رکھ کر آیندہ کی بابت کوئی خیال قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن علما نے اس طرزِ استدلال کی تنقید کی ہے اُن کا قول ہے کہ یہ طریقہ نہایت مغالطہ آمیز ہے۔ مقابلہ ہم جنس اشیا یا ادارات کا کیا جاتا ہے غیر جنس کا نہیں اور جب مکان یا زمان میں اصولی تبدیلی پیدا ہو گئی تو پھر مقابلہ کیسے ممکن ہے۔ اسی بنا پر بعض کا خیال ہے کہ جب تک کوئی مجموعۂ افرادِ تمدن کی ایک مخصوص حد تک نہ پہنچ جائے اُس وقت تک اُس کے افعال دائرۂ سیاسیات میں نہیں آ سکتے اور اُن سے کوئی سیاسی استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ غالبیّت دونوں اصولوں میں موجود ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ زمان یا مکان کا لحاظ کئے بغیر محض مقابلے یا کسی اور طرزِ استدلال کے ذریعہ سے ایسے کلیّے قائم کئے جا سکتے ہیں جو ہر ایک حالت پر جاری ہوں یقیناً وہ غلطی پر ہیں، اسی طرح بنی نوعِ انسان کی ایک خاص مجموعی حیثیت ہے، اور اُس کے ایک حصہ کے سیاسی تجربات سے یقیناً دوسرا حصہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

تاریخ سے تعلق ۔ یہ مبحث ہمیں ایک دوسرے موضوع کی طرف لے جاتا ہے یعنی علمِ سیاسیات کا دیگر ہم جنس علوم کے ساتھ کیا تعلق ہے یوں تو مختلف مصنفوں نے اس مبحث پر بہت کچھ طبع آزمائیاں کی ہیں اور سیاسیات کا تعلق علومِ متعارفہ مثلاً علم ہندسہ۔ ریاضی، کیمیا اور طبعیات تک سے بتایا ہے۔ لیکن اختصار کو مدِّنظر رکھ کر یہاں اس کا تعلق محض ہم جنس علوم سے دکھایا جائے گا۔ مفصلۂ بالا بیان سے سیاسیات کا تعلق علمِ تاریخ کے ساتھ تو معلوم ہو گیا ہوگا۔ ایک بہت بڑے فرانسیسی سیاس کا قول ہے کہ تاریخ انسانی زندگی کا علم ہے اور اسے سیاسی استدلال میں

۵؎ موسیو دے لانڈر M. Deslandres جن کے مقولے کو پروفیسر جے۔ڈبلیو۔گارنر J. W. Garner نے اپنی کتاب "تمہید سیاسیات" باب ۱ میں نقل کیا ہے۔

ین رتبہ حاصل ہے۔ یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ علومِ متعارفہ اور عمرانی علوم اس لحاظ سے مختلف ہیں اُن کے لئے
ن عمل یا تجربہ خانہ تیار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ہم مجبور ہیں کہ بنی نوعِ انسان کے قدیم تجربوں ہی سے فائدہ اٹھائیں، اور
یخ تجربہ خانہ یا عمل کی اس کمی کو پورا کرتی ہے وہ بے حد و بے شمار واقعاتِ انسانی، احساسات، دوستیوں اور
منیوں، جنگ اور صلح، عروج اور زوال، علمی و فنی ترقی کا ایک ناپیدا کنار بحرِ ذخار ہے، اور نہ صرف عالمِ عمرانیات
بلکہ جتنے علوم دنیا میں ہیں سب کے محققوں کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑتی ہے۔ سیاسیات بھی اس قاعدے سے
ستثنیٰ نہیں اور بہت سے سیاسی کلیات ایسے ہیں جو مختلف ممالک کے دستوری تغیر و تبدل اور نظم و نسق کے انقلابات
ے منتج کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ کل تاریخ سیاسیات ہی ہے یا کل سیاسیات تاریخ سے ماخوذ ہیں،
لہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں ایک طرف نظری سیاسیات میں ہمیں تاریخ سے بہت ہی کم مدد ملتی ہے۔ وہاں دوسری جانب
یاسی استدلال کے لئے اکثر تاریخی واقعات بیکار ثابت ہوتے ہیں اور سیاسی محقق کو صرف ان ہی واقعات پر اکتفا
رنا پڑتا ہے جو ترتیبِ حکومت، اور تنظیمِ مملکت کے متعلق ہوں[1]

عاشیات سے تعلق - سیاسیات کا تاریخ سے جس قدر لگاؤ ہے اُس سے شاید کچھ ہی کم سیاسیات اور معاشیات کا
علق ہے۔ جس طرح سیاسیات میں حاکم و محکوم کے باہمی ربط پر بحث کی جاتی ہے اُسی طرح معاشیات کا اُن کے کسب
عاش، کھانے پینے، داد و ستد، لین دین، درآمد و برآمد، لگان اور مال گذاری سے سروکار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں
ہم لازم و ملزوم ہیں۔ یہاں تک کہ معاشیات کے ابتدائی مدارج میں اس علم اور سیاسیات میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی

---

[1] تاریخ اور سیاسیات کا باہمی تعلق مفصلہ ذیل شکل سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا
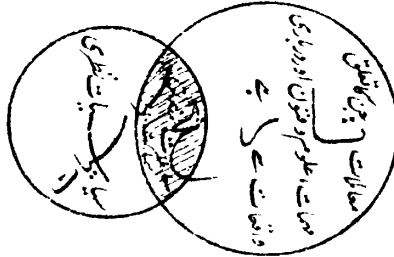
ان دونوں دائروں میں سے ایک سیاسیات کا دائرہ ہے دوسرا تاریخ کا اور یہ دونوں دائرے بجائے اس کے کہ ایک دوسرے پر بالکل منطبق ہو جائیں، ایک دوسرے کو ایسے کاٹتے ہیں کہ ایک دائرے کا ایک حصّہ دوسرے دائرے سے باہر رہ جاتا ہے۔ سایہ دار حصے میں وہ تاریخی امور ہیں جن کا تعلق مملکت کے تعلقات یا اُس کی ترکیب سے ہے، اور یہ حصّہ براہِ راست سیاسیات کے دائرے میں شامل ہے۔ اس کے برعکس سیاسیات کا غیر سایہ دار حصّہ نظری سیاسیات ہیں، اور تاریخ کا غیر سایہ دار حصّہ لڑائیوں درباروں اور دیگر ایسے معاملات سے پڑ ہے جن کا تعلق براہِ راست مملکت سے نہیں۔

اور اسے بھی علم سیاستِ مدن میں شامل کیا جاتا تھا۔ جس طرح یہ امر ناممکن ہے کہ کوئی ملک معاشی اعتبار سے ترقی کر سکے،
تاوقتیکہ اُس کی تنظیم نے ترقی کے ایک خاص درجہ کو عبور نہ کر لیا ہو، بجنسہ اسی طرح جب تک کسی ملک
کی حکومت عاملینِ پیدائش کی کافی نگرانی نہ کرے یعنی جب تک وہ درآمد و برآمد کے قواعد و قوانین مرتب نہ کرے اور
جب تک لگان اور مال گذاری کے حدود مقرر نہ کئے جائیں اُس وقت تک ملک کی ترقی میں رخنہ پڑنے اور اُس کی تنظیم
بے کار ثابت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ آج کل دنیا میں جتنی عالمگیر معاشی تحریکات پھیلی ہوئی ہیں، مثلاً آزاد و مامون تجارت
حکومت کی جانب سے محکومات کی نگرانی، کاشتکاروں اور زمینداروں کے تعلقات، ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق
براہِ راست مملکت سے ہے۔ اور یہی وہی مسائل ہیں جہاں سیاسیات اور معاشیات ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں
الغرض اِن دونوں علوم کا باہمی رشتہ ایسے معاشی مسائل سے ظاہر ہوتا ہے جن کا تعلق براہِ راست تنظیمِ مملکت یا
اختیاراتِ حکومت سے ہو۔

اخلاق و مذہب سے تعلق۔ یوں تو عمرانی علوم کو بہت سی شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کا
کچھ نہ کچھ تعلق سیاسیات سے ہونا ضروری ہے۔ لیکن بنظرِ اختصار اس وقت صرف اخلاق و مذہب سے جو واسطہ
ہے۔ اس کا بیان کافی ہوگا۔ ابتدائی معاشری حالت میں جب انتظامِ مملکت میں اتنی پیچیدگیاں نہ تھیں۔ اور جب
انسان نسبتاً سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت اِن تینوں میں بہت ہی کم فرق سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی
فعل کی سزا میں مجرم کے بھائی بند حقہ پانی بند کر دیتے تھے۔ حکومت کی جانب سے کسی نہ کسی قسم کی جسمانی سزا دی
جاتی تھی، اور اگر مجرم نے کفارہ نہ دیا ہو۔ یا اقرارِ گناہ نہ کیا ہو یا تائب نہ ہُوا ہو۔ تو اُسے مرنے کے بعد طرح طرح کی
روحانی سزاؤں کا خوف دلایا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ معاملاتِ زندگی میں پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ اور انسان کے افعال
کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر لیا گیا۔ اب بجائے اس کے کہ حکمران ہی سرگروہِ معاشرۃ اور مذہبی سردار ہو۔ اس کی حیثیت
محض سیاسی رہ گئی۔ اور زیادہ سے زیادہ وہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی نگرانی کرنے لگا۔ حال کے زمانے میں
سیاسی اثر نے اس قدر ترقی کی ہے۔ کہ نہ صرف سیاسی زندگی کی اصلاح کی غرض سے قوانین نافذ کئے جاتے ہیں
بلکہ مذہب اور اخلاق تک میں سیاسیات نے دخل حاصل کر لیا ہے۔ مثلاً مناکحت و ازدواج کے قوانین جنکا تعلق
کسی زمانے میں محض مذہب کے ساتھ تھا۔ اب رفتہ رفتہ حکومت کے زیرِ اثر آتے جا رہے ہیں۔ اور اخلاقی
قواعد جن کی خلاف ورزی کی سزا صرف اس قدر ممکن ہے کہ معاشرۃ ملوم سے کنارہ کشی اختیار کرے، عرصہ دراز
سے براہ راست سیاسی اثر سے متأثر ہو چکے ہیں۔ مثلاً اکثر ممالک میں شارعِ عام پر برہنہ پھرنا اتنا ہی بڑا جرم

جتنا وہ اخلاقی گناہ سمجھا جاتا ہے۔

سیاسیات کی تعریف اور اس کے تعلقات کے بیان کے بعد اب اس ادارہ یعنی مملکت کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس کے ساتھ علمِ سیاسیات خاص طور پر وابستہ ہے۔

فہرستِ اصطلاحات جو تمہید میں استعمال کی گئی ہیں

اجتماعی ادارہ	Collective Institution	شخصیت	Personality
آزاد و مامون تجارت	Free and protected trade	عاملینِ پیدائش	Agents of Production
اشتراکیت	Socialism	علومِ غیر متعارفہ	Non-exact Sciences
انفرادی	Individual	علومِ متعارفہ	Exact Sciences
تادیب	Discipline	عمرانی	Social
تخیلات	Ideas	معاشرۃ	Society
تصور	Ideal	معاشری	Social
تنظیم	Organization	معاشرۂ سیاسی	Political Society
دستور، دساتیر	Constitution, Constitutions	مرکّب	Composite
حقوق	Rights	مملکت	State
سیاسیات	Politics	معاشیات۔	Economics
سیاسیات منطبقہ	Applied Politics	مقابلتی	Comparitive
سیاسیات نظریہ	Theoretical Politics	فرائض	Duties

(باقی)

ہارون خان شروانی

اور اسے بھی علم سیاستِ مدن میں شامل کیا جاتا تھا۔ جس طرح یہ امر ناممکن ہے کہ کوئی ملک معاشی اعتبار سے ترقی کرسکے، تاوقتیکہ اُس کی تنظیم نے ترقی کے ایک خاص درجہ کو عبور نہ کرلیا ہو، بجنسہٖ اسی طرح جب تک کسی ملک کی حکومت عاملینِ پیدائش کی کافی نگرانی نہ کرے یعنی جب تک وہ درآمد برآمد کے قواعد و قوانین مرتب نہ کرے اور جب تک لگان اور مال گذاری کے حدود مقرر نہ کئے جائیں اُس وقت تک ملک کی ترقی میں رخنہ پڑنے اور اُس کی تنظیم بے کار ثابت ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ آج کل دنیا میں جتنی عالمگیر معاشی تحریکات پھیلی ہوئی ہیں، مثلاً آزاد و مامون تجارت حکومت کی جانب سے محکومات کی نگرانی، کاشتکاروں اور زمینداروں کے تعلقات، ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق براہِ راست مملکت سے ہے۔ اور یہی وہی مسائل ہیں جہاں سیاسیات اور معاشیات ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ الغرض اِن دونوں علوم کا باہمی رشتہ ایسے معاشی مسائل سے ظاہر ہوتا ہے جن کا تعلق براہِ راست تنظیمِ مملکت یا اختیاراتِ حکومت سے ہو۔

اخلاق و مذہب سے تعلق۔ یوں تو عمرانی علوم کو بہت سی شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ تعلق سیاسیات سے ہونا ضروری ہے۔ لیکن بنظرِ اختصار اس وقت صرف اخلاق و مذہب سے جو واسطہ ہے۔ اس کا بیان کافی ہوگا۔ ابتدائی معاشری حالت میں جب انتظامِ مملکت میں اتنی پیچیدگیاں نہ تھیں۔ اور جب انسان نسبتاً سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت اِن تینوں میں بہت ہی کم فرق سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی فعل کی سزا میں مجرم کے بھائی بند حقہ پانی بند کر دیتے تھے۔ حکومت کی جانب سے کسی نہ کسی قسم کی جسمانی سزا دی جاتی تھی، اور اگر مجرم نے کفارہ نہ دیا ہو۔ یا اقرارِ گناہ نہ کیا ہو یا تائب نہ ہوا ہو۔ تو اُسے مرنے کے بعد طرح طرح کی روحانی سزاؤں کا خوف دلایا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ معاملاتِ زندگی میں پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ اور انسان کے افعال کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرلیا گیا۔ اب بجائے اس کے کہ حکمران ہی سرگروہِ معاشرۃ اور مذہبی سردار ہو۔ اس کی حیثیت محض سیاسی رہ گئی۔ اور زیادہ سے زیادہ وہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی نگرانی کرنے لگا۔ حال کے زمانے میں سیاسی اثر نے اس قدر ترقی کی ہے۔ کہ نہ صرف سیاسی زندگی کی اصلاح کی غرض سے قوانین نافذ کئے جاتے ہیں بلکہ مذہب اور اخلاق تک میں سیاسیات نے دخل حاصل کرلیا ہے۔ مثلاً مناکحت و ازدواج کے قوانین جنکا تعلق کسی زمانے میں محض مذہب کے ساتھ تھا۔ اب رفتہ رفتہ حکومت کے زیرِ اثر آتے جا رہے ہیں۔ اور اخلاقی قواعد جن کی خلاف ورزی کی سزا صرف اس قدر ممکن ہے کہ معاشرۃ ملزم سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ عرصہ دراز سے براہ راست سیاسی اثر سے متأثر ہوچکے ہیں۔ مثلاً اکثر ممالک میں شارعِ عام پر برہنہ پھرنا اتنا ہی بڑا جرم

ہے۔ جتنا وہ اخلاقی گناہ سمجھا جاتا ہے۔

سیاسیات کی تعریف اور اس کے تعلقات کے بیان کے بعد اب اس ادارہ یعنی مملکت کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس کے ساتھ علمِ سیاسیات خاص طور پر وابستہ ہے۔

فہرستِ اصطلاحات جو تمہید میں استعمال کی گئی ہیں

اصطلاح	English	اصطلاح	English
اجتماعی ادارہ	Collective Institution	شخصیت	Personality
آزاد و مامون تجارت	Free and protected trade	عاملینِ پیدائش	Agents of Production
اشتراکیت	Socialism	علومِ غیر متعارفہ	Non-exact Sciences
انفرادی	Individual	علومِ متعارفہ	Exact Sciences
تادیب	Discipline	عمرانی	Social
تخیلات	Ideas	معاشرۃ	Society
تصور	Ideal	معاشری	Social
تنظیم	Organization	معاشرۂ سیاسی	Political Society
دستور، دساتیر	Constitution, Constitutions	مرکّب	Composite
حقوق	Rights	مملکت	State
سیاسیات	Politics	معاشیات۔	Economics
سیاسیات منطبقہ	Applied Politics	مقابلتی	Comparitive
سیاسیات نظریہ	Theoretical Politics	فرائض	Duties

(باقی)

ہارون خان شروانی

تجلّیات

بے نیازی نگہِ حُسن کرے یا نہ کرے
عشق ناکام مگر حسن کو رسوا نہ کرے

منزلِ عشق ملے یا نہ ملے، دل لیکن
ترکِ آوارگیٔ وحشتِ تمنّا نہ کرے

طلبِ چشمۂ حیواں میں پھرے دشت بدشت
دل مگر پیرویٔ خضر و مسیحا نہ کرے

بے نیازی سے رہے وقفِ جہنّم، لیکن
جُھک کے توبہ کی ندامت کو گوارا نہ کرے

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اُس ساقیٔ دریا دل کو
میرے ویراں کدۂ دل کو جو میخانہ کرے

مستیاں میکدۂ حُسن کی اللہ اللہ
یہ نشے قلزمِ صہبا کبھی پیدا نہ کرے

دستِ نازک سے مجھے خود ہی سنبھالے ساقی
کام ایسا بھی کبھی لغزشِ مستانہ کرے

سر وہی سر ہے نہ ہو جس میں خمارِ غمِ دوش
دل وہی دل ہے جو اندیشۂ فردا نہ کرے

رازِ ہستی سے ہے کچھ کچھ وہی آگاہ اثرؔ
جو کبھی بھول کے فکرِ غمِ دنیا نہ کرے

اثرؔ صہبائی

تاریخ دنیا پر ایک نظر

مشرق کے قدیمی تمدن

(۱)

تاریخی تمدن کا آغاز

خانہ بدوش ۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ انسان کس طرح قدیمی جنگلوں سے نکلا اور کس طرح اس نے اپنی صیادی کا زمانہ چھوڑ کر دو مختلف سمتوں میں اپنی ترقی شروع کی۔ اِدھر اُس نے جانوروں کو پالتو بنایا، اپنے گرد بیوی بچوں اور غلاموں کا اک گروہ اکٹھا کیا اور گھوڑوں اونٹوں بھیڑوں اور بیلوں کی دولت جمع کر کے اُس نے صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی زندگی شروع کی + اُدھر زراعت کا فن سیکھ کر وہ زرخیز اور محفوظ وادیوں میں بس گیا جہاں اُس نے اپنا گھر بار بنایا۔ اور صنعت وحرفت کی داغ بیل ڈالی +

بودوباش کی اِن دو مختلف طرزوں سے دو مختلف قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ اور اِن کے اختلافات نسلاً بعد نسلٍ بجائے گھٹنے کے بڑھے۔ خانہ آبادوں نے جلد اور مسلسل ترقی کی یہاں تک کہ وہ تمدن کے ایک اعلےٰ درجے پر پہنچ گئے۔ خانہ بدوشوں کی ترقی بہت جلد رُک گئی اور وہ ایک نیم وحشیانہ حالت میں بسرِ اوقات کرنے لگے

خانہ بدوشوں کے علاقے اُس وقت سے لے کر اب تک وہی صحرائے اعظم کے مضافات عربستان کا وسطی خطہ اور خاص طور پر وہ وسیع ایشیائی میدان تھے جو بحیرۂ اخضر سے لے کر مشرق کی طرف کوہستان ختگن تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اِن مقامات میں خانہ بدوش اپنے متعلقین کے ساتھ ایک خیمہ میں رہتا ہے + اُس کی خوراک کا انحصار تقریباً تمام تر اُس کے گلّوں پر ہے اور انہیں کا پالنا اور بڑھانا اس کی زندگی کا کام ہے۔ ان کی خور ونوش کے سامان کی بہم رسانی کے لئے وہ جابجا آوارہ رہتا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی زمین جوتنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نہ وہ

کسی طرح قدرت کا معاون بنتا ہے۔ نتیجتہً وہ ایک خاص مقام میں چند روز ہی گذارہ کرسکتا ہے۔ جہاں اُس کا دانہ پانی ختم ہؤا۔ اُس نے اپنے خیمے اکھاڑے اور چل دیا۔ کہتے ہیں کہ ایشیا میں وہ ایک سال کے دوران میں اکثر دو ہزار میل تک طے کرلیتا ہے۔ گرمیوں میں وہ قطبِ شمالی کے قریب جا پہنچتا ہے اور سردیوں میں منطقۂ حارہ کے قریب + ایسی طرزِ زندگی میں وہ جائداد بہت کم بنا سکتا ہے اُسے امن و امان نصیب نہیں ہوتا وہ کوئی فن و حرفت حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے، نہ سِکھا سکتا ہے + زمانہ گزرے جاتا ہے لیکن وہ بدستور اپنی حالت پر قائم رہتا ہے۔ قوی، چالاک اور سمجھدار لیکن تند مزاج، غارت گر اور نیم وحشی۔ جب کبھی آبادی کے بڑھنے یا دانے چارے کے گھٹ جانے سے وہ اپنے صحراؤں کو چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے تو وہ اور اُس کا دائمی رفیق گھوڑا خانہ آبادوں کے لئے ایک زحمت و مصیبت ثابت ہوتے ہیں +

خانہ آباد۔ انسان نے جوں جوں تمدن کے میدان میں قدم مارا جوں جوں اُس نے قدرت کے ذرائع پر قابو پایا توں توں دنیا کی زمین روز بروز زیادہ آبادی کی پرورش کرنے کے قابل ہوتی گئی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ قدیم زمانۂ حجریہ میں جب انسان سوائے صیادی کے اور کچھ نہ کرسکتا تھا اس وقت ساری دنیا میں صرف پچاس لاکھ آدمی یعنی لندن کی آبادی سے بھی کم آدمی گزارہ کرسکتے تھے۔ جب آدمی چرواہا بنا۔ تو اُسے کسی قدر کم زمین کی ضرورت ہوتی لیکن پھر بھی تھوڑے آدمیوں کے لئے بہت سی زمین درکار تھی۔ موجودہ فرانس کے برابر کے ایک زرخیز خطّے میں صرف ۵۰۰۰ خانہ بدوش رہ سکتے تھے۔ اس کے برعکس مزارعین کے ملکوں میں آبادی بہت بڑھ سکتی تھی اور بڑھی۔ نیل کی شاداب وادی کا مزروعہ رقبہ یارک شائر کے رقبے سے صرف دوچند تھا۔ لیکن اس سے ایک کروڑ آدمیوں کے لئے خوراک بہم پہنچ سکتی تھی۔ اور دجلہ و فرات گنگا و سندھ، ہوانگ ہو اور ینگ سی کیانگ کی وادیوں میں تو بڑی بڑی آبادیوں نے جگہ پائی۔ انسانی تاریخ میں ان مستقل آبادیوں کی اہمیت کا اندازہ لگانا ایک ناممکن امر ہے۔ جب تک انسان فقط جنگلوں میں آوارہ رہا یا شکار کھیلتا رہا یا چرواہا بن کر اپنے خیمے اُٹھائے اُٹھائے پھرا اُس وقت تک وہ طرزِ معاشرت میں کچھ زیادہ ترقی نہ کرسکا۔ اور جب تک عورتیں اپنے بچوں کی گٹھڑیاں اپنی پیٹھ پر لئے لئے پھریں وہ خانگی امور میں زیادہ کمال حاصل نہ کرسکیں لیکن جب مرد اور عورتیں کنبہ بنے اور ان کنبوں کی قومیں بنیں اور یہ لوگ بس گئے انہوں نے گھر بار بنائے ایک مستقل نظام قائم کیا مال و دولت جمع ہوئی پھر فرصت ملی اور انہیں کچھ نہ کچھ چین نصیب ہؤا تو اُس وقت ایک اعلےٰ شائستگی کی طرف نسلِ انسانی نے اپنا قدم بڑھایا +

خانہ بدوشی سے خانہ آبادی آہستہ آہستہ ہوئی۔ بہت سی نسلوں تک آدمی ابھی صید و شکار کرتے رہے اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتی رہیں۔ علاوہ بریں ابتدائی زراعت اس قدر نامکمل تھی کہ زمینیں بہت جلد بیکار ہو جاتیں اور اکثر نئی زمینیں ڈھونڈھنی پڑتیں۔ باوجود اس کے چند مبارک مقامات میں حضریت کی زندگی قائم ہو گئی۔ اور نقلِ مکانی کی عادت جاتی رہی +

ترقی کے پہلے قدم۔ پہلی آبادیاں جو انسان نے قائم کیں، میٹھے پانی کے قرب میں دریاؤں یا جھیلوں کے کناروں پر تھیں۔ انسان کے جسم میں اپنے اُن قدیمی بزرگوں اور پیشرؤں کی جو پانی کے قرب وجوار میں رہنے والے تھے۔ ابھی اتنی نشانیاں موجود ہیں۔ کہ میٹھا پانی اُس کی زیست کے لئے ایک لازمی چیز ہے +

جدید زمانہ حجریہ میں جھیلوں کی بستیاں عام تھیں۔ جن کے بعض نمونے حال ہی میں سوئٹسان، شمالی اطالیہ اور انگلستان میں (بمقام گلیسٹنبری) پائے گئے ہیں۔ گٹھے جھیل کی تہ پر جما دیے جاتے تھے۔ اُن پر ایک چبوترا بنا دیا جاتا تھا۔ اور اس پر جھونپڑے تعمیر کر دیے جاتے تھے۔ جھیلوں کے گاؤں ذرا محفوظ ہوتے تھے۔ مچھلی وہاں بکثرت دستیاب ہوتی تھی۔ اور یہی اِن کی عام خوراک تھی۔ ساتھ کے کنارے پر اِن کے پالتو جانور چرتے تھے جہاں وہ تھوڑی بہت کھیتی باڑی کر لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی صید و شکار سے بھی کچھ حاصل کر لیتے تھے۔ اِن بستیوں کو سب سے بڑا خطرہ آگ کا تھا۔ اور اِن کا جہاں کہیں کوئی نشان ملا ہے۔ اُس سے اُن ہیبت ناک آتشزدگیوں کا پتہ چلتا ہے۔ جنہوں نے عموماً ان آبادیوں کو تہ و بالا کر دیا ہو گا +

لیکن ایسی بستیوں میں زراعت صرف ایک ضمنی کام تھا مچھلیوں کا شکار سب سے بڑا کام تھا۔ اور اس کے ساتھ دودھ کے لئے چند بکریاں اور تن پوشی کے لئے بھیڑوں کا ایک گلّہ ہوتا تھا۔ صرف بعض خاص سرسبز و شاداب وادیوں کے دیہاتوں میں زراعت انسان کا اولیں کام قرار پایا اور صیادی اور ماہی گیری اور راعیت محض زائد کام ہو گئے۔

کامیاب دریائی سکونت کی شرائط یہ تھیں کہ:۔

(۱) آب و ہوا اوسط درجہ گرم ہو۔

(۲) زمین زرخیز ہو۔

(۳) پانی بہتات میں ہو اور باقاعدہ ملے۔

(۴) علاقہ مخالفانہ حملوں سے صحراؤں، سمندروں یا پہاڑوں کی آڑ میں محفوظ ہو۔

(۵) اندرونی آمد و رفت کے رستوں کی سہولت، لیکن

(۶) بیرونی دنیا سے رسم و راہ رکھنے کی قابلیت موجود ہو۔

اُن دس بارہ علاقوں میں جہاں یہ شرائط کم و بیش پوری ہوئیں ۔ ترقی بہت جلد ہوئی۔ اور موجودہ تمدن کی بنیادیں مستحکم طور پر قائم ہوگئیں ۔ کاشتکاری کے لئے آلات ایجاد ہوئے ۔ آبپاشی کے ذریعے نکالے گئے ۔ دھاتوں کو تیار کرنے کے طریقے دریافت ہوئے ۔ اینٹ، پتھر کے مکانات تعمیر ہوئے ۔ کشتیاں اور جہاز بنائے گئے ۔ مساحت اور ہیئت کے علوم کی بنا پڑی ۔ تقویمیں اختراع ہوئیں ۔ فنون و حرفت کا آغاز ہوا ۔ تجارت کا دور دورہ ہوا ۔ کتابت نقاشی، ادب، فلسفہ، دینیات ان سب نے ترقی کی راہ میں قدم رکھا ۔

تمدن کے قدیمی مرکز ۔ اس بات پر بہت بحث کی گئی ہے کہ تمدن کے قدیمی مرکزوں میں سے کس میں یہ ترقی پہلے پہل رونما ہوئی ۔ چینی کہتے ہیں کہ ہمارا تمدن سب سے پرانا ہے ۔ یہ کہہ کر وہ اپنی ایک لاکھ سال کی روایات بیان کرنے لگتے ہیں ۔ چینی تاریخ بیشک پرانی ہے لیکن مستند تاریخ میں چار ہزار سال ق م سے پہلے اس کا نشان نہیں ملتا ۔ بعض ماہران علم الانسان کا خیال ہے ۔ کہ وہ شائستگی جو سپینیوں نے سولھویں صدی عیسوی میں میکسیکو اور پیرو میں ملاحظہ کی، دنیا میں سب سے پرانی تھی ۔ لیکن جدید ترین تحقیق اس نظریہ کو مسترد کرتی ہے ۔ کہ امریکی تہذیب امریکی آبادی کی طرح مقابلتہً جدید تر وقتوں میں ایشیا سے امریکا کو گئی ۔ چند سال ہوئے کہ مصر کا تمدن سب سے قدیم مانا جاتا تھا ۔ اس کی تقویم ۴۰۰۰ ق م کے قریب ہوئی اور اس سے بھی ہزار سال پیشتر مصریوں کی زندگی کم و بیش حضارت کی زندگی تھی ۔ لیکن اب حال کے محققین کا خیال ہے کہ بابل کا تمدن اس سے قدیم اور خوزستان کا تمدن بابل سے بھی زیادہ قدیم تھا ۔ چنانچہ ڈاکٹر ڈی جی ہوگارتھ اور پروفیسر فلنڈرز جیسے مسلم الرائے ماہران اثریات کا بھی خیال ہے کہ جدید ترین آثار کا دیدہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایلم کے تمدن کا زمانہ بارہ ہزار سال ق م کا ہے ۔ حال میں ہڑپا کے برآمدشدہ آثار سے خیال کیا گیا ہے ۔ کہ ہندوستان میں حضرت مسیح سے تین ہزار سال پہلے تمدن کا دور دورہ تھا ۔ لیکن پیشتر اس کے کہ اس امر میں کوئی قطعی رائے قائم کی جاسکے بہت سے اور اکتشافات کی محنتیں درکار ہونگی ۔

آخری اور قطعی جواب کچھ بھی ہو ۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف اور ممیز تمدن اس طرح نشو و نما پاتے رہے ۔ کہ یا وہ کسی ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ رہے یا کسی دوسرے کا تھوڑا بہت اثر اُن پر پڑتا رہا ۔

غالباً یہ صحیح ہے ۔ کہ انسانی نسل ایک ہی ابتدائی خاندان سے بڑھی لیکن ایسا ہے بھی تو اس خاندان کا انتشار قدیم زمانۂ حجریہ ہی میں ہو چکا تھا اور مختلف جغرافی حالات اور مختلف نوع کے ازدواجی تعلقات سے سفید

رسیاہ اور زرد اور سُرخ نسلیں جو ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں، ظہور میں آئیں ۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جدید
مانۂ حجریہ میں مصر اور بابل یا بابل اور ہندوستان کا آپس میں کچھ تعلق نہ تھا۔ اور چین تو باقی مانندہ مہذب دنیا سے بالکل الگ
تھلگ صرف اپنے اُن خانہ بدوش دشمنوں سے جو اُس کے حدود پر ہمیشہ یورشیں کرتے رہتے تھے، برسرِ پیکار رہ کر آپ
ہی اپنے بنائے ہوئے رستے پر گام زن تھا ✦

---

(۲)

چین اور ہندوستان

چین کی ابتدائی تاریخ ۔ کیون لُون کے پہاڑوں سے جو تبت کی سطحِ مرتفع کی شمالی جانب واقع ہیں، دو
بڑے دریا جن کے منبعے قریب ہی قریب ہیں بہتے ہیں ۔ اُن میں سے ایک ہوانگ ہو (یعنی دریائے زرد) تھوڑی دور
چل کر ایک شمالی راستہ اختیار کر کے غاروں کے ایک سلسلے سے گزرتا ہوا زرخیز وادیوں کے ایک وسیع خطے میں جو خاص
چین کے شمالی صوبوں پر مشتمل ہے داخل ہوتا اور شاداب کئے جاتا ہے۔ دوسرا یانگ سی کیانگ کے جنوب کی طرف ہو کر
۲۲۰۰ میل کی مسافت طے کرتا ہوا وسطی میدانوں کو سیراب کرتا ہے ۔ اِن خطوں کو جن کی سرسبزی و زرخیزی اِن برفانی
ندیوں پر منحصر ہے، خوفناک کوہستانی سلسلوں اور دُور دُور تک پھیلے ہوئے اجاڑ بیابانوں نے بیرونی دنیا سے منقطع کر رکھا
ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جس کے متعلق کوئی روایات بھی موجود نہیں، یہ خطے منگولی نسل کے امن پسند خانہ آبادوں
کا مسکن بنے جو یہاں کے بڑے دریاؤں اور اُن کے بہت سے معاونوں کی وادیوں تک جا کر بیشمار خود مختار دیہاتی
جماعتوں میں بس گئے ۔ یہ ابتدائی خانہ آباد جو اپنے صبر و ہمت کے لئے مشہور تھے جلد دولت اور تعداد میں ترقی کر گئے
یہاں تک کہ اُن کی خاموش خوشحالی کو دیکھ دیکھ کر وسطِ ایشیا کے صحرا نوردوں کا جی للچا اُٹھا ۔ سینکڑوں بار ان لٹیروں
نے گوبی کے صحرا سے اپنے تیز رفتار گھوڑوں پر گزر کر ان لوگوں پر چھاپہ مارا، اُن کے گاؤں تباہ و برباد کر دیئے۔
اُن کے ذخیرے لوٹ لئے اور اُن کے بچوں کو غلام بنا کر لے گئے ✦
یہ اور ایسے ہی اور بہت سے خانگی مخمصوں کی وجہ تھی۔ کہ چین میں جاگیرداری کا نظام رائج ہو گیا جس میں
فوجی امرا کی ایک جماعت امن و حفاظت کی ذمہ دار بنی۔ کوئی دو ہزار سال تک (اندازاً ۲۲۰۰ سے ۲۴۶ ق م تک)

یہ جاگیرداری نظام برقرار رہا، بتدریج فوجی سرداروں کی تعداد گھٹتی گئی اور جو بچے اُن کی قوت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ آخرکار مشہور ٹسن شی کے تحت میں جس نے ہوانگ ٹی یعنی شہنشاہ کا لقب اختیار کیا ایک متحدہ سلطنت قائم ہوگئی ٹسن شی نے شروع ہی میں تین لاکھ آدمیوں کی ایک فوج تیار کر کے خانہ بدوشوں کو قرارِ واقعی سزا دی۔ اس کے بعد اُس نے ”دیوارِ اعظم“ بنوائی، جو ۱۸۰۰ میل لمبی تھی۔ اور جس کا مقصد سلطنت کو اِن یورشوں سے بچانا تھا۔ ۲۴۶ ق م سے لے کر ۱۹۱۲ء تک چین کی حکومت شاہانہ طرز کی رہی۔ بہت سے شاہی خاندانوں کے عہد میں جو یکے بعد دیگرے مالکِ تخت و تاج ہوئے، چین کی سلطنت میں امن و امان قائم ہوگیا۔ مانچوریا، منگولیا، ترکستان اور تبت اُس کی طاقت کے سائے میں آگئے۔ ملک دولت اور خوشحالی میں ترقی کرتا گیا۔ اور وہاں ایک ایسے تمدن کا ڈنکا بجنے لگا جو ساتویں صدی عیسوی میں بے شبہ دنیا بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔

چینی تمدن۔ چینی تاریخ اور چینی تمدن اور فن کی ایک نادر خصوصیت اُن کا غیر منقطع تسلسل ہے۔ قدیم ترین زمانوں سے لے کر آج تک وہاں کوئی تباہ کن انقلاب نہیں ہوا۔ وہاں ہمارے سامنے ایک قوم (جو تعداد میں کُل دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے) زمانۂ تجربہ سے لے کر زمانۂ حال تک اپنے ہی بنائے ہوئے رستوں پر چلی اور پھولی پھلی ہے۔ اگر کبھی ایک لمبے عرصے کے لئے کوئی اجنبی خاندان (مثلاً تیرھویں صدی عیسوی کے تاتار یا سترھویں صدی کے مانچو) تختِ سلطنت پر قابض ہوا، تو آخرکار مفتوحین کے انبوہ کثیر نے اُسے کانِ نمک میں نمک بنا دیا۔ اور وہ سب چینیوں کے سے چینی ہوگئے۔ اسی عظیم الشان سلطنت کی محفوظ وسعت کے اندر مشہور و معروف دریافتیں ہوئیں۔ اور بڑی اہم ایجادیں کی گئیں۔ لیکن بالعموم اُن کو اس طرح چھپا چھپا کر رکھا گیا کہ حال ہی میں آکر دنیا کو اُن کا علم اور دنیا کی ترقی پر اُن کا اثر ہوا۔ شروع شروع ہی میں چینیوں نے آبپاشی کا ایک نہایت اعلےٰ نظام بنایا جس میں بہت سی نہریں عمدہ نالیاں اور پل تھے۔ پرانے زمانوں سے انہوں نے ریشم کے کپڑے تیار کئے تھے اور دنیا میں صرف وہی لوگ تھے، جو ریشم بافی کے بھید سے آگاہ تھے۔ چینی کے برتن اور ان کی نفیس جلا انہیں تک مخصوص تھیں۔ چھاپے کا فن چینیوں کے ہاں یورپ والوں سے کم از کم آٹھ صدیاں پہلے رائج تھا۔ بارود جس کا علم اہلِ مغرب کو بہت بعد میں جا کر ہوا۔ اُن کے ہاں جنگ و جدل میں مدت سے استعمال ہوتا تھا، اور یہ امر یقینی ہے کہ مغرب نے یہ باتیں عربوں اور تاتاریوں کے واسطہ سے گویا چینیوں ہی سے سیکھیں۔ ملاحی ”کمپاس“ بھی غالباً اُن کی ایجاد تھی۔ جس کا استعمال صدیوں بعد یورپ نے عرب سیاحوں سے سیکھا۔ ”یہ حال جانتے ہوئے کہ تیرھویں صدی کی عیسائی دنیا پر کمپاس، بارود اور چھاپے کا اثر کیا معنی رکھتا تھا۔ یہ کہنا کچھ بے جا نہیں کہ ”نشأۃ الثانیہ“ کی تحریک کا اصلی منبع جس قدر یونان تھا۔ اُسی قدر چین بھی تھا“۔

لیکن چینی تمدن اُس وقت میں اور اب بھی مذہبی اور علمی حیثیت سے کمزور رہے۔ وہ زیادہ تر مادّی تھا اُسے زیادہ تر جسمانی معاملات سے سروکار تھا۔ بزرگ پرستی نے اُسے بڑی حد تک پُرانی چیزوں کا شیدائی اور نئی چیزوں سے متنفر کر دیا۔ کتابت کا طریقہ بھونڈا اور دقیانوسی تھا جس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ علم کے خزانے بڑی بڑی دشوار فہم کتابوں میں بھرے پڑے رہتے۔ چینی علما عموماً اپنی قدیم کتابوں کی ہمہ گیری کے نام لیوا تھے۔ چین کے مشہور روحانی رہنما کنفوشس (گنگ فوتسی ۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م) کی تعلیمات میں اگرچہ اخلاقی اوصاف مثلاً انسانی حمیت، انصاف پسندی حکم برداری، دیانت داری اور نیک نیتی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن اُن میں حیات و ممات کے دشوار و اہم مسائل پر کچھ روشنی نہیں ڈالی گئی، نہ ایسا طریقہ بتایا گیا ہے جس سے انسان اپنے خدا سے ربط پیدا کر سکے +

ہندوستان اور اُس کے باشندے - اگرچہ صرف ایک ہمالیہ کا سلسلہ ہندوستان کو چین سے جدا کرتا ہے لیکن ہندوستان کے مختلف نسل و نوع کے باشندوں کی تاریخ چین کے زیادہ ہم وضع و ہم معاشرت باشندوں سے بنہایت درجہ مختلف ہے۔ یوں تو ہندوستان کو بھی چین کی طرح ایک بڑے کوہستانی سلسلے نے محفوظ اور بیرونی دنیا سے منقطع کر رکھا ہے۔ لیکن نہ یہ حفاظت اور نہ یہ انقطاع چین کی طرح مکمل ہے۔ مشرق کی طرف برما کے ساحل اور برہما پترا کی وادی سے اندر آنے کے راستے ہیں۔ اور مغرب میں درّۂ خیبر کا بڑا کھلا ہؤا دروازہ موجود ہے۔ جہاں سے کم از کم آٹھ مختلف موقعوں پر حملہ آور فوجیں پنجاب اور وادیٔ گنگا کی طرف پیش قدمی کرتی ہوئی ملک پر قابض ہو گئی ہیں۔ جزیرہ نما کے اوّلیں باشندوں پر پیشتر اس کے کہ وہ یا اُن کا تمدن یہاں مستحکم طور پر قائم ہو سکتا، اجنبی آ پڑے۔ لیکن اِن حملہ آوروں کی بھی جلد باری آئی اور ان پر اور حملہ آوروں نے یورش کی۔ اور اسی طرح صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہانتک کہ ہندوستان میں کم از کم چار مختلف نسلوں، آٹھ مختلف مذاہب اور ایک سَو سے زائد دیسی زبانوں کا دور دورہ ہو گیا +

ہندوستان کے اصلی باشندے "متوسط" نسل کے نمونے کے تھے۔ پست قد اور سیہ فام۔ (ان کے تمدن کا مقام سندھ کی وادی تھی) موجودہ پہاڑی قومیں مثلاً گورکھے اور بھیل گونڈ انہیں کی نسل سے ہیں +

اِن لوگوں پر ۲۰۰۰ ق م سے کچھ مدت پہلے آریائی نسل ترکستان کے صحراؤں سے نکل کر حملہ آور ہوئی۔ اور انہیں مغلوب کر لیا یا مار پیٹ کر بھگا دیا۔ آریائی حملہ آوروں نے پنجاب میں ۲۰۰۰ سے ۱۴۰۰ ق م تک کی چھ صدیوں میں ایک غیر معمولی طبع زاد تمدن کی بنیاد ڈالی۔ جس کی دائمی یادگاریں ویدی ادب اور ہندومت ہیں۔ بعد میں جب اُن کی آبادیاں گنگا کی وادی میں پھیلیں۔ تو وہ تین بڑی ذاتوں یا معاشری گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ جن کی شدید حد بندیاں ابھی تک تمدنی ترقی اور قومی اتحاد کے رستے میں ایک حدِ فاصل بن کر حائل ہیں۔ وہ ذاتیں یہ ہیں:-

(۱) برہمن یا پروہت
(۲) کشتری یا سپاہی۔ اور
(۳) ویش یا دُکاندار اور زمیندار۔

اِن کے نیچے تھے وہ ہند کے اصلی غیر آریائی مفتوح باشندے جو ایک چوتھی شودر یا کمینہ ذات میں شامل تھے اور جن کے ساتھ چوپایوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا +

بعد کی چھ صدیوں میں ۱۴۰۰ سے ۸۰۰ ق م تک جب کہ یہ ذاتیں اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو رہی تھیں۔ یعنی اُس زمانے میں جس کی خصوصیات اُن دو بڑی رزمیہ نظموں مہابھارت اور رامائن میں بوضاحت بیان کی گئی ہیں۔ ہندوستان کی سیاسی طاقت بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی تھی۔ جنوبی ہندوستان پر ۸۰۰ ق م تک جاکر ہندوانہ اثر پڑا۔ اور کہیں ۳۲۱ ق م میں جاکر ایک مرکزی حکومت قائم ہوئی۔ اس سن میں عظیم الشان بادشاہ چندرگپت موریا نے اپنی سلطنت کی بمقام پاٹلی پترا (پٹنہ) بنیاد رکھی +

ہندی تمدّن ۔ یہ موریا سلطنت جس کا بانی چندرگپت تھا۔ تقریباً ڈیڑھ صدی تک (۳۲۱ تا ۱۸۴ ق م) برقرار رہی۔ یہ ایک محض شمالی سلطنت تھی۔ اور دریائے کرشنا سے زیادہ جنوب کی طرف اس کا اقتدار نہ تھا۔ یہ اپنے بانی کے پوتے مشہور و معروف بادشاہ اشوک کے عہد میں (۲۷۲ تا ۲۳۲ ق م) اپنی وسعت اور شان و شوکت کے معراج پر پہنچی۔ اس بادشاہ کی صعوبتیں اور کامرانیاں ہندی تمدّن کے امتیازی خصوصیات کا صحیح نقشہ کھینچتی ہیں۔ یعنی اُن سے اس تمدن کے مذہبی رنگ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس میں وہ زیادہ تر رنگا ہوا ہے۔ اگر اُدھر جفاکش اور سست رو چینی مذہبی خیالات سے عاری نظر آتے ہیں۔ تو اِدہر اپنے تخیلات میں مستغرق رہنے والے جذبات پرست ہندوؤں میں مافوق العادت کا ضرورت سے زیادہ احساس ہے اور وہ ایک گرم خطۂ زمین کی حیات و ممات کی کثرت میں بیخودی کی افراط رہبانیت کی انتہا اور مذہبی جوش کی تندی میں گرفتار لیکن اس کے ساتھ ہی تخیل کی بلند پرواز اور الہامی وجدان کی پاکیزگی کے بہترین نمائندے رہے ہیں۔ رزمیہ زمانہ (۱۴۰۰ تا ۸۰۰ ق م) میں جب کہ وہ گنگا کی وادی کے سکون و عافیت میں آرام و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ تو اُن میں برہمنوں کی مذہبی جماعت نے حیاتِ قومی کے ہر شعبے پر اپنا اقتدار جمالیا۔ سیاست اور معاشرت، قانون اور ادب، تعلیم اور اخلاق، فنون و طبیعیات سب پر برہمنوں کا اثر حاوی ہوگیا۔ اُن کی رہنمائی میں ہندوؤں کی ذکاوت نے دنیا میں نئی نئی چیزیں اختراع کیں اور بڑے بڑے نمایاں کام کر دکھائے۔ ہیئت، مساحت، حساب (مثلاً کسورِ اعشاریہ) تعمیر، سیاسیات، فلسفہ میں انہوں نے وہ کچھ کیا۔ جو

ہمیشہ دنیا کے مستقل علمی خزانے کی زیب وزینت رہے گا *

لیکن مذہب کے دائرے میں ہندومت کا اثر سب سے زیادہ اور سب سے نمایاں طور پر ظاہر ہوا ہے۔ کیونکہ اسی ملکِ ہندوستان میں تقریباً ۵۵۰ سے ۴۷۷ ق م تک (عین اس وقت جب کنفیوشس چینیوں کو اپنے اخلاق کی تعلیم دے رہا تھا) گوتم بدھ نے اپنے وطن والوں کو اور اُن کے ذریعے سے دنیا بھر کو یہ سبق دیا کہ خوشی کا راز نفس کشی میں چھپا ہے۔ زندگی کی راہ نیکی کی راہ ہے۔ قلبی پاکیزگی کے مقابل میں مذہبی رسمیات کی کچھ حقیقت نہیں۔ پروہتوں کی طاقت بودی اور ہیچ ہے۔ اور زیست کا منتہائے کمال جذبات پر پوری طرح غالب آجانا ہے۔ اور یہی نروان یا نجات ہے

مشہور شہنشاہ اشوک بدھ مت کا پیرو ہوگیا اور اُس نے اس کی تعلیمات کی دور دور تک اشاعت کی لیکن اُس کی موت کے جلد بعد یہ زوال پذیر ہوگیا۔ اُس کا بھی ایک مذہبی نظام بن گیا برائیاں اُس میں سرایت کرگئیں برہمنوں نے اسکی مخالفت پر کمر باندھ لی اور اسلامی حملوں کے زمانے میں وہ ہندمیں نیست و نابود ہوگیا۔ لیکن اس سے بہت پہلے وہ سیلون، برما، تبت اور چین تک پھیل چکا تھا اور ان ملکوں میں یہ آج تک قائم ہے اور دنیا کی ساری آبادی کا پانچواں حصہ بدھ کا پرستار اور پیرو ہے *

---

(۳)

ہلالِ شاداب[1]

بابل۔ اگر ہم ہندوستان سے بلوچستان کی دشوار گزار غاروں اور صحراؤں میں سے ہوکر مغرب کی جانب چلتے جائیں تو پانچ سو میل کے دقت طلب اور خطرناک سفر کے بعد ہم ایران کی بڑی سطحِ مرتفع پر پہنچ جائیں گے۔ جو بلند ہوتے ہوتے خلیج فارس کے قریب ۸۰۰۰ فٹ بلند ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد اگر ہم اس سطحِ مرتفع کی بلندیوں پر ہوتے ہوئے شمال مغربی طرف کو خلیج کے اُوپر کی جانب چلتے جائیں۔ تو غروبِ آفتاب کی طرف دور دور ہماری نگاہ اُس مشہور دوآبہ پر پڑیگی جو قدیم بابل کا گہوارہ تھا *

---

[1] "ہلالِ شاداب"۔ اس علاقہ کو کہتے ہیں جس میں بابل۔ اشوریا۔ فینیقیا اور فلسطین شامل تھے۔

یہ خوش قسمت ملک جسے دجلہ و فرات سیراب کرتے ہیں۔ ایک نہایت قدیم اور طبع زاد تمدن کا مسکن تھا۔ جو کئی ہزار سال تک اپنے زوروں پر رہا۔ البتہ اس تمدن کی ترقیوں میں کئی رُکاوٹیں اور آفتیں حائل ہوئیں، جس کا ایک سبب وہ تباہ کن طغیانیاں تھیں۔ جو اُس کے اِن دریاؤں میں وقتاً فوقتاً اُٹھتی تھیں۔ اور دوسرے دونوں ہمسایہ پہاڑی قوموں اور دور کے رہنے والے خانہ بدوشوں کی تاخت و تاراج تھی، جس سے محفوظ رہنے کے لئے یہاں کوئی قدرتی حدود نہ تھیں۔

بابل کے سب سے پہلے باشندے وہ پُراسرار سُومیری تھے۔ جو نہیں معلوم کہاں سے آئے اور پھر کہاں گم ہو گئے۔ بعضوں کا خیال ہے۔ کہ اُن کی اور چینیوں کی نسل ایک ہی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جنوبی ہندوستان کے دراوڑ اور وہ ہم نسل تھے۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ خوزستان کے رستے سے ۴۰۰۰ ق م سے قبل یہاں وارد ہو کر اُنہوں نے شہر آباد کئے جن میں وہ ۲۰۰۰ ق م تک رہے۔ اُنہوں نے آبپاشی کا ایک عمدہ طریقہ ایجاد کیا۔ ایک عجیب قسم کی تحریر نکالی جو مٹی کی تختیوں پر لکھی جاتی تھی اور جسے پچر نما تحریر کہتے ہیں۔ ہیئت میں خاصی ترقی کی۔ ایک تقویم ایجاد کی جو باقاعدہ طور پر مہینوں اور ہفتوں میں منقسم تھی۔ دِن کو آفتابی اور آبی گھڑیوں کے ذریعے سے گھنٹوں اور دقیقوں میں تقسیم کیا اور دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کے بڑے بڑے مندر تعمیر کئے اور وہاں بڑی لمبی چوڑی رسمیات رائج کیں۔

۲۷۵۰ء ق م میں سارگن نے جو فرات کی بالائی وادی میں ایک شامی مملکت کا بادشاہ تھا۔ اُن کو اپنے زیر قلم کیا لیکن باوجود اس تسخیر کے وہ اور اُن کا تمدن بدستور قائم رہے۔ چند سو سال بعد ۲۲۶۳ء ق م میں شام کے اموریوں نے سارے دوآبہ پر اپنا سِکّہ بٹھالیا لیکن اس دفعہ بھی سُومیری تمدن کی فوقیت نے اُسے مِٹ جانے سے بچالیا۔ بلکہ اموری بادشاہ حمورابی (وہ امرافیل شناری جس کا ذکر توریت، کتاب پیدایش ۱۴-۹ میں آیا ہے) کے عہد میں (۲۱۲۳ تا ۲۰۸۰ ق م) جس کا مجموعۂ قوانین چند سال ہوئے، سُوسہ میں ایک منقوش ستون پر پایا گیا اور جس سے اس کی غیر معمولی عدل گستری کا پتہ چلتا ہے، بابل کا تمدن اپنے معراج ترقی پر پہنچ گیا۔ لیکن اس کے بعد کا تیسرا حملہ ایسا تھا۔ کہ اہلِ بابل اُس کی مقاومت کی تاب نہ لا سکے۔ ۱۹۲۵ ق م میں اناطولیہ کے حطّی اُن پر چڑھ آئے۔ اور بعدازاں بحیرۂ اخضر کے کاسیوں نے اُنہیں قطعی طور پر مغلوب کر کے بابل میں ایک شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی، جو برابر چھ سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ کچھ مدت تک اپنی قومیت برقرار رکھنے کی کوششوں کے بعد سومیریوں کا بحیثیت ایک قوم کے نام و نشان باقی نہ رہا۔ لیکن اُن کا تمدن ابھی تک ہمارے قوانین، ہماری ہیئت، ہماری تقویم، ہماری تقسیمِ اوقات، ہمارے وزنوں اور پیمانوں میں اور درجنوں سے شمار کرنے کے طریقے میں مضمر ہے۔ پہیئوں، پیرموں اور چرخیوں کا استعمال پہلے پہل اُنہیں نے کیا اور ممکن ہے کہ گیہوں کی کاشت کی ابتدا بھی اُنہیں نے کی ہو۔

اشوریا ۔ سومیری بابل کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب اُس کا سیاسی اور مذہبی نفاق تھا ۔ ہر ہر شہر کی اپنی حکومت، اپنا مذہبی نظام اور اپنا اپنا خدا تھا ۔ ان سب میں یہ کمزوری تھی کہ وہ اپنے مشترک مُلک کو اپنے متعدد اور خونناک دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے متحد نہ ہو سکتے تھے ۔ اِسی لئے اکادیوں، اموریوں اور کاسیوں نے اُن کے وطن کو یکے بعد دیگرے پامال کیا +

اسی زمانے میں (۳۰۰۰ ق م سے لے کر) دجلہ پر پانچ سو میل شمال کی طرف ایک اور طاقت آہستہ آہستہ نشوونما پا رہی تھی ۔ اُس کے نامساعد حالات نے اس میں عین برعکس اوصاف پیدا کر دیئے تھے یعنی اُس کا تمدن کمتر تھا، لیکن اُس کی سیاسی تنظیم بہت زیادہ زبردست اور اُس کی فوجی قوت بہت زیادہ خوفناک تھی ۔ یہ اشوری جن کا دارالسلطنت اشور تھا، ایک سامی النسل قوم تھے جن کی رگوں میں عربی بدویوں کے ایک تُند خو قبیلے کا خُون گردش کرتا تھا +

اُن کا وطن غیر محفوظ تھا ۔ اردگرد کی پہاڑی قومیں آئے دن اُن پر چھاپے مارتی تھیں ایشیائے کوچک کے حملے بھی کبھی کبھی اُن پر ہاتھ صاف کرتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی ساری زندگی جنگ وجدل کے لئے وقف ہو گئی اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اُن میں ایسی جنگی قابلیت اور خونخواری پیدا ہو گئی کہ ایک ہزار سال (تقریباً ۱۶۰۰ سے ۶۰۰ ق م) تک انہوں نے شمال سے لے کر جنوب تک سارے دوآبے کو اپنی فوجوں کی رزمگاہ بنائے رکھا ۔ اُنہوں نے اپنے تئیں کمانوں اور نیزوں، دیوار شکن اور قلعہ شکن کلوں کے سے آلاتِ حرب سے مسلح کر لیا ۔ انہوں نے فولادی رتھیں بنائیں ۔ اور گھوڑوں کو لڑائی میں لڑنے کا طریقہ سکھایا +

اُنہوں نے شہروں پر حملہ کر کے اُن کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۔ اور باشندوں کو طرح طرح کی شیطانی اذیتوں سے ہلاک کیا ۔ ۱۲۷۵ ق م میں یا اس کے قریب قریب انہوں نے بابل کو فتح کر کے اُسے اپنے علاقے میں شامل کر لیا ۷۴۵ ق م سے لے کر ۶۰۶ ق م تک، اپنے نصف درجن بادشاہوں کے تحت میں جن میں سناحرب (۷۰۵ تا ۶۸۱ ق م) سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ اُن کی سلطنت اپنے بامِ عرُوج پر پہنچی + سناحرب نے اپنا دارالخلافہ نینوا میں بدل دیا جس کی اُس نے دوبارہ ایک بے نظیر طریقے پر تعمیر و قلعہ بندی کی ۔ اُس کی خواہش تھی کہ نینوا کو ایک عالمگیر سلطنت کا مرکز بنائے ۔ لیکن اُن ظلم وستم کا جو اُس نے اور اُس کے جانشینوں نے معصوم باشندوں پر ڈھائے، یہ نتیجہ ہوا ۔ کہ آخر کار اُنہوں نے ایک عام بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا ۔ میدان کے رہنے والے بابلی کوہستان کے میدیوں کے ساتھ مل گئے اور پھر صحراؤں کے سیمیوں کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا ۔ دُور دراز مصر بھی جو مفتوح ہو چکا تھا بغاوت میں شریک ہو گیا + ۶۰۶ ق م میں نینوا کے ظلم آباد شہر پر حملہ آوروں نے دھاوا کیا اور اُس کو قطعی منہدم کر دیا

وہاں کا آخری مطلق العنان بادشاہ اپنے ہی محل کی ہیبت ناک آگ میں جل کر مر گیا +

اگر اشوریوں نے دنیا کے تمدن کے لئے کچھ کیا تو وہ محض جنگ و حکومت کی مشق میں تھا۔ جنگی قابلیت کے لحاظ سے انہیں زمانۂ قدیم کے پرشین کہا جا سکتا تھا + اُن کے وقت تک کسی قوم نے جنگی معاملات میں ایسی نمایاں تنظیم نہ کی تھی۔ نہ اُن سے پہلے کبھی حکومت کے سارے امور کو اس طرح ایک مرکز پر لایا گیا تھا اور نہ مفتوحہ قوموں کا کسی نے یوں خون چُوسا تھا +

فینیقیا۔ اشوریا کے زوال پر اس کی سنگین گرفت سے "ہلالِ شاداب" کی جن قوموں کو آزادی ملی وہ بابلی، یہودی اور فینیقی تھے۔ بابل کا تمدن ایک دفعہ تھوڑی دیر کے لئے کلدانی بادشاہ بخت نصر ثانی اور اُس کے جانشینوں (۶۰۶ تا ۵۳۸ ق م) کے عہد میں پھر چمکا۔ یہودی بھی تقریباً بیس برس (۶۰۶ تا ۵۸۶ ق م) کے لئے آزادی کی ہوا میں پھولے پھلے لیکن وہ جنہوں نے اس آزادی سے سب سے زیادہ اور سب سے دیر تک استفادہ حاصل کیا فینیقی تھے جن کی تجارت کے منافع سے اشوری مدتوں تک فیض یاب ہوتے رہے +

فینیقی جو ایک سامی قوم تھے نہ اشوریوں کی طرح جنگجو تھے، نہ بابلیوں کی طرح مزارعین تھے۔ اُن کا ملک بحرِ متوسط پر ایک تنگ ساحلی خطہ تھا جس کی پیداوار بہت کم تھی۔ اُن کی تعداد تھوڑی تھی اور اسی لئے وہ اپنے زبردست ہمسایوں یعنی جنوب کے مصریوں، مشرق کے اشوریوں اور شمال کے حطیوں کے حملوں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ سمندر اُن کا میدان تھا اور وہ تاجر اور ملاح تھے۔ اُن کے دو بڑے بندر (ٹایر اور سدون) کے جہاز بحیرۂ لیوانت کا زر و دولت ادھر سے اُدھر منتقل کرنے اور سب سے زیادہ اپنے ملک کو اُس سے مالا مال کرتے تھے۔ امن و امان ان لوگوں کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اسی لئے صرف ایک امن و عافیت کے لئے وہ کسی بڑی طاقت کا لوہا ماننے اور اُسے مطلوبہ خراج ادا کرنے پر ہر وقت رضامند تھے +

اپنی تجارت کے دوران میں فینیقیوں نے دور دراز کا سفر کیا اور مختلف ملکوں کے ساحلوں پر انہوں نے اپنی تجارت گاہیں قائم کیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور و اہم کارتھیج (قرطاجنہ) تھا جو افریقہ کے ساحل پر صقلیہ کے جزیرے کے مقابل میں واقع تھا۔ اِن لوگوں نے جہاز سازی کے فن کو ترقی دی، مبادلے کا طریقہ سلجھایا۔ اور اوزان اور پیمایش کے نظام کو زیادہ مکمل بنایا۔ سب سے بڑی بات انہوں نے یہ کی کہ مصریوں کی "تمثالی تحریر" کو جس سے اُنہوں نے اپنے برتنوں پر نشان لگانے کا کام لیا، جلا دے کر وہ حروف تہجی تیار کئے جو فی زمانہ مغربی دنیا میں رائج ہیں +

یہی لوگ تھے۔ جو بحرِ متوسط کے تمدن کو دور دراز نامعلوم خطوں تک لے گئے۔ ادھر ٹین کی تلاش میں وہ کئی سمندر پار برطانیہ تک جا پہنچے۔ اُدھر بحرِ احمر اور خلیجِ فارس کی بندرگاہوں سے وہ نکل کر بحرِ ہند اور بحیرۂ چین میں جہازرانی کرتے رہے۔ بلکہ بعض مورخین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ وہ بحر الکاہل کے دور دور تک پھیلے ہوئے پانیوں سے گزر کر میکسیکو اور پیرو تک جا پہنچے جہاں انہوں نے دنیائے نوآنت کی "شمسی حجری" شائستگی کی روشنی پھیلائی +

فلسطین - جس طرح فینیقیا بحری تجارت کا گھر تھا اُسی طرح اس کے جنوب کی طرف کو فلسطین کی سرزمین ایک مشہور مذہب کا گہوارہ بن گئی۔ عبرانی لوگ جنہوں نے فلسطین کو اپنا وطن بنایا اُسی سامی نسل سے تھے۔ جس سے فینیقی اور اشوری تھے۔ وہ دراصل عرب کے مرغزاروں کے بدوی تھے اور اُن کی قوم کی اوّلین روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے "پدر سری" گھرانے اپنے بکریوں، بھیڑوں کے گلّوں کو ہمراہ لئے چراگاہ بہ چراگاہ پھرتے رہتے تھے + ہر گھر کا باپ اپنے گھرانے کا سردار ہوتا تھا۔ پدرسروں کا زمانہ تقریباً ۲۰۰۰ ق م کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ مشہور بابلی بادشاہ حمورابی کے ہم عصر تھے۔ جس کا زمانہ ۲۱۲۳ تا ۲۰۸۰ ق م کا تھا۔ اس وقت کے بعد کی تاریخ غایت درجہ دُھندلی ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہزار سال بعد حضرتِ ابراہیمؑ کو اپنا جدِّ امجد کہنے والے لوگ حضرت داؤد کی حکومت کے ماتحت (۱۰۱۵ تا ۹۷۵ ق م میں) فلسطین میں آبسے +

اس ہزار سال کے عرصے میں صحرانورد عبرانیوں نے کچھ صدیاں مصر کے نواح میں گزاریں۔ جہاں اُن کی زندگی مستقل اور مہذب رہی۔ جب ایک مخالف فرعون نے اُن کی حالت کو ناقابل برداشت بنا دیا۔ تو وہ مصر سے ہجرت کر گئے اور (شاید ۱۵۰۰ ق م کے قریب) انہوں نے سینا کے صحراؤں اور نخلستانوں میں پھر اپنی بدویانہ زندگی اختیار کر لی۔ دشت و صحرا میں مدتوں تک آوارہ رہنے کے بعد اُنہوں نے فلسطین کی زرخیز و شاداب سرزمین پر (جس میں اُس وقت انہیں کے ہم نسل کنعانی رہتے تھے) حملہ آور ہو کر اُسے اپنے قبضے میں لے لیا + سینا میں اُن کی بود و باش کا سب سے عجیب نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن کا مذہبی شعور عمیق تر ہوتا گیا۔ چنانچہ جب وہ فلسطین میں داخل ہوئے تو انہیں یقین ہو چکا تھا کہ وہ خدا (یہوا) کی بہترین اور منتخب مخلوق ہیں +

کنعان کی فتح کا کام دشوار اور طول طویل تھا۔ اس کے دوران میں عبرانیوں پر بیرونی قوموں مثلاً مبدیوں نے صحرا کی طرف سے اور فلسطینیوں نے سمندر کی جانب سے (ممکن ہے کہ یہ لوگ ۱۲۰۰ ق م کے قریب کریٹ سے یہاں وارد ہوئے) حملہ کیا اور انہوں نے ساحلی خطے پر قبضہ بھی کر لیا + آبادکاری کے اوّلین دور میں عبرانیوں کے ہاں اُن کے قاضیوں کی حکومت تھی لیکن جب یہ لوگ فلسطینیوں سے برسرِ پیکار ہوئے تو اتحاد اور جنگی قابلیت کے حصول کے لئے اُن

میں بادشاہت قائم ہوگئی۔ حضرتِ داؤد کی قیادت میں اُنھوں نے فلسطینی طاقت کو توڑ دیا۔ بلکہ انھوں نے جبوسیوں سے (جو ایک کنعانی قوم تھے اور جو اس سے قبل عبرانیوں کے پے درپے حملوں سے مغلوب نہ ہوئے تھے) یروشلم کا شہر بھی چھین لیا +

اپنے آئندہ بادشاہ حضرتِ سلیمانؑ کے عہد میں (۹۷۵ تا ۹۳۵ ق م) اُن کی خوشحالی اپنے معراج پر پہنچ گئی۔ اُن کی موت پر وہ دو قبیلوں بنی اسرائیل اور بنی یہودا میں منقسم ہوگئے۔ بنی اسرائیل کو تو بہت سے انقلابات کے بعد اشوریوں نے مغلوب کرلیا جو انہیں ۷۲۲ ق م میں قید کرکے لے گئے اور اس طرح یہ لوگ ناپید ہوگئے + یہودا کی سلطنت ۵۸۶ ق م تک قائم رہی۔ اِس کے بعد وہ بھی فتح ہوگئی۔ اس کا فاتح نئی بابلی سلطنت کا بادشاہ بخت نصر ثانی تھا۔ اس کے عناد کی وجہ یہ تھی کہ باوجود تنبیہ آمیز پیشین گویوں کے یروشلم کے حکمرانوں نے مصر کے بادشاہ سے جو بابلی بادشاہ کا دشمن تھا، اتحاد کرلیا۔ یہودا کی بابلی قید تقریباً نصف صدی تک جاری رہی + پھر ۵۳۸ ق م میں وہ بڑے عجیب و غریب واقعات کے ساتھ انجام کو پہنچی + لیکن اس قید کے اثر یہودا کے لوگوں پر نہایت گہرے اور مستقل ہوئے + اُن میں اپنی قومیّت برقرار رکھنے کا جذبہ تو برقرار رہا لیکن اُن کی ریاست مفقود ہوکر فقط ایک کلیسا رہ گیا +

بشیر احمد

دائمی آزادی

اپنے دنیاوی سالوں کی تنگ ندی میں میں اس زندہ تختے (یعنی) اپنے جسم کو چمٹا ہوا ہوں۔ پار ہوکر میں اسے چھوڑ دیتا ہوں! ...... اور پھر؟ میں نہیں جانتا کہ وہاں روشنی اور تاریکی یکساں ہوتی ہیں + غیب دائمی آزادی ہے + وہ اپنی محبت میں بے رحم ہے۔ وہ موتی کے لئے جو تاریکی کے زنداں میں بے زبان پڑا ہوا ہے گھونگھے کو توڑ دیتا ہے!

اے دلِ بیکس! تو سر بہ گریباں ہے اور اُن دنوں کو روتا ہے جو ہمیشہ کے لئے گزر چکے ہیں۔ تو خوش ہو کہ ابھی آنے والے دن بھی ہیں۔

اے مسافر نوبت بج رہی ہے۔ اب وقت ہے کہ تو اپنا رستہ اختیار کرے۔ اُس کا چہرہ دوبارہ بے نقاب ہوگا، اور تیری ملاقات ہوگی!

گلچیں

لمعات

جب کبھی مُسکرا دیا تُو نے
درد کو کر دیا دوا تُو نے

میں اُسی ابتدا کی ہوں تمہید
جس کو لا انتہا کیا تُو نے

میں ہوں ممنون اے جفا پیشہ
دل کو غم آشنا کیا تُو نے

اک مسرّت ہے غم میں بھی حاصل
کر دیا خوگرِ جفا تُو نے

صاف آتی نہیں ہے اب آواز
نزع میں آہ کیا کہا تُو نے

وجہِ تسکینِ دل ہُوا جب درد
درد کو کر دیا دوا تُو نے

بڑھ گیا اور بھی حجابِ نظر
عام جلوہ اگر کیا تُو نے

منکشف کر دیئے حیات کے راز
خوب جب آزما لیا تُو نے

سُن کے مجھ سے مری حکایتِ دل
کیا کیا مُسکرا دیا تُو نے

وجہِ ماتم ہے حاسدوں کے لئے
مجھ کو جادو نوا کیا تُو نے

تیری ہمت پہ آفریں ثاقبؔ
تھا جو دل میں وہ کہہ دیا تُو نے

سیّد (ابو محمد) ثاقبؔ کانپوری

کیا؟

مجھے کچھ کہنا ہے مگر جو کچھ کہنا ہے اُسے اگر بالکل کھلے کھلے لفظوں میں کہدوں تو لوگ اسے اس قدر گول مول تصور کرینگے کہ میرا مطلب فوت ہوجائیگا ۔ لوگ لائق ہیں اور اپنی ذہانت سے معمولی سی معمولی بات کو بھی عقدِ ثریا سے ورے نہیں چھوڑتے مگر مجھے آسمان کے تارے نہیں توڑنے ۔ مجھے تو سیدھی سی بات کہنی ہے وہ بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں اور اردو سمجھنے والوں سے لیکن اسی لئے اس بات کو سات دیباچوں کے بعد پردے ہی پردے میں کہوں گا ۔

(۲)

جسم ۔ " روح ! تو جارہی ہے ؟ سچ مچ ؟ اچھا سدھارو ۔ رستہ ، سنا ہے ایسا ویسا ہی ہے ، دیکھ کر چلنا ۔ جو بات بیت گئی اس کا ذکر فضول ہے مگر تو نے مجھے بہت دُکھ دیئے اور اس پر بھی ہمیشہ تجھے معاف کیا گیا ۔ اب بھی معاف کرتا ہوں ۔ میں تو آرام کرتا ہوں اور یہ جو تم نے آوارہ گردی کی ٹھانی ہے سو تمہاری مرضی ! کیوں میری طرح آرام نہیں کرتی ہو ؟ کہاں ماری ماری پھروگی ؟ کیا کہا کہ سفر لازمی ہے ! تھا '. . . . . . ہوگا ' . . . . ہم تو تھک چکے . . . . . . اچھا ایک آخری بات سن لے ۔ امتحان میں پڑتی ہے غلطی کرتی ہے ۔ میرے ہی امتحان میں تو فیل ہوچکی تو اور کسی کے امتحان کا تجھے کیا یارا ہے ! ۔ کم بخت سو سو دفعہ تجھے رعایتی نمبر ملے کہ تو فیل نہ ہو ۔ کئی دفعہ محض سفارش سے تو اوپر والی جماعت میں بھی چڑھائی گئی مگر جس طرح امیرزادوں کی معمولی تعلیمی ترقی یہی ہوتی ہے ۔ کہ پرائمری فیل ، مڈل فیل ، انٹرنس فیل ، نالائقی پاس اسی طرح تو بھی مذہب فیل ، معاشرت فیل ، سُکھ فیل اور دُکھ پاس رہی ۔ اُف تم نے مجھے کیا کیا نہیں ستایا ؟ جا اب دور ہو ۔ جہاں کی تو لعنت ہے وہیں جا ۔ میں اب چین سے پاؤں پھیلا کر سوؤں گا ۔

روح ۔ کیا تم سب کچھ کہہ چکے ؟

جسم ۔ سب کچھ ۔

روح ۔ آج تک کیوں نہ کہا ؟ کیا مجھ پر رحم کیا ؟

جسم ۔ او بیوقوف ! رحم نہ کرتا تو کیا کرتا ؟ کیا کہتا ؟ مجھ پر تو صرف ہمعصروں کا اور تیرا ظلم تھا مگر تجھ پر مُردے بھی سوار تھے ۔

سقراط نے یہ کہا، ارسطو نے یہ بکا، ڈارون کی لن ترانیاں یوں تھیں - یہ تھا تیرا شغل - جسے اس جنجال میں مبتلا دیکھتا اُس پر رحم نہ کرتا تو کیا کرتا؟ -

روح - لِلّٰہ مجھے معاف کرو - کاش کہ میں رہ سکتی! اگر کچھ اور رہنا ہوتا تو ضرور تلافی کی کوشش کرتی مگر مجھے ان مُردوں نے کہیں کا نہ رکھا - مُردوں کے فریب میں آ کر زندوں کو ستاتی رہی - افسوس!

(۳)

زندگی کا مُنتا یہ ہے کہ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ضروری ایثار کی طاقت نہ رہے - شباب کا مُنتا یہ ہے کہ گناہ کی اُمنگ باقی نہ رہے - نیکی اُس شکست کا نام ہے جو ماحول کے پے در پے حملوں سے فطرتی انسانی جذبات کو روزانہ نصیب ہوتی ہے - وہ جوانا مرگ جذبات جنہیں اس شکست کا اوائلِ عمر ہی میں مزا چکھنا پڑے اندر ہی اندر سانپ کی طرح بِس گھولتے رہتے ہیں -

(۴)

اس دنیا میں پھول اور پھل ایک ہی وقت ایک ہی درخت میں صرف کہیں کہیں ساتھ ہوتے ہیں ورنہ عام طور پر پھول محض آنے والے پھل کی آرزو کا ایک شگفتہ سا اظہار ہیں - اسی طرح بچپن ایک شغل بیکاری ہے - شباب کے کھیل کا ایک بھڑکیلا مگر پھٹ جانے والا اشتہار ہے -

(۵)

پہلے موت، پھر شباب، پھر بچپن! یہ کیا الٹ پھیر ہے؟ کوئی الٹ پھیر نہیں - ایک مرد خدا کو القا ہوا کہ انسان نہیں مرتا - صرف وقت مرجاتا ہے - اس عارف نے اپنی ریاضت کے زور سے وقت کو از سرِ نو زندہ کیا مگر شومیٔ قسمت سے وقت کی گھڑی میں الٹی طرف چابی لگ گئی یعنی بجائے آگے بڑھنے کے وقت پیچھے ہٹنے لگا - جس مرید کو اس حال سے آگاہی ہوئی اس کا ایک ہی نعرہ ہے :-

"میں خدا کی طرف اُلٹے پاؤں جا رہا ہوں!!!"

(۶)

میرا مولوی بھی یہی کہتا ہے کہ تیرہ سَو سال پیچھے ہٹ جاؤ - موجودہ صدی فضول ہے اس سے پہلی لایعنی تھی - اُس سے پہلی کا خیال نہ کرو - جو اُس سے پہلی ہیں اُن کو بھی بُھلا دو اور پورے تیرہ سَو سال اُگل دو - آمنّا و صدّقنا - مگر خدا کی جانب سامنی طرف کا راستہ کیا بند ہے؟ -

(۷)

ایک عیش نصیب حضرت کو یہ رنج ہے۔ کہ ان کا دوست غمگین ہے اور اظہار ہمدردی کو اولی ترین انسانی فرض سمجھ کر یہ حضرت بھی عیش کی حکمرانی چھوڑ چھاڑ آہ و بکا میں مصروف ہیں۔ یعنی ان کا آئینِ وفا یہ ہے کہ دوست خوش نہیں تو ہم بھی خوشی کو لات مارینگے۔ دراصل سارے کا سارا ایشیا ہی اسی نہج پر ہے۔ نمازی کو جب تک دنیا میں ایک بھی بے نماز نظر آتا ہے چین نہیں آسکتا اور لطف یہ ہے کہ جتنی نمازیں لمبی ہوتی ہیں جوں جوں نمازی زیادہ ہوتے ہیں، اُسی قدر یہ بےچینی بڑھتی ہے۔ یعنی ایشیا میں ایک غم یا ایک گناہ بہت سی خوشی بہت سی عبادت کو لے مرتا ہے۔ یہ کیوں نہیں ہوتا کہ تھوڑی سی عبادت بہت سے گناہوں کو لے مرے یعنی اس طرح کہ جس قوم میں ہزار میں سے ایک نمازی ہو وہ قوم اپنے تمام افراد کو ہی نمازی سمجھ لے؟ گناہ کا وارنگی پر اس قدر کاری کیوں ہے اور نیکی کا جادو بدی پر کیوں نہیں چلتا؟ کیوں کوئی غمگین کسی عیش نصیب دوست کا خیال کر کے اپنے آپ سے یوں مخاطب نہیں ہوتا؟ "میرا دوست خوش ہے گویا میں ہی خوش ہوں۔ میرا اولین فرض یہ ہے کہ اپنا غم چھپا کر اُس کی خوشی بڑھاؤں"، اور کیوں خوشی کا شہسوار یوں نہیں کہتا "چونکہ میرا دوست غمزدہ ہے۔ اس لئے مجھے اور بھی زیادہ خوشی کا اظہار کرنا چاہئے تاکہ دوست کا غم زیادہ نہ ہو"، مگر یہ کبھی نہیں ہوگا۔ صدیوں سے "دل کے کرب آہ وزاریاں" والی بلائے بد ایسی بُری طرح اس رسم زدہ برّ اعظم کے گلے پڑی ہے کہ اب چھٹکارا مشکل ہے۔ خود زبان چیخ رہی ہے کہ جن لوگوں میں "ہمدردی" کا لفظ ہے مگر "ہم مسرتی" کسی نے آج تک نہیں بولا اُن میں دردِ عام ہوگا مسرت کا نام نہ ہوگا کیا اس سے صاف ظاہر نہیں کہ ایشیا کی دنیا کو جسمانی خوشی کے رسول کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ایشیا میں روحیں ڈھلتی ڈھلتی اس قدر پتلی پڑ گئیں ہیں کہ اب تقریباً ناکارہ ہیں. بالخصوص اس خیال سے کہ ایشیا کے روحانی دھوبی ابھی تک پرانے طریقے سے روحوں کو عذاب کے پتھر خوف کے تختے پر زور زور سے پٹختے ہیں۔ دھوبی کا کیا جاتا ہے مگر روحیں ہیں کہ چمک اور استری تو کجا جو چرنے پھٹنے سے بچے اسے گائے چبائے جاتی ہے۔ کاش کہ مسلمان اس رسوم کی گائے کو قربان کردیں مگر آمدیم بر سرِ مطلب۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایشیا میں ایسا ہادی پیدا ہو جائے جو پیرس کے باکمالوں کی طرح۔ . . . . [یادش بخیر۔ پہلے پیرس کو آنکھیں بند کر کے دیکھ لوں۔ ایشیا میں خوشی حرام وہاں غم حرام ہے۔ یہاں کسی آنے والی دنیا کی خوشی کا تقاضا ہے کہ گریہ نیم شبی پر زور ہو مگر پیرس کے شبستانوں میں اس جا والی دنیا کی وادیں رقص و سرود و خندۂ فراواں کی دلفریبی ہے۔ ہم اس دنیا کو لات مارتے ہیں وہ اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہیں (دنیا سب جگہ عورت ہے صرف سلوک کا فرق ہے) مگر پیرس کو اس طرح کیوں یاد کیا جائے۔] پرانی سے بدا!

روحانی قمیص کو ہر ہفتے چمکادے گمر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ یارانِ وطن شدھی کی دُھن میں ہیں۔ افغانی شلوار تو خدا خدا کر کے پتلون بن چلی ہے مگر ہندوستانی تہمد کی خیر نہیں - آج دھوتی کل لنگوٹی - [سنتا ہوں کہ مدراس میں کوئی مولانا کسی پنڈت جی کے پاؤں پڑے - اس ہم مسرّتی کے سوانگ سے بھی خدا بچائے]

مجھے کچھ کہنا تھا مگر کہہ نہ سکا - وہ مائیں پیدا نہیں ہوئیں جن کے بچے اسے سن سکیں - دنیا سے میں ناراض نہیں - جیسی بھی ہے اچھی ہے اور بیچاری بہتر ہونے کی کوشش میں سرگرداں ہے - دنیا والوں سے میں ناراض نہیں - جہاں بھی ہیں جھوٹے ہیں اور جو جھوٹا ہے سو اچھا ہے - مگر جب ایشیائی میلا کچیلا جھوٹ یورپ کے زرق برق د - و غ میں تبدیل ہو جائیگا تو پھر دنیا میں آہ و زاری کی آواز کہاں سے آئیگی ؟ - آنسوؤں کے شیدائی پھر کہاں تیس مار خانی کرینگے ؟ اس دنیا کی قسمت میں اگر ایک ابدی تبسّم بننا لکھا ہے - تو کیا رونے والوں نے یونہی اپنی عمریں کھوئیں ؟

کیا ؟ کیا ؟؟ کیا ؟؟؟

فلک پیما

محبت

پیارے مجھ سے تھوڑی محبت کر مگر ہمیشہ کے لئے -

اے محبت ! اے پیاری اور ننھی سی !

محبت محبت کا مفہوم سمجھ لیتی ہے اُسے کسی ترجمانی کی ضرورت نہیں -

---

تمہاری خواہشیں پاکیزہ ہوں اور تمہاری محبت گہری -

جس کسی نے محبت کی پہلی نظر ہیں کی -

گلچیں

تکمیلِ محبّت

(۴)

سجاد ایک تھرڈ ایر کلاس کا طالب علم تھا۔ اُسے علی گڑھ میں آئے تین سال ہونے کو تھے۔ وہ علی گڑھ کی مخصوص خوبیوں سے مزیّن اور وہاں کی متمیز سیاسیات سے خوب آگاہ ہوچکا تھا۔ ایک روز وہ اسٹریچی ہال کے قریب گزر رہا تھا کہ اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سرسیّد کورٹ میں کھڑا سر اُٹھائے ٹکٹکی باندھے ہال کو دیکھ رہا ہے۔ جب وہ پھر آیا تو اُس نے دیکھا کہ اب یہ حضرت جامع مسجد کے آگے ڈٹے کھڑے ہیں اور اُسی طرح بہ غور وخوض اُس کا مطالعہ کر رہے ہیں حیران ہُوا کہ کیا ماجرا ہے یہ کوئی امریکی سیاح ہیں؟ لیکن امریکی تو اتنی دیر میں ساری کی ساری دہلی اور شاید تاج محل بھی دیکھ جائیں یہ سست رو آدمی ضرور کوئی مشرقی خیال پرست ہیں جن کے دماغ کا کوئی نہ کوئی پرزا ڈھیلا ہوگیا ہے۔
اور بلاشبہ وہ ایک "کالے آدمی" تھے اور طرزِ لباس سے ایک معمولی طالبِ علم۔

سجاد نے کہا اِن عجیب الخلقت کا سراغ لگانا چاہیئے کہ ان کا دولت کدہ کون سے نمبر کمرے میں ہے؟ کیا عجب ہے کہ علی گڑھ کی غیر دلچسپ فضا میں ہمارے لئے اِس سے کچھ دلچسپی کا سامان پیدا ہوجائے۔

جمیل جب سے علی گڑھ میں آیا تھا اُس کے در و دیوار کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں کے کھلے وسیع کورٹ، وہاں کے ہال، وہاں کی مسجد، وہاں کے گراؤنڈ اور میدان، لباس کی یکسانیت، ترکی ٹوپیاں، طالب علموں کی یگانگت، آزاد خیالی اور خودداری سے وہ نہایت درجہ متاثر ہُوا۔ اُس کی طبیعت پہلے اسلامی جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسلامی تاریخ میں اُس نے مسلمانوں کے شاندار کارنامے گویا آنکھوں دیکھے تھے۔ امیر علی کی تصنیفات۔ "روحِ اسلام" اور "مختصر تاریخ عرب"، شبلی کی "الفاروق" اور "الغزالی"، عبدالرزاق کی "البرامکہ"، حالی کی "مسدس" اور ایسی ہی چند اور شہرۂ آفاق کتابیں نہ صرف اُس کے مختصر سے کتب خانے میں شامل تھیں بلکہ اُس کے دل و دماغ کی زیب و زینت بنی ہوئی تھیں۔ فاروقِ اعظم کا راتوں کو گشت کرنا، صلاح الدین کا عدالت میں جواب دہی کے لئے آکھڑا ہونا، طارق کا آبنائے جبل الطارق کو عبور کرکے سپین میں جا دھمکنا، قرطبہ و بغداد کی علمی و ادبی مجلسیں، غزالی و رومی، بوعلی سینا و ابن رشد کی مذہب آرائیاں اور فلسفہ پیمائیاں، عرب کے صحرا، الحمراء و القصر کے محلات، ازہر و ایاصوفیہ کی مساجد جو اس کے نفس میں جاگزیں ہوچکی تھیں سب علی گڑھ کے نظارے سے گویا ایک آن کی آن میں اس نوجوان خیال پرست مسلمان کی نظروں میں پھر گئیں +

کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عارضی طور پر اپنی سب قلبی کلفتیں بھول گیا ہے۔ اُسے ایک نئی دنیا مل گئی ہے جس میں وہ محوِ تماشا ہے۔

چند روز کے بعد جمیل کے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی اور ایک وضعدار معتبر صورت طالب علم اندر داخل ہؤا۔ جمیل استقبال کو اُٹھا۔

طالب علم۔ السلام علیکم۔ کہو بھئی اچھے ہو؛ کب علی گڑھ آنا ہؤا ؟

جمیل۔ (تعظیم و تکریم کے لہجے میں) جناب میں ایک ہفتہ ہؤا حاضر ہؤا ہوں۔ میں آپ کا بےحد ممنون ہوں کہ مجھ ناواقف اجنبی پر آپ نے یوں عنایت فرمائی۔

طالب علم۔ ناواقف! ہاں ناواقف تو آپ معلوم ہو ہی رہے ہیں ورنہ علی گڑھ میں یوں ادب سے گفتگو کرکے اپنی مٹی پلید نہ کریں اور "اجنبی پنے" میں تو آپ کنجوس سیاحوں یا کسی عالمِ اثریات کے ہم پایہ ہیں۔ بھائی تمہاری نظر بازی ہی مجھے یہاں کھینچ کر لے آئی ہے کہ مجھے بھی وہ کچھ دکھا دو جو تم نے جمعہ جمعہ آٹھ روز میں یہاں دیکھ پایا ہے۔ اور جو میں تین سال سے تلاش کر رہا ہوں مگر کہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور باقی کیا علی گڑھ کا ایک طالب علم اور کیا اُس کی عنایت فرمائی کا شکریہ؛ عنایت تو تم نے فاضلِ اجل و ناظرِ اکمل کی ہے کہ مجھ سے سہ سالہ طالب علم کو اپنی بزرگانہ صحبت سے مستفید ہونے کا موقع دیا ہے۔

جمیل۔ آپ کا اسمِ مبارک؛

طالب علم۔ اسمِ فاعل اسمِ حالیہ اسمِ تفضیل وغیرہ سے تو شاید کسی کو یہاں کے اسکول میں تھوڑی بہت آگاہی ہو بھی مگر واللہ اسمِ مبارک علی گڑھ کی کسی قواعد میں تمہیں نظر نہ آئے گا۔ مجھے سجاد کہتے ہیں۔ اور تمہارا وہی اسمِ مبارک ؟

جمیل۔ (شرماکر) جمیل۔

سجاد۔ اچھا تو جمیل آؤ میں تمہارے دماغ سے پُرانے زمانے کی بوسیدہ تاریخ کے اوراق نکال کر وہاں کچھ جدید معلومات کا اضافہ کروں۔ بھائی! یہ اسٹریچی ہال یہ بارکیں یہ مسجد بھی سب محض گارے اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ہال میں جلسے ہوتے ہیں جہاں بڑے بڑے آدمی نئی اور پرانی وضع کے چست لباس پہن کر ایک دوسرے کو دھوکا دینے آتے ہیں۔ بارکوں میں آوارہ گردی ہؤا کرتی ہے اور مسجد غریب طالب علموں سے جرمانے کی زکوٰۃ وصول کرنے کی تاوان گاہ ہے اور بس باقی یہاں مجھ سے نوجوان ہیں اور کچھ اُن کی خوشامد کرنے والے پروفیسر اور پرنسپل۔

جمیل۔ لیکن بھائی سچ بتاؤ کہ یہاں کا انتظام تو نہایت اہتمام و توجہ سے ہوتا ہوگا۔ ایک مکمل دارالعلوم کا چلانا کوئی

معمولی بات نہیں۔

سجاد - انتظام یہاں ہر ایک کا کیا جاتا ہے بڑی توجہ سے تکمیل یہاں ہر شے کی ہوتی ہے یہاں تک کہ سیاست کی بساط بھی بچھی رہتی ہے۔ اور یہ نرا دارالعلوم نہیں یہاں فنون ولطائف و مزخرفات کی ساخت پرداخت بھی ہوتی ہے۔

جمیل لیکن آخر یہاں کے ارباب حل وعقد بڑے باتدبیر ہوں گے۔

سجاد باتدبیر؛ باتقدیر کہو تو بات بھی ہے۔ اور بھائی یہاں کے ربّ حل وعقد کے آگے تو ربِّ ارض وسما کی دال بھی نہیں گلتی۔ لیکن خیر تم ابھی بچے ہو۔ تم کیا سمجھو علی گڑھ کی ان سیاسیات کو۔ بس چھوڑو یہ قصہ اور سمجھ لو کہ علی گڑھ لاہور سے کسی صورت بہتر نہیں اور بدتر نہ ہو تو غنیمت ہے۔ ہاں تم سے ہزار ڈیڑھ ہزار مسلمان نوجوان یہاں وارد ہوں تو شاید اس فضا میں کچھ تبدیلی واقع ہو جائے۔ لیکن خیر آؤ ہم تم کوئی کام کی بات کریں۔

یہ باتیں ہو کر دونوں دوست باہر چلے گئے اور پھر یہی معمول ہو گیا کہ سجاد اور جمیل عموماً اکٹھے رہتے۔ سجاد کی صحبت جمیل کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ یہ ضرور ہوا کہ علی گڑھ کے متعلق جو منصوبے اُس نے باندھے تھے وہ سب خاک میں مل گئے اور اس سے چند دنوں کے لئے وہ ملول و مایوس سا ہو گیا کہ میں جس بت کو اپنی پرستش کے لئے کھڑا کرتا ہوں فوراً کوئی بت شکن آ دھمکتا ہے۔ لیکن سجاد کے اثر سے وہ کبھی کبھی اپنے خیالات کے خول کے اندر سے زبردستی باہر کو کھینچ لیا جاتا جس سے نہ صرف اُس کے خیالات کو وسعت ہوئی بلکہ دل لگی کا ایک اچھا خاصہ سامان پیدا ہو گیا۔

پھر بھی ثروت کا خیال بھلائے نہ بھولتا تھا۔

ایک روز علی الصباح سجاد جمیل کے کمرے میں آیا۔ جمیل سو رہا تھا۔ سجاد نے عمداً اُسے نہ جگایا اور اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو میز پر دیوانِ حافظ پڑا تھا۔ کھولا تو اُس صفحہ کے اندر سے ایک کاغذ نکلا جس پر یہ غزل تھی کہ

ترسم کہ اشک در غمِ ما پردہ در شود   ویں رازِ سر بہ مُہر بہ عالم سمر شود
گویند سنگ لعل شود در مقامِ صبر   آرے شود ولیک بہ خونِ جگر شود

کاغذ کے پرزے پر یہ عبارت لکھی تھی :-

آہ ث . . . میری تیرے لئے محبت بے غرض ہو اور پاک وصاف!
آہ ث . . . میری تیرے لئے محبت پُرخلوص ہو اور نرم و خاموش!

میں تجھ سے محبت کروں اور کرتا رہوں
میں تیری پرستش کروں اور کرتا رہوں

آہ ث . . . میری تیرے لئے محبت کامل ہو اور پائدار !
آہ ث . . . میری تیرے لئے محبت صادق ہو اور خوددار !
تیرے پیار میں میرا دل تجھ پر نثار ہو !
تیرے خیال میں میرا ہر خیال تجھ سے سرشار ہو !
آہ اے میری پہلی دلبر ! اے تُو حسن کی شمع !
اے تو محبت کی دیوی ! اے تُو صداقت کی پتلی !
آہ ث . . . کیا اب میرا تیرا رستہ جدا جدا کیا اب میرا تیرا نصیبہ
الگ الگ ہے ؟
اگر ہے تو
پھر بھی ث . . . خدا کرے میں تجھ سے محبت کروں اور کرتا رہوں
پھر بھی ث . . . خدا کرے میں تیری پرستش کروں اور کرتا رہوں
اور
میری تیرے لئے محبت بے غرض ہو اور پاک و صاف
اور تیری میرے لئے اُلفت بیدار ہو اور نرم و خاموش !

چپکے سے یہ پُرزا جیب میں ڈال کر سجاد چلتا بنا۔ گھنٹے بھر کے بعد پھر آیا تو دیکھا کہ جمیل نے کمرے کا سب سامان تہ و بالا کر رکھا ہے اور کچھ تلاش کر رہا ہے۔

سجاد کوئی نوٹ گم ہو گئے یا کوئی پالتو بلی کہیں چھپ گئی ؟

جمیل (پریشان ہوکر) نہیں ایسے ہی والد کا ایک خط تھا جو ڈھونڈ رہا ہوں۔

سجاد جی وہ تمہارے والد کا خط تو میں نے تمہارے والد بزرگوار ہی کی خدمت میں واپس بھیج دیا ہے۔

جمیل (کھسیانا ہوکر) ہیں بھائی سجاد ! یہ کیا ! بھئی سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں قسم ہے۔ وہ تو ایسے ہی کچھ خیالات تھے خط نہ تھا

سجاد وہ میں اُسے پہنچا دوں گا جس کے لئے لکھا تھا۔ لیکن یار تم تو بڑے مکار و عیار نکلے۔ بالکل غیر مسلم۔ ہاں خیالات ہی تھے۔ شاید علی گڑھ میگزین کے لئے کچھ لکھا تھا ؛ ایڈیٹر تمہاری تین نقطوں والی کا گلا کاٹ دے گا جب جاکر

تمہارے باقی ماندہ مسودے پر نگاہ ڈالے گا۔۔

جمیل سجاد کیا کہوں!

سجاد ارے بھائی مسلم اِس طرح چھپ چھپ کر خیالات بنا بنا کر دلبر کی غیر حاضری میں روتا نہیں وہ اُسے ہر طریقے سے جیت لینا چاہتا ہے۔

جمیل تو پھر میں واقعی کچھ غیر مسلم سا ہوں۔

سجاد تمہیں میری قسم مجھے بتاؤ آخر یہ کون بھلا مانس ہے جس کی بیٹی تمہاری نظر پڑ گئی؟

جمیل تم تو مذاق اُڑاتے ہو اور اِن چیزوں کا مذاق ہی اُڑانا چاہیئے کہ اِن کی سنجیدگی صرف اُن کے لئے ہے جن کے دل محبت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔

سجاد جمیل میں ایک مسخرا ہوں اور دنیا کو مسخروں کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ تمہاری اس رنگین نوائی (خط جیب سے نکال کر جمیل کو دے دیتا ہے) کو دیکھ کر جس کے لئے میں دل سے معافی کا خواستگار ہوں میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنا رازدار سمجھو اور مجھے بتاؤ جو کچھ بھی تمہارے دل میں ہے۔

جمیل (ایک آہ بھر کر) سجاد تم سنجیدہ بن کر مجھے کیوں رنجیدہ بناتے ہو۔ میں اک خیال پرست ہوں اور دنیا کو خیالات و تصورات کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ لیکن کیا مقامِ شکر نہیں کہ تمہارے تفنن سے میری سنجیدگی کچھ کم ہوئی۔ اب تم سنجیدہ بن گئے تو میں کیا کروں گا؟

سجاد کیا اُس لڑکی کو تمہارے کسی عزیز نے دیکھا ہے اور کیا وہ اُس سے تمہاری شادی پسند کریں گے؟

جمیل یہ میری چچازاد بہن ہے۔ میرے عزیزوں کو مجھ سے بھی زیادہ اُسے دیکھنے کا موقع ملا ہے (ملاحظہ ہو کہ نگاہوں کی مجموعی تعداد وحدت سے اندازہ لگایا جاتا تو یہ سرتاپا غلط تھا) اور شادی کا کیا پوچھتے ہو۔ بھائی میرا شمار شادی پسندوں میں نہیں۔

سجاد اللہ اکبر! تم گاندھی کے پیرو کب سے ہو گئے اور اُس بھلے مانس مہاتما نے بھی شادی کے بعد ازدواجی تعلق کے خلاف لیکچر دینے شروع کئے۔ لیکن تم مہاصوفی شادی سے پہلے ہی اُس کے مشاہدے سے بھی بیزار ہو گئے۔ خدا کے واسطے عقل کے ناخن لو۔ بھئی اسے ہنسی ٹھٹھا نہ سمجھنا۔ یہ ایک نہایت اہم بات ہے جس کا اثر تمہاری ساری زندگی پر پڑنے والا ہے۔ خدا کے لئے ذرا ہوش میں آؤ۔ کہیں کسی سادھو سے پرستان کی کوئی جڑی بوٹی لے تو نہیں نگل لی؟

میل اگر یہ دیوانہ پن ہے تو شروع سے اخیر تک میری ساری زندگی محض دیوانہ پن اور میرے سارے منتہائے نظر
فقط سرابِ نظر ہیں ۔

سجاد یقیناً، بلاشبہ! تم تو مسلم ہو یہ غیر مسلمانہ روش کب سے اختیار کی؟

میل کیا کسی شخص کو کسی دوسرے سے الفت یا محبت نہیں ہو سکتی جب تک شادی کا دلّال بیچ میں آکر سودا نہ کرائے؟
گویا مسلمان صرف شادی کر سکتا ہے بغیر محبت کے اور محبت نہیں کر سکتا مگر شادی کی حالت میں۔ پھر دوستی
بھی ایک بے معنی تعلق ہے؟

سجاد ارے میاں ذرا کبھی لغت بھی اٹھا کر دیکھ لیا کرو۔ دوستی مردوں مردوں اور عورتوں عورتوں میں ہوتی ہے پیار
ماں کو بچے سے ہوتا ہے یا بچے کو ماں سے اور اُنس آدمی کو آدمی سے۔ لیکن محبت یا عشق صرف مرد کو عورت یا
عورت کو مرد سے ہوتا ہے اور یہ اُسی وقت جائز ہے جب عقد کی مہر اُس پر لگ جائے!

جمیل تو گویا محبت یا عشق تولیدِ جنسی کا اجارہ دار ہے اور بس؟

سجاد بھائی جمیل میں یہ نہیں کہتا کہ اس معصوم لڑکی سے محبت نہ کرو۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اُس بیچاری سے
دل لگا کر اُس سے یوں دست بردار نہ ہو جاؤ۔

میں دل لگانے والوں میں نہیں۔ میرے دل میں تو محض اُس کی طرف محبت کا اک پاکیزہ جذبہ ہے۔ وہ جس
قسمت میں ہوگی، جسے اُس کے والدین دینا چاہیں گے اُسے مل رہے گی۔

یہی سہی تو اسے کیوں محض اُس کے والدین کی مرضی پر چھوڑتے ہو۔ شاید تمہیں اُس کی خوشی کے بہتوں کفیل
دسکو۔ کیا اُسے یوں چھوڑ دینا اُس سے محبت کرنا ہے؟

سجاد اگر یہ محبت شادی کی غرض سے ہوتی تو بھی میں اُس کے قابل کب تھا! میرا جسم منحنی ہے میرا دل تاریک ہے
میرے پاس زیادہ زر و مال ہے نہ کسی رتبے یا عہدے کا رعب وداب۔ خدا گواہ ہے میں کسی طرح بھی اُس
کے قابل نہیں!

میں سمجھ گیا تم اُن بزدل ناخود شناس خیال پرستوں میں سے ہو جو اپنے تئیں کسی شے کے قابل نہیں سمجھتے
ور اسی لئے کسی شے کے قابل بنتے نہیں۔ اور اگر بنتے بھی ہیں تو اس سے دنیا یا دنیا والوں کو کوئی فائدہ نہیں
پہنچتا۔ وہ انڈے کی طرح اپنے اندر ہی رہتے ہیں۔ وہ کیا ہوئے اور کیا نہ ہوئے۔ اُنہیں دنیا سے غرض نہیں تو
دنیا کو اُن سے کیا غرض؟ فی الحقیقت اُن کا دنیا میں رہنے کا حق ہی کیا ہے۔ وہ اپنے فطری فرائض کو ادا نہیں

کرتے بلکہ زندگی سے جی چُراتے ہیں۔ بھائی زندہ وہی ہیں جو زندہ دل ہیں، انسان وہی ہیں جو دوسروں سے تعلقات پیدا کریں نہ کہ فقط اپنے خیالات و تصورات میں محو رہیں۔

جمیل ثروت اور مجھ سے شادی! نہیں سجاد ناممکن قطعی ناممکن۔ وہ میری ہمیشہ کے لئے میری ہے۔ وہ وہاں نہیں جہاں ہے وہ میرے دل میں موجود ہے اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے۔ میں دنیا میں اپنا کام کرتا ہوں کئے جاؤں گا۔ مجھ سے اوروں کے لئے جو کچھ ہو سکے گا میں کروں گا۔ تمہارے نقطۂ نظر سے بھی دیکھوں تو ابھی میں طالب علم ہوں مجھے پڑھنا پڑھانا ہے۔ ابھی میں کیا ہوں کہ اپنے تیئں اُس کے لئے پیش کروں۔ لیکن میرا دل اُس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔

سجاد اچھا جمیل چھوڑو یہ قصہ بھئی آؤ باہر چلیں۔ اگر کہیں ہمارے پروفیسر آف فلاسفی مل گئے تو اُن سے اِس نفسیاتی اُلجھن کے سُلجھانے کا طریق پوچھیں گے۔

---

(۵)

محبت ایک نسوانی جذبہ ہے!

محبت حسن ہے اور حسن عورت اور اس لئے صرف عورت ہی صحیح محبت ہے!

پھر اگر عورت میں محبت نہیں تو وہ محض ایک چینی کی مورت ہے جیسے اگر مرد میں ہمت نہیں تو وہ فقط ایک آہنی بت ہے!

انسانی فطرت کے دریائے جذبات کا سرچشمہ محبت ہے جس کی نُزہت گاہ عورت کا دل اور جس کا آبِ روا عورت کے آنسو ہیں!

عورت حُسن کا پھول ہے اور اس پھول کی خوشبو محبت ہے، مرد کا چمن حیات اسی پھول سے آراستہ اور اُس کی فضائے دل اسی کی نکہت سے معمور و معطر ہے!

دنیا کے چمنستان میں مہک اسی پھول سے ہے اور چمک اسی بکھیرو سے۔ اور اس مہک اور اس چمک سے وہ عالم انبساط پیدا ہے جس کا نام بہارستان زندگی ہے!

دنیا میں جب پہلا انسان پیدا ہوا تو اُس نے عورت کی آنکھوں سے محبت کی زبان سیکھی۔ یہی وہ زبان تھی

کی بدولت خلوص کے الفاظ ہمدردی کے جملے اور ایثار و نیکی کے منظومات بزمِ تمدن میں نطقِ فطرت سے ادا ہوئے اور گنبدِ افلاک میں گونج اُٹھے!

دُنیا اک ظلمت کدہ ہے جسے محبت کی شمع منور کرتی ہے اور انسان کا دل ایک صدف ہے جس کی ساری آب و تاب صرف محبت کے دُرِ شاہوار سے ہے۔

اور عورت جس کا سینہ محبت کا کعبہ ہے جب بھی محبت کرتی ہے تو سراپا محبت ہو جاتی ہے۔ اس شمع کا شعلہ جب بلند ہوتا ہے تو یہ شمع محض اپنا شعلہ بن کر رہ جاتی ہے۔

ثروت اک رنگین و زرّین نوشگفتہ پھول کی طرح بچپن کے گلزار میں لہلہا رہی تھی کہ **جمیل** ایک بلبل شیدا کی مانند اُس خوش منظر روش پر آکر اُڑان بھرنے لگا جس کی ساری رونق ثروت کے دم قدم سے تھی۔ اپنے گل کا نظارہ دیکھ کر بلبل نغمہ زن ہوئی، اپنی بلبل کا نغمہ سُن کر پھول میں وہ نکہت پیدا ہوئی جس سے دونوں کا باغِ زندگی پایانِ کار معطر و سرشار ہونے والا تھا۔

ثروت کے دل میں کچھ دیر سے طفلانہ موانست کی وہ لہریں سطحِ خیالات کے نیچے متحرک تھیں جن کا ابھی اُسے خود بھی علم نہ تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ کسی دوسرے کے لئے بھی انہیں حسنِ طفلی کی فطری شوخیوں سے علیحدہ تصوّر کرنا دشوار تھا۔ جب جمیل "علیم منزل" میں آکر رہنے لگا اور دن رات اُس کی نظروں سے محبت کی کرنیں جلوہ ریز ہوئیں تو پہلے پہل بے جانے ہوئے ثروت کے دل سے الفت کی وہ رقیق ہوائیں اٹھیں جن سے زندگی کی فضا میں ایک روز دھواں دھار گھٹائیں چھا جانے والی تھیں۔

بہت سے نوجوان ثروت کے پیشِ نظر تھے لیکن قُربت و ہم نشینی کا اثر کہئے یا جمیل کی انوکھی طبیعت کی دلکشی کہ ثروت بچپن ہی سے اپنے کھیل کود میں جمیل کی صحبت میں خوش رہتی تھی۔ اب جب جوانی کی نسیمِ جانفزا چلی تو کسی کے چھپے سن کر یہ غنچۂ ناشگفتہ اِک گُلِ رعنا بن کر چٹک پڑا۔

جب ثروت نے پہلے پہل جمیل کو ٹکٹکی باندھے تکتے دیکھا تو وہ نہ سمجھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ لیکن وہ ٹکٹکی ہٹنے والی نہ تھی اور نہ وہ اک نری ٹکٹکی ہی تھی کہ محض تعجب و استعجاب کا اظہار ہوتی۔ نہیں اُن نگاہوں میں اک گہرائی تھی اور اُس گہرائی میں اک سوز تھا، غایت درجہ دلپذیر و دلگداز۔

آخر ایک روز گُل کھلا۔ ثروت کی انگلی میں اک ننھی سی خوش نما انگوٹھی تھی جسے وہ بار بار اُتار کر اُس سے کھیل رہی تھی اور جمیل اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ انگوٹھی اتفاق سے تپائی ہی پر رہ گئی۔ جب سب کمرہ چھوڑ کر باہر چلے گئے تو

جمیل نے اُسے اُٹھاکر جیب میں ڈال لیا۔ ہفتے کا دن تھا جب وہ گھر والوں سے ملنے اور گاؤں میں دو روز گزارنے کے لئے لاہور سے چلا جایا کرتا تھا۔ جمیل چلا گیا۔ پیچھے انگوٹھی کی تلاش ہوئی۔ بدرالنساء نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ آخر ثروت نے کہا کہ انگوٹھی مل گئی۔ بدرالنساء نے پوچھا کہاں ہے اُس نے بات ٹالنے کے لئے کہا کہ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ کہیں ہے۔

بدرالنساء بولی تمہارے جی میں؟

فی الحقیقت وہ انگوٹھی ثروت کے جی ہی میں نکلی۔ اُسے انگوٹھی سے وہ کھیلنا اور جمیل کا وہ دیکھنا یاد آگیا۔ انگوٹھی مل گئی لیکن اُس کا جی کھو گیا۔ کئی ہفتوں سے دل کے خس و خاشاک میں ایک اَن دیکھی چنگاری سلگ رہی تھی جو اب یک لخت ایک شعلہ بن کر دہک اٹھی۔ ثروت کو معلوم نہ ہؤا کہ کیا ہؤا لیکن اُس کا جی سینے میں بیٹھ گیا اور اُس کے بدن میں ایک سنسنی پیدا ہو گئی۔ ثروت نہ جانی کہ اُس کا دل ہی اُس کا جانی دشمن بن گیا ہے۔ وہ سمجھی تو یہی سمجھی کہ خدا جانے کون اُسے اپنے پروں پر اُٹھا کر بلند ترین چوٹیوں پر لے گیا ہے اور اب اُسے دور نیچے اک ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر میں پٹخ دینے کو ہے۔ وہ چیخ اٹھنے کو تھی کہ اُسے اَوروں کی موجودگی کا احساس ہؤا وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہاں کواڑ بند کر بستر پر لیٹ گئی۔ موتی اُس کی آنکھوں سے ڈھلکنے لگے یہاں تک کہ آنسو چھم چھم جاری ہو گئے اور ہچکی کا تار بھی بندھ گیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ روئے اور روئے جائے۔ اس سے پہلے بھی کبھی وہ ماں یا سہیلیوں کے طعنوں پر روئی ہو گی لیکن یہ رونا کچھ اَور رونا تھا۔ یہ اشکِ زار گرم و گرم رفتار تھے۔ اِن آنسوؤں میں محبت پڑی مسکراتی تھی۔ اس غمگینی میں اک دلکشی اس اندوہ میں اک انبساط کی لہر تھی۔ لیکن ثروت کو کیا پتہ تھا کہ یہ کیا ہے۔ بس اک آگ سی سینے کے اندر لگی ہوئی تھی کہ پتہ لینے کو جی ہی نہ چاہتا تھا کہ کس نے لگائی بجز اِس کے جس نے لگائی ہے وہ آکر اسے بجھا تو دے۔ جب طبیعت ذرا ٹھکانے ہوئی تو ثروت کے کان میں گویا خاموشی نے آواز دی "جمیل"۔ یہ نام اب اس قدر دلکش ہو گیا تھا کہ اُس نے بار بار آہستہ آہستہ کہا "جمیل ...... جمیل ...... جمیل .... تُو کہاں ہے کہ میرے ساتھ آکر کھیلے"؟

اتوار کا دن چھٹی کا دن تھا لیکن آج وہ پہاڑ کی طرح ٹالے نہ ٹلتا تھا۔ جوں توں کر کے وہ کٹا اور پیر کی خوشگوار صبح خوشیوں کے شادیانے بجاتی آئی۔ جمیل آیا اور انگوٹھی کو چپکے سے وہیں رکھ دیا جہاں پہلے تھی۔ اتنے میں بدرالنساء گول کمرے سے گزریں تو تپائی پر انگوٹھی کو پڑا پایا۔ ثروت کو آواز دی وہ آئی تو کہا کہ انگوٹھی کہاں ہے اُس نے کہا اماں میں کیا ہر وقت انگوٹھی دیکھتی پھرتی ہوں کہیں میرے کمرے میں ہو گی؛ پرسوں ہی مل گئی تھی۔ جمیل نے ذرا

حیرت سے ثروت کی طرف دیکھا اُدھر ثروت بھی بن دیکھے نہ رہ سکی اور شرم سے سر جھکا لیا۔ اُس وقت جمیل کے دل کی دزیدہ لیکن خوف زدہ مسرّت کا کچھ وہی اندازہ لگا سکتا ہے جس نے ہند کی مجبور معاشرت میں اپنی دلبر حسینہ کے متعلق پہلی بار محسوس کیا ہو کہ اُسے بھی اُس سے پیار ہے۔ بدر النساء نے ذرا جھنجھلا کر اور انگوٹھی دکھا کر کہا تو پھر اِسے یہاں کوئی چھلاوا لے آیا؟ ثروت میں دیکھتی ہوں کہ جوں جوں تم بڑی ہوتی ہو تمہاری عقل غائب ہوتی جاتی ہے۔ کسی روز دن کو تارے نہ دیکھنے لگ جانا کہ کہیں کہہ دو اندھیری رات میں بھی مجھے چاند نظر آتا ہے۔

ثروت کیا جواب دیتی کہ وہ واقعی دن کو تارے دیکھنے لگی تھی اور واقعی اُس کی اندھیری راتیں آن کی آن میں کسی چاند کی چاندنی سے پُر نور ہو چکی تھیں۔

عرب کہتے ہیں کہ کسی شے کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ دوسروں کی نظر میں محبت والوں کا یہی حال ہو گا مگر اپنے آپ میں تو اسیرِ محبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کسی شے کی محبت اُسے سرشار و بیدار کر دیتی ہے۔ اُس کی بیقراری میں اک اطمینان اور اُس کی بے اختیاری میں ایک وجدان رونما ہوتا ہے۔ اُس کے سازِ دل کے سارے تار محوِ اہتزاز اور اُس کے دماغ کی ساری قوتیں ایک برقی کل کی طرح متحرک و مرتعش ہو جاتی ہیں۔ باہمی محبت کے احساس سے روح و رواں میں گویا ایتھر کی ایک رو دوڑ جاتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہو کر کمزوریاں خوبیوں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں جمیل کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُس کا تخیل اُسے ایک آسمانی فضا میں لے گیا ہے جو اُس کے شہپروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے گونج رہی ہے۔ اگر موقع ہوتا تو اُس کے نطق کی شیرینی اُس کے تخیل کی پرواز اُس کی عقل و فہم کی سلامت روی اُس وقت دنیا کو حیرت میں ڈال دیتی کہ اس نوعمر میں یہ پختگی کہاں سے آئی اور کیونکر؟ اُدھر ثروت جو یوں بھی حسن کی ایک پتلی تھی اب ایک حسن کی دیوی بن گئی۔ عورت جب کامران محبت کی آمد آمد کا احساس کرے تو اُس کا حُسن دوبالا اور اُس کی رعنائی پہلے سے بدرجہا زیادہ شیریں ہو جاتی ہے۔

ثروت نے جمیل کو دیکھا جمیل نے ثروت کو۔ محبت کی معجز نمائی نے دونوں کو ششدر کر دیا۔ ثروت کبھی ایسی حسین نہ تھی جیسی آج۔ دنیا جہان کا رنگین و زرین جمال اُسکے چہرے میں چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا اور اُس کی رسیلی آنکھیں جمیل کے لئے اُس کے نرم و نازک دل کی ترجمان بن گئی تھیں۔ اور جمیل جو یوں اک معمولی شکل کا لڑکا تھا آج اُس میں اس قدر دلکشی پیدا ہو گئی تھی کہ ثروت جی ہی جی میں کہہ رہی تھی کہ آج وہ کہاں سے ہو کے آیا ہے کہ وہ کچھ اَور کا اَور معلوم ہو رہا ہے۔

کیا یہی نہ تھی تکمیلِ محبت؟ اُس زرّیں ساعت میں جمیل و ثروت نے معراجِ مسرّت کو پا لیا تھا!

لیکن قدرت کو محبت کی یہ آسانیاں منظور نہ تھیں۔ زمانے کو مسرت کا یہ قیام و قرار ایک نظر نہ بھایا۔ کرۂ فلک نے گردش کی اور ایک نئی صورتِ حالات پیشِ نظر کر دی۔

آئندہ دو تین ماہ میں ثروت کے لئے وہ پیام آئے جن کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں + بدر النساء عقاب نظر تھی اور بات بات میں بال کی کھال اُتارتی تھی۔ لڑکی کا رُخ تاڑ گئی اور ایک دن اُسے تخلئے میں لے جا کر خوب سرزنش کی اور کہا کہ ناسمجھ نہ بنو۔ تمہاری ساری عمر کا معاملہ درپیش ہے۔ اب ماشاءاللہ تم جوان ہو۔ جوان لڑکیاں گھر میں بٹھائی جائیں تو شریفوں کی ناک کٹ جائے اور ساری کی ساری آبرو خاک میں مل جائے + یاد رکھو لڑکیاں لڑکوں کی طرف نہیں دیکھا کرتیں یہ شریف حیادار بیٹیوں کا کام نہیں۔ لڑکے لڑکیوں کی طرف دیکھ لیں تو مضایقہ نہیں۔ پھر لڑکے پیام بھیجتے ہیں اور ماں باپ سوچ بچار کر کے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہماری لختِ جگر کے لئے کونسا نوجوان سب سے زیادہ موزون ہے؟ خوش اطوار نیک بخت لڑکی جانتی ہے کہ میرے ماں باپ سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے والا اس دنیا میں نہ کوئی ہے نہ ہوسکتا ہے سو وہ خداوندِ کریم کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔

اور اِسی طرح یہ خانگی تقریریں اور ملامتیں روز بہ روز جاری رہیں۔ کبھی دھمکیاں کبھی ترغیبیں کبھی لاڈ پیار کبھی دم دلاسے یہ گوناگوں عذاب برابر جاری رہا۔

اور جمیل ابھی وہیں مقیم تھا اور ثروت کو بدستور دیکھنے پر مجبور تھا اور ثروت کی نگاہیں بھی ہمیشہ نیچی نہ تھیں۔ اگرچہ دونوں میں کبھی کوئی محبت کی گفتگو نہ ہوئی جس سے دوسرے کا مافی الضمیر علانیہ طور پر ظاہر ہو جاتا + ان پیاموں اور بحثوں سے اُدھر جمیل اِدھر ثروت بے قرار و بدحواس ہو گئے۔

آخر جمیل نے لاہور چھوڑ دیا۔ ثروت ماں سے شرافت کی صفات سن سن کر بے حال ہو رہی تھی کہ سوائے اس کے کہ شریف لڑکی بنوں میں اَور کر ہی کیا سکتی ہوں؟

حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت میں ثروت کا کرب و اضطراب جمیل سے بھی کہیں بڑھ کر تھا۔ دن کی آہیں اور رات کی اشک باریاں اُس کی ماں سے بھی نہ چھپی تھیں گو باپ کو ان سب حالات کی مطلق خبر نہ تھی۔ لیکن ماں اپنی جنس کی کمزوری اور اطاعت گزاری سے بخوبی واقف تھی۔ اُس نے شوہر کی غائبانہ جھوٹی سچی رائے بھی لڑکی کے آگے پیش کر دی۔ چند مہینوں رو دھو کر ثروت گویا مضمحل ہو کر اپنی قسمت کے قدموں میں گر پڑی۔ اور آخر ایک دن اُس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ جو آپ کی مرضی ہو وہی میری خوشی ہے۔ میں اپنے دل کو بھینچ ڈالوں گی مگر ادائے فرض سے کبھی نہ چوکوں گی +

ماں نے آبدیدہ ہو کر بیٹی کے سر پر پیار کیا کہ میری ثروت! ہماری ساری خوشیاں تیرے ساتھ ہیں۔ خدا تجھے خوش نصیب کرے اور تُو ہمیشہ پھولے پھلے!

(۶)

جمیل کالج کے ایک برآمدے میں کھڑا ایف اے کی فہرستِ نتائج میں اپنی کامیابی دیکھ کر مُسکرا رہا تھا کہ سجاد نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور امتحان کی کامیابی پر مبارکباد دے کر اُس کے ہاتھ میں ایک خط دیا کہ یہ لو تمہاری دلبر کا محبت نامہ، تمہاری شبانہ روز دماغی کوفت پر انعام + والدہ کا خط تھا جمیل نے وہیں کھول کر دیکھا تو اُس میں مادرانہ شفقت کا طول طویل اظہار تھا اور اخیر میں ایک کونے میں لکھا تھا کہ منظور و ثروت کی منگنی ہو گئی ہے جمیل کا رنگ بالکل متغیر ہو گیا اور چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ سجاد نے کہا خیر تو ہے۔ جمیل نے جواب دیا ہاں یوں تو سب بخیریت ہیں۔ سجاد نے کہا پھر؟ (اور جمیل کے ہاتھ سے لفافہ چھیننے کی کوشش کی) جمیل ہٹ کر علیحدہ ہو گیا سجاد آیا تو کہا بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ تم کو مبارک ہو۔ تمہاری پیشین گوئی پوری ہونی تھی سو ہوئی۔ ثروت کی منگنی ہو گئی۔ سجاد نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا کہ سارا کمرہ گونج اُٹھا۔ پھر جمیل کی پیٹھ پر خوب زور سے ہاتھ مار کر اُس کے کندھوں پر تھپکیاں دیں اور اُچھل اُچھل کر اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا کہ مجھ احمق کو افسوس ہو تو ہو لیکن یار تمہیں تو امرت مل گیا۔ واللہ تمہارے صوفیانہ ٹونے ٹوٹکے بڑے کارگر ثابت ہوئے۔ بھئی میں تم پر ایمان لے آیا۔ تمہیں اُس بھلی مانس سے پاگلوں کی سی محبت تھی لیکن تم دن رات اسی فکر میں مبتلا تھے کہ کہیں اُس سے تمہاری شادی ہی نہ ہو جائے۔ سو اب اُس کی منگنی ہو چکی ہے تم بالکل مامون و مصئون ہو اور اب کسی قسم کا خطرہ مطلق باقی نہیں رہا۔ اللہ اکبر کیسی کامیابی ہے! اُدھر تعلیم کے ایف اے میں پاس اِدھر محبت کے میٹرک میں فیل۔ سبحان تیری قدرت! تو نے صوفیوں کو اپنی قدرتِ کاملہ کی کیسی کیسی نشانیاں دکھائی ہیں!

جمیل کا دل جو کبھی محبت کے میدان میں کسی پہاڑی ندی کی طرح بہتا تھا اب خشک ہو کر اُس میں مایوسی اور خشک مزاجی کے سنگ ریزے نکل آئے جن کی دل میں پوجا کرنا بھی اب متقی عقل مندوں کے نزدیک ایک اخلاقی جُرم ٹھیرا۔ اب وہ اکثر تن تنہا چہل قدمی کے لئے جانے لگا لیکن اُس کے سال میں کبھی کبھی ایسے دن آتے تھے جب وہ نفس خاموشی کی تنہائی اور قدرت کی عزلت سے متاثر ہو کر دنیا و مافیہا سے بلند اور اُس کی جکڑبندیوں سے

قلعی بالا بالا پرواز کرنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے پاکیزہ لمحات اپنا پرتو ڈالتے تھے کہ دل کی اندرونی تاریکیاں اُن سے یکسر فروزاں ہوجاتی تھیں۔ ایک روز ایک ایسی ساعت میں اُس نے قوتِ نفس کی وجدانی آواز سنی کہ اُٹھ اور جاکر اُن دوَر دور پھیلے ہوئے خزانوں کو سمیٹ لے جو مشیتِ خداوندی نے فطرت کے ہاتھوں دنیا کے کونے کونے میں چھپا رکھے ہیں!
اُس کی زندگی میں ایک تبدیلی سی آگئی۔

جمیل کے دل میں ثروت کی محبت تو جیسی تھی ویسی رہی لیکن اس بظاہر مردہ پکھیرو پر اب اُس نے چمن چمن سے گلچینی کرکے رنگ رنگ کے پھولوں کا اک انبار لگادیا کہ دنیا کے مردار خواروں کی بھیانک نظریں اُس پر نہ پڑیں۔ وہ شعر و ادب اور رقص و موسیقی کے چمنستان میں جانکلا اور اُس نے اپنا دامن ننھی ننھی پتیوں اور رنگیں پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیوں سے بھر لیا۔ ہر روز وہ ایک نئی بیاض کو کبھی کسی شاعر کی بوقلمونیوں کبھی کسی نثار کی خیال آرائیوں کبھی کسی نقاش کی نقش نگاریوں اور کبھی کسی فلسفی کی حقیقت نمائیوں سے زیب و زینت دیتا۔ وہ ان بیاضوں کو ایسی خوش نمائی اور حزم و احتیاط سے پیراستہ کرتا گویا وہ ان نادر الوجود مسوّدات کو کسی کتب خانے یا عجائب گاہ میں پیش کرنے والا ہے۔ یہ تھا اُس کے دل کا عجائب خانہ جس کی خالی غیر آباد عمارت کو اب اُسے اپنے ذہنی و قلبی نقش و نگار سے یکسر رشکِ عالم بنانا تھا۔ محبت کی ناکامی نے اُسے مفلس بنادیا تھا اب علم و فن کے حصول سے اُسے ایک غیر فانی دولت پیدا کرنی تھی۔ یہ ایک بڑے دل و دماغ کا کام تھا اور جمیل اس کام میں پورا اترا۔ وہ خوش تر قوی تر اور زندہ تر ہوگیا۔ اُس کی خوشی ایک ذہنی خوشی، اُس کی قوت ایک دماغی قوت اور اُس کی زندگی ایک روحانی زندگی ہوگئی۔

کچھ عرصہ ہوا جب حمید نے ثروت کی منگنی سے پہلے منظور کے کچھ حالات اور اُس کی رائے جمیل سے دریافت کی تھی تو جمیل نے بے کم و کاست اپنے خیالات کو بیان کرکے منظور کو ہر طرح قابلِ قبول ظاہر کیا تھا۔ اس کے ایک سال بعد ثروت اور منظور کی شادی کی تیاریاں ہوئیں۔ دعوتی رقعے سب عزیزوں دوستوں کو پہنچے۔ منجملہ اُن کے جمیل بھی تھا نارو ادار خدا رسیدہ زاہدوں کو شاید اصرار ہو لیکن بیچارے جمیل سے ہم کیونکر اُمید کرسکتے ہیں کہ وہ ثروت کے نیلام میں آخری بولی دینے والے کی خوشیوں کے جشن میں بخوشی شریک ہوتا۔ وہ معاشرتی مواقع میں رسمی شرکت سے بہت گریز کرتا تھا بالخصوص جب اس کے جذبات اُس معاملے میں ایسے نازک تھے کہ ذرا سی ٹھیس سے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کا ڈر تھا۔ یہ جذبات اُسے غایت درجہ عزیز تھے اور اُن کی صیانت کے لئے اُس نے اک دروغِ مصلحت آمیز کی آڑ میں اپنے تئیں بچانا چاہا۔ عین عقد کی رات اُس نے لاہور تار بھیجا کہ میں علیل ہوں لیکن اس خوشی میں سب کے ساتھ شریک ہوں گو اِس غیر حاضری میں اس نے اپنے مفصّل تہنیت نامے میں ایک بظاہر پُرخلوص معذرت بھی پیش کی لیکن منظور اور اُس

کی وجہ سے ثروت بھی اُس کی اس بے اعتنائی سے ذرا رنجیدہ خاطر ہوگئی اور یہ غلط فہمی روز بہ روز بڑھتی گئی۔

منگنی کے چھ ماہ بعد ثروت کی شادی ہوگئی۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ پنجاب بھر کے چیدہ چیدہ معززین شریکِ دعوت تھے۔ بڑے بڑے ریش دار شاعروں نے سہرے پیش کئے۔ دعوت ایسے پیمانے پر کی گئی تھی اور "تناولِ ماحضر" اس قدر مکلف و مرغن و ملذذ اور متنوع و ا بقولِ شخصے مفصل تھا کہ جتنے لوگ دعوت سے گھر کو واپس گئے اُن میں سے اکثر نے دو دو تین تین وقت کا کھانا نہ کھایا اور بعض تو دو دو ہفتے تک سند یافتہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے ٹیلیفون کھڑکاتے رہے۔ اِدھر عزیزوں اور منتظموں میں سے کئی صاحبوں کے گلے پھولے ہوئے تھے، آنکھیں دکھنے آگئی تھیں اور چہرے ہڑ کی طرح سوکھے ہوئے اور چھوارے کی طرح سیاہ ہو گئے تھے۔ یعنی عملی طور پر ثابت ہو گیا تھا کہ دعوت ہر طرح سے کامیاب اور پُر اثر رہی +

علی گڑھ میں بی اے کا امتحان پاس کرکے جمیل چار سال کے بعد گھر واپس آیا۔

اِس دوران میں جب کبھی اتفاقی طور پر اُسے "علیم منزل" میں قیام کرنا پڑتا وہ یا تو ثروت کے سامنے آنے سے پرہیز کرتا اور اگر کبھی ایسا ہو جاتا تو اپنے رویے پر ایک مصنوعی رنگ چڑھا لیتا۔

گھر واپس آنے کے چھ ماہ بعد نعیم الدین نے کئی ہفتوں کی مسلسل کوشش کے بعد جمیل کو ریل میں اے ٹی ایس کا عہدہ دلوا دیا۔

ایک دن جمیل کی ہمشیرہ نے اُسے اپنے بچپن کے انداز سے کہا کہ بھائی اب تو ہمیں اپنی بھاوج کا چاؤ ہے۔ گھر آپ کی غیر حاضری میں کس قدر سُونا تھا اب اُسے آباد و شاد کیجیئے۔ جمیل نے ہنستے ہوئے کہا جمیلہ گھر میری غیر حاضری میں سونا تھا تو تم کوئی سی ایک بھاوج لے آتیں۔ بھلا میرے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ جمیلہ علیحدہ ہوگئی تو خورشید بیگم اپنے بیٹے کے پاس آئی اور کہنے لگی مرے اکلوتے بیٹے! امتحان اور معاش میں کامیاب ہو کر تم نے باپ کا گھر روشن کیا۔ کیا تم اب اپنی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا نہ کرو گے؟ جمیل نے مسکرا کر کہا اماں! میں وہ برف کہاں سے لاؤں جس سے نہیں ٹھنڈک پہنچے؟ ماں بولی بیٹا برف کا تو سب انتظام ہو جائیگا مگر تم بھی تو ہاں کہو۔ جمیل نے جواب دیا اماں میں جس طرح ہوں بہت خوش ہوں میں نہیں جانتا شادی کی یہ نئی بلا کیا اثر پیدا کرے گی۔ خورشید بیگم نے بزور کہا جمیل شادی کو بلا نہ کہو اس سے تمہارا گھر آباد ہوگا اور تمہارے بزرگ باپ کی نسل قایم رہے گی۔ جمیل یہ سن کر باہر چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ پہلے کی بہ نسبت ایک زیادہ عملی آدمی بن رہا تھا۔ اُسے بھی اُسی روز سے دُھن لگ گئی کہ اِس معاملے کو کسی طرح طے کرنا چاہیئے۔ کبھی جی سے پوچھتا کہ اگرچہ ثروت مجھے بھول چکی ہے اور اُسے بھول بھی جانا چاہیئے لیکن کیا میں ثروت کو

بھولا ہوں؛ پھر کہتا کہ اگر نہیں بھی بھولا تو اُسے بھول جانا میرا اخلاقی فرض ہے۔ کبھی سوچتا کہ تن تنہا رہنا میرے والدین کے لئے باعثِ کرب اور یوں میرے لئے بھی موجبِ اندوہ ہوگا۔ پھر جی سے پوچھتا کہ جس طرح عمر میں اُور ارادے کئے ہیں کیا اُسی طرح ایک روز فیصلہ نہ کرلوں کہ ہاں شادی کرلوں گا اور پھر والدہ سے جا کر کہہ دوں کہ برائے خدا مجھے اُس نیک بخت کی شکل تو دکھا دو۔

اِسی دوران میں ایک روز نعیم الدین باغ کی سیر کو جاتے ہوئے بیٹے کو ساتھ لیتے گئے اور اُس سے یہ ساری بات کی کہ میری تمنا ہے کہ اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو تم اپنی خالہ زاد بہن عذرا سے شادی کرلو۔ وہ بڑی صالح و نیک بخت اور عقلمند لڑکی ہے۔ اگر ہماری طرف سے ذرا دیر ہوئی تو اُس کے لئے پیام چلے آرہے ہیں پھر ایسی لڑکی مشکل سے ملے گی جسے تم مل چکے ہو یا دیکھ سکتے ہو۔

جمیل خاموش رہا پھر تھوڑی دیر کے بعد والد سے کہا کہ جیسے آپ کی مرضی میں آپ کے حکم پر راضی ہوں۔

جمیل اپنے ضمیر کو آئینے کی طرح صاف و روشن رکھنا چاہتا تھا۔ ماں باپ کی تربیت تعلیم کے اثر اور محبت کے سوز سے اُس کا دل گداز ہوچکا تھا۔ اُس نے اُسی روز سے ارادہ کرلیا کہ اب میری تمام توجہ اور محبت صرف عذرا کے لئے وقف ہوگی!

جمیل اپنی خالہ محمود بیگم کے گھر آنے جانے لگا اور گویا موسیو کوے کے "خود تاثیری" کے اصول پر عمل کرکے عذرا کے آگے پیچھے جی ہیں اُس کا نام دُہرانے لگا اور اکثر خیال کرنے لگا کہ عذرا بڑی اچھی لڑکی ہے۔

اور واقعی عذرا گو گلعذاروں میں نہ تھی لیکن ایک زبردست سیرت کی مالک ضرور تھی۔ وہ خاموش مزاج دوراندیش اور خوددار تھی۔ وہ تکلیفوں میں حوصلہ مند ضروریاتِ آرام و آسایش میں کفایت شعار اور لباس و خانہ آرائی میں سادگی پسند تھی۔ وہ تخیلات سے عاری اور معمولات کی عادی تھی۔ وہ دنیا کو اس طرح دیکھتی تھی جیسی کہ وہ نظر آتی ہے وہ جمیل کی طرح دنیا کے خاکے کھینچ کھینچ کر اُن میں رنگ بھرنے کی مشتاق و خوگر نہ تھی۔ لیکن گو غیر معمولی خیالات اُس کی نظر میں پسندیدہ نہ تھے وہ اپنے معمولی خیالوں اور باتوں پر اک پہاڑ کی طرح قایم تھی۔ جمیل کی طرح اُس کی فطرت میں نہ صحرا کی وسعت تھی نہ ندیوں کی روانی اور نہ سمندر کا جوش و خروش۔ اُس کے چہرے کا نام متانت تھا اور خاموشی اُس کی آنکھوں میں بستی تھی۔ اُس کے خیالات اور اُس کی پسند ناپسند کا پتہ لگانا آسان کام نہ تھا کیونکہ وہ منصوبہ بندی سے متنفر اور خیال آرائی کا مضحکہ اُڑاتی تھی جس سے یہ معلوم کرنا کہ اُس کے اپنے خیال کیا ہیں انتہا درجہ دشوار ہوجاتا تھا۔ وہ وفادار تھی اور جہاں اُس کی مخصوص بہ درمیان میں نہ آجاتی وہ ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار تھی۔

اپنے گاؤں میں وہ یتیموں کی سرپرستی اور رانڈوں کی دلجوئی کرتی اور غریبوں کے لئے اُس نے ایک چھوٹی سی

درسگاہ بنائی جس میں وہ اور اُس کی ایک غریب سہیلی اُنہیں لکھنے پڑھنے اور سینے پرونے کی تعلیم دیتیں ۔

اُسے اردو فارسی میں خاصی لیاقت تھی اور حساب بھی اُس نے دلچسپی سے سیکھا تھا ۔

عذرا کی صورت زیبا اُس کا قد چھوٹا اُس کی چال باترتیب اور اُس کی آواز دھیمی تھی ۔

ملازمت ملنے کے پانچ ماہ بعد جمیل کی منگنی اور ڈیڑھ سال بعد اس کی شادی ہوگئی ۔

عذرا سے مل کر جمیل گویا ایک ایسی شخصیت سے دوچار ہؤا جس میں اُس میں بعض باتوں میں بُعدِ مشرقین تھا لیکن جمیل کی کمیاں عذرا کی خوبیاں تھیں اور شاید قدرت نے جو عموماً فطرتِ انسانی کی خواہشات کے جادۂ زرین پر اپنے واقعات کی ریل گاڑی کو چلانا پسند نہیں کرتی بلکہ اُسے اپنے ہی بعض ناقابل الفہم موضوعہ اصولوں کی آہنی سڑک پر رواں کرتی ہے ۔ اسی لئے اِس ندرت پرست نوجوان کو ایک معمول پسند رفیق زندگی دی تاکہ روزمرہ کے افکار و اعمال کی آمد و شد میں اُن کی باہمی زندگی کا ترازو متوازن و یکساں رہے +

عذرا جمیل کو عموماً یہ کہہ کر ایک عملی زندگی کی ترغیب دیتی کہ تمہاری "سادھوانہ" قابلیت اور تمہارا "گاندھیانہ" تخیل کس کام کا ہے جب دنیا کو اُس سے کچھ فائدہ نہ پہنچے ۔ اگر انسان ایک خیالی نصب العین اور ایک مثالی محبت کے تخیلات میں ذہن ہی ذہن میں اپنی زندگی گزار دے تو اس دنیا میں اُس کے آنے اور رہنے سہنے کی غرض ہی کیا تھی ؛ اُدھر جمیل کی طبیعت بجائے آگے بڑھ کے آنے کے پیچھے ہٹ کے چھپنے کی تھی ۔ وہ اپنی خلوت سے محبت کرتا تھا ۔ وہ دن کی روشنی سے گھبراتا تھا ۔ اُس کی آنکھیں راتوں کی چاندنی کو ڈھونڈتی تھیں ۔ پھر بھی عذرا کی "عملیت" کا اک خاموش اثر جمیل پر ہونے لگا اگرچہ اُس کی سچی عظمت کا راز اُس وقت جمیل پر کھلا جب آئندہ بعض دشوار موقعوں پر اُس نے جمیل کو خاموشی کے ساتھ زندگی کی سیدھی راہ دکھادی ۔

کیا جمیل کے دل سے ثروت کی محبت محو ہوچکی تھی ؛ اس سوال کے جواب میں ہم صرف یہ سوال کرینگے کہ کیا انسان اپنے جذبات و تصورات کا مالک و حاکم ہے ؛ اور کیا اُس کے دل کا کوئی جذبہ اور وہ بھی اک حسین و پاک جذبہ قطعی طور پر مٹ سکتا ہے ؟ اور پھر کہیں گے کہ انسان کو خود اپنی ہی قلبی حالت سے صحیح آگاہی نہیں ۔ وہ اپنے دل کو الٹ پلٹ کر دے بعض خیالات کو اُس میں سے نکال ڈالے لیکن اُن رنگوں کو کیونکر دھو ڈال سکتا ہے جو اس جامِ جہاں نما کے بلوریں عنصر کا جزو بن چکے ہیں ؛

جمیل کی شعریت عذرا کی "فطریت" سے دوچار ہوئی ۔ جمیل نے عذرا کو شاعرانہ نگاہوں سے دیکھا عذرا نے جمیل کو فطری طریقے سے لیکن دونوں کی نگاہوں میں سچی محبت تھی جو روز بروز بڑھتی گئی ۔ عذرا کو اُس کی ماں کی نصیحت تھی کہ آج کل کی

بعض منہ زور لڑکیوں کی طرح شوہر سے زیادہ بحث مباحثہ نہ کرتا ورنہ وہ مانتا بھی تمہاری بات نہ مانے گا۔

اُدھر جمیل ایک " اصیل شوہر" تھا سوائے اس کے کہ جہاں وہ اپنی فلک پروازیوں میں محو ہوجاتا وہاں عذرا عموماً اُسے زمین کی طرف کھینچ نہ سکتی تھی۔ جمیل چونکہ کمزور طبع تھا اسلئے بعض وقت وہ اِدھر اپنی "اماں" اُدھر اپنی زوجہ کی اینچا تانی میں گرفتار ہوجاتا لیکن خوش قسمتی سے ایسے مواقع اکثر پیش نہ آتے تھے۔

شادی کے ایک سال بعد جمیل کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام دادا نے عزیز احمد رکھا۔ اِس سے جمیل کے والدین کی نگاہ میں اُس کی بیوی کی قدر و منزلت بڑھ گئی اور جمیل اور عذرا کے تعلقات اَور بھی زیادہ خوشگوار و استوار ہوتے گئے۔

اِس کے دو سال بعد شیخ نعیم الدین کا انتقال ہوگیا۔ نعیم الدین نے اپنی عمر کے پچھلے چند سالوں میں زمینوں اور مکانوں کی خرید و فروخت سے کافی جائداد پیدا کر لی تھی۔ پس نعیم الدین کی وفات پر جمیل ایک خاصا متمول شخص ہوگیا۔ اب بجائے علمی مشاغل کے وہ اپنے کاروباری معاملات میں منہمک رہنے لگا۔ ملازمت سے جو وقت بچتا اُسے اُن کی نذر کرتا۔ تعجب تھا کہ باوجود تخیل پسند ہونے کے کاروباری حیثیت سے وہ ناکام نہ رہا۔ جمیل و عذرا کی سادہ معاشرت اور کفایت شعاری کے باعث اُن کے پاس تھوڑی ہی دیر میں خاصا سرمایہ جمع ہوگیا۔

لیکن اس زر و دولت کا اثر جمیل کی سیرت پر بُرا پڑا۔ وہ روز بروز زیادہ زر پرست اور مادیات میں منہمک ہوتا گیا اگرچہ اُس نے کبھی خیانت سے کام نہ لیا اور نہ کبھی کی دل آزاری کی۔ وہ عموماً اپنی بنک کی کتاب کا مطالعہ کرتا اور اپنی جمع کو دیکھ دیکھکر جی ہی جی میں خوش ہوتا اور حساب کیا کرتا کہ کتنی مدت میں میرے پاس کتنا روپیہ جمع ہو جائیگا۔ اُس کی بیوی اُسے خیرات کرنے کی ترغیب دیتی لیکن علاوہ اِس بات کے کہ وہ رسمی خیرات کے خلاف اپنے اصولی اعتراضات میں پناہ لے لیتا اُس میں ایک یہ عجیب وغریب عادت بھی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ سرزنش آمیز نصیحت پر بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے عارضی طور پر عین اُس کے برعکس عمل کرنے لگتا تھا۔ اپنے کاروبار میں منہمک ہو کر اُس کی محبت کی بلند پروازی و تیزی کچھ کم ہو گئی۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس نے اپنے خانگی تعلقات میں کسی طرح کی بے اعتنائی سے کام لیا۔ نہیں بلکہ عذرا کی مستقل مزاجی کے اثر سے اُن کی محبت روز بروز زیادہ پائدار و مستقل ہوتی گئی اور اُن کی باہمی زندگی زیادہ ساکن و مطمئن!

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمیل و عذرا کی ساری زندگی اسی طرح باہمی مسرت و انبساط میں گزرے گی!

(باقی)

بشیر احمد

تحریکِ عمل

گر دیکھئے تو یاس، ہے انکارِ ذاتِ حق، امیدوارِ رحمتِ پروردگار رہ

آئیں گی تجھ کو راس نہ سرمستیاں تری رہنا ہے اِس جہان میں اگر ہوشیار رہ

اب دشت گردیوں کے زمانے گزر گئے ہنگامہ زائے محفلِ زیبائے یار رہ

شایانِ عاشقی نہیں مایوسیٔ فراق ہر دم رہینِ کشمکشِ انتظار رہ

جاتی رہیں گی حُسن کی بے اعتنائیاں تو اپنے عہدِ شوق پہ خود استوار رہ

اچھی نہیں ہیں دوست یہ عزلت گزینیاں تو حق و راستی ہے سدا آشکار رہ

یہ تیرہ خاکداں ترے دم سے چمک اُٹھے رخشاں عمل کے چرخ پہ خورشید وار رہ

اہلِ نظر کو زندگیٔ پُرسکوں ہے موت بحرِ جہاں میں موج صفت بیقرار رہ

پیدا ہر اک بہار میں اپنی بہار کر اور بے نیازِ عہدِ خزان و بہار رہ

کِس نے کہا تجسّس و تدبیر چھوڑ دے

سنگِ عمل سے شیشۂ تقدیر توڑ دے

جلال الدّین اکبر

بکھرے ہوئے پھول

اے عابد! جب رات کی نقاب پوش ملکہ واپس جانے لگتی ہے۔ جب آسمان کی آب گون چادر سے ملائک اُس کی پوشاک کے بکھرے ہوئے ہیرے چننے لگتے ہیں تو رفتہ رفتہ افق پر سحاب کے رنگین وباریک پردے بھی پھٹ پڑتے ہیں۔ پردہ نشین ملکہ اُن میں روپوش ہو جاتی ہے اور صبح کا نور دنیا کو تابندگی بخشتا ہے۔ اُس وقت نازک نازک پھول بھی اظہارِ عقیدت میں مسکرا اُٹھتے ہیں مگر تو اُس وقت کہاں ہوتا ہے؟ مجھے سجدہ کیوں نہیں کرتا؟

اے عابد! تو جانتا ہے۔ صبح کس کو کہتے ہیں؟ صبح اُس دوشیزہ کا نام ہے جس کے دل میں معصومانہ جذبات پنہاں ہوتے ہیں اور جس کے سینہ سے دوشیزگی کا نور نکل کر، تیری آنکھ کی پھیلتی ہوئی بینائی کی طرح دنیا پر چھا جاتا ہے! اسی لئے میں نے اس وقت کو اپنی عبادت کا بہترین وقت بنایا ہے!!!

اے عابد! اُس وقت، جب صحرائے اعظم کی دلکشی پر رفتہ رفتہ ایک ہولناک اندھیرا مُسلّط ہونے لگتا ہے جب قمر اپنی بے حجاب اور عُریاں روشنی کو مشرق کے اُفقی حصّہ سے پھیلاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ جب اُس کی روشنی ہلکے رنگ کی زرّین شراب بن کر کائنات کے ہوش وحواس پر غالب آتی جاتی ہے۔ جب سمندر آہستہ آہستہ چاندنی کا ساتُما نور اپنی آنکھوں میں لئے ہوئے متحرّک ہوتا ہے۔ اور جب آسمان پر موتی بکھر جاتے ہیں۔ تو اُس وقت تو کن تاریکیوں میں چھپ جاتا ہے؟۔

آ اور اپنے معبود کو سجدہ کر!

اے عابد! یہی وہ وقت ہے۔ جسے میں نے اپنی عبادت کے لئے پسند کیا ہے کیونکہ شام دلکش اور دل افروز مناظر کا مخزن ہے!!!

اے عابد! جب رات کی تاریکی میں نقاشِ قدرت کے تراشے ہوئے نقش ونگار جھلملانے لگتے ہیں۔ جب دنیا کے تمام پہلوؤں پر سکوت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور جب فرشتوں کی آرامگاہ اور نیک روحوں کے پاک محل میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ جب چاند کی روشنی دنیا میں تکیہ و تنہا رہ جاتی ہے اُس وقت تیرے کلبہ میں نیند کا تیرہ و تار

کیوں چھا جاتا ہے؟

آہ کیا تو اس وقت کو نہیں جانتا؟

اے عابد! اُٹھ اور سرِ نیاز جُھکا دے!

یہی وہ وقت ہے جو میری عبادت کی آخری منزل ہے اور جس وقت سکوت اور سکون باہم گلے ملتے ہیں!

اے عابد! میری عبادت کے یہ اوقات "بکھرے ہوئے پھول" ہیں۔ انہیں چُن لے! موسمِ بہار گزرا جاتا ہے۔ پھر تو ان کی لڑیاں کب پروئے گا؟؟؟

تہذیب فاطمہ عباسی

کوائفِ دل

(۱)

خوکردہ ہے دل لطفِ خراشِ جاں کا — دل دادہ جراحتِ غمِ پنہاں کا
معلوم ہے درماں کی حقیقت اُس کو — وارفتہ ہے دردِ طلبِ درماں کا

(۲)

کرتا ہے بسر ہمیشہ روتے دھوتے — ہوجائے گی تسکیں اسے ہوتے ہوتے
نادان ہے دل، کبھی سمجھ جائے گا — سو ہی جاتا ہے بچہ روتے روتے

(۳)

کرتا ہے عجیب خواہشوں کا اظہار — لاتا نہیں میں زباں پہ حرفِ انکار
ازبس ہے عزیز مجھ کو خاطر اُس کی — ہادی مرا دل ہے ایک طفلِ بیمار

سیّد محمد ہادی حسین

وجدانیات

اظہارِ حالِ عجز، محبت سے دُور تھا — اور اُس پہ یہ کہ حُسن تمہارا غیُور تھا

نغموں میں ڈوب ڈوب گئی تھی ہر ایک سانس — تو دل کی انجمن میں گل افشاں ضرُور تھا

نسبت ہی کیا ہے طور سے انوارِ یار کو — یہ تابشِ جمال ہے وہ رقصِ نُور تھا

اُن کی ہزار ضد کہ ہمیں چھیڑ کیوں دیا — میرا یہ ایک عذر کہ دل ناصبُور تھا

رنگینیوں میں ڈوب گیا لالہ زارِ دل — ہر چند تیری برقِ تجلّی سے دُور تھا

دل کی شکستگی سے نہ گھبرائیے حضُور — یہ آئینہ ازل سے یونہی چُور چُور تھا

تیری طرف سے ظلم کی غایت نہیں رہی — میں کچھ نہ کہہ سکا کہ ادب کا وفُور تھا

میں قصۂ تباہیٔ دل عرض تو کروں — تم ہنس کے کہہ نہ دو کہ تمہارا قصُور تھا

غیروں سے تھے وہ محوِ سخن سادگی تھی یہ — دیکھا نہ آنکھ اُٹھا کے مجھے یہ غرُور تھا

عابدؔ کوئی حجاب نہ تھا شامِ وصل میں

اِک پردۂ تبسّمِ پنہاں ضرور تھا

عابد علی عابدؔ

محبت کی فتح

موسمِ بہار کی ایک صبح کو جب کہ ناصر کی عمر آٹھ یا نو سال کے قریب ہوگی وہ اپنے باغ میں سیر کے لئے آیا اور پھول توڑ کر رومال میں جمع کرنے لگا۔ دفعتہً اُس کی نظر ایک خوبصورت تتلی پر پڑی جو گلاب کے پھولوں پر اُڑ رہی تھی۔ ننھے گلچیں کا دل اُسے پکڑنے کے لئے بے تاب ہوگیا۔ وہ پھولوں کو زمین پر پھینک کر تتلی کو پکڑنے کی کوشش میں مصروف ہؤا۔ اُس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ باغ کے آخری حصّہ میں جا پہنچا۔ وہاں اُس کے کوٹ کا دامن ایک خاردار جھاڑی میں اُلجھ گیا۔ اور وہ منہ کے بل زمین پر گر کر رونے لگا۔ باغ کے سامنے والی سڑک پر سے سلیم گذر رہا تھا۔ اُس نے ناصر کو گرتے ہوئے دیکھا تو فوراً اُس کی مدد کے لئے دوڑا اور اُسے کانٹوں کے جال سے رہائی دی۔ وہ خود بھی ناصر کا ہم عمر تھا اُس کے ہاتھ کانٹوں سے زخمی ہو گئے۔ ناصر نے اُس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم کیسے اچھے اور بہادر لڑکے ہو کیا تم میرے دوست بنو گے؟" وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اُس کا باپ بھی ادھر آنکلا۔ ناصر نے دوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے یہ تمام واقعہ سنایا۔ ناصر کا باپ سلیم کے پاس آیا اور بولا "میاں تم کس کے بیٹے ہو" سلیم نے جواب دیا۔ "جناب میرے کوئی ماں باپ نہیں، لوگ کہتے ہیں تمہارے ماں باپ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ میں چچا کے پاس رہا کرتا تھا لیکن آج انہوں نے ناراض ہو کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔"

خدا نے جہاں ناصر کے باپ کو ظاہری دولت اور عزت عطا کر رکھی تھی۔ وہاں اُس کے باطن کو بھی رحم، محبت اور فیاضی کے لاتعداد خزائن بخش دیئے تھے۔ اُس نے سلیم سے اس کے مفصّل حالات دریافت کرنے کے بعد اُسے پیار کیا اور کہا کہ تم میرے پاس رہو میں تمہیں ناصر کے برابر ہی تعلیم دلاؤں گا اور تمہیں اپنا بیٹا سمجھوں گا۔

دن گذرتے گئے۔ سلیم اور ناصر کی عمر کے ساتھ ہی ان کی محبت بھی ترقی کرتی گئی۔ وہ بچپن ہی سے ایک غیر معمولی طبیعت رکھتے تھے۔ عام لوگوں سے ملنا جلنا انہیں سخت ناگوار تھا۔

آخر وہ دن بھی آپہنچا جب انہوں نے اپنی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیا۔

سلیم کا چچا اور چچی کسی ناگہانی حادثہ سے دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ چونکہ اُن کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لئے سلیم ہی اُن کی جائداد کا مالک ہؤا۔ لیکن وہ پھر بھی ناصر سے جدا نہ ہؤا۔ انہیں دنوں ناصر کے باپ کا بھی انتقال ہوگیا۔

باپ کی موت کے بعد ناصر نے شہر کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے گاؤں میں جہاں اُس کا آبائی مکان تھا سکونت اختیار کی۔ سلیم بھی اپنی جائداد فروخت کر کے اُس کے ساتھ ہی چلا آیا۔

یہاں اُن کے کتب خانے میں ہزارہا نادرالوجود کتابیں تھیں جو ناصر کے باپ نے اپنی تمام عمر میں جمع کی تھیں اب اِن کا محبوب ترین مشغلہ کتب بینی تھا۔ جب اُن کا دل پڑھنے سے سیر ہو جاتا تو وہ باغ میں چلے جاتے۔ وہاں کسی کُنج میں بیٹھ کر کتابِ فطرت کے مطالعہ میں محو ہو جاتے اور پہروں قدرت کی رنگینیوں کے متعلق گفتگو کیا کرتے۔

انہوں نے آپس میں یہ تحریری عہد کر لیا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو دوسرا اُس کے ترکہ کا واحد مالک ہو۔

ناصر کے ہمسایہ اکرم کے ہاں اُس کا ایک رشتہ دار وحید جو شہر میں رہتا تھا ملنے کے لئے آیا۔ ایک دن دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وحید نے کہا "ناصر اور سلیم کو ایک دوسرے سے کس قدر محبت ہے اور محبت بھی ایسی پائدار ہے کہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں اس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ جب سلیم ناصر کے پاس نیا نیا آیا تھا اُسی زمانہ سے میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میرا مکان ان کے شہر والے مکان کے نزدیک ہی واقع ہے جہاں یہ پہلے رہا کرتے تھے ان دونوں کا باہمی اخلاص نظیر نہیں رکھتا یہی وہ سچی دوستی اور حقیقی محبت ہے جسے موت کے سوا دنیا کی کوئی چیز شکست نہیں دے سکتی۔ بلکہ سچ تو یوں ہے کہ ایسی محبت موت پر بھی فتح پاتی ہے"۔ اکرم نے یہ سن کر شرارت سے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "تو یہ آپ بھی دنیا پر کس قدر نیک ظن رکھتے ہیں۔ اجی! یہ محبّت وحبّت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سب لوگ اپنی غرض کے لئے آپس میں خوشامد سے پیش آنے پر مجبور ہیں اور آپ جیسے خوش اعتقاد اسے محبت سمجھے ہوئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص کسی سے بغیر کسی قرابت کے صرف بے غرض محبت کر سکتا ہے۔ ایسا آدمی جو خواہ مخواہ کسی غیر سے محبت کرے، پاگل، مجنون، دیوانہ ہے یہ دونوں بھی جانے کس غرض کے لئے ابھی تک ایکدوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ موت بھی ان کی محبت پر فتح نہیں پا سکتی مگر یاد رکھئے کہ یہ خاکسار بھی اس پر فتح پا سکتا ہے"۔

وحید۔ ہرگز نہیں، حقیقی محبت کبھی نہیں مٹ سکتی، تم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔

اکرم۔ بھئی خدا کی قسم، اگر میرا نام اکرم ہے تو چھ مہینے کے اندر آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ محبت کیا حقیقت رکھتی ہے۔

وحید۔ اُونہہ۔

وحید نے اُس کی بات کو محض یاوہ گوئی سمجھا۔ لیکن وہ درحقیقت اپنے ارادہ کی تکمیل پر تُلا ہُوا تھا۔ اُس نے وحید کے رخصت ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

وہ اکثر ناصر کے پاس آکر بیٹھتا اور ہمیشہ سلیم کی نسبت نہایت سادگی سے ایک نہ ایک ایسی بات کر دیتا کہ سلیم کی شکایت بھی ہو جاتی اور ناصر بھی اُسے نہایت نیک نیت آدمی سمجھتا۔ کچھ عرصہ تک تو ناصر پر چنداں اثر نہ ہُوا، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے دل میں سلیم کی طرف سے نامحسوس طور پر کدورت آنی شروع ہوئی۔ گو بظاہر وہ اُس سے اسی طرح پیش آتا، لیکن اُس کے دل کی گہرائی میں کہیں بہت دور ایک مبہم شبہ کسی زخمی سانپ کی طرح تاریکی میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب اُس نے سلیم کو تنقیدی نظروں سے دیکھنا شروع کیا، اُسے سلیم کی ہر پُرخلوص بات میں ایک تصنّع نظر آنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا اور افسوس کرتا۔ اب اُس کا دل مطمئن نہ تھا مگر وہ کبھی واضح طور پر یہ نہ سوچ سکا کہ اُس کا اطمینان کیوں جاتا رہا۔

اکرم نے یہ کام بھی شروع کیا کہ سلیم کی ایک تصویر ساتھ لے کر گھر سے چلا جاتا اور کئی کئی دن آس پاس کے گاؤں اور قصبوں میں پھرا کرتا۔ کوئی تین ماہ کی کوشش کے بعد اُس کا مقصد پورا ہو گیا۔ اُسے عشرت خاں نامی ایک ایسا آدمی مل گیا۔ جس کی صورت سلیم سے بہت ہی ملتی جلتی تھی۔ یہ ایک ذلیل و غریب آدمی تھا جو ہمیشہ نہایت ناجائز طریق سے روپیہ حاصل کر کے اپنی بسر اوقات کیا کرتا۔ اکرم نے اس سے معاملہ طے کر لیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ جس شام وہ گاؤں پہنچا اتفاقاً اس روز سلیم کی طبیعت ناساز تھی۔ وہ سرِ شام ہی ناصر سے رخصت ہو کر اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

رات کے وقت اکرم ان کے مکان میں داخل ہُوا۔ اور ناصر کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ناصر نے نہایت فکر سے اُسے بتایا کہ سلیم کی طبیعت خراب ہے۔

اکرم۔ (تعجب سے) اچھا مگر وہ تو کھڑکی کے پاس بیٹھ کر بندوق میں کارتوس ڈال رہے تھے۔ کیا آپ کا ارادہ صبح شکار کو جانے کا ہے؟

ناصر۔ نہیں تو۔

ناصر یہ سن کر بہت حیران ہُوا۔ لیکن اُس نے اپنا تعجب اکرم پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ پھر اکرم باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ "سلیم صاحب نے یہ بہت ہی اچھا کیا کہ رائے صاحب والا گاؤں خریدنے کا ارادہ کیا، ایک لاکھ میں یہ گاؤں بہت سستا ہے"۔

ناصر۔ کیسا گاؤں؟۔ سلیم نے تو کوئی ارادہ نہیں کیا۔

اکرم۔ اجی وہی جو یہاں سے بیس میل شمال کی جانب واقع ہے۔ رائے صاحب اسے فروخت کر دینا چاہتے ہیں۔

ناصر۔ تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ سلیم اس کے خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اکرم۔ مجھ سے رائے صاحب کا ایک ملازم ملا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تمہارے ہمسایہ سلیم ایک روز ہمارے آقا سے اس کے خریدنے کی نسبت گفتگو کرنے آئے تھے۔

ناصر۔ سلیم تو وہاں کبھی نہیں گیا۔

اکرم۔ آپ کو شاید اس لئے معلوم نہ ہوگا کہ پچھلے دنوں جب آپ دہلی تشریف لے گئے تھے۔ انہیں دنوں مسٹر سلیم وہاں گئے تھے۔

ناصر۔ ہاں یہی بات ہوگی۔

تھوڑی دیر بعد اکرم اٹھ کر چلا گیا۔ ناصر آج ان نئی باتوں کو سن کر سخت متعجب ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ سلیم ایک لاکھ میں گاؤں کیونکر خرید سکے گا؟ اس کے پاس تو صرف پچاس ہزار روپیہ ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ "پہلے جب کبھی میں ایک دن کے لئے بھی دہلی جایا کرتا تھا تو سلیم ہمیشہ میرے ساتھ ہی جاتا۔ لیکن اس مرتبہ وہ خلافِ معمول ناسازیٔ طبع کا عذر کر کے یہیں رہا۔ اور پھر یہ بات بھی مجھ سے پوشیدہ رکھی۔ سلیم کبھی مجھ سے اپنا کوئی راز نہیں چھپایا کرتا تھا۔ معلوم نہیں اُسے کیا ہو گیا۔ خیر میں صبح یہ بات تو اُس سے ضرور دریافت کروں گا۔"

وہ انہیں خیالات میں غرق ہو گیا۔

رات کو ایک بجے کے قریب جب تمام لوگ سو رہے ہیں۔ اکرم اور عشرت، ناصر کے مکان کے سامنے کھ[ڑے] آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ عشرت شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اس کے ہاتھ میں سلیم کی ایک نہایت اور قیمتی بندوق ہے۔

اکرم۔ عشرت دیکھو اس کی صرف ایک ہی نظر اپنے چہرے پر پڑنے دینا۔ اگر اس نے تمہیں اچھی طرح سے دیکھ [لیا تو] تمہاری جان کی خیر نہیں۔ مگر ایسی جلدی بھی نہ کرنا کہ وہ تمہیں دیکھ ہی نہ سکے۔ بس ایک نظر میں تو وہ سلیم ہی سمجھے گا۔ واللہ اس وقت مجھے خود دھوکا ہو رہا ہے۔ وال[...] [illegible]

[illegible]

میں گزر رہی ہے ۔ یہ آپ نے خوب کیا کہ سلیم کی بندوق اور لباس حاصل کر لیا۔

اکرم ۔ ہاں اسی لئے تو میں نے اپنے آدمی کو ان کے ہاں نوکر کرا دیا تھا کہ وقت پر کام آئے ۔ اچھا خدا حافظ۔

عشرت دبے پاؤں ناصر کے مکان میں داخل ہؤا ۔ اکرم کے آدمی نے دروازہ کھلا ہی رکھا تھا ۔عشرت اُس کے پیچھے ہو لیا ۔ وہ اُسے ناصر کے کمرے کے سامنے چھوڑ کر چلا گیا ۔عشرت اندر داخل ہؤا ۔ ناصر گہری نیند سو رہا تھا ۔ پلنگ کے پاس ہی تپائی پر ٹائم پیس پڑا تھا ۔عشرت نے پہلے تو بندوق کا رُخ ناصر کے سینے کی طرف کیا اور پھر ایک ہاتھ مار کر ٹائم پیس تپائی سے نیچے گرا دیا ۔ اس آواز سے ناصر بیدار ہو گیا ۔لیمپ کی دھیمی روشنی میں اس کی نگاہیں عشرت کے چہرے پر پڑیں ۔ اس نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ کہا "سلیم"۔ عشرت نے بندوق کو وہیں پھینکا ۔ اور نہایت سرعت کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

ناصر چند لمحوں تک تو سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کیا ہؤا ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے حواس بجا ہوئے ۔ اُس نے کہا "یہ سلیم نے کیا کیا؟ وہ میری جان لینا چاہتا ہے! اُس سے اس کا کیا مقصد تھا"؟ ۔ اُسے فوراً اکرم کی باتیں یاد آ گئیں ۔ اُسے خیال آیا کہ سلیم میرے روپے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ۔ اس خیال سے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی ۔ وہ سر کو پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور یوں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا ۔"اُف! سلیم واقعی دغاباز نکلا ۔ آہ آج مجھ پر کس قدر تلخ حقیقت منکشف ہوئی ۔ میں نے کیا دیکھا جس کے دیکھنے کی مجھے کبھی اُمید نہ تھی ۔ کیا دنیا میں محبت کا یہی بدلہ ملا کرتا ہے؟"

وہ اُٹھا اور سلیم کی بندوق ہاتھ میں لے کر کہنے لگا ۔" یہ بندوق میں نے اُسے اسی لئے تحفتہً دی تھی کہ وہ اس سے مجھی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے"۔ دفعتہً اُس کے دل میں غیض وغضب کا طوفان اُمنڈ پڑا ۔ اس شخص کے لئے جس سے اُس نے بھائیوں سے بڑھ کر محبت کی تھی لیکن جو ایسا کمینہ نکلا کہ اس نے اس محبت کی کچھ قدر نہ کی ۔ جس کی پست فطرت اس محبت کو بالکل نہ سمجھ سکی ۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر چاروں طرف سلیم کو دیکھا لیکن اسے کہیں نہ پا کر وہ اُس کے کمرے کی طرف گیا۔

سلیم دردِ سر کی شدت سے ابھی تک سو نہ سکا تھا ۔ وہ پلنگ پر پڑا کروٹیں لے رہا تھا ۔ ناصر کو دیکھ کر بولا " اوہ ناصر! تم نے اس وقت کیوں تکلیف کی ۔ میں بالکل اچھا ہوں ۔ یونہیں سر میں خفیف سا درد ہو رہا ہے "۔

(گرج کر) " اب تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے ۔ میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا ۔ لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ دغاباز احسان فراموش یوں کسی بے گناہ کی جان لے ۔ اُس نے تمہارے ہی ہاتھوں مجھے بیدار کرا دیا ۔ اب یہ کہ تم صبح ہی یہاں سے چلے جاؤ ۔ چونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اس لئے میں تمہیں کوئی نقصان

نہیں پہنچانا چاہتا۔ کیونکہ مجھ میں کچھ انسانیت ہے میں تمہاری طرح حیوان نہیں ہوں"۔

سلیم نہایت تعجب سے یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بہتیرا ہی ناصر کو اپنی بے گناہی کا یقین دلایا۔ لیکن ناصر نے اسکی ایک بات نہ مانی۔

اس واقعہ سے ایک روز پہلے ناصر کو ایک گمنام خط ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ "سلیم تمہاری جان لینا چاہتا ہے" اس کے ساتھ ہی سلیم کو بھی اس مضمون کا ایک خط ملا کہ "ناصر اب تم سے بہت اُکتا گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں گھر سے نکال دے۔ چنانچہ وہ عنقریب کسی حیلے کے ساتھ تمہیں اپنے سے الگ کر دے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم خود ہی اسے چھوڑ دو تاکہ اُس وقت ندامت نہ اٹھانی پڑے"۔

اس وقت تو ان دونوں نے ان خطوں کے مضمون کا خیال نہ کیا۔ لیکن آج انہوں نے ان پر یقین کر لیا۔ سلیم نے ارادہ کیا کہ جس طرح ناصر نے میری محبت کو ٹھکرا دیا ہے۔ اب میں کبھی اسے صورت نہ دکھاؤں گا۔ اُس نے فوراً وہاں سے رخصت ہونے کی تیاری شروع کر دی اور صبح تک بالکل تیار ہو گیا۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہونے لگا۔ تو اُس کی آنکھوں کے سامنے گذشتہ اٹھارہ سال کا تمام نقشہ کھنچ گیا۔ اس نے بہتیرا ضبط کرنا چاہا مگر آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ اُبل پڑا۔ وہ بڑی دیر تک روتا رہا۔ آخر اٹھا اور یہ سوچ کر کہ آخری مرتبہ ناصر کو بھی دیکھ لوں اُس کے کمرے کی طرف گیا ناصر کمرے میں نہایت اضطراب کے ساتھ اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ اسے اس وقت جو روحانی تکلیف پہنچ رہی تھی وہ اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ سلیم اُس کے قریب گیا اور بولا "میں اُس محبت کا جو آپ نے آجتک مجھ سے کی تھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چونکہ اب آپ مجھے محبت کے قابل نہیں سمجھتے۔ اس لئے میں آئندہ آپ کو کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ میں اس لئے یہاں آیا ہوں کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے بے وفا دوست کو دیکھ لوں"۔ ناصر نے کہا "سلیم! اب اس دیدہ دلیری سے مجھے زیادہ تکلیف نہ پہنچاؤ، میرا دل پک گیا ہے، اب میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔ میں بہت ضبط کر رہا ہوں جو تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ مگر تم میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھے اور تنگ کر رہے ہو سلیم! اگر میں تمہاری بندوق اپنے کمرے میں گری نہ پاتا تو بخدا! مجھے تم پر اس قدر بھروسا تھا کہ میں اپنی آنکھوں کا بھی اعتبار نہ کرتا۔ مجھے تم پر ایسی امید نہ تھی بلکہ میں تو یہ بھی خیال نہ کر سکتا تھا کہ تم کبھی مجھ سے جُدا ہو گے"۔

سلیم نے ایک حسرت بھری نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہاں سے نکل کر وہ اُس ندی کے کنارے جو اُن کے مکان کے قریب ہی بہتی تھی، درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچا۔ یہ جگہ ان دونوں کو بہت پسند

تھی۔ اور اکثر شام کا وقت وہ یہیں گزارا کرتے تھے۔ اس نے ایک وداعی نظر اُس جگہ پر ڈالی اور باچشم نم وہاں سے چلا آیا۔
سلیم کی گاڑی جب وہاں سے روانہ ہوئی تو ناصر اسے کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ جب گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو وہ پلنگ پر گر پڑا اور بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک وہ یونہیں رویا کیا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ میں کس قدر بیوقوف ہوں جو اپنے دشمن کے لئے رو رہا ہوں۔ اُس نے تو اٹھارہ سال کے رشتۂ محبت کو دولت کی خاطر اس بے دردی سے توڑ ڈالا اور میرے دل میں ابھی تک اُس کی محبت باقی ہے۔ مجھے اب اسے بھول جانا چاہیئے۔"

سلیم نے قریب ہی ایک قصبہ میں رہنے کے لئے مکان لے لیا۔ اب اُسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتا تھا۔ اس کا مکان جس سڑک کے کنارے واقع تھا اُس پر سے وہ اور ناصر شکار کی غرض سے کئی دفعہ گزر چکے تھے۔ سلیم تمام دن کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر گزرنے والی گاڑیوں کو دیکھا کرتا۔ اس امید پر کہ شاید کبھی ناصر ادھر سے گزرے اور وہ اسے ایک نظر دیکھ لے۔ ہر دور سے آنے والی گاڑی پر اس کی منتظر آنکھیں جم جاتیں۔ اس کے تاریک دل میں اُمید کی ایک کرن چمک اُٹھتی۔ لیکن افسوس کہ اُس کی نگاہیں کبھی کامیاب نہ ہوتیں۔
ناصر نے سلیم سے جدا ہونے کے بعد گھر سے نکلنا ترک کر دیا۔ وہ نہ کبھی سیر کو جاتا نہ شکار کو۔ اکرم کبھی اُس کے پاس آتا اور نہایت ہمدردی سے کہتا "آپ کیوں اس قدر افسردہ خاطر رہتے ہیں۔ آپ کی صحت بہت خراب ہو رہی ہے خدا کے لئے اپنے حال پر رحم کیجیئے"۔ وہ جواب دیتا "اکرم! میرے دل سے اُس بے وفا کی محبت نہیں نکل سکتی جس نے میری زندگی میں داخل ہو کر چند سال کے لئے اسے نہایت خوشگوار اور پر لطف بنا دیا تھا۔ خواہ اُس نے مجھ سے بے وفائی کی لیکن پھر بھی میں باوجود ہزار کوشش کے اُسے نہیں بھول سکتا"۔

ایک دن اکرم نے سوچا کہ اب وحید کو اپنا کارنامہ سنانا چاہئے۔ یہ سوچتے ہی اُس نے وحید کے پاس جانے کی تیاری شروع کی دوسرے روز وہاں جا پہنچا اور اُس سے کہا "لو میں نے سلیم اور ناصر پر فتح پا لی ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ آؤ کہ سلیم ناصر کے پاس نہیں ہے"۔ وحید کو یہ سن کر سخت رنج ہؤا۔ لیکن اس نے اکرم سے اپنا رنج چھپایا اور ہنس کر کہا "بھئی بڑے حضرت ہو۔ لیکن یہ تو کہو یہ ہؤا کیونکر؟"۔ اسی طرح تدبیر کے ساتھ تمام بات اُس سے معلوم کر لی کہ کس طرح اس نے سلیم اور ناصر کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اکرم کے جاتے ہی وحید نے یہ تمام واقعہ ناصر اور سلیم کی طرف الگ الگ خطوں میں لکھ دیا۔
ناصر کو جب یہ خط پہنچا تو خوشی اور رنج کی دو متضاد کیفیتوں سے اس کی عجیب حالت ہوگئی۔ کبھی وہ اس بات سے

خوش ہوتا کہ سلیم بے گناہ ہے اور وہ دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے ملنے والے ہیں اور کبھی اس بات سے اسے رنج پہنچتا کہ اُس نے سلیم کے دل کو کس طرح توڑ ڈالا تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اسی دن سلیم کے پاس جاکر اس سے معافی مانگے اور اسے پھر اپنے پاس لے آئے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آکر اس کے ہاتھ میں ایک خط دیا۔ لفافہ پر سلیم کی تحریر دیکھ کر ناصر نے نہایت اضطراب سے لفافہ چاک کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔ "میں دنیا میں صرف چند گھنٹے کا مہمان ہوں۔ اور مرنے سے پہلے ایک بار آپ کو دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ آپ مجھے بھول چکے ہیں اور مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ آپ سے اس استدعا کے پورا ہونے کی اُمید رکھوں۔ لیکن میں آپ کو اُس بھولے ہوئے عہد محبت کا واسطہ دیتا ہوں (جب کہ آپ مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور میری ہر آرزو کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے) کہ میری آخری تمنا پوری کردیجیئے"۔

یہ خط پڑھکر ناصر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ رونے لگا اور بولا "سلیم! خدا نہ کرے اب تم مجھ سے جدا ہو۔ خدا تمہیں زندہ رکھے"۔

ناصر گھبرایا ہؤا سلیم کے کمرے میں داخل ہؤا اُس نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا کہ سلیم اب آخری سانس لے رہا ہے۔ ملازم نہایت افسوس سے اپنے مہربان آقا کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور ڈاکٹر اُسے وحید کا خط سنا رہا تھا۔

ناصر کی طرف دیکھ کر سلیم نے کہا "ناصر! تم آگئے، میری روح تمہیں دیکھنے کے لئے بے قرار تھی، اور تمہارے ہی انتظار میں وہ میرے جسم سے اب تک جدا نہ ہوسکی۔ اب میں اطمینان سے مرسکوں گا۔ یہ موت اور یہ چندروزہ جدائی مجھے سب ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ ناصر! میری روح تم سے اب بھی جدا نہ ہوگی۔ میری محبت، میری دعائیں عمر بھر تمہارے ساتھ رہیں گی"۔ وہ پلنگ سے اُٹھ کھڑا ہؤا۔ ناصر نے یہ کہتے ہوئے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا "سلیم مجھ بدنصیب کو معاف کردو۔ مجھے تم سے اسی طرح محبت ہے، اور میں نے تم سے جدا ہونے کے بعد کبھی چین نہیں پایا"۔ سلیم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ہاں میں نے تمہیں معاف کردیا مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم بے گناہ تھے۔ ناصر نے سلیم کو پلنگ پر لٹانا چاہا۔ لیکن سلیم کے بازو اُس کی گردن کے گرد سخت ہوگئے۔ ناصر نے بمشکل اُسے اپنے سے علیحدہ کرکے بستر پر ڈال دیا۔

سلیم ایک بے جان جسم تھا، مگر اُس کے سفید ہونٹ متبسم تھے۔ ناصر نے جھک کر اُس کی نیم وا آنکھیں بند کردیں اور اُس کی پیشانی کو چوم لیا +

ع۔ ب

میری جھونپڑی

سب وسعتوں سے آگے اک ارضِ رنگ و بو ہو
ہو دور اِس جہاں سے نزدیک بزمِ ہو ہو
انسان کا تصوّر معذورِ جستجو ہو
اُس خلوتِ سکوں میں دنیائے آرزو ہو
خاموشِ زندگی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب محملِ شفق میں لیلائے شام آئے
دوشیزۂ سکوں جب بالائے بام آئے
جب کاروانِ انجم مستِ خرام آئے
جب سازِ خامشی سے "شب کا پیام آئے"
اک مستِ تیرگی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب مسکرا رہے ہوں زریں ضیا ستارے
جب گیت گا رہے ہوں کچھ نغمہ زا ستارے
جب تھرتھرا رہے ہوں مستِ حیا ستارے
جب جھلملا رہے ہوں جانِ ضیا ستارے
ہلکی سی روشنی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

وہ چاند وہ حسینہ وہ تاجدارِ زریں
چھا جائے جب جہاں پہ بنکر بہارِ زریں
گردوں پہ بہ رہا ہو اک آبشارِ زریں
اٹھ اٹھ کے جھومتی ہو موجِ خمارِ زریں
پُرکیف چاندنی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب کوثرِ شفق سے موجِ شراب اُٹھے
گلریز وادیوں سے بوئے گلاب اُٹھے
وہ صبح کی "حسینہ" جب بے حجاب اُٹھے
جس وقت مسکرا کر تیرا شباب اُٹھے
تو مستِ بے خودی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب شام کی خموشی پیمانۂ سکوں ہو
دامانِ بزمِ فطرت کاشانۂ سکوں ہو
ہر منظرِ مسکّر میخانۂ سکوں ہو
اے کاش! روح میری بیگانۂ سکوں ہو
تو گیت گا رہی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب کوندتے ہوں جلوے طوفانِ رنگ و بُو میں
جب گونجتے ہوں نغمے ہیجانِ رنگ و بُو میں
جب جھومتی ہوں بوندیں نیسانِ رنگ و بُو میں
جب کھیلتی ہوں حوریں دامانِ رنگ و بُو میں
ہاں! شغلِ مے کشی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

روش صدیقی

کسرِ نفسی

پست ہمت اور اخلاق کو کمزور کرنے والے امراض میں کسرِ نفسی میں حد سے تجاوز کر جانا ایک مہلک ترین مرض ہے اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنی کم بضاعتی اور ہیچ میرزی کا ذکر بڑے ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو ذلیل، سیہ کار اور ناچیز جرم خاک کہتے ہیں حالانکہ خدا نے انہیں سلطان، امیر اور مرد و عورت پیدا کیا۔ اس لئے انہیں چاہیئے کہ اپنی نیک خلقی اور پاکیزہ سرشتی کا ذکر تشکر اور تفاخر کے ساتھ کریں۔

خدا تعالےٰ نے انسان کو بلند فطرت بنایا۔ تاکہ وہ قدرت کی مخالف قوتوں کا مقابلہ عزم و استقلال سے کر سکے اپنی تذلیل و تحقیر کرنا اُس کی بارگاہ میں انتہا درجہ کی ناشکر گزاری اور بدترین گناہ ہے۔

تذلیلِ نفس کی عادت اخلاقِ فاضلہ کے حق میں سم قاتل ہے۔ انسان اپنی نگاہوں میں خود بے اعتبار ہو جاتا ہے آزادی اور اطمینان ضایع ہو کر وہ بے ریڑھ کی ہڈی کا ڈھانچ رہ جاتا ہے۔ پاکیزہ سیرتی اور خوش اخلاقی جو شریف طبیعت کا خاصہ ہے تباہ ہو جاتی ہے۔

اکثر لوگوں کی افتاد ہی ایسی ہوتی ہے کہ مجلس میں وہ سب سے پیچھے اور حتے الوسع ایسے مقام پر بیٹھتے ہیں جہاں لوگوں کی نظریں اِن پر نہ پڑیں انسان فطری طور پر تذلیلِ نفس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ وہ آزادانہ طور پر زندگی بسر کرے۔ اُس کے خیالات آزاد ہوں اور اپنے تئیں وہ ہر لحاظ سے اشرف المخلوقات کہلانے کا اہل بنائے۔ دنیا بھی ایسے آدمی سے محبت کرتی ہے۔

اس مرض کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تمہاری طبیعت ایسے لوگوں سے تنفر ہو چکی ہے جو اپنے تئیں حقیقت سے کہیں بڑھ کر ظاہر کرتے ہیں تم متواتر ان کو ذلیل و خوار دیکھ کر قابلیت کے اظہار سے بھی نفرت کرنے اور اپنے آپ کو ہیچ اور ناچیز شمار کرنے لگتے ہو۔ لیکن یاد رکھو کہ تذلیلِ نفس سے نہ کوئی دنیا میں کامیاب ہؤا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے اور اپنی قابلیت کے صحیح اندازہ کے بعد اپنی ذات پر اعتماد کرنے میں بہت فرق ہے۔

اپنی عزت آپ کرنا اور اپنے متعلق اعلےٰ خیالات رکھنا انسان کو گناہ کی خواہش ہی سے نہیں بچاتا بلکہ اُس کو ناکامی کی تلخی سے بھی آشنا نہیں ہونے دیتا۔ اُس شخص سے جو اعلےٰ خیالات رکھتا ہے کبھی کمینہ حرکات سرزد نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ خفیہ سازشوں اور ذلیل کوششوں کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

دنیا کی نظر میں تمہارا رتبہ کچھ بھی ہو۔ تم کبھی اپنی تحقیر نہ کرو اگر زر و مال جاتا ہے تو جانے دو۔ جائداد تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے ہر شے سے مفارقت اختیار کرو۔ لیکن خدا کے لئے خود داری کو ہاتھ سے نہ دو۔ (سویٹ مارڈن)

محمد حنیف

تیری یاد میں

آہ بھر بھر کے تجھے یاد کیا کرتا ہوں
دل کو اس طرح سے برباد کیا کرتا ہوں

میری آنکھوں میں رہے میرا ستارہ یارب
شب کو رو رو کے یہ فریاد کیا کرتا ہوں

تیرا فرماں تھا کہ اُلفت میں مری خوش رہنا
غم سے اپنے تجھے ناشاد کیا کرتا ہوں

جب سے میں تیری محبت میں گرفتار ہُوا
ہر گرفتار کو آزاد کیا کرتا ہوں

دلِ غمگیں کو ترے شاد کرے تا کہ خدا
غم زدہ جو ہیں اُنہیں شاد کیا کرتا ہوں

سنگ دل جو ہیں اُنہیں دل دئے جائیں دے کر
اُن کی بیداد پہ بیداد کیا کرتا ہوں

شام ہوتی ہے تو میں حُسنِ تصور سے ترے
دل کے ویرانے کو آباد کیا کرتا ہوں

اُسے معلوم ہے کیا شے دلِ بیدل ہے بہارؔ
آہ بھر بھر کے جسے یاد کیا کرتا ہوں

بہار

سرابِ نظر

وہ تھیئیٹر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

رائیلے نے اُسے پکڑ لیا اور اندر داخل ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے کہا "نہیں برونو! یہاں نہیں! طرب گاہوں میں اُس کی تلاش بے سود ہے"۔

مگر شکستہ دل ملاح نے جو اپنی بیوی کی جدائی میں دیوانہ ہو رہا تھا نہایت روکھے پن سے اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑا لیا اور ایک عزمِ آہنی کے ساتھ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا "تم چاندی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کھو کر اُسے ادھر اُدھر ڈھونڈتے پھرتے ہو اور میں جس کا خزانہ لُٹ گیا اُس کو تلاش نہ کروں"۔

برونو اپنی بیوی کو عصمت کی دیوی اور نیکی کا فرشتہ سمجھتا تھا وہ اُسے تمام گرجوں اور خانقاہوں میں، آبادی کے ہنگاموں اور جنگل کی عزلتوں میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ برونو کا دوست رائیلے اُس کے اِس جنون میں اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ رائیلے کو معلوم ہو چکا تھا کہ میڈیلون اسی تھیئیٹر میں ایکٹریس کی حیثیت سے کام کر رہی ہے اور اس لئے وہ برونو کو ہر ممکن طریقے سے وہاں جانے سے روک رہا تھا۔ رائیلے کو یقین تھا کہ برونو اُس بیوی کو جس پر اُسے اس قدر حسنِ ظن ہے اِس پست حالت میں دیکھ بالکل ہی دیوانہ ہو جائے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ اُسے دوبارہ روک سکے برونو نے ٹکٹ والے کی طرف ایک سکہ پھینکا اور تماشائیوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

روشنی کے طوفان، موسیقی کے شور، زر و جواہر اور رنگ و زیبائش کے وفور سے برونو کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ ہجوم کے درمیان جہاں خود اُس نے اپنے آپ کو لا پھنسایا تھا ایک ستون کی مانند کھڑا تھا۔ اُس کا بلند و بالا قد سب سے اونچا نظر آ رہا تھا، اُس کی وحشت آمیز، درد مند آنکھیں ایک زخمی شیر کی طرح ہر طرف دیکھ رہی تھیں، اُس کی قمیص کا گریبان کُھل کر پیچھے کی طرف ہٹا ہوا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے سیاہ بال لہریں لیتے ہوئے اس کے گندمی چہرے کے پُرشکوہ اور سخت و درشت نقوش کی مخالف سمت چلے گئے تھے۔ وہ لوگوں کے ہنستے ہوئے ہجوم کے درمیان بالکل ایک صحرائی درندے کی مانند گھرا ہوا تھا۔

سٹیج پر پریوں کے ملک کا ایک نظارہ پیش کیا جا رہا تھا اور لوگ اُسی کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور تالیاں بجا

رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک اور گھنٹی بجی۔ اس دفعہ ایک ایسا نظارہ سامنے آیا جس میں جنگل اور پانی، سیمین چشمے اور گلاب کے تختے دکھائے گئے۔ سفید پروں والی پریاں درختوں کی ٹہنیوں پر اُڑتی پھرتی تھیں۔ اور دوشیزہ لڑکیوں کی جماعتیں جن کے لباس دنیا کے ایک ایک پھول کی طرح ترتیب دیئے گئے تھے موسیقی کی ہر لہر کے ساتھ مل مل کر رقص کر رہی تھیں۔

ریویرا کے ماہی گیر کے لئے یہ سب کچھ حقیقی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں حیرت آمیز خوف کے ساتھ اس نظارے کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے کند دماغ میں جادو کی وہ کہانیاں چکر لگا رہی تھیں جو اُس نے اپنے بچپن میں سنی تھیں جو اُن ملکوں کے متعلق تھیں جہاں اُس کے خیال کے مطابق کسی فانی انسان کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا، حیران، بےحس و حرکت۔ آواز کے زیر و بم، حرکات کی ہم آہنگی، اور روشنی کی جوت نے جو رات کی تاریکی میں سے یہاں آکر اُس کی نظر کو خیرہ کر رہی تھی اُس کے سر کو چکرا دیا +

اس تمام عرصہ میں اُس کی نظر رقص کرنے والی ہزاروں لڑکیوں کے مجموعی حسن میں سے ایک ایک کے چہرے پر متجسسانہ پڑ رہی تھی ——— اُس چہرے، کے تجسس میں جس کو وہ آج تک نہ پا سکا تھا۔

پھولوں کی کیاریوں کو پھاندتی ہوئی اور مخملیں جادوں کو طے کرتی ہوئی ایک عورت کی سراپا شوکت صورت نظر آئی جس کا لباس کنول کے پھول کی طرح سجایا گیا تھا۔ اُس کا جسم "لباس کے پھول" کی سفید اور سبز پنکھڑیوں میں بمشکل چھپ رہا تھا۔ اُس کے سنہری بال ایک جوئے زریں کی طرح لہرا رہے تھے اور اُس کی نیلی نیلی آنکھیں مسرت وانبساط سے ہنس رہی تھیں۔

کوریاس جب لپک کر "پھول لڑکیوں" کے حلقہ میں آئی تو ایسا معلوم ہوا گویا وہ ابھی اپنے اُٹھتے ہوئے شباب کی فصل بہار میں ہے۔ اور جب اُس نے گانا شروع کیا تو اُس پر کسی بلبلِ خوشنوا کے ہلکے ہلکے اور میٹھے میٹھے نغموں کا گمان ہونے لگا۔

معاً اُس کے نغموں کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی "یہ وہی ہے"!

ایک لمحہ کے لئے وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں روشنی سے چمک رہی تھیں۔ اُس کا سینہ ابھرتا تھا اور گرتا تھا۔ پھر وہ ایک ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا لوگوں کے سروں پر سے پھاندتا ہوا اور ایک نشست سے دوسری نشست پر کودتا ہوا اُس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ کھڑی تھی۔

کوریاس کے لبوں کی موسیقی گنگ ہو گئی "پھول لڑکیوں" کا حلقہ اُسے اکیلے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں مجرمانہ ہراس سے بھر گئیں۔ وہ بے قوت اور بےحرکت اُس شخص کی طرف دیکھنے لگی جس کی عزت کو

اُس نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اُدھر سازندوں پر اور حاضرین پر ایک خوف آمیز خاموشی چھا گئی۔

برونو نے اپنی باہیں اُس کے لئے پھیلا دیں۔ اور اُس کی آواز خاموشی کو لرزاتی ہوئی نکلی "میڈیلون، میڈیلون! تم جنت میں ہو اور مجھے بھلا چکی ہو! کیا یہ حقیقت ہے؟"

اُس کا سارا جسم مرجھا گیا، اُس کے اعضا کی قوت سلب ہو گئی، وہ کانپ اُٹھا اور پھر ایک سکتے کے عالم میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ہجوم کے شور وغل اور متحیر حاضرین کی چیخ اور پکار میں کیا طاقت تھی کہ وہ اُس کے کانوں تک پہنچ سکیں۔ وہ صرف اُس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جسے اُس نے اس سُنسان دنیا میں ڈھونڈھ پایا تھا ــــــ اُس عورت کی طرف جو اُس سے اجتناب کر رہی تھی اور اُس سے خوف کھا رہی تھی۔

وہ مجرمانہ دہشت جو برونو نے اس وقت اپنی بیوی کی آنکھوں میں دیکھی اُس کے دل و جگر کو ایک خنجر کی طرح چیر گئی اُس لرزا دینے والے خوف و ہراس کے ساتھ جو اس وقت اُس کے حواس میں رواں دواں تھا ایسا معلوم ہؤا کہ اُس کے ہوش پھر بجا ہو رہے ہیں۔ اُس نے اپنا سر اوپر کو اُٹھایا، اِس طرح جیسے کوئی شیر ایک جانکاہ زخم کھا کر ایک آخری بار اپنے دشمن کو دیکھنا چاہے۔ اُس نے ایک نگاہ غصے سے بھرے ہوئے اور طیش سے وارفتہ تماشائیوں پر ڈالی اور پھر ایک دفعہ اور اپنی بیوی کو دیکھا ــــــــ اُس کے برف جیسے سفید اعضا کو، اُس کے سینے کو جو اُس کی زرّیں پوشاک میں سے کھلا ہؤا اُبھر اور گر رہا تھا، اُس کے رنگ آلود حسن کو جو نزدیک سے شباب کی تمام رعنائیوں سے معرا نظر آتا تھا۔

اُس وقت اُس پر روشن ہؤا کہ یہ جنت نہیں بلکہ دوزخ ہے، اور اِس روشنی نے اُس سرابِ نظر کو جو اُس کی آدھی زندگی تک اُسے دھوکا دیتا رہا چیر کر دو ٹکڑے کر دیا۔ اُس نے اُسے پکڑ لیا، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، پھر اُس کے نرم و نازک جسم کو بھینچ ڈالا اور ایک چیخ کے ساتھ جو تمام لوگوں کے دلوں سے اس طرح گزر گئی جیسے وہ سب یک دل و یک روح تھے اُس نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف پھینک دیا۔

"تم میری بیوی نہیں ہو گو تمہاری شکل و صورت ویسی ہی ہے! آہ، اے نابکار ظالم شیطان! تو میرا منہ چڑاتا ہے۔ آہ! تو نے اُس کے ساتھ کیا کیا جس سے میری روح محبت کرتی تھی؟ تو اُس کے اعضا سے زیاں کاروں کی آنکھوں کی دعوت کرتا ہے، تو اُس کا حسن شہوت پرست ہجوم کے درمیان لٹاتا ہے اور وہ ہونٹ جو صرف میرے چومنے کے لئے تھے تو اِن تماشائیوں کے سامنے پیش کرتا ہے،! مجھے بتا! وہ روح کہاں ہے جس کی میں پرستش کرتا تھا؟ وہ زندگی کہاں ہے جس سے مجھے محبت تھی؟ وہ خدا کی تھیں۔ تو اُن پر اپنا تصرّف نہ کر سکتا تھا! وہ اُسی کے ہاتھ میں ہیں تو اُن پر اُس کے جسم کی طرح قبضہ نہ کر سکتا تھا!

ایک پل کے لئے وہ اِس طرح کھڑا رہا جیسے ایک جوانمرد سینے میں گولی کھا کر کھڑا رہتا ہے۔ پھر اُس کی شعلہ بار نکھیں جنہیں اب کچھ نظر نہ آتا تھا اُن گروہ در گروہ تماشائیوں پر اٹھیں جو اب اپنی نشستیں چھوڑ چکے تھے۔ اُس کے ہرے پر اس وقت نامرادی و ناکامی کی ایک ناقابلِ اظہار شان نمایاں تھی۔ اُس کے ٹوٹے ہوئے دل سے ایک زور ی چیخ نکلی، پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے سر کی طرف لے گیا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اُس کی پیشانی س کی بیوی کے سینے پر آ رہی۔ اُس کے منہ سے لہو جاری ہو گیا اور اس خون سے نرگس کے وہ پھول جو اُس کی بیوی کے لباس میں پروئے گئے تھے سُرخ ہو گئے۔ جب لوگوں نے اُسے اُٹھایا تو وہ مر چکا تھا ــــــ وہ یس سال سے مر رہا تھا +

"اودا"

منصور احمد

غزل

کر گئے کام ولولے دل کے	قیس ہے ساتھ ساتھ محمل کے
توبہ کر بیٹھے مے کشی سے وہ	بن گئے جام جب مری گل کے
رکھ کے آنکھوں پہ لے گئے عشاق	سارے حلقے مری سلاسل کے
اب وہ طوفانِ زندگی کیسا	موج آغوش میں ہے ساحل کے
کس قدر تُند تھی شرابِ عشق	ہو گئے ٹکڑے شیشۂ دل کے
کیوں نہ بھٹکیں مسافرانِ عدم	پھیریں آ گئے ہیں منزل کے
موجزن ہے حیات کا طوفاں	قطرہ قطرہ میں خونِ بسمل کے
گل کھلاتی رہی چمن میں بہار	زخم جب تک ہرے رہے دل کے
اللہ اللہ رے خمارِ ستم!	لڑکھڑاتے ہیں پاؤں قاتل کے
کر دیا فاش رازِ ناخنِ غم	کھول کر عقدے میری مشکل کے
اٹھتے جاتے ہیں باری باری سے	بیٹھنے والے تیری محفل کے

چھٹ گیا دامنِ امید تپشؔ
رہ گئے خالی ہاتھ سائل کے

شیخ عبداللطیف تپشؔ بی اے

محفلِ ادب

ارتقائے حقیقت

جناب رگھوپت سہائے صاحب فراق بی۔ اے کی یہ نظم ٹامس ہارڈی کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے جس کے بحر و قوافی کی ترتیب وہی ہے جو اصل نظم میں ہے۔ جناب فراق کہتے ہیں کہ انگریزی نظموں کے ترجمے اردو نظم میں اکثر ہوئے ہیں لیکن غالباً یہ امر پہلی بار اس ترجمے میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ ترجمہ کا ہر مصرع اُسی بحر میں ہو۔ جس بحر میں اصل مصرع ہے۔

(نغمۂ ماہ و سال) (۱)

اب تک کھُل نہ سکا یہ راز

کیوں ہے عالمِ سوز و گداز

کیوں قدرت نے

کیوں فطرت نے

ہر اک شے سے چھیڑ دیا ہے درد بھرا یہ نغمۂ ساز

(۲)

بے حس و بے جان

کچھ تغیر

خوابِ پریشان

کی تصویر

بے خبر اِس سے کہ ہے کس حال میں ذی احساس ہر اک دلگیر

(نغمۂ ترحم) (۳)

کیا ہو گی نہ یہ ظلمت دور

کیا ہو گی نہ یہ غفلت دور

رفتہ رفتہ

درجہ بدرجہ

کیا نہ دلِ فطرت بدلے گا ہو کے محبت سے مجبور

(۴)

جو یہ حالت

یوں ہی رہی

جو یہ اذیت

کٹ نہ سکی

مٹ کے فنا ہو جائے تو اچھا ہر چلتی پھرتی ہستی

(آخری ترانہ) (۵)

لیکن کچھ ہے فضا لرزاں

جوشِ تموّج سے ہے عیاں

ساری بلائیں

غم کی صدائیں

مٹ جائیں گی اور نہ چلیں گے دُکھتے دلوں پر پھر پیکاں

فطرت کو جوش آئے گا دنیا ہو جائے گی رشکِ جناں

"نگار"

افلاطون کا فلسفۂ عشق

جب وہ عارف، جو عالمِ عینی کا گہرا مشاہدہ کر چکا ہے، کسی حُسن کے دیوتا کے چاند سے چہرے میں حسنِ حقیقی کا جلوہ دیکھتا ہے یا کسی قدِ موزوں کی دلفریبی پر نظر ڈالتا ہے، تو وہ سارے بدن سے لرز اُٹھتا ہے۔ اور اُس پر ویسی ہی مقدس ہیبت طاری ہو جاتی ہے جیسی حسنِ مطلق کے نظارہ سے ہوتی ہے۔ اُس وقت وہ اُس نوجوان، اُس خدائے حُسن کی دل و جان سے عبادت کرتا ہے بلکہ اگر اُسے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ اُسے احمق سمجھیں گے تو وہ اُس کے سامنے قربانی کرتا، جس طرح کسی بُت یا دیوتا کے سامنے کی جاتی ہے۔ اِس نظارہ کے عالم میں اُس پر عجیب و غریب واردات گزرتی ہے۔ اُس کے جسم کا ارتعاش جاتا رہتا ہے [اُس] کی جگہ بے انتہا حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ پسینہ میں ڈوب جاتا ہے۔ حُسن کی کرنیں آنکھ کی راہ اُس کے وجود میں [داخل ہو] جاتی ہیں اور مرغِ روح کے گرد ایک جال سا بنا کر اُس کے بازوؤں کو گرما دیتی ہیں۔ یہ گرمی ساری سختی اور جمود کو جن سے [بازو]وں کے نکلنے میں رُکاوٹ تھی پگھلا دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بازوؤں کی جڑیں حرارت سے غذا پا کر پنکھ بن جاتی ہیں [او]ر پنکھ میں پر جم آتے ہیں۔ کیونکہ روح میں کسی زمانہ میں پر لگے تھے۔ وہ مجسّم بال و پر تھی۔ غرض روح گرمی سے کھولنے [او]ر اُبلنے لگتی ہے اور جس طرح بچوں کے مسوڑوں میں دانت نکلتے وقت گُدگدی اور ٹیس ہوتی ہے۔ اسی طرح روح میں بھی [پر] نکلتے وقت میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے اُسے بخار سا محسوس ہوتا ہے اور تپک اور ٹیس۔ جب کبھی اُسے معشوق کے حُسن کا نظارہ [نظ]ر آتا ہے۔ اُس کے آرزو کی کلی کِھل جاتی ہے حُسن کی حرارت سے گرما کر وہ درد سے نجات پاتی ہے اور خوب ہنستی کھیلتی ہے، [لیکن] محبوب سے جدا ہوتے ہی وصل کی پیاسی روح پھر تڑپنے لگتی ہے۔ بازوؤں کی جڑیں سُوکھ کر بند ہو جاتی ہیں۔ اِس [لئ]ے پنکھ حرکت نہیں کر سکتے۔ اب مقید آرزو اور جکڑے ہوئے پر و بال نبض کی طرح اُچھلتے ہیں اور زنجیروں کو توڑ کر نکلنا [چ]اہتے ہیں۔ اس لئے روح جس میں ہر طرف سے نشتر چبھ رہے ہیں درد سے بے چین ہو جاتی ہے۔ اگر کسی چیز سے فرحت [ہو]تی ہے تو معشوق کی یاد سے۔ لذت اور درد کے یوں مل جانے سے روح اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتی ہے، نہ رات کو [نی]ند آتی ہے نہ دن کو چین آتا ہے۔ آرزو کی بے تابی کھینچ کر وہاں لے جاتی ہے۔ جہاں حسن کے مالک کو ایک نظر دیکھنے کی [ا]مید ہو۔ جب روح اُسے دیکھ لیتی ہے اور آرزو کو نکلنے کی راہ مل جاتی ہے۔ تب جا کر قیدیوں کو رہائی اور تازہ ہوا میں سانس [لی]نا نصیب ہوتا ہے۔ روح کانٹوں کی خلش سے نجات پاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے بے پایاں مسرّت کے مزے لیتی ہے۔

"تعلیم و تربیت"

ایک تاریخی انکشاف

گذشتہ سال کے ماہ ستمبر میں۔ رومۃ الکبریٰ کے جو سکّے انگلستان میں برآمد ہوئے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے

انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان میں روما کے عہدِ حکومت کے سب سے بڑے ماہر پروفیسر آر۔جی۔کولنگ وڈ کا خیال ہے کہ ان سکوں کا وجود انگلستان میں روما کے دورِ حکومت کی تاریخ کو پلٹ دے گا۔ اور دوسری تاریخ لکھنی پڑیگی کیونکہ مورخین نے اپنے قیاسات کی بنا پر جو تاریخ لکھی ہے وہ غلط ہے اور جو تاریخ انہوں نے مرتب کئے ہیں وہ قطعی بے دلیل ہیں

پروفیسر موصوف کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ تاریخِ انگلستان کا سنگِ بنیاد اکھاڑ پھینکا جائے گا، اور جدید معلومات کی روشنی میں نئی بنیاد رکھی جائے گی۔

علمِ تاریخ کے شیدائی منتظر ہیں کہ دیکھیں تجدیدِ تعمیر کس ڈھب سے ہوتی ہے اور انگلستان کی قدیم تاریخ کے بدل جانے سے وہاں کے محققین اور ماہرین کے کمالات کی قلعی کس شان سے اترتی ہے۔

"شمع"

قرآنِ پاک عرب عیسائی کی نگاہ میں

فلسطین میں سرکاری مدرسوں کے اعلےٰ مدرسین کی کانفرنس اس غرض سے منعقد کی گئی تھی کہ فلسطین کے مدارس کا نظام و نصاب مقرر کیا جائے۔ اس کانفرنس میں استاذ انیس صیداوی نے جو مسیحی ہیں اور یافہ کے مدرسہ ثانویہ کے مدرس اعلیٰ ہیں یہ تجویز پیش کی کہ سرکاری مدرسوں کے اعلےٰ درجوں میں قرآن کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ تاکہ عیسائیوں کی آئندہ نسل قرآن کی بلاغت کے فائدہ سے محروم نہ رہے اور اُن کی زبان درست ہو اور ملکۂ زبان حاصل ہو۔

سامریوں کی تورات

سامری فرقے کے اُن موسیوں کے پاس جو نابلس (شام) میں رہتے ہیں، حضرتِ موسےٰ کی پانچوں کتابوں کا سب سے قدیم نسخہ موجود ہے۔ جو مطبوعہ اور مشہورہ نسخہ سے جو موجودہ یہودیوں کے پاس ہے مختلف ہے۔ سامریوں کا دعوےٰ ہے کہ یہ نسخہ حضرتِ موسےٰ کی اولاد میں سے ایک کا لکھا ہوا ہے، اور یہ بنی اسرائیل کے کنعان میں داخل ہونے کے تھوڑے دن بعد لکھا گیا تھا۔

"معارف"

چینی مزدوروں کے گیت

میری بڑی بہن کپڑا بُنتی ہے۔ میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ کپڑا بیچتا ہے اور چاول خریدتا ہے، ہمارے خالی پیٹ بھرنے کے لئے۔

میری بڑی بہن کپڑا بُنتی ہے، میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کے کپڑے پھٹے رہتے ہیں مگر ان کو پیوند لگانے کے لئے کوئی کپڑا نہیں ملتا۔

میری بڑی بہن کپڑا بنتی ہے، میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ کپڑا کون خریدتا ہے؟ وہ امیر آدمی جو سامنے رہتا ہے بدیسی کپڑا سستا ہے، دیسی کپڑا سخت ہے۔ بدیسی کپڑا عمدہ ہے امیر آدمی اُسی کو خریدتا ہے۔ دیسی کپڑا کوئی نہیں پہنتا میرا بھائی اور میری بہن بھوکے مرتے ہیں۔

(۲)

تم چاول بوتے ہو، میں کپڑا بنتی ہوں، وہ اینٹیں بناتا ہے۔ ہینگ ہو۔ ہینگ ہو۔ ہینگ ہو۔

آٹھ گھنٹے کام، آٹھ گھنٹے آرام، آٹھ گھنٹے مطالعہ، سب جو محنت اور مشقت کرتے ہیں انسانوں کے سے دماغ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پڑھنا سیکھو۔

کتابیں پڑھو، مزدور احمق نہیں ہے، پڑھو اور سیکھو، سیکھو اور پڑھو۔

آٹھ گھنٹے مطالعہ، آٹھ گھنٹے آرام، آٹھ گھنٹے کام، سب جو محنت اور مشقت کرتے ہیں انسانوں کا سا دماغ پیدا کرنا چاہتے ہیں ✦

تبصرہ

تجلّی سفید رنگ کا سرمہ ہے جو آنکھوں کے تمام عوارض کے لئے مفید تسلیم کیا گیا ہے۔ جناب موجد نے اس سرمہ کا ایک پیکٹ ہمارے پاس بھیجا تھا جسے ہم نے دو تین ضرورت مند اشخاص میں تقسیم کر دیا۔ استعمال کے بعد سب نے تعریف کی ہے۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو وہ ایک مرتبہ ضرور اس سرمہ کو آزمائیں۔ قیمت پانچ روپے فی تولہ ہے۔ تین ماشے سے کم روانہ نہیں کیا جاتا۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر کارخانہ تجلّی۔ شاہ دولہ گیٹ ۔ گجرات (پنجاب)

جامِ صہبائی

حضرت اثرؔ صہبائی کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی حیات افروز اور روح پرور رباعیات ملک کے مختلف بلند پایہ رسائل میں شائع ہو کر نقادانِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ "جامِ صہبائی" کی خوبیوں کی ضمانت کیلئے حضرت اثرؔ کا نام ہی کافی ہے۔

قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:- چوہدری جلال الدین اکبر۔ الرحمٰن بلڈنگ بیرون بھاٹی دروازہ۔ لاہور

دِق کے لئے

موجودہ دنیا میں ہماری مشہور و معروف دواسے بہتر اور کامیاب دوا پیش کرنے والے کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائیگا مرض کسی وجہ سے ہو اور دق خواہ کسی درجہ پر پہنچ گئی ہو اگر جان باقی ہے تو ہم شافیِ مطلق کے فضل سے مریض کو موت کے منہ سے واپس لانیکا ذمہ لیتے ہیں۔ ضرورتمند اصحاب مزید تفصیل ایک کارڈ لکھکر معلوم کریں۔ المشتہر

مینیجر کوثر فارمیسی دہلی

بیدارِیِ ہند

یعنی

کارنامہ مہاتما گاندھی

ہندوستان کے معزز اخبارات و رسائل نے اس کتاب پر جو تنقید و تبصرہ کیا ہے وہ طلب کرنے پر مفت روانہ ہوگا۔ جس کے مطالعہ سے آپ پر اس کتاب کی پوری حقیقت واضح ہوجائیگی

ملنے کا پتہ

دار الاشاعت بیداری ہند۔ میرٹھ

نئے سال کے آمد کی خوشی مین اس گھڑی کے خریدار کو
اٹھارہ چیزین انعام مین مفت
بطور تحفہ اس گھڑی کے خریدار کو آخر فروری تک
انعام میں بلا قیمت دیجائینگی
سونے کا ملمع کی ہوئی یادگار لیور واچ
اس گھڑی کے پرزے مضبوط ہین مشین لیور ہی۔ سونے کا پایدار ملمع کیا ہوا ہی۔ جو مثل
سونے کے چمکتا ہی۔ اور عرصہ تک قائم رہتا ہی۔ یہ گھڑی ہم نے اپنے خاص آرڈر سے منگائی ہی
جو دیکھنے مین پچیس ۲۵ روپے سے کم کی نہیں معلوم ہوتی۔ فیشن ایبل جنٹلمین سائز کی نہایت پاک بناوٹ کی گھڑی ہے۔ ٹائم نہایت درست
بتاتی ہی۔ ایک عدد ضرور منگائیے۔ قیمت معہ اٹھارہ انعامی چیزون کے چھ ۶ روپے۔ محصول علاوہ۔ گارنٹی دو ۲ سال۔
ہوشیار خبردار
دیکھئے فوراً فرمائش بھیجئے۔ ورنہ تاریخ مقررہ گذر جانے بعد چھ ۶ روپے مین صرف گھڑی ملے گی۔ انعام نہیں ملے گا
فہرست انعامی اشیا سنہری نگینہ دار انگوٹھی ایک ۱ دستی آئینہ ایک ۲ فونٹین پن ایک ۳ ٹوتھ کی متواص ایک ۴ دو کام کا
کاک اسکرو ایک ۵ سنہری سیفٹی پن ایک ۶ سونیکا ملمع کی ہوئی چوڑی ایک جوڑہ ۷ جوڑے مین
لگانے کا کانٹا ایک جوڑہ ۸ خوبصورت سنہری ایک جوڑہ فیشن ایبل گلے کا ہار ایک ۹ تصویر دار پوسٹ کارڈ ایک درجن ۱۰ دستی
رومال ایک ۱۱ فونٹین پن کلپ ایک ۱۲ لیٹر کلپ ایک ۱۳ پنسل کٹ ایک ۱۴ سنہری جین ایک ۱۵ خوشبودار سینٹ ایک شیشی۔
تازہ شہادت۔ جناب محمد حنیف صاحب ضلع ڈرانگ آسام سے تحریر فرماتے ہین۔ کہ دو ۲ عدد گھڑی نمبر ۳۶ معہ انعامی چیزون
کے پہونچی۔ بہت پسند آئی۔ مہربانی فرما کر اور چھ عدد گھڑیان معہ انعامی چیزوں کے بہت جلد بھیج دیجئے۔
فرمائش لکھتے وقت گھڑی کا نام اور اخبار کا حوالہ ضرور لکھیے گا۔
ایس۔ اے۔ بی۔ بخشی۔ اینڈ کمپنی نمبر ۷ کولوٹولہ اسٹریٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴ کلکتہ

ناظرین! تحفہ

مال منگواؤ اور سرور پاؤ

نام تحفہ	قیمت روپیہ	قیمت آنہ	نام تحفہ	قیمت روپیہ	قیمت آنہ
گبرون لودیانہ کلاتھ قمیضوں فی گز	۰	۹	دُھسہ کابلی	۳۵	۰
دریائی زنانہ فی گز	۱	۴	تھان پٹی ۹ گز	۱۵	۰
کرنڈی برائے سوٹ مردانہ ۲ ۱ گرہ	۱	۰	لوئی سفید کشمیری	۱۳	۰
جراب فوجی اُونی فی جوڑہ	۱	۴	چادر زنانہ گرم اُونی	۶	۸
جراب پشمینہ فی جوڑہ	۱	۲	چار خانہ کمبل	۶	۸
جراب اُونی فی جوڑہ	۰	۸	پوستین	۸۰	۰
جراب سوتی فی جوڑہ	۰	۷	چادر پھولدار زنانہ سلکی	۵	۸
جراب ریشمی فی جوڑہ	۰	۱۲	بوسکی سلکی زنانہ فی گز	۱	۲
جراب سوتی سٹاکنگ	۰	۱۲	دری سلکی پھولدار ۹ فٹ × ۵ فٹ	۶۵	۰
چادر جوڑہ پشمینہ	۶۰	۰	دری سوتی بسترہ ۲ گز × ۱۸ گرہ	۲	۸
چادر جوڑہ گربھی پشمینہ	۱۷	۰			

آپ کو چاہیئے کہ ہمارے کارخانہ سے مال خرید کر ہماری حوصلہ افزائی فرماویں۔ اگر مال مہنگا یا خراب ہو تو ہم ذمہ وار ہیں +

آپ کی خدمت کرنے والا اسلامی کارخانہ

جمعدار ایم دین اینڈ سنز لودیانہ (پنجاب)

سب سے بڑی رعایت
جرمنی کی حیرت انگیز اشیا
محصول و پیکنگ معاف
سوئٹزرلینڈ کی بنائی ہوئی
بے نظیر رسٹ واچز
اگر آپ ان گھڑیوں میں سے صرف ایک گھڑی چھ آنہ میں لینا چاہتے ہیں تو آپ پہلے
کارآمد سفری چولھا
کپڑے سینے کی چھوٹی مشین
کپڑوں پر بیل بوٹے نکالنے کی مشین
لڑکا ہوگا یا لڑکی
سگرٹ بنانے کی مشین
جیبی چھاپہ خانہ
بجلی کے پاکٹ لیمپ
حیرت انگیز قینچی
حجام کو موقوف کرو
پتہ ملنے کا: ترکر و اینڈ کمپنی (الیف ڈیپارٹمنٹ) مچھی ہٹہ سٹریٹ لاہور

ہندوستان کی حقیقی ترقی کے خواہشمند

ملکی صنعت کی قدر کریں!

پیتل کی خوبصورت پالش شدہ پائیدار منٹوں میں سیروں
نفیس و لذیذ و عمدہ سیویاں تیار کرنے والی نو ایجاد

نقشہ نو ایجاد مشین سیویاں

مشین سیویاں (نو ایجاد)

ایجنٹوں کو معقول کمیشن

پرزے مختصر و مضبوط وزن کم حجم معمولی

ہمارے اس نو ایجاد کے سب سے پہلے کارخانہ حکیم محمد ... کی تیار کردہ

جوالہ اخبار ضرور دیں پتہ صاف و خوشخط

قیمت مشین مع عملی وستور ۲۱۱ دو عدد
مبلغ آٹھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک وغیرہ

مینیجر کارخانہ مشین سیویاں قادیان پنجاب

۹۰ فی صدی شریف المخلوقات کی دائمی تکالیف کا قلع قمع

قبض اور بدہضمی جو تمام امراض کے منبع ہیں۔ تقریباً ۹۰ فیصدی انسان ان سے نالاں ہیں۔ طرح طرح کی تدابیر کرتے ہوئے بھی پوری صحت حاصل نہیں کر سکتے بلکہ دیگر امراض کے شکار بنجاتے ہیں۔ ایسے اشخاص کیلیے ہماری تیار کردہ مشہور عالم آتنک نگرہ گولیاں غیبی امداد ہیں۔ یہ گولیاں قبض دائمی کو دور کر کے معدہ کو مضبوط بناتی ہیں۔ قوت ہاضمہ کو تیز کر کے خوراک اچھی طرح ہضم کر کے خون صالح پیدا کر کے اعلے درجہ کی طاقت و توانائی بخشتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے امراض کے شرطیہ علاج ہیں۔ لاکھوں اشخاص مستفید ہو کر صحت حاصل کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ ایکدفعہ ضرور تجربہ کریں قیمت فی ڈبیہ ۱۰ ایام کے لئے صرف ایک روپیہ۔ پانچ ڈبیاں صرف چار روپیہ۔ للعہ

امرتار نواوہیہ یعنی (بحر آبحیات) نحیف الاجسام ضعیف الدماغ وقوا کے لئے امرتار نواوہیہ ہمہ صفت موصوف ہے جسم کا معقول فربہی دیگر دماغ اور دل کو فرحت بخشتا ہے۔ قبل از وقت کی ضیفی کو دور کر کے قوی الجسم بنادیتا ہے۔ مقوی آیورویدک ادویہ کا مرکب ہے نہایت لذیذ اور مزیدار صبح بطور ناشتہ ایک تولہ استعمال کر سکتے ہیں قیمت فی ڈبیہ صرف دو روپیہ عہ

ویدشاستری منی شنکر گووندجی جام نگر کاٹھیاواڑ

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے +

۲۔ علمی و ادبی تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں +

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے +

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے +

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا +

۸۔ جواب طلب امور کیلئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے +

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۰۶ر +

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے +

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے +

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۴۔ مزنگ روڈ لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا (ہمایوں)

یادگار علامہ فضیلت آب سر شاہ محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

فہرستِ مضامین

جلد ۱۳ | بابت ماہِ مارچ ۱۹۲۸ء | نمبر ۳

تصویر:- چھٹی کی ایک رسم -

اِعلان

طلبہ کے لئے ہمایوں کے چندہ میں تخفیف

ہمایوں اُردو زبان کا بہترین رسالہ ہے۔ اِس کے ظاہری اور باطنی محاسن پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ ملک بھر کے علما و اُدبا کی تحریریں ہر مہینے "ہمایوں" کے اوراق کی زینت بنتی ہیں۔ اِس کے علاوہ اُس کی عنانِ ادارت نہایت قابل ہاتھوں میں ہے۔ صحتِ زبان اور سلامتِ ذوق کے اعتبار سے یہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اِسی لئے اِس کی اشاعت کا ایک معقول حصّہ سکولوں اور کالجوں میں جاتا ہے۔ ہم طلبہ کے فائدہ کے لئے اعلان کرتے ہیں کہ اگر وہ مارچ کے مہینے میں "ہمایوں" کے خریدار بنیں گے تو اُن سے سالانہ چندہ پانچ روپے کی بجائے صرف تین روپے لیا جائے گا جو دراصل "ہمایوں" کا ششماہی چندہ ہے۔

ہمیں امید ہے کہ وہ اِس موقع سے ضرور فائدہ اُٹھائیں گے۔ ۳۰ مارچ کے بعد کسی فرمائش کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

مینیجر رسالہ "ہمایوں"

۲۴۔ مزنگ روڈ۔ لاہور

جہاں نما

فطرت کا انتقام

تہذیب نے حواس انسانی کو کُند کر دیا ہے

نظرت جو چیز ہمیں عطا کرتی ہے اُس کی قیمت وہ وصول کر لیتی ہے۔ مہذب انسان اب تہذیب کی قیمت ادا کر رہا ہے۔

فطرت نے انسان کو ادنیٰ حیوانوں کی بہ نسبت زیادہ پیچیدہ اور زیادہ گہرے دماغی آلات عطا کر رکھے ہیں مگر اب وہ اُن کی قیمت کا مطالبہ کر رہی ہے۔ تہذیب کے اس عطیہ کے لئے اگر وہ عطیہ کہلائے جانے کے قابل ہے ہم جو کچھ ادا کر رہے ہیں وہ ہمارے ہوش و حواس ہیں۔ جس قدر ہمارا دماغ ترقی کرتا ہے اتنا ہی ہمارے حواس ہمیں جواب دیتے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر وہ بیکار ہو رہے ہیں۔ اس کے ثبوت میں یہاں ہم کچھ مثالیں پیش کریں گے۔

ہاتھیوں کی ایک ٹولی جنگل کی زمین کو پامال کر رہی ہوتی ہے کہ یکایک کہیں سانبھر کے ڈکرانے کی آواز آتی ہے۔ ہاتھی ہوا میں اپنا سونڈ اٹھا کر سونگھتا ہے۔ وہ اپنے کان کھڑے کر کے سنتا ہے مگر اُسے کوئی آواز نہیں آتی۔ ایک لمحہ کے بعد تمام ہاتھی بھاگ اُٹھتے ہیں۔ اُن کو کچھ نظر نہیں آیا نہ انہوں نے کوئی آواز سنی مگر پانچ میل کی دُوری سے انہوں نے اپنے دشمن انسان کی بُو پالی۔

قدیم زمانوں میں جب انسان اپنی دشمن قوتوں سے بھری ہوئی دنیا میں آوارہ پھرتا تھا، اُس دنیا میں جس میں وحشی درندے اور اُس کی اپنی نوع اُس کے درپئے آزار رہتی تھی، تو اُس کی قوتِ شامہ بہت تیز تھی۔ اُسے اپنے دشمن کی بُو دُور ہی سے آجاتی تھی۔ وہ ہوا میں سے معلوم کر لیتا تھا کہ دشمن کون سے راستوں سے گزر گیا ہے۔ مگر مہذب انسان اپنے حواس کو استعمال نہیں کرتا۔ اسی کی سزا قدرت اب اُسے دے رہی ہے۔

دریائے ٹیمز میں طغیانی آئی تو چوہے اپنے بلوں میں سے نکل نکل کر بھاگنے لگے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے طوفان کی آواز سن لی ہو یا ممکن ہے کہ اُن کو پانی کی بُو آگئی ہو۔ کچھ بھی ہو یہ چھوٹے چھوٹے حقیر جانور تجربہ کار انسان سے جسے طوفان نے آلیا جہد للبقا کے لئے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے۔ وہ سیلاب زدہ مکانوں کے پردوں کے ساتھ چمٹ گئے درآں حالیکہ انسان پانی میں ڈوب رہے تھے۔

یہی حال ۔ ہماری سماعت کا ہے ۔کبھی امریکی وحشی کے ساتھ جنگل میں چلے جاؤ ، تم اُس کی باتیں سُن سُن کے حیران ہو گے کہ وہ کبھی کہیں دُور سے صرف ہرن کے پاؤں کی آہٹ سُن کر تمہیں اُس کا پتا دیتا ہے اور کبھی کسی دریائی بچھڑے کے دانت کٹکٹانے کی آواز کی خبر دیتا ہے ۔

وہ کیا چیز ہے جس نے تمہارے کانوں کو اس وحشی کے کانوں سے مختلف بنا دیا ہے ؟ اس کا جواب "تہذیب" ہے! کُتے کی سیٹی کو بجاؤ ، اُس سیٹی کو جس کی آواز انسانی کان نہیں سن سکتے ۔ تمہارا کُتا اُسے سن کر دوڑ آتا ہے ۔ کیوں ؟ اس لئے کہ وہ باوجود اپنے گھریلو پن کے قدرتی زندگی بسر کرتا ہے ۔ اور اسی لئے اُس کے کان ہلکی سے ہلکی آواز سے بھی آشنا ہیں ۔ تہذیب نے انسان کے بعض حواس کُند کر دیے ہیں ، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اُس کی قوتِ شعور صحیح طور پر اپنے فرائض انجام نہیں دیتی ۔

صدارتِ جمہوریہ امریکہ

ریاست ہائے متحدہ کی سینات نے ایک قرارداد منظور کی ہے کہ کوئی وطن پرست شہری تیسری مرتبہ صدر منتخب ہونے کی کوشش نہ کرے ۔ ساتھ ہی یہ ترمیم بھی پیش کی گئی کہ مسٹر ہربرٹ ہوور جماعتِ جمہوریہ کی طرف سے صدارت کے اُمیدوار ہوں گے ۔ رکیلوِن کولج پہلی دفعہ انتخاب کے ذریعہ سے صدر مقرر نہ ہوئے تھے بلکہ صدرِ منتخب کے انتقال پر وہ نائب صدر کے عہدہ سے ترقی کر کے صدارت تک پہنچے تھے ۔ دوسری مرتبہ وہ منتخب ہوئے ۔ سینات کی قرارداد غالباً صدرِ موصوف کے تیسری مرتبہ منتخب ہونے کے خلاف ایک آواز ہے ۔ سینات کو دستور میں کوئی ترمیم کرنے کا اختیار حاصل نہیں مگر اُس کی اس قرارداد سے ایک غیر تحریری روایت کا اجرا ہو گا کہ دو مرتبہ سے زیادہ کسی شخص کو صدر منتخب نہ ہونا چاہیئے ۔

گوشۂ ہائیڈ پارک

لندن کا سب سے بارونق حصہ

لندن کا سب سے زیادہ بارونق حصہ پکیڈلی سرکس سمجھا جاتا تھا لیکن ماہِ جولائی کے ایک خوشگوار دن میں جب گزرنے

والی گاڑیوں کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ گاڑیاں گوشۂ ہائیڈ پارک کی سڑکوں سے گزریں۔ ان کی تعداد ۱۴۴۵۵ تھی اس کے بعد ٹریفالگر کا چوک اور ماربل آرک تھے۔ پکیڈلی سرکس میں سے جو چوتھے درجے پر تھا ۴،۷،۳۹ گاڑیوں کا گزر ہوا +

اس شہر کے متعلق بعض دوسرے اعداد و شمار بھی نہایت عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً لنڈن میں ٹیلیفون کے تاروں کی مجموعی لمبائی ۱۹۸۹۵۹۴ میل ہے۔ اور ہر سال ٹیلیفون پر ۵۱۶۲۲۹۰۰ مرتبہ گفتگو کی جاتی ہے۔

لندن کے بازاروں کی مجموعی مسافت ۲۲۲۱ میل ہے۔ اور ٹریم وے کی لائن کا طول ۳۵۷ ½ میل۔ لندن میں ۳۴۹۵ ہوٹل اور قہوہ خانے وغیرہ ہیں۔ اور وہاں کی پولیس کے آدمیوں کی تعداد ۲۰۰۵۰ ہے۔ سالانہ ۱۹،۰۱۴۱ حادثات پیش آتے ہیں۔ ایک سال میں وہاں ۱۳۷۲۳۲ معاملات کی تفتیش ہوئی اور ۴۹۱۹ مقامات پر آگ لگی +

دل کو مضبوط بنانے کا طریقہ

دل کو مضبوط بنانے کا در اصل ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ مسلسل، باقاعدہ اور کافی ورزش کی جائے۔ ورزشوں میں بلندیوں پر یا سیڑھیوں پر چڑھنا سب سے زیادہ مفید تصور کیا گیا ہے۔ جس شخص کی نبض ایک مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھنے سے پچاس سے ساٹھ ضربوں تک پہنچ جاتی ہو اُسے چاہئے کہ وہ ہر روز سو مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھے اور اُترے۔ ایک مہینے تک یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک ایسا کرنے سے اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اب اس مشقت کے باوجود اُس کے دل کی حرکت معمول سے نہیں بڑھتی بلکہ ورزش نے اُس کے اِس جاں بخش عضو کو ایک لوہا کوٹنے والے لوہار کے عصبات کی طرح مضبوط بنا دیا ہے اور اس میں طاقت اور قوتِ برداشت حیرت انگیز طور پر پیدا ہو گئی ہے +

اسی قدر نہیں بلکہ دل کی کمزوری کی وجہ سے عضلات میں جو گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سوءِ ہضم کے باعث جو بے آرامی محسوس ہوتی ہے اُس کے انسداد کے لئے بھی یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔ سیڑھیوں پر چڑھنے اور اُترنے سے صرف ٹانگیں ہی مضبوط نہیں ہوتیں بلکہ چھاتی بڑھتی ہے۔ دل انحطاط سے بچ جاتا ہے۔ معدہ کے عصبات اور ہضم کرنے والے اعضا مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اور تمام جسم کھائی ہوئی غذا سے پورا پورا فائدہ حاصل کرتا ہے +

چھٹی کی ایک رسم

جننے کے بعد چھٹی کی رات کو دالان کے آگے چوکی بچھاتے ہیں۔ اور زچہ اور بچے کو بناؤ سنگار کرا کے باہر چوکی پر کھڑا کرنے لاتے ہیں۔ ماں بچے کو گود میں لے کر آتی ہے۔ دو عورتیں دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لئے ساتھ ہوتی ہیں۔ دائی آٹے کی چومک[1] اُٹھائے آگے آگے چلتی ہے۔ ماں بچے کو گود میں اور قرآن شریف کو سر پر رکھکر آسمان کی طرف دیکھتی اور چوکی پکڑی ہو کر سات ستارے گنتی ہے۔ اُس وقت دونوں تلواروں کی نوک سے نوک ملا کر زچہ کے سر پر قوس بنا دیتے ہیں۔ تاکہ اوپرے جن اور پری کا گذر نہ ہو سکے۔ گویا آج سے جن و پری کے سایہ کا خوف دور ہو جاتا ہے۔ اِدھر ماں تارے دیکھنے جاتی ہے اُدھر لڑکے کا باپ تیر کمان لے کر زچہ کے پلنگ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور بسم اللہ پڑھ کر چھت میں تیر لگا کر گویا فرضی مرگ مارتا ہے چنانچہ اس رسم کا نام ہی مرگ مارنا پڑ گیا ہے۔ مرگ مارنے کا نیگ ساس داماد کو دیتی ہے۔

زچہ تارے دیکھ کر پلنگ پر آبیٹھتی ہے۔ پلنگ کے آگے دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔ چوکی میز کی طرح لگا دی جاتی ہے۔ اُس پر تورہ (چوبہ) چنا جاتا ہے جس میں پکی ہوئی سات ترکاریاں اور مختلف طرح کے کھانے ہوتے ہیں۔ سات سہاگنوں کے ساتھ مل کر زچہ رانی ذرا ذرا سا چکھ لیتی ہے۔ جسے چوبہ چکھانا کہتے ہیں۔ مبارک سلامت سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ گانا شروع ہو جاتا ہے:-

جچا جب دیکھنے کو آئی تارے	ستارے چرخ گرداں نے اُتارے
ہوا فرزند یہ سب کو مبارک	کہو لڑکے کا باوا مرگ مارے
چھٹی کی دھوم جو پہنچی فلک تک	قمر اور مشتری دونوں پکارے
خدا نے کیا خوشی دونوں کو دی ہے	دمامے بج گئے گو بجے نقارے

اس کے بعد زچہ کے آگے کے تورے اور چومک میں روپے ڈال کر دائی کو دیتے جاتے ہیں +

ماخوذ از "رسوم دہلی"

منصور احمد

---

[1] آٹے کا ایک چراغ چومو ہا بنایا جاتا ہے۔ اُس میں چار بتیاں اور گھی ڈال کر جلاتے ہیں +

مُبادیٔ سیاسیات

حصۂ اوّل، سیاسیاتِ نظریہ

مملکت اور اُس کے ہم جنس ادارات - اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ سیاسیات میں ایک مخصوص معاشری ادارہ یعنی مملکت کے تخیل، اس کے ارتقاء، اسکی مختلف صورتوں، اس کے آلۂ کار یعنی حکومت و دیگر مسائل متعلقہ پر بحث کی جاتی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نفسِ مملکت کے مفہوم کو واضح کر دیا جائے۔ اور جہاں تک ہو سکے اُس کے اور اس کے ہم قسم ادارات جیسے معاشرۂ انسانی، قوم، مُلک اور حکومت کے مابین فرق ظاہر کر دیا جائے +

آبادی - مملکت کی تعریف تقریباً ہر ایک سیاسی مُفکّر نے مختلف انداز سے کی ہے، لیکن اِن تمام تعریفوں میں چند عناصر مشترک پائے جاتے ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو اِن مُفکّروں کے تخیلات کے درمیان کوئی اصولی فرق نہیں۔ یہ امر ہے کہ مملکت کے قیام کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ انسانوں کی ایک کثیر آبادی ہے۔ اس کا تعین ناممکن ہے کہ مملکت کی آبادی کتنی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ تاریخ میں ایک طرف تو ایسی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا ذکر آیا ہے۔ جیسے یونانِ قدیم میں ایلس اور دورس یا قدیم بنی اسرائیل کی مملکتِ کنعان جن کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی، دوسری طرف چنگیز اور تیمور، کنشک اور اشوک کی عظیم الشان سلطنتیں ہیں اور زمانۂ موجودہ میں ممالکِ متحدۂ امریکہ اور بولشوی جمہوریہ روس کو بھی مملکتوں کا ہی لقب دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے آبادی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بہت کم نہ ہونی چاہئے +

اراضی - مملکت کے لئے دوسرا جزوِ لاینفک ایک مستقل مُلک بھی ہے۔ خانہ بدوش اقوام جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہوں مملکت نہیں کہلائی جا سکتیں، خواہ اِن میں کتنی ہی تنظیم کیوں نہ ہو۔ مثلاً تُوط قوم نے اس وقت تک مملکت کی شکل اختیار نہیں کی جب تک وہ مغرب میں اسپین اور مشرق میں جزیرہ نمائے بلقان کے ساحل پر آباد نہ ہوگئی۔ اگر کوئی قوم جغرافی حدود کے اندر مستقلاً آباد ہو اور پھر کسی سبب کی بنا پر اپنے مساکن چھوڑنے پر مجبور ہو جائے تو نقلِ وطن کے دوران میں اس کی شانِ مملکت باقی نہ رہے گی +

مقتدرِ اعلےٰ - مملکت کے قیام کے لئے دو مزید امور لازمی ہیں۔ اوّل تو ایک ایسی شخصیت جس کو یہ حق

حاصل ہو کہ افرادِ معاشرہ کی تنظیم قائم رکھنے کے لئے ایسے احکام صادر کرے جن پر کاربند ہونا ہر ایک فرد اور ہر ایک جماعت کا فرضِ عین ہو، اور خلاف ورزی کی حالت میں ملزم کو سزا بھی دی جا سکے۔ یہ شخصیت مفرد بھی ہو سکتی ہے اور مرکب بھی، یعنی اس کا مرکز شخصِ واحد بھی ہو سکتا ہے۔ اور بہت سے لوگوں کی جماعت بھی، لیکن دوسری صورت میں اس جماعت کے مجموعی احکام قابلِ نفاذ سمجھے جائیں گے۔ اس حاکم کو مقتدرِ اعلیٰ اور اس کے اختیارات کو اقتدارِ اعلیٰ کا لقب دیا جائے گا +

خود مختاری ۔ مملکت کے قیام کے لئے خود مختاری بھی ایک نہایت ضروری عنصر ہے۔ خود مختاری کی دو شقیں کی جا سکتی ہیں۔ ایک تو وہ صورتِ حال جس میں ملک ہر قسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ہو، یعنی نہ صرف اندرونی معاملات میں اسے آزادیِ تامہ حاصل ہو بلکہ بین الاقوامی قوانین اور معاہدوں کے علاوہ خارجی معاملات میں وہ کسی بیرونی قوت کا پابند نہ ہو۔ عام طور پر مملکت ایسے ہی سیاسی ادارہ کو کہا جاتا ہے، لیکن آج کل کے زمانہ میں بعض طاقتور ممالک کی جوعِ ارضی کے باعث شاید ہی کوئی بیچارہ کمزور ملک ایسا رہا ہو گا جس پر کوئی نہ کوئی خارجی بندش عائد نہ کر دی گئی ہو کہیں تو جملہ خارجی معاملات کسی بڑی سلطنت کے سپرد ہیں۔ جیسے ہندوستانی ریاستیں، کہیں کسی مخصوص سیاسی اصول کے تحت کمزور ملک پر مختلف قسم کی بندشیں عائد کر دی گئی ہیں، جیسے مسقط، کویت اور زنجبار پر کہیں خارجی معاملات کے دائرہ کو چھوڑ کر ملک کے مالیات پر قبضہ کر لیا گیا ہے جیسے چین میں، اور کہیں برائے نام اندرونی اور خارجی اختیارات دے کر ماتحت ملک میں فوج رکھ کر اس کی آزادی میں خلل ڈالا گیا ہے جیسے مصر میں، غرض اگر مملکت کا معیار یہی ہے کہ ملک کو اندرونی اور خارجی آزادیِ تامہ حاصل ہو تو علاوہ پانچ سات سلطنتوں کے اور کسی کو مملکت نہیں کہا جا سکیگا۔ اس لئے بنظرِ سہولت علمِ سیاسیات کو مفید بنانے کی خاطر مناسب یہ ہے کہ مملکت میں ان ممالک کو بھی شامل سمجھا جائے جن کو کم از کم اندرونی معاملات میں آزادی حاصل ہو +

مملکت کی تعریف ۔ الغرض انسانوں کی ایسی منظم جماعت کو مملکت کا لقب دیا جاتا ہے۔ جو کسی مخصوص جغرافی رقبے میں سکونت پذیر ہو، جس کے افراد کے مابین حاکم و محکوم کے تعلقات پیدا ہو گئے ہوں۔ اور جسے کم از کم اپنے اندرونی معاملات کے انصرام و انتظام پر معمولاً قدرت حاصل ہو +

حکومت ۔ اس تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ مملکت دراصل انسانوں کی ایک منظم جماعت کا نام ہے جو سیاسی رشتہ میں منسلک ہو گئے ہوں۔ نیز یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ نہ صرف آج کل کے زمانہ میں جب کہ مملکتوں کے حدود وسیع سے وسیع تر ہو رہے ہیں، بلکہ یونان کی شہری مملکتوں میں بھی باشندوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انتظامِ مملکت ہر جگہ

ایک نسبتاً مختصر جماعت کے سپرد کردینا پڑا۔ اسی لئے مملکت کا ایک جزوِ لاینفک یہ ہے کہ باشندوں کے آپس میں حاکم و محکوم کے تعلقات پیدا ہوجائیں، اور حکومت اس مشین کا نام ہے جس کے ذریعہ سے مملکت کے کاروبار انجام کو پہنچتے ہیں یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کہ حکومت کو بعض مرتبہ تمام مملکت پر حاوی سمجھ لیا جاتا ہے۔ مملکت اور حکومت کا وہی رشتہ ہے جو آقا اور ملازم کا ہے؛ جس طرح آقا اپنے ملازم کو تبدیل کرسکتا ہے اور ملازم کی علیحدگی کی وجہ سے اس کی حیثیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوتی اسی طرح حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، مگر مملکت اس وقت تک مسلسل قائم رہتی ہے جب تک وہ منظم اور کم و بیش خودمختار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ایسے ملک میں جہاں موروثی بادشاہ کی حکمرانی ہو، بادشاہ مرتا ہے۔ تو اس کے ولی عہد کے اعلانِ جانشینی سے پیشتر ہی فوراً اس کو حکمران تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ بادشاہ کوئی ہو، وزیر کوئی ہو، پارلیمنٹ نشست کررہی ہو یا برخواست ہوگئی ہو، مملکت کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا اور اگر مملکت کے لازمی عناصر مثلاً تنظیم، آبادی اور آزادی قائم رہیں اور طرزِ حکومت بدل جائے یعنی ملوکیت سے جمہوریت یا جمہوریت سے دستوری بادشاہی ہوجائے تو بھی مملکت برابر قائم رہتی ہے +

قوم۔ مملکت کو ایک اور ادارہ سے ممیز کرنا ضروری ہے۔ آج کل تقریباً ہر ایک حصہ دنیا میں سب سے زیادہ جس سیاسی اصطلاح کی آواز کانوں میں گونجتی ہے وہ لفظِ قوم ہے؛ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ گو مشرق میں بھی ہر ایک شخص قوم قوم پکارتا ہے اور مغرب میں بھی معاملات قومی اثر سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن مشکل سے دو ممالک کے باشندے ایسے ہوں گے جو اس لفظ کے ایک ہی معنی سمجھتے ہوں۔ آج کل کے زمانہ میں ایک طرف اینگلوسیکسن قوم میں نہ صرف انگلستان ممالک متحدہ امریکا اور آسٹریلیا کے باشندے شامل سمجھے جاتے ہیں، بلکہ خدا جانے کیوں جنوبی افریقہ کے ولندیزی، کناڈا کے فرانسیسی، ویلز کے کلٹ اور سکاٹلینڈ کے مرکب النسل باشندے بھی اینگلوسیکسن قومیت کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فرانسیسی قوم میں صرف وہ افراد شامل سمجھے جاتے ہیں جو جمہوریہ فرانس کے تحت اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن مشرقی بلجیم کے والوٗن اور مغربی سوئیزرستان کے فرانسیسی بولنے والے معلوم نہیں کیوں اس نعمت سے محروم ہیں بعض مرتبہ تو قوم اور قومیت کی وجہ سے ملک کے ملک غیرآباد ہوگئے ہیں، مثلاً صلحنامہ لوزآن کی رُو سے یہ قرار پایا کہ قسطنطنیہ کے یونانی بولنے والے باشندوں کے علاوہ جمہوریہ ترکیہ کے تمام یونانیوں کو یونان کے تمام ترکوں سے تبدیل کرلیا جائے اور اس عمل سے جو مصیبتیں اور مشکلات اٹھانی پڑی ہونگی اس کا اندازہ مشکل ہے۔ بہرحال مغربی اعتبار سے قوم کے معنے کم و بیش ہم نسل مجموعۂ افراد کے ہوگئے ہیں اور عام میلان یہ معلوم ہوتا ہے کہ حتی الامکان ایسے ہم نسل افراد کو ایک ہی مملکت میں شامل ہونا چاہیے +

لیکن ایسی مثالیں کمیاب نہیں کہ ایک ہی بنیادی قوم کے مختلف مجموعوں نے مختلف ممالک میں آباد ہو کر اپنی اپنی مملکتیں قائم کرلیں، اور ان میں ایسا تشخص پیدا ہو گیا کہ ہر ایک مملکت کے باشندے اپنی قوم علیحدہ علیحدہ تصور کرنے لگے۔ برازیل اور پرتگال کے باشندے ہم نسل، ہم زبان، اور ہم مذہب ہیں اور دونوں کی روایات یکساں ہیں، لیکن آج یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پرتگالی اور برازیلی ہم قوم ہیں، یہی کیفیت ان اقوام کی ہے جو جنوبی امریکا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں، اور باوجودیکہ ان کے رسم و رواج، زبان اور مذہب ایک سے ہیں لیکن وہ محض اپنی جداگانہ انفرادی حیثیت کی وجہ سے متحد نہیں ہوتے۔ اسی طرح ایسے بھی ممالک ہیں جہاں متعدد اقوام دوش بدوش آباد ہیں اور ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھے ہوئے ہے جیسے بلجیم میں والوَن اور فلیمنگ، سوئیزرلستان میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی +

اب مشرق کی طرف آیئے۔ جہاں مغرب میں عموماً قوم کے معنی ہم نسل افراد کے مجموعہ کے لئے جاتے ہیں وہاں ہندوستان میں قوم سے مراد ہم مذہب اشخاص سے ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مسلمان ہیں ان کا صرف بارہواں حصہ ابتدائً غیر ممالک سے آکر یہاں آباد ہوا ہوگا، اور اس قلیل تعداد میں سے شاید نصف بھی ایسے نہ نکلیں جن کے اجداد اپنی بیویوں سمیت یہاں آئے ہوں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ہندی مسلمان ایک قوم نہیں۔ یہی کیفیت اس ملک کے عیسائیوں سکھوں اور دیگر اقوام کی ہے۔ اصل میں اسی التباس کو رفع کرنے کی غرض سے یہاں کی سیاسیات میں عام طور پر "قومی" ادارہ اس ادارے کو کہتے ہیں جو کسی مذہب کے پیروؤں کے ساتھ مختص ہو اور "ملکی" کا لقب ان ادارات کو دیا جاتا ہے جن کا تعلق بلاتفریق مذہب تمام ملک سے ہو[1]۔

چند سال پیشتر تک مشرقی دنیا کے تقریباً ہر ملک کے باشندوں کی تقسیم کم و بیش اسی اصول پر کی جاتی تھی، چنانچہ جب سنہ ۱۹۱۲ء میں ملک چین میں جمہوریت قائم ہوئی تو وہاں کے عَلم پر ملک کی پانچ ممتاز اقوام کے لئے ایک ایک رنگ رکھا گیا لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی ایشیا میں جو ہلچل پیدا ہوئی۔ یعنی ترکی میں جمہوریہ قائم کیا گیا، اور ایران میں خاندان قاچار ہمیشہ کے لئے تخت سے محروم کیا گیا، تو ساتھ ہی ساتھ ان ممالک میں بھی کم و بیش مغربی طرز کی قوم کا تخیل پیدا ہو گیا، جس کا ایک نہایت دلچسپ مظاہرہ یہ ہے کہ ہندوستان کے پارسی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے "ہم قوموں" یعنی ایرانیوں اور خود ان کے درمیان ربط و اتحاد بڑھ جائے۔ اسی طرح فلسطین کے باشندوں کی جو فریق بندی ہے۔ اس میں عام عربی بولنے والے فلسطینی خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان ایک طرف نظر آتے ہیں، اور عبرانی بولنے والے یہودی

---

[1] ہندوستانی اقوام کی ترکیب و ساخت کا مفصل بیان میرے والد ماجد حاجی محمد موسےٰ خانصاحب نے اپنے رسالہ "ہندی قوم" (مطبوعہ مطبع ملیہ علیگڈھ) میں کیا ہے۔ اس کا مطالعہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ خاص طور پر ملاحظہ کیجیے اس رسالے کا عنوان موسومہ "ہندی قوم کا باغیچہ" صفحہ ۳۰

دوسری طرف +

ریاست ۔ مملکت کو ایک اور ادارہ یعنی ریاست سے بھی ممیز کرنا چاہئے ویسے تو ریاست کے لغوی معنے ایک ایسے مجموعۂ افراد کے ہیں جن کا کوئی سرگروہ یا رئیس ہو، لیکن سیاسیات کی اصطلاح میں اس لفظ کا انطباق عام طور پر آزاد مملکتوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا اس سے پیشتر بیان کیا جاچکا ہے دنیا میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جن پر کسی نہ کسی طاقتور سلطنت کا اثر ہے، اور اِن پر یہ سلطنت براہِ راست حکومت نہیں کرتی۔ بلکہ اپنی سہولت کی غرض سے اس نے اکثر اندرونی انتظامات کو وہیں کے مقامی حکمرانوں پر چھوڑ رکھا ہے۔ علاوہ ازیں دنیا میں ایسے بھی ممالک ہیں جن پر خواہ جغرافی وسعت کے سبب سے، خواہ تاریخی تنوع کے لحاظ سے براہِ راست حکومت نہیں کی جاتی بلکہ چند اختیارات جو ملک کو متحد اور طاقتور رکھنے کے لئے ضروری ہوں مرکزی حکومت کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، اور ایسے اختیارات جن کا تعلق انفرادی بود و ماند سے ہو، مقامی ادارت کے قبضہ میں رہنے دیئے جاتے ہیں؛ ساتھ ہی یہ قاعدہ بنا دیا جاتا ہے کہ مرکزی حکومت کو ان اختیارات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان دونوں قسم کے ادارات کو، یعنی جہاں کسی بیرونی ذی اقتدار سلطنت نے اندرونی انتظامات کسی مقامی حاکم کے قبضہ میں رہنے دیئے ہوں، یا ملک کے مختلف حصوں کے اختلافِ روایات کے باعث انہیں بعض شعبہ جاتِ حکومت میں مختارِ کل بنا دیا گیا ہو، سیاسی اصطلاح میں "ریاست" کہتے ہیں۔ اول الذکر قسم کی ریاستوں کی بہترین مثال ہندوستانی ریاستیں ہیں اور دوسری قسم کی ریاستوں کی بہترین مثال ممالکِ متحدہ امریکا، جرمنی اور روس کی منفرد ریاستیں ہیں جہاں اکثر اندرونی اختیارات ریاستی حکومتوں کو حاصل ہیں اور مرکزی حکومت صرف ایسے اختیارات پر قناعت کرتی ہے جو ملک کی عظمت و اقتدار کے اجزائے لاینفک ہوں۔ بہرحال اگر ہم مملکت میں ایسے انسانی مجموعوں کا شمار کریں جن کو اندرونی اختیارات تامہ حاصل ہوں پھر بھی ریاستوں سے ان کی تفریق کر دینا مناسب ہوگا۔ آزاد ممالک کے مختلف اجزا کو کسی حالت و صورت میں ممالک کا لقب نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ عام طور پر بہت سے داخلی معاملات پر بھی مرکزی حکومت حاوی ہوتی ہے، جیسے سڑک سازی شاہراہوں اور قومی ریلوں کا انتظام، بعض محاصل عائد کرنے کا اختیار وغیرہ، اب رہا ماتحت علاقوں کا سوال، یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ آیا ذی اقتدار سلطنتِ غیر نے محض اپنی سہولت کی خاطر ان رقبوں کے قبضے میں اندرونی اختیارات چھوڑ دیئے ہیں، یا ملک کی رفتار آزادی کی جانب سے اور ان اختیارات سے اس غیر سلطنت کو مجبوراً دست بردار ہونا پڑا ہے۔ ہندوستان کی اکثر و بیشتر ریاستوں کو مملکت کا لقب نہیں دیا جا سکتا، اس لئے کہ جس طرح خارجی معاملات میں ان پر قیود عائد ہیں اسی طرح اندرونی معاملات میں بھی اگر صاحبِ اقتدار سلطنت چاہے تو ان پر دباؤ ڈال سکتی ہے، بلکہ

چھوٹی موٹی ریاستوں میں تو شاید رئیس کو تخت سے بھی اُتار سکتی ہے۔ گویا جہاں تک ایسی ریاستوں کا تعلق ہے ذی اقتدار سلطنت اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے اختیارات پر پورے طور سے حاوی ہے۔ "مملکت" کا لقب زیادہ سے زیادہ اُن ممالک کو دیا جا سکتا ہے جہاں کی اندرونی حکومت پر کسی غیر ملک کا حقیقتاً کوئی اثر نہ ہو۔ ممکن ہے کہ سلطنتِ برطانیہ کو جنوبی افریقہ یا کناڈا کے اندرونی معاملات پر ہر قسم کا قانونی اختیار حاصل ہو[1]، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کے لئے ان اختیارات کو کام میں لانا خارج از امکان اور خارج از بحث ہے۔ اور بعض معاملات پر سلطنتِ برطانیہ کا جو اختیار باقی رہا ہے اس کا سبب سلطنتِ برطانیہ کی سہولت نہیں بلکہ خود جنوبی افریقہ یا کناڈا کی سہولت ہے، اس لئے کہ وہ بالفعل اس کے لئے تیار نہیں کہ ایسے ایسے معاملات سے بھی جیسے بحری مدافعت، خارجی امور وغیرہ ہیں، بالکلیہ انگلستان کی پشت پناہی کو مسترد کر دے۔ ایسے ترقی یافتہ سیاسی مجموعہ کو مملکت کا لقب دینا یقیناً غلط بیانی نہ ہوگی۔

ہارون خان شروانی

اصطلاحاتِ جدیدہ

ابوی	Patriarchal	شہنشاہی	Imperial
اقتدار اعلیٰ	Sovereignty	مفکر	Thinker
اموی	Matriarchal	مقتدر اعلیٰ	Sovereign
جمہوریہ	Republic	ملوکیت	Monarchy
حکومت	Government	نظریۂ جبر	Theory of force
دستوری	Constitutional	ولندیزی	Dutch
سوئیزرستان	Switzerland		

[1] ہمارے نزدیک ۱۹۲۶ء کی برطانوی شہنشاہی کانفرنس کی آخری قرارداد کے بموجب برطانیہ کو کسی قسم کے قانونی دباؤ کا حق باقی نہیں رہا۔

حیاتیّات

خاکِ ناچیز ہو گر دشت میں چکّر نہ لگاؤ
بحرِ مردار ہو گر تم کوئی طوفاں نہ اُٹھاؤ

نوجوانو! تمہیں ہم مردہ یقیں کر لیں گے
اپنی ہستی سے نہ دنیا میں اگر دھوم مچاؤ

ترقی کی اُمنگوں سے پرِ پرواز پیدا کر
وگرنہ چھو نہیں سکتا تو ہرگز بامِ شہرت کو

مرے شہپر کے سایہ میں ہے سارا عالمِ امکاں
اگر دیکھوں ذرا پھیلا کے مَیں بازوئے ہمّت کو

طوفانِ حوادث سے لڑ سینہ سپر ہو کر
آتی ہیں یہ آوازیں پیہم لبِ دریا سے

چٹکنا بھی تجھے مشکل ہے غنچہ کی طرح غافل!!
گلستاں کی فضا لبریز ہے شورِ عنادل سے

ہر ایک سطرِ نفس میں غافل ہزاروں اسرار جلوہ گر ہیں
ورق ورق کھول کر نہ دیکھی یہ زندگی کی کتاب تو نے

ایک دانہ بھی مرے خرمن کا جل سکتا نہ تھا
صاعقے بربادیوں کے تلملا کر رہ گئے

رزمگاہِ زندگی کرتی تھی مردوں کو تلاش
ہمتیں کچّی تھیں جن کی ہچکچا کر رہ گئے

عقلِ انسانی نہ سمجھی آج تک رمزِ حیات
عالمِ فطرت کے جلوے مسکرا کر رہ گئے

وحیدالدّین سلیم

تاریخ دُنیا پر ایک نظر

حصّۂ دوم، مشرق کے قدیمی تمدّن

(۹)

مصر

ملک مصر اور اُس کے اصلی باشندے ۔ چھٹی صدی ق م میں جب یہودا کے بادشاہوں نے عظیم الشان بابلی شاہنشاہ کے خلاف مصر کے ساتھ رابطہ پیدا کیا تو اس ملک کی طاقت اس سے پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن اس کمزوری کی جگہ کبھی وہ قوت وتمدن جلوہ گر تھا جس کی غیر معمولی شان وشوکت دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ مصر کا تمدن قدیم ترین تمدنوں میں سے تھا۔ بعض فاضل مورخین کا تو خیال ہے کہ مصر تمدن کا پہلا گھر تھا اور نیل کی وادی ہی میں انسان نے پہلے پہل متمدن زندگی کے فنون سیکھے۔ لیکن حال کے اکتشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی افریقہ میں نہیں بلکہ جنوب مغربی ایشیا میں، بابل میں اور اس سے بھی پہلے ایلم کی قدیمی سرزمین میں اوّل اوّل تمدن کی بنیاد پڑی۔

تاہم مصری تمدن کی انتہائی قدامت اور رفعت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ مصر کی زمین کامحل وقوع ابتدا زراعت کی آبادکاری اور ایک پُرامن حکومت کے نشوونما کے لئے نہایت موزون تھا۔ یہ ایک غیر معمولی سرسبزی کا تھا جس کا سب سے بڑا سبب نیل کی طغیانیاں اور کوہستان ابی سینیا کی نئی زمین کی زرخیز مٹی تھی جو یہ عظمت آب اپنے ہمراہ لاتا اور چاروں طرف کھیتوں میں بکھیر دیتا۔ اس کی آب وہوا پیداوار کے لئے مفید اور نوع انسان کے لئے آرام دہ تھی۔ اور یہ بات بھی کچھ کم نہ تھی کہ قدرت نے مصر کو جنگی اور آوارہ گرد بدویوں کے حملوں سے بچائے رکھنے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اس کے تین طرف لق ودق صحرا اور چوتھی طرف سمندر تھا صحرائے اعظم کے وسیع دشت لیبیوں سے اُسے محفوظ رکھتے تھے نوبیا کے صحرا حبشیوں کو یہاں تک پہنچنے سے روکے ہوئے تھے اور سینا کا اجاڑ جزیرہ نما عرب اور اسکے درمیان حائل تھا لیکن مصر محفوظ تھا وہ دنیا سے علیحدہ نہ تھا۔ یہ ایک بڑی نتیجہ خیز بات تھی کیونکہ اگر علیحدگی ہوتی تو رکاوٹ بھی ساتھ ہی پیدا ہو جاتا۔ اگرچہ حملہ آور فوجوں کی وہاں تک رسائی نہ تھی لیکن گلہ بانوں اور تاجروں کے چھوٹے چھوٹے قافلے ایک نخلستان

سے دوسرے نخلستان تک آسکتے تھے اور آئے - بیرونی دنیا سے اِن تعلقات کے قیام و تسلسل نے مصری ذکاوت کو تیز تر کردیا +

مصری آب و ہوا کی قلتِ باراں اور نیل کی پہنچ سے دُور اُس کی مٹی کے ریتیلے پن کے باعث مصر کے آثارِ قدیمہ کا ایک مکمل اور مختلف النوع سلسلہ نہایت عمدگی کے ساتھ آج تک محفوظ رہا ہے - اِن سے ظاہر ہے کہ مدتیں ہوئیں حجریہ زمانوں میں اس خطہ کا اُن خانہ بدوش شکاریوں اور صحرا نورد گلہ بانوں کو علم تھا جن کے ہم نسل بعد میں قرب و جوار کے صحراؤں اور سبزہ زاروں میں گھومتے رہے - اِن اصلی باشندوں کو (جو غالباً حبشی النسل تھے) ۵۰۰۰ ق م کے قریب حامی نو وارد ملک سے نکال کر یہاں بس گئے جو عرب سے چل کر بحرِ احمر کے پار آئے اور نیل کی وادی کے بالائی حصے میں جہاں بعد میں کوپٹس، ابی دوس، تھیبز، اور کارنک کے شہر واقع تھے آباد ہو گئے +

اس دوران میں نیل کے دہانے کے قریب اس مثلث نما قطعے میں جو دریا کے بھراؤ سے بن گیا تھا مغرب سے لیبیا کی قومیں اور مشرق سے سامی گلہ بان آباد ہو رہے تھے +

قیامِ سلطنت - مصر کا حقیقی تمدن نیل کی بالائی وادی کے گہوارے میں پھولا پھلا - یہ تمدن ۴۵۰۰ سے لے کر ۳۵۰۰ ق م تک وضع ہوا - یہاں اس تنگ زرخیز خطے میں جس کے دونوں طرف لق و دق صحرا تھے جفاکش لوگوں کی دیہاتی جماعتوں نے دریا کے اتار چڑھاؤ کی روش دیکھی زرخیز کرنے والی طغیانیوں پر قابو پانے اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کا فن دریافت کیا اور اِسی دوران میں معاً ایک تقویم نکالی، ایک فنِ تحریر ایجاد کیا اور ایک منتظم حکومت کی بنیاد ڈالی +

غالباً شروع شروع میں بہت سی صدیوں تک اِن کثیر تعداد نو آبادیوں میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی - لیکن جوں جوں بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریاتِ زندگی زیادہ ہوئیں - اس قسم کی حکومت کی ضرورت محسوس ہونے لگی - دریا پر سب کی زیست کا انحصار تھا - اس لئے قحط سالی کے زمانے میں لازم قرار پایا کہ کوئی مشترک حاکم آبپاشی کے طریقوں اور غلہ کے ذخیروں کا مناسب انتظام کرے - غرض اس طرح بتدریج یہ جداگانہ خود مختار آبادیاں مصر بالائی کی ایک سلطنت میں مربوط ہو گئیں - اس پر طرہ یہ کہ چونکہ دریا جس کا منبع کسی کو معلوم نہ تھا اور جس کے چڑھاؤ اتار کا بھید کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا کسی خدا کا ہدیہ سمجھا جاتا تھا - لہذا بادشاہ یا فرعون کی بابت رفتہ رفتہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ خدا کا اعلیٰ ترین نمائندہ بلکہ خود ہی مجسم خدا ہے - اس طور پر مذہبی حرمت نے اس کے عہدے کو اتنی فوقیت دے دی - کوئی زبردست سے زبردست حاکم کے آگے چون و چرا نہ کرسکتا تھا +

مرور زمانہ کے ساتھ غالباً ۳۵۰۰ ق م کے [illegible]

تاریخ دُنیا پر ایک نظر

حصّۂ دوم، مشرق کے قدیمی تمدّن

(۹)

مصر

ملک مصر اور اُس کے اصلی باشندے ۔ چھٹی صدی ق م میں جب یہودا کے بادشاہوں نے
عظیم الشان بابلی شاہنشاہ کے خلاف مصر کے ساتھ رابطہ پیدا کیا تو اس ملک کی طاقت اس سے پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن
اس کمزوری کی جگہ کبھی وہ قوت و تمدن جلوہ گر تھا جس کی غیر معمولی شان و شوکت دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ مصر
کا تمدن قدیم ترین تمدنوں میں سے تھا۔ بعض فاضل مورخین کا تو خیال ہے کہ مصر تمدن کا پہلا گھر تھا اور نیل کی وادی ہی
انسان نے پہلے پہل متمدن زندگی کے فنون سیکھے ۔ لیکن حال کے اکتشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی افریقہ میں نہ
بلکہ جنوب مغربی ایشیا میں، بابل میں اور اس سے بھی پہلے ایلم کی قدیمی سرزمین میں اوّل اوّل تمدن کی بنیاد پڑی ۔

تاہم مصری تمدن کی انتہائی قدامت اور رفعت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ مصر کی زمین کا محل وقوع ابتدائی
زراعت کی آباد کاری اور ایک پُر امن حکومت کے نشو و نما کے لئے نہایت موزون تھا۔ یہ ایک غیر معمولی سرسبزی کا ملک
تھا جس کا سب سے بڑا سبب نیل کی طغیانیاں اور کوہستان ابی سینیا کی نئی زمین کی زرخیز مٹی تھی جو یہ عظمت آب
اپنے ہمراہ لاتا اور چاروں طرف کھیتوں میں بکھیر دیتا۔ اس کی آب و ہوا پیداوار کے لئے مفید اور نوع انسان کے لئے
آرام دہ تھی۔ اور یہ بات بھی کچھ کم نہ تھی کہ قدرت نے مصر کو جنگی اور آوارہ گرد بدویوں کے حملوں سے بچائے رکھنے کی صورت
پیدا کر دی تھی۔ اس کے تین طرف لق و دق صحرا اور چوتھی طرف سمندر تھا صحرائے اعظم کے وسیع دشت لیبیوں سے اُسے محفوظ رکھتے
تھے نوبیا کے صحرا حبشیوں کو یہاں تک پہنچنے سے روکے ہوئے تھے اور سینا کا احاطہ جزیرہ نما عرب اور اُس کے درمیان حائل تھا لیکن
مصر محفوظ تھا وہ دنیا سے علیحدہ نہ تھا۔ یہ ایک بڑی نتیجہ خیز بات تھی کیونکہ اگر علیحدگی ہوتی تو رکاوٹ بھی ساتھ ہی پیدا ہو
جاتا۔ اگرچہ حملہ آور فوجوں کی وہاں تک رسائی نہ تھی لیکن گلہ بانوں اور تاجروں کے چھوٹے چھوٹے قافلے ایک شخلہ

سے دوسرے نخلستان تک آسکتے تھے اور آئے۔ بیرونی دنیا سے اِن تعلقات کے قیام و تسلسل نے مصری ذکاوت کو تیز تر کردیا +

مصری آب و ہوا کی قلتِ باراں اور نیل کی پہنچ سے دُور اُس کی مٹی کے ریتیلے پن کے باعث مصر کے آثارِ قدیمہ کا ایک مکمل اور مختلف النوع سلسلہ نہایت عمدگی کے ساتھ آج تک محفوظ رہا ہے۔ اِن سے ظاہر ہے کہ مدتیں ہوئیں حجریہ زمانوں میں اس خطہ کا اُن خانہ بدوش شکاریوں اور صحرانورد گلہ بانوں کو علم تھا جن کے ہم نسل بعد میں قرب و جوار کے صحراؤں اور سبزہ زاروں میں گھومتے رہے۔ اِن اصلی باشندوں کو (جو غالباً حبشی النسل تھے) ۵۰۰۰ ق م کے قریب حامی نووارد ملک سے نکال کر یہاں بس گئے جو عرب سے چل کر بحرِ احمر کے پار آئے اور نیل کی وادی کے بالائی حصے میں جہاں بعد میں کوپٹس، ابی ڈوس، تھیبز اور کارنک کے شہر واقع تھے آباد ہو گئے +

اس دوران میں نیل کے دہانے کے قریب اس مثلث نما قطعے میں جو دریا کے بھراؤ سے بن گیا تھا مغرب سے لیبیا کی قومیں اور مشرق سے سامی گلہ بان آباد ہو رہے تھے +

قیامِ سلطنت۔ مصر کا حقیقی تمدن نیل کی بالائی وادی کے گہوارے میں پھولا پھلا۔ یہ تمدن ۵۰۰۰ھ سے لے کر ۳۵۰۰ ق م تک وضع ہوا۔ یہاں اس تنگ زرخیز خطے میں جس کے دونوں طرف لق و دق صحرا تھے جفاکش لوگوں کی دیہاتی جماعتوں نے دریا کے اتار چڑھاؤ کی روش دیکھی زرخیز کرنے والی طغیانیوں پر قابو پانے اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کا فن دریافت کیا اور اِسی دوران میں معاً ایک تقویم نکالی، ایک فنِ تحریر ایجاد کیا اور ایک منتظم حکومت کی بنیاد ڈالی +

غالباً شروع شروع میں بہت سی صدیوں تک اِن کثیر التعداد نوآبادیوں میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی۔ لیکن جوں جوں بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریاتِ زندگی زیادہ ہوئیں۔ اس قسم کی حکومت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ دریا پر سب کی زیست کا انحصار تھا۔ اس لئے قحط سالی کے زمانے میں لازم قرار پایا کہ کوئی مشترک حاکم آبپاشی کے طریقوں اور غلہ کے ذخیروں کا مناسب انتظام کرے۔ غرض اس طرح بتدریج یہ جدا گانہ خودمختار آبادیاں مصر بالائی کی ایک سلطنت میں مربوط ہو گئیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ چونکہ دریا جس کا منبع کسی کو معلوم نہ تھا اور جس کے چڑھاؤ اُتار کا بھید کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا کسی خدا کا ہدیہ سمجھا جاتا تھا۔ لہذا بادشاہ یا فرعون کی بابت رفتہ رفتہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ خدا کا اعلےٰ ترین نمایندہ بلکہ خود ہی مجسم خدا ہے۔ اس طور پر مذہبی حرمت نے اس کے عہدے کو اتنی فوقیت دے دی کہ کوئی فردِ بشر اُس کے حکم کے آگے چون و چرا نہ کرسکتا تھا +

مرورِ زمانہ کے ساتھ غالباً ۳۵۰۰ ق م کے جلد ہی بعد مصر بالائی کے بادشاہ نے مصرِ اسفل پر اپنا اقتدار جمالیا

اس تاریخ سے مصر کے "خاندانِ شاہی کی تاریخ" شروع ہوتی ہے - وہ فنِ تحریر جس کی ایجاد زیادہ تر شاہی احکام کو اس نادر الشکل سلطنت کے کونے کونے تک پہنچانے کے واسطے ہوئی تھی اُسی کے نتیجے ہیں - چٹانوں اور تختیوں کے وہ کتبے جن سے آئندہ تین ہزار سال کے چھبیس خاندانوں کے حالات ہم تک پہنچے ہیں - تین خاندان تو ابی دوس میں کچھ نامعلوم سے رہے - چوتھے خاندان نے اپنا دارالسلطنت دہانۂ نیل کی مثلث کے سرے پر بمقام ممفس بنایا اور اس شہر کے قرب جوار میں بطور مقبروں کے وہ اہرام (اندازاً ۲۹۰۰ ـــ ۳۰۰۰ ق م میں) تعمیر کئے جو ابھی تک دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں +

لیکن مصری تاریخ کے پُرامن دوران میں ۲۰۰۰ ق م کے قریب ایک بڑا ہولناک حادثہ ہوا - حملہ آوروں کے ایک گروہ نے جو مشرق سے سینا کے رستے سے آئے تھے سلطنت پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا - وہ ہیکسوس یا صحرا کے شاہی شہزادے کہلاتے ہیں - چار صدیوں (۱۵۰۰ ق م) تک مصر برابر ان کی ذلیل غلامی میں رہا +

عروجِ سلطنت اور زوال - اجنبی ہیکسوسوں کے مظالم کا خاتمہ یوں ہوا کہ مصریوں نے خود بخود مصر بالائی میں بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا - اس وقت تک وادیٔ نیل کے باشندے جنگجو نہ تھے - امن و محافظت اور معتدل آب و ہوا نے اُن کے طبائع کو نرم بنا رکھا تھا - ہیکسوس جو جنگی رتھوں اور گھوڑوں کو لئے ہوئے مصر پر چڑھ آئے بآسانی فتحیاب ہوئے - لیکن طویل غلامی کی مصائب نے امن پسند مصریوں کے مزاج میں ایک بڑا تغیر برپا کر دیا - چنانچہ ہیکسوسوں کو ملک سے باہر نکال کر انہوں نے جارحانہ جنگ و جدل کا سلسلہ شروع کر دیا اور ایک مصری قلمرو کی بنیاد ڈالی جس کی حدود اپنے عروج کے وقت مشرق میں فرات اور شمال میں ایشیائے کوچک کی سرحد تک پہنچتی تھیں - جنوب کی طرف نوبیہ کو نیل کے تیسرے آبشار تک ملحق کر لیا گیا - سب سے زیادہ شان و شوکت کا زمانہ اٹھارہویں شاہی خاندان کے وقت میں تھوتمس سوم (تقریباً ۱۵۰۱ تا ۱۴۴۷ ق م) کے عہد سے امین ہٹپ دوم (تقریباً ۱۴۱۲ تا ۱۳۷۶ ق م) کے عہد تک کا تھا +

امین ہٹپ سوم کی موت پر وہ بادشاہ تخت آرا ہوا جو بلاشبہ زمانۂ قدیم کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار ہونے کے قابل ہے - اس کا نام شروع میں امین ہٹپ چہارم تھا لیکن قدیمی مذہب کو جس کا اعلیٰ ترین سردار وہ خود مانا جاتا تھا ترک کرنے کے ساتھ اس نے اپنا نام بدل کر آکن آٹن کر لیا - اُس نے مصر میں ایک خالص روحانی وحدانیت کو رائج کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ صرف ایک خدائے قدیر کی پرستش کرنی چاہئے جو سب انسانوں کا باپ اور سچا خدا ہے - اس مجوزہ مذہبی اصلاح کے خیال نے مصر میں ایک طوفان برپا کر دیا اور مرکزی حکومت کی طاقت اس قدر کمزور ہو گئی کہ اس کی وسیع سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا - آکن آٹن کی موت پر ۱۳۶۲ ق م میں پرانا مذہب پھر قائم ہو گیا اور توتنخ امین

(۱۳۶۰ تا ۱۳۵۰ ق م) کے تحت میں جس نے پروہتوں کی فرمانبرداری کا اظہار کرنے کے لئے اپنا نام توتنخ امین کرلیا، وہ مذہب پھر اسی قدیمی شکل میں رائج ہوگیا +

اُنیسویں شاہی خاندان کے عہد میں جو ۱۳۲۱ ق م میں قائم ہوا مصری قلمرو پھر اُبھری اور رعمسیس دوم (تقریباً ۱۳۰۰ تا ۱۲۳۴ ق م) کے وقت میں وہ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ایشیائے کوچک کے ہتیوں کے ساتھ ایک شدید مفصل کن جنگ کے بعد مصریوں نے فلسطین شام اور فینیقیا پر پھر اپنا قبضہ جما لیا۔ لیکن یہ قبضہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ انیسویں شاہی خاندان کے خاتمے پر (تقریباً ۱۲۰۵ ق م میں) آخرکار زوال کا زمانہ تیز رفتاری کے ساتھ شروع ہوگیا۔ خاص مصر میں شاہی طاقت کی جگہ پروہتوں کی نقاہت اثر حکومت نے لے لی۔ بیرونی دنیا میں نئی نئی طاقتیں اُبھریں جنہوں نے بلاد مصر کے مقبوضات کو فتح کیا۔ اور بالآخر خود مصر کو مغلوب کرلیا۔ مصر کو یکے بعد دیگرے (۶۷۰ ق م میں) اشوریوں (۵۲۵ ق م میں) ایرانیوں (۳۳۲ ق م میں) اسکندر اعظم کے مقدونیوں اور (۳۰ ق م میں) رومیوں نے فتح کیا +

مصری تمدن ۔ ان فتوحات سے بہت عرصہ پیشتر مصری تمدن کے دن بیت چکے تھے۔ مصر بےحس و حرکت اور منجمد ہوکر اور پروہتوں کے قدموں میں نڈھال پڑا تھا۔ بلکہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۵۰۰ ق م کے قریب ہی مصر کی بہترین آزادی اختراع کاری اور توانائی کا زمانہ ختم ہوچکا تھا۔ چوتھے اور پانچویں شاہی خاندان کے عہد میں اہرام عظیمہ کی تعمیر ہی سے ظاہر ہے کہ وہ ایک شاہی مطلق العنانی کا زمانہ تھا جب غلامی عام تھی اور موت اور آئندہ زندگی کا بہت چرچا رہتا تھا۔ اور یہ باتیں تنزل کی صریح نشانیاں ہیں۔ اُس وقت بھی مصریوں کی ذکاوت محض مقبروں اور مندروں پر صرف ہورہی تھی جو بجائے خود عظیم الشان یادگاریں تھیں لیکن جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے دل ضعیف الاعتقاد اور خیالات غلامانہ ہوچکے تھے +

لیکن اپنے زوال سے پہلے مصر نے وہ بنیاد اُستوار کردی تھی جس پر بعد موجودہ تہذیب نے اپنی عمارت بنائی۔ اپنے تمدن کی بیس تخلیقی صدیوں میں (اندازاً ۴۵۰۰ سے ۲۵۰۰ ق م تک) مصر نے وہ دریافتیں اور وہ ایجادیں کیں جو نوع انسانی کی معاشرتی میراث کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ اُس نے زراعت کے فن اور آبپاشی کے طریقوں کو اعلےٰ معیار پر پہنچایا۔ اُس نے ایک تقویم بنائی جو سورج کی ظاہرہ حرکتوں پر مبنی تھی اور جس میں تھوڑا سا ردوبدل کرکے موجودہ دنیا کی تقویم تیار کی گئی ہے۔ اُس نے اجرام فلکی کے درست مشاہدات قلمبند کئے جس سے بعد کے یونانی علم ہیئت کے لئے رستہ کھل گیا۔ اُس نے یا تو پہلے پہل دھاتوں کو دریافت کیا یا اُنہیں پہلے پہل استعمال کیا اور دھاتوں کے اوزاروں سے بڑھئی اور معمار کے کام کو بےانتہا ترقی دی۔ اپنی فلک بوس تعمیرات کے دور میں جب اُس نے اہرام، معابد، محلات اور مقابر بنائے اُس نے مساحت کا فن نکالا اور اپنے حیرت انگیز فہم و ذکاوت سے اُس نے ایسے ایسے نفیس نقشے

تیار کئے جن پر حال کے ماہرانِ تعمیرات عش عش کرتے ہیں - اُس نے بحری جہاز بنائے اور بیرونی دنیا سے تجارت کا ایک سلسلہ قائم کیا جس کے اجرا و استحکام کی غرض سے اُس نے ایک قسم کا سکہ رایج کیا اور مبادلہ کا طریقہ نکالا - اُس نے کاتنے اور بننے، ٹوکری اور برتن بنانے مینا کاری اور زیورات تیار کرنے کے فن و حرفت ایجاد کئے - نقاشی اور تعمیر، کتابت اور آرائش قانون اور حکمت، حکومت اور مذہب غرض متمدن زندگی کے ہر شعبے میں مصر نے ایسی ایسی ترقیاں کیں جو اُس سے پہلے کسی قوم سے یا کسی زمانے میں نہ ہوئی تھیں +

---

(۱۰)

ایشیائے کوچک اور بحیرۂ ایجین

اناطولیا کی سطحِ مرتفع - مصری قلمرو کی شمالی حدود اپنے کمال کے زمانے میں بھی طارس (کراماں) کے پہاڑوں سے جو شام اور ایشیائے کوچک کے درمیان حائل ہیں متجاوز نہ ہوئی تھیں - بلکہ اشوریوں کی زبردست جنگجو حکومت بھی جو مصر کے بعد مشرقِ قریب کے مقبوضات پر متمکن ہوئی اس کوہستان کے پرے اپنا اقتدار قائم نہ کر سکی +

کوہستان طارس کے مغرب کی طرف اناطولیا کی ناہموار و غیر آباد بلند سرزمین واقع ہے - یہ چونے کے پتھر کی ایک بڑی مرتفع سطح ہے جو کبھی ایک مدت سے خشک شدہ جھیل کی تگاب تھی - اُس کی اوسط بلندی سمندر سے ۳۰۰۰ فٹ ہے اور اس میں کہیں کہیں اونچی اونچی آتش فشاں چٹانیں اپنا سر نکالے ہوئے ہیں - سطحِ مرتفع کے گرد پہاڑوں کا ایک چکر ہے جو کبھی جھیل کے کنارے تھے اور جو اب گنجان جنگلوں سے ڈھکے ہیں - ان کے پرے زمین یک لخت سمندر کی طرف ڈھلوان ہو گئی ہے لیکن ان جنگلی کوہستانوں اور سمندر کے درمیان بالخصوص جنوبی جانب ایک محفوظ اور زرخیز ساحلی خطہ چلا گیا ہے جسے بحرِ متوسط کی نیلی لہریں تر و تازہ اور شاداب رکھتی ہیں اور جس کی آب و ہوا دنیا بھر میں اپنا نظیر نہیں رکھتی +

اس سطحِ مرتفع پر ہمیشہ سے ایک دلاور پہاڑی آرمینی یا آلپینی نسل کے لوگ آباد رہے ہیں - بے شمار سیاسی حکومتوں کے تغیرات کے باوجود ان کی سیرت اور طرزِ زندگی استوار رہی ہے - ان کا خاص پیشہ ہمیشہ گلہ بانی رہا ہے - سر ولیم ریمزے کی رائے میں انہیں لوگوں نے سب سے پہلے بھیڑ بکری اور سؤر کو پالتو بنایا اور انہیں اپنے کام میں استعمال کیا لیکن ان ابتدائی گلہ بانوں کے ہاں بالخصوص اُن قحط سالی کے دنوں میں جب ان کے گلے پیاس سے ہلکان ہو جاتے تھے

ساتھ ہی ساتھ سرسبز ساحلی آبادیوں پر جہاں زیادہ نرم مزاج اور صلح پسند قومیں آباد تھیں، چھاپے مارنا بھی معمولِ زندگی تھا +

یہ واقعہ ہے کہ کئی صدیوں تک نہ صرف ایشیائے کوچک کے ساحلی خطے بلکہ شام اور دوآبہ کے میدان یعنی اشوریا اور بابل کی سلطنتیں بھی بارہا ان اناطولیوں کی یورشوں سے تہ و بالا ہوئیں +

یہ تباہ کن یورشیں، جب لوہا استعمال میں آنے لگا تو اور بھی ہیبت ناک ہوگئیں۔ کیونکہ اناطولیا کے شمالی پہاڑ جو دریائے ہیلس (قزل ارماق) کے مشرق کو واقع تھے اس زمانے میں کچے لوہے کا سب سے بڑا ذخیرہ تھے۔ یہاں اُن کے لوہے کے ہتھیار بنتے تھے اور ان سے مُسلح ہوکر ان کوہستانی قوموں نے اپنے ہمسایوں پر دور دور تک اپنا اقتدار جما لیا +

ہتّی سلطنت۔ اِن اناطولی لٹیروں کو اس زمانے میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ لیکن وہ نام جو سب سے زیادہ مشہور ہوا ہتّی تھا۔ سب سے پہلا مشہور ہتّی حملہ جس کا ذکر تاریخ میں آیا ہے ۱۹۲۵ ق م کے قریب ہوا جب ان لوگوں نے بابل کو فتح کیا وہاں کے بادشاہ کو مار ڈالا اور لوٹ مار کا سارا مال طارس (کوہ کرامان) کی حد کے پار لے گئے +

ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ ان ہتّیوں کے ہر وقت کے خوف وہراس نے کس طرح اشوریوں کو ایک فوجی قوم بنا دیا جو ہر وقت جنگ وجدل میں منہمک رہتی تھی۔ لیکن ہتّی طاقت کا کمال چودھویں صدی ق م میں جا کر ہوا۔ جب مصر میں آکن آٹن (۱۳۷۶ تا ۱۳۶۲ ق م) کے مذہبی انقلاب کی خرابیوں نے فلسطین، فینیقیا اور شام پر مصری حکومت کا زور ہلکا کر دیا۔ اس وقت یہ ہتّی اپنے اُس بادشاہ کے تحت میں جس نے شُبّی لُلی اُوما کا عجیب وغریب نام فخریہ اختیار کیا (۱۳۸۵ تا ۱۳۴۵ ق م) اپنے سب سے بڑے شہر ختّی سے جو موجودہ شہر بوغاز کی کے مقام پر واقع تھا نکلے اور انہوں نے ارمنی پہاڑوں سے لے کر سینا کے صحرا تک کا سارا وسیع خطہ فتح کر لیا +

لیکن ہتّی تسلط چند روزہ تھا۔ رعمسیس کے عہد میں (۱۳۰۰ تا ۱۲۳۴ ق م) مصری قوت کی بحالی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ زمانۂ قدیم کی ایک سب سے بڑی خوفناک جنگ وہ تھی جو اورنتیس پر بمقام قادیش رعمسیس (جو خود شریکِ جنگ تھا) اور ہتّیوں کے بادشاہ مُرسل کے درمیان تقریباً ۱۲۹۵ ق م میں ہوئی اور جس کا نتیجہ ہتّیوں کی تباہی اور مصر کا اپنے چھنے ہوئے علاقوں پر پھر قبضہ حاصل کر لینا ہوا +

اس مشہور واقعہ کے بعد ہتّی اور مصری حکمتِ عملی میں ایک عجیب تغیر واقع ہوا۔ دونوں طاقتوں نے آپس میں (۱۲۷۹ ق م میں) ایک اتحاد قائم کیا اور بعد میں اس کو مضبوط کرنے کی غرض سے باہمی شادیاں اور دونوں قوموں کے خداؤں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس عجیب تغیر کا سبب یہ تھا کہ دونوں قوموں نے اشوریوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا جائزہ لے لیا

تھا۔ اور اس ہیبت ناک خطرے کو بھی تاڑ لیا تھا جو شمال اور مغرب کی اطراف سے بڑھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یعنی ہندی
یورپی نسلوں میں ایک ہیجان برپا تھا۔ دریائے ڈینیوب کے پار سے بحرِ اسود کے اُس کنارے سے ماوراء قفقاز کے میدانوں
سے اور بحرِ خزر کے ساحلوں کے چاروں طرف خوفناک شکاریوں اور گلہ بانوں کی نئی قوموں کی موجودگی کا دنیا کو احساس
ہو رہا تھا۔ اناطولیا پر وہ ہیلس (قزل ارماق) اور سنگیریس (سکاریہ) کی وادیوں کی طرف سے خوب حملے کر سکتے تھے لیکن
ایجیئن میں ٹرائے کے علاقے میں تھیالیہ کے میدان میں مائی سینی کے قرب وجوار میں اور جزیرہ کریت کی سلطنت میں اُن
کے حملوں کا پورا زور نظر آ رہا تھا۔ مصریوں اور ہتّیوں کے باہمی عہدنامے سے بہت پہلے منوی تمدن کو ان نئے حملہ آوروں
نے سخت صدمہ پہنچایا +

کریتی بحری طاقت۔ اُن اکتشافات سے جو شلائی مان نے ۱۸۷۲ء میں پہلے قدیمی ٹرائے اور پھر مائی سینی
کے موقعوں پر جاری رکھے اور پھر سر آرتھر ایونز نے جزیرۂ کریت میں بمقام نوسوس اسی سلسلے میں کئے یہ بات جس کا کسی کو
سان گمان بھی نہ تھا دریافت ہوئی کہ تقریباً ۳۰۰۰ سے ۱۲۰۰ ق م تک بحیرۂ ایجیئن اور اُس کے گرد و نواح میں ایک اعلیٰ
درجہ کا تازہ و نادر تمدن قائم رہا۔ ہومری معاصرۂ ٹرائے جو روایتہً ۱۱۹۴ سے ۱۱۸۴ ق م تک جاری رہا یونانی تاریخ کے
دلچسپ ناٹک کا صرف پہلا منظر ہی نہ تھا بلکہ وہ اُس شائستگی کے غمگین ناٹک کے آخری منظروں میں کا ایک تھا جو بعض
صورتوں میں خاص یونانی تمدن سے بڑھ چڑھ کر تھا +

ایجیئن کا خطہ انسان کی رہائش کے لئے خاص طور پر موزوں تھا۔ وہاں سمندر جزیروں سے ہر طرف اس طرح گھرا
ہوا ہے کہ وہ تقریباً ایک جھیل سی بن گیا ہے اور اُس میں چھوٹے جہازوں اور کشتیوں کے لئے بھی جہازرانی کرنا ایک آسان
کام ہے۔ یہاں کی آب و ہوا خوشگوار ہے۔ سورج عموماً چمکتا رہتا ہے لیکن بہار کے دنوں میں اتنی کافی بارش ہو جاتی ہے
کہ گیہوں اور باجرہ، انگور اور زیتون کی کاشت کچھ دشوار نہیں ہوتی۔ اندرونِ ملک اور ساحل کے پہاڑی علاقے میں ہری
بھری گھاس اس کثرت سے ہوتی ہے کہ اس سے گلوں کے لئے چارہ خود بخود فراہم ہوتا رہتا ہے +

اس خطے میں اور بالخصوص جزیرۂ کریت میں بتدریج ایک ایسی طرزِ زندگی کا نشو و نما ہوا جس پر گو بعد میں مصر اور بابل
دونوں کا معتدبہ اثر پڑا لیکن اُس میں اپنی ہی ایک شان و نزاکت تھی۔ یہ لوگ جن میں یہ ایجیئن شائستگی نمایاں ہوئی پست
قد، گندم گوں، "متوسط نسل" کے تھے اور اس لئے وہ آریائی ہتّیوں، سامی فینیقیوں اور دہانۂ نیل کے حامی باشندوں یعنی
اپنے تمام ہمسایوں سے مختلف النسل تھے۔ اُن کی قلمرو جو کچھ بھی تھی ایک بحری قلمرو تھی اور اپنے عروج کے دنوں میں
تقریباً ۱۶۰۰ – ۱۵۰۰ ق م) کریت کے فرمانروا بعض اوقات بحری بادشاہ کہلاتے تھے۔ لیکن اُن کا واسطہ بجائے

ر و جنگ کے زیادہ تر حرفت و تجارت سے تھا۔ اُن کے شہر شروع شروع میں بے فصیل تھے اُن کے جہاز تجارتی جہاز تھے
ر اُن کی زندگی امن کی زندگی تھی +

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ علاقہ ایجیئن کی سرحد پر کبھی کسی پرائیم[1] نے شمالی حملہ آوروں کے خلاف اپنے شہر کی قلعہ بندی
ہو اور کبھی کسی ہیکٹر[2] نے سدا کامران اکیلیز[3] کا مقابلہ کرنے کی جرأت کی ہو لیکن یہ ہئیتِ مجموعی ایجیئن بہت غیر محفوظ
ممکن الفتح تھا۔ بالخصوص کریٹ کا جزیرہ جو منوئی تمدن کا منبع و ماویٰ تھا، حملہ آوروں کا جلد شکار ہو گیا۔ نوسوس میں
ں کے بادشاہوں کا عظیم الشان محل جو قدیم شاہی محلات میں سب سے حیرت انگیز تھا ۱۴۰۰ ق م کے قریب مسمار کر
یا گیا۔ اس زمانے کے دو سو سال کے اندر اندر بحیرۂ ایجیئن کے جزیروں کے تمام ساحلی مقامات پر نئے وحشیوں کا قبضہ ہو
یا اور کریٹی شائستگی روپوش ہو گئی۔ لیکن یہ نئے وحشی یونانیوں کے آبا و اجداد اکائی اور دوریائی تھے اور اگرچہ انہوں نے اس
مدن پر پردہ ڈال دیا لیکن انہوں نے اُسے تباہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ اور اُن کے بعد آئیونی اُس کے شیدائی ہو گئے اور اُسے
راستہ پیراستہ کر کے انہوں نے اُسے دُنیائے حال کے سامنے پیش کیا +

---

[1] پرائم (Priam) ٹرائے کا بادشاہ اور ہیکٹر اور پیرس کا باپ تھا۔ اس کا نام یونانی شاعری اور یونانی داستانوں میں اُس کے
ور اُس کے خاندان کے اندوہناک انجام کے باعث مشہور ہو گیا۔ یہ مصائب خود اُس کے بیٹے پیرس کے ہاتھوں اس پر پڑیں۔ پیرس یونان
ے ہیلن کو جو اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھی ٹرائے میں لے آیا تھا۔ یونانیوں نے ہیلن کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن پیرس نے اس سے
نکار کر دیا۔ اس پر یونانیوں نے ٹرائے کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ دس سال تک انہوں نے شہر کا محاصرہ کیا اور آخر اُس پر غلبہ حاصل کر کے
ے تاخت و تاراج کر دیا اور پرائم کے بیٹے ہیکٹر کو اُس کی نظروں کے سامنے قتل کر دیا +

[2] ہیکٹر (Hector) بادشاہ پرائم اور ملکہ ہیکیوبا کا بیٹا اور اینڈرومیک کا خاوند ٹرائے کی افواج کا کپتان تھا اور اپنی قوم میں سب سے
بہادر تصور کیا جاتا تھا۔ یونانیوں کو اس نے بہت سی شکستیں دیں لیکن آخر کار اکیلیز کے ہاتھوں مارا گیا۔ اکیلیز کو اُس کے تعاقب میں تین دفعہ ٹرائے
کی دیواروں کے گرد چکر لگانا پڑا۔ اکیلیز نے اُس کی نعش کو اپنی رتھ کے پہیوں کے ساتھ باندھ دیا اور دیر تک اُسے گھسیٹتا رہا۔ جو پیٹر (زیوس) نے
مداخلت کر کے حکم دیا کہ نعش پرائم کے حوالے کر دی جائے جس کے بعد اس بہادر سپاہی کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ انسانوں میں
کوئی انسان ہیکٹر کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس جنگ میں محض ہنروا کے دھوکے سے اُسے ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ الیڈ کی داستان کا بہترین حصہ وہ ہے
جہاں ہیکٹر اپنی بیوی اینڈرومیک سے رخصت ہو رہا ہے یہاں وہ ایک شہزادہ ایک خاوند اور ایک باپ ہونے کی حیثیت سے بہترین احساسات کا اظہار کرتا ہے +

[3] اکیلیز (Achilles) یونانی صنمیات کا ایک بطلِ عظیم تھا۔ اور ہومر کی کتاب الیڈ کا ہیرو۔ ہومر کے بیان کے مطابق وہ تھسلی کے

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

منوئی تمدن۔ اُن اکتشافات سے جو (۱۸۷۶ء میں) مائی سینی (۱۸۸۴ء میں) ٹرنز اور بعد میں (۱۸۹۳ء میں) ٹرائے میں ہوئے، کانسے کے زمانے کے ایک تمدن کا پتہ چلتا ہے، جس کی یادگاریں بڑی بڑی تعمیرات سنگتراشی کے اعلےٰ نمونے مٹی کے نفیس برتن اور دھاتوں کی مرصع کاریاں ہیں۔ لیکن کریتی تمدن کی صحیح شان وعظمت کا اندازہ اس وقت ہؤا جب سر آرتھر ایونز نے موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں بمقام نوسوس کریت کے بحری بادشاہوں کے عظیم الشان محل کو بے نقاب کیا۔ اس وقت تک اِس تمدن کے لئے "مائی سینی" کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ کیونکہ مائی سینی کے اکتشافات میں اس کے فن کے بہترین ومکمل ترین نمونے پائے گئے تھے۔ لیکن اس وقت سے اس کی جگہ "منوئی" کا لفظ استعمال ہونے لگا کیونکہ "منوس" ایک مشہور فرضی کریت بادشاہ یا شاہی خاندان کا نام تھا اور "منوئی" سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس تمدن کا منبع کریت کا جزیرہ تھا نہ کہ برّ اعظم +

نوسس کا محل جو ایک بڑی عمارت کیا ایک پیوستہ شہر تھا حیرت انگیز طور پر ایک زمانۂ حال کی تعمیر معلوم ہوتا ہے۔ اس کے وسیع ایوان، اِس کے برآمدے، اس کے شہ نشین، اس کے قطار در قطار ستون اِن سب کا تناسب اور خوبصورتی حیرت افزا ہیں۔ اس کی بدرروؤں کے مکمل نظام کی نہ صرف اُس وقت کے مصر یا بابل میں کوئی مثال مل سکتی تھی بلکہ ایک ہزار سال بعد تک بھی جب روما اپنے کمال پر تھا دنیا اس کی نظیر پیش نہ کر سکی + اس کی خستہ دیواروں کی تصویری آرائشیں ظاہر کرتی ہیں کہ ایک زمانے میں وہاں کا فنِ تصویر کشی اس قدر مائل بہ فطرت تھا کہ نیل یا فرات پر کہیں اس کا مقابلہ نہ ہو سکتا تھا۔ منوئی برتنوں کے نقشے کی نزاکت اُن کے رنگ و روغن کی خوبصورتی اور اُن کی میناکاری کی دِقّتِ نظر قابلِ دید ہے۔ ان سے بھی بڑھ کر اُس کا سونے کا جڑاؤ کام ہے جس میں انسانوں اور

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

ایک صوبے کے بادشاہ پیلیوس اور بحری دیوی تھیٹس کا بیٹا تھا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ اُس کی ماں نے دریائے سٹکس میں غوطہ دے کر اُس کے بدن کو ایسا مضبوط بنا دیا کہ اُس کو کوئی صدمہ نہ پہنچا سکتا تھا +

سٹکس یونان اور روما کے صنمیات میں پاتال لوک کے ایک دریا کا نام ہے۔ جب دیوتا اپنی کسی قسم کی عظمت کو خاص طور پر ظاہر کرنا چاہتے تھے تو وہ اس دریا کی قسم کھایا کرتے تھے۔ سٹکس دراصل آرکیڈیا میں ایک چشمہ تھا جو ایک بلند ٹیلے سے پھوٹتا تھا۔ اس کا پانی انسانوں اور حیوانوں کے لئے زہرِ قاتل سمجھا جاتا تھا۔ دھاتیں اس میں گل جاتی تھیں اور برتن اس میں ڈالنے سے ٹوٹ جاتے تھے۔ اکیلیز کو غوطہ دینے میں اُس کی ایک ایڑی جہاں سے اُسے ماں نے پکڑ رکھا تھا سوکھی رہ گئی اور اس میں وہ قابلیت پیدا نہ ہوئی جو اس کے سارے جسم کو حاصل ہو چکی تھی۔ وہ پچاس جہازوں میں اپنی فوجیں ٹرائے والوں کے خلاف لیکر گیا۔ یونانیوں نے ٹرائے کا محاصرہ کر لیا اور بادشاہ ساحلی اور گیارہ اندرونی قصبوں کو تباہ کر دیا۔ میدانِ جنگ میں اکیلیز نے ہیکٹر کو قتل کیا اور اس کے علاوہ اور بہت سے شجاعت کے کام کئے۔ آخر کار پیرس کے ہاتھوں ایڑی میں ایک تیر کا زخم کھا کر مر گیا +

جانوروں کی نفیس اور بانکی تصویروں سے ایک ایسا پختہ مذاق اور ایسا ہنر آیئنہ ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کی ہوشیاری اس کے آگے سرنگوں ہے +

حقیقت یہ ہے کہ منوئی تمدن جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے نہایت بلند پایہ تھا۔ صرف یونان کا تمدن جس کا یہ سرچشمہ تھا اس پر فوقیت لے گیا۔ اس کے علمی کارناموں سے ہم ابھی تک بے بہرہ ہیں کیونکہ اس کی تحریر ابھی تک ہمارے لئے اِک رازِ سربستہ ہے۔ اخلاقی لحاظ سے جہاں تک ہمیں علم ہے اس میں پستی و عیش پرستی کا عنصر شامل تھا۔ لیکن یہ اظہر من الشمس ہے کہ شمالی وحشی جو ۱۲۰۰ ق م سے آٹھ صدیاں پہلے یہاں وارد ہوکر ہر طرف اس سرزمین میں بس گئے اور آخر کار اس کے مقامات پر اپنا قبضہ جما بیٹھے۔ جب اس تمدن سے آشنا ہوئے تو انہوں نے گویا حیرت و مسرت کی ایک نئی دنیا اپنے سامنے جلوہ گر دیکھی +

بشیر احمد

زورقِ حیات

صبح صبح یہ آواز کانوں میں پڑی تھی کہ ہم کشتی میں سوار ہو کر جائیں گے، صرف تو اور میں، اور دنیا کا کوئی انسان ہمارے اُس مقدس سفر سے واقف نہ ہونے پائے گا جس کی نہ کوئی منزل ہے نہ کوئی انتہا۔

اُس بحرِ ناپیدا کنار میں لہروں کی طرح آزاد، الفاظ کے بندھنوں سے آزاد تیرے تبسمِ خاموش پر میرے گیت نغمے بن بن کر نکلیں گے۔

کیا ابھی وقت نہیں آیا؟ کیا ابھی کام باقی ہے؟ لو، شام ساحل پر چھا گئی اور ماند پڑتی ہوئی روشنی میں بحری پرندے اڑتے ہوئے اپنے گھونسلوں کی طرف آرہے ہیں۔

کون جانتا ہے کہ لنگر کب اُٹھے گا اور کشتی غروبِ آفتاب کی آخری شعاع کی طرح رات کی تاریکی میں غائب ہو جائیگی۔

(ترجمہ)

عبدالعزیز خاں

تجلّیات

پنہائے کائنات میں تیرے سوا ہے کیا! تو مدعا ہے اور مرا مدعا ہے کیا!

پھر قلبِ بے قرار ہے سرشارِ آرزو پھر اعتبارِ وعدۂ فردا ہوا ہے کیا؟

مے خانۂ نشاط ہے یا برقِ جاں گداز معلوم کیا ہو وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا!

جس حُسن کی نقاب ہے رنگینیٔ مجاز اب کیا کہیں وہ جلوۂ رنگیں ادا ہے کیا!

نا آشناسی وہ نگہِ آشنا ہے کیوں! اُن پر بھی حالِ شوق مرا کھل گیا ہے کیا!

برہم ہوئے حضور مری عرضِ شوق پر آخر یہی خطا ہے مگر یہ خطا ہے کیا!

نکلے گا اس سراب سے کب کاروانِ زیست یارب طلسم بندیٔ صبح و مسا ہے کیا!

اے مطربِ بہار! محبّت کا راگ چھیڑ! یہ فکرِ ابتدا و غمِ انتہا ہے کیا!

طوفانِ رنگ و بُو میں مری رُوح کھو گئی رنگینیٔ بہار میں تو ہی چھپا ہے کیا!

دارا و جم گدا ہیں اُسی بارگاہ کے دارا و جم کے در پہ تری التجا ہے کیا!

اس پر نثار کون و مکاں کا سکونِ عیش اللہ! لذّتِ دلِ شورش ادا ہے کیا!

اپنی وفا پہ ناز ہے کیوں اس قدر اثرؔ
سوچا بھی ہے کبھی کہ ترا ادعا ہے کیا!

اثرؔ صہبائی

عدالتیں

پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں

اوّل دیوانی عدالتیں۔ ان کے دروازوں پر دس بجے سے چار بجے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مفصلہ ذیل قسم کی آوازیں دی جاتی ہیں

چلو پکوڑی چند اور قرض محمد

چلو کروڑی مل اور فاقے خاں

چلو لالہ گروی مل اور میاں مرہون الہی

یہ چل چلاؤ غدر کے بعد سے شروع ہوا ہے اور شاید قیامت تک رہے۔ ان عدالتوں کے ہر فیصلہ کا دارومدار بارِ ثبوت پر ہے۔ عجب دیوانے لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ بوجھ تلے دبتے ہیں مگر یہ ثبوت کا بوجھ بعض دفعہ ججوں کی توجہ سے آناً فاناً اِدھر کا اُدھر جا پڑتا ہے۔ ان دیوانی عدالتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ گاؤں میں رسم و رواج چاہے کچھ بھی ہو عدالت میں بعض دفعہ مسل میں وہ ایسا بدلتا ہے کہ خود وہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض دفعہ سیدوں میں بیٹیاں لاوارث اور برہمنوں میں نواسیاں جائز حقدار قرار دی جاتی ہیں۔ مگر سب سے طرفہ داستان ان دیوانی عدالتوں کی یہ ہے کہ ان میں سچ (یا سچ نما جھوٹ) کے لئے بھی میعاد مقرر ہے۔ بارہ سال کے بعد سچ چاہے وہ کتنا ہی صادق کیوں نہ ہو جھوٹ ہو جاتا ہے اور بعض سچ تو بہت ہی جوانا مرگ ہوتے ہیں، تین سال سے زیادہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے +

دوم فوجداری عدالتیں۔ انہیں دیوانی عدالتوں پر یہ فوقیت ہے کہ ان کے بعض شائقین آواز کے محتاج نہیں۔ اپنے ساتھ لوہے کی زنجیر کے سرے پر ایک پولیس کا سپاہی اٹکا لیتے ہیں اور خود بخود داخل ہو جاتے ہیں۔ ان شائقین کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ان پر بڑے سے بڑا بیرسٹر بھی، چاہے وہ لارڈ ریڈنگ ہی کیوں نہ ہو جرح کا سوال نہیں کر سکتا اور ان کو جھوٹ بولنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ بعض دفعہ تو بڑے بڑے گھمنڈا سنگھ اور طرّے باز خاں اس قانونی حق کا فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر عام طور پر یہ حق نتھو، خیرے، رو پے اور ننّدے کے لئے مخصوص ہے۔

سوم مال کی عدالتیں۔ ان کا مرتبہ اول الذکر ہر دو سے بالاتر ہے کیونکہ ان میں اکثر گاؤں کے گاؤں کو طلب

کرلیا جاتا ہے۔ دیگر عدالتوں میں تو انسانوں کی قسمت کا الٹ پھیر ہوتا ہے۔ یہاں زمین کی تقدیر گردش میں رہتی ہے۔ یہ عدالتیں اکثر خود بھی چکر میں رہتی ہیں۔ بُدھو پور کا مقدمہ منگل پور، منگل پور کی جمعبندی سنسان پور، سنسان پور کی فرزندی پور۔ دریاؤں کی برد برآمد کی طرح انپجاب کے دریا سمجھدار ہیں جسے فائدہ پہنچانا ہو اس کی زمین پہلے بُرد کر دیتے ہیں) ان عدالتوں میں جو ایک دفعہ بہ نکلے پھر وہ نکلتا ضرور ہے مگر عرصہ کے بعد۔

چہارم اندھیری مجسٹریٹوں کی عدالتیں۔ یہ سب سے انوکھی ہیں کیونکہ ان میں صلح صفائی کے بلاتنخواہ واعظ جلیس ہوتے ہیں۔ مارپیٹ کا مقدمہ ہو کہ نقضِ امن کا اندیشہ ہو کہ اغوا کی واردات ہو سب کے لئے ایک ہی مجرب تلقین ہے یعنی راضی نامہ۔ ان سب عدالتوں کا جو گرانقدر مجموعی احسان اہلِ پنجاب پر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ پنجاب کی عدالتیں پہلا سبق یہ سکھاتی ہیں کہ انسان اس دنیا میں صرف اپنے لئے زندہ نہیں چنانچہ ان کے فیضان سے گاؤں والوں کی کمائی سے عرضی نویس، وکیل، وکیلوں کے منشی، عدالتوں کے اردلی، اہلمد، ناظر، پولیس کے سپاہی، دیوانی کے پیادے، قید خانے کے برقندازعلیٰ قدرِ مراتب اپنا اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انگلستان کے خود پرست لوگ اس رواداری کے قریب نہیں پھٹکتے۔ گو وہاں ایسی موٹی عقل کے ہیں کہ رشتہ داری، قرابت، دوستی، دشمنی انہیں کسی کا کچھ پاس نہیں بلکہ ایسی عقل کی مار ہے کہ اکثر ملزم خود اقبالی ہوجاتے ہیں۔ دوسرا سبق روحانی ہے۔ ہر مذہب کی روحانی تعلیم کا نصب العین ایک ہی ہے یعنی فنا فی اللہ ہوجانا۔ پنجاب کی تمام عدالتوں کی تقدیس اس ایک بات ہی سے ثابت ہے کہ انہوں نے اس عظیم الشان نصب العین کی پوری تکمیل اپنے ذمے لے رکھی ہے یعنی اس طرح سے کہ پہلے اہلِ مقدمہ پوری طرح فنا ہوتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر صبر کر لیتے ہیں کہ خدا کی مرضی، گویا فنا فی اللہ ہوگئے۔ صاف ظاہر ہے کہ جتنی عدالتیں زیادہ ہونگی اسی قدر روحانی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائیگی اس لئے ملک کے رہنماؤں کا اوّلین فرض یہ ہے کہ اور کاموں کو چھوڑ کر تمام کوششیں اس مرکزی اصول پر جمع کی جائیں کہ ہندوستان کی روحانیت کا تقاضا ہے کہ ہر گاؤں میں ہر قسم کی عدالت قائم ہو اور ہر عدالت کے ہر حکم کی اپیل در اپیل ہوسکے۔ اس اصلاح میں ہر قسم کی اصلاح آجائیگی اور تمام انٹرنس فیل بلکہ مڈل فیل بزرگ بلا دِقت ملک کی خدمت میں لگ جائینگے۔

تیسرا سبق اقتصادی ہے بشرطیکہ کوئی غور کرے۔ مثلاً کہاں دریائے سندھ کے پاس چھچھ کا علاقہ کہاں لاہور کا مشہور بیرسٹر سر ولیم رائیگن مگر چونکہ ذاتِ باری کو منظور نہ تھا کہ چھاچھی لوگ پکے مکانوں میں آسودہ ہوکر رہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے لاہور میں چیف کورٹ قائم کرا دیا۔ چنانچہ چھاچھی جو پہلے قتل کے بدلے صرف قتل کرتے تھے چیف کورٹ قائم ہونے پر قتل کے ساتھ قتل کے علاوہ اپیل کے ساتھ وکیل کرنے لگے اور سابق مسٹر رائیگن کے گھر چاندی کی نہر

ہ مکی۔ صرف مسٹر راٹیگن ہی نہیں بلکہ بابو پرتول چندر چیٹرجی (بعد میں سر پرتول چندر) بھی اسی زمرہ میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدالتیں تو اللہ جل شانہٗ کا الف لیلہ والا الہ دین کا عجیب وغریب چراغ ہیں۔ جس وکیل، بیرسٹر نے اس چراغ کو درست طریقے سے مل لیا۔ اس کے محل تیار ہو گئے۔ اس زندہ اور جاری معجزے کو دیکھ کر جو شخص ذاتِ حق پہ یا کم از کم برٹش گورنمنٹ پر ایمان نہ لائے اس کا اقتصادی مذہب باطل ہے۔ عدالتوں میں دہقانوں کے روپیہ کے لئے وہ مقناطیسی کشش قائم ہو گئی ہے کہ ان کے ہوتے کوئی گاؤں کا رہنے والا اپنے آرام و آسائش میں مستغرق ہو ہی نہیں سکتا۔ صاف مشیت معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ہر قسم کی نعمتیں شہریوں کو عطا ہونگی اور اس کے بعد مناسب موقع پر گاؤں والوں کو عقل دی جائے گی کہ وہ فارغ ہو کر افسوس کریں۔

اب یہ مضمون ختم ہوتا ہے مگر پڑھنے والوں سے اس امر کی داد کی توقع ہے کہ عدالتوں کے ذکر میں انصاف کا لفظ بھول کر بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ مرزا غالب مرحوم کے شعر

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

میں "تیرا" خداوند تعالےٰ کی طرف راجع ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ انصاف مطلق ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انصاف کو مخاطب کر کے یوں یہ شعر نہ پڑھا جائے

لُٹ لُٹ کے ہر کچہری میں دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

یا روحانیت کا اظہار یوں کیوں نہ کیا جائے

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں میں جج کو

بعض کوتہ اندیش لوگ اکثر واویلا کرتے ہیں کہ مسجدیں غیر آباد ہیں اور مندر سنسان۔ کیا انہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ پنجاب میں نئے عبادت خانے جہاں لوگ شوق سے چڑھاوے لے کر جائیں بھرپور آباد ہیں یعنی عدالتیں

"فلک پیما"

طوفانی رات

برسات کی گھٹائیں طوفاں اُٹھا رہی ہیں　　سنسان جنگلوں میں ہلچل مچا رہی ہیں
خوابیدہ بستیوں کا بازو ہلا رہی ہیں　　سنسار میں ہزاروں موتی لُٹا رہی ہیں

اک حشر موج زن ہے بارش کی رات کیا ہے
دنیا لرز رہی ہے، اک دو کی بات کیا ہے

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رہ رہ کے آ رہے ہیں　　باغوں کی بھینی بھینی خوشبو لُٹا رہے ہیں
خوابیدہ دل میں لاکھوں ارماں جگا رہے ہیں　　صہبائے بیخودی کے دریا بہا رہے ہیں

آ جا رہے ہیں ہر سُو نغمے سنا سنا کر
جنگل میں سنسنا کر، بستی میں گنگنا کر

پُرشور بادلوں میں بجلی چمک رہی ہے　　پارے کی ایک مچھلی گویا لپک رہی ہے
کندن کی طرح جس سے ہر شے دمک رہی ہے　　ہر آنکھ خیرگی کے مارے جھپک رہی ہے

چونک اُٹھے جنگلوں میں غفلت زدہ چرندے
جاگ اُٹھے گھونسلوں میں سوئے ہوئے پرندے

بادل گرج گرج کر ہر سُو مچل رہے ہیں　　کاجل کی تہ میں لاکھوں موتی اُگل رہے ہیں
چُپ چاپ بہنے والے دریا اُبل رہے ہیں　　موجیں اُبھر رہی ہیں طوفاں اُچھل رہے ہیں

برسات کی رگوں میں ہیجان آ رہا ہے
سرسبز وادیوں میں طوفان آ رہا ہے

اک شور مچ گیا ہے خاموش بستیوں میں　　دھندلی بلندیوں پر تاریک پستیوں میں

کچھ لوگ الجھ رہے ہیں مینا پرستیوں میں　　　کچھ محو ہیں شرابِ گلگوں کی مستیوں میں
کچھ نیند کے نشے میں کروٹ بدل رہے ہیں
کچھ ڈرتے ڈرتے اپنے گھر میں ٹہل رہے ہیں

دریا چڑھاؤ پر ہیں، تالاب بھر رہے ہیں　　　جنگل ہرے ہوئے ہیں گلشن سنور رہے ہیں
باغوں کے ننھے پودے دھل کر نکھر رہے ہیں　　　بادل گرج رہے ہیں چوپائے ڈر رہے ہیں
یہ ابر ہے کہ ہر سُو اڑتا ہوا دھواں ہے
یا آسماں پہ چھایا اک اور آسماں ہے

مدہوش ہیں مناظر پُر شور ہیں صدائیں　　　تھرا رہی ہیں دھندلی بھیگی ہوئی فضائیں
یہ ابر کی گرج ہے یا توپ کی صدائیں　　　ساتوں طبق زمیں کے کیونکر دہل نہ جائیں
پھل پھول گر رہے ہیں پتے بھی جھڑ رہے ہیں
لاکھوں درخت اپنی جڑ سے اُکھڑ رہے ہیں

اُودی گھٹا نے ہر سُو دریا بہا دیئے ہیں　　　دنیا پہ کالے کالے پردے چڑھا دیئے ہیں
سوئے ہوئے ہزاروں فتنے اُٹھا دیئے ہیں　　　اپنی کڑک سے لاکھوں محشر جگا دیئے ہیں
باغوں میں ہر جگہ اک طوفاں بکھر رہا ہے
ہر ذرہ کانپتا ہے ہر پھول ڈر رہا ہے

بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے　　　ہر ذرّہ ذرّہ پر اک ہنگامہ سا بپا ہے
مینہ کی جھڑی لگی ہے۔ اک شور سا مچا ہے　　　محشر سا موجزن ہے، طوفان سا اُٹھا ہے
یہ رات، یہ سیاہی، یہ ابر، یہ اندھیرا
گویا کبھی نہ ہوگا دنیا میں اب سویرا

کیشوداس عاقل

تکمیلِ محبّت

(۷)

منظور و ثروت کی شادی کو اب نو برس ہونے کو تھے۔

منظور جو جمیل کا دوست تھا اور منظور جو ثروت کا شوہر تھا فی الحقیقت دو مختلف الطبائع شخص تھے۔ کچھ یہ وجہ تھی کہ جمیل پندرہ سال کی عمر میں ابھی ایک ناتجربکار نوجوان تھا اُسے دنیاداروں کی سیرت کا صحیح صحیح اندازہ نہ ہو سکتا تھا اور کچھ یہ سبب تھا کہ منظور کی سیرت تھی ہی کچھ مستور و متلون۔ وہ گورنمنٹ کالج میں تاریخ کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا اور تاریخ ہی کی طرح اُس کی طبیعت میں عجیب و غریب نشیب و فراز تھے۔

وہ اپنے دوستوں سے کبھی دوستی رکھتا تھا اور کبھی بے اعتنائی برتتا تھا۔ وہ کبھی نہایت خوش مزاج ہوتا تھا اور کبھی اپنے آپ سے بھی بیزار۔ اُس کا جسم پُرصحت اور اس کی شکل وجیہ و دلکش تھی جس پر عینک نے سونے پر سہاگہ کر دیا تھا۔ اُس کا لباس کبھی نہایت پُرفیشن اور کبھی نہایت مکروہ ہوتا تھا۔ اور اُس کے دوستوں میں اس "پروفیسریت" کا خوب مذاق اُڑایا جاتا تھا۔

اُس نے علیم الدین کے گھرانے میں بڑے شوق سے شادی کی تھی کہ اِس میں اُس کی عزت افزائی تھی اور ثروت سے بھی اُس کا برتاؤ نہایت پُرخلوص و پُرمحبت تھا لیکن وہ جبلتاً نسوانی صحبت سے گریز کرتا تھا اور عادتاً اپنے دوستوں یاروں کی محفل میں رات رات بھر بیٹھے رہنے کا مشتاق تھا۔ یا پھر اُسے اپنی "ہسٹری" (تاریخ) کا خبط تھا۔ جب کبھی وہ اپنے بوسیدہ مسودات اور گبن اور الفنسٹن کی "عظیم الجثہ" کتابیں نکال کر انھیں اپنے دفتر میں پھیلا دیتا اور کام کرتے کرتے روشنائی کے بعض چھینٹے ساتھ کے "پلنگ کمرے" میں بھی ڈال دیتا تو ثروت کو اس علمی بدتمیزی پر بہت غصہ آتا۔ شادی کے تین سال کے بعد منظور نے کالج کا کام کرنا کم کر دیا کہ اب وہ ایک کرائے کے گھوڑے کی طرح اپنے مقرّرہ راہِ عمل سے بخوبی آگاہ ہو گیا تھا اور اُسے بغیر زیادہ کاوش کے نہایت رسمی طور پر سُستی سے طے کرتا تھا۔ وہ چند دوستوں کی خاموش عملی ترغیب سے ناچ، وہ ناچ جو انگریزی تفریح گاہوں میں صرف تعلیم یافتہ اصحاب کی ضیافتِ طبع اور محض ذوقِ فن کی ترقی کی خاطر دیکھا جاتا ہے اور راگ رنگ، وہ جو فقط احباب کی مخفی شبانہ صحبتوں میں بعض آوارہ گرد نوجوان دوستوں سے سُنا جاتا ہے اور تھوڑی سی شراب اتنی جتنی کہ انگریزی وضع کی سوسائٹی میں نہ صرف ممنوع ہے بلکہ وضعداری میں داخل اور فیشن کاری کے لئے

لازم ہے اور جوئے کی وہ متمدن شکل جس سے شناسائی ہر کلب والے کے لئے "کلبیت" کا جزو لاینفک ہے ان سب چیزوں سے تھوڑا تھوڑا اور عموماً بالکل حدِ اعتدال کے اندر وہ محظوظ و متمتع ہوتا رہا۔ لندن اور پیرس میں ہم نہیں جانتے کہ اُس نے عیش و عشرت میں حصہ لیا یا نہیں لیکن جب ولایت جانے سے پہلے اور بعد کے بڑے بڑے پارسا اور سٹرمیلے اصحاب ولایت میں عموماً آں کار دیگر می کنند کی تصویر بنے رہتے ہیں تو بیچارے منظور ہی نے کیا جرم کیا ہے کہ ہم اُس کے بعد کی عشرت پسندیوں سے (اور وہ بھی اُن عشرت پسندیوں سے جن کو عشرت کہنا تازہ ترین شائستگی والوں کے نزدیک تنگ خیالی اور جہالت کا مرادف ہے تو ان آزاد خیالیوں سے ہم) "قدیمانہ" بیزاری ظاہر کر کے اُسکی تاریخ زندگی کے "ولایتی زمانے" میں اُس کے رویے کی چھان بین کریں +

انصاف سے بعید ہوگا اگر ہم منظور کے چال چلن میں کسی قسم کا شک و شبہ کریں۔ وہ اُن بہت سے "انگلستانی" ہندوستانیوں کی مانند تھا جو ندرت پسندی کے مرض میں مبتلا ہو کر فیشنی جدت کے پیرو اور شائستہ رنگ رلیوں کے نام لیوا ہو جاتے ہیں اگرچہ اُن میں سے اکثر بہیمیت کی انتہائی کمزوریوں کا شکار ہونے سے بچے رہتے ہیں +

منظور کی یہ روش اُس کے خسر کو ناپسند تھی لیکن وہ مجبور تھے کہ اپنے داماد پر زیادہ زور نہ ڈال سکتے تھے۔ ثروت کو کلب میں آنے جانے سے عار نہ تھا شریف مردوں سے ملنے جلنے میں اعتراض نہ تھا لیکن وہ دورِ حاضر کی تمام عشرت پسندیوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اپنے شوہر کو اُن میں حصہ لینے سے روکنا چاہتی تھی + مگر بدقسمتی سے وہ اب منظور نظر نہ رہی تھی۔ ثروت کی شادی کو اب نو برس ہونے کو تھے لیکن اُس کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا تھا نہ ہونے کی کچھ زیادہ اُمید تھی۔ منظور ثروت سے محبت کرتا تھا اُسے دل سے چاہتا تھا مگر وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کے باپ کو پوتے کی خواہش تھی جس سے اُس کی نسل قائم رہے اور اپنے بیٹے کا گھر بے چراغ دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ منظور دوسری شادی کرلے لیکن منظور کی خوش نصیبی سمجھئے کہ اُس نے اپنی مغربی تعلیم سے اتنا فائدہ ضرور اُٹھایا کہ کثرتِ ازدواج کے معاملے میں کبھی لغزش نہ کھائی۔ ہاں یہ ہوُا کہ ثروت کی طرف روز بروز اُس کے جذبات سرد اور اُس کا رویہ بے پروا ہوتا گیا اور ثروت شادی کے تین چار سال کے بعد زیادہ تر اپنے میکے ہی میں رہنے لگی +

ثروت کی زندگی روز بروز زیادہ غمگین و اندوہ ناک ہوتی گئی۔ وہ اپنے باپ کو اپنے شوہر کی عادات پر خاموش رہنے کی ترغیب دے سکتی تھی لیکن جس نعمت سے خدا ہی نے اُسے اب تک محروم رکھا تھا اُسے بغیر تائیدِ الٰہی کے وہ کیونکر پا سکتی تھی! رونا دھونا اُس کا کام اور آہیں بھرنا اُسکی فطرتِ ثانی ہوگئی۔ وہ عبادت کی طرف مائل ہوتی گئی۔ ہر روز قرآن مجید پڑھتی اور صبح کی نماز ادا کر کے گڑگڑا کر خلوص دل سے دعائیں مانگتی کہ بارِ خدایا یا مجھے اس دنیا سے اُٹھا لے منظور اور شادی کر

لے تو اُسے اک بچہ عنایت کرے اور یا مجھ عاجز کی گود بھری بھری کردے کہ مجھ سے محبت میں یہ بے اعتنائیاں نہیں دیکھی جاتیں۔ مجھے غربت کی اٹوانٹی کھٹوانٹی پسند ہے مجھے کلفت کے درد و کرب مقبول ہیں مگر محبت کا گلا نہ گھونٹ سکنے والے وارورسن مجھے کسی صورت منظور نہیں۔ پھر آہ بھر کر چپ ہوجاتی کہ خدایا مجھے معاف کریں کیا کہہ رہی ہوں؟ مجھے کیا منظور نہیں؛ جو کچھ بھی تو مجھ کو دے وہ سب مجھ کو بسروچشم قبول کرنا ہے۔ جس روز سے میں منظور کے دل کی ثروت اور منظور میرا منظور نظر بنا اُس روز سے جو بھی میرے اُوپر گزر جائے وہ سب مجھے بصد شوق منظور ہے!

ثروت جس کی ظاہرہ شکل وصورت کو دستِ قدرت نے تکمیلِ حسن کے سانچے میں ڈھالا تھا اب زمانے کی گردش اور دنیا کی مصیبتوں نے اُس کی فطرت کو اپنے شکنجے میں دبا کر اُس کے باطن کو صدق وصفا کی جِلا دی۔ ممکن تھا کہ دنیا کے عیش وعشرت میں پڑ کر وہ محض حسن کی اک دلکش پتلی ہوجاتی لیکن اب زندگی کے درد وکلفت نے اس غمگین حسینہ کو فرشتوں کی سی سیرت سے آراستہ کردیا!

دن گزرتے گئے۔ راتیں لمبی ہوتی گئیں۔ ہفتے مہینے ہوگئے۔ مہینے سال بن بن کر نظر آنے لگے! لیکن اُمید کی صورت نظر شاید نہ آنی تھی نہ آئی +

اِس اندوہ والم میں ثروت کو تسلی دینے والے یا اُس کے والدین تھے اور یا گذشتہ دو سال سے جمیل وعذرا +

ہم دیکھ چکے ہیں کہ شادی کے وقت سے جمیل اور منظور و ثروت میں غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ شادی ہوکر نہ صرف دونوں کا نصیبہ جُدا جُدا ہوگیا بلکہ اُن کے گھرانوں میں بھی مغائرت سی ہوتی گئی۔ عزیزوں میں جب غیریت پیدا ہونے لگتی ہے تو وہ عموماً اجنبیت کی حد سے بھی تجاوز کرجاتی ہے۔ ایسا ہی یہاں ہوا۔ اُدھر منظور و جمیل کی دوستی کا بھی اب کچھ نشان باقی نہ رہا تھا کہ جمیل کا منظور کے پاس آنا جانا باقی رہتا۔ لیکن باپ کی وفات کے بعد جمیل علیم الدین کو اپنا باپ سمجھ کر اُن کی انتہائی عزت کرتا تھا اگرچہ اُسے اُن سے نہ کوئی غرض تھی نہ کوئی واسطہ۔ اُدھر علیم الدین جن کی اپنے داماد سے چشمک تھی اس نوجوان سے ہر طرح مروت کے ساتھ پیش آتے تھے اور اکثر "علیم منزل" میں اُس کے آتے رہنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے۔ اس طرح جمیل اور عذرا کی آمدورفت یہاں ہونے لگی +

جمیل اگرچہ ثروت و منظور کی ناچاقی سے باخبر تھا لیکن اب ثروت کو بار بار دیکھ کر اور اپنے چچا علیم الدین کے ذریعہ سے مختلف حالات سے آگاہ ہوکر وہ اپنی گذشتہ بے مروتی اور روکھے پن پر بے انتہا نادم ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور عذرا اب اکثر "علیم منزل" میں آنے جانے لگے +

عذرا اور ثروت کی گہری دوستی ہوگئی۔ ثروت کو اُس کے غم ومصیبت میں ایک نہایت سچے دل والی سہیلی مل گئی

جس کے آگے وہ بے تکلف اپنا دکھڑا کہہ سکتی۔ عذرا گھر جا کر یہ سارا حال جمیل کو سناتی اور کہتی کہ تم اُس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہو انسانیت کا تقاضا ہے کہ تم کبھی کبھی اُس سے ہمدردانہ گفتگو کیا کرو۔ بچپن کے دنوں میں تمہارے دل میں اُس کے لئے اِک معصوم الفت کا جذبہ اٹھا۔ اُس کے بعد اُس کی اور تمہاری زندگی الگ الگ ہوگئی لیکن کیا وہ الفت اس قدر بودی تھی اور یہ اُس الفت کا ردِّ عمل ہے کہ پھر اِس کی بجائے اک ضد آمیز بے اعتنائی تم میں پیدا ہوگئی۔ سرد مزاج طبیعتیں عموماً رشک و حسد سے پاک ہوتی ہیں۔ عذرا کے دل میں حسد کے جذبات مطلق نہ تھے۔

عذرا شروع میں بظاہر ایک معمولی سیرت کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ پُر تخیّل و جدّت طراز جمیل کی عقلی و ذہنی عظمت کے مقابل میں اُس کی شخصیّت بے حقیقت نظر آتی تھی۔ لیکن حق یہ ہے کہ باوجودیکہ بعض باتوں میں اُس کی اور جمیل کی فطرت میں زمین آسمان کا فرق تھا اُس نے جمیل کی زندگی کو عملی طور پر راستی کی اُس راہ پر لگا دیا جس سے ممکن ہے کہ وہ اپنے سرکش تخیل کے باعث بھٹک جاتا۔

عذرا کے اس قابلِ تحسین اعتمادِ محبت کا اثر نہایت اچھا ہُوا۔ جمیل سے ثروت کی طرف برادرانہ الفت کا اظہار ہونے لگا اور ثروت کی جانب سے جمیل کی طرف خواہرانہ شکر گزاری کا بیان۔

عذرا نے دونوں بچھڑے ہوؤں کو پھر ملا دیا اور ملانے والی کی شکر گزاری میں ملنے والوں کے جذبات نے وہی رنگ اختیار کیا جو انہیں اختیار کرنا چاہئے بھی تھا۔

ثروت کی زندگی ابھی غم و افکار سے تیرہ و تار ہو رہی تھی لیکن خدا کا ہزار شکر تھا کہ اب کبھی کبھی اِس ظلمت کدہ میں عزیزانہ ہمدردی کی شیریں کرنیں چلی آتی تھیں!

ثروت اکثر کہا کرتی پیاری عذرا! میں تمہارے احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔ خدا گواہ ہے کہ اگر کبھی ضرورت پڑی جو خدا نہ کرے کبھی تم کو پڑے تو میں اپنی ناچیز خدمت تمہارے لئے پیش کروں گی۔ اب تو میرے پاس صرف ایک ہی محبت کا ناچیز تحفہ ہے اور بہن! وہ حاضر ہے!

∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴

---

(۸)

ننھا عزیز ایک دن اپنے رنگین کھلونوں سے کھیل رہا تھا کہ اُس کی آپا نے اُسے گود میں لے کر پیار کیا اور

کہا میرے بچے! تیری ماں آسمان کے دیس چلی گئی!

عزیز نے کہا " ہاں! وہ مجھے آسمانی پریوں کی کہانی سنایا کرتی ہیں کہ وہاں بلور کے پہاڑ ہیں جن پر زمرد کے درخت لہلہاتے ہیں۔ اُن پہاڑوں سے شہد کی سرخ اور سفید نہریں بہتی ہیں اور اُن درختوں میں رنگ رنگ کے یاقوتی پھول کھلتے ہیں۔ وہ میرے لئے وہاں سے ایک ننھی منی پری لائیں گی جس کے ساتھ مل کر میں اس گھروندے میں رہوں گا اور ان کھلونوں سے کھیلوں گا۔ وہ آئے تو میں اُسے اپنے سارے کھلونے دے دوں اور کھانے کو چیزیں دوں کہ پھر جانے کو اُس کا جی نہ چاہے "۔ آپا کا جی بھر آیا۔ اُس نے بچے کو اپنے گلے سے لگالیا اور اُس کے آنسو ٹپ ٹپ بچے کے رخسار پر گرنے لگے جو اس نے جلد جلد پونچھ دیئے۔ بچے نے شوخی سے کہا " رحیمہ آج تیسری بار تم نے میرا منہ دھویا ہے۔ امی جان آئیں گی تو میں ضرور کہوں گا کہ اگر اتنی بار منہ دھونا ہو تو وہ خود ہی دُھلا دیا کریں۔ رحیمہ تمہارے ہاتھ بڑے سخت ہیں امی جان کے ہاتھ بڑے پیارے اور نرم ہیں "۔

اتنے میں سامنے سے ثروت آگئی اور اُس نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔

عذرا تین ماہ کی شدید علالت کے بعد آج دم توڑ چکی تھی اور دوسرے کمرے میں بچے سے تھوڑی ہی دُور بے حس وحرکت پڑی تھی۔ بہت سے عزیز وہاں جمع تھے۔ جمیل عذرا کے بستر مرگ پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور آنسو زار قطار اُس کے چہرے پر رواں تھے۔

جب موت کا وقت قریب آیا تو عذرا نے ثروت کو اپنے قریب بلایا اور کہا کہ " میری پیاری بہن! تم کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں جاتی ہوں مگر اپنے لختِ جگر کو چھوڑے جاتی ہوں۔ وہ اب تمہارا بچہ ہے، ثروت اب تم اُس کی ماں ہو۔ دیکھنا میرے لال کو دُکھ نہ پہنچے۔ جب وہ پوچھے کہ امی جان کہاں ہیں تو تم کہنا کہ میں ہی تمہاری امی جان ہوں جو پریوں کے ملک سے اک پری بن کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ خدا حافظ بہن! "

عذرا کی موت سے جمیل کی زندگی تہ و بالا ہوگئی۔

عذرا جس سے جمیل نے شروع میں محض ایک نوع کی رسمی شادی کرنے کا ارادہ کیا تھا ایک ایسی شخصیت رکھتی تھی جس کے خاموش اثر سے بڑے بڑے خیال پرست بتدریج خود بخود عملی انسان بن جاتے ہیں۔ جمیل کی طبیعت شادی سے پہلے بھی کج روش نہ تھی لیکن اُس کی فطرت ابھی زمین پر پاؤں نہ رکھتی تھی، اُس کی جودت ابھی اُسے فلک پیمائیوں پر مجبور کرتی تھی۔ اگرچہ تکمیلِ تعلیم کے بعد اُس نے عارضی طور پر اپنے تئیں تخیل کے زور و ترغیب سے دنیا کے معمولات کا خوگر بنالیا تھا۔ عذرا سے اُس نے یہ سبق سیکھا کہ بغیر زورِ تخیل کے بھی انسان یہ معمولی زندگی بسر کرسکتا ہے اور ایسے

ہی اُسے زندگی بسر کرنی چاہئے۔ انسان ایک متنفّس ہے کوئی پردار فرشتہ نہیں، کھاتا پیتا بولتا چالتا ہے اَوروں کے ساتھ مل کر رہتا اور اَوروں ہی کی مدد سے کسبِ معاش وکسبِ کمال کرتا ہے اس لئے انسان کا پہلا فرض اپنی دنیائے معاشرت سے وابستہ رہنا، اُس کی خدمت کرنا اور اُسے برابر ترقی دیتے رہنا ہے۔ جب تک معاشرتی دستور تبدیل نہ ہوں یا کر نہ دیئے جائیں اُس وقت تک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا مسجد بنانا نہ صرف بے سود ہے بلکہ قطعی ضرر رساں! جمیل کی فطرت میں جو کمیاں یا زیادتیاں تھیں عذرا نے اُن کی اصلاح کی اور اُسے سیدھے رستے پر لگا دیا +

اِس کے علاوہ عذرا نے جمیل کی خانگی زندگی کو خوشگوار بنا دیا تھا اور اُس کے گھر بھر میں ایک ننھے منے چراغ سے چکاچوند کا عالم پیدا کر دیا تھا۔ اِس سے بڑھ کر اُسے دنیا کی زندگی میں اَور مل ہی کیا سکتا تھا کہ اِک وفادار بیوی ہو جو رنج وراحت میں اُس کی شریک اور نشیب وفراز میں اُس کی مُشیرِ کار بن کر زندگی کے اِک ایسے جادۂ رواں پر اُس کی رہنمائی کرے جس پر وہ سلامت روی کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہو +

سچ یہ ہے کہ عذرا جمیل کی طبیعت کے پریشان اجزا کا مضبوط ومتناسب سانچا تھی۔ جب سانچا! ٹوٹ پھوٹ گیا، تو اجزا پھر پریشان اور پریشان تر ہو گئے +

غم کی گھٹائیں اُس کے دِل پر چھا گئیں اور رنج ومحن کی بجلیاں اُس کے خرمنِ حیات پر رہ رہ کر گرنے لگیں۔ راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ آرام وآسائش سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ بے چینی نے دل میں گھر کر لیا۔ رونے سے آنکھوں کا ستیاناس ہُوا۔ فکر والم سے اعصاب میں کبھی اضمحلال اور کبھی انتہائی بے کلی پیدا ہونے لگی۔ اب کون تھا جس سے اس کرب واندوہ کا تذکرہ کرکے وہ جی ہلکا کرتا۔ اُس کے خمیر میں تھا کہ جی کی بات کہے تو کسی ایسے دوست سے جو کسی اور کا دوست نہ ہو۔ اب کون باقی تھا جو فقط اُسی کا دوست اور محض اُسی کا رفیقِ زندگی ہو رہتا؟

جمیل کو اِس ظلمت سے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہ سُوجھی۔ اُس کی ماں نے اُسے بہت تسلی دینی چاہی لیکن بیوی کے بارے میں ماں کی تسلی اُسے بُری معلوم ہوتی تھی۔ اُسے تسلی صرف وہی دے سکتا تھا جسے عذرا کی موت کا اُتنا ہی رنج ہو جتنا اُسے خود تھا۔ اِس لئے اب وہ عموماً اپنی خالہ کے ہاں آنے جانے لگا۔ عذرا اپنی ماں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ عذرا کی موت سے اُس کی ماں بیچاری دیوانی سی ہو گئی، گھر بار سے، دوستوں عزیزوں سے اُس نے روگردانی کر لی۔ لہٰذا اگرچہ جمیل کو کچھ عرصہ اپنی غم زدہ خالہ سے اِس مشترک غم میں ایک دلی مصاحبت ہو گئی لیکن اِس کا اثر اُس پر بجائے اچھا ہونے کے بُرا ہُوا۔ کیونکہ جمیل ایک غایت درجہ حساس شخص تھا اور وہ اپنے غم کو نہ صرف جسمانی وقلبی بلکہ عقلی وذہنی طور پر بھی محسوس کرتا تھا۔ غرض غم جمیل کے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا۔ باپ بھی سر پر نہ تھا کہ پدرانہ شفقت اور بزرگانہ

سطوت سے کچھ اثر ڈال سکتا۔ ماں کو جمیل کا روز بروز رنجیدہ دیکھنا زہرِ قاتل تھا۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ نرم دل ہو چکی تھی۔ اب بیٹے کے رنج و غم سے اُس کی طبیعت بالکل گداز ہوگئی اور سب عزیزانہ رنجشیں اور گلے شکوے بُھول بھلا گئی +

عزیز کبھی ثروت کے پاس ہوتا تھا اور کبھی اپنی نانی اماں کے پاس اور کبھی کبھی اپنی دادی اماں کے ہاں بھی چلا آتا تھا۔ ماں نے سوچا کہ اِسی گھر میں جس میں اُس کے بیٹے نے بیوی کی محبت دیکھی ہے ہر وقت وہی محبت بیٹے کی آنکھوں میں پھرتی ہوگی۔ بہتر ہے کہ کسی طرح وہ کچھ عرصہ یہاں نہ رہنے پائے + لہذا وہ علیم الدین کے پاس گئی اور اُن سے کہا کہ آپ اب جمیل کے باپ کی بجائے ہیں۔ غم سے اُس کا حال بُرا ہو رہا ہے۔ ذرا آپ ہی اُسے سمجھائیے۔ وہ آپ کی بات بہت مانتا ہے اور اُس پر آپ کے کہنے کا بڑا اثر ہے۔ علیم الدین نے کہا بہن! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میری خواہش ہے کہ جمیل یہاں میرے پاس آجائے اور کچھ عرصہ "علیم منزل" ہی میں رہے۔ ماں نے بخوشی منظور کیا +

ایک روز جمیل کے پاس اُس کے چچا آئے اور کہنے لگے کہ بیٹا! میں چاہتا ہوں تم ہمارے پاس آجاؤ کم ازکم کچھ عرصہ تو ضرور میرے قریب آکر رہو کہ مجھے کئی باتوں میں تمہاری مشورت کی ضرورت ہے۔ عزیز بھی مجھے اس قدر پیارا لگتا ہے کہ جب کبھی گاؤں چلا آتا ہے تو صبح کو میرا جی کام کاج کو نہیں چاہتا۔ وہ علےٰ الصباح میرے بستر پر آجاتا ہے اور کبھی میری مونچھیں نوچتا ہے کبھی میرے گالوں پر تھپڑ مارتا ہے۔ وہ ثروت کے ساتھ رہتا ہے اور اُسے ہی امّی جان پکارتا ہے لیکن اکثر پوچھتا رہتا ہے کہ میرے ابا جان اب امّی جان کے پاس کیوں نہیں آتے؟

چچا کی پُرخلوص شفقت سے جمیل کا دل بھر آیا۔ اُس کے منہ سے کچھ بن نہ پڑا۔ بستر باندھ سامان لے ساتھ ہولیا۔ چچا نے کہا جمیل ذرا اپنی کتابیں بھی ضرور ساتھ لے چلو کہ مجھے اُن سے دلچسپی ہوگی۔ بہن نے کتابیں بکس میں بند کر کے ساتھ کر دیں +

ثروت جمیل کے غم کا حال سُن سُن کر غمگین و ملول ہو رہی تھی۔ جب آیا تو دیکھا کہ پہچانا نہیں جاتا۔ بچہ گود میں تھا آنسو نکل پڑے اور اپنے کمرے میں چلی گئی +

جب سے جمیل "علیم منزل" میں آیا سبھی نے یہاں تک کہ منظور نے بھی جو گاہے گاہے سُسرال میں آیا جایا کرتا تھا اُس کی خاطر مدارات اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ثروت عموماً عزیز کو اُس کے پاس لے آتی۔ منظور کبھی اُسے یونیورسٹی کے جدید ترین حالات سناتا اور کبھی اُن دِنوں کا تذکرہ کرنے لگتا۔ جب پہلے پہل جمیل کی اُس سے دوستی ہوئی۔ علیم الدین کبھی جمیل کی کوئی پسندیدہ کتاب باہم مل کر پڑھنے میں اُسے مصروف کرلیتے اور بدر النساء کبھی اُس سے گھر کے بیرونی انتظامات کراتیں اور کبھی منظور کی بے رُخی اور ثروت کی غمگینی کا ذکر چھیڑ دیتیں +

لیکن ان سب حیلوں حوالوں سے جمیل کی طبیعت ٹھکانے نہ ہوئی۔ وہ دوسروں کا دل رکھنے کے لئے اُن کے ساتھ
بن کرنے اور ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کرتا لیکن اُس کے دل بہلاؤ کی صورت عموماً پیدا نہ ہو سکتی +

آخر ایک دن ثروت عزیز کو لئے اُس کے پاس آئی۔ عزیز رو رہا تھا اور بڑے بڑے آنسو اُس کے پیارے چہرے
باری تھے۔ جمیل نے بےچینی سے پوچھا کہ کیوں میرے لال! کیوں روتے ہو؟ ثروت نے الگ ہو کر چپکے سے جمیل کے
ن میں کہا کہ بھائی! بچہ کسی بات پر مچل رہا تھا کسی نالائق خادمہ نے جھنجھلا کر اُسے کہہ دیا کہ تیری امی یہاں ہوتی تو تُو یہ
ارتیں نہ کرتا۔ اسی پر وہ امی جان امی جان پکارتا میرے کمرے کی طرف دوڑ آیا +

جمیل آب دیدہ ہو گیا اور بیٹے کو گود میں اُٹھا کر کہنے لگا میرے چاند! جب تک تیری امی جان تجھے منع نہ کیا کریں
تیرے جی میں آئے کئے جایا کر۔ کوئی اَور ڈانٹ ڈپٹ کرے تو تُو میرے پاس دوڑ آیا کر +

پھر کیا تھا؟ عزیز ذرا ذرا سی بات پر بجائے ثروت کے پاس جانے کے جمیل کے پاس اپنی پیاری پیاری شکایتوں
کہانی سنانے آجاتا اور اپنے ابا سے مل کر اپنے بچپن کے کھیل کھیلنے لگ جاتا +

اِس طرح جمیل کے لئے اک چھوٹا سا مشغلہ پیدا ہو گیا لیکن بچے سے اوجھل ہو کر وہ اکثر غم و اندوہ میں مستغرق
ہتا۔ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن ثروت حسبِ معمول عزیز کو اپنی گودی میں اُٹھائے آئی اور جمیل کے پاس بیٹھ کر
نے لگی" بھائی! میں تم سے کچھ باتیں کرنی چاہتی ہوں + میں بچپن میں تم سے کھیلا کرتی تھی۔ اب اِس پیارے بچے سے
ھیلتی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، یہ ابھی سے چشم بددور اس قدر فہیم و ذکی ہے کہ میں نے
ن عمر میں ایسا بچہ نہیں دیکھا۔ تمہارے رنج و غم کے متعلق یہ کبھی کبھی سوال کر بیٹھتا ہے تو میں نہیں جانتی کہ اسے کیا
اب دوں؟ بھائی! اگر تمہارے غم کا ذرا سا سایہ بھی اِس پھول پر پڑ گیا تو یہ مرجھا کر رہ جائے گا۔ یہ تمہاری عذرا کی یادگار
ہے یہ ہُوبہو اُس کی تصویر ہے اور اُس کی تصویر بھی دلپذیر و بے نظیر۔ چینی کی اک مُورت عقل کا اک کھلونا سا معصومی کا
پُتلا سا! اب تمہاری خوش دلی ضروری ہے اِس کی خوشی کے لئے!

اور بھائی دنیا میں غم کسے نہیں؟ کون ہے جس کے دل میں درد کی کسک نہیں؛ کون ہے جس کی زندگی میں رنج
ن کی آندھیاں برپا نہیں؟

بھائی میرا دُکھ تمہارے غم سے کم ہے لیکن پھر بھی دُکھ ہے اک پُرانا دُکھ دُور نہ ہونے والا +

میل (کانپ کر) ثروت بہن! میرے دل کی تمنا ہے کہ تمہارا پُرانا دُکھ بھی میرے حصے میں آجائے۔ جہاں اتنا بارِ
غم ہے وہاں ایک اَور بھی سہی۔ مجھے تو اب غم سے محبت ہو گئی ہے۔

ثروت برائے خدا غم سے یوں محبت نہ کرو۔

جمیل (آہ بھر کر) بہن! پھر اَور کس سے کروں؛ محبت تو محبت والی کے ساتھ گئی۔ اب میرے لئے محبت کا زمانہ ختم ہو چکا اب میری محبت فقط میرے خیالات تک محدود رہیگی! اور تمہارا دکھ! معاف کرنا آج میرے منہ میں زبان ہے۔ تمہارے دُکھ نے مجھے اور عذرا دونوں کو ملول کر رکھا تھا، آج عذرا کا اور اپنا دونوں کا ملال میرے سینے میں ہے تمہارے لئے میری بہن! خدا تمہیں اتنا ہی شاد و آباد کرے جتنا اُس نے مجھے اندوہ ناک و غمگین بنا دیا ہے +

ثروت میں ناچیز بجز اس کے اَور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ جو خدمت بھائی کی مجھ سے ہو سکے گی میں اُس کے لئے حاضر ہوں! بچپن کے دن گزر گئے لیکن بچپن کی یاد باقی ہے۔ عذرا چلی گئی لیکن وہ محبت جو وہ مجھ سے کیا کرتی تھی میرے پہلو میں چھوڑ گئی۔ عذرا جیتے جی میرے غموں کی غمگسار رہتی۔ مگر اُس نے میرے لئے وہ ننھا سا تحفہ چھوڑا جو میری زندگی کی تنہا مسرت ہے +

جمیل مجھے خوشی ہے کہ عزیز کے دم سے تم بھی کچھ خوش ہو۔ عزیزے تمہاری محبت کا میں کیا صلہ دے سکتا ہوں؛ کچھ نہیں!

ثروت دے سکتے ہو بھائی دے سکتے ہو! بس یہی کہ خوش رہو اور خدا کے حکم پر شاکر! برائے خدا تم تن تنہا نہ رہا کرو گھر میں ہو تو تمہارا اک چاند سا ٹکڑا ہے اور پھر ہم سب حاضر ہیں۔ باہر جاؤ تو ہر جا قدرتِ خداوندی کا جلوہ ہے اور خود خدا کا ہر طرف سامنا ہے! بھائی! گھر میں تنہا نہ بیٹھا کرو اِس سے کبھی کبھی باہر چلے جانا بدرجہا بہتر ہے کہ وہاں عُزلت میں ایک صحبت ملتی ہے جو محبت کی پیامی ہے!

∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴

---

(۹)

جمیل خواب دیکھ رہا ہے!

باغ میں چاندنی رات ہے۔ فضا میں یہ کیفیت ہے گویا کسی نے چاندی کا بُرادہ ہر سو بکھیر دیا ہے۔ زمین پر یہ عالم ہے گویا موسیقی عطر کا جامہ زیبِ تن کئے محوِ رقص ہے۔ اک عالیشان عمارت کا سامنا ہے تالابوں اور آبشاروں کا سلسلہ ہے اِسی نسیان و حسن کے چمن میں ایک ننھے سے جھرنے کے قریب دو کمسن ایک دوسرے کا ہاتھ سنبھالے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں ——— کہ اتنے میں ریل گاڑی شالامار کے بڑے دروازے پر آ کھڑی ہوا ہے۔ چند احباب و اقربا ایک نوجوان کو رخصت کرنے آئے ہیں .... ٹرین چل پڑتی ہے، چلتی ہے۔ دل

گزرے جاتے ہیں لیکن وہ بدستور چلے جاتی ہے۔ نوجوان سمجھتا ہے کہ اب تک تو زمین کی ساری وسعت بھی ختم ہونے کو ہو گی، مگر آج کی بار تو فی الحقیقت وہ کسی اور کرۂ زمین کو جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر ڈر سے کانپنے لگتا ہے ——— کہ آن کی آن میں اپنے سونے کے کمرے میں میز پر بیٹھا یہ لکھ رہا ہے:۔

"پیاری! میرے لئے تُو کبھی سن رسیدہ نہ ہو گی۔ پیاری! میرے لئے تو ہمیشہ ہی نوجوان ہے، اس لئے کہ پیاری! میرے لئے تُو ہمیشہ ہمیشہ اک دوشیزہ ہے! اے نیک و پاک! اے سچے دل والی! اے ہمیشہ وفادار! اے بندۂ پروردگار! تیرا حُسن تیری نیکی ہے اور تیری نیکی تیرا حسن!

جب میرا دل ابھی ایک نوخیز پودے کی طرح نرم و نازک تھا تو تیری محبت کی نسیم اُس کے چمن میں آئی اور وہ اُس کے جھولے میں جھولا۔ تجھے شاید علم نہ تھا کہ تیرا وجود میرے لئے کیا معنی رکھتا تھا؛ تجھے شاید پروانہ تھی کہ تیرے معصوم حُسن نے کسی کی دنیا کو کیونکر تہ و بالا کرنے کا سامان پیدا کر دیا؛ شاید برسوں بعد تجھے پتہ چلا کہ میں تیری خوبی و محبوبی کا دلدادہ تھا! (یہاں جی ہی جی میں اپنے سے بھی چوری چوری چاہتا ہے کہ کوئی آئے اور کسی طرح اِس لکھے ہوئے کو دیکھ پائے)

پھر میں عیش و تنعم کا دلدادہ ہو گیا اور تُو کلفت و اندوہ کا شکار! میں تیری محبت سے ناآشنا ہو گیا اور تیرے حال سے یکسر ناآگاہ!

لیکن آج بھی برسوں کے بعد" ——— یہ لکھتے لکھتے رُک جاتا ہے پھر یک لخت قلم میز پر پھینک کر کاغذ کو پرزے پرزے کر دیتا ہے اور "ہائے" کہہ کر ——— جاگ اُٹھتا ہے!

کمرے میں گھُپ اندھیرا ہے۔ گھر میں خاموشی چھائی ہے۔ باہر درخت سائیں سائیں کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی ہے!

جمیل کے روح و رواں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اُس نے ایک ایسی گہری سانس لی کہ اُس کے نظامِ عصبی کے کونے کونے میں اک برقی سا ارتعاش دوڑ گیا۔ اُس کی پیشانی عرقِ شرم سے پُرنم ہو گئی اور بڑے بڑے آنسو اُس کی آنکھوں میں بھر آئے۔ اُس وقت اُس کی حالت اُس حساس شخص کی سی تھی جو بغیر کوئی ظاہرہ گناہ کئے جی کے اندر ہی اندر اپنی لغزشوں سے یک لخت آگاہ ہو کر ساری دنیا کے آگے ہاتھ جوڑ دینے کو تیار ہو۔

بیچارا جمیل! اُسے خالق کے بنائے ہوئے اپنے مجبور و مقہور نفس پر کتنا اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے مدفون جذبات کے اِس جبری انکشاف کا سدِ باب کر سکتا۔ بچپن کی یاد تو خیر معصوم تھی نوجوانی کا قصہ بھی کچھ ایسا مذموم نہ تھا لیکن وفاوار

عذرا کی موت کے بعد شادی شدہ غم زدہ ثروت سے خواب میں بھی یہ مُخاطبت کسی طرح روا نہ تھی + وہ نظری گناہ کا مرتکب نہ تھا لیکن اِس باب میں خیالی گناہ بھی اُس کے لئے سوہانِ روح تھا +

وہ بولا ثروت نے جو کہا درست کہا۔ مجھے اپنے غموں میں مغموم نہ رہنا چاہئے۔ان غموں نے مجھے سیدھی راہ نہیں دکھائی۔ مجھے اب کسی اَور نامعلوم سرزمین کی طرف رُخ کرنا چاہئے جہاں کوئی ہم خیال رہنما مدت سے میرا رستہ دیکھ رہا ہے !

---

(۱۰)

دوسرے روز جمیل علے الصباح جب ثروت نماز پڑھ رہی تھی باہر لارنس باغ کی طرف اور وہاں سے شالامار کی جانب چل کھڑا ہُوا۔ وہاں پہنچا تو عجب عالم تھا کہ سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم، میدانی پرندے چہچہا رہے تھے، باغبانی پھول لہلہا رہے تھے۔ درخت جھومتے تھے اور سبزہ وگل کو چومتے تھے +

جمیل پر محویت کا اک عالم طاری ہوگیا + نہروں میں پانی کی روانی اور باغِ کہن میں درختوں کا سناٹا اُسے کہیں سے کہیں لے گیا۔ وہ دنیا کے قریب تھا لیکن دنیا سے گویا کوسوں دُور۔ وہی دن رات کے زمین وآسمان اُس کے پیشِ نظر تھے لیکن اُسے کچھ ایسا محسوس ہُوا گویا زمین پر وہ اور آسمان پر ربّ دوجہاں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا اور کچھ کہتا ہے۔نہیں نہیں بلکہ اُس کی جلوہ پاشیاں عطرِ حسن بن کر زمین پر اپنی گنگا جمنی بارش کر رہی تھیں۔وہ پرندوں کے رنگین پروں وہ پھولوں کی نازک پنکھڑیوں وہ روشنی کی سیمین وزرّیں کرنوں میں پرتو افگن ہو رہا تھا نسیم سرگوشیاں کر رہی تھی، چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور پانی بھی بار بار یہ راگ الاپ رہا تھا کہ وہ یہاں ہے اور یہیں ہے! جمیل نے سوچا کس قدر دلکش ہے یہ آسمان اور یہ فضا یہ زمین اور یہ سبزہ زار، کتنے حسین ہیں یہ پھول پتے کتنی شیریں ہے پرندوں کی یہ چہکار، پھر دنیا کیسے اپنے جادۂ منضبط پر رواں دواں ہے۔سورج کس قدر بڑا چاند کس قدر پیارا اور تارے کس قدر دور دراز ہیں + یہ منظر ہمارے پیشِ نظر ہے اور ہم وہی اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف ہیں منہمک ہیں۔زندگی کے بحرِ ذخار میں ہمارے جسم وجان کی کشتی ڈگمگا رہی ہے لیکن چلی جاتی ہے جب تک کہ ڈوب نہیں جاتی + اور ہمارے دن رات کی خواہشوں اور کوششوں میں ہمارے روزمرہ کے حالات وواقعات میں اسباب ونتائج کا اک عجیب وغریب سلسلہ قائم ہے + یہ سب کچھ راست ہے اور راستی کی جانب رواں ہے + جمیل نے بآوازِ بلند کہا میرے رنج ومحن اور میری کلفتیں بھی سب اے میرے رحیم ورحمٰن میری لغزشوں کی سزائیں! میری ترقی کی راہیں ہیں +

وہ ان خیالات میں محو مستغرق تھا کہ یک لخت خدا جانے کیوں اک عجیب شوخی کے ساتھ وہ اچھل پڑا اور یکسر مسرور و شاداں ہوگیا اور بول اٹھا میرے اچھے دلبر! تُو جو کچھ کر رہا ہے میری بھلائی کے لئے۔ تو جدھر مجھے لے جا رہا ہے اسی لئے لے جاتا ہے کہ میں جلد سے جلد تجھے پالوں اور تیرے پیارے چہرے کا دیدار کروں، تیرا وہ چہرہ جو حسین و دلکش ہے تیرا وہ چہرہ جو دلپذیر و دلفریب ہے۔ ہائے تو مجھے اِس بھری دنیا سے اٹھا لے اور اپنے قدموں میں جگہ دے میرے پیارے آقا!————

لیکن نہیں مجھ کو ابھی یہیں رہنا ہے تیرا حکم یہی ہے یہی تیری تمنا ہے مجھ سے۔ تو چاہتا ہے کہ میں اس تہ و بالا جہان میں تیرا کام کروں جب تک کہ کام میرے لئے ہو۔ میں کیوں نہ کروں گا کہ اب اِس کام کی کلفتیں بھی میری مسرتیں ہیں۔ مجھے تونے بھیجا ہے کہ بُرا بھلا جو کچھ مجھ سے بن پڑے میں کروں۔ تیری اس دنیا میں ہزاروں دُکھی ہیں میری اپنی ہی پہنچ میں صدہا غمگین و رنجیدہ بیسیوں بیچارے متکبر و سرکش انسان ہیں جنہیں میری ہمدردی اور میری ناچیز رہنمائی کی ضرورت ہے۔ دنیا مجبورِ غم اور پامالِ فساد ہے اور میں ہوں کہ اک اپنا خود غرض الم لئے ہوئے سر بہ گریباں ہوں۔ پیارے! میں کیا جانوں تیری خلوت میں میرے لئے کیا کچھ رکھا ہے؟ ہاں مجھے کامل یقین ہے کہ یہاں سے دُور بہت دُور رنگ و بُو کی اک پاکیزہ دنیا میں میرے بے تاب بچپن کی بھولی بھالی تمنائیں میری جوانی کی پُرجوش بے قراریاں اور میری بعد کی تباہ کن مایوسیاں اُس بچی طفلانہ مصاحبت اُس گہری پائدار محبت سے پھر دوچار ہوں گی جو میری مصیبت و ناکامی کے طوفانِ آتشیں میں سے گزر کر اب تیری حضوری کے سکون و اطمینان میں میرا انتظار کر رہی ہے۔

کس قدر کیف آور ہوگی وہ گھڑی جب اِک آسمانی فضا میں جہاں دنیا کے شور و غل کی رسائی نہیں ہیں عصمت و عفت کی آنکھوں سے اُس معصوم و مامون محبت کا نظارہ کروں گا جس کی کلی باغِ عالم کی مسموم ہواؤں میں پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا جاتی ہے۔ کس قدر شیریں و رنگیں ہوگی وہ ساعت جب میری محبت اِن آنی جانی کامرانیوں سے آزاد ہو کر اُس ازلی حسن کی قوسِ قزح کے جُھولے میں جھولے گی جو کائنات کے افق پر اپنا پرتو ڈالے ہوئے ہے!

یہ سب تیرے تحائف ہوں کے میرے لئے تو کیا اے چاند سے مکھڑے والے اے پھولوں سے دل والے! تُو جو میری بچی خوشیوں کا امانت دار ہے کیا میں تیری رضا پر راضی نہیں۔ نہیں تیری خوشنودی اور تیری اُس محبت کی تمنا میں جس کے لئے برسوں سے میں سرگرداں ہوں میں اپنی زندگی کو بدل ڈالوں گا، اپنے نصب العین کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھوں گا اور تیرے اُس جلوے سے تیری اُس صورت سے روز و شب دوچار رہوں گا جسے میں نے آج دیکھ پایا ہے۔ تُو ہے اور میرے لئے ہے جب تک کہ میں تیرے لئے ہوں۔ تُو میرے سامنے ہے جب تک کہ میں تجھے دیکھتا رہوں۔ تُو مجھ سے ہمکلام ہے جب تک کہ میں تجھے سنتا اور تجھ سے بولتا رہوں۔

جمیل کی اُس روز سے عجیب کیفیت ہوگئی۔ کوئی عالمِ طبیعیات کوئی ماہرِ نفسیات اُسے شاید دیوانہ کہتا مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ دیوانہ نہ تھا۔ اُسے ہر نظارے ہر شے اور ہر شخص میں ایک نور محسوس ہونے لگا۔ وہ تمام چیزوں اور تمام شخصوں میں ایک ہی رحیم و زندہ محبت کرنے والے خدائے قدیر کی شخصیت کو جاری و ساری دیکھنے لگا +

کیا یہ نہ تھی اُس پاکیزہ محبت کی تکمیل جو کبھی بچپن کے چمن میں ثروت کے معصوم حُسن کے ساتھ کھیلا کرتی تھی ؟

اُسے کسی شے سے نفرت نہ رہی اُسے ہر ایک سے محبت ہوگئی۔ وہ ہر بات کی تہ کو پہنچنا چاہتا وہ ہر کام میں قدرت کی کوئی غرض دیکھتا + بعض وقت وہ گزرتے ہوئے آدمیوں ہی کو بغور دیکھنے لگتا اور اُن کے چہروں کو استعجاب سے دیکھتا اور سبحان اللہ کہہ اٹھتا + اُس کا خیال ہوگیا کہ کوئی شخص بُرا نہیں صرف اُسے اپنی یا کسی دوسرے کی رہنمائی کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے حقیقی سود و زیاں کو سمجھ لے +

اِس انقلابِ روحانی اور اس وجدانِ قلبی کے ساتھ اُس کا کرب و اندوہ اطمینان و مسرت میں تبدیل ہوگیا +

لیکن وہ نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ دن رات اُسے یہ دُھن لگ گئی کہ کسی طرح اپنے عزیزوں اور دوستوں اور اَور بھی جتنے لوگوں کو ممکن ہو وہ دلبرِ حقیقی کا پیغامِ محبت اور سچی خوشی کا سیدھا عملی راستہ دکھادے +

اور یہی اُس کا کام ہوگیا۔ اب وہ قلبی غم سے ناآشنا اور جسمانی کلفت سے ناآگاہ تھا۔ کیونکہ اگر کبھی (اور یہ کم اتفاق ہوتا) اُسے کوئی تکلیف یا مصیبت پڑتی بھی تو وہ یہ سمجھ کر اَور بھی مسرور و مطمئن ہوجاتا کہ یہ پیغام ہے میرے خدا کا میرے لئے + اِسی طرح اس نے اَوروں کو قول و عمل سے نیکی و مسرت کی تعلیم دی +

ہر کوئی اُس کے علم و خلوص اور محبت و خیر طلبی سے بغایت متاثر ہوا۔ اور اُس کا تھوڑا بہت اثر اُن تمام اشخاص پر ہوا جن سے اُس کا واسطہ پڑا +

وہ رُوٹھے ہوئے عزیزوں کی غلط فہمیاں دور کرتا۔ غم و درد پر عقل و اعتقاد کا مرہم لگاتا۔ غربا و مساکین اور مدارس و مجالس کے لئے مناسب خیرات دینے کی ترغیب دیتا +

گو وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند نہ تھا اُس کے خیالات اک قسم کی گہری عبادت اور اُس کے تصورات اک نوع کی سچی معرفت تھے جن میں دل کے اندر ہی اندر وہ روز و شب محو رہتا +

وہ تارک الدنیا نہ تھا اِس لئے عقل پسند اُس کی حقیقت بینی کو مذہبی جنون نہ کہہ سکے + وہ حریص و غرض مند نہ تھا اس لئے مذہبی لوگ اُس کی اصلاح و ترقی کی تحریکات کو حرص و ہوا سے تعبیر نہ کرسکے +

وہ عزیز جن کا اُس سے دن رات واسطہ پڑتا تھا اُس کی نیک روش سے متحیر رہ گئے + غصے کا اُس کی طبیعت پر

شائبہ بھی نہ رہا۔ رشک و حسد سے وہ اجنبی ہوگیا۔ غرور کبھی اُس کے دل میں بھی محسوس نہ ہُوا +

اُس کی طبیعت کی کمزوریاں قوتیں ہوگئیں۔ وہ زر پرستی سے بیزار ہوگیا اور فقیروں اور نوکروں پر بھی اُس کی شفقت بھری نظریں پڑنے لگیں +

وہ بارہا اپنی گزشتہ لغزشوں کا علانیہ اعتراف کرتا تھا، اور اب بھی روزمرہ جو غلطیاں اُس سے سرزد ہوتی تھیں وہ فوراً اُن کا جی میں یا ضرورت ہو تو دوسروں کے سامنے اعتراف کرکے آیندہ کی اصلاح و بہبود کی طرف مائل ہوتا۔ اُس کا قول تھا کہ طُول طویل ندامتیں لاحاصل ہیں۔ اور استغفار سے ترکِ گناہ بدرجہا بہتر ہے!

اُس کی تبدیلیٔ فطرت اور تبدیل شدہ شخصیت کا سب سے نمایاں اور زبردست اثر "علیم منزل" میں رونما ہُوا +

ثروت جمیل کے اِس انقلابِ قلبی پر شروع شروع میں بہت خوش و مطمئن ہوئی لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے وہ حیران و مبہوت ہوتی گئی + کیا یہی وہ جمیل تھا جو بچپن کے دنوں میں اُس سے محوِ بازی رہتا تھا؛ جس کی نگاہیں عنفوانِ شباب کے زمانے میں برابر اُس پر جمی رہتی تھیں، جس کی پھر مدتوں اُس نے شکل بھی نہ دیکھی، جو بعد میں شاید دنیادار سا بن گیا اور اب یہ کیفیت ہے کہ اُس کی نگاہیں ہمدردی اُس کا چہرہ محبت اور اُس کی گفتگو کوئی آسمانی پیام معلوم ہوتی ہے +

اُس کی تنہائی سے کبھی اُس کا جی بھر آتا لیکن پھر اُس کو مطمئن دیکھ کر وہ اُس کا منہ تکنے لگتی کہ یہ کیسا انسان ہے جو تنہائی میں بھی یوں اطمینان رکھتا ہے +

ایک روز وہ نہ رہ سکی اور اُس سے کہنے لگی "میرے اچھے بھائی! میں تمہیں مطمئن دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ میں نے آج تک کسی میں یہ بات نہیں دیکھی جو تمہاری بات بات میں عیاں ہے!

جمیل نے شرما کر جواب دیا: "مجھ سے کیسی عداوت سوجھی ہے کہ آج تم میری تعریف کرنے لگی ہو۔ بہن! میں اس مدح سرائی کے قابل نہیں +

ثروت نے کہا افسوس! تم یہ کہتے ہو بھائی! اگرچہ تم خوب جانتے ہو کہ میں نے آج تک کبھی تمہاری بے جا تعریف نہیں کی لیکن اب تو میں تم کو دیکھتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ خدایا عزیز کے سر پر اُس کے اچھے باپ کو سلامت رکھیو +

ثروت کے دل پر تو عزیز کے باپ جمیل، بچپن کے ساتھی جمیل کی نیک شخصیت کا اثر ہونا ہی تھا۔ وہ کبھی اُس کے لئے خلوص سے دعا کرتی اور کبھی ایک لمبی سرد آہ بھرتی جس کی حسرت کے خدا جانے کیا معنی تھے۔ وہ تو روز بروز جمیل کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی رہی لیکن تعجب یہ تھا کہ منظور بھی آہستہ آہستہ اُس کا حلقہ بگوش ہوتا گیا +

منظور جو کبھی سالوں ہوئے گورنمنٹ کالج میں جمیل کا سب سے گہرا دوست تھا ثروت سے شادی کرنے کے بعد جمیل

سے بالکل بے اعتنائی برتنے لگا اور یہ بے توجہی روز بروز بڑھتی گئی یہاں تک کہ آپس میں وہ بول چال کے روادار بھی نہ رہے لیکن عذرا کی موت کے بعد جمیل کے غم واندوہ سے کس پتھر کا دل تھا کہ موم نہ ہو جاتا۔ اور پھر اُس کے روحانی انقلاب کے بعد منظور پر بہت سُرعت سے اُسکا نفسی اثر پڑا۔ وہ گویا اک سُورج تھا جس کے آگے نشاط وہوس کی تاریکیاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکیں۔ وہ گویا اک برقی قوت تھا جو آن کی آن میں دیکھنے والے کی روح ورواں میں سرایت کر گئی +

ایک روز جمیل نے منظور سے کہا " بھائی! مجھے معاف کرنا میں نے اک مدت تک تمہاری دوستی کا حق ادا نہ کیا۔ تم مجھ سے روٹھ گئے اور میں نے تم کو منایا تک بھی نہیں" +

منظور کی پیشانی پر پسینہ آگیا اور اُس نے جواب دیا " جمیل! کیا کہتے ہو؟ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو؟ معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے نہ کہ تم کو۔ تم نے مجھے اِس گھر کی راہ دکھائی اور میں نے تمہارا رستہ نہ دیکھا + بھائی! آؤ پھر دوست دوست اور بھائی بھائی بن جائیں۔ تم زندگی کی پیچیدگیوں میں میری کلیدِ مراد ہو + جمیل! میرے پیارے بھائی! تم نے مجھ سے معافی مانگ کر میری زندگی کی تنہا مسرت مجھ سے چھین لی + تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر کتنا نادم ہوتا رہا ہوں۔ آج تم نے خود موقع دیا کہ میں اپنے تئیں تمہارے سپرد کر دوں + جب سے تم یہاں آئے ہو میں اپنی زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا ہوں" +

جمیل نے کہا " ہر چند میں تمہاری عنایات کے قابل نہیں ہوں لیکن تمہاری دوستی اب پھر میرے دل میں موج زن ہے۔ البتہ اس پر ایک تاریک بادل چھایا ہوا ہے جو سچ پوچھو تو تمہاری ساری زندگی کو بھی تیرہ وتار کر رہا ہے + منظور کیا یہ ثروت کا قصور ہے کہ اُس کے ہاں ابھی تک بچہ پیدا نہیں ہوا۔ اُس کی بدقسمتی پر تمہاری بے اعتنائی! آہ! تمہارے نزدیک یہ کیونکر روا ہو سکتی ہے؟ + کہتے ہیں مغرب میں عورت سرکش ہے تو کیا یہاں مرد ظالم وجابر نہیں؛ پھر جب خدا اور انسان دونوں ہی عورت کے خلاف سازش کرلیں تو اُس بیچاری کی خبر لینے والا اُس کے ساتھ انصاف کرنے والا کون ہو؟ بھائی! عذرا جب تک زندہ رہی مجھ میں اُس میں سچی محبت قائم رہی میں نے مقدور بھر اُس کی دلجوئی کی پھر بھی جب سے وہ مجھے اِس دنیا میں تنہا چھوڑ گئی ہے دن میں بیسیوں بار میں اپنے تئیں ملامت کرتا ہوں کہ حیف ہے مجھ پر فلاں روز میں نے اُسے یہ کیوں کہا اور اُس کے لئے وہ کیوں نہ کیا! منظور خدا گواہ ہے کہ میری زندگی کی دلی تمنا یہ ہے کہ تم دونوں کو دوبارہ متحد اور باہمدگر وابستہ دیکھوں +

منظور نے کہا بھائی! میں اس درخواست سے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا ہوں لیکن جو ستم ثروت پر میں آج تک ڈھا چکا ہوں اُس عذاب دہی کی تلافی اب کیسے کروں؟

جمیل بولا: ـ پچھلے گناہوں کو آیندہ نیکیاں ہمیشہ دھو ڈالتی ہیں۔ اور محبت کو تو پچھلے گلے شکوے بھول جانے کی خاص

عادت ہے۔ میرے اچھے بھائی! اپنے چاند کی چاندنی کو اپنے دل میں بس جانے دو۔ اس زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ یہ راتیں گئی پھر واپس نہ آئیں گی!

اسی رات منظور ثروت کے کمرے میں گیا۔ ثروت حیران ہوگئی کہ آج اس غیر معمولی وقت پر آنے کے کیا معنی ہیں؟

ثروت خیر تو ہے؟

منظور میری پیاری ثروت میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔

ثروت کاہے کی؟

منظور اپنی عمر بھر کی بے پروائیوں کی۔

ثروت (آنکھوں میں آنسو بھر کر) کبھی مرد بھی عورت سے معافی مانگتے ہیں؟ معافی تو صرف بیچاری عورت کے لئے بنی ہے آخر وہ کیا وجہ ہوئی کہ آج تم مجھ بدبخت کے پاس آگئے؟

منظور اب جمیل پہلے کی طرح میرا دوست ہے اور تم پہلے کی طرح میری رفیقِ زندگی۔ پیاری ثروت! کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی؟

ثروت میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مرد بھی قصور کرے تو معافی ہمیشہ عورت ہی مانگتی ہے + لیکن منظور تم نے سب کچھ سوچ لیا ہے؟ میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کیا تم یہ بھول گئے؟

منظور بیوی رفیقِ زندگی ہوتی ہے محض تولید کی کل نہیں ہوتی۔

ثروت حضور کہیں سے آج بہت سی عقل سیکھ کے آئے ہیں یہ کیا ماجرا ہے؟

منظور یہ سب جمیل کی عنایات ہیں ہم پر۔

ثروت (آہ بھر کر۔ کچھ توقف کے بعد) اب تم پھر مجھے وہی پرانے منظور معلوم ہوتے ہو۔ میں تو وہی بدقسمت ثروت ہوں مگر ہوں تمہاری بیوی جو تم سے مرتے دم تک وابستہ رہے گی!

منظور نے ثروت کو گلے سے لگا لیا اور دیر تک میاں بیوی میں محبت کی باتیں ہوتی رہیں +

ثروت کے لئے یہ رات شب برات سے کم نہ تھی۔ مصیبت کے دھواں دھار بادلوں میں سے چاند نے پھر اپنی جھلک دکھائی تھی۔ اُس کا کھویا ہوا موتی پھر اُسے مل گیا تھا +

جب منظور چلا گیا تو ثروت کا دل جمیل کے لئے اک اُداس شکر گزاری کے جذبۂ الفت سے لبریز ہوگیا اور غمگین خوشی کے آنسو اس کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگے +

جمیل نے جو بچپن میں ناکام محبت تھا جس نے عین شباب میں دستِ اجل کا صدمہ سہا اُس نے اب اپنی زندگی کی تنہائی میں بچھڑے ہوئے دلوں کی باہمی مصالحت و قربت کا سامان پیدا کردیا +

جمیل کے لئے ثروت کی خانگی مسرت خوشی کا باعث ہوئی لیکن جمیل کو دنیا کی کونسی خوشی حاصل تھی جس سے ثروت مسرور و مطمئن ہوتی +

---

(۱۱)

اِس کے دس ماہ بعد ثروت کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام جمیل کے کہنے پر نکہت رکھا گیا +

جمیل کی دعا سُنی گئی ثروت کا ایثار درگاہِ حق میں قبول ہؤا منظور کا استغفار پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا !

اس کے دو ماہ بعد جمیل سخت بیمار ہوگیا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر راہئ ملکِ عدم ہؤا +

---

(۱۲)

تیرہ سال بعد کا واقعہ ہے !

وہی تیرھویں کا چاند آسمان پر جلوہ گر تھا۔ وہی تارے کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے۔ اُسی طرح کچھ ننھی منّی بدلیاں فضا میں منڈلا رہی تھیں + شالامار کے وسطی خطے میں آبشار و چادرِ آب کا زور اور فواروں کے ٹپکتے ہوئے پانیوں کا یہ شور تھا کہ ساون بھادوں کے قریب کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی !

فضا میں اک جانفزا خاموشی کا عالم طاری تھا۔ باغ میں اک دلکش شورش کے شادیانے بج رہے تھے + ایک نوجوان اور ایک حسین دوشیزہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے آخری نطۂ باغ میں آبجو کے کنارے کنارے محوِ گلگشت تھے :

نوجوان نے کہا "میری پیاری تُو باغِ حیات میں میرے دل کے پھول کی نکہت ہے" !

حسینہ نے کہا "میرے عزیز تُو دنیا بھر میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے" !

ثروت نے اِک چنبیلی کے پودے کی آڑ میں یہ شیریں گفتگو سُن پائی۔ پہلے وہ ذرا مُسکرائی پھر کچھ آبدیدہ ہوئی لیکن آخر مسرت کی اک برقی رو اُس کے روح و رواں میں دوڑ گئی +

اِس کے چار سال بعد عزیز و نکہت کی شادی ہوگئی +

یہ تھی تکمیلِ محبت !

بشیر احمد

درسِ توکّل

تجھے کیا فکر ہے اے دل، تجھے کس بات کا کھٹکا
خدا کا نام لے، اُٹھ اور سرگرمِ سفر ہو جا

اگر دشوار ہے منزل تو ہونے دے، نہ تو گھبرا
نہیں زادِ سفر ممکن، نہ ہو اس کی نہ کر پروا

خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

تذبذب تا بکے اب شانِ استقلال پیدا کر
تلاشِ رہبرِ منزل نہ کر، خود اپنا بن رہبر

بھروسا رکھ خدا پر اور اپنے دست و بازو پر
تجھے کیا غم، اگر کوئی نہیں ہے ہم سفر تیرا

خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

یہ مانا راستہ پُرخار ہے اور دُور ہے منزل
نئی افتاد ہے ہر ہر قدم پر اور نئی مشکل

مگر صدقِ طلب کے روبرو اوہام ہیں باطل
کوئی سنگِ گراں رستہ میں حائل ہو نہیں سکتا

خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

نہ کر کچھ فکرِ تنہائی، نہ گھبرا شامِ غربت سے
ہر اک منظر نظر کش ہے زیادہ صبحِ جنت سے

مبدّل ہوگا یہ رنجِ سفر اک روز راحت سے
یقیناً کامیابی کا بندھے گا تیرے سر سہرا

خدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

بس اب عزمِ سفر کر بے نیازِ این و آں ہو کر
قدم آگے بڑھا اپنا تو میرِ کارواں ہو کر

لگا دے راہ پر سب کو عناں گیرِ جہاں ہو کر
بتا دے بے تکلّف سب کو یہ گُر کامیابی کا

خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

ابُوالفاضل ؔ ازچاندپور

تصویرِ وفا

(۱)

ہرمز نے اپنے سامنے والی دوشیزہ سے اک ذرا نظر ملائی تھی کہ اس کا منچلا دل اس کی سرور آفرین نظروں میں ہچکولے لینے لگا۔

اپنی بے اختیار سانس کو بہزار دشواری قابو میں کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "آہ تم نے! تم نے بڑی محبت کا ثبوت دیا ــــــ بڑا ایثار برتا۔ اور پھر یہ سب کچھ میرے لئے! ــــــ تمہاری محبت کے صدقے۔ بڑا احسان کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بفرضِ محال تم خسرو کو منظور کرلیتیں؟ ــــــ وہ اپنے باپ کے سارے کاروبار اور جائداد پر عنقریب بلاشرکتِ غیرے پورا اختیار حاصل کرے گا۔ پھر خیال تو کرو تم کتنے بڑے مالدار کی بیوی ہوتیں"۔

"مگر مجھے مالدار بننے کی کبھی تمنا ہی نہیں ہوئی۔ ہرمز! میں تو اپنی زندگی کے دامن کو نمایشی اطمینان و آسایش سے بچا کر مسرتِ حقیقی کی گلکاریوں سے مزین دیکھنا چاہتی ہوں جو تم ہی انصاف سے کہو کتنی متبرک اور انمول شے ہے ــــــ اور پھر بھلا اس شخص سے جس سے مجھے کوئی اُنسیت ہی نہ ہو اپنی قسمت وابستہ کرنے کے بعد کسی خوشی کا وہم و گمان ہونا میری نادانی نہ ہوتی؟ ــــــ لیکن سچ کہنا۔ تمہیں میری جان کی قسم کیا واقعی تم کو مجھ سے محبت ہے؟"

وہ یہ کہہ کر مُسکرا دی ــــــ اس ادا سے جس میں شاعرانہ مبالغہ سے برطرف واقعی ایسا معلوم ہُوا کہ صدہا بجلیاں کوند گئیں۔ کتنے ہی موقعے ایسے گزر چکے تھے کہ اس نے یہ سوال محض اس لالچ اور تمنا سے کیا تھا کہ وہ اس کا حسبِ دلخواہ جواب ایک بار پھر اُسی زبان سے سُن لے جو اس کی ساری آرزوؤں اور ارمانوں کا حاصل تھا ــــــ کہنے کے ساتھ ہی وہ شرمائی لجائی ایک دلفریب ادا کے ساتھ سامنے والی میز پر جھکی اور الھڑپن کی لاپروائی سے اپنا نازک مرمرین ہاتھ پھیلا دیا۔ اس کی سبک اُنگلی میں ایک خوشنما ہیرے کی نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

مذہبی اصول پر آج صبح ہی ان کی شادی ہوئی تھی ــــــ وہ شادی جو اب تک صیغۂ راز میں تھی اور ہر طرح خفیہ طور پر عمل میں لائی گئی تھی۔ دونوں نو آموزِ الفت۔ نوعمر۔ بیس بائیس کا سن۔ ناتجربہ کار۔ دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف ــــــ مگر رشتۂ محبت میں اس طرح جکڑے ہوئے کہ کوئی دنیاوی ہستی ان کو جدا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکتی تھی۔

خفیہ شادی کا لازمی نتیجہ لڑکی والوں کی ناخوشی کا اظہار تھا۔ لڑکا حقیقتاً خوشحال نہ تھا۔ کہنے کو وہ اپنے آپ کو فوٹو گرافر

مصور۔ سب ہی کچھ کہتا اور مہینے میں پچاس ساٹھ اس ذریعہ سے کما بھی لیتا مگر وہ خود اس کے ذاتی مصارف کے لئے کافی نہ ہوتے تھے چہ جائیکہ اب ایک اور شریک زندگی کے اخراجات! ۔ ظاہرا کوئی صورت اضافۂ آمدنی کی بھی نہ معلوم ہوتی تھی +

لڑکی کا باپ! شہر کا بڑا سوداگر۔ مسلمہ رئیس ۔ وہ اور اس کے گھر والے روپے کی قیمت اور اس کے اصراف کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے ۔ دوشیزہ! خود بے حد حسین تھی۔ نازک اندام۔ چھریرہ جسم ۔ لمبے لمبے سیاہ بال۔ تبسّمی ۔ جیسے مخملی ڈبیا میں سچے موتیوں کی دو قطاریں ۔ بڑی بڑی ۔ سیاہ پلکوں والی مخمور آنکھیں ۔ گلابی کاغذی ہونٹ ۔ غرض یہ کہ اس کی شباب آفرین ہستی کسی کی آغوش تمنا سے ہم کنار ہونے کی تلاش سے مستغنی تھی ۔ سینکڑوں تھے جو ہر دم اس پر پروانہ وار نثار ہونے کو تیار تھے اور سینکڑوں ایسے بھی تھے جو اس کی ایک ادائے تبسّم پر نقد دل ۔ نقد جان ۔ سب ہی کچھ قربان کرنے پر آمادہ تھے ۔ مثالاً مذکرہ بالا مُصّور کو لیجئے ۔ وہ واقعی اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا ۔ اس کے والدین بھی اُس کو سر آنکھوں پر لیتے ——— مگر لڑکی! ۔ محبت کی دیوی ۔ محبت کی پجاری ۔ اور محبت ہی کی بھوکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ سب طرف سے آنکھیں موند کر اس نے ایک غریب نادار مصوّر کو محض محبت کے نشہ سے بے خود ہو کر اپنا سرمایۂ حیات سپرد کر دیا اور ہمیشہ کے لئے کر دیا ۔ گو عام اصطلاح میں مشہور بھی ہوُا کہ وہ اس کے ساتھ "بھاگ" گئی ۔

اس طرح یہ دونوں ناتجربہ کار ہستیاں اپنا اسباب وغیرہ لپیٹے شام کی گاڑی سے کہیں باہر چلے جانے کو تیار تھے یا یوں کہئے کہ اپنے لئے تخلیق مصائب کا سامان پیدا کرنے میں "اپنی کلماڑی اپنا پاؤں" کا مصداق کر رہے تھے ۔ مگر پھر بھی ان کے دل ہمت افزا ۔ ان کی پیشانیاں خندہ تھیں ۔ محض اس لئے کہ ان کی ہر حرکت اور ارادے میں خلوص اور محبت کی نورانی شمع روشن تھی ۔

ایک غیر معروف ہوٹل کے گوشہ والی میز کے سامنے دونوں بیٹھے تھے ۔ دو ایک پلیٹوں میں معمولی طور پر جو کچھ سامان رکھا تھا وہی ان کی برات کا کھانا تھا ۔ اور لڑکی کے ہاتھ کی انگوٹھی ان کا سارا جہیز ۔

دوشیزہ نے اک حیا آموز ادا کے ساتھ کہا "ہرمز! تم جانتے ہو ۔ مجھے تم سے محبت ہے ۔ میں اس وقت دنیا کی ساری عورتوں میں غالباً سب سے زیادہ خوش نصیب اور مسرور ہوں ۔ مجھے اپنی کامیابی پر بجا ناز ہے" ۔

ہرمز۔ "عزیزترین تہمینہ! تم انشاءاللہ ہمیشہ یوں ہی شاد رہوگی ——— مگر مجھے ڈر ہے کہ وہ . . . . وہ لوگ مجھے تم سے جدا کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے" ۔

تہمینہ۔ اوئی کون ؟

ہرمز۔ کون! تمہارے والد ۔ تمہاری . . . .

تہمینہ۔ (سر ہلا کر) وہ اپنی کوششوں کو بے سود پاکر خود ہی بیٹھ رہینگے ——— تم دیکھنا خدا نے چاہا تو وہ مجھے تم سے ہرگز علیحدہ نہ کرسکیں گے۔

ہرمز۔ پھر بھی ایک قسم کی لڑائی تو جاری رہے گی۔

تہمینہ۔ رہے! مگر میں تو تمہاری مدد کے لئے ہردم سایہ کی طرح ساتھ ہوں۔ ہرمز! تم کو قدرت نے غیر معمولی ذوقِ مصوری ودیعت کیا ہے۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ تم اس دور میں ایک نہ ایک دن مصوری کا درخشندہ ستارہ بن کر چمکو گے اور خدا نے چاہا تو ضرور چمکو گے۔ اس وقت کے لئے۔ اس ساعت کو قریب تر لانے کے لئے۔ میں۔ میری تمام کوششیں۔ میری تمام دعائیں تمہاری کامیابی کے لئے وقف ہونگی۔

ہرمز۔ پیاری تہمینہ . . . . . . (جوشِ مسرت میں اسکی آنکھیں ڈبڈبا آئیں)

دونوں وہاں سے اُٹھ کر اس کمرہ کی طرف چل دیئے جو انہوں نے شبِ عروسی گزارنے کے لئے کرایہ پر حاصل کرلیا تھا اور جو ہر عروسانہ آرایش سے بے نیاز تھا۔ دروازہ پر پہنچتے ہی ان کو معلوم ہوا کہ ان کے انتظار میں کوئی اندر بیٹھا ہوا ہے۔ باہر موٹر کھڑا تھا۔ دوشیزہ نے پہچان لیا ——— موٹر اس کے گھر کا تھا۔

تہمینہ۔ انہیں ہمارا پتہ چل گیا۔ ہرمز! شاید والد صاحب آئے ہیں۔

ہرمز۔ بر سرِ تقدیر . . . . . . میں تیار ہوں۔ (اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں)

کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی ان کو معلوم ہوا کہ آنے والا تہمینہ کا باپ نہیں ——— بلکہ ماں تھی۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوگئی؟" تہمینہ کی ماں کا پہلا اور گھبرایا ہوا بے ساختہ سوال تھا۔

تہمینہ۔ اماں جان! ہم لوگوں کو جدا کرنے کے لئے واقعی اب وقت ہاتھ سے جاتا رہا ——— میں ہرمز کی ہوچکی۔

تہمینہ کی ماں کی نظروں میں بجلی سی کوند گئی۔ بدن میں ایک سنسنی ایک رعشہ محسوس ہوا۔ لیکن اس نے انتہائے ضبط کو کام میں لاکر ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرہ سے انتشار اور ہیجان بیّن طور پر نمایاں ہونے لگا۔ اس نے تہمینہ کی طرف ایک بار جھٹکے سے مڑکر کہا۔ "میں تمہارا خط پاتے ہی تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ میں نے تم کو ایک بار ٹیلیفون پر اس ہوٹل کا نام لیتے سنا تھا ——— دکھاؤ۔ تمہاری شادی کا سرٹیفکیٹ کہاں ہے؟"

ہرمز نے اپنی جیب سے سرٹیفکیٹ نکال کر خاموشی کے ساتھ بڑھادیا جس پر تہمینہ کی ماں نے سرسری سی نظر ڈال کر ہی واپس کردیا اور بولی۔ "تم جانتے ہو! میری تہمینہ ابھی بیس کی بھی پوری نہیں ہوئی ہے"۔

ہرمز۔ "جی ہاں ——— سچ پوچھئے تو میرا بھی ابھی اکیسواں ہی سال شروع ہے۔ مگر ہم دونوں محبت کا عہد و پیمان کر

چکے ہیں اور آپ سے بصد التجا درخواست کرتے ہیں کہ برائے خدا ہم کو جدا کرنے کی کوششوں سے درگزر کیجئے۔

تہمینہ کی ماں۔ "سمجھ لو! تمہارے خلاف چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ قانوناً تمہاری شادی ناجائز قرار پا سکتی ہے یا نہیں مگر...... اس کے باپ نے تو طے کر لیا ہے کہ وہ اب اس کی شکل نہ دیکھیں گے۔ تم نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ تم محبت کا دعوےٰ کرتے ہو مگر میری لڑکی کو اس حال پر پہنچانے میں مجھے تمہاری محبت اور الفت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ اس نے اب تک آرام و آسایش کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ ناز و نعم میں پرورش پائی ہے۔ لیکن اب تو ظاہری اسباب اس کے لئے بجز فاقہ کشی اور کچھ نظر نہیں آتے۔

ہرمز۔ جی نہیں۔ خدا نے چاہا تو ایسی نوبت ہرگز نہ آنے پائے گی۔ میں اس کے لئے......

تہمینہ کی ماں۔ بس بس! اپنی فضول گوئیوں سے میرا وقت خراب نہ کرو۔ میں جس غرض سے آئی ہوں اس کی تکمیل کے بعد جلد سے جلد واپس جانا چاہتی ہوں۔ تہمینہ کے باپ نے لڑکی سے ہاتھ دھو لیا۔ ان کا خیال ہے کہ تم دونوں نے ان کو بڑا صدمہ پہنچایا اور زبردست فریب دیا۔ آیندہ کے لئے تم خود مختار ہو۔ تم پچتاؤ گے ــــــ دیکھنا تم دونوں آخر کار پچتاؤ گے۔ مگر تہمینہ کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ آج سے اس کے لئے میرے گھر کے دروازے بالکل بند ہو گئے۔ اب وہ تا حیات اس مکان میں واپس نہیں جا سکتی۔ اس نے جو کچھ کیا۔ اب بھگتے۔ ہم نے جس محبت سے پرورش کیا جس محنت سے تعلیم دی۔ اور جس شفقت سے پالا پوسا اس کا صلہ خوب مل گیا۔ اس ناشدنی نے اپنی آبرو دو کوڑی کی کر لی...... ہاں۔ ایک غریب مصور کے ساتھ شادی کر کے ہماری عزت خاک میں ملا دی +

ہرمز۔ محترمہ! میں شاید ہمیشہ مفلس نہ رہوں گا...... میں......

تہمینہ کی ماں۔ مجھے اپنی لڑکی کی خاطر شاید یہی دعا کرنی پڑے گی کہ تم مفلس قلاش نہ رہو۔ تم پر جو کچھ بھی افتاد پڑے۔ تمہاری جو کچھ بھی خانہ خرابی ہو۔ مگر تم اب میرے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ میں تم دونوں کو اس کا پورا یقین دلا دوں ــــــ رہی میں۔ گو میں دکھیا۔ بدنصیب اور بے غیرت ہوں مگر پھر بھی تم دونوں کے ساتھ آخری سلوک کئے جاتی ہوں (اپنے بٹوے سے نوٹ نکال کر) لو تہمینہ۔ یہ تین ہزار کے نوٹ ہیں۔ تمہارے باپ کو ان کا علم نہیں مگر میں......

تہمینہ نے اپنا سر ہلا کر نوٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بولی۔" اماں جان! مجھے ان کی ضرورت نہیں ــــــ آپ کی دعا چاہئے"۔

ماں۔ نادان لڑکی! دیکھ ہوش میں آ جا۔ تجھ کو ان کی ضرورت پڑے گی۔ اور پھر پڑے گی ــــــ تو ابھی دنیا داری

سے ناواقف ہے۔

تہمینہ پھر بھی مغرورانہ انداز سے ہرمز کے پاس کھڑی رہی اور استغنا کے ساتھ بولی " مجھے اُن کی ضرورت ہرگز نہ ہوگی۔ میں نے ہرمز کے ساتھ شادی اس لئے کی ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس کا مستقبل خواہ روشن ہو یا تاریک مگر میرے دل کی تسکین اور جان کا آرام ثابت ہوگا۔ گو یہ امر میرے لئے ایک مستقل صدمہ بن جائیگا کہ میرے قدیمی گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے۔ اور میں آپ یا ابّا جان کو اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی ـــــ مگر خیر! ـــــ میرا دِل یوں مطمئن رہے گا کہ مجھے اپنے خاوند سے محبت ہے۔ آپ کا روپیہ لینا اس کی صریحی توہین ہی نہیں بلکہ اس کی محبت پر غیر اعتمادی کا اظہار ہوگا اس لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہوں ـــــ اور فقط اسی لئے انکار کرتی ہوں"۔

تہمینہ کی ماں نے طیش میں ایک بار، اچھا، کہا اور دروازہ کی طرف بڑھ گئی ـــــ مگر قبل اس کے کہ وہ قدم باہر رکھ سکے تہمینہ نے سامنے آکر بے تکلف اس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے اور گلوگیر آواز میں بولی " اماں جان...... روپے کی بجائے مجھے ایک آخری پیار دیتی جایئے........ اور اماں.... وعدہ کیجئے...... کہ آپ مجھے دعائے خیر سے اسی طرح یاد رکھیں گی جس طرح ہر شب کو سوتے وقت میرا آخری کام آپ کی یاد اور آپ کا تصوّر ہوا کرے گا.... اور.... اور اماں..... کبھی کبھی مجھے یاد ضرور کر لیا کیجئے گا...... کیونکہ...... پھر بھی میں آپ کی...... اولاد ہی تو ہوں"۔

بہت ممکن تھا کہ کسی معمولی سے معمولی سبب کے تحت میں اگر عزیزوں رشتہ داروں میں اس کی رسوائی ہوتی یا دوست آشناؤں کے دائروں میں سُبکی ہوتی تو تہمینہ کی ماں اس کو تاحیات درگزر کرنے کا وہم بھی نہ کرتی مگر یہاں اب سوال ' ماں کی محبت ' کا آگیا تھا۔ بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کی اکلوتی جوان لڑکی یوں جوشِ محبت میں اس کے گلے سے لگی، آنکھوں میں آنسو بھرے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے اس کو بھیچ بھیچ کر ہمیشہ کے لئے رخصت کر رہی ہو اور پھر اس کا دل مانے؟۔ آخر وہی ہوا جو اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ تہمینہ کی ماں جوشِ اُلفت سے بیتاب ہو گئی۔ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کو بے تابانہ چپٹا لیا اور اسی وجدانِ بے خودی میں ایک نہیں بلکہ بے شمار پیاروں کی بوچھاڑ اس کے رخسار۔ اس کی پیشانی۔ اس کے ہونٹوں اور شانوں پر کر دی۔ پھر ایک بار محبت آمیز نظریں ہرمز پر ڈال کر بولی " ہرمز! دیکھو اس نے محبت کی خاطر بڑا زبردست ایثار کیا ہے۔ اس نے اپنے سارے موجودہ عیش و راحت اور شاندار مستقبل کو قربان کیا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو"۔

شاید یہ الفاظ ہرمز کے دل پر گہرا اثر کر گئے۔ کیونکہ تہمینہ کی ماں کے چلے جانے پر اس نے تہمینہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ اور آواز بے قابو۔ " میں اس کا اہل ثابت ہوں گا ـــــ تہمینہ..... میں ضرور ہونگا۔

تم نے میری محبت میں جو کچھ قربانیاں کی ہیں ان کے عوض اگر میں کبھی عدمِ التفات یا عدمِ توجہ کا مرتکب بنوں تو ——
خدائے برتر مجھے سزا دے - میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہ تھا - اور تو کچھ نہیں مگر ہاں اس وقت یہ ضرور کہتا ہوں کہ مجھ سے
جس قدر محنت - مشقت ہو سکی ......"

تہمینہ نے شوخی سے اپنا نازک ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ کر کچھ آگے کہنے سے روک دیا اور بولی - "ہرمز - بس بس - ہوش کی باتیں کرو - میں خدا کی قسم بالکل مطمئن ہوں —— اور بے حد خوش بھی "

---

(۲)

بیس سال کے بعد !

یہی محبت کے نام پر جینے والا جوڑا - ایک خوش نما - خوش وضع - اور خوش آراستہ فوٹو گرافی کی دوکان میں حسد آفرین انداز سے کھڑا تھا - عورت چالیس برس کی عمر پر پہنچنے کے بعد بھی خوبصورت ضرور کہی جا سکتی تھی - مگر اس کے ماتھے پر خفیف جھریوں کی نمود رخساروں کی سرخی میں زردی کی جھلک - اور آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے اس کے دل کی افسردگی اور قلبی اضطراب و انتشار کی شہادت دیتے تھے -

ہرمز کو اپنے فن میں بالآخر کامیابی نصیب ہوئی - گو شادی کے بعد ابتداءً پورے بارہ سال بے حد صبر آزما ثابت ہوئے لیکن تہمینہ نے کبھی دامنِ صبر و استقلال ہاتھوں سے نہ چھوڑا - بیشتر موقعے ایسے آئے کہ دو دو فاقوں کی نوبت پہنچ گئی - مگر اس نے ہرمز کے سامنے کبھی حرفِ شکایت منہ پر نہ آنے دیا - محض اس خیال سے کہ اس کے لئے زندگی کی کشاکشِ پیہم زیادہ دشوار اور صبر کوش تھی - اسلئے جو کچھ روکھا سوکھا ممکن ہوتا وہ ہر طرح ضد اور خوشامد کر کے اس کے پیٹ میں ڈلوا دینا فرضِ اوّلین جانتی تھی - اس صورت میں شہرت و ثروت کی پرانی خوش خیالیاں قصۂ پارینہ یا محض خواب و خیال بن کر رہ گئی تھیں -

اس دور میں ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ وہ بے تکلف اپنے گھر واپس جا سکتی تھی - مگر تہمینہ کی محبت - تہمینہ کے خلوص - اور تہمینہ کے استقلال کو کبھی لغزش نہ ہونے پائی - اس کو اپنی محبت کا دعوے اور اس کا پاس ہر دم ملحوظ رہتا - اس کا وجود ایک ہستی کی راحت و مصیبت - خوشی اور رنج - اچھے برے کا شریک بن چکا تھا اب خواہ اس کو روکھی سوکھی ملے یا مرغن لذیذ کھانے - پھٹے چیتھڑے ملیں یا زربفت کی بیش قیمت ساڑیاں - خانہ بدوشی نصیب ہو یا سر بفلک محلات - مگر ہر حال میں اُس کے دوش بدوش رہنا - خوش رہنا اور رکھنا —— یہی اس کی مستقل دماغی کاوش تھی اور یہی اس کی زندگی کا غیر فانی آسرا -

چار برس بعد ایک خوبصورت سا بچہ بھی پیدا ہوا۔ مگر تہمینہ کی مغموم فضا اور پے در پے فاقہ کشیوں نے اس کو پروان چڑھنے نہ دیا۔ اپنی پرورش کے ذرایع مسدود دیکھ کر اس نے بھی چند مہینوں کے بعد ہی ساتھ چھوڑ دیا جس کا قلق تہمینہ کے لئے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ بن گیا۔

چھٹے برس خدا خدا کر کے کایا پلٹی۔ قسمت نے کروٹ لی۔ سوتے نصیب جاگے۔ دن دونے رات چوگنے۔ ہر مہینہ دوسرے مہینے سے غنیمت اور ہر سال دوسرے سال سے بہتر گزرنے لگا۔ اور چودہ برس بعد تو وہ اچھے خاصے روپے والے ہو گئے۔ اعلیٰ درجہ کی دوکان۔ موٹر۔ نوکر چاکر۔ ساز سامان سب ہی کچھ ہو گیا ـــــــ لیکن اب ایک اندرونی خلش ایسی بھی پیدا ہو گئی جس سے نامراد تہمینہ اپنے گذشتہ ایام سے مغموم تر نظر آنے لگی۔ ہرمز بہت سے غیر مآل اندیش خاوندوں کی طرح اس کی طرف سے غفلت اور عدمِ توجہ کا مرتکب ہونے لگا تھا۔

ہرمز کی عمر چالیس اکتالیس کی کسی طرح نہ جچتی تھی۔ اس کے چہرہ پر اب بھی لڑکپن کی سی شوخی۔ لبوں پر شباب آفرین تبسم اور بالوں میں جوانی کی سی چمکدار سیاہی برقرار تھی۔

تہمینہ نے تھوڑی بہت نگرانی شروع کی تو اس کا نتیجہ ہرمز کے دل میں اس کی طرف سے مزید نفرت کی تخلیق نکلا۔ تہمینہ کے شباب میں جوانی۔ اور جوانی میں عمر کا پختہ پن ٹپکنے لگا۔ اس کا سراپا حُسن۔ اس کے ہونٹوں کا تبسم اور اس کی آنکھوں کا خمار رفتہ رفتہ کافور ہونے لگا۔ اب وہ حسین نہ رہی ـــــــ لیکن ہرمز کو کبھی اس کا احساس بھی نہ ہوا کہ درپردہ یہ سب اسی کی تغافل شعاریوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اسی کی کم نگاہیوں کی نذر ہو گئے۔ اور اب تو اس کی آنکھوں نے خود وہ منظر دیکھ لیا تھا جس سے رہی سہی امیدوں پر بالکل ہی پانی پھر گیا۔

تھئیٹر کی ایک حُسن فروش رقاصہ کو فنِ مصوری کا نمایشی شوق پیدا ہوا۔ ہرمز استاد بنا اور وہ شاگرد! ـ گو بعد میں ہرمز ہی کو اس کی جناب میں زانوئے حواس تہ کرنا پڑا۔ ۲۲ کا سن۔ بلا کی شوخ اور حسین۔ جس کو خود ہرمز 'ساحرہ' کہا کرتا۔ رفتہ رفتہ اِن دونوں کے تعلقات کا چرچا ہر گلی کوچے میں عام ہوا تو تہمینہ بھی ناواقف نہ رہی۔

مصوری کے تاریک کمرہ میں ایک دِن دونوں پاس پاس بیٹھے تصویر بنانے میں مشغول تھے۔ اتفاقاً ـــــــ بلکہ کہنا تو یہی چاہیئے کہ 'قصداً'، ساحرہ نے اپنی ساری کو ایک بار اس انداز سے جھٹکا دیا کہ اس کے مرمریں شانے۔ گردن۔ اور سینہ کا مقابل حِصّہ بے پردہ ہو گیا۔ جس پر تاریک کمرہ میں موم بتی کی خفیف مگر لطیف روشنی نے ایک خاص نورانی جاذبیت کا اضافہ کر دیا۔ اس نظارہ سوز جلوے کا لازمی نتیجہ ہرمز میں مقتضیاتِ فطرت کے غیر معصوم ولولوں کا بھڑک اٹھنا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلو بدل کر ایک غیر اختیاری جوش میں اس کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا "ساحرہ! مجھے تمہاری محبت دیوانہ بنا کر چھوڑے گی"۔

عین اسی لمحہ میں دروازہ کھلا اور تہمینہ ــــــــــ اس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔

تہمینہ نے سب کچھ دیکھا اور سنا۔ مگر پھر بھی وہ خاموش رہی اور نہایت متانت کے ساتھ آگے بڑھ کر ساحرہ سے بولی "اجازت دیجئے۔ مجھے اپنے خاوند سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا ہے"۔

ساحرہ جس وقت کمرے سے باہر جانے لگی۔ تہمینہ نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر پُرغرور تبسّم کھیل رہا تھا۔

میاں بیوی میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہرمز آخرکار اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا کر آرام کرسی پر آبیٹھا اور بولا "تہمینہ! میں جانتا ہوں کہ میں نا عاقبت اندیشی سے کام لے رہا ہوں ــــــ مگر کیا کروں مجھے اس سے محبت ہے۔ میں . . . . . ."

تہمینہ۔ میں جانتی ہوں کہ تم کو اس سے محبت ہے۔ اور اب تو یہ ایک کھُلا ہوا راز ہے۔ میں کیا۔ اس کو دنیا جانتی ہے۔ ہر شخص کی زبان پر یہی تذکرہ ہے اور مجھے بس اسی کا زیادہ ملال ہے . . . . ہرمز۔ مجھے تم سے ہمیشہ محبت رہی ہے

ہرمز۔ "میں جانتا ہوں۔ اور مجھے یہی خیال پریشان رکھتا ہے۔ میں اتنا بُرا بھی نہیں جتنا تم خیال کرتی ہو۔ مگر اس کو کیا کروں کہ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ صبر نہیں ہوتا . . . . میرے دل پر گہری چوٹ آئی ہے"۔

تہمینہ۔ اچھا سچ بتاؤ۔ کیا واقعی تم کو اس سے محبت ہے؟ سچی محبت! کیا تم اپنے وقتی ولولوں کو ایسے مستقل جذبات سے موسوم کرسکتے ہو جو کسی خاص میعاد کے پابند نہ ہوں گے؟

ہرمز۔ ہاں ایسی ہی ہے۔ میں اس کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ اس کا ایک نظارہ میری رگوں میں حشرِ تلاطم برپا کر دیتا ہے . . . . . محض ایک نظارہ!

تہمینہ۔ "لیکن یہی تو تم مجھ سے بھی کہا کرتے . . . ." تہمینہ وفورِ غم سے جملہ پورا نہ کرسکی اور خاموش ہوگئی۔ اس کے پہلوئے تخیّل میں وہ زمانہ کروٹیں بدلنے لگا جبکہ یہی ہرمز اس کو اپنی زندگی کا آسرا۔ اپنی جانِ تمنا کہا کرتا تھا۔ اس کو اس کا بھی احساس ہونے لگا کہ اس کی وجہ سے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کیں۔ بدنامیاں سہیں۔ گھر چھوڑا۔ والدین کو خیرباد کہی ــ اور پھر اچھے بُرے ہر حال میں صبر و شکر کے ساتھ گزاری ــــــ مگر اب اس کا نازک دل اس کی بے وفائی اور بے توجہی کا شکار ہو کر ٹوٹ گیا۔ مردہ ہوگیا۔

ہرمز۔ "میں نے تم سے دل کا حال صاف صاف کہہ دیا۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ فریب نہیں دیتا۔ مجھے اس سے واقعی محبت ہے ــــ اور بُری طرح . . . ."

"تو تم مجھے چھوڑ دو گے؟"۔

تہمینہ نے یہ سوال نہایت اطمینان۔ متانت اور بھولے پن سے کیا تھا جس کے بعد ہی ہرمز کھڑا ہو کر کمرہ میں آہستہ

آہستہ ٹہلنے لگا اور بولا "میں نے ابھی کوئی ایسا فیصلہ تو نہیں کیا ہے"۔

تہمینہ ۔ لیکن ہرمز، تم کو شاید ایسا کرنا پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی بندوبست تو کرنا ہی ہوگا۔ اس طرح کب تک گزارو گے۔ تمہارا دعوے ہے کہ تم کو اس سے محبت ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ میری محبت تمہارے دل سے فنا ہو چکی ——— کیوں سچ ہے نا؟

یہ کہہ کر وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ مگر ہرمز کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کا مجرم ضمیر کم از کم اس موقعہ پر اس سے نگاہیں دوچار نہ کر سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چہرہ فرطِ غم سے زرد پڑ گیا ہوگا۔ اور وہ یہ بھی یقینی سمجھتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمنڈا ہوا ہوگا۔ حالانکہ وہ ہر ممکن ہمت کا ثبوت دے کر ابھی تک اپنی آواز کی شیرینی کو قائم رکھے ہوئے تھی۔

ہرمز پر حقیقتاً اس وقت گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ واقعی شرمندہ اور منفعل نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی نفس پرستیاں۔ اسکے دلولوں کی کشمکش اس کو ہر طرح ناعاقبت اندیشی کے ارتکاب کی رغبت دے رہی تھیں۔ آخر کار ایک بار ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "تہمینہ! مجھے افسوس ہے ——— اے خدا مجھے افسوس ہے"

تہمینہ ۔ وہ تم سے کہے گی کہ مجھے کہیں دور لے چلو ——— وہ یہ بھی کہے گی کہ یا تو تم میرے ہو کر رہو یا اُس کے ——— اور شاید تم کو اس کا کہا ماننا پڑے۔ بہرحال جیسا کہ میں کہہ چکی موجودہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی ——— مگر ہرمز! میں تم کو چھوڑ نہیں سکتی۔ میں کیا کروں۔ میرا دل نہ مانے گا۔ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔

ہرمز نے ایک بار اس کو کنکھیوں سے دیکھا اور بولا۔ "تو تم . . . ."

تہمینہ ۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ میرے دل میں تمہاری محبت اب تک اسی طرح محفوظ ہے اور انشاءاللہ مرتے دم تک رہے گی۔ تمہارا خیال ہی دمِ واپسیں کا ہم نفس ہوگا ——— اب تم ہی بتاؤ میں تم کو کس طرح چھوڑ سکتی ہوں۔ تم میرے بچے کے باپ . . . . بس مجھے یہی کہنا تھا۔ قطع نظر ان تمام باتوں کے میں پھر ٹھنڈے دل سے تم کو کامل آزادی کا حق دیتی ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے۔ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ نہ میں اب حسین ہوں اور نہ نوجوان۔ مگر میری چشمِ محبت زمانہ شباب کی طرح تم کو اب بھی اسی تندیدی اور پُرشوق نظروں سے تکتی ہے۔ میرا دل اب بھی اسی طرح تمہاری محبت کا خزینہ بنا ہوا ہے۔

"مسٹر ہرمز! میں جاتی ہوں۔ آپ کو کچھ کہنا تو نہیں ہے"۔ پاس والے کمرہ سے ساحرہ کی شیریں آواز میں یہ الفاظ سنائی دیئے۔

تہمینہ نے اپنا رُخ پھیرا اور دروازہ کی طرف بڑھ گئی۔ ہرمز نے ایک بار "تہمینہ" کہا بھی مگر اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور باطمینان بولی۔ "بس! تم کو ہم دونوں میں سے انتخاب کرنا ضروری اور لابدی ہے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے۔

اس نے انتخاب کیا ——— تہمینہ خوب جانتی تھی کہ اس کا انتخاب کیا ہوگا۔

آخر کار ایک ایسا منحوس دن آیا کہ تہمینہ کی نمناک آنکھوں اور مغموم دل کو میدانِ صبر و رضا میں اس لئے سینہ سپر ہونا پڑا کہ اس کا خاوند ایک دوسری عورت کو لے کر فرار ہو گیا۔ لیکن اللہ ری وفا آموز ہستی! اس حال میں بھی اس نے اپنے رات اور دن محض اس کے لئے دعائے صحت۔ دعائے عافیت اور اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو ایک نہ ایک دن اس کی واپسی کی ڈھارس دینے میں وقف کر دیئے۔ اسکا ایمان تھا کہ اس کی محبت چونکہ پہلی ہے اس لئے آخری بھی یقیناً ثابت ہوگی۔

---

(۳)

ہرمز چلا گیا ——— اور تہمینہ کو اس کا منہ پھر پندرہ سال تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ پہلے تو ہر مہینے پابندی کے ساتھ کچھ نہ کچھ خرچ بھیجتا رہا مگر بعد کو وہ بھی بند ہو گیا۔ تہمینہ نے اس کے خلاف نان نفقہ کے لئے کوئی چارہ جوئی نہ کی۔ روپیہ کی طرف سے وہ یوں مستغنی تھی کہ اس کی ماں نے مرتے وقت وصیت نامہ میں اس کے لئے کثیر رقم چھوڑی تھی +

شدہ شدہ یہ خبر ملی کہ ہرمز کی بُری طرح گزر رہی ہے۔ شراب کی لت نے بیکار بنا کر آمدنی کے ذرایع مسدود کر دیئے۔ عورت زندگی کی رفیق ثابت نہ ہوئی۔ ابتدا میں ہر دم قیمتی لباس۔ لذیذ کھانے۔ سیر تماشے یا اور اسی طرح کی مختلف فرمائشوں اور فضول خرچیوں کا طومار باندھتی رہی۔ آرام میں ساتھ دیا مگر وقت پڑے پر نکل بھاگی۔

پھر ——— کامل پندرہ برس کے بعد۔ ہزاروں میل کے فاصلے سے۔ ایک بے ترتیب اور کانپتے ہاتھ کی یہ تحریر موصول ہوئی۔

> پیاری تہمینہ!
>
> خدا کے لئے جلد آؤ۔ میں مرتا ہوں لیکن مرنے سے پہلے اگر ....
>
> تمہاری دید کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ تو شاید میری روح تاقیامت مضطرب و پریشان رہیگی۔
>
> ہرمز

تہمینہ گئی ——— اور اب ایک بوسیدہ۔ غلیظ سے کمرہ میں تھی جہاں کی عفونت اور گندگی دیکھ کر اس کو نفرت ہی نہیں بلکہ گونہ عبرت بھی ہوئی۔ اس کا شوہر ہرمز ایک ٹوٹی سی چارپائی پر پڑا تھا۔ بیمار۔ لاغر۔ دھان پان۔ چہرہ ستا ہوا۔ ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ آنکھیں گڑھی ہوئیں۔ کھانسی کی زیادتی دم نہ لینے دیتی تھی۔

تہمینہ کی پہلی ہی نظر میں بے ساختہ چیخ نکل گئی ہوتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہ نکلا ہوتا۔ مگر اس نے

قصداً، مصلحتاً اپنے آپ کو بہت روکا سنبھالا۔

وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اور اس کا مردہ بے رونق ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ہرمز باتیں کرتا رہا:۔

"اس ظالم۔ سفاک کو گئے ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ بڑی مطلب پرست۔ خود غرض۔ دنیا ساز عورت تھی۔ جب تک روپیہ رہا۔ آمدنی رہی۔ خوش رہی۔ جب ذرا اس طرف سے کمی دیکھی لگی جا و بیجا پریشان کرنے۔ شراب نے میرے ہاتھوں میں رعشہ پیدا کر دیا اس لئے رہا سہا سلسلہ بھی جاتا رہا۔ نہ مصوری رہی نہ فوٹوگرافی پھر تو میدان صاف دیکھ کر وہ بھی نکل بھاگی۔ تہمینہ ——— میں سمجھتا تھا کہ تم کو ان سب واقعات کی اطلاع ہوگی۔"

تہمینہ۔ نہیں ہرمز۔ مجھے کیا معلوم؟ میں تو اُس دن سے دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو کر ایک ویران گوشہ میں جا پڑی تھی۔ سب سے ملنا جلنا۔ راہ و رسم یک لخت بند کر دیئے تھے۔

سچ پوچھئے تو اس میں شک بھی نہ تھا کہ ہرمز کے جانے کے بعد وہ مجبوراً ایک غیر معروف قصبہ میں چلی گئی تھی۔ رشتہ داروں کے طعن و تشنیع۔ دوست احباب کی چہ میگوئیاں اس کے دل کے زخموں پر نشتر کا کام کرتی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر موت کی طالب ہوتی۔ اور گود پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتی۔ کہ کسی طرح یہ زمین شق ہو اور وہ اس میں سما جائے تاکہ اس ندامت اور بدنامی سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ جائے۔

ہرمز۔ خدایا! اس عورت کے دام میں پھنسنا!۔ آہ۔ میری کتنی بڑی نادانی تھی۔ اور پھر تم ایسی فرشتہ خصلت وفادار خاتون کو چھوڑ کر۔ نہیں بلکہ تمہارا دل توڑ کر۔ مجھے ...."

تہمینہ۔ "ہائیں۔ ہائیں۔ ہرمز۔ تم خدا کے لئے اس وقت ان خیالات سے اپنا دماغ پریشان نہ کرو۔ ہم ......"

ہرمز۔ تہمینہ! میں نے اس عرصہ میں کئی بار ارادہ کیا کہ تمہارے پاس لوٹ جاؤں۔ مگر میری ندامتوں نے کسی طرح گوارا نہ کیا۔ یہی سوچ کر کہ اتنے بڑے جرم کے ارتکاب کے بعد میں بھلا تم کو کیونکر دوبارہ منہ دکھا سکتا ہوں۔

تہمینہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس نے اس کا بھی اقرار نہ کیا کہ اتنے عرصہ تک وہ محض ایک ہی امید پر زندہ رہی ہے۔ بس ایک نہ ایک دن اس کی واپسی کی اُمید پر۔ جس کے بے چین انتظار میں گو لاکھ اس کی آنکھیں پتھرائیں۔ دِل بیٹھا۔ ارمان و حسرت مبدل بہ یاس و حرمان ہوئے مگر لوٹ پھیر کر یہی آسرا دل کو ڈھارس دیئے رہتا اور اسی وقت کا خیالی منظر آنکھوں کو وارفتہ رکھتا۔

ہرمز۔ شادی کے دن میں نے تم سے کہا تھا۔ پیاری تہمینہ شاید تم کو یاد بھی ہو کہ اگر میں کبھی تم کو تکلیف پہنچاؤں یا تم سے تغافل برتوں تو خدائے برتر مجھے سزا دے۔ تجھ سے مجھے۔ آہ۔ میں نے تم کو رنج پہنچایا۔ دیدہ دانستہ ایذا دی۔ میرا کہا سامنے آیا اب یقیناً خدا کا قوی ہاتھ مجھ سے تمہارا بدلہ لے رہا ہے۔ میں اس حالت کو پہنچ گیا ہوں۔ اور خدا جانے میری شمع حیات اس ٹمٹماتی حالت میں

کب گل ہوجائے۔ تہمینہ تم مجھے معاف کرنا۔ تہمینہ میری خطاؤں کو معاف ....

تہمینہ۔ ہرمز۔ پیارے ہرمز........ میرے وفادار ہرمز۔ " اب باوجود تمام کوششوں کے اس میں یارائے ضبط نہ رہا۔ وہ بے قرار ہوکر رونے لگی۔ پٹی کے پاس ننگی زمین پر دوزانو ہوکر اس نے اس کا سر دونوں ہاتھوں سے سرکایا اور اپنے سینہ سے لگا لیا۔ " ہرمز! میرا خدا بڑا رحم والا ہے۔ جس نے تم کو پندرہ برس بعد مجھ کو واپس دیا وہ اب یوں جدا نہ ہونے دیگا۔ ہرمز۔ میں یہاں رہ کر تمہاری خدمت کروں گی۔ علاج کراؤں گی۔ اور جب خدا نے کیا تمہاری طبیعت ذرا ٹھیری تو میں گھر لے چلوں گی پھر وہاں پہنچ کر تبدیلِ آب و ہوا، معقول علاج، میری خدمات اور دعائیں تم کو صحت یاب کرنے میں جلد کامیاب ہوں گی اور انشاء اللہ ضرور ہونگی "

ہرمز کے چہرہ پر ایک رونق سی پیدا ہوگئی۔ اس کا دل ان امید افزا اقراروں اور وعدوں سے بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ دل جس میں مدت ہوئی کہ کسی امید کے وجود، قیام یا تخلیق کی گنجایش باقی نہ رہی تھی۔ اس نے ایک بار نظر گھما کر تجسس انداز سے دیکھا اور پوچھا " تہمینہ! کیا تم واقعی میری خطائیں معاف کردو گی؟"

تہمینہ۔ بیشک! مجھے ہمیشہ تمہاری خوشی مدنظر رہی۔ میں نے عمر بھر یہی کیا۔ اور اب بھی مرتے دم تک اسی طرح تمہاری خوشی اور خدمت میرا فرض اولین رہیگا۔

ہرمز۔ مگر پندرہ برس ....

تہمینہ۔ آہ میں برابر تمہاری واپسی کا آسرا تکتی رہی۔ اس کے بعد شاید اس وجہ سے کہ وہ بیمار اور کمزور تھا۔ یا شاید اس وجہ سے کہ وہ افسردہ دل اور مغموم تھا، بہرحال ہرمز بیقرار ہوکر زار و قطار رونے لگا ـــــــ کچھ دیر بعد اس نے کہا " آہ تہمینہ! میں تمہاری عنایتوں کا مستحق نہیں اور سچ پوچھو تو میں اس قابل بھی نہیں کہ تمہاری خاک پا اٹھا سکوں ـــــــ افسوس یہ ہے کہ اب اپنی مختصر سی بقیہ زندگی میں میں اس کا عوض کیونکر ادا کرسکوں گا۔ خدا سے میری التجا ہے کہ مجھے تھوڑی زندگی محض تمہاری خدمت اور آرام پہنچانے کے لیئے اور عطا فرمائے "۔

تہمینہ۔ تمہاری صحت میری دوبارہ زندگی ہوگی۔ تم کو خدا اچھا کردے۔ پھر ہم تم دونوں اطمینان اور عیش کی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

الماری کے تختے پر موم بتی جل کر پھیل گئی۔ آس پاس والے مکانوں سے بچوں کی چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ مگر تہمینہ اسی طرح بغیر پہلو بدلے ہرمز کا سر اپنے ہاتھوں میں لئے **تصویرِ وفا** بنی خاموش بیٹھی رہی۔ حتٰے کہ وہ سوگیا اور بیہوشی میں خراٹے لینے لگا۔

ہرمز کے آرام سے سونے کا ہر ممکن انتظام کردینے کے بعد تہمینہ اٹھی اور جوشِ غم میں اس کی پٹی کے قریب ہی سربسجود ہو کر اپنے مالکِ حقیقی کی جناب میں رجوع ہوگئی گو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا، ہچکیوں کے باعث سانس بے قابو تھی۔ مگر اس کی زبان شکستہ اور پُر درد الفاظ میں یوں وقفِ دعا تھی:-

" بارِ الہا! اِن کو اچھا کردے۔ تاکہ میں پھر ایک مرتبہ ان کی کیف نواز نظروں میں اپنے دل کے ارمان اور ولولوں کو پھلتا پھولتا دیکھ لوں "۔

دلوآنہ (بریلوی)

باغ کی رانی

بھیگی بھیگی سرد ہوائیں اُودی اور گھنگھور گھٹائیں برکھا رُت کی نئی ادائیں مستی بن کر دل پر چھائیں
پتا پتا ڈالی ڈالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

برس پڑا جو کوئی بادل عالم ہوگیا دم میں جل تھل ڈھل گئی شاخیں پھوٹی کونپل بول اُٹھا ہے منہ سے جنگل
بھیگی بھیگی سب ہریالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

سبزہ لہکا، جنگل مہکا کوئل کُوکی۔ مور جھنکارا جنت بن گئی باغ کی دنیا مست ہُوا ہے پتا پتا
جھُوم رہی ہے ڈالی ڈالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

گاتی ہے ملہار جوانی جھول رہی ہے باغ کی رانی سر پر ایک دوپٹہ دھانی ساون شرم سے پانی پانی
موہنی مُورت۔ بھولی بھالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

کھچی ہوئی کیا جھُولے پر ہے بال کھُلے ہیں ننگے سر ہے آنچل سرکا، کس کو خبر ہے ہاتھ لپیٹے رسی پر ہے
رُخ پر زلفیں کالی کالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

جھولے پر کیوں مست ہوئی ہے؟ بے خود ہو کر جھول رہی ہے! خوشیوں میں تو کھوئی گئی ہے! اپنا آپا بھُول رہی ہے
تُو ہے اک تصویرِ خیالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

بالے پن کی پاک اُمنگیں نئی جوانی، نئی ترنگیں دیکھنا! تجھ کو مست نہ کر دیں میری ہمت پست نہ کر دیں
جیت اِس رُت پر تُو نے پالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

ہند کی دُلہن ہوش میں آجا آجا بالی جوش میں آجا عالمِ اُلفت کوش میں آجا خاضف کے آغوش میں آجا
ترے لئے آغوش ہے خالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

خاضف ملانوی

ابنِ آدم

اپنے لمحاتِ تنہائی میں

روس کے مشہور مصلح میکسم گورکی کی ڈائری کا ایک ورق

آج شام میں دریائے نوآ کے کنارے کھڑا ایک لطیف منظر کی سیر میں مصروف تھا کہ میں نے ایک حسین وجمیل خاتون کو پُل پر بے خودانہ انداز میں کھڑے دیکھا یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ قیودِ حیات سے تنگ آکر دریا میں چھلانگ مارنا چاہتی ہے پھر یکایک میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا اور اپنی گلابی سی زبان نکال کر چاند کا منہ چڑانا شروع کر دیا ۔

مہتاب دبے پاؤں دود شال بادلوں میں سے آہستہ آہستہ گزر رہا تھا غالباً چودھویں رات تھی کیونکہ سیلِ نور غیر معمولی طور پر طلا نگار تھا - ہوا میں نعطر و خوشبو کی لہریں موج زن تھیں - اور اس عالمِ رنگ و بُو میں خاک کا ایک پیکرِ جمیل آسمانی حسن کا مضحکہ اُڑا رہا تھا - اس نظارے نے کئی اور واقعات کی یاد تازہ کر دی عجیب اتفاق ہے کہ جب کبھی میں کسی کو تنہائی میں دیکھتا ہوں تو وہ اس قسم کی حرکات میں مشغول ہوتا ہے جن سے میرے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید شخصِ موصوف مخبوط الحواس ہے۔

بچپن میں میں نے ایک ایکٹر کو دیکھا - آپ آئینے کے سامنے کھڑے تھے اور بار بار اپنی ٹوپی اُتار کر اپنے عکس کے آگے ایک نہایت سنجیدہ انداز میں جھک رہے تھے ۔

اس کے بعد میں نے اپنے دوست چیکاف (مشہور افسانہ نویس) کو ایک شاعرانہ مشغلے میں مصروف دیکھا - آپ ایک باغ میں بیٹھے ہوئے تھے سورج کی زرنگار شعاعیں عین آپ کے سامنے گلاب کے ایک چھوٹے سے پودے پر پڑ رہی تھیں اور آپ کوشش کر رہے تھے کہ ان امواجِ نور کو کسی طرح اپنی ٹوپی میں مقید کر کے سر پر رکھ لیں میں دیکھ رہا تھا کہ یہ ناکام کوشش ان کے ذہن میں اضطراب اور غصے کا ایک تلاطم پیدا کر رہی تھی - ان کے چہرے کی سُرخی ان کی حرکات کی نامعقولیت اور ان کا اُٹھ کر اضطراری طور پر ٹہلنا شروع کر دینا سب اس حقیقت کی مظہر تھیں - یہی حضرت تھے جن کو تھوڑے عرصے کے بعد میں نے ایک تنگ بوتل میں ایک نہایت موٹی پنسل داخل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا نتیجہ ظاہر ہے - وہ سائنس کا ایک اصُول توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور بوتل ٹوٹ گئی ۔

ایک بار میں نے ٹالسٹائی کو دیکھا - قریب ہی ایک گرگٹ دھوپ سینک رہا تھا اور آپ ایک اندازِ شفقت میں جھکے ہوئے

اسے مخاطب کرکے زیرِ لب کہہ رہے تھے "کیوں دوست خوش تو ہو؟" یہ کہہ کر آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر رازدارانہ سے انداز میں فرمایا "میں تو خوش نہیں ہوں"۔

ایک بار میرے ہاں روسی ادب کے ایک پروفیسر مہمان تھے باتیں کرتے کرتے آپ کی نگاہ آئینے کی طرف جا پڑی۔ اُس وقت تو خاموش ہوگئے لیکن بعد میں جب وہ اپنے آپ کو تنہا خیال کرتے تھے میں نے انہیں چھپ کر دیکھا کہ اپنے عکس سے کہہ رہے ہیں "میرے یار کہو تو زمانے نے تم سے کیسا سلوک کیا"۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار کسی شخص نے مشکاف کو عالمِ تنہائی میں دیکھا۔ آپ کے سامنے ایک طشتری رکھی ہوئی تھی جس میں تھوڑی سی روئی پڑی تھی۔ آپ روئی کو اُٹھا کر زور سے طشتری پر مارتے تھے اور فوراً جُھک جاتے تھے۔ گویا روئی کی آواز سننا چاہتے ہیں۔

مشہور پادری ویلڈمرسکی نے ایک بار ایک کشتی اپنے سامنے رکھ لی۔ اور کہنے لگے "ذرا چل کر تو دیکھ"۔
جب کشتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو آپ فرمانے لگے "دیکھا جب تک میری مدد شاملِ حال نہ ہو تو چل ہی نہیں سکتی"۔

میری نگاہ سے اکثر اس قسم کے واقعات گذرے ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان بعض اوقات تنہائی میں بے اختیار رونے یا ہنسنے لگتا ہے۔ ایک مشہور مصنف تنہائی میں ہمیشہ رو دیا کرتا تھا*

قارئین کرام پر واضح رہے کہ مصنف موصوف شراب کا عادی نہ تھا لیکن میری نظر میں 'خندہ' یا 'گریہ' مخبوط الحواس کی نشانی نہیں۔ یہ دو چیزیں توازنِ دماغی کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور ہر بالغ نظر شخص پر اس قسم کی کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ میں بستر پر لیٹا ہوا گناہ کی اضافی حیثیت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میرا ایک ہمسایہ (ایک نہایت معزز زمیندار) داخل ہوا۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا ہوا تھا۔ غالباً وہ غلطی سے میرے کمرے کو اپنا کمرہ سمجھ کر اندر چلا آیا تھا۔ کمرے میں کوئی لمپ وغیرہ موجود نہ تھا۔ لیکن چاندنی موجود تھی۔ میں چُپ چاپ اس کی حرکات کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس نے پہلے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیں۔

خود ہی کہنے لگا "کون ہے؟"

خود ہی جواب دیا "میں ہوں"۔

"یہ تمہارا کمرہ نہیں ہے؟"

"میں معافی کا خواستگار ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اور میری الماری میں سے ایک کتاب نکال کر میز پر رکھ دی۔ پھر کھڑکی میں سے بازار کی طرف جھانکا۔ پھر بولا " اس وقت روشنی ہے۔ لیکن دن کو کس قدر تاریکی تھی۔ توبہ"۔

یہ کہتے ہوئے وہ پنجوں کے بل دبے پاؤں دروازے کی طرف چل دیا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اکثر بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں دے دی جائے تو تصویریں پھاڑنی شروع کر دیتے ہیں۔ اور خاصکر کسی ایک صفحے پر کوئی تصویر ہوتی ہے تو یہ خیال کرتے ہیں کہ تصویر اور صفحہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ تصویر اُتر آئے اور صفحہ نہ پھٹے۔

یہی کام کرتے ہوئے میں نے ایک پروفیسر کو دیکھا۔ آپ کوشش کر رہے تھے کہ ایک صفحے پر سے تصویر کو اُتار کر اپنے جیب میں ڈال لیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ آپ نے خوب زور سے تصویر کو رگڑا۔ پھر کسی شے کو ہاتھ میں تھام کر اپنی جیب کی طرف لے گئے۔ پھر یکایک غور سے اس شے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اور غالباً انہیں احساس ہوا کہ تصویر کا کوئی حصہ ہاتھ نہیں آیا۔ کیونکہ آپ کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ اور آپ پھر تصویر کو رگڑنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کتاب مذکور دیکھی۔ تمام تصاویر کاغذ پر چھپی ہوئی تھیں۔ کوئی تصویر بھی ایسی نہ تھی جو کاغذ پر چپکی ہوئی ہو۔ اور آپ سائنس کے پروفیسر تھے۔

ایک بار میں نے ایک معزز میونسپل کمشنر کی بیوی کو دیکھا کہ اپنے سامنے مٹھائی کا ایک ڈبا رکھ کے بیٹھی ہوئی ہے۔ اور ایک ایک دانے کو اُٹھا کر نہایت اطمینان سے کہہ رہی ہے۔ " میں تمہیں کھا جاؤں گی"۔

سیّد عابد علی

اپنی عظمت کے کرشمے دکھاتا ہوا ربِّ دو جہاں عجیب و غریب رستوں پر چلتا ہے وہ اپنے قدم سمندر میں رکھتا ہے اور طوفانوں میں سے گزرتا ہے۔

تمہارے ساتھ جو لوگ رہتے ہوں کبھی اُن سے زیادہ عقلمند اور عالم ہونے کا دعوےٰ نہ کرو۔ اپنی قابلیت کو اک گھڑی کی طرح اپنی پوشیدہ جیب میں رکھو اور اُسے بار بار باہر نہ نکالو۔ یہ دکھانے کے لئے کہ تمہارے پاس گھڑی ہے۔ اگر تم سے پوچھا جائے کہ کیا وقت ہے تو بتا دو لیکن ہر گھنٹے بغیر پوچھے ایک چوکیدار کی طرح اعلان کرنے کی ضرورت نہیں!

بشیر احمد بیگم

خدمتِ محبوب

لوگ کہتے ہیں تجھے دنیا میں ہوس ہَیں منہمک
کیا خبر ہے اُن کو دل میرا ہے تجھ سے منسلک؟

وہ سمجھتے ہیں میں ہوں شیدائے جاہ و مرتبت
کیا خبر ہے اُن کو اُلفت ہی ہے میری منزلت؟

منتہائے زیست ہے اُن کی نظر میں سیم و زر
میری آنکھوں میں ہے سیم و زر تری اک اک نظر

میرا جاہ و عیش میری زندگی پر بار ہے
میری خوشیوں کے وطن میں خواہشِ ایثار ہے

وقف ہے اے دِل تُو اپنی ہی مسرت کیلئے
زندگی تجھ کو ملی اَوروں کی خدمت کیلئے

زندگی اک خواب ہے اِس خواب سے بیدار ہو
راہِ حق میں جان دینے کے لئے تیار ہو

رہنمائے زندگی ہے عشق اب تیرے لئے
منتہائے زندگی ہے عشق اب تیرے لئے

دل کو اپنے عشق کے شعلے سے کر لے تُو گداز
تا تری جاں میں ہوں پیدا قوتِ عجز و نیاز

خود شناسی کا مرقع زندگانی ہو تری
روح ایثار و عمل سے آسمانی ہو تری

سب کی خدمت کر اسی میں خدمتِ محبوب ہے
سب سے اُلفت کر جو دل میں اُلفتِ محبوب ہے

کام وہ کر جس سے ہو دلبر کو تیرے تجھ پہ ناز
مُرتعش ہو تیری لَے سے خود بخود اُلفت کا ساز

بل

ماہِ صیام میں

اماں! جب تو مجھے سحری کے وقت جگاتی ہے تو میں نفرت سے بھر جاتی ہوں مگر تجھے کیا معلوم کہ میرے اس تنفر کا راز کیا ہے ؟

اماں! جب تو مجھے نرمی سے آواز دیتی ہے تو میں کروٹ بدل کر سو رہتی ہوں۔ تو اس لئے مجھ پر جھنجھلاتی ہے۔ مگر میں پھر بھی نہیں اٹھتی کیونکہ اُس وقت میری روح تھوڑے سے سکون کی جویا ہوتی ہے !

اماں! آدھی رات کو، عین اس وقت جب ہماری جھونپڑی کے عقب میں "پپیہا" بولنے لگتا ہے اور جب تو ہوشیار کرنے کے لئے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہے تو تجھے نہیں معلوم کہ میں بڑی لجاجت کے ساتھ تجھ سے 'ایک لمحہ' اور سونے کی مُہلت کیوں مانگتی ہوں !

کاش! تو آپ ہی سمجھ لیتی کہ اس وقت صحرا کا یہ ننھا مطرب میٹھے سُروں میں شور مچا کر حق کی تلاش کرتا ہے اور میں اسے چپ چاپ ہو کر سُنتی ہوں !!

پیاری اماں! ماہِ مبارک میں! نیم شب کے درمیان جب تو مجھ کو نیند سے اُٹھانا چاہتی ہے تو تُو کیا جانے کہ اس وقت میرے آئینۂ دل پر کس کی تصویر مرتسم ہوتی ہے !

اچھی اماں! مجھے گھُور گھُور کر نہ دیکھ۔ ہائے شاید تو یہ یقین نہیں مانتی کہ جب میں معصومیت کے گھر میں سوئی ہوئی ہوتی ہوں تو میرے دل کی منہ بند کلی پر خدائے قدوس کا خیال شبنم بن کر ٹپکا کرتا ہے !!

اماں! میں تیرے پاؤں لگوں گی مجھے راتوں کو نیند میں بے کل نہ کیا کر۔ آہ تو نہیں جانتی کہ میں اس وقت کیسا اچھا خواب دیکھا کرتی ہوں !!

میری اماں! مجھ سے یہ پیاری گھڑیاں نہ چھین، کیونکہ جن میں تو مجھ کو اُٹھا دینا چاہتی ہے۔ وہی میری زندگی کے بہترین لمحات ہیں !!

اماں! تو محوِ حیرت ہے پر ہائے تجھ کو کیا معلوم کہ ایک دوشیزہ کا پاکیزہ دل، آدھی رات کے درمیان، کیسے نورافشاں خیالات میں ڈوبا رہتا ہے !

خاک نشین
تہذیب فاطمہ عباسی

اِستقلال پیدا کرو

بہت سے لوگ ہیں جو یک دم کامیابی کے بامِ رفعت پر پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیاں نہایت جوش وخروش کے ساتھ شروع کرتے ہیں لیکن عام طور پر قبل اس کے کہ منزلِ مقصود پر پہنچیں وہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ جادۂ حیات کے اس سرے سے اُس سرے تک ہمیں ایسے اشخاص نظر آتے ہیں جو زندگی کی دوڑ میں تھک تھک کر مختلف منازل پر رہ رہ گئے۔ وہ محنتی، دیانت دار، پُرجوش، تعلیم یافتہ سبھی کچھ تھے، انہیں اچھے مواقع بھی ملے مگر عزم و استقلال اُن میں نہ تھا، وہ اُس اَن دیکھی منزل سے جو کامیابی کی منزل کہلاتی ہے چند ہی قدم پر رہ گئے تھے کہ دوڑ میں سے الگ ہو گئے۔

وہ کتنے حیران ہوں اگر یہ پردہ اُٹھ جائے! اور ان کو معلوم ہو کہ جس کامیابی کے وہ مشتاق تھے اُس کے اور ناکامی کے درمیان صرف اُن چند قدموں کا فاصلہ تھا جو انہوں نے نہ اُٹھائے۔

ایک عظیم الشان فوج جس کو کوئی انسان نہ گن سکے کامیابی کے شہر کے گرد اُس کی دیواروں کے پاس، اُس کے دروازوں کے قریب محاصرہ کئے پڑی ہے لیکن وہ کبھی شہر میں داخل نہیں ہوئی اور وہ کبھی اس میں داخل نہ ہوگی۔ اس فوجِ عظیم کے ہزاروں آدمی، اگر اُن سے سوال کیا جائے تو کہیں گے کہ انہیں کبھی کوئی عمدہ موقعہ نہیں ملا، اُن کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور انہیں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو اُن سے احسان کرتا۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو مکتبوں اور مدرسوں کے سائے میں پیدا ہوئے اور پلے، بڑی بڑی لائبریریاں اُن کی پہنچ میں رہیں۔ بہ مقابلہ ان کے ابے لنکن اور ہزاروں دوسرے غریب لڑکوں نے لکڑی کے ذخیروں میں آگ کے الاؤ کی روشنی میں بیٹھ بیٹھ کر علم حاصل کیا اور پھر ان کے سامنے سے فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے گزر گئے۔

تقریباً ہر ایک کامیاب شخص نے اپنی جد و جہد کے زمانے کے دوران میں محسوس کیا ہو گا کہ اُس کی کامیابی کی رفتار بہت دھیمی ہے اور زندگی اب بھی ناکام ہو سکتی ہے مگر جنہوں نے اچھے نتائج حاصل کئے وہ اس احساس کے باوجود بھی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے رات کی تاریکیوں کی پروا نہ کی، انہوں نے دِن کی صعُوبتوں کو کچھ اہمیت نہ دی۔

انسان کے اندر استقلال سے بڑھ کر کوئی جوہر نہیں۔ متواتر اور مسلسل کوشش ہی سب سے بڑا جوہر ہے۔ دنیا میں اگر ہزار آدمی قابلیت کے مالک ہیں تو اُن میں سے ایک جفاکش ہے۔ ذہانت اور قابلیت مشکلات

کے سامنے جی چھوڑ جاتی ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کسی اور وجہ کی بہ نسبت غیر مستقل مزاجی کے باعث زیادہ آدمی ناکام رہتے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی خواہش کو حاصل کرنے کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن محنت اور مشقت کے لئے تیار نہیں۔ وہ تجویزیں سوچنے خدع اور فریب کرنے، ترقی کی طرف مختصر اور نزدیک راستے معلوم کرنے میں اپنی طاقت و قوت زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر چند سال تک محنت و مشقت آمیز کوشش کرنے اور اپنے ذرا ذرا سے آرام و آسایش کو چھوڑنے کا خیال تک دِل میں لانے کے لئے تیار نہیں۔

یوں ہی ہزاروں لوگ اپنی قیمتی زندگی کے سالہاسال کامیابی کے سودے ڈھونڈنے اور محنت اور کام سے کوئی آسان اور سریع التاثیر طریقہ تلاش کرنے کی کوشش میں صرف کر دیتے ہیں۔

بعض لوگوں میں کام جاری کرنے اور انجام دینے کا ایک خاص مادہ ہوتا ہے اور یہ یقیناً ایک غیر معمولی طاقت اور ایک تخلیقی قابلیت کی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ اُس کے مالک میں دوسروں کا سردار بننے کی قابلیت موجود ہے۔ کسی کام کے شروع کرنے کی اہلیت تقریباً ہر شخص میں ہوتی ہے لیکن ایسا شخص مشکل سے ملتا ہے جو ہر اُس کام کو جو وہ شروع کرے انجام تک بھی پہنچائے۔ اور یہ انجام ہی ہے جسے کچھ اہمیت حاصل ہے۔

(ماڈرن)

منصور احمد

غزل

ساقی تری نگاہ نے مستانہ کر دیا	دل ایک جام تھا جسے میخانہ کر دیا
کیفِ شرابِ حسن کی ہیں طرفہ کاریاں	دیوانہ کر دیا کبھی فرزانہ کر دیا
برقِ جمالِ یار کا انداز دیکھنا	دل غیرتِ بہار تھا ویرانہ کر دیا
مدِ نظر وقارِ حرم تھا تو اے خدا	کیوں گلفشاں سوادِ صنم خانہ کر دیا
ساقی کی چشم مست میں دیکھا جو کیفِ حسن	دل ہم نے وقفِ بادہ و پیمانہ کر دیا

یوسف مآلِ عشقِ زلیخائے مصر نے
عالم میں خوابِ حُسن کو افسانہ کر دیا

یوسفِ گجرات

محفلِ ادب

صہبائے سخن

ظاہر کی نظر نے تجھے پنہاں پایا　　باطن کی نظر نے تجھے عُریاں پایا
تھی عقل بھی جُویا ترے جلوے کی مگر　　(۱) کم بخت کو سرگشتہ و حیراں پایا

کیا گلشنِ عالم میں صبا ہو جاؤں　　یا تہ ہیں سمندر کی فنا ہو جاؤں
ہستی سے بھی وحشت ہے عدم سے بھی گریز　　(۲) حیران ہوں یارب کہ میں کیا ہو جاؤں

رشکِ جم و کے ہے مے پرستی میری　　وہ مست ہوں جاوداں ہے مستی میری
موجِ مئے ارغواں ہے ہر سانس مری　　(۳) مے خانۂ رنگ و بو ہے ہستی میری

میں کعبہ نشیں نہیں ہُوں مستانہ ہُوں　　پابندِ خرد نہیں ہُوں دیوانہ ہُوں
ہو جاؤں نگا تیری شمعِ اُلفت پہ نثار　　(۴) میں کوئی مگس نہیں ہُوں پروانہ ہُوں

گلہائے سحر کے جام رنگیں رنگیں　　تاروں کی ضیا سے شام رنگیں رنگیں
کاشانۂ روحِ حُسن سے ہے روشن　　۵ ہے بزمِ جہاں تمام رنگیں رنگیں

"جامِ صہبائی"

انسانی دماغ کا ارتقا

ڈارون کی کتاب" سلالت انسان" کے فیصلہ کُن ابواب وہ ہیں جن میں اُس نے انسانی دماغ کے ارتقا کے متعلق ایک تاریخی بیان دیا ہے - اور اس عضو کے مختلف افعال کا ذکر کیا ہے - سوال یہ ہے کہ اس وقت اِن ابواب کی کیا حیثیت ہے ڈارون علم تشریح کا عالم نہیں تھا لہذا اُس نے ہکسلے کے اس بیان کو تسلیم کر لیا تھا کہ انسان کے دماغ میں کوئی ایسی ساخت نہیں جو انسان نما بندروں کے دماغ میں نہ ملتی ہو - ہکسلے کی رائے میں اگر ہم انسان نما بندروں کے دماغ کو ایک کتاب

فرض کرلیں تو انسانی دماغ کو اس سادہ اور قدیم کتاب کی ایک مشرح ایڈیشن تصور کیا جاسکتا ہے - اور اسی طرح اول الذکر کتاب کو اس سے بھی زیادہ قدیم اور ابتدائی کتاب کی مطول ایڈیشن سمجھنا چاہئے۔ ہکسلے کے اس بیان کے بعد ہزاروں علمائے تشریح وفعلیات نے انسان اور بندر کے دماغوں کا مطالعہ کیا ہے - چند مہینے ہوئے پروفیسر جی - ایلیٹ سمتھ نے اس تحقیق کے نتایج کا خلاصہ یوں پیش کیا ہے "بندر کے دماغ میں کوئی ایسی ساخت دیکھنے میں نہیں آئی جو انسانی دماغ میں نہ پائی جاتی ہو برخلاف اس کے انسانی دماغ کوئی ایسی ساخت ظاہر نہیں کرتا جو گوریلا یا چمپانزی کے دماغ میں موجود نہ ہو...... انسانی دماغ کو بندر کے دماغ سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ محض اس کی کمیت ہے" - گویا انسان اور بندر کے دماغوں میں صرف کمیت کا فرق ہے، نوعیت کا فرق نہیں - مگر پھر بھی اس فرق کی اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا - انسان نما بندر کے دماغ کے بعض حصے انسانی دماغ میں بہت زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور انہیں حصوں کی توسیع سے انسان کو احساس، ادراک، عمل، نطق اور علم کی قوتیں نصیب ہوئی ہیں -

"سائنس"

عِشق

عِشق جلوہ گر ہؤا، زندگی مہک اُٹھی　　گلستاں چمک اُٹھا، ہر کلی دمک اُٹھی
ذرہ ہائے خاک سے دلبری جھلک اُٹھی　　رُوحِ کائنات میں آگ سی بھڑک اُٹھی
آگ سی بھڑک اُٹھی روحِ کائنات میں

فتنہ ہائے ناز کو عشق گدگدا گیا　　آگ سی لگا گیا، حُسن کو جگا گیا
محفلِ خیال پر اک نشہ سا چھا گیا　　عشرتِ حیات میں سوزِ غم سما گیا
سوزِ غم سما گیا عشرتِ حیات میں

"قوسِ قزح"

انتظار

آفتاب طلوع ہؤا اور غروب ہوگیا - چاند کی نورانی کرنیں اپنی نازک، اپنی اَن دیکھی رفتار کے ساتھ عرش سے اُتریں اور ظلمت کے بے محابا تیرتے ہوئے غبار کے ساتھ شوخیاں کرنے لگیں - ستاروں نے اپنی درخشانی سے آسمان کی نیلگوں چادر

کو ہیروں اور موتیوں سے سجا دیا۔

دن گزر گئے۔ راتیں گزر گئیں۔

دریاؤں میں طغیانیاں آئیں اور سکون ہؤا۔ میدان میں ریت کے ذروں نے چمک چمک کر زمین پر آسمان کا نقش دکھا دیا۔ کلیاں پھول ہوئیں، پھول مرجھا گئے، کونپلیں پھوٹیں، بہار آئی اور چلی گئی، خزاں نے درختوں کو زرد لباس پہنایا۔

لیکن میرا دل، آہ میرا دل ایک حال پر ہے۔ اس میں کبھی تغیر نہیں ہؤا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں یہ کب سے تیری یاد میں محو ہے۔ اس کے انتظار کا طلسم اُس وقت تک نہ ٹوٹے گا جب تک تو اُسے اپنے پاس آنے کا پیام نہ دے۔

"نور جہاں"

زردشت کی تعلیمات

قابلِ عبادت صرف وہ خدا ہے جو زمین، آسمان، چاند، سورج، پانی اور آگ کا خالق ہے، جس نے دنیا کو پیدا کیا اور جس کے اختیار میں موت اور زندگی، رنج اور خوشی ہے۔

انسان کو اُسی سے التجا کرنی چاہئے۔ کیونکہ اُس کے سوا انسان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

خدا کا کوئی جسم اور کوئی رُوپ نہیں ہے۔ لیکن وہ ہر جگہ موجود ہے۔

خدا ہے، اور واحد ہے، اس کی وحدت عددی نہیں ہے۔ وہ گنتی اور شمار سے برتر ہے۔

خدا نے آگ پانی، چاند اور سورج میں اپنا جلوہ دکھایا۔ ان چیزوں سے اُس کی شان و شوکت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی طرف رُخ کر کے ہمیں اُس پاک اور برتر خدا کی عبادت کرنی چاہئے۔

نیکی بدی، انصاف اور ظلم میں تمیز کرنی چاہئے۔

ثواب گناہ رحمت اور غضب کو سمجھنا چاہئے۔

پانچ وقت خدا کی عبادت کیا کرو۔ اُس وقت تمہارا رُخ کسی روشن چیز کی طرف ہونا چاہئے۔

برائیوں سے بچو اور نیک بننے کی کوشش کرو۔

ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے۔ زردشت کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا۔

عاجزی، تواضع، حیا، عصمت، سچائی، مروّت، حسنِ سلوک، بھیک نہ مانگنا۔ دوسروں کی مدد کرنا یہ سب کام نیک ہیں اور خدا کی عبادت میں داخل ہیں۔

"پیمانہ"

تبصرہ

جامِ صہبائی حضرتِ اثر صہبائی کی ۱۲۷ رباعیات کا دلکش مجموعہ ہے۔ اصنافِ سخن میں غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جس کی طرف شعرائے اردو نے اب تک توجہ کی ہے اور اُسے معراجِ کمال تک پہنچایا ہے۔ طرزِ جدید کے شعرا نے نظم کی طرف بھی رُخ کیا ہے مگر رُباعی کو جو فی الحقیقت ایک چھوٹی سی بلیغ نظم ہے۔ ایک مستقل موضوع اور خاص فلسفہ کے ماتحت صرف صہبائی نے پیش کیا ہے۔ صہبائی کا فلسفہ خیام کا فلسفہ ہے اور اگر انہیں زبانِ اُردو کا عمر خیام نہ کہا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ فٹز جیرلڈ ضرور ہیں، کیونکہ انہوں نے اس مغربی خیام پرست کی طرح فلسفۂ خیام کی روح کو اُردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

جامِ صہبائی کا طرزِ عنوان خیام کی یہ رباعی ہے۔

آمد سحرے ندا ز مے خانۂ ما ۔۔۔ کاے رندِ خرابا تیِ دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زمے ۔۔۔ زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

صہبائی فرماتے ہیں:-

دامانِ سحر کی گلفشانی فانی ۔۔۔ شبہائے بلائے آسمانی فانی
یہ لمحۂ عشرت ہے غنیمت ساقی ۔۔۔ بھر جام کہ زندگی ہے فانی فانی

یا

ہے تاک میں مرگِ ناگہانی ساقی ۔۔۔ گردش میں ہو جامِ ارغوانی ساقی
جھونکے کی طرح سن سے گزر جائے گی ۔۔۔ مانندِ صبا ہے زندگانی ساقی

کون کہہ سکتا ہے آخری دو رباعیات بھی عمر خیام کی نہیں؟ اسی طرح باقی رباعیات بھی حقائق و معارف اور پاکیزگی و لطافت سے پُر ہیں۔ کتاب لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ حجم سرورق کے علاوہ ۶۴ صفحے ہے اور قیمت آٹھ آنے۔ دار التالیف، بیڈن روڈ، لاہور سے طلب فرمائیے۔

شاما مصنفہ جناب کشن پرشاد کول صاحب۔ یہ ایک دلچسپ اور پاکیزہ ناول ہے جس میں فطرتِ انسانی کی تصاویر نہایت خوبی سے کھینچی گئی ہیں۔ زبان سلیس اور شگفتہ ہے اور طرزِ ادا پُر سوز و دل گداز۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو خود تعلیم یافتہ اور مہذب و شائستہ ہے لیکن اُس کے ماں باپ اپنے اغراض کی خاطر اُسے ایک ایسے شخص سے بیاہ دیتے ہیں جو نہایت جاہل ہونے کے علاوہ

چال چلن بھی اچھا نہیں رکھتا اور لڑکی کی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ کتاب ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق مصور اور رنگین ہے ملنے کا پتہ:۔ انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد +

پیارے دیور۔ جناب حافظ عبداللہ صاحب شرار کا ایک درد انگیز اور نتیجہ خیز معاشرتی ڈراما ہے جس کے لکھنے کی تحریک انہیں مہا کبی بابو گریش چندر کی تصنیف سے ہوئی لیکن چونکہ مصنف موصوف بنگالی زبان سے واقفیت نہ رکھتے تھے اس لئے اُس کا ترجمہ نہ کر سکے اور چند مرتبہ اس کے تماشے کو دیکھ کر اُسی پلاٹ پر انہوں نے یہ ڈرامہ تصنیف کیا جو نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ معاشرتی اصلاح کے لئے ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے۔ حجم ۲۷۰ صفحے ہے اور کتابت، طباعت کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے مقرر کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ حافظ عبداللہ صاحب شرار۔ نمبر ۲/۴ دل کشا سٹریٹ۔ بالی گنج۔ کلکتہ۔

"نورجہاں" کا سالانہ نمبر۔ جنوری ۱۹۲۸ء سے رسالہ نورجہاں کی صوری و معنوی خوبیوں میں ایک انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ یہ نمبر غیر معمولی طور پر پونے دو سو صفحات پر شایع ہوا ہے، تصویریں بھی معمول سے زیادہ ہیں اور تقطیع بھی پہلے سے بڑی اور ہمایوں کے برابر کر دی گئی ہے۔ ملک کے مشہور اور مسلمہ ادیبوں کے مضامین اس کے لئے حاصل کئے گئے ہیں اور اُن کی ترتیب و تدوین نہایت قابلیت سے کی گئی ہے۔ علمی مضامین میں باتصویر مضمون "عورت کی حیثیت مشرق اور مغرب میں"، "فارسی گو شاعر عورتیں" "صنعت و دستکاری" اور "مادام لیٹیا" بہت اچھے ہیں۔ افسانوں میں "حرماں نصیب" اور "سیتا دیوی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حصہٴ نظم میں عابد علی عابد، راز چاندپوری اور آثر صہبائی کا کلام پڑھنے کے قابل ہے۔ ایڈیٹر صاحب کے مضامین کی عموماً اور نظموں کی خصوصاً داد دینی پڑتی ہے کہ اُن کا کلام جدید شاعری میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ "پیغامِ عمل" اور "تاج محل" نہایت عمدہ تصاویر ہیں۔ "نورجہاں" کے صرف اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ منیجر "نورجہاں" امرتسر سے طلب فرمایئے۔

"ہنر مند"۔ یہ ماہوار رسالہ شیخ محبوب الٰہی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل لاہور اور حکیم محمد عبدالغفور صاحب کی مشترک ادارت میں لاہور سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کا مطمحِ نظر مسلمانوں کو زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کی تعلیم دینا ہے۔ دونوں مدیر اس رسالہ کو بڑی محنت اور قابلیت سے مرتب کر رہے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ جن مقاصد کو مدنظر رکھ کر انہوں نے اسے جاری کیا اُس میں وہ بوجہ احسن کامیاب ہوں گے۔ ہماری رائے میں ملک و قوم کو ایسی چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ منیجر رسالہ ہنر مند۔ حویلی کابلی مل لاہور سے منگایئے۔

اطلاع:۔ سید محمد ہادی صاحب ہادی مچھلی شہری وکیل علی گڑھ سے منتقل ہو کر الہ آباد چلے آئے ہیں۔ آئندہ اُن کا ۱۵۲ شاہ گنج الہ آباد ہوگا +

چال چلن بھی اچھا نہیں رکھتا اور لڑکی کی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ کتاب ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سر ورق مصور اور رنگین ہے ملنے کا پتہ :۔ انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد +

پیارے دیور۔ جناب حافظ عبداللہ صاحب شرار کا ایک درد انگیز اور نتیجہ خیز معاشرتی ڈراما ہے جس کے لکھنے کی تحریک انہیں مہاشے بابو گریش چندر کی تصنیف سے ہوئی لیکن چونکہ مصنف موصوف بنگالی زبان سے واقفیت نہ رکھتے تھے اس لئے اُس کا ترجمہ نہ کر سکے اور چند مرتبہ اس کے تماشے کو دیکھ کر اُسی پلاٹ پر انہوں نے یہ ڈرامہ تصنیف کیا جو نہایت دلچسپ اور مفید ہے معاشرتی اصلاح کے لئے ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحے ہے اور کتابت، طباعت کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے مقرر کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ :۔ حافظ عبداللہ صاحب شرار۔ نمبر ۲ دل کشا سٹریٹ۔ بالی گنج۔ کلکتہ۔

"نور جہاں" کا سالانہ نمبر۔ جنوری ۱۹۲۸ء سے رسالہ نور جہاں کی صوری و معنوی خوبیوں میں ایک انقلاب و نما ہو گیا ہے۔ یہ نمبر غیر معمولی طور پر پونے دو سو صفحات پر شایع ہوا ہے، تصویریں بھی معمول سے زیادہ ہیں اور تقطیع بھی پہلے سے بڑی اور ہمایوں کے برابر کر دی گئی ہے۔ ملک کے مشہور اور مسلمہ ادیبوں کے مضامین اس کے لئے حاصل کئے گئے ہیں اور اُن کی ترتیب و تدوین نہایت قابلیت سے کی گئی ہے۔ علمی مضامین میں باتصویر مضمون "عورت کی حیثیت مشرق اور مغرب میں"، "فارسی گو شاعر عورتیں" "صنعت و دستکاری" اور "مادام لیٹیا" بہت اچھے ہیں۔ افسانوں میں "حرماں نصیب" اور "سیتا دیوی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حصۂ نظم میں عابد علی عابد، راز چاندپوری اور آثر صہبائی کا کلام پڑھنے کے قابل ہے۔ ایڈیٹر صاحب کے مضامین کی عموماً اور نظموں کی خصوصاً داد دینی پڑتی ہے کہ اُن کا کلام جدید شاعری میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ "پیغامِ عمل" اور "تاج محل" نہایت عمدہ تصاویر ہیں۔ "نور جہاں" کے صرف اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ بنیجر "نور جہاں" امرتسر سے طلب فرمایئے۔

"ہنرمند"۔ یہ ماہوار رسالہ شیخ محبوب الٰہی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل لاہور اور حکیم محمد عبدالغفور صاحب کی مشترک ادارت میں لاہور سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کا مطمح نظر مسلمانوں کو زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کی تعلیم دینا ہے۔ دونوں مدیر اس رسالہ کو بڑی محنت اور قابلیت سے مرتب کر رہے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ جن مقاصد کو مد نظر رکھ کر انہوں نے اسے جاری کیا اُس میں وہ بوجہ احسن کامیاب ہوں گے۔ ہماری رائے میں ملک و قوم کو ایسی چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ مینیجر رسالہ ہنرمند۔ حویلی کابلی مل لاہور سے منگایئے۔

اطلاع :۔ سید محمد ہادی صاحب ہادی مچھلی شہری وکیل علی گڈھ سے منتقل ہو کر الہ آباد چلے آئے ہیں۔ آئندہ اُن کا ۱۵۲ شاہ گنج الہ آباد ہوگا +

امرت دھارا کی سلور جوبلی

کی

دوسری سالگرہ کی رعایت

رعایت ایڈیشن

۱۲ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کو سلور جوبلی بڑی دھوم دھام سے زیر صدارت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب خدا اُن کو جنت نصیب کرے منائی گئی تھی اُس دن کی یاد ناظرین کے دلوں میں تازہ رکھنے کے واسطے فیصلہ کیا گیا تھا کہ سلور جوبلی کا سالانہ جلسہ منایا جایا کرے پہلی سالگرہ ۱۹۲۷ء میں زیر صدارت آنریبل رائے بہادر لالہ جے لعل جج ہائیکورٹ پنجاب منائی گئی اور ۱۲ مارچ کیواسطے وہی رعایت ادویات میں دیگئی جو کہ سلور جوبلی پر دیگئی تھی۔ اب یہ تیسرا سال ہے۔ اس سال کوئی جلسہ تو نہ منا سکیں گے۔ مگر پبلک کو مقرر کردہ رعایت سے محروم نہیں رکھنا چاہتے۔ اس واسطے

۱۲ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء کو

امرت دھارا و دیگر ادویات و کتب کی قیمت میں بدستور عام رعایت ہوگی

یعنی امرت دھارا (مرہم، صابن، منجن، مجموعہ) ۱/۳ قیمت پر ملیں گی اور باقی ادویات و کتب نصف قیمت پر

ایجنٹوں کو بھی اس سے زیادہ رعایت نہیں ہے کیونکہ یہ رعایت صرف عام پبلک کیواسطے ایک دن کے لئے ہوتی ہے یہ رعایت صرف ۱۲ مارچ کے دن کیواسطے ہے۔ خط کے ذریعہ ۱۲ مارچ کی رعایت لکھنا چاہئے اور اسکو ۱۲ مارچ کو ہی ڈاک میں ڈالنا چاہئے خط ہمارے پاس کسی دن پہنچے ڈاکخانہ کی مہر ۱۲ مارچ کی ہونی چاہئے۔
لوکل اصحاب اپنا خط ڈاک میں بھی ڈال سکتے ہیں اور انکے واسطے ایک بکس بھی امرت دھارا بھون کے باہر رکھا جاویگا جس میں اپنے آرڈر ڈالدیں اور ادویات ایک ہفتہ کے اندر جب چاہیں آکر لیجاویں اُس دن دفتر کو بھی چھٹی ہوگی اور ایک دن میں سب کو ادویات دیدینا بھی ناممکن ہے پچھلے سال کل بکس میں ہزار سے زیادہ خطوط ڈالے گئے تھے

ناظرین ۱۲ مارچ سوموار کا دن ابھی سے نوٹ کر لیں اور

فہرستیں اگر موجود ہیں تو بہتر ورنہ ابھی منگوالیں اور سوچ رکھیں کہ کیا منگوانا ہے جو منگانا چاہیں روپیہ بھی جمع کر رکھتے ہیں جبتک روپیہ ختم نہ ہوگا۔ ان کو یہی رعایت ملتی رہے گی ۔
فہرستیں جو آپکے پاس موجود ہیں یا آپ منگوائیں سب میں قیمتیں پوری درج ہیں۔ امرت دھارا و امرت دھارا کے مرکبات زیر کستہ سونا درج شدہ قیمتوں سے ۱/۳ قیمت پر اور باقی ادویات و کتب نصف قیمت پر ملیں گی۔ مفردات جیسے کستوری وغیرہ پر کوئی رعایت نہیں ۔

المشتہر

خط و کتابت و تار کا پتہ:—

امرت دھارا لاہور — مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ۔ لاہور

ہر قسم کی بہترین ٹوپیاں مناسب قیمت پر

ممتاز کیپ ہاؤس دہلی

نے مہیا کرنے کا خاص انتظام کیا ہے

جو براہ راست ولایت سے آتی ہیں۔ اسی لئے مقابلۃً اپنے خریداروں کو اس قدر سستے داموں پر فرمائشیں روانہ کرتا ہے جس سے آپکو خود اپنے شہر و نیز دیگر مقامات سے بڑی کفایت اور اطمینان حاصل ہوگا صرف اپنے سر کا ناپ اور رنگ کی تفصیل تحریر فرما دیں +

ترکی ملایم ٹوپیاں

۱- سلطان چھاپ بانات نہایت ہی موٹی اور نرم -/-/۶
۲- رشادیہ چھاپ بانات بہت موٹی اور ملایم -/-/۵
۳- شیر گولا- اصلی- بانات موٹی اور ملایم -/-/۴
۴- لاسٹک اصلی- بانات موٹی ملایم اور رواں باریک -/۸/۳
۵- نور اسلام- بانات موٹی اور ملایم -/-/۳
۶- بانات موٹی ملایم نہایت عمدہ -/۱۲/۲
۷- بانات قدرے موٹی- رواں باریک -/-/۲
۸- بانات افضل ترین پتلی بہت ملایم مخملی رنگ -/-/۵ پھندنا ترکی ٹوپی- ہر قسم:
۹- بانات نہایت عمدہ پتلی بہت ملایم رواں باریک -/-/۴ ۱۲ آنہ و ۱۳ آنہ و ۱۴ آنہ و ۸ آنہ و ۹ آنہ و ۱۰ آنہ و ۱۱ آنہ و ۱۲ آنہ و ۱ آنہ

۱۰- بانات عمدہ پتلی ملایم اور رواں باریک -/-/۳
۱۱- بہ گیوتر کی ملایم ٹوپیاں -/۱ و -/۸/۱ و -/۲

ترکی سخت استر والی ٹوپیاں

۱۲- کرسٹی لنڈن چمڑہ استر صابر پٹی بانات نہایت عمدہ -/-/۷
۱۳- کرسٹی لنڈن چمڑہ استر -/۶ کپڑا استر -/۴/۴
۱۴- سولائٹ استر تیل سے محفوظ رکھنے والا -/۱۲/۲
۱۵- چمڑہ استر- صابر پٹی- بانات عمدہ -/۸/۲
۱۶- چمڑہ استر- بانات عمدہ -/-/۲

علاوہ ازیں ہر قسم کی بالدار، صفدر کیپ- انور کیپ امیر کیپ- ایرانی کیپ اور میلٹ کیپ کرسٹی- اٹلی اور ہندوستانی اصلی و مخمل کی پارسی کیپ اور میرٹھ کی تشری ٹوپیاں بھی موجود ہیں۔

نوٹ:- دوکانداروں کے لئے خاص عایت جو بذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتی ہے۔

نوٹ:- قیمت ٹوپی علاوہ پھندنا ہے +

نوٹ:- پتہ صاف تحریر فرما دیں +

ملنے کا پتہ:- **ممتاز کیپ ہاؤس نمبر ۸ دہلی**

مسلمانوں کا ہفتہ وار انگریزی اخبار

ینگ مسلم دہلی

چندہ سالانہ ۵ روپے ششماہی ۳ روپے — قیمت فی پرچہ دو آنے

نومبر ۱۹۳۷ء سے حضرت خواجہ حسن نظامی نے جاری کر دیا۔ ہر ہفتہ ۱۶ صفحہ کے مضامین۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا۔ چھپائی بہت عمدہ۔ اور قیمت صرف پانچ روپے سالانہ۔ مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی ضروریات و مطالبات کے مضامین شائع کرتا ہے۔ مسلمان طلبہ کے لئے اسلامی تاریخ اور اسلامی آرٹ کے مضامین بھی ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے دلچسپ اُردو مضامین کے ترجمے بھی ہر ہفتہ درج کئے جاتے ہیں۔

ہر مسلمان کو جیسے انگریزی ہفتہ وار کی ضرورت تھی وہ سب چیزیں اس اخبار میں ہوتی ہیں۔ بعض دو مہینہ کے اندر اس کی اشاعت اسی واسطے بہت زیادہ ہو گئی کہ یہ اخبار مسلمانوں کی ضروریات و مطالبات کے حسب حال مرتب کیا جاتا ہے۔

طلبہ سے قیمت چار روپے لی جاتی ہے ششماہی ۲ روپے

منیجر ینگ مسلم دہلی

جذباتِ ہمایوں

آنریبل خان بہادر میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم بی۔ اے بارایٹ لا جج چیف کورٹ پنجاب کا مجموعۂ کلام جس میں اُن کی ولولہ انگیز اخلاقی فلسفیانہ نظمیں۔ اور دلکش غزلیات درج ہیں شروع میں اُن کے سبق آموز حالات زندگی اور کلامِ ہمایوں پر تبصرہ کیا گیا کیا گیا ہے۔ حجم ۱۸۰ صفحات۔ دو تصویریں۔ اعلےٰ درجہ کی لکھائی چھپائی۔ ولایتی کاغذ قیمت درجہ اوّل ایک روپیہ درجہ دوم -/۱۲ علاوہ محصول ڈاک +

المشتہر

منیجر رسالہ ہمایوں ۳۴ مزنگ روڈ لاہور

پھلبھری اور خون کی دیگر خرابیوں کا مجرب علاج

رائے بہادر مُولراج ایم اے کا

کومارکوشک

قیمت فی پیکٹ دس تولہ ۵ر پانچروپیہ
نمونہ ۲ تولہ ۱ روپیہ

محصول ڈاک بذمہ خریدار

کومارکوشک بڑا مصفی خون ہے اس کے متواتر استعمال سے شوبتر یعنی پھلبھری - جس کو انگریزی میں لیوکو وارما کہتے ہیں دور ہو جاتی ہے اور دیگر قسم کی جلدی اور خونی بیماریوں کے لئے نہایت مفید ہے - پرانے پھوڑے - پھنسی وغیرہ کو دفع کرنے میں بڑی مفید چیز ہے - اور اس سے زیادہ خوبی یہ ہے کہ ہضم اور معدہ کو طاقت دیتا ہے - اور بعض امراض پیشاب کو اور آنکھوں کے لئے مفید ہے ٭

سرٹیفکیٹ

جناب پاٹھک دیویدیال صاحب وکیل مین پوری سے رقم طراز ہیں کہ میں نے آپ کے یہاں سے مصفی خون دوا کومارکوشک کئی مرتبہ از زمر پاٹھک سیتارام جو کہ میرے بھائی ہیں - منگوائی - دوا نے دراصل بہت فائدہ کیا - پرمیشور آپ کے اوشد ہالیہ کو روز افزوں ترقی دے ٭

مفت: - ارشاد آنے پر رسالہ محافظ صحت مفت روانہ کیا جاتا ہے ٭

ملنے کا پتہ } انچ ایم ڈیپارٹ مہیش اوشدھالیہ رائے بہادر مولراج ایم اے
پوسٹ بکس ۱۴۱ لاہور

پندرہ روزہ

اپنی قسم کا ایک لاثانی پندرہ روزہ رسالا اشاعت ایک لاکھ ماہ مارچ سے شایع ہونا شروع ہو جائیگا۔ جس میں مفید تجارتی معلومات دولت کمانے کے طریقے۔ بیکاروں کے لئے روپیہ پیدا کرنے کے گر تھوڑے سرمایہ سے ہزاروں روپیہ پیدا کرنا۔ ہر قسم کی اشیاء کے اشتہار ۵۰۰ روپیہ کے انعام مقابلے اور مفید نسخہ جات شایع ہوا کریں گے +

یہ رسالہ ہر ایک مرد کے لئے، ہر ایک بچہ کیلئے، اور ہر ایک عورت کے لئے یکساں مفید ہوگا۔ کیونکہ یہ ہر ایک کیلئے دلچسپی کا سامان مہیا کرے گا اور ہر ایک کو اپنے اپنے طریقہ پر روپیہ پیدا اور جمع کرنے کے طریقے بتائے گا اسلیئے آج ہی اسکی خریداری قبول فرمادیں +

سالانہ چندہ صرف عہ مگر ۳۰ اپریل تک ایکہ۔ ارمعزز اردو خوانوں کے پتے +

مشتہرین و ایجنٹ خط و کتابت کریں +

THE "GAZI ADVERTISER"

انگریزی کا سب سے زیادہ چھپنے والا ہفتہ وار رسالہ۔ اس میں ہر قسم کی اشیاء کے اشتہار شایع ہوتے ہیں۔ اور بس یہی اس کا مقصد ہے یعنی عام لوگوں کو ہر ایک چیز کے نرخ سے آگاہ کرنا اور مشتہرین کو

بہترین قیمت

اُن کے اشتہار کی اُجرت کے عوض دلوانا۔ اور ملکی تجارت کو ترقی دینا

سالانہ چندہ صرف عہ

۲۹ فروری تک ۱۳۰۰ انگریزی خوان تاجروں کے پتے

مالکان ہر دو رسالہ جات

غازی ٹریڈنگ کمپنی (ان ہ) بستی نو جالندھر

۱ - ہمایوں بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲ - علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں۔

۳ - دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴ - ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵ - خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶ - ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸ - جواب طلب اُمور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹ - قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ نمونہ ۶/

۱۰ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱ - خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اُوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۴ - مزنگ روڈ - لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا (ہمایوں)

بیادگار علامۂ فصیحے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی، اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لار

جائنٹ ایڈیٹر { حامد علی خاں۔ بی، اے
منصُور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۳	بابت ماہ اپریل ۱۹۲۸ء	نمبر ۴

تصویر:۔ محرومِ محبت

جہاں نما

حضور نظام کی معارف پروری

اردو زبان کے لئے جو دور اعلیٰ حضرت خسرو دکن میر عثمان علی خاں کے عہد سلطنت سے شروع ہوا ہے
وہ اپنی عظمت اور شوکت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ زبان اردو کا آفتاب دکن ہی سے طلوع ہوا
تھا اور آج پھر وہ دہلی اور پنجاب کا چکر لگاتا ہوا دکن ہی پر اپنی پوری آب وتاب سے چمک رہا ہے دہلی اور پنجاب
نے اردو کو ادب کے لطیف سے لطیف نکات سمجھا دیئے تھے مگر پھر بھی اس میں ترقی یافتہ زبانوں کی صف
اول میں بیٹھنے کی قابلیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس میں علوم وفنون کو اپنے اندر جذب کرنے کی اہلیت نہ تھی لیکن آج
اگر اردو زبان کو ایک کمل زبان کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں تو یہ یقیناً عثمان علی خاں کی علم پروری اور عالی خیالی
کا نتیجہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ حضور نظام کے دو ایسے عظیم الشان کارنامے ہیں جن سے ہمارے دلوں میں
خلافت عباسیہ کی یاد از سر نو تازہ ہو رہی ہے۔ اس وقت دکن ہندوستان کا بغداد بن رہا ہے جہاں ملک قابل ترین
دل و دماغ جمع ہیں۔

مہذب ممالک میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ متعلمین کی معاشرتی زندگی پر اقامتی جامعات کا بڑا اثر پڑتا ہے
ان کی تہذیب اور تربیت میں اقامت کا بڑا حصہ ہوتا ہے اور اسی سے ان میں وسعت نظر اور عالی ہمتی پیدا ہوتی
ہے چنانچہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے اعلیٰ حضرت نظام نے جامعہ عثمانیہ کی عمارت تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا ہے اور
ایک کروڑ روپے کی منظوری بھی دے دی ہے جس کے صرف سے ایک جامعی قصبہ تعمیر کیا جائے گا۔ اس میں
اقامت خانوں کے علاوہ طلبہ کی تمام دوسری ضروریات بھی مہیا کی جائیں گی۔ جامعہ کی عمارت کے متصل ہی ایک
ہزار ایکڑ زمین کا ایک رقبہ ہوگا جس میں زراعت وغیرہ کے متعلق علمی تجربات کئے جائیں گے اور طلبہ کو ان سے فائدہ
اٹھانے کا موقع دیا جائے گا۔

ہم یقین کرتے ہیں کہ اس اقامتی نظام کا نتیجہ جامعہ عثمانیہ کے متعلمین کے لئے نہایت مفید ہوگا اور جب وہ
یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے تو ان کے پاس صرف علم و فضل کی سندیں نہ ہوں گی بلکہ ان میں بام رفعت پر چڑھنے
کی صلاحیتیں بھی ہوں گی۔

روس میں اشاعت کتب

جمہوریہ روس میں سب سے بڑا ادارہ اشاعت سویٹ سٹیٹ اڈیٹوریل آفس ہے۔ اس دار الاشاعت نے صرف ۱۹۲۵ء میں ۴۰۰۰۰۰۰ کتابیں ۴۰۰۰ مختلف عنوانات پر شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کی مجموعی لاگت کا اندازہ ۲۴۰۰۰۰۰۰ روبل کیا گیا ہے۔

میکسم گورکی کی کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اُن کی بیس لاکھ جلدیں طبع ہوئیں۔ لینن کی تصنیفات اور اُن کے متعلق دوسری کتابوں کی تعداد جو یکم جنوری ۱۹۲۵ء تک اشاعت پذیر ہوئیں ۱۲۰۰۰۰۰ تک پہنچ گئی جن کے ۱۳۶ مختلف عنوانات تھے۔

دار العوام کی دعا

یہ وہ دعا ہے جس سے پارلیمنٹ کے ہر اجلاس کا افتتاح ہوتا ہے:۔

اے خدائے بزرگ و برتر بس تیرے ہی حکم سے جہان کے بادشاہ حکومت کرتے ہیں۔ اور دنیا کے شہریار انصاف کرتے ہیں اور تجھ ہی سے تمام مشورے اور عقل اور دانش ہمیں ملتی ہے۔

ہم تیرے ناکارہ غلام، جو تیرے نام پر یہاں جمع ہوئے ہیں نہایت عاجزی کے ساتھ تجھ سے استدعا کرتے ہیں کہ تو اوپر سے ہمارے لئے آسمانی عقل و دانش نازل فرما اور ہمارے تمام مشوروں میں تو ہماری رہنمائی کر اور قبول کر کہ تیرے خوف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اپنے تمام ذاتی مفادوں، تعصبوں اور طرفداریوں کو برطرف کرتے ہوئے ہمارے تمام مشوروں کا نتیجہ صرف تیرے مبارک نام کو بلند کرنا ہو، سچے مذہب اور عدل کا حصول ہو، اور بادشاہ کی حفاظت، عزت اور مسرت ہو، رعایا کی آسائش، امن اور ملک کی آسودگی اور خوشی ہو اور افراد و اقوام کے دلوں کو اُس محبت اور اخوت کے رشتے میں منسلک کر کے ایک دوسرے سے ملا دینا ہو جس کی تعلیم ہمیں مسیحیت نے ہمارے شفیع اور خداوند یسوع مسیح کے ذریعہ سے دی ہے۔ آمین۔

سونے کی سڑک

کالوریڈو میں ایک پختہ سڑک کی تعمیر کے لئے روڑی ایک سونے کی کان میں سے لی گئی ہے۔ گو اس روڑی میں فی ٹن ۶ شلنگ کی قیمت کا سونا تھا لیکن یہ بہترین مسالہ تھا جو مہیا ہو سکتا تھا۔ اس حساب

سے اس سڑک میں فی میل چھ سو پونڈ کا سونا موجود ہے۔

سورج کی عمر

ایک فرانسیسی ہیئت دان نے بتایا ہے کہ سورج ہمیں ایک پدم اور پچاس ہزار سال تک روشنی اور گرمی پہنچاتا رہے گا۔ اب تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سورج زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ برس کے بعد بجھ کر رہ جائیگا۔ یہ نیا اندازہ اُن انکشافات کی بنا پر لگایا گیا ہے جو ذروں کی ساخت کے متعلق حال ہی میں ہوئے ہیں۔

کاغذ کے قحط کا اندیشہ

کبھی آپ نے سوچا کہ سال بھر میں ہم کتنا کاغذ خرچ کرتے ہیں؟ اخبار، رسالے، خطوط، لفافے، وہ کاغذ جن میں پارسل باندھے جاتے ہیں یا جن میں ہم دوکانوں سے سودا خرید کر لاتے ہیں اگر جمع کئے جائیں تو میزان اتنی بڑھ جائے گی کہ اُسے دیکھ کر حیرانی ہوگی۔ برطانیہ میں فی کس ۶۵ سیر کاغذ صرف ہوتا ہے اور امریکا میں اِس سے بہت زیادہ۔

زیادہ تر کاغذ کینیڈا کی نرم لکڑی سے تیار کیا جاتا ہے لیکن اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر کاغذ اسی شرح سے استعمال ہوتا رہا تو تقریباً پچیس سال کے اندر اندر لکڑی کا تمام ذخیرہ ختم ہوکر رہ جائے گا۔ ریاستہائے متحدہ کا یہ حال ہے کہ ہر سال کی بالیدگی سے اُن کا خرچ آٹھ گنا زیادہ ہوجاتا ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر ماہرین اگر پریشان ہوں تو وہ حق بجانب ہیں کیونکہ لکڑی کے اس قحط کا اثر کاغذ ہی تک محدود نہ ہوگا بلکہ ریشمی جرابوں سے لے کر چھڑیوں اور ریل کی پٹڑیوں تک کی حالت مخدوش ہوجائیگی۔

خوش قسمتی سے کاغذ سازی کا انحصار آج کل کلیتہً پرانے مصالح پر نہیں رہا اور اب نئے نئے طریقے ایجاد ہورہے ہیں مگر صرف نئے طریقوں کا دریافت کرلینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جنگلوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے کیونکہ موجودہ صورت میں چار درختوں میں سے صرف ایک درخت کام میں آتا ہے اور تین آگ یا کسی دوسری تباہی کی نذر ہوجاتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں کاغذ اور بعض دوسری صنعتوں پر جو لکڑی صرف ہورہی ہے اُس کا اندازہ چار کروڑ

ٹن فی سال کیا گیا ہے اور قیاس لگایا گیا ہے کہ دس سال کے عرصہ میں اُس کا خرچ پانچ کروڑ ٹن فی سال تک پہنچ جائے گا اور موجودہ جنگل اس کو مہیا کرنے سے عاری ہو جائیں گے۔

کیا رفتار کی کوئی انتہا بھی ہے؟

ہوائی جہازوں کی رفتار روز بروز اس قدر بڑھ رہی ہے کہ ممکن ہے کبھی اُس کی تیزی کو انسان برداشت ہی نہ کر سکے۔ اور اُس کے ادراک ہی سے اُس کا دماغ قاصر رہے۔ آئندہ ایسے تیز رفتار ہوائی جہازوں کے تیار ہونے کی امید ہے کہ کسی ایسے جہاز کو موڑنے کا نتیجہ چلانے والے کی موت ہوا کریگا۔ کیونکہ اس عمل سے اُس کے دماغ کے ایک پہلو پر اتنا بار پڑے گا جو اُس کی برداشت سے باہر ہو گا۔ خیال کیا گیا ہے کہ آدمی تین سو میل فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار پر مڑنے کو برداشت نہیں کر سکتا خواہ وہ سیدھے راستے پر اس سے زیادہ رفتار کو بھی برداشت کرے۔

خوراک کا بدل

آئندہ جب کوئی شخص منہ یا گلے کے زخم یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو گا جس کی وجہ سے وہ کچھ کھا پی نہ سکے تو یہ ممکن ہو گا کہ اُسے جلد کے ذریعہ سے غذا بہم پہنچائی جائے۔ خوراک رسانی کا یہ عجیب و غریب طریقہ آسٹریا کے ایک ڈاکٹر نے سال بھر کے مسلسل تجربات کے بعد معلوم کیا ہے۔

آج کل مصنوعی پرورش کے دو طریقے رائج ہیں اول پچکاری کے ذریعہ سے خون میں غذا داخل کرنے کا دوسرے اُسے مقام انہضام میں پہنچانے کا۔ مگر یہ دونوں طریقے ناقص ہیں کیونکہ اُن سے غذا پوری طرح جزو بدن نہیں ہوتی۔ لہذا یہ جدید انکشاف نہایت اہم ہے۔ اس کے ذریعہ سے اعضائے ہاضمہ دیر تک آرام لے سکیں گے اور خوراک جلد ہی سے اندر پہنچتی رہیگی۔ ایک مرکب پروٹین شکر اور دوسری ضروری حیاتین ملا کر تیار کیا جائے گا جس کی شکل مرہم کی سی ہو گی اور اُس سے مریض کے جسم پر مالش کی جائے گی جو غذا کی قائم مقام ہو گی۔

چند نصیحتیں

تفکرات کو پاس نہ آنے دو۔
امن کو تلاش کرو اور اُس کے تعاقب میں جاؤ۔
خوش رہو۔ مسرور دل زیادہ دیر تک زندہ رہتا ہے۔
کبھی مایوس نہ ہو، مایوسی ایک جانکاہ بیماری ہے۔
مردانہ وار کام کرو مگر اتنا کام نہ کرو جس سے زندگی خطرے میں پڑ جائے۔
جتنی قوت تم میں روزانہ پیدا ہوتی ہے اُس سے کم خرچ کرو۔
جلدی نہ کرو۔ منزل پر زیادہ تیز رو بھی اُسی وقت پہنچتا ہے جس وقت سست رو پہنچتا ہے
خوب سیر ہو کر سوؤ اور آرام کرو۔ نیند قدرت کی بڑی نعمت ہے۔
جوش و ہیجان سے باز آؤ۔ ایک لمحہ کا جوش بھی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔
صحت ور لوگوں سے میل جول رکھو۔ بیماری کی طرح صحت بھی متعدی ہے۔
زیادہ مت کھاؤ، اور نہ بھوکے رہو۔ اپنے اعتدال کو ضرب المثل بنا دو۔

دھات کا نیا استعمال

لندن میں ایک شخص نے ایک حیرت انگیز ایجاد کی ہے۔ وہ ہر ایک چیز پہ دھات کی ایک تہ جما کر اُسے غیر معمولی طور پر مضبوط بنا دیتا ہے۔ مثلاً ایک کپڑے پر اُس نے دھات کی تہ چڑھا دی کپڑا بظاہر باریک اور نازک تھا مگر ایک شخص اپنا پورا زور لگانے کے باوجود اُس کو پھاڑ نہ سکا۔ اس شخص کا دعوےٰ ہے کہ وہ اس طریقے سے ایسے ہوائی جہاز تعمیر کرے گا جن کا وزن موجودہ ہوائی جہازوں سے نصف بھی نہ ہوگا وہ موجودہ ہوائی جہازوں سے کم وقت میں تیار ہؤا کریں گے اور اُن سے زیادہ پائدار ثابت ہونگے۔

مخدوم صاحبات

CALCUTTA
ART PRINTING WORKS
LAHORE

یتیم بچّی

مجھ سے محبت کرنے والا
الفت کا دم بھرنے والا
کوئی نہیں ہے اس دنیا میں   اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

پیار سے کون بلائے مجھ کو
گود میں کون بٹھائے مجھ کو
میرے ناز اُٹھانے والا   اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

اچھّی کہانی مجھ کو سنا کر
پیار سے اپنے پاس سُلا کر
چہرہ پہ نظریں گاڑنے والا   اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

جاگ اٹھوں نہ سُلائے کوئی
سوتی رہوں نہ جگائے کوئی
جس کو ہو میری بھی پروا   اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

ٹھوکر کھا کے جو گر جاؤں میں
آپ ہی بن روئے اُٹھوں میں
اس دنیا میں کوئی نہیں ہے   اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

سوتے سوتے اگر ڈر جاؤں
پھر بھی تم کو پاس نہ پاؤں!
امّاں! امّاں! پیاری امّاں   اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

حامد علی خاں

مبادئ سیاسیات

باب ۳

تخیلِ مملکت کا آغاز اور اس کا ارتقا

تنظیمِ مملکت - علامہ ابن خلدون نے اپنی مشہورِ آفاق تاریخ کے مقدمہ میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مملکت تمام دنیوی خیرات اور نیکیوں کا مجموعہ اور نفسانی و جسمانی امیدوں اور آرزوؤں کی غایت الغایات[1] ہے مملکت کے حقیقی مقاصد پر آیندہ بحث کی جائے گی - اس وقت یہ بتا دینا کافی ہے کہ ابن خلدون نے جو اسے اتنا گراں بہا ادارہ بتایا ہے تو اس کا اصلی سبب مملکت کی منظم کیفیت معلوم ہوتی ہے جو اس کا جزوِ لاینفک اور اس کی عظمت کی گویا جان ہے - بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کی تنظیم کبھی نہ کبھی ضرور عمل میں آئی ہوگی، اور معاشرۂ انسانی پر ایک زمانہ ضرور ایسا گذرا ہوگا جب اس میں سیاسی کیفیات پیدا نہیں ہوئی تھیں. یعنی جب حاکم و محکوم کے تعلقات کا وجود نہ تھا - یہی وجہ ہے کہ اندازاً دو ہزار سال سے مشرق اور مغرب کے سیاسین مختلف واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر اُن کیفیات کو از سرِ نو مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو مملکت کی تنظیم سے پیشتر معاشرۂ انسانی کی ہونگی - ظاہر ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ سب محض نظریات پر مشتمل ہے، اور شاید تاریخ میں کسی ایسے معاشرۂ انسانی کا ذکر نہیں ہے جس میں سیاسی تخیل کا کلیتہً فقدان ہو -

ہندی نظریے - تخیلِ مملکت کے آغاز کے متعلق شاید سب سے پہلے نظریہ کا ذکر جو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، بودھ مت کی کتابوں میں ملتا ہے - دیگھہ نکائے میں لکھا ہے کہ مہاتما گوتم بدھ نے کسی کے سوال کے جواب میں یہ کہا کہ ابتدا میں انسان کی حالت بالکل مکمل تھی - اور رنج و فکر کا پتا نہ تھا، رفتہ رفتہ خاندان قائم ہو گئے ذاتی مِلک کا رواج ہو گیا - قوم چار ورنوں میں تقسیم ہو گئی - لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا اور اس کی ضرورت پیش آئی

[1] مقدمہ ابن خلدون حصہ دوم فصلِ اول -

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کے گراں پایہ مضمون "مبادئ سیاسیات" کو ہمارے بعض ناظرین اب تک کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ سمجھتے رہے ہیں حالانکہ یہ اُن کا طبع زاد مضمون ہے -

کہ کسی نہ کسی طرح سے زیادتیوں اور ظلم وستم کا انسداد کیا جائے۔ الغرض تمام لوگ یکجا جمع ہوئے اور انہوں نے یہ طے کیا کہ اِن زیادتیوں کا انسداد اُسی وقت ممکن ہے جب ایک ایسا حکمران منتخب کیا جائے جو ملزموں کو سزا دے، دو شخصوں میں لڑائی جھگڑا ہو تو اُن کا فیصلہ کرے اور ملک میں امن وامان قائم رکھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی جماعت میں سے سب سے زیادہ خوب رو، سب سے زیادہ متین اور سب سے زیادہ طاقتور شخص کو اپنا حکمران منتخب کیا۔ اور اُس سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر وہ یہ فرائض منصبی ادا کرے تو اُسے ایک مقررہ مشاہرہ دیا جائیگا۔[1]

اِس کے بعد جو نظریۂ ہندوستان کے سیاسی میدان میں سب سے ممتاز ہے وہ کوٹلیا کا نظریہ ہے جس کے مطابق مملکت سے پیشتر بالکل بزاج کی سی کیفیت تھی، امن وامان مفقود تھا، ہر شخص دوسرے کی ایذا رسانی اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے پر تُلا ہوا تھا اور معاشرۂ انسانی کی بعینہٖ وہی کیفیت تھی جو سمندر کی مچھلیوں کی ہوتی ہے۔ یعنی ہر زبردست شخص اپنی خواہشات کی تکمیل کے درپے تھا، اور جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہے اسی طرح وہ بھی اپنے مطمح نظر کے سامنے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔ کوٹلیا اس صورتِ حال کو متسیانیایا یعنی "قانونِ ماہی" کا لقب دیتا ہے۔ اور اس طرح سیاسی لغت میں ایک نئی اصطلاح کا اضافہ کرتا ہے۔ بہرحال اُس کے نزدیک جب صورتِ حال اس قدر ناقابلِ برداشت ہوئی تو لوگوں نے ایک حکمران کی ماتحتی قبول کرلی۔ کوٹلیا یہ نہیں کہتا کہ اس حکمران کا انتخاب باضابطہ ہوا ہوگا۔ بلکہ وہ محض حکمران کے احکام کو تسلیم کرلینا ہی اِس انتخاب کے واقعے کے لئے کافی تصور کرتا ہے۔[2]

چینی نظریے۔ تقریباً اسی زمانے میں چینی فلسفی موہ تی نے بھی مملکت سے قبل کی حالت کا تجزیہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ مملکت سے پہلے ہر شخص کے نزدیک حق اور ناحق کا تخیل جداگانہ تھا چنانچہ ایک شخص کسی بات کو حق سمجھتا تھا تو دوسرا شخص نہ صرف اُسی کو ناحق تصور کرتا بلکہ شخصِ اول کو اپنے زعم میں گمراہ سمجھنے لگتا۔[3]

یورپی نظریے۔ بہرحال یورپ میں مملکت کے قیام سے پہلے کی حالت کا تجزیہ سولہویں صدی عیسوی سے پیشتر کسی نے نہیں کیا، پہلا شخص جس کی تحریروں سے ہمیں اُس کا پتہ چلتا ہے۔ وہ گروٹ ہے۔ گروٹ کے بعد جرمن پوفنڈورف اور ولندیزی اسپی نوزا نے بھی اُس کے تجزیے کی کوشش کی، لیکن اس موضوع پر سب سے پہلی مرتبہ کامل بحث ومباحثہ کا سہرا انگلستان کے فلسفی طامس ہوبز کے سر ہے جس نے ۱۶۵۱ء میں اپنی کتاب لیوایاتھن کو شائع کرکے مغربی سیاسیوں کے لئے ایک نیا بحث پیدا کردیا۔

---

[1] و [2] گھوشال ہندو کے سیاسی نظریوں کی تاریخ۔ U. Ghoshal - A History of Hindu Political Theories باب ۲
[3] بنوے کمار سرکار۔ ہندوؤں کے سیاسی ادارات ونظریات۔ Benoy Kumar Sarkar The Political Institutions and Theories of the Hindus. باب ۹ ست

ہوبز ۔ کو ٹلیا کی طرح ہوبز کے نزدیک بھی مملکت سے پیشتر منتیا نیایا کی کیفیت ہوگی ۔ چونکہ اس فطری حالت میں قانون کا بالکلیہ فقدان تھا ۔ اس لئے حق و باطل ، انصاف و بے انصافی کا وجود ہی نہ تھا ۔ ہر شخص کو اپنی جملہ خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کی کامل آزادی حاصل تھی ۔ اور چونکہ انسان فطرتاً خود بین اور خود غرض ہے ۔ اس لئے ہمیشہ مختلف لوگوں کی خواہشات میں باہم تصادم ہوتا رہتا تھا ۔ یہ صورتِ حال اس قدر ناقابل برداشت ہوگئی کہ لوگ اپنی زندگی تک سے عاری ہوگئے ۔ اور انہوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ ہر شخص اپنی آزادی اور قوتِ عمل سے بالکلیہ دست بردار ہو جائے ۔ بشرطیکہ باقی اشخاص بھی اسی طرح دست برداری دے دیں ۔ ساتھ ہی جملہ افراد نے باتفاق رائے اپنے اوپر حکومت کرنے کا اختیار جزوی وکلی ایک ایسی شخصیت کے سپرد کر دیا جسے ہوبز "مقتدر اعلیٰ" کا لقب دیتا ہے ۔ چونکہ یہ کارروائی محض اس لئے ہوئی تھی کہ بغیر اس کے ملک میں امن و امان رہنا ناممکن تھا ۔ اس لئے مقتدرِ اعلیٰ کا فرضِ اولین یہ ہوا کہ ملک میں امن و امان قائم رکھے ۔ اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرے ۔ چنانچہ جب تک وہ اس اساسی شرط کو پورا کرتا رہیگا یعنی جب تک وہ امن قائم رکھے گا ۔ اُس وقت تک اُس کا حکم ماننا ہر شخص پر فرض ہوگا ۔ خواہ وہ حکم بادی النظر میں کیسا ہی بے انصافانہ کیوں نہ ہو ۔

لاک ۔ ہوبز کے بعد جس فلسفی نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا وہ بھی اُس کی طرح ایک انگریز مسمی جان لاک تھا جس نے اپنی کتاب سنہ ۱۶۹۰ء میں شائع کی ۔ ہوبز کے نزدیک تو مقتدرِ اعلیٰ کا مطلق العنان ہونا قیامِ مملکت کے لئے لازمی تھا ۔ لیکن ہابز کے وقت سے لے کر لاک کے زمانہ تک یہی امر شاہِ انگلستان و رعایائے انگلستان کے درمیان مابہ النزاع رہا تھا کہ آیا بادشاہ کو حقوقِ مطلق العنانی حاصل ہیں یا نہیں ۔ انگریز چارلس اول کا سر قلم کر چکے تھے انہوں نے جیمز دوم کو ملک سے نکال دیا تھا ۔ اور اکثر شاہی اختیارات سلب کر کے ایک غیر ملکی ولیم سوم کو تختِ انگلستان پر بٹھا دیا تھا ۔ لیکن باوجود اِن تمام انقلابات اور باوجود ہوبز کے نظریہ کے انگلستان کی مملکت برابر قائم تھی ۔ لاک نے یہ محسوس کیا کہ اُس کے پیشتر کے نظریہ میں کچھ نہ کچھ خامی ہے اور اِس کی ضرورت سمجھی کہ ایک نیا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کرے ۔

لاک کے نزدیک یہ غلط ہے کہ مملکت کے آغاز سے پیشتر کسی قانون کا نفاذ نہ تھا ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت بھی قانونِ قدرت رائج تھا ۔ ہر انسان میں عقل و شعور کے جذبات موجود تھے ۔ وہ حق اور باطل انصاف اور بے انصافی میں تمیز کر سکتا تھا ۔ ہر شخص کو ہر چیز پر قبضہ کرنے کا قدرتی اختیار تھا ۔ بشرطیکہ وہ دوسروں

کا سدِّراہ نہ بنے۔ لیکن اس قانون کی تاویل کرنے کا استحقاق بجائے کسی ثالث کے ہر ایک فرد کو حاصل تھا۔ اس صورتِ حال میں ایک سقم یہ تھا کہ چونکہ ہر شخص اپنے افعال کا خود ہی جج تھا۔ اس لئے اکثر و بیشتر کسی خاص امر کے متعلق مختلف افراد کے فیصلوں میں تصادم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود بھی یہ نہایت آرام دہ کیفیت ناقابلِ برداشت نہ ہو جاتی اگر بعض طماع اور نفس پرست افراد دوسروں کی مقبوضہ اشیا پر جبراً قبضہ کرنا نہ چاہتے، جس کی وجہ سے نہ صرف لوگوں کے مقبوضات بلکہ اُن کی آبرو اور زندگی بھی معرضِ خطر میں پڑ گئی۔

لاک کے نزدیک معاشرۂ سیاسی کا اولین مقصد انسان کی زندگی، تندرستی، آزادی اور مملوکات کی حفاظت ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے واسطے ابتدائی انسانوں نے آپس میں سمجھوتا کر کے یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ قانونِ فطرت کی خود ہی تاویل اور نفاذ کرنے کے بجائے اس اہم فرض کو کل قوم کے سپرد کر دیں گے، اور جب اس طرح معاشرۂ سیاسی قائم ہوگیا تو سب نے ایک شخص واحد کو اپنا حکمران قرار دے کر اپنی جانب سے اُس کو نفاذِ قوانین و تاویلِ قوانین کا اختیار دیا۔ بشرطیکہ وہ ابتدائی معاہدے کے مقصدِ اولین کو پورا کرتا ہے یعنی افراد کی آزادی، زندگی، آبرو اور ملک کی حفاظت کرتا رہے۔ ساتھ ہی آپس میں یہ بھی طے ہوا کہ کثرت رائے ہمیشہ قلت پر حاوی رہا کرے گی۔ لاک کی رائے ہے کہ اس معاشری حالت کی ابتدا کا ثبوت محض منطقی دلیلوں ہی سے نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اُس کی بنیاد تاریخی واقعات پر ہو۔ اور یہ محض اس لئے کہ ہمارے پاس اس کا ثبوت کم ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ مطلق پیش نہ آیا ہوگا۔

رُوسو۔ تیسرا ممتاز شخص جس نے معاہدۂ معاشری پر قلم اٹھایا، جنیوا کا باشندہ ژان ژاک رُوسو تھا جس نے اپنی مشہور کتاب "معاہدۂ معاشری" کو ۱۷۶۲ء میں شائع کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ اپنی فطری حالت میں انسان کی زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر ہوتی تھی۔ انصاف یا اخلاق کا تخیل تو بالکل مفقود تھا، لیکن ہر شخص بالکلیہ آزاد ہونے کی وجہ سے فطرتاً دوسروں کے احساسات و جذبات کا پاس کرتا تھا۔ اس حالت میں کوئی چیز کسی کی مملوکہ نہ تھی۔ بلکہ غیر مقبوضہ چیز پر ہر شخص کو قبضہ کرنے کا حق تھا۔ یہ عہدِ زریں ایک ایسا عہد تھا جس کا خاتمہ مستقل مملوکات کے رواج اور قوی و زوردار افراد کی حرص کی وجہ سے ہمیشہ کے واسطے ہوگیا۔ جب مختلف اشیا مختلف افراد میں تقسیم ہوگئیں اور زبردست زیردست پر مظالم ڈھانے لگا۔ تو امن قائم کرنے کی صرف ایک صورت نظر آئی، وہ یہ کہ تمام افراد متحد اور مجتمع ہو کر ظالموں اور غاصبوں کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ ہر ایک شخص نے اپنی ذات اور اپنے جملہ اختیارات سے دست بردار ہو کر اپنے آپ کو تمام قوم کے اقتدار کے ماتحت کر دیا۔ رُوسو کا خیال ہے

کہ اس ترکیب سے غاصب اور ظالم مغلوب ہو گئے۔ اور ساتھ ہی چونکہ ہر شخص اس نئی جماعت کا ایک رکن تھا۔ اِس لئے آزادی میں بھی کمی پیدا نہیں ہوئی ؎

؎ ہوبز، لاک اور روسو کے نظریوں کے اختلافات کے باعث اُن کے قائم کئے ہوئے حکمرانوں کے اختیارات میں بھی بڑا فرق ہے۔ ہوبز کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنی فطری عادات سے تنگ آکر اپنے جملہ اختیارات ایک مقتدرِ اعلیٰ کے سپرد کر دیئے۔ اس کے نزدیک خواہ یہ "مقتدرِ اعلیٰ" شخصِ واحد ہو یا ایک مرکب جماعت، اسے سیاہ و سپید کا کلی اختیار حاصل ہے اور ہر شخص کو اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ لاک کے نزدیک مقتدرِ اعلیٰ کا تقرر چند خاص اسباب کی بنا پر ہوا ہے اور اُس کا اقتدار مشروط ہے۔ تا وقتیکہ وہ جان مال اور آبرو کی حفاظت کرتا رہے گا اُس کا اقتدار قائم رہے گا۔ ورنہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اکلیلِ اقتدارِ اعلیٰ اُس سے چھین کر کسی اور کو دیدیں۔ روسو کے خیال کے مطابق مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ باشندگانِ مملکت ہی کو حاصل ہے۔ اور وقتی حکمران کی حیثیت خادم سے زیادہ نہیں ہے۔

اِن تینوں سیاسیوں کے نزدیک باشندگانِ مملکت اور مقتدرِ اعلیٰ میں جو تعلق ہے وہ مفصلہ ذیل شکلوں سے واضح ہو سکتا ہے۔
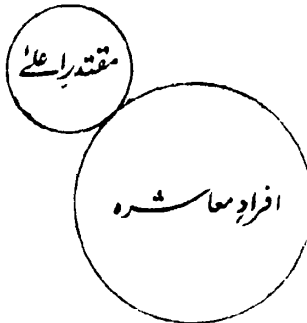
(۲) لاک کے نزدیک پہلے معاشرہ سیاسی منظم ہوا، اس کے بعد معاشرہ نے اپنے میں سے ایک شخص کو مقتدرِ اعلیٰ اس شرط پر مقرر کیا کہ وہ جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرے گا

(۳) روسو کے نزدیک افرادِ معاشرہ ہی کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔

افرادِ معاشرہ

ان نظریوں کا مشترک عنصر۔ ان تمام نظریوں میں، خواہ اُن کے پیش کرنے والے ہندوستانی ہوں یا چینی، انگریز ہوں یا فرانسیسی، ایک چیز مشترک ہے، وہ یہ کہ بنی نوعِ انسان کی تاریخ دو بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے یعنی تنظیمِ مملکت سے پیشتر کا زمانہ اور اس کے بعد کی حالت۔ مملکت کے قیام سے پہلے کی کیفیت کی بابت سیاسوں کے درمیان باہمی اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کی اصل بنا انسان کی فطری حالت کی حقیقت ہے۔ بعض کے نزدیک انسان فطرتاً ہمیشہ سے حریص، خود غرض، لڑاکو واقع ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خواہ اِس کی حالت منظم ہو یا نہ ہو، وہ چند قوانینِ قدرت کا اتباع کرتا ہے۔ اور اس میں اور باقی جانداروں میں جو امتیاز ہے وہ عقل، فہم اور ادراک کے وجود پر مبنی ہے۔ انسانیت کے معنے ہی یہ ہیں کہ مختلف انسانوں میں فہم وادراک کی صفات موجود ہوں، اور یہ کہنا کہ ازل سے ہی انسان محض خودغرض یا محض حریص ہے۔ صریح غلط بیانی ہے۔ لیکن ثانی الذکر سیاس بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ رفتہ رفتہ بعض زبردست افراد میں خود غرضی اور حرص کے جذبات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ہر ایک کے نزدیک معاہدۂ معاشری سے پیشتر بنی نوع انسان میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور اسی کے انسداد کی غرض سے آخر کار معاشرۂ سیاسی قائم کرنا پڑا۔

اصولِ معاہدۂ معاشری کی تنقید۔ یورپ اور امریکا پر ان نظریوں کا اثر نہایت عظیم الشان پڑا۔ ممالک متحدہ امریکا اور فرانس کے انقلابی دستوروں کے فقرے کے فقرے رُوسو کی تحریروں سے لئے گئے ہیں۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے اواخر ہی میں سیاسوں میں اس کے خلاف ردّعمل پیدا ہو گیا۔ اور ایڈمنڈ برک، جیرمی بنتھم اور داؤد ہیوم نے اپنے دلائل سے گویا کہ اُس کا خاتمہ کر دیا۔ لاک کا یہ قول کہ عدمِ شہادت سے عدمِ واقعہ ثابت نہیں ہوتا بالکل لایعنی ہے۔ ہوبز کے نظریے کی بنیاد بھی ایک حد تک واقعات اور منطقی استدلال پر تھی۔ لیکن لاک کا ایک طرف تو ثبوت کے فقدان کو تسلیم کر لینا اور دوسری جانب معاہدے کو بطور ایک واقعہ کے پیش کرنا۔ ایک امرِ لاطائل ہے۔ اگر یہ تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کر لیا جائے کہ کسی ایک وقت میں بنی نوع انسان یکجا بیٹھے، اور اُنھوں نے آپس میں یا کسی شخصِ ثالث سے کسی قسم کا معاہدہ کیا۔ تاہم یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اُن ابتدائی معاہدہ کرنے والوں کی اولاد پر بھی اُس کے شرائط کی پابندی فرض ہے۔ دوسرے ہم جانتے ہیں کہ موجودہ پیچ در پیچ قانونی تخیلات صدیوں کے ذہنی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ جب انسان منظم ہی نہ تھا اور جب آپس کے تعلقات تقریباً مفقود تھے تو پھر معاہدہ جیسے پیچیدہ قانونی تخیل کا اُنھیں احساس پیدا ہونا، اس احساس پر اُن کا عمل کرنا، اور ہر ایک

فرد کا، خواہ وہ زبردست ہو یا کمزور، چھوٹا ہو یا بڑا، بختی سے کاربند ہونا کم وبیش ناممکنات سے معلوم ہوتا ہے۔
نیز یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ آخر اس معاہدے کو استحکام کیوں حاصل ہؤا۔ اس کے دو ہی اسباب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مقتدرِ اعلیٰ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے معاہدے کا قیام چاہتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ افرادِ معاشرہ امن وامان کے خواہاں ہیں۔ لیکن اگر محض مقتدرِ اعلیٰ کی خواہش ہی پر قیامِ معاہدہ کا دارومدار ہے تو پھر معاشرۂ سیاسی جبرواکراہ ہی پر منحصر ہؤا۔ اور اگر اس کی بنیاد افرادِ معاشرہ کی خواہش پر ہے تو پھر ایک دُور رس نقاد یہ بھی سوال کرسکتا ہے کہ آخر افراد کو فی الجملہ امن وامان کی خواہش کیوں ہوتی ہے۔ تقریبًا اسی قسم کی تنقید ہوبز، لاک، رُوسو اور تمام اُن سیاسوں کے نظریوں کی کی جاسکتی ہے جنہوں نے معاہدۂ معاشری کے تخیل کو پیش کیا ہے۔ آخر میں صرف یہ کہنا باقی ہے کہ رُوسو کے نزدیک ہیئتِ اجتماعیہ پیدا ہونے کے بعد ہر ایک شخص پہلے کی طرح بالکلیہ آزاد رہا۔ اِس نظریے میں جو مغالطہ ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ ہر شخص کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک انفرادی دوسری اجتماعی۔ اجتماعی حیثیت جملہ افراد کی انفرادی حیثیتوں کا نام نہیں بلکہ وہ ایک علیحدہ تخیل ہے جو گویا ان تمام انفرادی حیثیتوں کی کیمیاوی ترکیب سے بنا ہے، چنانچہ خود رُوسو ان دونوں تخیلات کے مابین امتیاز کرکے اجتماعی اداروں کو "مشیتِ عامہ" اور انفرادی اداروں کے مجموعے کو "مشیتِ عوام" کا لقب دیتا ہے۔

ہم نے نظریۂ معاہدۂ معاشری کو دو اسباب کی بنا پر اس قدر اہمیت دی ہے، ایک تو یہ کہ کم وبیش پانچویں صدی ق م سے انیسویں صدی عیسوی تک مشرق ومغرب دونوں کے بعض بڑے بڑے نظریہ ساز یکے بعد دیگرے اسی نظریہ کے مغالطے میں پڑے رہے۔ دوسرے مختلف سیاسوں نے اُس کی مختلف شکلیں قائم کی ہیں لہٰذا اِس کی ضرورت پیش آئی کہ اس پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے۔

نظریۂ تخلیقِ ربانی ۔ نظریۂ معاہدۂ معاشری کے بعد دوسرا کم وبیش عالمگیر نظریہ تخلیقِ ربانی کا ہے، جس کے مطابق مملکت کی آفرینش اور قیام انسان کا کام نہیں۔ بلکہ خدا کا کام ہے۔ اِس کے معتقد یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ خدا نے اپنے چند برگزیدہ بندوں کو تخت وتاج عطا کرکے اُن کے سپرد معاشرۂ انسانی کی تنظیم کردی ہے۔ لہٰذا حکمرانوں کو جو حقوق حاصل ہیں اُن سے انہیں محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس نظریہ نے مغربی ممالک پر نہایت گہرا اثر ڈالا، تاآنکہ جرمانیہ کے شہنشاہ کو شہنشاہیت کے ایک خاص معنے کرکے دوسرے عیسائی بادشاہوں سے مقدس وممتاز سمجھا گیا اور انگلستان میں شاہانِ اسٹیوٹرٹ نے اپنی شخصی حکومت کا دارومدار اسی پر رکھا۔ مشرق

میں بھی اس کا ایک خاص اثر پڑا۔ بلکہ شاید یہی اصول ہے جس کے تحت بادشاہوں کو ظلّ اللہ کہا جانے لگا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو گو امر بدیہی ہے کہ مملکت کو خدا نے پیدا کیا ہے اور اُسی نے انسانوں کو منظم کر کے معاشرۂ سیاسی کی بنیاد ڈالی ہے لیکن اِس سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ خدا نے تو ہر چیز بنائی ہے ہر مادّی شے اور غیر مادّی تخیل کا مبدا وہی ہے؛ اُس نے نہ صرف انسان میں معاشرہ قایم کرنے کی صلاحیت پیدا کی بلکہ جانوروں میں بھی ایک قسم کی تنظیم قائم کردی جس سے خود انسان بھی سبق لے سکتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں مملکت یا حکمرانوں کو کوئی خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسری مخلوقات کو حاصل نہیں۔ خدا تو ہر چیز کا سبب اول ہے؛ اِسی لئے جب ہم کسی خاص تخیل کے مبدا کی تحقیقات کرتے ہیں تو تخلیقِ ربانی کے اصول کو پہلے ہی سے تسلیم کر لیتے ہیں اور سببِ اول کی تلاش کرنے کی بجائے محض سببِ ثانی کی جستجو کو کافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال کہ چونکہ مملکت کی تخلیق خدا نے کی ہے لہٰذا مزید تحقیقات نہیں کرنی چاہئے، نہ صرف بیکار ہے۔ بلکہ نقصان رساں بھی ہے۔

نظریۂ اقتدارِ ابوی و اموی ۔ نظریۂ معاہدۂ معاشری اور نظریۂ تخلیقِ ربانی کے بعد جس نظریہ نے زمانۂ حال کے سیاسی تخیل پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے وہ ابوی یا اموی نظریہ ہے۔ ارسطا طالیس کے زمانے سے لے انیسویں صدی عیسوی تک مشکل سے کوئی عہد ایسا گزرا ہوگا جس میں سیاسی مفکروں کی ایک جماعت نے ابوی نظریہ کی تائید میں قلم نہ اُٹھایا ہو۔ اِس کے مطابق مملکت دراصل خاندانوں کے ایک مجموعے کا نام ہے اور جس طرح ابتدائی زمانوں میں ہر خاندان میں باپ کو اختیارات مطلق حاصل تھے۔ اسی طرح مملکت میں بھی ایک شخصیت کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے پیش کرنے والے اس کے ثبوت میں ہندو مشترک خاندانوں کے سربراہ کاروں، بنی اسرائیل کے بطریقوں اور رومن "اقتدارِ ابوی" کے اصُول کو پیش کرتے ہیں۔ زمانہ حال میں اس نظریہ کی یہ شکل قائم کی گئی ہے کہ ابتداً خاندان کا سرگروہ ایک فردِ واحد ہوتا تھا جس کا حکم جملہ اہلِ خاندان مانتے تھے، اور بعض مقامات میں اس سرگروہ کو اپنے دست نگر افراد پر موت و زیست کا بھی اختیار ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ خاندان کے افراد میں توسیع ہوئی اور انہوں نے کنبہ یا قبیلہ کی صورت اختیار کرلی، اور یہ خیال لوگوں کے دلوں میں اس قدر جاگزین ہوا کہ قبیلے کے افراد اپنے آپ کو ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی اولاد ظاہر کرنے لگے۔ جب ہر قبیلے کی تنظیم میں امتداد زمانہ سے استقلال و قوت پیدا ہو گئی تو اُسے اپنے ہمسایہ قبائل کو مغلوب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جس کے بعد خواہ مجبوراً ورنہ ارادتاً مختلف قبائل ایک ہی سلسلے میں منسلک ہو

گئے اور مناکحت وازدواج کے قوانین مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مرور ایام سے ہم نسل ہونے کا خیال بھی زائل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آخر کار مملکت عدم سے وجود میں آگئی۔

اس نظریہ کو انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک کم وبیش عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، اور اسے پہلی زک اُس وقت ملی جب لوگوں نے دنیا کا سفر کر کے دور اُفتادہ اقوام کے حالات کی تفتیش کرنی شروع کی۔ اس کے معتقدوں کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہیں معلوم ہوا کہ دنیا میں بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن میں ایک ایک عورت کو متعدد مردوں سے نہ صرف نکاح کرنے کی اجازت ہے بلکہ عادتاً اور رواجاً ایسا کیا بھی جاتا ہے؛ مثلاً ملیبار کی بعض ہندو ذاتوں میں ایک عورت کئی مردوں سے شادی کر سکتی ہے۔ جس کے باعث خاندان کی سرگروہ وہی ہوتی ہے اور اُسی کے واسطہ سے خاندانی جائداد کی وراثت پسماندگان کو پہنچتی ہے۔ یہی کیفیت نیپال اور تبت کی بعض اقوام کی ہے جہاں اگر کوئی عورت ایک شخص کے نکاح میں ہو تو وہ اُس کے تمام بھائیوں کی منکوحہ سمجھی جاتی ہے۔ غرض اِن انکشافات کے بعد ابوی نظریہ کے حامی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہر جگہ باپ ہی خاندان کا سرگروہ ہوا کرتا تھا۔ آج کل اِس نظریہ پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ حال ہی میں پروفیسر جنکس نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم ترین سیاسی ادارہ خاندان نہیں بلکہ قبیلہ ہے جو رفتہ رفتہ گھرانوں میں منقسم ہو جاتا ہے، اور اُنہوں نے اپنے اِس خیال کا ثبوت آسٹریلیا کی اصلی اقوام اور کلٹ قوم کی تنظیم سے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آسٹریلیا میں خاندان کو مطلق کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، بلکہ "قوم" چند مجموعوں پر مشتمل تھی جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک نشان مخصوص تھا، (مثلاً ایک مجموعے کے لئے سانپ کی تصویر یا دوسرے کے لئے کسی پرند کی تصویر) اور مناکحت وازدواج کے قوانین اسی تفریق پر مبنی تھے؛ مثلاً کسی نشان والا اپنے ہی نشان کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا[1]۔ یہ کم وبیش وہی صورت حال ہے جو ہندوؤں کی بعض ذاتوں میں پائی جاتی ہے، یعنی بعض ذاتوں میں ایک ہی گوتر کے دو افراد باہم شادی کر سکتے ہیں بعض میں نہیں۔ اسکاٹستان اور ایرستان میں بھی قبیلوں کو جتنی اہمیت حاصل ہے اُس کا عشر عشیر بھی خاندانوں کو حاصل نہیں ہے۔

نظریہ جبر۔ بعض سیاسوں کے نزدیک مملکت کی بنا محض جبر وقوت پر ہے۔ ابتدا میں غالباً ایسا ہی ہوا ہوگا کہ کسی دور رس عقلمند اور قوی شخص نے پہلے تو بہت سے لوگوں کو اپنے زیر اثر کیا، اور پھر اُن کو ساتھ لے کر

---

[1] جنکس: "مملکت اور قوم" Jenks: The State and the nation باب ۳

قرب وجوار کے باشندوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ جب اُس کی قوت بڑھ گئی اور اُس کا اثر لوگوں کے دلوں پر مستقل طور پر قائم ہوگیا تو اُس نے اُنہیں اپنا حکم ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ اُن کا مستقل فرمانروا بن گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کو مان کر کسی ملک میں آزادی اور حقوقِ انسانی کا نام بھی باقی نہیں رہنا چاہئے اور جس طرح محض معاہدۂ باہمی مملکت کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا اسی طرح محض جبر پر ہی اس کا مدار نہیں ہو سکتا آج کل کے زمانے میں جب ہر جگہ عمومیت کی لہر دوڑ رہی ہے، یہ کہنا کم وبیش لا حاصل معلوم ہوتا ہے کہ معاشرۂ سیاسی کا دارومدار کلیتہً جبر ہی پر ہے۔

حقیقی ارتقاءِ مملکت ۔ اِس موضوع پر جتنی دلیلیں اِس وقت تک پیش کی گئی ہیں وہ سب کی سب تمہیدی ہیں، یعنی مختلف نظریے پیش کر کے اُن میں سے تقریباً ہر ایک کا بطلان کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعتاً مملکت کیسے قائم ہوئی۔ سب سے پہلی بات جو ذہن نشین ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ جملہ سیاسی ادارات ایک تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا تاریخی واقعہ ہم کو نہیں ملتا جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ مملکت کا تخیل انسانوں کے کسی مجموعے کے دماغ میں بلا بیرونی اثرات کے یک بیک پیدا ہوگیا۔ اس خیال کو مدِنظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گو مفصلۂ بالا نظریات میں سے کوئی بھی بالکلیہ صحیح نہیں، بہر کیف ہر ایک میں کچھ نہ کچھ حقیقت کا پہلو ضرور ہے۔ ارسطا طالیس اپنی مشہور آفاق کتاب "سیاسیات" میں کہتا ہے کہ مملکت ایک قدرتی ادارہ ہے اور انسان فطرتاً ایک سیاسی حیوان ہے[۱]۔ دوسرے الفاظ میں اِس کے یہ معنی ہوئے کہ خالقِ اکبر نے بنی نوعِ انسان کے ہر ایک فرد کے لئے یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی زندگی گزارے، اور ساتھ ہی اُس کو یہ قابلیت ودیعت کی ہے کہ باہمی تعلقات کو مرتب و منظم کرے۔ ساتھ ہی شاید سب سے پہلے اثرات جنہوں نے انسان کو قانون و آئین کی پابندی پر آمادہ کیا وہ مذہبی قواعد ہونگے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ مملکت کا انتظام و انصرام صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مختلف افراد کو قانون کی پابندی پر سختی سے مجبور کیا جا سکے اور خلاف ورزی کرنے والوں پر مناسب تشدد روا رکھا جائے۔ اِن سب امور کے بعد بھی مملکت کا قیام اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہر ایک فردِ مملکت نہ صرف اپنے دل میں بلکہ اپنے عمل کے ذریعے سے یہ ثابت نہ کر دے کہ باوجود اِن تمام سختیوں کے وہ مملکت کے قیام کا ہمہ تن خواہاں ہے۔

الغرض مملکت کے ارتقا میں یہ تمام عناصر ممد و معاون ہوئے ہونگے۔ غالباً ابتدا میں تو چند ہی

---

[۱] ارسطا طالیس: "سیاسیات" ۲۱۱۔

افراد کے دماغ میں ایک سیاسی حس پیدا ہوئی جو رفتہ رفتہ عالمگیر ہوگئی، لیکن یہ حس محض ایک خیال کی حد تک محدود تھی اور سیاسی ادارے اور قوانین کی تنظیم میں شاید سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال صرف ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ان قوانین کے نفاذ اور اداراتِ سیاسیہ کے استحکام کے لئے عمال کی ضرورت لاحق ہوئی اور اُن کے تقرر کے بعد گویا مملکت عدم سے وجود میں آگئی [1]

بہرحال یہ سب بھی محض ایک نظریے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اِس لئے کہ جب اوپر بیان کیا جا چکا ہے، معاشرۂ سیاسی کے ارتقا کے بعد مملکت کی موجودہ صورت کا پیدا ہونا ہزار ہا برس کا کام ہے۔ نیز یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ تخیلِ مملکت کا ارتقا ہر جگہ ایک ہی طرح ہُوا ہوگا، بلکہ مختلف حصص دنیا کے جغرافی اثرات باشندوں کے فطری میلانات اور ہمسایوں کے تعلقات بھی اس ارتقا میں ممد و معاون ہوئے ہونگے۔

ہارون خاں شروانی

فہرستِ اصطلاحات جو اِس باب میں بیان کی گئی ہیں

اقتدارِ ابوی	Partia Potestas	سیاست دان	Politician
انہدامی دلیل	Destructive argument	عمومیت	Democracy
اسکاٹستان	Scot land	قانونِ فطری	Law of Nature
ایرستان	Ireland	قبیلہ	Tribe
بطریق	Patriarch	کٹم	Clan
تخلیقِ ربّانی	Divine creation	مشیّتِ عامہ	Volonté générale
حالتِ فطری	State of Nature	مشیتِ عوام	Volonte de tous
حکمران	Ruler	معاہدۂ معاشری	Social Contract
ریاست	State	نراج	Anarchy
سیاس	Political Scientist	ولندستان	Netherland (Holland)

[1] گارنر: "تمہید سیاسیات" Garner: Introduction to Political Science باب ۴

نغمہ

ساغرِ صہبائے رنگیں شعلہ زارِ نغمہ ہے
موجِ مے کی رنگ افروزی شرارِ نغمہ ہے

ناقۂ لیلیٰ کی جنبش میں بہارِ نغمہ ہے
ذرہ ذرہ دشت کا منّت گذارِ نغمہ ہے

کہکشاں کا نور کیا ہے رہگذارِ نغمہ ہے
چاندنی کی موج کیا ہے آبشارِ نغمہ ہے

عشقِ غمگیں کا ہشِ بے تابیٔ فریاد ہے
حسنِ رنگیں لرزشِ بے اختیارِ نغمہ ہے

ساز کی آواز پر دھوکا ہے موجِ رنگ کا
پھول کی رنگینیوں پر اعتبارِ نغمہ ہے

وہ خراماں ہوں تو آئے وجد میں کُل کائنات
اُن کی رفتارِ گُل افشاں پر مدارِ نغمہ ہے

محفلِ انجم ہے معمورِ ترنّم عرش پر
عرش کیا ہے دامنِ گوہر نگارِ نغمہ ہے

حُسن کی بے دادبھی رنگ آفرینِ لطف ہے
عشق کی فریاد بھی آئینہ دارِ نغمہ ہے

آج کس فردوس منظر نے اُٹھایا ہے رباب
آج موجِ رنگ سیلِ جوئبارِ نغمہ ہے

مدتوں سے ضبط نے روکا ہوا ہے سیلِ درد
مدتوں سے بربطِ دل بے قرارِ نغمہ ہے

شعلہ ہائے عشق میں پوشیدہ ہیں سب راگ رنگ
شعلہ ہائے عشق سے روشن دیارِ نغمہ ہے

تاجدارِ عشق ہوں عاؔبد دیارِ حُسن میں
میرا اندازِ غزل پروردگارِ نغمہ ہے

عاؔبد

تاریخ دُنیا پر ایک نظر

ایران، یونان اور مقدونیہ

۱۱

نئی نسل کی آمد آمد

ہندی یورپی لوگوں کی ابتدا - ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ۲۰۰۰ ق م کے قریب مشرق میں ہندوکش سے لے کر مغرب میں بلقان تک سامیوں حامیوں اور متوسط النسل قوموں کی قدیم و روشن دنیا کو شمال سے ایک نیا ہیبت ناک خطرہ آتا دکھائی دیا + اس سن سے بہت پہلے سندھ کی وادی پر ہندوؤں نے حملہ کرکے اُس پر اپنا قبضہ جمالیا تھا - ۱۹۲۵ ق م کے قریب بابل کو جو ہتی لوٹ مار سے کمزور ہوگیا تھا کاسیوں نے آدبایا - اور کچھ اسی وقت میں متانیوں نے شمالی شام میں آباد ہوکر اپنی ایک حکومت قائم کرلی جس سے مشرق میں آشوری اور شمال میں ہتی ڈرنے کانپنے لگے اور اُسی زمانے میں اکائیوں نے تھیسلی میں آباد ہوکر ایجئین میں لوٹ مار شروع کردی + یہ تمام قومیں ہندو کاسی متانی اکائی ایک نئی نسل سے تھے جس کا ابھی تک جنوبی دنیا میں کبھی نام بھی نہ سنا تھا + بعد کے ہزار سال میں اُن کے پیچھے انہیں کے ہم نسل میدی ایرانی فریجی لیدی سیمیری دورانی آئیونی سابینی لاطینی کلتی بھی آدھمکے + اس مجموعۂ اقوام کے لئے پہلے "آریا" کا لفظ مستعمل تھا لیکن اس نام کا درست اطلاق صرف اُن کی مشرقی شاخ پر ہوتا ہے - اُن سب کے لئے جو مشترک نام اب مغربی محققین کے ہاں استعمال ہوتا ہے وہ "ہندی یورپی" ہے +

لفظ "ہندی یورپی" دراصل ایک لسانی اصطلاح ہے اس کا اطلاق اُن لوگوں کے وسیع گروہ پر ہوتا ہے جن کی مشترک اصلی زبان کی قدیم ترین نمائندہ سنسکرت ہے اور جس سے بعد میں لاطینی یونانی فرانسیسی انگریزی وغیرہ نکلیں + لیکن اس مشکوک نظریے کو مستند مان کر کہ ابتدائی ہندی یورپی زبان کے بولنے والے ایک ہی نسل کے تھے

اورکرۂ زمین کے ایک خاص حصے میں اکٹھے رہتے تھے یہ اصطلاح نسلی معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ ماہرین علم اللسان نے اُن مشابہ الفاظ کے مطالعہ سے جو تمام ہندی یورپی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ آریاؤں کے اصلی وطن اور علیحدگی اور نقلِ مکانی سے پہلے اُن کے درجۂ تمدن کے متعلق بعض دلچسپ واقعات پیش کئے ہیں پہلے تو وہ سب اس نسل کے لوگوں کا وطن وسطِ ایشیا اور خاص کر تبت کی سطح مرتفع سمجھتے تھے۔ لیکن حال کی باقاعدہ یورپی تحقیقات اور نسلیات کے مطالعہ سے یہ رائے زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ شمال مشرقی یورپ اور بالخصوص گنجان جنگلوں کا وہ خطّہ جو دریائے وسچولا اور کوہستانِ یورال کے درمیان لتھوئینیا کے قریب واقع ہے اُن کا ابتدائی وطن تھا۔

ابتدائی ہندی یورپی تمدّن - ایشیائی خانہ بدوش مشرق کے کھلے میدانوں میں رہتے تھے۔ گلہ بان آلپینی وسط کی کوہستانی بلند سرزمینوں کے باشندے تھے۔ زراعت پیشہ قومیں دریاؤں کی وادیوں میں بستی تھیں اور بعض بحری ساحلوں پر آباد تھیں۔ اُن کے مقابل میں ہندی یورپی قومیں شمال کے گنجان جنگلوں اور دلدلوں میں رہنے والی تھیں۔ یہ لوگ بمقابلہ گلہ بانوں یا وادیوں کے خانہ آبادوں کے تعداد میں تھوڑے تھے۔ اُن کی زندگی کٹھن اور سرگرم تھی۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں دلدل اور جنگل حائل تھے۔ اول اول وہ گلہ بانی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بلکہ بجائے بھیڑ یا بکری کے اُن کی گذراوقات زیادہ تر بیل پر تھی۔ وہ کتے پالتے تھے اور انہوں نے اپنے مشرقی خانہ بدوش ہمسایوں سے گھوڑے کا استعمال بھی سیکھ لیا تھا۔ انہیں کی یورشوں سے اشوری اور بابلی ۲۰۰۰ ق م کے قریب گھوڑے سے واقف ہوئے۔ جب اشوری سلطنت عروج کمال پر تھی تو ہندی یورپی میدی (جو اس وقت بحرِ خزر کے جنوب مشرق میں آباد تھے) اُن کی رعایا تھے اور اُن کا کام اپنے حاکموں کی جنگی رتھوں کے لئے گھوڑے پالنا اور فراہم کرنا تھا۔

لیکن ابتدائی ہندی لوگوں کی طرزِ زندگی نری گلہ بانی کی نہ تھی۔ وہ خانہ بدوش نہ تھے۔ وہ ایک قسم کی معمولی وسیع زراعت سیکھ چکے تھے۔ اُن کی مشترک زبان میں حل چلانے بونے اور کاٹنے کے لفظ موجود تھے۔ باجرا وہ سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اور وہ اس سے نہ صرف روٹی پکانا جانتے تھے بلکہ ایک قسم کی شراب بھی نکالتے تھے۔ جس کے نشے میں وہ جنگلوں کی سرد تاریکی اور اپنی دلدلوں کی نمی کو بھول جاتے تھے۔ زراعت کے ساتھ ساتھ حرفت بھی ترقی پاتی گئی اور اُن کے پاس نہ صرف زمین جوتنے کے آلات تھے بلکہ بیل گاڑیاں عمارتیں اور گھر کا سامان بھی تھا۔

اِس کا ہمیں پورا علم نہیں کہ وہ دھاتوں سے کب اور کیونکر آشنا ہوئے + لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ
۲۰۰۰ ق م سے قبل وہ ان سے واقف ہو چکے تھے اور واقفیت کا سبب یقینی طور پر جنوب کے تمدن سے راہ و
رسم کا پیدا ہونا تھا + جب انہوں نے ہندوستان بابل شام ایشیائے کوچک اور بلقان پر یورشیں کیں تو اُن کے
سپاہی کاٹنے کے ہتھیاروں سے مسلح تھے + جب انہوں نے (۱۱۹۴ ق م کے قریب) ٹرائے کا محاصرہ کیا تو اُن کے
پاس لوہے کے ہتھیار بھی تھے اور یہی اُن کی کامیابی کا بڑا سبب ہُوا + اُن کی طرزِ حکومت پدرسری تھی۔ مذہب کے
معاملے میں وہ جنوبی قوموں سے بہت کم وہم پرست تھے اور جہاں کہیں اُن کے ہاں مذہبی رہنما تھے اُن
کی طاقت بہت کم تھی + وہ قوائے فطرت کے پرستار تھے لیکن وحدانیت کی طرف اُن کا بہت میلان تھا
یعنی وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتے تھے جو سب خداؤں کا سردار تھا۔

نقلِ مکانی اور نو آبادیاں۔ ہندی یورپی لوگ اپنے اصلی وطن سے نکل کر استقلال کے ساتھ جنوبی
اطراف میں پھیلنے لگے۔ کب انہوں نے نقلِ مکانی شروع کی اور کیونکر مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کے وسطی میدانوں
میں پھیلے اس کا ہمیں علم نہیں + لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں تقریباً تین ہزار میل کے محاذ پر وہ ہندی سامی
اناطولی اور ایجیئن ملکوں کی متمدن جماعتوں پر حملہ آور ہونے لگے + ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آریائی شاخ بحیثیت
ایک جماعت کے کچھ عرصہ ترکستان میں (بحیرۂ خوارزم) اور ہندوکش کے پہاڑوں کے درمیان سکونت پذیر رہی
اور بعد میں دو فریقوں میں تقسیم ہوگئی جس میں سے ایک ہندوستان کے شمالی میدانوں میں آبسی اور دوسری جس میں
سے بعد کے کاسی ایلمی (دوزی)، میدی اور ایرانی نکلے ایران کی بلند سرزمین میں جا آباد ہوئی۔

اس سے مغرب کی طرف بحیرۂ (اخضر)، کوہِ قفقاز اور بحیرۂ افشین کی رکاوٹیں ہندی یورپی پیش قدمی کے
رستے میں حائل ہوئیں لیکن بتدریج ۲۰۰۰ سے ۱۰۰۰ ق م تک کی ہزار سالہ مدت میں وہ اِن حدود کو عبور کر گئے یا
اُن کے اطراف سے گھس آئے۔ متانی ہلالِ شاداب میں اور شام کے شمالی حصّے میں بالائی فرات کے ساتھ ساتھ
فاتحین بن کر بس گئے۔ ارمنی اُس بلند سرزمین پر جا ڈٹے جو اُن کے نام سے مشہور ہوئی اور فریجی اور لیدی اناطولیا
کے ہیٹیوں پر چڑھ آئے یہاں تک کہ ۱۲۰۰ ق م میں اُن کو قطعی مغلوب کر لیا +

اس سے پرے ڈینوب کے علاقے سے یونانیوں کے آبا و اجداد استقلال کے ساتھ بحیرۂ یونان
کے ساحلوں کی طرف بڑھ رہے تھے + پہلے اکائیوں نے الیریا سے اُتر کر تھیسلی میں ڈیرے ڈال دیئے جہاں کوہ
اولمپس اُن کے خداؤں کا مسکن بنا + پھر دورانیوں نے ۱۱۰۰ ق م کے قریب ایک فوری اور زبردست یورش

کے بعد جزیرہ نمائے پیلوپونیسس پر قبضہ جمالیا اور سمندر پار ہو کر مجمع الجزائر کے جزیروں پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ انکے بعد ۱۲۰۰ ق م کے قریب یہ آئیونی اور ۱۰۰۰ ق م کے قریب ایولی آپہنچے یہ لوگ مل کر نہ صرف بحیرہ یونان کے یورپی بلکہ ایشیائی ساحل پر بس گئے یہاں تک کہ منوئی تمدن کا سارا علاقہ اُن کے قبضے میں آگیا۔

ان سے بھی پرے ڈوبتے ہوئے سورج کی سمت جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے لاطینی اور دیگر متعلق قومیں اطالیہ میں گھس رہی تھیں اور اُن ملکوں میں جنہیں اب ہسپانیہ اور فرانس کہتے ہیں کلتی آباد ہو رہے تھے

چھٹی صدی ق م کا خاص زمانہ - اس طرح ۲۰۰۰ ق م سے کچھ پہلے بغیر اعلانِ جنگ کئے اور ایک وسیع محاذ پر جو بالآخر پنجاب سے لیکر بحرِ اوقیانوس تک پھیل گیا جنوب کے آباد لوگوں اور شمال کے اُن حملہ آوروں کے درمیان ایک ہیبت ناک لڑائی ٹھن گئی۔ یہ جنگ فی الحقیقت عظیم الشان تھی اور اگرچہ لڑنے والوں کو اس کے نتائج سے آگاہی نہ تھی اور یہ پندرہ سو سال تک (بغیر کوئی اہم واقعہ ہوئے) جاری رہی لیکن انسانی نسل کی ساری آیندہ تاریخ اِس کے ساتھ وابستہ تھی۔ ہندی یورپی حملہ آور اس جنگ میں مل کر کسی خاص تدبیرِ حرب پر متفق نہ ہوئے تھے اُن میں کے مشرقی حملہ آور غالباً وسطی حملہ آوروں کی ہستی سے بھی بے بہرہ تھے اور جو وسط میں تھے وہ مغربیوں کی پیش قدمی سے قطعی آگاہ نہ تھے۔

البتہ آخر کار اس وسیع محاذ کے وسط میں ایک اہم اور زبردست جنگ شروع ہو گئی جو واقعی دلچسپ تھی۔ دوآبہ اس کی کارزار قرار پایا اور متخاصمین ایک طرف آریہ اور دوسری طرف سامی تھے۔ اول اول میدی (جو ۷۰۰ ق م کے قریب آشوری حکمرانی سے نکل چکے تھے) پہاڑوں سے اُتر کر بابلیوں اور مصریوں کے ساتھ ملے اور جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں اُن لوگوں نے نینوا کی ظالمانہ سلطنت کا ۶۰۶ ق م میں قلع قمع کر دیا۔ پھر ایرانی ایران کی سطحِ مرتفع سے نیچے اُترے انھوں نے بابل کے شہر پر قبضہ کر لیا اور ۵۳۸ ق م کے بعد سلطنت کے مالک بن بیٹھے۔ اس بغایت اہم واقعہ کی تفصیل پر ہمیں ابھی نظر ڈالنی ہے۔

لیکن اس سے پہلے اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ یہ وہ وقت ہے جب ہم تاریخ کے ایک نہایت واقعہ خیز زمانے میں پہنچ چکے ہیں۔ چھٹی صدی ق م سے تمام تحریکات کا رُخ حال کی جانب ہو گیا۔ اب نہ صرف ہندی یورپی لوگ سامیوں کی بجائے انسان کے رہنما بن گئے بلکہ بہت سے زبردست اثرات چار دانگِ عالم میں رونما ہوئے۔ چین میں چھٹی صدی کنفیوشس کا زمانہ ہے ہندوستان میں بدھ کا۔ یہودی تاریخ میں یہ قید کا زمانہ ہے اور اشعیا کا اور ایک عالمگیر مذہب کے خیال کے ارتقا کا دور بھی ہے۔ یہی وہ صدی ہے جس میں یونان اپنی قوت اور

اپنے مقدر کو سمجھ گیا۔ وہ زمانہ جس میں یونانیت نے سربلند کیا + روما کی تاریخ میں یہ وہ صدی ہے جس میں اٹرسکی استبداد کا خاتمہ ہؤا بادشاہ ملک بدر ہوئے اور وہ شہرۂ آفاق جمہوریہ قایم ہوئی جس کا مستقبل غایت درجہ شاندار ہونے والا تھا + سچ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں اس صدی کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ بعد میں ملی!

۱۲

ایران

میدی اور لیدی - اشوریا کے زوال اور ۶۱۲ ق م میں نینوا کی تباہی سے میدی اپنے بادشاہ ساؤش کے تحت میں مشرق کی سب سے زبردست طاقت بن گئے + یہ اغلب ہے کہ مشہور کلدانی بادشاہ بخت نصر ثانی بھی جو نئی بابلی سلطنت کا فرمانروا تھا وہ اس میدی بادشاہ کا جس کا صدر مقام ایران کی بلند سرزمین کے شمال مغرب میں ہمدان تھا باج گذار تھا + میدیوں نے اشوریا کی قلمرو کو ارمنی پہاڑوں کی حد تک فتح کر لیا تھا اور قفقاز تک آرمینیا بھی اُن کے زیر اثر تھا۔ اُس کے پرے اُنہوں نے ہتیوں کے ملک ایشیائے کوچک میں دریائے ہیلیس تک اپنی حکومت کو وسعت دی جہاں ایک نئی طاقت نے اُن کی روک تھام کر دی؛

یہ نئی طاقت وہ لیدی سلطنت تھی جس کا دارالسلطنت بحیرۂ یونان کے ساحل پر مقام سارڈس تھا اور جس کی مشرقی حدود دریائے ہیلیس اور کوہ طارس تھے + ہم دیکھ آئے ہیں کہ ایشیائے کوچک نبرھویں صدی میں ابھی ہتیوں کا ملک تھا جو مشرق میں اشوریوں اور مغرب میں فریجیوں اور لیدیوں سے ڈر کر مصر سے اتحاد پیدا کرنے کی فکر کر رہے تھے + یہ اتحاد بے سود نکلا + ہم نہیں جانتے کہ اُس کا انجام کیونکر ہؤا لیکن اُن کے دارالسلطنت (موجودہ بوغازکی) کے مقام پر آتش و غارت کے نشانات اور معاصرانہ تاریخوں میں اُن کے مفقود الخبر ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۰۰ ق م کے بعد جلد وہ تباہ کر دیئے گئے + فریجی اناطولی سرزمین میں آباد ہو گئے اور لیدی ساحل ایجیئن پر جہاں انہوں نے منوئی تمدن اختیار کر لیا +

فریجیوں کو تو سیمیریوں یا سیتھیوں نے جو قفقاز اور بحیرۂ اسود کے پرے سے کسی غیر مہذب خطے کے ہندی یورپیوں میں سے تھے ۶۵۰ ق م کے قریب تباہ کر دیا + جب یہ حملہ آور لوٹے تو لیدی آدھمکے اور انہوں نے

غارت شدہ ملک پر قبضہ جما لیا + یہ ایک ہوشیار اور شائستہ قوم تھے جنہوں نے ایجئین اور دوآبہ کے درمیان تجارت کا سلسلہ قائم کرکے اُس سے فائدہ اُٹھایا۔ ممکن ہے کہ انہیں لوگوں نے پہلے پہل سکہ رائج کیا + ان کی سڑکیں اور ان کے اردگرد کارواں سرائیں دنیا بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں +

ایرانیوں کی آمد۔ چھٹی صدی ق م کے نصف اول میں اُس زرخیز اور مالامال خطے پر جو بحیرۂ یونان اور خلیج فارس کے درمیان واقع ہے لیدیا میدیا اور کلدانی بابل اور سلیسیا کی ایک چھوٹی سی خودمختار ریاست کا قبضہ تھا لیکن اُن کی طاقت بلکہ اُن کی خودمختاری بھی دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔

میدیوں کے جنوب کی طرف ایرانی سطح مرتفع پر (جس کے صدر مقام اصطخر اور پسرگادی تھے) اُن کے ایک ہم نسل اور برائے نام اُن کے باجگذار کچھ لوگ رہتے تھے جنہیں پارسہ یا پارسی کہتے تھے + یہ لوگ مضبوط وجری تھے اور ابھی اُن میں وہ ابتدائی سادگی اور راستبازی پائی جاتی تھیں جو میدیوں میں بوجہ بابل کے عیش وعشرت سے روشناس ہونے کے مفقود ہوچکی تھیں + وہ زراعت کے کٹھن کام میں مصروف رہتے تھے اور انہوں نے صحرا کے قرب وجوار کو جہاں وہ آباد تھے اپنے صبر وتوانائی سے گلزار بنا دیا تھا + وہ اپنے اس اہم کاروبار کو ایک مذہبی فرض گردانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسا کرنے میں وہ تاریکی وموت کے خلاف ضیا وحیات کی لڑائی لڑ رہے ہیں + خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں لوگوں کے ہاں ۱۰۰۰ اور ۸۰۰ ق م کے درمیان ایک مشہور ومعروف رہنما پیدا ہوا جس نے اس روحانی جنگ کے خیال کو ایک نئے اور اعلیٰ مذہب کا سب سے بڑا اصول قرار دیا۔ اُس نے صرف ایک خدائے مطلق اہرمزد یا ارمزد کا اعلان کیا جو صداقت وضیا وحیات کا مالک ہے۔ لیکن خدا کے برخلاف اہرمن (جسے یہودیوں نے بعد میں شیطان پکارا) تاریکی بدی اور موت کا مالک تھا جو ازلیت اور بقا میں اُس کا ہمسر تھا انسان کی ساری زندگی اور بالخصوص روحانی زندگی کو زرتشت نے اسی عظیم الشان جنگ کے سلسلے کی ایک کڑی ظاہر کیا +

چھٹی صدی کے شروع میں زرتشت کے ایرانی پیروؤں نے ملک ایلم پر اپنا اقتدار جمایا اور وہاں کے دارالسلطنت سوس کو اپنی قوت کا مرکز بنا دیا + ۵۵۳ ق م میں جب اُن پر ایک غیرمعمولی قابلیت کا فرمانروا جسے تاریخ میں کیخسرو کہتے ہیں حکمران تھا تو اُن کی اپنی حکمران قوم میدیوں کے بادشاہ افراسیاب سے لڑائی چھڑ گئی + انہوں نے باجگذاری کا طوق اپنی گردنوں سے اتار پھینکا بغاوت کرکے میدیوں کو شکست دی اُن کے شاہی خاندان کو تخت سے اُتار دیا اور میدی سلطنت کو ایک ایرانی سلطنت بنا کر کیخسرو کو اُس کا شہنشاہ

قرار دیا۔ اصطخر اور سوس کے ساتھ ہمدان بھی ایرانی حکومت کا صدر مقام ہوگیا۔

کیخسرو اور لہراسپ - کیخسرو اور اُس کے ایرانیوں کے آن کی آن میں قوی و طاقتور ہو جانے سے مشرق کی دوسری طاقتوں میں ایک سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ لیدیا کے حاکم نے اس نو دولت بادشاہت کے خلاف ایک جتھا بنانے میں پہلا قدم اُٹھایا - بابل کے مدار المہام بلشزار نے اس کی داد دی اور پھر اماسس شاہ مصر اور یونان کی بعض شہری ریاستیں بھی شامل ہوگئیں۔ سائرس نے اُن کے حملے کا انتظار نہ کیا - بلکہ اُس نے اپنی فوجیں مجتمع کر کے سیدھا ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور دریائے ہیلس کو عبور کر کے لیدیا میں جا دھمکا جہاں اُس نے سارڈس کی فصیل شہر کے عین نیچے کریسس کو فاش شکست دے کر وہاں کے فرمانروا کو قید کر لیا (۵۴۶ ق م)

لیدی سلطنت ایرانی قلمرو میں شامل کر دی گئی جس کا یہ اہم نتیجہ ہؤا کہ ایشائی ساحل کے یونانی شہر لیدی قبضے سے نکل کر ایرانی گرفت میں آگئے۔ کیخسرو دوسرے اتحادیوں کی سرکوبی نہ کر سکا کیونکہ اُس کے مشرقی علاقے پر عین اسی وقت میں سیدینوں (تورانیوں) نے چھاپہ مارا۔ ۵۴۵ سے ۵۳۹ ق م تک کے چھ برس ان لوگوں کی روک تھام اور شمال مشرق میں دریائے جیحوں (سر دریا) سے لے کر جنوب مشرق میں دریائے سندھ تک کے وسیع اور مختلف النوع علاقے میں ایرانی رعب و داب قائم کرنے میں صرف ہوگئے۔

ادھر سے فراغت پا کر ۵۳۸ ق م میں اُس نے بابل کا رخ کیا ایک ہی یلغار میں نہایت آسانی کے ساتھ اُس نے وہ عظیم الشان شہر سر کر لیا اور اُس کے کلدانی شاہی خاندان کو تخت سے اتار کر بابل کی قلمرو کو جو مصر کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا۔ اُن لوگوں میں جو اُس کی رعایا تھے یہودی بھی تھے جو ۵۸۶ ق م سے جب بخت نصر نے یروشلم کو تباہ کر دیا تھا "بابل کے ندی کنارے" اپنی جلاوطنی کے دن کاٹ رہے تھے۔ اُس نے فوراً کلدانی حکمت عملی کو تبدیل کر دیا اور اُن جلاوطنوں کو واپس اپنے وطن بھیج دیا کہ جا کر اپنے شہر اور معابد بنائیں اور اپنے مذہب کو از سر نو ترتیب دیں۔ (۵۳۷ ق م)

قدیمی دنیا کی بڑی سلطنتوں میں سے صرف ایک مصر باقی رہ گیا۔ اس میں بھی اب اتنی ہمت نہ تھی کہ لیدیا اور بابل کے فاتح کا مقابلہ کرتا لیکن سیدی سرحد پر پھر شور و غوغا برپا ہو جانے سے وہ بارہ تیرہ سال تک بچا رہا۔ کیخسرو کو پھر شمال مشرقی سرحد پر جانا پڑا تھا جہاں ۵۲۹ ق م میں وہ دریائے جیحوں کے قریب راہئ عدم ہؤا۔ مصر کی فتح اُس کے مشہور بیٹے لہراسپ (۵۳۹ تا ۵۲۱ ق م) کا کام تھا جس کے عہد میں ایران کی قلمرو نے ایسی وسعت و عظمت پائی جیسی اس سے پہلے کسی مشرقی شاہنشاہ کو نصیب نہ ہوئی تھی (۵۲۵ ق م)

دارا اور اُس کی سلطنت - لہراسپ کی بے وقت موت کے بعد کچھ عرصہ بحل اور خانہ جنگی میں گذرا - لیکن ۵۲۱ ق م کے ختم ہونے سے پہلے گستاشپ کے بیٹے دارا نے جو گذشتہ بادشاہوں کا ایک دور کا قرابت دار تھا تخت پر قبضہ کر لیا - اُس نے اس وسیع قلمرو پر چھتیس سال (۵۲۱ سے ۴۸۵ ق م تک حکومت کی اور حکومت بھی نہایت غیر معمولی قابلیت اور کامیابی کے ساتھ کی - بہت سی حیثیتوں سے ایران کا نظم ونسق جو اُس کے عہد میں منضبط ہؤا اُس وقت تک دنیا کی تاریخ میں قطعی بے نظیر تھا - بالخصوص دو باتوں میں وہ آشوری طرز حکومت سے جس پر اُس کی بنیاد قائم کی گئی سبقت لے گیا - اول یہ کہ اُس کی تنظیم کا مقصد جنگ نہ تھا بلکہ صلح - اُس کا دار و مدار لوٹ مار پر نہ تھا بلکہ تجارتی کاروبار پر - آشوریوں کی سی سالانہ یورشیں جن سے مشرق کے لوگ کانپا کرتے تھے اُس کا معمول نہ تھا - دوسرے یہ مذہب کے معاملے میں رواداری تھا - اس کا اپنا بلند ایمان سب مغلوب قوموں کے مذاہب میں کوئی نہ کوئی اچھی بات دیکھ لیتا تھا - جیسا یہودیوں کی طرف اس کا رویہ تھا ویسا ہی ساری رعایا کی طرف تھا -

ایرانی سلطنت متفقہ اصول پر منتظم تھی - وہ بیس صوبوں میں منقسم تھی اور ہر صوبے میں شہنشاہ کا مقرر کردہ ایک صوبہ دار مقامی دستور کے مطابق تقریباً خود مختاری کے ساتھ حکومت کرتا تھا - مرکزی حکومت کی طرف اُس کے فرائض یہ ہوتے تھے کہ وہ تجارت کی راہیں کھلی رکھے - امن کا ذمہ دار ہو اور باقاعدہ طور پر خراج ادا کرتا رہے - سلطنت کے دور دراز حصوں تک اعلیٰ درجے کی سڑکوں سے رسائی ممکن تھی - بالخصوص وہ شاہراہ جو سارڈس سے اناطولیا اور آرمینیا کو طے کرتی ہوئی سوسہ گئی تھی دنیا کا ایک اعجوبہ تھی - جس طرح یہ بات ایرانیوں نے لیدیوں سے سیکھی اُسی طرح اُن سے فلزاتی سکّے کا رواج بھی سیکھا اور اُس کو ایسی ترقی دی کہ تجارت خوب پھولنے پھلنے لگی - تجارت ہی کی وجہ تھی کہ فنِ تحریر زیادہ سادہ ہوگیا - بحری تجارت نے بہت نشو ونما پائی - دارا افریقہ میں سائیرین سے لے کر ایجیئن میں سمرنا تک کے سارے لیوانتینی ساحل کا فرماں روا تھا - مصریوں فنیقیوں لیدیوں اور یونانیوں سب کے جہاز اُس کے ایک اشارے پر ادھر سے اُدھر چلتے تھے -

لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا ایشیائے کوچک کے یونانی ایرانیوں کی حکومت کے نیچے بے چین ہوتے گئے - پانچویں صدی ق م کے شروع ہی میں اُنہوں نے کھلی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا - یہ وہ بغاوت تھی جس کے نتیجے دنیا کی تاریخ کے لئے غایت درجہ اہم اور معنی خیز تھے - اب ہم اُن کی کارروائیوں اور ترقیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں"

(ترجمہ) **بشیر احمد**

حکمیات

پہلے ظرفِ نگاہ پیدا کر
پھر بقدرِ نظر تقاضا کر

گفتگو چھوڑ دے نظر پہچان
ہوش کو روشناس ایما کر

شکوۂ شش جہت بجا لیکن
کبھی اپنی طرف بھی دیکھا کر

باہمہ ہوکے بے ہمہ کی تلاش
ہوکے تنہا تلاشِ تنہا کر

ذرّے کی کائنات دیکھتا ہے
ذرّے سے کائنات پیدا کر

ہے بہار، اتحادِ خار و گل
دوست دشمن سے ربط پیدا کر

اذنِ سجدہ ہے خود نشانِ قبول
اے جبینِ نیاز! سجدہ کر

کامیابی بقدرِ ہمت ہے
اپنی کوتاہیوں کا شکوہ کر

غنچۂ ناشناس! آنکھ تو کھول
دیکھ رنگِ چمن، تماشا کر

ذوقِ توحید اور پریشانی
خاطرِ منتشر کو یک جا کر

ظرف اپنا دکھا دیا تو نے
بات بھی کھوئی ہاتھ پھیلا کر

ہاتھ مخلوق سے اُٹھا گویاؔ
خالقِ پاک پر بھروسا کر

شفق

ہیں احمریں شعاعیں زیرِ سحابِ سیمیں
یا پردۂ سما میں اک التہابِ رنگیں
یا دن نے سرخ جوڑا بدلا ہے بہرِ تزئیں

یا دامنِ افق میں کچھ پھول ہیں گلابی
یا گلشنِ شفق میں کچھ پھول آفتابی
یا ماہتابیوں میں اک جلوۂ شہابی

یا پردۂ شفق میں فردوسِ آسماں ہے
یا ابرِ ارغوانی میں بادۂ جناں ہے
یا مژدۂ مسرّت یا شام کا سماں ہے

گویاؔ جہان آبادی

مرزا نبّو

مرزا نبّو (ماں باپ نے تو نواب علی نام رکھا تھا مگر شہر بھر کی بے تکلفی ماں، باپ کے تکلف کو آسانی سے برطرف کردیتی ہے) تباہی کی کشادہ شاہراہ پر اچھی خاصی مسافت طے کرچکے ہیں۔ ڈگریاں، قرقیاں، نیلامیاں، گرفتاریاں یکے بعد دیگرے اُن کے ساتھ اپنے تپاک کے اظہار سے محظوظ ہوچکی ہیں اور وہ بلائے بدجو دنیا کے سو کام میں حارج ہوتی ہے اور جس کا نام عزت ہے مدتوں پہلے مرزا نبو کے برہنہ پاؤں سے ٹھکرائی جاچکی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مرزا نبّو تو اب بھی اپنے آپ کو ہمیشہ "عزت دار آدمی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں مگر دنیا کو اُن سے چنداں اتفاق نہیں اور بعض مجسٹریٹوں کی ہٹ دھرمی سے مرزا کا آخری معزز کمائی کا ذریعہ (ایک روپیہ فی گواہی) بھی اب مخدوش حالت میں ہے اور مرزا اس فکر میں ہیں کہ ہو تو کسی چلتے پرزے تھانیدار کی چلیں بھرنے کی رضاکاری اختیار کریں۔ سوجھتی انہیں خوب ہے اور اس میں شک نہیں کہ کسی کپتان پسند تھانے دار کی بلا تنخواہ نوکری میں علی بابا والے غار کے رازِ نہاں ہوسکتے ہیں مگر پیشتر اس کے کہ مرزا کچہری کی دنیا سے رحلت کریں اُن کے چند کارناموں کا ذکر ضروری ہے۔

ایک دن مرزا نبو کسی مقدمے میں شہادت کے لئے عدالت میں پیش ہوئے تو وکیل فریق ثانی نے اُن کی صورت دیکھتے ہی افسر جلیسی کی خدمت میں عرض کیا کہ مرزا کا کوئی پیشہ نہیں یونہی موقع بے موقع کرایہ پر گواہی دیتے پھرتے ہیں۔ مرزا کا یہ وصف ہمیشہ سے رہا ہے کہ کوئی بات کرتا ہو تو درمیان میں نہیں بولتے۔ جب وکیل صاحب مرزا کے برخلاف اپنی فصاحت کا دریا بہا چکے تو مرزا عدالت سے ملتجی ہوئے کہ مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔

عدالت۔ کہو۔

نبّو۔ حضور اس عدالت کی تو شان ہی الگ ہے اور میری کیا مجال کہ وکیل صاحب کی طرح کوئی ناشائستہ بات کہوں مگر یہ بالکل غلط ہے کہ میرا کوئی پیشہ نہیں۔

عدالت۔ وَل تمہارا کیا پیشہ ہے؟

نبّو۔ حضور خفا نہ ہوں تو بالکل سچ بتادوں۔

عدالت - دل جلدی بولو

نبّو - غریب پرور جس طرح بعض عدالتیں وکیل پرور ہیں اسی طرح میں بھی وکیل پرور ہوں - دو ہزار سے زیادہ روپیہ وکلا کو فیسوں کا دے چکا ہوں - کیا وکیل پرور ہونا کوئی بُری بات ہے آخر وکیلوں کے ماں باپ بھی تو اُن کو پلتے ہیں - اور حضور سب کے ماں باپ ہیں -

عدالت - تم گستاخ آدمی شریر ہے -

نبّو (وکیل کو مخاطب کر کے دبی زبان سے) اب جواب دیجئے نا اِس بات کا -

اِس پر جو فرمائشی قہقہہ عدالت میں ہوا اُس کا برسوں ذکر رہے گا - اُس روز دور دور سے لوگ مرزا کو دیکھنے آئے - وہ وکیل صاحب سارا دن منہ چھپاتے پھرے - ایک اور موقع پر ایک پٹواری زادہ وکیل مرزا نبو سے تن تن کرا لٹے سیدھے سوال کر رہا تھا - خرانٹ مرزا تاک میں تھا کہ موقع ملے تو بدلہ لوں آخر وکیل صاحب گرج کر بولے -

وکیل - کتنا فاصلہ تھا ؟

نبّو - تخمیناً پچاس گز

وکیل - ٹھیک یاد ہے کہ تخمیناً ساٹھ گز نہیں تھا -

نبّو - آپ کا اختیار ہے پچاس کو ساٹھ کہئے مگر میں تو پٹواری سے پُوچھ کر آیا ہوں، اس نے پچاس گز بتایا تھا -

وکیل - پٹواری تمہارا دوست ہے ؟

نبّو - حضور پٹواری کا کام ایسا ہے کہ بیٹے کو اپنا نہیں بناتا، مجھے کیا دوست بنائے گا ؟

وکیل صاحب عدالت میں تو بات ٹال گئے مگر وکیلوں کے کمرے میں دوستوں نے اُن کے خوب لتے لئے -

ایک اور موقع پر مرزا کی گواہی کے دوران میں اُن سے سوال کیا گیا کہ کیا ملزم کی مقتول سے دشمنی تھی ؟

نبّو - تھی -

عدالت - کیوں ؟

نبّو - عورت کے سبب سے -

عدالت - کون عورت ؟

نبّو - مسماۃ طوائف

عدالت - کیا دونوں کی دوستی تھی ؟
نبّو - حضور دوستی کے سبب سے دشمنی نہ تھی، وہ تو دونوں کو جوتے لگاتی تھی -
عدالت - پھر کیا دشمنی تھی ؟
نبّو - حضور وکیل صاحب کو مساۃ طوائف کے گھر کے سب حال کا پورا علم ہے - ان سے دریافت کرلیں
عدالت - (جھڑک کر) تم سیدھا جواب دو جو تم کو علم ہے -
نبّو - حضور دونوں نے مساۃ طوائف کے حق میں جھوٹی شہادت دی مگر مساۃ طوائف مقدمہ ہار گئی - ان دونوں کی آپس میں تکرار ہوگئی وہ کہتا تھا کہ تیری شہادت نے مقدمہ خراب کیا وہ کہتا تھا کہ تیری شہادت نے کام بگاڑا -
عدالت - اِن لوگوں نے جھوٹی شہادت کیوں دی ؟
نبّو - کسی وکیل کے کہنے پر -

بات بالکل سچ تھی اور مرزا کے منہ سے بے تکلف نکلی اور مرزا اپنی لیاقت سے "کسی" کا لفظ ایسی موزوں طرح چسپاں کرگیا کہ عدالت اُس کے سر نہ ہوسکی اور ملزم کا وکیل گویا کٹ کر مرگیا - عدالتوں میں بہت دن "کسی وکیل" کے معنی ایک خاص وکیل رہے -

وکلا کے ساتھ تو میرزا کے یہی تین مشہور معرکے ہیں مگر چھوٹے اہلکاروں پر تو مرزا کے سترہ حملے زبان زد ہیں - صرف ایک کا ذکر کافی ہے -

ایک جدید کرنیل ڈپٹی کمشنر جس کو رعایا "موتیوں والا" کے لقب سے اب تک یاد کرتی ہے کچہری سے اُٹھنے کو تھا کہ اردلی نے حسب معمول آواز دی "چلو عرضی سوال والا" مرزا نبو یہ سُن کر بڑھے -

کرنیل صاحب - ویل کیا ہے ؟
نبّو - حضور کیا آپ کے سامنے کسی اہلکار کی جھوٹی شکایت کرنے سے مجھے قید کی سزا ہوسکتی ہے -
کرنیل - ضرور ہوگی، اگر شکایت جھوٹی ہوگی -
نبّو - اور اگر جھوٹی نہ ہوئی تو کیا اہلکار کو سزا ہوگی ؟
کرنیل - تم بکو - جلدی بکو - تمہارا کیا مطلب ہے ؟
نبو - حضور میں شکایت کرتا ہوں - آپ چل کر دیکھ لیجئے -

کرنیل۔ کدھر؟

نتھو۔ صرف پچاس گز۔

خدا جانے نتھو اور کرنیل کے درمیان کوئی سمجھوتا تھا یا کیا بات تھی مگر کرنیل صاحب نتھو سے کہنے کہ "اچھا تم آگے آگے چلو"۔ نتھو کرنیل کو سیدھا خزانچی کے کمرے کی طرف لے گیا اور کمرے کے عین باہر جا کہنے لگا کہ حضور اس کی گدی کے نیچے جھوٹے سکے درجنوں رکھے ہیں۔ جو رشوت نہ دے چالاکی سے اُ روپے بدل دیتا ہے اور پھر روپے کٹوا دیتا ہے۔

کرنیل صاحب نے فوراً بلا تامل گدی کو الٹ دیا۔ نیچے سے بیس روپے سے زائد جھوٹے روپے نک خزانچی کا وہ گماشتہ تو موقوف ہؤا اور مرزا کو کرنیل صاحب نے خوشنودیٔ مزاج کا پروانہ دیا۔ مگر آج کے ڈپٹی کمشنر مرزا کی نظروں میں کم جچتے ہیں۔ ہمیشہ کہا کرتے ہیں "اگلے حاکم بڑے نرحاکم تھے"۔

فلک پیما

غزل

نور کو ظلمت کے پردے میں نہاں پاتا ہوں میں
ذرّے ذرّے میں نشانِ بے نشاں پاتا ہوں میں

عشق سے پہلے بھی یہ گھر بس کے اُجڑا ہے کبھی
دامنِ عقل و خرد کی دھجیاں پاتا ہوں میں

آشیں میں مرے آرام کر شوریدہ سر
تیری ہر حرکت میں پنہاں بجلیاں پاتا ہوں میں

کیا تعجب ہے بہار آجائے گلشن میں مرے
پتّے پتّے کو خزاں کا رازداں پاتا ہوں میں

کیا مرے نالوں میں بھی تاثیر پیدا ہوگئی
اُن کی شرمندہ "نہیں" میں ضبطِ "ہاں" پاتا ہوں میں

اُٹھ کہ اب شاید گناہوں کی سیاہی دھو سکیں
سامنے رحمت کا بحرِ بیکراں پاتا ہوں میں

بار بار اعجاز آتا ہے جنوں پر طیش سا
راستہ بھولے ہوئے جب کارواں پاتا ہوں میں

اعجاز ساندوی

انتظار

(گیت ۴۷ گیتانجلی)

ہجر کی رات بدستور کٹی جاتی ہے — جاگتے جاگتے پھر صبح ہوئی جاتی ہے
آہ اُمید! کہ اب بھی نہیں سونے دیتی — مجھ کو مایوس بھی ظالم نہیں ہونے دیتی
دل یہ کہتا ہے کہ کیا ہو جو کوئی آ جائے — اور سوتا ہُوا دیکھے تو تجھے شرمائے
در کھلا چھوڑ دو سوتا ہوں تو سو جانے دو — کوئی آ جائے تو روکو نہ اُسے آنے دو

پائے نازک کی صدا گر نہ جگانا چاہے — اور پازیب کی جھنکار سُلانا چاہے
ہمدمو تم بھی خدارا نہ جگاؤ مجھ کو — اور اس خوابِ گراں سے نہ اُٹھاؤ مجھ کو
ہیں پرندوں کے خوش آئند ترنم بے کار — اور نسیمِ طرب افزا کے تراکم بے کار
میں نہ جاگوں گا مری نیند پریشاں نہ کرو — آہ! اتنا تو مجھے اُس سے پشیماں نہ کرو

اے خوشا وہ مری نیندیں وہ مری بیہوشی — اُس کے چھونے پہ جو قرباں ہوں بصد خاموشی
اے خوشا وہ مری جاگی ہوئی آنکھیں پُرخواب — جو کسی نورِ تبسم کے لئے ہوں بے تاب
صرف وہ نورِ تبسم جو کسی چہرے سے — آفتابِ شفقی رنگ کی صورت نکلے
اور تاریکیٔ غمخانہ کو یوں دُور کرے — جس طرح خوابِ صنم نیند کو پُر نور کرے

میری آنکھوں میں وہی نور سما جانے دو — اور دل میں وہی تصویر اُتر آنے دو
صبح دم آنکھ کھلے تو وہی صورت دیکھوں — چڑھتے سورج میں وہی موہنی مورت دیکھوں
اسی نظارۂ دل کش سے محبت بن کر — ایک طوفان اُٹھے موجِ مسرت بن کر
بے قراری ہو مری رُوح کی بیداری میں — اور ہیجانِ عمل ہو رگِ بے کاری میں

وندریں راز چنیں باخبرے گردم باز
بازگردم بمنازل کہ بخود جویم باز

(ٹیگور)

طالب باغپتی

(عثمان کا خط اپنے دوست ریاض کے نام)

ریاض بھائی! چار سال کے بعد لندن سے تمہارا پہلا اور غالباً آخری خط ملا۔

اِس خط کو لکھتے ہوئے تمہارے دل میں ایک شادان و فرحاں شریف النفس انسان کا تصوّر ہوگا لیکن زمانے کی گردش دیکھو کہ بالکل اِس کے برعکس یہ خط ایک ذلیل اور تباہ و برباد انسان کو ملا۔ شاید تم کبھی اندازہ نہ کرسکو کہ اس خط نے ایک منفعل روح، ایک پشیمان دل، اور ایک گناہ کے بار سے تھکے ہوئے دماغ پر کیا اثر کیا۔

تم مجھے میری کامیاب شادی اور اُس کے بعد میرے بچے کی پیدائش پر مبارک باد لکھتے ہو۔ آہ کس وقت تمہیں اس بات کا علم ہوا جب میں ہمیشہ کے لئے برباد ہوچکا تھا۔ اپنی زندگی کی تمام شادمانیاں میں نے خود اپنے ہاتھوں برباد کردیں۔ اپنا سب کچھ میں کھوچکا ہوں اور خواب کی طرح ایک دھندلی سی یاد کے سوائے اب میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

کالج کے زمانہ میں مَیں نے کئی دفعہ تم لوگوں کو مذاقیہ فریب دیئے۔ اور بعض اوقات تمہاری سخت اذیت کا باعث ہوا اُس وقت کسے معلوم تھا کہ آخر میں چل کر یہی فریب میری دین و دنیا کی رسوائی کا موجب ہونگے۔ اُف! میں نے اب بھی ایک فریب کیا اور آخر کار خود بھی فریب میں مبتلا ہوا۔ لیکن اس فریب نے مجھے میری مدتوں کی گہری نیند سے بالکل بیدار کردیا۔

یہاں تک میری تحریر سے تمہیں صرف حیرت ہوگی لیکن آگے آگے جو کچھ میں لکھنے والا ہوں اُسے پڑھ کر عنقریب تم بھی مجھے ایک ازلی شیطان تصوّر کرنے لگوگے۔ لیکن مجھے اس کا ذرہ بھر رنج بھی نہ ہوگا میں بہت رسوا ہوچکا ہوں اور اس سے کہیں زیادہ رسوائی کا مستحق ہوں میں نے محبت کے گلے پر کند چھری پھیر دی قسامِ ازل کے بہترین عطیہ کو میں نے پاؤں تلے روند ڈالا۔

تمہیں یاد ہوگا کہ تمہاری روانگی کے دنوں میں مرزا محمد عمر صاحب سب جج مرحوم کی صاحبزادی کی خواستگاری کے لئے اَن تھک کوششوں میں مصروف تھا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک میری اور تمہاری خط وکتابت بند

رہی۔ میں تمہیں رخصت کرنے تک نہ آیا۔ حالانکہ میرے اور تمہارے درمیان صرف چند گھنٹوں کا راستہ حائل تھا۔ لیکن میں اپنا کون کون سا عیب بیان کروں شاید میں دنیا میں سراپا عیوب بن کر آیا تھا اور اب ایک ابدی لعنت کا طوق گلے میں ڈال کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔

میری درخواست قبول ہو گئی اور چند ہفتے بعد نزہت آرا میرے گھر میں موجود تھی میں اپنی بیوی کے متعلق عجیب عجیب تصورات قائم کئے ہوئے تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک پیکر نور ہو گی جس کی برق پاش ضیا سے میری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اُس کے عادات و اطوار اُس کا ہر انداز اُس کی ہر حرکت اُن خیالی شہزادیوں کی سی ہو گی جو میں افسانوں کی زندگی میں دیکھ چکا تھا اور میرے دل کی اندرونی تہوں میں شاید یہ خیال بھی پوشیدہ تھا کہ اُس کی آمد سے میرے ادبیہ میں کوئی عظیم الشان ترقی ہو گی۔

ایک لحاظ سے میری یہ خواہشیں امید سے بڑھ کر پوری ہو گئیں۔ لیکن جانتے ہو جو چیز انسان کو مل جائے وہ اُسے نظر انداز کر کے اُس سے بڑی چیز کی ہوس میں مرتا ہے۔ پھر مجھ جیسا متلون المزاج انسان۔ خدا یا تیری پناہ۔ میں بالکل اس کی قدر نہ پہچان سکا۔ اُس کی ہر نظر سے میں محسوس کرتا کہ وہ مجھے ایک کامل انسان سمجھتی ہے۔ لیکن میں اُس کی زندگی میں اُسے ایک بار بھی وہ نہ سمجھ سکا جو کچھ وہ تھی۔ اُس کے ہر قابل تحسین فعل کو میں اپنے حسن سلوک کا نتیجہ سمجھتا رہا۔ جتنا عرصہ وہ میری شریکِ زندگی رہی کبھی مجھے شکایت کا موقع نہ ملا لیکن میری خود پسند طبیعت نے ایک دن بھی مجھے اجازت نہ دی کہ اُس کے کسی جوہر کی سچی داد دے سکوں۔ اُس کا اندازِ طبیعت عجیب پُر وقار اور سنجیدہ تھا وہ ہمیشہ خوش رہنا چاہتی تھی۔ میں نے کبھی نہ دیکھا کہ وہ کسی تکلیف دہ بات کو اپنے دل میں زیادہ جگہ دے کر ملول ہوئی ہو۔

میرا خط طویل ہو رہا ہے اور ابھی تک میں اصل حکایت سے بہت دور ہوں۔ ہاں میری تباہی کا آغاز یوں شروع ہوا۔

شام کے چار بجے میں اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اتفاقاً میری نگاہ ایک اشتہار پر پڑ گئی۔ یہ اشتہار ایک روشن خیال عالی خاندان، خوبصورت اور قابل لڑکی کے رشتہ کے لئے تھا۔ میں نے اُس بھوکے اور لالچی شخص کی طرح جو مٹھائی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہو اور کھانے کا مقدور نہ رکھتا ہو کئی بار اس اشتہار کو پڑھا۔ اور آخر اپنے دل کی اُلجھن مٹانے کے لئے یا خدا جانے کس خیال سے اخبار اُٹھا کر نزہت کے پاس جانے لگا۔ کاش کہیں چلا جاتا۔ یکا یک کسی نے باہر سے میرا نام لے کر پکارا

میں نے کہا "اکرم" جواب ملا "ہاں" میں نے کہا "چلے آؤ"۔ اکرم آتے ہی ایک صوفے پر دراز ہو گیا۔ میں نے کہا "اکرم! لو بھئی بڑا اچھا موقع ہے درخواست کر دو۔ اکرم نے اخبار میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر بولا "اوہ میں سمجھا" "مجھے بخوبی معلوم ہے" میں نے ذرا آگے بڑھ کر کہا "کیا کہا" اس نے کہا بھئی بہت بے قرار ہوئے جاتے ہو۔ لو سنو۔ یہ صاحب جن کی لڑکی کے لئے اشتہار دیا گیا ہے ایک بہت بڑے جاگیردار نوابی خاندان سے ہیں بے انتہا امیر، بے حد روشن خیال اور "حسین شخص ہیں" آخری لفظ پر اُس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا واللہ میں نے کہا واہ پھر دیر ہی کیا ہے لو اکرم تیار ہو جاؤ ہم اپنی ایک بھابی نوابی خاندان سے بھی لائیں گے۔ اکرم۔ جی نہیں یہ باتیں کچھ آپ جیسے امیروں کو ہی زیبا ہیں ہم غریب تو انگلوں کو ہی پورا نہیں کر سکتے۔ بس یہ سمجھ لو آدھی درجن بچوں میں تین ہی کی کمی باقی ہے۔ اب اُنہیں سنبھالیں یا اور کی فکر کریں۔ دوسرے میں غریب آدمی ہوں اور میری بیوی ہوئیں امرا سے مجھے ایسا کرنا کب لازم ہے۔

البتہ تم ہر طرح اس کے لائق ہو بیرسٹر ہو لاکھوں کی جائیداد کے مالک ہو۔ اور سب سے بڑھ کر بیوی کے مقابلے میں خاصی حیثیت رکھتے ہو۔ بچہ بھی خدا کے فضل و کرم سے اب تین سال کی عمر کے قریب ہے، ماں کے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ کہو لکھوں خط؟

میں۔ چپ رہو۔ ابھی کہیں خالد سُن پائے تو فوراً سب کچھ اپنی اماں سے جا کر بیان کر دے۔

اکرم۔ اور وہ تمہیں مار ڈالیں، بھئی واہ بیوی کا بڑا خوف ہے۔ لیکن آج تو ہم ٹلنے والے نہیں۔ یہ جگہ بالکل تمہارے لئے موزوں ہے۔ دیکھو نا۔ امارت بھی موجود ہے حسن بھی آزاد خیالی بھی علم بھی۔ کہو ان باتوں میں سے کونسی چیز کی کمی تم میں ہے؟

میں دل میں تو خوش ہوا لیکن ظاہرا سب سے انکار کرتا چلا گیا۔ اتنے میں خالد آ کر مجھے ایک واقعہ سنانے لگا۔ اُس میں اور آپا کی لڑکی میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نظر جو اٹھاتا ہوں تو اکرم کو کچھ لکھتے ہوئے پایا میں نے پوچھا "یہ کیا"؟ اکرم نے کہا ابھی دکھاتا ہوں۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد اُس نے مجھے ایک پرچہ خط سنانا شروع کیا جس میں میری طرف سے نواب کے سامنے رشتے کی درخواست کی گئی تھی۔ خط منگانے کا پتہ اُس نے اپنے مکان کا لکھا تھا۔ اور اُس میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ چونکہ بزرگ کوئی موجود نہیں اس لئے خود درخواست کی جاتی ہے۔ میں نے سن کر ایک بلند قہقہہ لگایا اور کہا "بھئی

خوب تم تو بڑے مکار نکلے تمہیں تو کہیں مشاطہ ہونا چاہیئے تھا۔" اُس نے کہا "دیکھئے آج ہی سے شروع کرتا ہوں"۔ اس کے بعد اُس نے میز پر رکھی ہوئی میری تصویر فریم سے نکال کر خط کے ساتھ لفافے میں بند کردی۔ میں نے بڑھ کر لفافہ اُس سے چھیننا چاہا لیکن وہ تیزی سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اب اگر میں چاہتا تو اُس کا تعاقب کرکے خط اُس سے چھین لیتا۔ لیکن شیطان کی روح نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ اور میں کرسی پر لیٹے لیٹے نوابوں کے خواب دیکھنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں نے اسی قسم کے منصوبے باندھنے میں صرف کردیا۔ اور پھر انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوُا۔ نزہت مجھے بلا رہی تھی۔ جو کچھ گذر چکا تھا میں نے اُسے وہیں چھوڑا اور اُٹھ کھڑا ہوُا۔

ایک ہفتہ کے بعد اکرم نے مجھے اپنے مکان پر بلایا اور ایک خط مجھے دیا۔ یہ خط نواب کے ہاں سے آیا تھا اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے قابلِ اطمینان تصور کرتے ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے کہا اکرم بھئی اب کوئی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے لیکن تم نے تو یہ ثابت کردیا کہ نوابوں کی بھی ہم پر رال ٹپک سکتی ہے۔ اُس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھ کر کہا نتیجہ نہ نکلنے سے کیا مطلب؟ اب ان بھلے آدمیوں کو دھوکا دوگے کیا؟ میں نے کہا اور کیا کروں؟ بیوی کو کہاں رکھوں۔ اکرم۔ "اُف تم بھی کیسے خفقانی ہو اب بیوی کا سوال لے آئے۔ اُن بیچاری کا کیا ہے دو بھائی ہیں وہ بھی منجمد اور بے حس، ہزاروں کی جائداد چھن گئی لیکن خدا کے بندے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب کیا تم پر دعوے کریں گے؟ اول تو وہ کچھ کریں گے ہی نہیں اور اگر کیا بھی تو اُن کی اپنی توہین ہے۔" میں نے ایک مصنوعی آہ بھری اور کہا "اور وہ بیچاری" اکرم "دور ہو جاؤ یہاں سے تمہیں مرد کس نے بنایا تھا۔ عورت سے ڈرتے ہو۔ تمہارے سامنے عورتوں کی کچھ حقیقت ہوگی کیونکہ تم خود بھی اُن سے کم نہیں۔ لیکن میرے سامنے پھر کبھی ایسی بات نہ کرنا" میں نے کہا اچھا آگے؟ اکرم:۔ آگے! آگے کیا کسی بہانے سے نکال باہر کرو اور بعد میں فوراً طلاق بھیج دو۔ میں:۔ توبہ توبہ کیسی بُری باتیں کرتے ہو۔ اکرم:۔ اچھا جاؤ جا کر بیوی کے پاؤں دھوؤ کہیں دیر ہو جائے تو جوتیاں پڑیں گی تم جیسے اس قابل ہی کہاں کہ کسی اعلیٰ رتبہ پر پہنچ سکیں۔ میں نے کہا بہت جوش میں نہ آؤ۔ کچھ خدا کا خوف بھی ہے یا نہیں (لیکن یہ سب باتیں بناوٹی تھیں کیونکہ میرا بے ایمان دل مجھے مجبور کر رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اکرم کی عالی ہمتی کی داد دے رہا تھا) اکرم بولا "خدا نے کوئی قید نہیں رکھی اُس نے چار بیویوں تک کی اجازت دی ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایک ہی رکھو ایک کو نکال دو۔ بہت عرصہ گذار لیا ہر چیز کی آخر کوئی انتہا ہے۔ تم

جیسے آدمی ہی اصل گناہ گار ہونگے جو اپنی تمام آرزوؤں کا خون کرکے جلتے مرتے عمر گذار کر خدا کی ناشکری کرتے ہوئے دنیا سے اُٹھ جائیں گے۔ بھلے آدمی خوش رہو اور خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تمہیں ہر طرح سے آزاد پیدا کیا ہے۔ کیوں عورتوں کی طرح بات بات پر وہم کرتے اور خوف کھاتے ہو۔ کوئی تمہیں مار تو ڈالے گا نہیں" میں نے کہا اچھا میں سوچ کر بتاؤں گا۔ اکرم ہے۔ بس تم سوچتے رہو اور وہ تمہارے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ اب اگر کوئی ادھر سے تمہاری تحقیقات کو آگیا اور اندر سے بیگم صاحبہ نے پان بھجوا دیئے تو اچھی عزت رہ جائیگی تمہاری میں نے کہا ہاں ہے تو ٹھیک لیکن میری ہمت نہیں پڑتی۔

اس کے بعد اکرم نے مجھے وہ شیطانی چال سمجھائی جس نے مجھے تباہ کر دیا۔ لیکن اس میں اُس کا بالکل قصور نہیں۔ میں جان بوجھ اپنے آپ کو اُس کے ہاتھوں میں دے چکا تھا۔ اور خود اپنے ضمیر کو دھوکا دیتا رہا کہ میں بے قصور ہوں۔ اکرم نزہت کے بھائی کی طرف سے ایک مصنوعی تار بنا کر دلوا چکا تھا "کہ تمہارے بڑے بھائی سخت بیمار ہیں جلد پہنچو" وہ ڈاک گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اور میں وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی فرشتہ مجسم بیوی کے عیوب سوچنے لگا۔ اگرچہ یہ سب خیال ہی تھے۔

تھوڑی دیر بعد تار میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ شام کے قریب موٹر میں بیٹھ کر میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

دبے پاؤں میں نے زینہ طے کیا۔ اپنے کمرے کے باہر ہی سے مجھے ہارمونیم کی آواز سنائی دی۔ اور ساتھ ہی ایک گانے کی دلکش آواز۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام کی یہ پرسکون خاموشی اسی سحر آفرین نغمہ کا اثر ہے تھوڑی دیر کے لئے میں مسحور ہو گیا۔ اُس کی آواز، آہ یہ وہ شے تھی جس میں ہزاروں کوششوں کے باوجود میں کوئی عیب نہ نکال سکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آسمانی حور شفق کے سنہرے بادلوں میں جھکی ہوئی دنیا والوں کو شام کی آمد کا پیغام سنا رہی ہے۔

یہ آواز اگرچہ سراپا سوز تھی لیکن پھر بھی اس میں ایک قسم کی طمانیت موجود تھی جو چند لمحے بعد میں اُس سے چھین لینے والا تھا۔ مجھے جرات نہ ہو سکی کہ خود بخود اُس کے سامنے جا سکوں۔ میں نے ماما کو آواز دی "رحیمًا رحیمًا! دیکھو تار والا چلا گیا کیا؟

باجا بند ہو گیا اور وہ آواز بھی ختم ہو گئی ہمیشہ کے لئے۔

نزہت باہر نکل آئی خلاف معمول آج وہ سیاہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں

میں کانپ گیا "کہیں اُسے معلوم تو نہیں ہوگیا" لیکن جلد ہی مجھے یاد آگیا کہ آج اُس کی والدہ کے انتقال کا دن ہے اُس دن کی یادگار میں ہمیشہ وہ سیاہ کپڑے پہنا کرتی تھی۔ میں نے آج کا تمام دن باہر ہی گذار دیا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا کہ وہ مجھ سے کچھ نہ پوچھے گی۔ اپنے جذبات پر وہ بہت زیادہ قادر تھی۔ اُس نے کہا "تار ہے؟ کس کا؟" میں نے کہا "تمہارے بھائی جان کا ہے" اُس نے تار میرے ہاتھ سے لے لیا اور پڑھنے لگی۔ میرا تمام جسم کانپنے لگا اور میں جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر آئی اُس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا گاڑی تو اب رات کے دس بجے ہی جائے گی۔ میں نے کہا "ہاں دس بجے" وہ بولی "تو پھر ہمیں گھر سے نو بجے ہی چلنا چاہئے" میں نے کہا افسوس آج ایک ایسا ضروری مسئلہ درپیش ہا کہ دن بھر مجھے فرصت نہیں ملی اور کل بھی میرا شہر سے غیر حاضر رہنا ناممکن ہے۔ بہتر ہے کہ اس وقت تم دو نوکروں کو ساتھ لے جاؤ میں بھی کوشش کروں گا کہ جلد کسی وقت پہنچ سکوں خالد کو یہیں چھوڑ جاؤ تمہیں راستے میں تکلیف ہوگی میں اپنے ساتھ اُسے لے آؤں گا۔ اُس نے کہا "جی ہاں وہ خود بھی آپ کے بغیر نہ جائے گا"

گاڑی کا وقت قریب ہونے لگا وہ بچے کو دیکھنے کے لئے گئی میں نے کہا اسے جگا کر مل لو۔ اُس نے کہا "واہ ایسا ہی کیا میں کوئی مہینوں کے لئے جا رہی ہوں۔ خدا بھائی جان کو آرام دے تو میں جلد آجاؤں گی۔ اس وقت اُٹھ کر اُسے تکلیف ہوگی" آیا کو اُس نے تاکید کی کہ بچے کا اچھی طرح خیال رکھے۔ پھر ہم موٹر میں بیٹھ کر سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑی آ چکی تھی میں نے اُسے سوار کرا دیا۔ اُس نے بچے کے متعلق پھر ایک دفعہ تاکید کی اور کہا اگر تم نہ آسکے تو خط ضرور لکھنا میں نے کہا "ضرور۔ اور تم بھی مجھے پہنچتے ہی خیریت کا تار دلوا دینا"

گاڑی کی روشنیاں آہستہ آہستہ ہلتی معلوم ہوئیں۔ میں نے دل میں کہا اُن روشنیوں کے درمیان ایک دل کی فروزاں روشنی عنقریب میرے طرزِ عمل سے بجھ کر رہ جائے گی۔ دور تک اُس کی افسردہ نگاہیں مجھ پر جمی رہیں اور جہاں تک نظر نے کام کیا مجھے اُس کا خوبصورت چہرہ دکھائی دیتا رہا۔ میری آنکھیں نمناک ہوگئیں اور میرا جی چاہا کہ کسی غیبی طاقت سے گاڑی رک جائے میں سب باتیں اُس سے کہہ دوں اور اُسے واپس لے جاؤں۔

گاڑی او جھل ہو چکی تھی مجھے اکرم کا خیال آیا اور میں نے شکر کیا کہ دل کی باتیں دوسرے کو معلوم نہیں ہو جاتیں ورنہ اس وقت اکرم مجھے کس قدر بزدل سمجھتا۔ واقعی وہ مجھے اس اعلیٰ رتبہ پر پہنچا رہا ہے جس کے میں قابل ہوں ایک سربمہر لفافہ میں نے لیٹر بکس میں ڈالا۔ یہی میری مسرتوں کا خاتمہ تھا۔ لیکن میری حماقت دیکھو کہ اُس وقت مجھے اپنی ہستی عجیب پُر شکوہ اور شاندار معلوم ہو رہی تھی۔ ایک آزاد شہنشاہ کی طرح میں اپنے گھر میں داخل ہوا۔

یہاں ہر طرف ویرانی اور وحشت برس رہی تھی میں سنے کہا خزاں کے بعد اب بہار آنے والی ہے۔
رات بھر میں نہ سو سکا۔ ایک نئے طریقے پر زندگی بسر کرنے کے دل خوش کن خیالات سوچتے سوچتے
چند دن بعد مجھے نزہت کا ایک خط جو اُس نے نہایت سراسیمگی کی حالت میں سپرد قلم کیا تھا ملا۔
میں لکھا تھا "کسی دشمن نے خواہ مخواہ بھائی جان کی بیماری کا تار ہمیں بھیج دیا۔ وہ بالکل تندرست ہیں۔ یہ
تو خیریت تھی لیکن آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ابھی تھوڑی دیر ہوئی ڈاکیہ ایک خط دے کر گیا ہے۔ تحریر
معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سُن کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ یہ ایک طلاق نامہ ہے۔ میں
بھی اپنے خط کے ساتھ بھیجتی ہوں تاکہ تم کچھ معلوم کرسکو۔ یہ خط میں سخت پریشانی کی حالت میں لکھ رہی
اور میں اس واقعہ کا یہاں کسی سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتی"۔
یہ خط پڑھ چکنے کے بعد پہلے تو میں حیران ہؤا کہ اب کیا کیا جائے۔ لیکن جلد ہی میں نے ایک تدبیر
لی۔ میں نے انسانیت کا جامہ اُتار پھینکا اور حیوانیت اختیار کر لی۔ قلم اٹھا کر میں نے اُسے ایک ایسا خط لکھ
کے ایک ایک حرف کو پڑھ کر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس خط کو ڈاک میں ڈال دینے کے بعد مجھے
اطمینان ہؤا۔ اکرم نے میری "دانائی" کی تعریف کی
اس کے بعد مجھے اُس کا کوئی خط نہ ملا۔
دن گذرتے گئے اور خطوط ہی کے ذریعہ سے نواب کے ہاں سے تمام معاملات طے ہو گئے ہمیں
مسرت بھی تھی اور حیرت بھی کہ وہاں سے کسی نے میری نسبت کچھ تحقیقات نہیں کی۔ لیکن ہم یہ نہ سمجھ
تحقیقات خفیہ طریقوں سے بھی ہوا کرتی ہے۔ میرے دل میں اور بھی غرور پیدا ہؤا اور میں نے کہا واقعی میں
قابل ہوں کہ میری نسبت کوئی تحقیقات نہ کی جائے۔
شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی چونکہ دونوں طرف روشن خیال اصحاب موجود تھے۔ اس لئے کوئی لمبے
سامان نہ ہوئے۔ اپنے دوستوں کے ہمراہ میں برات لے کر پہنچ گیا۔ راستے میں کئی افواہیں سننے میں آئیں
کہتا تھا کہ نواب کے ہاں تو کوئی بیٹی ہی موجود نہیں اور کوئی کہتا کہ اُس کی شادی تو ہو چکی ہے۔ ہمیں ان
افواہوں کی بالکل پرواہ نہ ہوئی۔ ہمارے استقبال کے لئے سٹیشن پر کئی معززلوگ موجود تھے۔ واقعی یہ لوگ
روشن خیال واقع ہوئے تھے ہم ایک خوشنما محل میں داخل ہوئے۔
نکاح ہو گیا اور نواب کی صاحبزادی کوئی درجن بھر ماماؤں کے ہمراہ رخصت ہوئیں۔ جہیز تو کوئی ا

شاندار نہیں تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن معلوم نہیں کہاں سے میرے کان میں یہ بات پڑ چکی تھی کہ نواب صاحب نے ایک بہت بڑی جاگیر بیٹی کے نام کر رکھی ہے۔ اور وہ بیٹی کو ہیروں کے زیور دیں گے۔ مگر دورانِ نکاح میں اس کا کوئی ذکر نہ آیا۔ میں ان لوگوں کے ساز و سامان دیکھ کر ہی کچھ ایسا مرعوب ہو گیا تھا کہ کسی اور بات کا خیال بھی نہ آیا۔ صبح دس بجے کے قریب عام دوستوں کو رخصت کر کے میں اپنے کمرہ میں داخل ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور کسی حسنِ جہاں سوز کے خیال ہی سے آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔

اُف! ریاض یقین جانو جو کچھ میں نے دیکھا مجھ پر بجلی گر گئی۔ ایک سیاہ فام چیچک رو فربہ اندام لڑکی سر سے پاؤں تک میری بیوی کے زیوروں سے آراستہ عروسی کا جوڑا پہنے آئینے کے سامنے کھڑی تھی نواب کی ملازمہ، اسے میں ایک دفعہ باہر کام کے لئے آتے بھی دیکھ چکا تھا۔

میں نے بیتابی کے لہجے میں کہا "دلہن کہاں ہے" وہ میری طرف مڑی اور پھر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے کڑک کر کہا "دلہن کہاں ہے" وہ کانپنے لگی۔ میری آواز سُن کر نواب کی تمام نوکریں اندر گھس آئیں ایک بوڑھی سی عورت نے ذرا مجھے ڈانٹ کر کہا۔ بیرسٹر صاحب! آپ تو ہماری بچی کا خون خشک کئے دیتے ہیں۔ میں نے کہا "بکومت کیا یہ نواب کی بیٹی ہے"؟ وہ صرافہ پہلے ہی کچھ سکھائی پڑھائی معلوم ہوتی تھی کہنے لگی خواہ کسی کی ہو خواہ میری ہو بہر حال آپ نے اس سے شادی کی ہے۔ کیا آپ عورتوں کو دکھ دینے کے لئے ہی شادیاں کرتے ہیں۔ اُس کے اِس فقرے سے بہت کچھ واقعات مجھ پر کھل گئے اور کچھ بعد میں معلوم ہوئے نواب کو معلوم ہو گیا تھا کہ میری شادی پہلے بھی ہو چکی ہے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے مجھے سزا دی۔ خیالات کے ہجوم سے میرا دماغ بے کار ہو گیا میں اوپر چلا گیا نواب کو سزا دینے کے لئے میں نے کئی تدبیریں سوچیں لیکن ہر ایک میں مجھے اپنی ہی خفت نظر آئی۔

وہ لڑکی بار بار عجیب و غریب نظروں سے میری طرف دیکھتی کمبخت معلوم نہیں اب اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی تھی۔ اُف ریاض اُس کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں اب بھی میرے دل میں ایک کراہیت پیدا کر رہی ہیں۔ اور اُن کے مدمقابل وہ بڑی بڑی روشن آنکھیں جن کی سیاہ پلکوں میں رخصت کے وقت آنسو جھلک رہے تھے اب مجھے نفرین و حقارت سے گھورتی ہوئی نظر آتی ہیں اور میں کانپ جاتا ہوں۔

دوسرے دن اکرم کئی دوستوں کے ہمراہ آموجود ہوا اُس شیطانِ مجسم کے قہقہوں کی آواز دور ہی سے مجھے سنائی دی وہ میرا خوب مذاق بنا رہا تھا۔ میں نے اُس کے ملنے سے انکار کر دیا۔ یوں میری اور اُس کی دوستی

ختم ہوئی۔

میں نے فوراً اُس لڑکی کو طلاق دینا چاہی لیکن وہ ڈھیٹ عورتیں میرا پیچھا چھوڑنے میں نہ آتی تھیں۔ وہ بڑھیا تو مقدمے کی دھمکیاں دیتی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے بہت سا روپیہ ادا کر کے اُن بلاؤں سے نجات حاصل کی۔

اب میں بالکل تباہ ہو چکا تھا ایک ننھے سے بچے کے سوائے کوئی میرا غمخوار نہ تھا۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد آخر میں نے نزہت کو ایک خط لکھا انسانیت تو یہ تھی کہ وہاں جا کر اُس سے معافی چاہتا۔ لیکن میرا غرور اب بھی قائم تھا۔ دوسرے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ میں نے اس طرح خط لکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں صرف یہ لکھ دیا کہ تم جلد آ جاؤ کیونکر گھر میں تمہارے بغیر رونق ہی نہیں اور خالد بھی اداس ہے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ وہ اِس موقع کو غنیمت جان کر فوراً دوڑی آئے گی میرے بغیر اُس کی زندگی مشکل ہو رہی ہو گی لیکن وہ نہ آئی چند دن بعد مجھے اس کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا "ایک غیر شخص کی حیثیت سے اب تمہیں مجھے خط لکھنا واجب نہیں۔ اس خط سے میری روح کو سخت صدمہ پہنچا جسم ایک فانی چیز تھی اُسے جہاں تک ہو سکا تم رسوا کر چکے۔ لیکن اب میری روح کی تحقیر نہ کرو۔ اس قسم کا کوئی خط اب یہاں نہ آنے پائے صرف میری یہ درخواست ہے کہ میرا بچہ جب تک چھوٹا ہے اُسے میرے پاس رہنے دو اور اس خط کو دیکھتے ہی اُسے یہاں بھیج دو"

لیکن پھر بھی میں نے اُسے یہی لکھا کہ بچے کو وہاں بھیج کر میں خود کیا کروں۔ تم یہاں آ جاؤ مجھ پر نہیں تو اسی کے حال پر رحم کرو۔ وہ پھر بھی نہ آئی اُس نے لکھا کہ میری عزت اور خودداری کو جو صدمہ پہنچ چکا ہے اُس کی تلافی حشر تک نہیں ہو سکتی۔ کیوں میری توہین پر توہین کرتے چلے جا رہے ہو۔ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ میرا بچہ میرا پیارا میں اُسے بھی خدا کے سپرد کرتی ہوں وہ مجھ سے دور سہی لیکن میرے دل کی دعائیں اس سے بہت نزدیک ہیں خدا اُس کا حافظ و ناصر ہو"

میں کچھ مایوس سا ہو گیا لیکن میری فریب کار طبیعت کو ایک اور ترکیب سوجھی مجھے معلوم تھا کہ وہ بچے کے لئے تڑپ رہی ہو گی۔ اس لئے میں نے اُس کے متعلق ایک دردانگیز خط لکھا جسے پڑھ کر پتھر کا دل بھی موم ہو جائے۔ یہ باتیں اگرچہ بہت کچھ غلط تھیں لیکن پھر بھی ہر بات میں تھوڑی سی صداقت موجود تھی۔ وہ مجھ سے بہت مانوس تھا لیکن یہ فطرت کے خلاف تھا کہ وہ اپنی ماں کو بھول جائے۔ اگرچہ میرے سامنے اُس نے کبھی اپنی اماں کا نام نہ لیا لیکن یہ بھی ظاہر تھا کہ اب اُس کے چہرے پر کبھی وہ حقیقی مسکراہٹ نمودار

نہیں ہوئی۔ اُس کی بناوٹی ہنسی کو ہمیشہ میں محسوس کرتا رہا۔ اُس کا جسم پہلے سے بہت نحیف ہوگیا تھا اور وہ ذرا ذرا سا بہانہ ڈھونڈ کر رونا شروع کر دیتا اگرچہ بچپن کی وجہ سے اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ میرے دل میں کیا خلش ہے۔ مجھ سے بھی اب وہ پہلے کی طرح بے تکلف نہیں تھا۔ اور مجھ سے بات بات پر ڈرنے لگا تھا۔ میرے سامنے کبھی اپنی ماں کی کوئی بات نہ کرتا لیکن جو باتیں وہ نوکروں سے کیا کرتا اُن سے صاف معلوم ہوتا کہ اُسے ہر وقت اپنی اماں یاد رہتی ہے۔

دوپہر کے وقت میں اندر کمرے میں بیٹھا تھا آیا باہر فرش پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھی۔ خالد اپنے چہرے کو ننھے ننھے ہاتھوں کا سہارا دیئے اُس کے قریب بیٹھا مختلف سوال کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی آواز سنائی دی "آیا تمہاری اماں بھی تمہاری آنکھوں کو چوما کرتی ہیں" آیا نے کہا نہیں بیٹا میری اماں مر چکی ہیں۔ اُس نے کہا "ہوں" "آیا میری اماں میری آنکھوں کو چوما کرتی ہیں" آیا نے کہا تمہاری ماں کہاں ہیں؟ کہنے لگا "مجھے معلوم نہیں"

ایک دن آیا نے نزہت کی ایک پرانی ساڑھی پہن لی اُس دن میں نے دیکھا کہ خالد تمام دن اُس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ کبھی پوچھتا آیا یہ ساڑھی تمہیں اماں نے دی تھی۔ کب دی تھی؟ کبھی کہتا میرا کوٹ بھی اماں نے مجھے دیا تھا میں مجرموں کی طرح چھپ چھپ کر اُس کی باتیں سنتا اور خود اُس سے کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔

میرے اُس خط کا کوئی جواب نہ آیا کئی دن گذر گئے۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا سنگدل ظالم عورت بچے کا خیال بھی نہیں کرتی لیکن یا اللہ سنگدل نہ تھی اُس کا نازک دل اتنے بڑے رنج و الم کی تاب نہ لا سکا۔ آہ وہ اس دنیا سے چل بسی۔ اور یہ منحوس خبر جانتے ہو کس وقت مجھے ملی۔ وہ قیامت خیز گھڑی میں کیسے بیان کروں۔ میرا دل پھوٹ کر باہر نکل جاتا چاہتا ہے۔ آہ وہ منحوس دن جب کہ اچانک دو بجلیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ ریاض! سنتے ہو مجھ پر کیا کیا گذر گئی، ہاں اس کی موت کی اطلاع مجھے اُس وقت ملی۔ جب میں خالد کو ویران جنگل میں تنہا ہمیشہ کے لئے خاک کے نیچے سُلا کر آرہا تھا۔ یہ سانحہ یکبارگی گذر گیا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ میں میز کے قریب بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی معلوم نہیں کیوں میں باہر نکل آیا۔ خالد اپنی اماں کا ایک سیاہ سا نقاب پہنے اوپر کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا اور کہہ رہا تھا "آیا دیکھو اماں آرہی ہیں" بے اختیار میں سامنے آگیا۔ گھبراہٹ میں اُس کا پاؤں پھسل گیا۔ لوہے کی تمام سیڑھیوں پر اُس کا سر ٹکتا رہا ایک لمحہ بعد وہ نیچے آرہا۔ میرا جسم شل ہوگیا تھا مجھ سے ہلا تک نہ گیا۔ ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ دماغ پھٹ چکا ہے آہ اس سے آگے میں کیا لکھوں۔

دوسرے دن میں اوپر کی منزل میں اپنی بیوی کے اُس کمرہ میں گیا جہاں اُس کا کچھ سامان وغیرہ پڑا رہتا تھا۔ آہ دو ننھے ننھے پیروں کے نشان گرد آلود صندوق پر ابھی تک موجود تھے۔ اور ایک چھوٹی سی لکڑی جس کے ساتھ خالد نے صندوق پر چڑھ کر کھونٹی سے نقاب اُتارا ہوگا۔ بے ہوش ہوکر معلوم نہیں کتنا عرصہ میں وہاں گرا رہا۔

اب میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں لیکن اس تمام انقلاب نے میری آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا دیا۔ نزہت اگر میرے بلانے پر آجاتی تو کبھی میں اُسے وہ نہ سمجھ سکتا جو اب سمجھتا ہوں۔ اور اُس نے مجھے بتا دیا کہ حمیت اور غیرت کس چیز کا نام ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں بہترین عورت وہی تھی۔ جسے میں ڈھونڈتا تھا حقیقت میں اُسے پا چکا تھا اور چونکہ خود اُس کے قابل نہیں تھا اس لئے اُس کی زندگی میں مَیں کچھ نہ جان سکا۔ مگر اُس نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا۔ اُس کی یاد کو بھی اب میں اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ بعض اوقات یہ سب ایک خواب معلوم ہونے لگتا ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ بیش بہا دولت کبھی میرے پاس موجود بھی تھی۔

اب میں سمجھا کہ انسان کو ایک ہی بار جو کچھ مل جائے وہی حقیقی ہے۔ اور جو بار بار کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اُس سے زیادہ بیوقوف کوئی نہیں۔ کیونکہ دوسری مرتبہ تو وہ چیز پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ جس قدر محبت میرے حصہ میں آئی تھی اُسے میں نے بے دردی سے ضائع کر دیا اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے بار بار انسان حاصل نہیں کر سکتا اور جب کوئی اسے کھو بیٹھتا ہے تو پھر ساتھ ہی اُس کی تمام مسرتیں اور راحتِ قلب بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ کیا اب میرے دل میں کوئی دوسری عورت میری بیوی کی جگہ لے سکتی ہے یا کوئی بچہ خالد کے برابر مجھے عزیز ہو سکتا ہے؟

میں راتوں کو اُٹھ کر باہر نکل جاتا ہوں۔ تمام تمام رات آوارہ و تنہا پھرنے میں گذر جاتی ہے۔ مجھے اب دنیا کی کسی چیز سے دل بستگی نہیں رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک خالی جسم جو ہر قسم کے جذبات سے بے بہرہ ہو چکا ہے کیوں ابھی تک دنیا میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

عالمِ تصور میں بار بار مجھے ایک بچے کی شرارت آمیز ہنسی اور ایک عورت کی ملامت خیز نظریں دکھائی دیتی ہیں۔ میں کانپ اُٹھتا۔ اپنے گناہوں کی ندامت سے میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو ختم ہو چکے ہیں اب مجھے کبھی رونا نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں رونے کی کوشش کروں تو آنسو کا ایک قطرہ بھی میری آنکھوں سے نہ نکلے۔

اب اس جگہ یوں پڑے رہ کر زندگی گذار دینا مشکل ہے میں چلا جاؤں گا یہاں سے دور بہت دور کسی ایسے صحرا میں جس کی ویرانی میرے دل کی ویرانی کی ہم رنگ ہو میں اپنے جسم کو کانٹوں میں گھسیٹتا پھروں گا۔ جب دل کو چین میسّر نہیں تو اس جسم کو کیوں آرام لینے دوں میرا قیام کہیں نہ ہوگا یہ سفر صرف اُس وقت ختم ہوگا جب موت آکر مجھے اپنے دامانِ عاطفت میں چھپا لے۔

ز۔ ب

عجز و غرور کا مقابلہ

تمہیں ربطِ جور و جفا پر گھمنڈ
ہمیں خبطِ مہر و وفا پر گھمنڈ

تمہیں حسنِ دو روز پر نخوتیں
ہمیں عشقِ دائم بقا پر گھمنڈ
تمہیں بختِ فیروز پر نخوتیں
ہمیں قسمتِ نارسا پر گھمنڈ

تمہیں جبرِ بے جا کی عادت پہ ناز
ہمیں تابِ صبر و رضا پر گھمنڈ
تمہیں ایک دنیا کی طاقت پہ ناز
ہمیں صرف اپنے خدا پر گھمنڈ

تمہیں تیغِ خوں بار پر نازشیں
ہمیں بے ضرر دست و پا پر گھمنڈ
تمہیں خوئے پیکار پر نازشیں
ہمیں طبعِ صلح آشنا پر گھمنڈ

تمہیں قبضۂ بحر و بر پر غرور
ہمیں ترکِ ہر دو سرا پر گھمنڈ
امیروں کو اموال و زر پر غرور
فقیروں کو فقر و فنا پر گھمنڈ

اب آزادؔ تم صاحبِ زر نہ زور
یہ سچ ہے تو پھر کس بنا پر گھمنڈ

حکیم آزاد انصاری

انسان اور الوہیت

ایک دفعہ کا ذکر ہے بلکہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب وقت ابھی پیدا ہی ہُوا تھا جب دیوتاؤں کو معرضِ وجود میں آئے ابھی اتنا عرصہ گزرا تھا کہ اُن کے نام رکھے جاتے، اور انسان کا جسم اُس گڑھے کی مٹی سے جس میں سے کھود کر اُسے بنایا گیا تھا ابھی گیلا گیلا ہی تھا کہ انسان نے دعویٰ کیا کہ ایک پہلو مجھ میں بھی الوہیت کا موجود ہے دیوتاؤں نے اُس کے قول کا وزن کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ واقعی اُس کا دعوےٰ کچھ اہمیت رکھتا ہے جب انسان کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا گیا تو روایت کہتی ہے کہ دیوتا چوری کے ارادے سے نکلے اور انسان کی الوہیت کو لے اُڑے - وہ چاہتے تھے کہ اسے کسی ایسی جگہ چھپا دیں کہ پھر انسان کی نظر بھی اُس پر نہ پڑ سکے مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا - اگر وہ اُسے کہیں زمین پر چھپاتے تو اُن کی بصیرت بین نگاہ دیکھتی تھی کہ انسان اُس وقت تک چین نہ لے گا جب تک وہ زمین کا ذرہ ذرہ چھان کر اُسے نکال نہ لے - اگر وہ اسے کہیں اپنے درمیان چھپاتے تو اُنہیں معلوم تھا کہ انسان فضاؤں کو چیر کر آسمانوں تک بھی راستے تعمیر کرے گا -

اور جب وہ کھڑے یہ مشورے کر رہے تھے تو سب سے عقلمند دیوتا نے کہا :-

" ادھر لاؤ! میں جانتا ہُوں اسے کہاں چھپانا چاہیے "!

اُس نے انسان کی الوہیت کی ننھی منی روشنی کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور جب وہ عظیم الشان ہاتھ کھلا تو روشنی اُس میں موجود نہ تھی -

دیوتا نے کہا :-

" اب مطمئن ہو جاؤ میں نے اُسے ایسی جگہ چھپا دیا ہے جہاں سے اُس کے ڈھونڈنے کا خیال تک انسان کے دِل میں نہ آئے گا ——— میں نے اُس کو انسان کے اپنے وجود میں چھپا دیا ہے "

کپلنگ

منصور احمد

خدا ہمارے نفس میں موجود ہے - اوڈ

جس طرح روح جسم کی زندگی ہے اُسی طرح خدا روح کی زندگی ہے - اس لئے جس طرح روح کے جسم کو چھوڑ جانے سے جسم بے کار ہو جاتا ہے اُسی طرح روح مر جاتی ہے جب خدا اُس کو چھوڑ دے - سینٹ آگسٹائن

خدا! اے وہ علتِ اولیٰ جسے دنیا نے بہت کم سمجھا - پوپ

پیغام پر

۱۸۶۹ء کے موسم سرما میں میں نے اپنا طبی کام کچھ دنوں کے لئے اپنے دو دوستوں کے سپرد کیا اور خود ماسکو میں بین الاقوامی طبی کانگریس میں شامل ہونے کے لئے پیرس سے روانہ ہوا۔ کانگریس کے پہلے پہلے اجلاس صد بعد ازاں تھے۔ وقت کے مشہور و معروف اطبا نئے نئے نظریے پیش کرتے تھے اور اُن نئے نئے طریقوں اور اصولوں پر بحثیں کرتے تھے۔ جو اب بالکل بھول چکے ہیں۔ اور میں چونکہ اُن دنوں جوان تھا اس لئے ان بحثوں میں نہایت گرم جوشی سے حصہ لیتا رہا۔ کانگریس کی روایات کے مطابق شام کے وقت تمام نمائندوں کو کھانے اور رنگ رنگ کی مجلسوں میں بلایا جاتا تھا۔

کانگریس کے انعقاد کے تیسرے روز ایک پروفیسر "مسمرازم" کے ذریعے سے، کہ اُن دنوں نفسی طب کے لئے یہی لفظ بولا جاتا تھا، صرع کے علاج پر تقریر کرتا رہا۔ ایسی ہی عجیب اور روح پرور بحثوں کے دوران میں میں نے دور خیالی اور خوابوں کی تعبیر کے متعلق بھی بڑے بڑے حکما کی تقریریں سنی تھیں۔ میں اُن سب کو محض توہم پرستوں کے ایجادات سمجھتا تھا مگر اُس دن جب میں اپنی قیام گاہ کو واپس جا رہا تھا تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے میری مادہ پرستی کو کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے اور یہی زمانہ تھا جب میں نے زندگی کے متعلق اپنے خیالات کی اصلاح کی۔

اسی شام کو ماسکو کے گورنر نے نمائندوں کے اعزاز میں ایک دعوت دی یہ ایک ایسا مجمع تھا جس میں بڑے بڑے مدبرین سلطنت اور عمائدین حکومت، بڑے بڑے علما و فضلا اور خوبصورت عورتیں جمع تھیں۔ اب جب کہ بڑھاپا مجھ پر چھا رہا ہے میں اس دعوت کا خیال کرتا ہوں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سب کچھ اب خواب و خیال ہو چکا ہے۔ جذبات مردہ ہو چکے ہیں۔ محبت ختم ہو چکی ہے۔ اُس زمانے کے نوجوان لفٹنٹ آج کل بوڑھے جرنیل بن چکے ہیں۔ وہ لڑکیاں جو اُن دنوں نوجوان اور حسین تھیں اب بوڑھی اور خود غرض دادیاں نانیاں ہو چکی ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اُن مہمانوں میں سے اکثر جو اس نہ بھولنے والی دعوت میں شریک تھے اب ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں۔

میں ایک سرجن کے پاس بیٹھا تھا جو فرانسیسی زبان سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور میں ابھی اس زبان میں

مبتدی تھا۔ میری عمر ابھی اُس منزل کو نہ پہنچی تھی جب دل سے مشاہیر پرستی کے تمام خیالات یکسر محو ہو جاتے ہیں۔ میری رومانی نظروں کو دنیا کے عظیم الشان انسان آسمان کے درخشاں ستارے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی ہستیاں مجھے سطحِ عام سے بلند نظر آتی تھیں۔ میری روح کو کسی ایسے وجود کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس کے سامنے میں اپنا سرِ نیاز جھکا دوں۔ جس کی میں پرستش کروں چنانچہ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے امرا و روسا کی اُن لڑکیوں میں سے اکثر کے ساتھ جو اس دعوت میں شریک تھیں مجھے عشق سا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کم از کم اس وقت میرا درجہ اُن تمام بڑے بڑے حکما کے برابر ہے جو یہاں موجود ہیں۔

کسی نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا یہ ایک عورت تھی جسے میں نہ جانتا تھا اور جو روسی زبان میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی سازش سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ زرد رو تھی اور اس کا جسم نرم و نازک تھا۔ اُس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے نقوش نمایاں تھے اور زردی اُس پر غیر معمولی طور سے چھائی ہوئی تھی اُس کی موجودگی اس پُر مسرت اور شگفتہ مجلس میں غم اور افسردگی کے عنصر کی ایک اجنبی آمیزش کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زہریلی کھڑکی کھل گئی ہے جس میں سے برفانی ہوا اپنی پوری تندی کے ساتھ کمرے میں برف باری کر رہی ہے۔

چونکہ میں روسی زبان نہ جانتا تھا اس لئے میں نے اپنے سرجن دوست سے ترجمان بننے کو کہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اِس عورت نے کہیں سے سنا ہے کہ تم دل کے امراض کا بہت اچھا علاج کرتے ہو اور چونکہ اس کا ایک رشتہ دار سخت بیمار ہے اِس لئے وہ تمہیں بلانے آئی ہے۔

ایک سپاہیانہ جوش کے ساتھ میں نے اُسے جواب دیا کہ میں اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔ گو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس عظیم الشان دعوت کی شرکت سے محروم ہو جاؤں گا۔ مگر یہی میرے لئے عورت کے بلاوے کو منظور کرنے کا سب سے بڑا باعث ہو گیا۔ کیونکہ نفس کی قربانی میرے نزدیک جوانی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اِس کے علاوہ مجھے اس پر ناز ہونے لگا کہ اتنے بڑے بڑے حکما میں سے صرف مجھے منتخب کیا گیا ہے۔

بہر حال میں نے کوئی مزید سوال کئے بغیر اپنی ٹوپی اور اوورکوٹ لیا اور اُس کے ساتھ ہو لیا۔

مجھے یہ تمام باتیں اس طرح یاد ہیں جس طرح کوئی کل کا واقعہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اُس عورت کے ساتھ جب میں محل کے دروازے کی طرف بڑھا تو اس وقت ایک لڑکی جو سفید لباس میں ملبوس تھی سیڑھیوں پر سے اوپر کی طرف آ رہی تھی جب وہ ہمارے قریب پہنچی تو کھلے ہوئے دروازوں سے جو روشنی باہر آ رہی تھی اُس وقت

اُس کے چہرے پر پڑی ہیں یہ سب کچھ اپنی چشمِ تصور میں اب بھی دیکھ سکتا ہوں اور یہ نظارہ مجھے اُس پرانی تصویر کی طرح نظر آتا ہے جس کا کاغذ زرد پڑ گیا ہو۔ مجھے یہ ماضی کا ایک ڈھانچ معلوم ہوتا ہے جس کی جگہ صرف ایک بوڑھے آدمی کے دماغ میں باقی رہ گئی ہو۔

گزرے ہوئے زمانہ کی یاد جہاں کچھ حسرت آفرین سی ہوتی ہے وہاں اُس میں کچھ مضحکہ خیزی بھی ضرور ہوتی ہے۔ اُن دنوں کے لباس دیکھو تو آج کل کے فیشن کا منہ چڑاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اگر آج کوئی اُن عورتوں میں سے کسی کو اپنے بھونڈے لباس میں دیکھ پائے تو کہے کہ ایسی عورت سے بھی کوئی شادی کرے گا؟

باہر آکر حسنِ اتفاق سے ہمیں ایک معمولی گاڑی مل گئی جو عام طور پر ماسکو کے بازاروں میں چلتی ہے اور جس کے آگے تین گھوڑے جتے ہوتے ہیں۔ عورت اُس سے کرایہ طے کر رہی تھی کہ میں نے گاڑی والے کا چہرہ لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ اُس کے رخسار سرخ تھے اور جلد سخت تھی اور اُس پر جھریاں نمودار تھیں۔ گھنی داڑھی تھی اور ناک عام روسیوں کی طرح خفیف سی۔

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور اُن بازاروں میں سے گزرنے لگے جن کو جگمگاتی ہوئی دکانوں کی روشنی نے بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ پھر ہم ایسے کھلے اور تاریک مقامات میں آگئے جہاں نظر صرف اشیا کے بیرونی خطوط کو پہنچتی تھی۔ کہیں کہیں اندھیری فضا کے سامنے روسی کلیساؤں کے سفید سفید گنبد بڑی آن سے کھڑے اپنی شانِ تقابل دکھا رہے تھے جن کو دیکھ کر دل پر ایک ہیبت طاری ہوتی تھی۔ تمام راستے میں سوائے بندوقوں سے مسلح سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمیں کوئی راہ گیر نظر نہ آیا۔ اب شہر کے نواح سے گزر کر ہم دیہات میں پہنچ چکے تھے۔ قدیم شہر کے شور و غوغا اور چکاچوند کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں تاریکی اور بھی زیادہ تھی ہر طرف موسم سرما کی سکوت آمیز شوکت چھا رہی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ زمین پر، درختوں پر، درختوں کی شاخوں پر ہر جگہ برف تھی، اور ایک سکونِ کامل تھا جس سے اول اول مجھے کچھ تسکین سی ہوئی۔ مگر بہت جلد میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ اور میں محل کی روشنی اور گرمی کیلئے جس کو میں نے بے سوچے سمجھے چھوڑ دیا تھا بہت متاسف ہوا۔ میں اپنی حماقت کو صلواتیں سنانے لگا۔ سفر کے سکوت اور یکسانی سے مجھ پر نیند کا سا غلبہ ہونے لگا۔ مجھے اپنی حالت دگرگوں معلوم ہونے لگی۔ کبھی سمجھتا کہ میں گاڑی میں اکیلا ہوں اور کبھی جانتا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، بہت ہی بوڑھا۔ مجھے ڈر آنے لگا کہ کہیں بھیڑیئے حملہ نہ کر دیں اور میں نے چاہا کہ کاش میں اپنا پستول ساتھ لے آتا۔ میں نہ جانتا تھا کہ میں اُس جرات کو کیا کہوں جو مجھے یہاں لے آئی تھی، کیونکہ ایک ایسے

ملک میں جہاں ہرطرف خفیہ انجمنوں کا جال پھیلا ہوا ہو ہر ممکن خطرہ پیش آسکتا ہے۔ کیا میں کسی ایسے ہی دام میں پھنسنے کے لئے جارہا تھا؟ کیا مجھ پر انہیں جاسوسی کا شک ہوا تھا یا کیا انہوں نے مجھے لوٹنے کا تہیہ کر رکھا تھا؟ لیکن اس کے لئے انہوں نے کسی امیر آدمی کو کیوں انتخاب نہ کیا؟ میں نے ہزاروں نظریے قائم کئے اور پھر سب کو رد کر دیا۔

میں تقریباً سو رہا تھا جب ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے کسی کسی مکان کی کھڑکیوں میں سے اب تک روشنی نمودار تھی۔ گھوڑے ہانپ رہے تھے اور اُن کے منہ سے کف جاری تھا۔ گاڑی ایک سرائے نما عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھلا اور مجھے تمباکو کے دھوئیں کے ایک مرغولے میں سے کسی شخص کی تاریک صورت نظر آئی جس نے ایک چغہ اور لمبے بوٹ پہن رکھے تھے۔ ہم گاڑی میں سے باہر آگئے۔ اور مجھے اپنی مضبوط ٹانگیں پھیلا کر ذرا اطمینان حاصل ہوا۔ گاڑی والا سرائے والے سے بات کر رہا تھا مگر وہ عورت مجھے اندھیرے میں اور آگے لے گئی۔ میں اپنے دل میں فیصلہ کرچکا تھا کہ اگر حملہ ہوا تو اپنی پوری طاقت سے اُس کی مدافعت کروں گا۔ چاروں طرف کامل سکوت تھا۔ ہم برف میں سے گزر رہے تھے راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کوئی گفتگو نہ کی تھی۔ میں نہایت پریشان تھا اور میرا دماغ عالم لاہوت کے متعلق اُن خیالات سے پُر تھا جن کا تذکرہ ہم شام کے وقت کر رہے تھے۔ مجھے وہ کہانیاں یاد آرہی تھیں جو میری انّا مجھے سُلانے کے لئے سنایا کرتی تھی اُن بھوتوں کی کہانیاں جو نئی نئی کھدی ہوئی قبروں کے اوپر منڈلایا کرتے ہیں۔ اور میں اپنے دل کی آنکھوں سے قبریں کفن، کالی کالی شمعیں جو ماتم کے دنوں میں جلائی جاتی ہیں اور تمام وہ وہمی نظارے دیکھ رہا تھا جنہوں نے موت کے خیال کو آلودہ کر رکھا ہے اور اُسے خوفناک اور وحشت انگیز بنا دیا ہے۔ سیاہ اور خاموش تاریکی، اُس کا سحر، رات کی برفانی سردی یہ سب مجھے اُس رات زندوں کی دنیا کی بجائے مُردوں کی دنیا کی چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔

آخر کار ہم ایک تاریک سے دیہاتی مکان کے باغ کی دیواروں کے پاس پہنچ گئے۔ مجھے کسی کے پاؤں کی چاپ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں یہ خیال کرکے کہ شاید وہ عورت مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہے، پیچھے کو مڑا۔ میری حیرت اور خوف کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ غائب ہو چکی ہے۔ میں اب اکیلا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اتنی جلد اور اتنے نامعلوم طریقے سے وہ کہاں چھپ گئی مگر مجھے ان خیالات میں محو ہونے کا زیادہ وقت نہ ملا کیونکہ اسی وقت دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے ایک لڑکی کو پایا۔ میں نے

فرانسیسی زبان میں اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا۔ اُس نے رکتے رکتے جواب دیا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ گھر میں سب کی صحت بہت اچھی ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ آپ اندر جا کر میرے والد سے گفتگو کیجیے وہ فرانسیسی مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ میں بالکل مایوس ہو رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ کمرے میں ایک بوڑھا آدمی آرام کرسی پر مٹی کے ایک چولہے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر کسی ماہر امراض کے لئے یہ معلوم کر لینا بالکل دشوار نہ تھا کہ یہ شخص دل کی کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ اُس کے چہرے کے ارغوانی رنگ میں نیلاہٹ کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی اور ناک کسی شرابی کی طرح سرخ تھی اُس کے ہاتھ میں ایک سگریٹ تھا جو اُس کے دل کی حرکت کے ساتھ ساتھ کانپتا تھا۔

میں نے اُسے سلام کیا اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ بوڑھے آدمی نے اپنی عینک کے اوپر سے میری طرف دیکھا اور تیوری چڑھالی۔ ظاہر تھا کہ اُس نے میرے بیان کے ایک لفظ کا بھی اعتبار نہیں کیا اور وہ میرے حقیقی ارادوں سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ اُس کے غصہ کو کم کرنے کے لئے اور بے وقت اُس کے آرام میں خلل انداز ہونے کی توجیہ کیلئے میں نے اُسے سارا قصہ سنا دیا۔ اُس نے نہایت توجہ سے میری کہانی سنی اور جب میں ختم کر چکا تو اُس نے کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ تمہارے یہاں آنے کو میں کیا سمجھوں۔ کچھ بھی ہو تم غلطی پر ہو۔ یہاں کوئی بیمار نہیں ہے۔ مگر چونکہ تم نے بے فائدہ بہت سی تکلیف اٹھائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ذرا دیر آرام لے لو۔ آج رات تم ماسکو واپس نہیں جا سکو گے۔ اس لئے تمہیں یہیں سرائے میں قیام کرنا پڑے گا۔ میں اپنی میزبانی تمہیں پیش کرتا مگر چونکہ ہمارے ہاں مہمان نہیں آتے اس لئے ہم تمہارے آرام کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہ کر سکیں گے"

اُس نے سگرٹوں کا ڈبا میری طرف سرکا دیا اور اُس کی لڑکی میرے لئے چائے بنا لائی۔ اسی عرصہ میں قریبًا قریبًا ایک نیم شعوری کی حالت میں میں نے ایک نظریہ قائم کیا۔ میں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو وہ عورت اسی شخص کی حالت کو سمجھ کر مجھے یہاں بُلا لائی ہے گو خود اسے اپنی مرض کا اندازہ نہیں۔ غالبًا اُس نے دیکھا ہوگا کہ ڈاکٹر کا مشورہ نہایت ضروری ہے اور اُس نے مصلحت اندیشی سے کام لے کر اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر ایک ڈاکٹر اُس کے پاس بھیج دیا ہے۔ میں نے بھی اپنا کام پوری حکمت عملی سے انجام دیا ہوتا مگر سفر کی کوفت نے مجھے اُس کی اجازت نہ دی۔

میں نے بوڑھے آدمی سے کہا آپ بالکل اچھی طرح ہیں نا"، وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"میری عمر اس وقت اکسٹھ برس کی ہے اور اس تمام عرصہ میں میں ایک مرتبہ بھی بستر پر نہیں پڑا۔ بڑھاپے کے ساتھ کمزوری یقینًا آ جاتی ہے۔ میں اب اُتنا طاقتور نہیں جتنا کہ ہوا کرتا تھا، اور مجھے ضیق النفس کی بھی تھوڑی

انداز کر دیا جائے تو میں بالکل تندرست ہوں - نہیں ڈاکٹر! تم مان جاؤ، میرے ہاں میں جہاں ہر طرف خفیہ سنگوں گے"

گفتگو کا موضوع بدل گیا - کانگریس اور پیرس کی زندگی پر باتیں شروع ہوئیں - بوڑھے کی دبلی پتلی شرمیلی لڑکی اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن اُس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا - لڑکی کے باپ کی گفتگو میں دانشمندی اور بذلہ سنجی دونوں موجود تھیں - اور میں ان صفات کو ایک گوشہ نشین میں دیکھ کر حیران رہ گیا غالباً میری گفتگو نے اُس کی طبیعت کو شگفتہ کر دیا تھا، کیونکہ اُس نے طالب علمی کے زمانے کی باتیں اپنی جوانی کی غلط کاریاں اور اُس زمانے کے حالات جب وہ ایک نوجوان وکیل تھا سب سنا ڈالے - کوئی ایک گھنٹے تک اُس نے اپنی بھولی بسری جوانی کو اپنی باتوں سے پھر زندہ کر دیا - اسی وقت شمع کچھ اس طرح ٹمٹمائی گویا وہ بجھنے کے قریب ہے - میں نہیں جانتا کہ اس سے مجھ پر ایک گہرا اثر کیوں ہوا در آں حالیکہ اس میں کوئی غیر معمولی بات بھی نہ تھی موم بتیاں لائی گئیں مگر اب سحر ٹوٹ چکا تھا - مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نوجوان خاوند یکایک کوئی بدشگونی دیکھ پائے - گھڑی بارہ کا گھنٹہ بجا رہی تھی کہ میں وہاں سے رخصت ہوا - بوڑھے وکیل نے مجھ سے دوسرے دن دوبارہ ملنے کو کہا اور میں نے اس کا بے ساختہ وعدہ بھی کر لیا - اُس کی لڑکی دروازے تک میرے ساتھ آئی اور کہنے لگی:-

"ڈاکٹر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ تم آگئے گو تمہارا آنا غلطی ہی سے ہوا - میرے والد سالہا سال سے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے جتنے کہ آج - کل ضرور آنا میں چاہتی ہوں کہ ہمارے ہاں لوگ آیا کریں اس سے اُن کی صحت اچھی رہے گی"

میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال اُٹھتا تھا کہ میری خاموش ہم سفر مجھے ضرور راستے میں ملے گی لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا - سرائے میں ابھی شمعیں جل رہی تھیں اور جب میں اندر داخل ہوا تو سرائے والا کچھ لوگوں کو جنہوں نے روسی طرز کی پوستینیں پہن رکھی تھیں اخبار سنا رہا تھا - اُن سب کے لمبے چہرے اور لمبے بال تھے اور وہ ایک ہی انداز میں یعنی اپنی ٹھوڑیوں کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر بیٹھے ہوئے تھے - دوسری طرف کچھ تو ایک قسم کی تیز روسی شراب پی رہے تھے اور اکثر حقہ نوشی میں مصروف تھے -

سرائے کی فضا میں دم رکا جاتا تھا اور تمباکو کے دھوئیں کا ایک دل بادل چھت کو چڑھ رہا تھا - میں نے اشاروں سے سرائے والے کو سمجھایا کہ مجھے رات گزارنے کے لئے کمرے کی ضرورت ہے - چنانچہ وہ مجھے ایک

اپنے کمرے میں لے گیا جہاں ایک بہت بڑا پلنگ بچھا ہوا تھا۔

دیوار جس پر سفیدی ہو رہی تھی یونانی علمائے دین کی تصویروں سے مزین تھی۔ سرائے والا مومی بتیاں لے آیا اور لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا کر اُسے بھی آگ لگاتا گیا۔ میں سونا نہ چاہتا تھا اس لئے میں نے سگار سلگایا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر شام سے لے کر اب تک جو جو واقعات پیش آئے تھے اُن پر غور کرنے لگا۔

میں اپنا سگار ختم کر چکا تھا کہ مجھے سیڑھیوں میں سے کسی کی آواز سنائی دی میں کانپ گیا۔ میں نے سمجھا کہ یقیناً یہ کوئی چال ہے جس میں میں آپھنسا ہوں اور لٹنا ہی چاہتا ہوں۔ مگر میں نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ سرائے والا اور بوڑھے وکیل کی بیٹی جن کے گھر میں میں نے شام کا وقت گزارا تھا میری طرف آ رہے ہیں لڑکی پریشان معلوم ہوتی تھی لیکن پھر بھی اُس نے اپنے حواس کو برقرار رکھا تھا۔

لڑکی نے کہا حسنِ اتفاق کی بات ہے کہ تم یہیں تھے۔ والد جی اپنے بستر میں لیٹے ہی تھے کہ اُن پر مرض کا ایک زبردست حملہ ہوا۔ شاید آج رات زیادہ پینے جلنے سے انہیں تکلیف ہو گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف دی مگر مجھے امید کہ تم میرے ساتھ ضرور چلو گے۔ شاید تم اُن کے لئے کچھ کر سکو۔

جس کمرے میں وہ مجھے لے گئی وہ بلند اور نامرغوب سا تھا۔ ہوا میں سے نوش دارو کی تیز بو آ رہی تھی۔ میز پر ایک لمپ جل رہا تھا اور وہ تمام چیزیں اُس پر رکھی تھیں جو عموماً پلنگ کمرے میں ہوتی ہیں۔ مثلاً بالوں کا برش۔ استرا۔ گھڑی اور ایک بڑا سا ٹائی پن جس پر ابھرے ہوئے نقش بنے تھے۔

انگیٹھی میں آگ کے آخری شعلے بجھ رہے تھے۔ بستر کے پردے ہٹا دیئے گئے تھے۔ ایک بوڑھا نوکر بستر کے پاس کھڑا دعا مانگ رہا تھا اور ایک نوکر کرسی پر بیٹھا رو رہا تھا۔

میں نے بوڑھے مریض کے دل کی حرکت سننی چاہی مگر اُس کے سینے میں اب کوئی سانس باقی نہ رہی تھی۔ موت اپنا کام کر چکی تھی اور اعضا میں سختی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے لڑکی کو اُس کے باپ کی موت کی خبر جس قدر نرم پیرایہ میں ممکن تھی سنا دی۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی سمجھ چکی تھی اور اُس نے اپنی پوری نسوانی قوت سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا

میں اپنے ہاتھ دھو رہا تھا اور دن کے تمام واقعات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر ایک تصویر کے چوکھٹے پر پڑی۔ اُسے مصور نے ۱۸۳۰ء کے انداز مصوری پر بنایا تھا اور جس نوجوان عورت کی یہ تصویر تھی اُس کا لباس لمبا اور بال گندھے ہوئے تھے۔ کسی شک و شبہ کے بغیر میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جو ماسکو کے

سی شکایت ہے مگر اُسے نظر انداز کردیا جائے تو میں بالکل تندرست ہوں ۔ نہیں ڈاکٹر! تم مان جاؤ، میرے ہاں سے تم ایک پیسہ بھی نہ کما سکو گے"!

گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ کانگریس اور پیرس کی زندگی پر باتیں شروع ہوئیں ۔ بوڑھے کی دبلی پتلی شرمیلی لڑکی اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن اُس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ لڑکی کے باپ کی گفتگو میں دانشمندی اور بذلہ سنجی دونوں موجود تھیں۔ اور میں ان صفات کو ایک گوشہ نشین میں دیکھ کر حیران رہ گیا غالباً میری گفتگو نے اُس کی طبیعت کو شگفتہ کردیا تھا، کیونکہ اُس نے طالب علمی کے زمانے کی باتیں، اپنی جوانی کی غلط کاریاں اور اُس زمانے کے حالات جب وہ ایک نوجوان وکیل تھا سب سنا ڈالے۔ کوئی ایک گھنٹے تک اُس نے اپنی بھولی بسری جوانی کو اپنی باتوں سے پھر زندہ کردیا۔ اسی وقت شمع کچھ اس طرح ٹمٹمائی گویا وہ بجھنے کے قریب ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے مجھ پر ایک گہرا اثر کیوں ہوا درآں حالیکہ اس میں کوئی غیر معمولی بات بھی نہ تھی مومی بتیاں لائی گئیں مگر اب سحر ٹوٹ چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نوجوان خاوند یکایک کوئی بدشگونی دیکھ پائے۔ گھڑی بارہ کا گھنٹہ بجا رہی تھی کہ میں وہاں سے رخصت ہوا۔ بوڑھے وکیل نے مجھ سے دوسرے دن دوبارہ ملنے کو کہا اور میں نے اس کا بے ساختہ وعدہ بھی کرلیا۔ اُس کی لڑکی دروازے تک میرے ساتھ آئی اور کہنے لگی:۔

"ڈاکٹر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ تم آگئے گو تمہارا آنا غلطی ہی سے ہوا۔ میرے والد سالہا سال سے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے جتنے کہ آج۔ کل ضرور آنا میں چاہتی ہوں کہ ہمارے ہاں لوگ آیا کریں اس سے اُن کی صحت اچھی رہے گی"۔

میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال اُٹھتا تھا کہ میری خاموش ہم سفر مجھے ضرور راستے میں ملے گی لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ سرائے میں ابھی شمعیں جل رہی تھیں اور جب میں اندر داخل ہوا تو سرائے والا کچھ لوگوں کو جنہوں نے روسی طرز کی پوستینیں پہن رکھی تھیں اخبار سنا رہا تھا۔ اُن سب کے لمبے چہرے اور لمبے بال تھے اور وہ ایک ہی انداز میں یعنی اپنی ٹھوڑیوں کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف کچھ تو ایک قسم کی تیز روسی شراب پی رہے تھے اور اکثر حقہ نوشی میں مصروف تھے۔

سرائے کی فضا میں دم رکا جاتا تھا اور تمباکو کے دھوئیں کا ایک دل بادل چھت کو چڑھ رہا تھا۔ میں نے اشاروں سے سرائے والے کو سمجھایا کہ مجھے رات گزارنے کے لئے کمرے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ مجھے ایک

ایسے کمرے میں لے گیا جہاں ایک بہت بڑا پلنگ بچھا ہؤا تھا۔

دیوار جس پر سفیدی ہو رہی تھی یونانی علمائے دین کی تصویروں سے مزین تھی۔ سرائے والا مومی بتیاں لے آیا اور لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا کر اُسے بھی آگ لگا تا گیا۔ میں سونا نہ چاہتا تھا اس لئے میں نے سگار سلگایا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر شام سے لے کر اب تک جو جو واقعات پیش آئے تھے اُن پر غور کرنے لگا۔

میں اپنا سگار ختم کر چکا تھا کہ مجھے سیڑھیوں میں سے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں کانپ گیا۔ میں نے سمجھا کہ یقیناً یہ کوئی چال ہے جس میں مَیں پھنسا ہوں اور لٹا ہی چاہتا ہوں۔ مگر میں نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ سرائے والا اور بوڑھے وکیل کی بیٹی جن کے گھر میں میں نے شام کا وقت گزارا تھا میری طرف آ رہے ہیں لڑکی پریشان معلوم ہوتی تھی لیکن پھر بھی اُس نے اپنے حواس کو برقرار رکھا تھا۔

لڑکی نے کہا حسنِ اتفاق کی بات ہے کہ تم یہیں تھے۔ والد ابھی اپنے بستر میں لیٹے ہی تھے کہ اُن پر مرض کا ایک زبردست حملہ ہؤا۔ شاید آج رات زیادہ ہلنے جلنے سے انہیں تکلیف ہوگئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف دی مگر مجھے امید کہ تم میرے ساتھ ضرور چلو گے۔ شاید تم اُن کے لئے کچھ کر سکو!

جس کمرے میں وہ مجھے لے گئی وہ بلند اور نامرغوب سا تھا۔ ہوا میں سے نوش دارو کی تیز بو آ رہی تھی۔ میز پر ایک لمپ جل رہا تھا اور وہ تمام چیزیں اُس پر رکھی تھیں جو عموماً پلنگ کمرے میں ہوتی ہیں۔ مثلاً بالوں کا برش۔ استرا۔ گھڑی اور ایک بڑا سا ٹائی پن جس پر ابھرے ہوئے نقش بنے تھے۔

انگیٹھی میں آگ کے آخری شعلے بجھ رہے تھے۔ بستر کے پردے ہٹا دیئے گئے تھے۔ ایک بوڑھا نوکر بستر کے پاس کھڑا دعا مانگ رہا تھا اور ایک نوکر کرسی پر بیٹھا رو رہا تھا۔

میں نے بوڑھے مریض کے دل کی حرکت سننی چاہی مگر اُس کے سینے میں اب کوئی سانس باقی نہ رہی تھی۔ موت اپنا کام کر چکی تھی اور اعضا میں سختی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے لڑکی کو اُس کے باپ کی موت کی خبر جس قدر نرم پیرایہ میں ممکن تھی سنا دی۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی سمجھ چکی تھی اور اُس نے اپنی پوری نسوانی قوت سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا

مَیں اپنے ہاتھ دھو رہا تھا اور دن کے تمام واقعات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر ایک تصویر کے چوکھٹے پر پڑی۔ اُسے مصور نے سنہ ۱۸۳۰ء کے اندازِ مصوری پر بنایا تھا اور جس نوجوان عورت کی یہ تصویر تھی اُس کا لباس لمبا اور بال گندھے ہوئے تھے۔ کسی شک و شبہ کے بغیر میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جو ماسکو کے

محل کے ہال میں مجھ سے ملی تھی اور میرے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ میری حیرت اس قدر بڑھی کہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ لڑکی اور اُس کے نوکروں نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا۔

تصویر کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا "یہ کون ہے؟ یہی عورت تو مجھے یہاں لائی تھی۔

لڑکی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اُس کے اوپر کے ہونٹ میں ذرا سا خم آگیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا، مگر مجھ کو بے چین دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔

اُس نے کہا "یہ میری ماں ہے بیس برس ہوئے جب میں پیدا ہوئی تھی تو وہ مر گئی تھی"

ہاپین — منصور احمد

لمعات

دلِ خوں گشتہ کو وابستگی تھی لالہ زاروں سے
نواہائے محبت سُن رہا تھا آبشاروں سے

نمی اُن میں نہ دیکھی چشمِ بیمارِ محبت کی
لڑا کر دیکھ لی ہیں رات بھر آنکھیں ستاروں سے

مہ و خورشید نے اُس کا مرقع کھینچنا چاہا
نہ ظاہر ہو سکا وہ حُسن ان آئینہ کاروں سے

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جسے اُڑنا نہیں آتا
بحسرت دیکھتا ہوں جانبِ خور لالہ زاروں سے

شعاعِ مہر جوئے آب پر کیا کیا لرزتی ہے
درخشاں ہے ردائے آب کا دامن ستاروں سے

ح - ب

رازِ محبّت

میں نے کہا کہ اے چمنِ زندگی کے پھول — تیرے بغیر خار ہے مجھ کو یہ گلستاں
کانٹا سا کیا یہ دل میں کھٹکتا ہے ہر گھڑی؟ — دن رات کیوں ہے وردِ زباں ہائے میری جاں!
آیا نہ کچھ سمجھ میں کہ کیا چیز عشق ہے؟ — کس طرح شعلہ بار ہے یہ آتشِ نہاں؟
تاریکیاں بھی مجھ کو مسرت کا نور ہوں — گر تیرے دل میں میری محبت ہو ضو فشاں
شعلہ ہے آفتاب کا چشمک ہے برق کی — الفت جو مجھ کو تجھ سے ہے اے میری جانِ جاں

سن کر یہ داستاں مری مجھ سے کہا بہار — یہ رازِ سربمہر کسی پر نہ ہو عیاں
الفت تھی مجھ کو تم سے تمہیں مجھ سے عشق تھا — حائل مگر ہمارا مقدر تھا درمیاں
کردیں فلک نے زیست کی راہیں الگ الگ — پھینکا تمہیں یہاں تو دھکیلا مجھے وہاں
تم مجھ کو بھول جاؤ یہ ممکن نہیں اگر — میں تم کو بھول جاؤں نہ کرنا کبھی گماں
دونوں دلوں میں نورِ محبت ہے جلوہ ریز — اک دوسرے کی دید ہے دونوں کو لطفِ جاں
چارہ نہیں مگر کہ جو ہونا تھا ہو چکا — چھایا ہوا ہماری زمیں پر ہے آسماں
وہ کام تم کرو جو خدا نے تمہیں دیا — بے کار ہیں یہ وہم و خیال و غمِ نہاں
کاوش ہے میرے جی کو بھی ہر دم وہی کروں — جو مجھ سے چاہتا ہے مرا ربِّ دو جہاں
موتی کی آب و تاب ہے خوشبو ہے پھول کی — الفت جو مجھ کو تم سے ہے اے میری جانِ جاں!
کرتا ہے آسماں کو جدا اگر کیا کرے — نزدیک تر کریں گی دلوں کو یہ دوریاں

دل میں بہار رازِ محبت چھپائے ہے
اے میری زندگی کی محبّت کے رازداں

بہار

ضرورت

"کسی کا قول ہے کہ خدا کسی کو تعلیم دلانا چاہتا ہے تو وہ اُسے مکتب میں نہیں بھیجتا بلکہ ضرورت کے حوالے کر دیتا ہے۔"

ضرورت جس کا دوسرا نام غربت ہے بعض مرتبہ انسان کی پوشیدہ طاقتوں کو نمایاں کر کے ترقی کا ایک ایسا دروازہ کھول دیتی ہے جو اُس کے لئے کبھی بند نہیں ہوتا۔ اِن پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے "ضرورت" سب سے زیادہ مفید چیز ہے۔ آرام و راحت اور دولت و عشرت کو کسی مذہب نے ذریعۂ ترقی نہیں بتایا۔ متمول خاندان کے افراد اس قدر عیش پسند ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اُن سے تحریکِ عمل مفقود ہو جاتی ہے اور یہی اُن کے انحطاط کا وہ زمانہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس میں اپنے آپ کو سنبھال سکے تو خیر ورنہ ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

اگر "غربت" کے مسئلے پر ایک عمیق نظر ڈالی جائے تو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس کا وجود، دنیا کے لئے کسی طرح ایک نعمت سے کم نہیں۔ اگر دنیا میں غربت و مصیبت کا وجود نہ ہوتا تو آج اُس کے مشہور فاتح، جانباز جرنیل، دولتمند تاجر اور بہادر جہازران جن کا تاریخ فخر کے ساتھ ذکر کرتی ہے پیدا نہ ہوئے ہوتے دنیا کے بڑے بڑے لوگ راحت و اطمینان کی آغوش سے محروم رہے ہیں۔ انہوں نے صرف تکلیف و غربت کے دامن میں پرورش پائی ہے۔ ملٹن سائکل کے پہیوں، مائکل فریڈے ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور پروفیسر بل ایک معمولی اپرنٹس کے تجربہ سے متمدن دنیا کا قابلِ فخر انسان بن گیا۔

امریکا میں سب سے زیادہ دلچسپ قصے اُن نوجوانوں کے ہیں جو باوجود افلاس و غربت کے میدانِ ترقی میں برابر آگے بڑھتے رہے اُن کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی دنیاوی زندگی کی ابتدا کی اور کس طرح زمانے کی پیہم مخالفتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس سے بڑھ کر جاذبِ توجہ شاید اور کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا کہ باوجود مشکلات و موانعات کے ایک صمیم العزم انسان کس طرح بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھتا ہے۔ طوفانی مصائب اس کے پاؤں کو لغزش دینے کی بجائے مضبوط کرتے ہیں۔ وہ مشکلات کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُس کا دل قسمت کی مخالفتوں کی پروا نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ زمانے کی یہ مخالفتیں عارضی ہیں۔ قسمت کی برائی امتحان تک ہے۔ اگر وہ استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا تو ایک دن یہی مخالفتیں اُس کے لئے عیش و عشرت کا دروازہ

کھول دیں گی۔

جن کے عزائم بلند اور خیالات پختہ ہوتے ہیں۔ تقدیر اُن کی ترقیوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ ہر سال پختہ عزائم رکھنے والے انسان محض اپنی بلند حوصلگی کی بدولت اس قید و بند سے نکل کر ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو صرف تقدیر کے بھروسے پر اپنی قوتِ عمل کو بے کار و معطل کر دیتے ہیں وہ رفتہ رفتہ پستی کی اُس عمیق ترین گہرائی میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سوائے غربت و فلاکت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

جس چیز سے حیاتِ انسانی استوار ہوتی ہے اُس کی نشو و نما خود اُسی کے دل و دماغ میں ہوتی رہتی ہے۔ جو چیز سب سے زیادہ تحریکِ عمل پیدا کرتی ہے اُس کا نام "احساس" ہے اسی سے انسان اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اُسی کے فقدان سے ذلت و پستی کے خوفناک غار میں گر جاتا ہے۔ اگر کسی انجن میں بھاپ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ پہیوں میں جنبش پیدا نہیں ہو سکتی اور کل پرزے بذاتِ خود کسی انجن کو نہیں چلا سکتے۔ اسی طرح اگر انسان کے احساساتِ مدرکہ میں گرمی نہ ہو تو ارادوں میں پختگی اور مزاج میں استقلال پیدا نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی مشکل تمہارے مقصد سے زیادہ قوی اور تمہارے عزم سے زیادہ راسخ ہے تو یقیناً تم دنیا میں کبھی کامیاب باوقار اور باعزت نہیں ہو سکتے۔ اس لیے سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیئے کہ آیا جو چیز تمہیں ترقی کی منزل سے روک رہی ہے وہ تم سے قوی ہے یا تم اس سے قوی ہو، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری مشکلات تم سے قوی ہیں اور تم میں اُن کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے تو بلاشبہ یہ تمہارے احساسات و عزائم کی کمزوری ہے۔ لیکن اگر تم ان مشکلات و موانع کے باوجود اپنی قوت و جرات کا احساس رکھتے ہو اور تمہیں اس کا یقین ہے کہ تمہاری مشکلات تمہارے عزائم کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتیں تو تم بغیر کسی پس و پیش کے دنیا کی ہر تجارت اور ہر کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہو، پھر جس وقت تمہیں اپنی بلند حوصلگی کا یقین ہو جائے اسی وقت تم دنیا کی مخالفتوں کو ٹھکراتے ہوئے بلا انتظارِ مواقع اپنے کام کو پورے جوش کے ساتھ شروع کر دو۔ اس لیئے کہ جس وقت تم میں بلند حوصلگی کا احساس پیدا ہوا تھا اسی وقت کامیابی نے تمہارے دروازے کھول دیئے تھے

بارہا تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے جو مشکلات ناقابلِ حل معلوم ہوتی ہیں وہ کام شروع کرنے کے بعد خود بخود راستے سے ہٹ گئیں اور کامیابی کے وہ ذرائع جن کا پہلے علم نہ تھا یکے بعد دیگرے سامنے آ گئے۔

وہ لوگ جو ہر کام کو خواہ مخواہ مشکل اور ناقابلِ فتح سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں انہیں کسی کام میں بھی کامیابی

فتح اور امید کی روشنی نظر نہیں آتی - وہ جس زمین کو دیکھتے ہیں اُسے یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ اس میں تخم ریزی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا - لیکن اگر وہ جرات کر کے اپنے اس پس وپیش اور بے جا تامل کو چھوڑ دیں تو پھر یہی ٹھکرائی ہوئی زمین اُن کے لئے مفید و نفع بخش ثابت ہوسکتی ہے - کاش ہر شخص یہ جان لیتا کہ تخم ریزی کے کیا طریقے ہیں اور کن ذرائع سے وہ زیادہ سے زیادہ نفع اپنے کھیتوں سے اُٹھا سکتا ہے - اس لئے کہ بہت سے لوگ اب بھی دنیا میں ایسے موجود ہیں جو تخم ریزی تو کر رہے ہیں لیکن اس سے بے خبر ہیں کہ اُسی زمین کو الٹ پھیر کے جوتنے سے کس قدر کثیر نفع ہوسکتا ہے -

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے وطن میں کاروبار کرنے کے باوجود دوسرے دور و دراز ملکوں میں تجارت کرنے کے دور از کار خیالات میں مبتلا رہتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جب اپنے ہی شہر میں جہاں ہر طرح کے ذرائع انہیں حاصل ہیں - وہ اپنی تجارت کو فروغ نہ دے سکے تو غیر ملکوں اور شہروں میں ایک اجنبی کی حیثیت سے کیا ترقی کرسکتے ہیں - تقدیر آزمائی کے لئے کسی دوسرے ملک یا شہر میں جانے کی ضرورت نہیں خود تمہارے ہی شہر میں ترقی کے تمام ممکن سے ممکن ذرائع موجود ہیں - جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُن شہروں میں جہاں لوگ اپنی بیکاری و بے روزگاری کی شکایت کیا کرتے ہیں کچھ ایسے اولوالعزم انسان بھی پیدا ہوجاتے ہیں جو ترقی کے اعلےٰ مدارج پر پہنچ کر یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ وسائل بشرطیکہ تحریک عمل سلب نہ ہوئی ہو ہر جگہ موجود ہیں -

گورنر جانسن اپنی تقدیر آزمائی کے لئے سینٹ پیٹر سے کہیں باہر نہیں گیا - وہ چند مہینوں کو مستثنیٰ کر کے تمام عمر علم سے بے بہرہ رہا - فرڈ ڈگلس اپنی غلامانہ کاشتکاری کے زمانے میں بھی آفتاب اقبال کو تلاش کرتا رہا - گارفیلڈ نے راہ گیری اور لنکن نے ایک تنگ و تاریک زاویہ میں بیٹھ کر تقدیر کے گوہر کو پالیا -

دنیا میں کسی انسان کی ناکامی و نامرادی کی اگر کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے "مواقع" اور ترقی کے وسائل کو عام سطح سے گزر کر عظیم الشان بلندی اور انتہائی رفعت پر تلاش کرتے ہیں وہ اس قدر بلند ہوجاتے ہیں کہ انہیں سطح عام کی چیز دکھائی نہیں دیتی اور بعض ایسے مواقع اُن کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں جن سے اگر فائدہ اٹھایا جاتا تو یقیناً وہ کامیاب ہوجاتے +

ثاقب کانپوری

راز زندگانی

کسی ٹہنی پہ تھا اک پھول مسرور اور اپنے حسن پر نازاں و مغرور
کہا میں نے سن اے گل بات میری ہے تیری زندگی بس ایک دن کی
تو کیوں ہے اس قدر پھر اس پہ نازاں تو کیوں ہے اس قدر شاداں و فرحاں
ترا کیا جانے کل کیا حال ہوگا کہاں تو خاک میں پامال ہوگا

کہا گل نے میں سب کچھ جانتا ہوں تری ہر بات کو میں مانتا ہوں
مگر میں حرص کا بندہ نہیں ہوں میں اپنی جان کو پھندا نہیں ہوں
فنا کا مجھ کو بالکل غم نہیں ہے چمن میں فکر بیش و کم نہیں ہے
یہ مانا کم ہے میری زندگانی مگر حاصل ہے مجھ کو شادمانی
مری خوشبو سے ہیں گلشن بھی مہکے مری تعریف میں بلبل بھی چہکے
فدا ہیں مجھ پہ ننھے ننھے بھنورے وہ مجھ کو دیکھ کر ہیں رقص کرتے
سحر کو باغ میں آتی ہے جس دم دھلاتی ہے مرا منہ آ کے شبنم

سراپا زیست ہے میری مسرّت
مسرّت — زندگانی کی حقیقت

ر - ب

ہمارا پہلا مقدمہ

"کیوں بھائی بشیر یہ نکٹائی کی گرہ تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں"

"ذرا اُٹھ کر دیکھو وہیں سے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے۔"

"میرے خیال میں تو بالکل ٹھیک ہے۔"

"بندۂ خدا عجب سست واقع ہوئے ہو میں کہہ رہا ہوں ذرا اُٹھ کر دیکھو۔ جانتے ہو ہم آج پہلی دفعہ کچہری جا رہے ہیں۔"

"دیکھئے...... ٹھیک تو ہے۔ ہاں ذرا موٹی ہے کچھ پتلی ہو جائے تو بہتر ہو"

بشیر کے اس اعتراض پر ہم نے گرہ کو درست کرنا شروع کیا۔ اُسے دبایا۔ گردن کو کبھی اس طرف کبھی اُس طرف گھمایا۔ نکٹائی کا ایک سرا کھینچا۔ پھر خوب کھینچا۔ آئینہ دیکھا گرہ بدستور موٹی اور بدنما تھی۔ اُسے پھر دبایا۔ پھر آئینہ دیکھا۔ موٹی تھی۔ نکٹائی کو کھول ڈالا۔ پھر باندھا اور اُسے موٹا پایا۔ اب کے تو ہمیں غصہ آگیا دونوں ہاتھوں سے نکٹائی کے ایک سرے کو پورے زور سے کھینچا۔ مگر سرا باقی حصے سے علیحدہ ہو کر ہمارے ہاتھ میں آرہا۔ مجبوراً دوسری نئی نکٹائی نکالی اب کے گرہ بہت چھوٹی اور پتلی بندھی۔ مگر بشیر کے خیال میں وہ "نہایت موزوں اور خوبصورت" تھی ہم نے بھی سوچا چلو چھوٹی ہی اچھی ہے۔ اِس کے بعد پتلون پہنی۔ محمد دین نے کوٹ پہنایا۔ ریشمی رومال اور "پارکر فونٹین پن" جیب میں رکھ کر ایک دفعہ پھر آئینے میں اپنے حلیے کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ پہلی دفعہ کچہری جا رہے ہیں کوئی نقص نہ رہ جائے۔ اِس خیال کے آتے ہی نکٹائی کی گرہ پر پھر نظر جا پڑی دیکھتے ہی جی میں شک پیدا ہوا کہ گرہ کچہری کی پہلی حاضری کے قابل نہیں۔ بشیر کو بلوایا ——

"بھائی سچ سچ کہنا نکٹائی کی گرہ بدنما تو نہیں؟"

"بھائی جان آپ کو خدا جانے آج کیا ہو گیا ہے۔ گرہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے اچھی گرہ آج تک کسی وکیل سے نہ بندھی ہو گی۔"

"بشیر بھائی مذاق نہ کرو۔ ہمیں آج پہلی دفعہ کچہری جانا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے پھر آئینہ دیکھا۔ کچھ دیر کے لئے عینک اتار کر رکھ دی اور بغیر عینک کے گرہ کو ملاحظہ کیا۔ پھر عینک لگالی اور شیشوں میں سے اُسے پھر دیکھا دل کو تسلی دی کہ بالکل ٹھیک ہے۔

خیر اس کے بعد کھانا کھایا اور کھایا بھی بہت جلدی کھانے کے دوران میں انگیٹھی پر دھری ہوئی گھڑی پر بار بار نظر جاتی تھی خیال آتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے کیونکہ آج پہلی مرتبہ کچہری جانا ہے۔ کھا چکنے بعد صابون سے ہاتھ وغیرہ صاف کئے۔ کلی کی۔ منہ پونچھا ٹوپی سر پر رکھی اور چھڑی ہاتھ میں لے کر گھر سے نکلے۔ بازار میں پہنچے پان فروش کی دکان پر پان خریدنے کے لئے ٹھہرے دکان میں ایک بڑا آئینہ لگا ہوا تھا اُس پر نگاہ جو پڑی تو سب سے پہلے نکٹائی کی گرہ نظر آئی اُسے وہیں کھڑے کھڑے پھر درست کرنے کی کوشش کی اور ایک دو منٹ تک اُس کے ساتھ زور آزمائی کرتے رہے اتنے میں پان لگ چکا تھا۔ لے کر منہ میں رکھا اور چھڑی گھماتے ہوئے کچہری کا راستہ لیا۔ راستے میں خیال آیا کہ پہلی دفعہ کچہری جا رہے ہیں ذرا رعب سے چلنا چاہئے۔ اِس خیال کے آتے ہی کمر کو ذرا اور سیدھا کیا گردن کو اکڑا لیا اور تیز تیز چلنے لگے۔ راستے میں ادھر ادھر بالکل نہیں دیکھا ہاں البتہ ہر دس قدم کے بعد ایک ہاتھ سے یہ دیکھ لیتے تھے کہ گرہ تو ٹھیک ہے ؟۔

غرض کہ دس پندرہ منٹ تک تیز چلنے کے بعد کچہری کے احاطے کے قریب جا پہنچے۔ ایک دفعہ پھر گرہ کو ٹٹولا اور بسم اللہ کہہ کر احاطے کے اندر داخل ہوئے اور لگے اِدھر اُدھر گھومنے۔ احاطے کے اندر دو تین بڑی بڑی عمارتیں تھیں جن کے اردگرد برآمدوں کے اندر۔ برآمدوں کے باہر۔ احاطے میں لگے ہوئے درختوں کے نیچے۔ اِدھر اُدھر لوگ بیٹھے باتوں گپوں اور حقوں میں محو تھے۔ جا بجا لوگ چٹائیوں اور تختوں پر بیٹھے کاغذات لکھنے میں مشغول تھے۔ اِن کے علاوہ اور بہت سے لوگ اِدھر اُدھر گھبرائے ہوئے پھر رہے تھے۔ خدا جانے کیوں ؟ کہیں کہیں ایک آدھا سپاہی بھی نظر آتا تھا۔ ہم کچھ دیر تک اِن عمارات کے اردگرد گھومتے رہے۔ کہیں کہیں کمروں کے باہر بورڈ آویزاں تھے۔ جن پر ڈپٹی کمشنر، سینیئر سب جج۔ مجسٹریٹ دفعہ تیس وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ ایک بورڈ پر نظر پڑی جو ایک کمرے کے باہر برآمدے کے ستون کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ "سب جج" سمجھ گئے کہ یہی وہ کمرہ ہے جہاں پہلے پہلے نئے وکیل جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے ایک عرضی نویس بیٹھا تھا جسے ہم پہلے ہی سے جانتے تھے اُس کے پاس گئے وہ سلام کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم آج پہلی مرتبہ کچہری آئے ہیں۔ ایک کرسی منگوا دو تاکہ ہم ذرا بیٹھ جائیں"۔ وہ بیچارہ بھاگتا ہوا گیا اور ایک منٹ کے بعد کہیں سے ایک کرسی لے آیا۔ ہم کرسی پر بیٹھ گئے اور یوں گویا ہوئے۔

"کیوں جی یہاں کام وغیرہ کی کیا حالت ہے ؟ ہمیں ذرا بتاؤ ہم آج پہلی ہی دفعہ آئے ہیں"

وہ "کام بہت اچھا ہے جناب۔ دیکھئے ابھی ابھی آپ کو کوئی مقدمہ دلوا دوں گا"

ہم نے دونوں ہاتھوں سے نکٹائی کی گرہ کو ٹٹولتے ہوئے ذرا رعب سے کہا "اچھی بات" اور جیب سے اپنی سنہری ڈائری نکال کر اُس کے خالی اوراق کو اِدھر اُدھر الٹنا شروع کیا۔ عرضی نویس اُٹھا اور ایک طرف کو چلا گیا ہم نے موقع پاکر ایک دفعہ پھر نکٹائی کو ٹٹولا۔ اطمینان کرنے کے بعد ایک دم کھڑے ہو گئے۔ پتلون کی کریزوں پر نظر دوڑائی چھڑی کو گھمایا اور پھر کرسی پر بیٹھ کر ڈائری کے اوراق الٹنے شروع کئے۔ ہم بظاہر تو ڈائری کے مطالعہ میں محو تھے مگر در اصل جی میں یہ سوچ رہے تھے کہ چونکہ آج پہلی مرتبہ کچہری آئے ہیں اس لئے لوگوں پر اپنی شخصیت کا اچھا رعب ڈالنا چاہئے۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد جیب سے ایک سگار نکالا اور سلگا کر منہ میں رکھ لیا۔ کمبخت تھا نہایت کڑوا ایک کش کے ساتھ ہی زور زور سے کھانسنا شروع کیا۔ اتنے میں دیکھا کہ وہی عرضی نویس ایک بوڑھے سے آدمی کو ساتھ لے کر ہماری طرف آرہا ہے۔ ہم نے کھانسی روکنے کی کوشش کے ساتھ ہی نکٹائی کی گرہ کو ٹٹولتے ہوئے ایک اور کش لگایا۔ اب کے کمبخت دھواں حلق سے نیچے اتر تو گیا مگر اندر جا کر اکڑ بیٹھا گلا بند ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دم گھٹنے لگا مگر ہم نے ہمت کی اور ایک ہاتھ سے نکٹائی کی گرہ کو سنبھالتے ہوئے کھانس کھانس کر دھوئیں کو باہر نکالنا شروع کیا۔ اس اثنا میں عرضی نویس اور بڈھا بالکل قریب آپہنچے۔

بڈھا (جھک کر) "سلام حضور"

"سلام"

"میرا یہ چھوٹا سا کام تو کر دیجئے"

ہم کھانستے ہوئے بولے "کیا ہے؟"

"جناب میرے حق میں یک طرفہ ڈگری مدعا علیہ کے خلاف ہو چکی ہے۔ مگر اب مدعا علیہ نے اس ڈگری کے منسوخ کرانے کے لئے درخواست دی ہے اور آج پیشی ہے۔ کیا آپ میری طرف سے پیش ہو جائیں گے؟

اس پر ہم نے مسکرا کر عرضی نویس کی طرف دیکھا اُس نے اپنے سر کو ہلایا اور ہم نے فوراً جواب دیا "ہاں ہم یہ کام کر دیں گے"۔ یہ کہہ کر ہم پھر نکٹائی کی گرہ اور سگار کے کڑوے دھوئیں سے زور آزمائی کرنے لگے۔ عرضی نویس اور بڈھا ذرا دور ہٹ کر کچھ دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے جو ہم نہ سُن سکے مگر یہ فقرہ ہم نے بڈھے کا سن ہی لیا "یہ تو کوئی بالکل نیا جا ——ہے کہیں کام ہی خراب نہ کر دے"۔ عرضی نویس آخر ہمارے قریب آیا اور کہنے لگا "لیجئے صاحب فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس پر دستخط کر دیجئے"۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک چھپا ہوا کاغذ پیش کیا جس پر ہم نے اپنے پارکر پن سے دستخط کئے اور کاغذ اُسے واپس دے دیا۔

عرضی نویس (بڈھے سے) لو بابا۔ چل کر وہاں بیٹھو اور آواز کا خیال رکھو۔
بڈھا (جاتا ہوا) "بابو جی کہیں چلے نہ جانا۔ ابھی آواز پڑے گی"
ہم "معمولی بات ہے۔ ہم یہیں ہیں"

بڈھے کے جاچکنے کے بعد عرضی نویس پھر ہماری جانب آیا اور کہنے لگا "لیجئے صاحب مبارک ہو یہ آپ کا پہلا محنتانہ ہے" یہ کہہ کر اُس نے تین روپے ہمیں دیئے اور تھوڑی سی دیر کے بعد پھر بولا "میرا حق دلوا دیجئے۔ آپ کا پہلا مقدمہ ہے اس لئے مجھے اچھے پیسے ملنے چاہئیں" ہم نے ایک روپیہ دیا مگر وہ نہ مانا۔ خیر پندرہ بیس منٹ کی بحث کے بعد اُسے ڈیڑھ روپے پر راضی کیا۔ اس کے بعد ہم پھر اپنی ڈائری کے مطالعہ میں مصروف ہوگئے "مطالعہ" کے دوران میں خیال آیا کہ پہلے مقدمے کے پیسے تو درج کرلیں۔ ۲۰ تاریخ کا صفحہ نکالا اور اُس پر موٹے حرفوں میں لکھا:-

"پہلا دن۔ پہلا مقدمہ۔ پہلا کام۔ یعنی پہلی دفعہ کچہری .... مبلغ ڈیڑھ روپیہ"

یہ لکھ کر ڈائری کو جیب میں رکھ لیا اور کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چھڑی گھماتے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے جی میں خوش تھے کہ پہلی دفعہ آنے پر ہی مقدمہ مل گیا ہے لوگ غلط کہتے ہیں کہ "پروفیشن" کا برا حال ہے اور وکیل دو دو آنے لے کر پیش ہوجاتے ہیں خدا نے ہمیں پہلے دن ہی تین روپے کا کام دلوا دیا ہے"۔

تھوڑی دیر میں خیال آیا کہ چلو "بار روم" میں چل کر اپنی آمد کی خوشخبری سنائیں لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہاں پہنچے۔ برآمدے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے اندر سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں ہم نے حوصلہ کرکے چک اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور ایک پاؤں دروازے کے اندر رکھا ساتھ ہی خیال آیا کہ سگار بجھ چکا ہے ہم نے وہیں کھڑے کھڑے یعنی ایک پاؤں دہلیز کے اس طرف اور دوسرا اُس طرف رکھے اور چک کو کندھے پر اُٹھائے ہوئے جیب سے دیا سلائی نکالی اور لگے سگار سلگانے۔ سگار کا سلگنا تھا کہ زبردست کھانسی کا دورہ شروع ہوگیا اور ہماری بے ڈھب کھانسی کی سقف شگاف آواز نے ایڈووکیٹوں اور پلیڈروں وغیرہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی باتیں چھوڑ کر ہماری طرف توجہ کریں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک دو شریف آدمی اُٹھ کر ہماری طرف آئے ہم نے کھانستے ہوئے کہا "آج ہم پہلی دفعہ کچہری آئے ہیں معمولی بات ہے" اس پر اُن میں سے ایک بولا "کیوں صاحب آپ کا کوئی مقدمہ ہے؟" ہم نے اپنا دوسرا پاؤں دہلیز کے اندر رکھتے ہوئے جواب دیا "ہاں" یہ سنتے ہی اور بہت سے اشخاص ہمارے پاس آگئے اور اس طرح سے سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگے۔

آپ کا کیا مقدمہ ہے؟ آپ کی تاریخ کب ہے؟ آپ کے کاغذات کہاں ہیں؟ آپ کا مقدمہ کونسی عدالت میں ہے؟ تشریف رکھئے "منشی ارے او منشی کرسی لاؤ" آئیے۔ بیٹھئے وغیرہ وغیرہ۔ اتنے میں ایک شخص جو چپڑاسی معلوم ہوتا تھا کرسی لے آیا اور ہمیں دروازے کے قریب ہی بٹھا دیا گیا۔ اور وہ سب لوگ ہمارے اردگرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم جی میں خوش ہو رہے تھے کہ پہلی دفعہ آنے پر ہی اتنی آؤ بھگت ہو رہی ہے اس خیال کے آنے کے ساتھ ہی ہم نے "نکٹائی" کی گرہ کو ٹٹولا اور سگار منہ میں رکھ کر ذرا رعب کے ساتھ مسکراتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ چند مختلف قسموں کے دیگر سوالات کے بعد ایک صاحب پوچھنے لگے" کیوں صاحب آپ نے اپنے مقدمہ کے لئے کوئی وکیل بھی مقرر کیا ہے؟" اس پر ہمیں غصہ آیا اور جی میں یہ خیال کر کے کہ پہلی دفعہ آنے پر بھی ان کو اتنا پتہ نہیں کہ ہم بذات خود ایک معزز وکیل ہیں ہم نے گلا پھاڑ کر جواب دیا "ہم خود وکیل ہیں ہمارا مقدمہ نہیں بلکہ ہمارے پاس کسی کا مقدمہ ہے اور ہم آج پہلی دفعہ کچہری آنے پر پیش ہو رہے ہیں" یہ سن کر اُن لوگوں نے ہمیں یوں دیکھنا شروع کیا جیسے ہم کوئی معمولی درجے کے نہایت کم مایہ آدمی ہیں اُن لوگوں میں سے ایک بولا " اچھا! تو آپ بھی وکیل ہیں؟ خوب" ہم نے سگار کو منہ سے نکال کر جواب دیا " ہاں "۔ یہ سُن کر سب لوگ ہمیں چھوڑ کر اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے اور ہم کچھ دیر تک وہیں یعنی دروازے کے پاس ہی کرسی پر پڑے رہے۔

تھوڑی سی دیر کے بعد ایک خوش وضع نوجوان کھڑے ہوئے اور کہنے لگے " ایک نئے وکیل صاحب تشریف لائے ہیں اور میں آپ سے اُن کا تعارف کراتا ہوں " اس پر آوازیں آئیں " آپ کا نام؟" " آپ کا اسم گرامی" وغیرہ وغیرہ اس کے بعد اُس شخص نے (جو ہمیں بعد میں معلوم ہوا بار ایسوسی ایشن کا سکرٹری تھا) ہمارا تعارف ہر ایک سے کرایا۔ ہم نے ہر ایک سے ہاتھ ملایا اور تعارف سے فارغ ہو کر پھر کرسی پر آ بیٹھے۔ سکرٹری صاحب نے ہمارا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا اور رجسٹر ہمارے پاس لے آئے۔ صفحے کے اوپر ہی موٹے الفاظ میں لکھا تھا "جون ۱۹۲۷ء چندہ ماہواری ایک روپیہ" سکرٹری صاحب کہنے لگے " دو روپے فیس داخلہ اور ایک روپیہ چندہ دے کر مشکور فرمائیے " ہماری جیب میں اس وقت وہی ڈیڑھ روپیہ یعنی ہمارے پہلی مرتبہ کچہری آنے پر ہمارے پہلے مقدمے کی پہلی فیس کی رقم تھی ہم نے جھٹ ہاتھ جیب میں ڈالا جیب میں سے صرف ایک روپیہ نکلا ہم نے باقی تمام جیبیں ٹٹولیں مگر کچھ نہ نکلا ہم نے حیران ہو کر کہا " لاحول ولا قوۃ۔ ہماری اٹھنی کہاں گئی! ساتھ ہی خیال آیا اوہو عرضی نویس نے اٹھنی واپس نہیں دی یعنی اُس سے نصف نصف کا فیصلہ ہوا تھا اور ہم نے اُسے دو روپے دیئے تھے مگر اُس کمبخت نے اٹھنی واپس ہی نہیں دی۔ بہت غصہ آیا۔ خیر۔ ہم نے وہ ایک روپیہ ہی سکرٹری صاحب کی نذر کیا اور کہا کہ باقی رقم یعنی دو روپے ہم کل دیں گے۔ انہوں نے روپیہ تو جیب میں رکھ لیا اور رجسٹر

بن وصولی کے اندراج کے لئے ہم سے ہمارا قلم مانگا۔ ہم نے مسکراتے ہوئے اپنا سنہری پارکر پن جیب سے نکال کر نہیں دیا۔ اُنہوں نے ہمارے نام کے آگے لکھ دیا "وصول . . . . ایک روپیہ" اور اِس کے بعد وہ کچھ اور لکھنے میں مشغول ہو گئے اور ہم باقی لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ کسی نے پوچھا "آپ کا وطن؟" کوئی کہنے لگا "آپ نے کس سال سند حاصل کی؟" کسی نے دریافت کیا "آپ نے اب تک کیوں پریکٹس شروع نہیں کی تھی؟" وغیرہ۔ ہم ہرایک کو باری باری سے مناسب جواب دیتے رہے۔ ہم اِن باتوں میں مشغول تھے کہ دروازے کی چک اُٹھی اور وہی بڈھا ہمارے پہلے مقدمے والا ہمارا پہلا موکل ہانپتا کانپتا داخل ہؤا اور چھوٹتے ہی کہنے لگا۔ "بابو جی جلد آیئے۔ مقدمہ پیش ہو گیا" ہم کھڑے ہو گئے اور بار روم سے نکل آئے اور ہم نے اُس سے پوچھا "کس عدالت میں؟" بڈھے نے جواب دیا "منصف صاحب کی عدالت میں" ہم جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے سب جج کے کمرے کی طرف چلے جی میں خوش تھے کہ ہم اس وقت واقعی اپنا پہلا مقدمہ بھگتنے جا رہے ہیں۔ دروازے پر پہنچ کر دارُ رکے، ٹوپی کو ٹیڑھا کر کے سر پر رکھا، کوٹ کا دوسرا بٹن بند کیا نکٹائی کو ٹٹولتے ہوئے چک اُٹھائی اور اندر داخل ہوئے۔

سب جج صاحب ایک بہت بڑی میز پر بیٹھے کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ دو تین شخص میز کے اس طرف کھڑے تھے جن میں سے ایک پنسل کاغذ ہاتھ میں لئے کبھی اِدھر کبھی اُدھر بغور دیکھتا تھا۔ ہم فوراً تاڑ گئے کہ یہ شخص فریق ثانی کا وکیل ہے خیر ہم بھی وہیں جا کھڑے ہوئے۔ جج صاحب نے کاغذات سے نظر اُٹھا کر کہا "مدعی آگیا؟" ہمارے بڈھے نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "ہاں حضور" جج صاحب کی نظر ہم پر پڑی پوچھنے لگے "آپ مدعی کی طرف سے پیش ہو رہے ہیں؟" ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں"

جج صاحب ۔ (دوسرے وکیل سے) "کیوں صاحب ڈگری کیوں منسوخ کی جائے؟"

وکیل ۔ "صاحب عرض یہ ہے کہ میرے موکل کو آج تک دعوے کی اطلاع ہی نہیں ہوئی یعنی سمن وغیرہ بھی اُسے نہیں پہنچے"

جج صاحب (ہم سے) "کیوں صاحب آپ کیا کہتے ہیں؟"

ہمیں چونکہ کہنا ہی کچھ نہ تھا اس لئے ہم خاموش کھڑے رہے۔

جج صاحب "آپ کیا کہتے ہیں انہیں اطلاع ہوئی تھی یا نہیں؟" ہم بدستور خاموش کھڑے رہے۔

جج صاحب "بولئے کچھ تو فرمایئے"

ہم پھر چپ سادھے رہے۔ جی میں سوچ رہے تھے کہ "ہاں" کہیں یا "نہیں" کیونکہ ہمیں تو کچھ علم ہی نہ تھا۔

اس کے بعد جج صاحب نے ایک کاغذ اُٹھایا اور اُس پر سے کچھ پڑھ کر دوسرے وکیل سے کہا "یہ دیکھئے اطلاع تو باقاعدہ ہوچکی ہے۔ یہ رپورٹ ملاحظہ کیجئے"!

وکیل۔ التماس یہ ہے جناب کہ اطلاع بالکل نہیں ہوئی آپ ان لوگوں کی چالاکیوں سے بخوبی واقف ہیں پیسے دے دلوا کر لکھوا لیا کرتے ہیں"

جج صاحب۔ (ہم سے) آپ کیا کہتے ہیں؟"

ہم (دبی آواز میں) "کچھ نہیں"

جج صاحب "ڈگری کتنے کی ہے"؟

دوسرا وکیل "صاحب چالیس روپے کی"

جج صاحب (کاغذ پر لکھتے ہوئے) اچھا ڈگری برطرف۔ تاریخ ۱۲۔ اگست"

یہ سُن کر سب لوگ عدالت کے کمرے سے نکل آئے ہم کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ جائیں یا وہیں رہیں ہمارا بڑھا بھی چل دیا تھا۔ خیر کچھ دیر کے بعد ہم بھی باہر نکل آئے۔ باہر آکر دیکھا تو بڑھا عرضی نویس سے جھگڑا کر رہا تھا "اچھا وکیل بتایا تھا تو نے۔ اُس کے تو منہ میں زبان ہی نہیں۔ ڈگری بھی گئی" عرضی نویس ہمارے قریب آیا اور کہنے لگا "آپ تو کچھ بولے ہی نہیں میں بھی وہیں ایک کونے میں کھڑا سن رہا تھا" ہم نے کہا "کوئی ڈر نہیں کیا ہوا" اتنے میں دوسرا وکیل بھی آ پہنچا اور پاس سے گزرتا ہوا کہنے لگا "آپ تو بولتے ہی نہیں کچھ۔ کام کرنے آئے ہیں یا تماشا دیکھنے"! یہ سُن کر ہمیں سخت غصہ آیا اور ہم نے لال پیلے ہو کر جواب دیا "چپ رہو جی تمہیں کیا"! اس پر بڑھا عرضی نویس اور وکیل سب کے سب چل دیئے اور ہم وہیں کھڑے رہے۔ جب ذرا غصہ فرو ہوا تو سوچا کہ واقعی غلطی ہوئی کچھ نہ کچھ ضرور کہنا چاہئے تھا۔ وکالت میں بولنے ہی کا تو کام ہے خیر ہم جی ہی جی میں افسوس کرتے رہے اور کچھ دیر کے بعد "بار روم" کا راستہ لیا۔ داخل ہوئے تو دوسرا وکیل پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ ہمارے داخل ہونے پر ادھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں "آیئے آیئے۔ سنا ہے آپ خوب بولتے ہیں"۔ "صاحب کہتے ہیں کہ آپ بحث خوب کرتے ہیں"۔ "فرمایئے مقدمہ جیت لیا"؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ فقرے سُن کر ہمارے غصّے کا پارہ ایک سو بیس ڈگری پر پہنچ گیا۔ چاہا کہ اُس دوسرے وکیل کے کلے پر ایک گھونسا رسید کریں مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ ہم اکیلے ہیں اور وہ لوگ چالیس پچاس۔ جی میں سوچا کاش یہ لوگ لاہور میں ہوتے تو ذرا . . . .

غرض کہ ہم وہیں کھڑے کھڑے غصے سے کانپا کئے اور جی ہی جی میں اپنے حریف کو۔ بار کے ممبروں کو۔ اپنے پہلے مقدمے کو۔ بڈھے کو اور وکالت کے پیشے کو گالیاں دیتے رہے۔ ہم اپنی پوشیدہ گالیوں میں مشغول تھے کہ ایک شخص ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا "آئیے آئیے تشریف رکھئے شروع شروع میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے"۔ ہم نے ذرا درشتی سے جواب دیا "نہیں صاحب معاف فرمائیے۔ ہم اب گھر جا کر ہی آرام کریں گے"۔ یہ کہہ کر ہم بار روم سے نکل آئے اور سیدھا گھر کا راستہ لیا۔ واپسی میں اِدھر اُدھر بالکل نہیں دیکھا۔ سڑک کے ایک کنارے چلتے رہے یہاں تک کہ نکٹائی کی گرہ کی بھی خبر نہ لی۔ جب گھر کے قریب پہنچے تو خیال آیا کہ چھڑی کہیں کچہری میں یا بار روم میں رہ گئی ہے۔ نہایت افسوس ہوا۔ خیر۔ گھر کے اندر داخل ہوئے اور سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے۔ کوٹ اتار کر رکھنے لگے تو اوپر کے جیب پر نظر جا پڑی۔ سنہری پارکر پن غائب تھا۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد خیال آیا کہ بار ایسوسی ایشن کے سکرٹری نے رجسٹر میں ہمارا نام وغیرہ درج کرنے کے لئے لیا تھا اور اُس بدمعاش نے واپس نہیں دیا۔ اِس نقصان پر اور زیادہ غصہ آیا۔ کوٹ کو میز پر پھینک چارپائی پر دراز ہوگئے۔ اور جی ہی جی میں اپنے پہلے مقدمے کے واقعات کو دھرانے لگے۔

ہمارے پہلے مقدمے کی خاص باتیں جو اس روز پیش آئیں یہ تھیں۔

(۱) مقدمہ کی فیس تین روپے جن میں سے دو روپے عرضی نویس ہضم کر گیا اور باقی ایک روپیہ بار روم کی نذر ہوا۔

(۲) ہماری چاندی کے دستے والی چھڑی کہیں رہ گئی۔

(۳) پارکر پن یعنی سونے کے نب اور سونے کے کلپ والا قلم بار ایسوسی ایشن کا سکرٹری کھا گیا۔

لطیف الرحمٰن

ہر بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔

زندگی کو بہار کے پھولوں کی طرح اور موت کو خزاں کے پتوں کی طرح خوبصورت بناؤ۔

یہ ظلمت کا نظر نہ آنے والا شعلہ کیا ہے جس کی چنگاریاں آسمان کے ستارے ہیں۔

یہ دنیا وحشی طوفانوں کی دنیا ہے جسے حسن کی موسیقی نے رام کر رکھا ہے۔

ٹیگور

محفلِ ادب

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسا لے   چھوڑ دے مسجد اور شوالے
دل کی دنیا کرے روشن   اپنے گھر میں جوت جگا لے
پریت ہے تیری ریت پرانی   بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دکھیاری   دکھیارے ہیں سب نر نار
توہی اٹھا لے سندر مرلی   توہی بن جا شام مرار
تو جاگے تو دنیا جاگے   جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
گائیں تیرے گیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اترا ڈیرا   چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن   ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہر داروں کی سنگت میں   کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
من ہے تیرا میت
بسا لے
اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے   دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اصلی روپ میں آجا   توہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا   من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے ۔۔۔ سرجائے پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری ۔۔۔ جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہے جلدی کر لے ۔۔۔ تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
وقت نہ جائے بیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

"مخزن"

دنیا کی تقسیم اور شاعر کا حصّہ

"آگے بڑھو، یہ دنیا سامنے ہے، اسے لے لو! ہاں وقت آگیا ہے کہ دنیا پر قبضہ کر لو! میں تمہارا خالق، تمہیں اور تمہارے بعد تمہاری نسلوں کو یہ میراث دیتا ہوں۔ یہ دنیا تمہاری ہے۔ تمہاری جاگیر ہے۔ ہمیشہ کے لئے صرف تمہاری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے بھائیوں پر ظلم کرنے لگو، کیونکہ میں ظلم سے ناراض ہو جاؤں گا"

اس طرح خدا نے آسمان پر سے پکار کر انسانوں سے کہا ہر آدمی معبود کی آواز سن کر اپنا حصہ لینے دوڑا۔ بوڑھے اور جوان سب تیزی سے آگے بڑھے۔ کسانوں نے زمین کی پیداوار پر قبضہ کر لیا۔ شکاریوں نے جنگلوں پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ بادشاہوں نے راستے روک لئے اور چلائے زمین ہماری ہے محصول دیتے جاؤ

جب سب نے اپنا اپنا حق لے لیا تو شاعر دور سے آتا دکھائی دیا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں نیچی تھیں وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آہ اب کوئی چیز بھی باقی نہ رہی تھی۔ شاعر کے سامنے میدان خالی پڑا تھا۔

شاعر روتا ہوا خدا کے عرش کے سامنے گر پڑا۔ اپنے مولا کو پکار کر شکایت کرنے لگا۔ آہ میں تیرا وفادار بندہ برباد ہو گیا! تو نے سب کو دیا، مگر مجھ اکیلے کو بھلا دیا!"

"غافل تو کہاں تھا؟" خدا نے شاعر سے کہا۔ "تو تو عالم خواب میں پڑا تھا۔ اب مجھ سے جھگڑنے کیوں آیا ہے؟"

"میرے معبود!" شاعر نے کہا۔ "میں تیرے جوار میں کھڑا تھا۔ تیرے رخ انور کے تماشے میں محو تھا۔ تیرے آسمانوں کے گیت مجھے مسحور کئے ہوئے تھے۔ کیا تو اُسے معاف نہیں کرے گا جسے تیری نورانی شراب نے

مدہوش کر دیا تھا، جسے تیرے جمال نے غافل کر دیا تھا۔"

"اب میں کیا کروں" ؟ خدا نے کہا۔ "وقت نکل گیا، دنیا بٹ گئی ہیں کسی کا حصہ چھین نہیں سکتا لیکن ہاں اگر تو میرے ساتھ آسمان پر رہنا چاہے تو دیکھ، آسمان کے یہ دروازے تیرے لئے کھلے ہیں۔ میرے اچھے شاعر! چلا آ، میرے ساتھ رہ" میں تجھ سے محبت کروں گا۔ اپنا بے نقاب چہرہ تجھے دکھا دوں گا اس سے زیادہ تو اور کیا تمنا کر سکتا ہے ؟"

"شلر" "ریاست"

عربی حسن کی ایک تصویر

اُس کی پیشانی آئینہ کی طرح صیقل زدہ ہے، اُس کے بال حد سے زیادہ سیاہ تاب ہیں اور ایسے گھنے اور لمبے ہیں جیسے گھوڑے کی دُم جب وہ جوڑا کھول دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک زنجیر لٹک رہی ہے اور جب کنگھی کرتی ہے تو بال ایسے چمکتے ہیں کہ گویا انگور کے خوشوں کو بڑی بڑی بوندوں کے بادل نے سیراب کیا ہے اور بھویں قلم سے کھینچی گئیں یا کاجل سے سیاہ کی گئی ہیں جیسے موٹی ہرنی کی آنکھوں پر کمانیں (بھویں) ہوتی ہیں اور اُن کمانوں کے وسط میں ستواں ناک اس طرح نمایاں ہے جیسے تلوار کی دھار اُس کی دونوں جانب گورے چہرہ پر جس کا رنگ موتی کی طرح ہے دو ارغوانی گال ہیں اور گالوں کے بیچ دہن انگوٹھی کے مشابہ ہے۔ ہونٹ شیریں اور اوپر نیچے کے چار دانت نہایت چمکدار ہیں جس کے اندر ایک فصیح اور متحرک زبان ہے۔ بڑی عاقلہ اور حاضر جواب ہے۔ جب اُس کی سفید نقرئی گردن کو حرکت دی جائے تو سرخ لبوں کا پانی شہد جیسا میٹھا ہے اور سینہ پر گردن ہاتھی دانت کی مورت کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ بازو گول ہیں۔ جس سے ملے ہوئے ہاتھ ہیں اور اس درجہ نرم ہیں کہ اُن میں ہڈی معلوم ہوتی ہے نہ رگیں اور ہتیلیاں ایسی نرم ہیں کہ چاہو تو انگلیوں کو اس سے ملا سکتے ہو۔

"علی گڈھ میگزین"

نواہائے راز

بخواہم بادۂ دیگر وزاں کیف و کمے دیگر	جہاں بیں جام دیگر دیدہ افروز جمے دیگر
مپرس اے ہم نشیں از من ز دنیا و ز شر و شورش	کہ من با جام عشق افتادہ ام در عالمے دیگر
نمک از خندہ اش باشد علاج زخم پنہانم	نمک پروردۂ عشقم بخواہم مرہمے دیگر

نمی ارزد بجز باغِ گیتی روضۂ رضواں — نمی خواہم بہشتے دیگر اندر عالمے دیگر
تو بہر امتحانے دیگرے پیدا کن ابلیسے — کہ شاید از دگر خلدے برآید آدمے دیگر
بہ مہر آں حسن کامل چوں مشعبدمی کند بازی — دمے پیدا کند اما کند پنہاں دمے دیگر

از یں پستی بہ آں رفعت نگاہم بردہ خاکم را
کہ من در عالمے و سایہ ام بر عالمے دیگر

حامد علی خاں — "انقلاب"

زندگی ہنوز ایک راز ہے

چکاگو یونیورسٹی نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کو اُس کے سولہ پروفیسروں نے مل کر تصنیف کیا ہے اور جس میں علوم و فنون کی ترقیوں کی تفصیل کی ہے، اس کتاب میں ایک فقرہ یہ ہے "ہم پر فرض ہے کہ ہم نہایت صراحت کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ زندگی کا اصلی راز اب تک لاینحل ہے اس کے حل کرنے کے لئے بہتر سے بہتر جو طریقہ ہمارے پاس ہے وہ ہنوز ابتدائی مفروضات ہیں ، زندگی کی ابتدا اور آغاز کی حقیقت کی گرہ اب تک ناخنِ عقل سے کھل نہیں سکی ہے اور جمادات اور زندہ مخلوقات کے درمیان جو ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی وہ اب تک اسی طرح ہے۔"

"معارف"

لفظِ ڈاکٹر

آج کل ڈاکٹر کا لقب، متعدد علوم و فنون کے ماہروں کو دیا جاتا ہے، مگر اس لفظ کے ابتدائی معنی اس قدر عام نہیں ہیں، ڈاکٹر لاطینی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے اصلی معنی معلم اور استاد کے ہیں، قرونِ وسطیٰ میں یہ لقب دینیات اور منطق کے معلموں کے لئے مخصوص تھا، جو اس زمانہ میں لاطینی زبان میں ان دونوں علموں کی تعلیم دیا کرتے تھے اور پھر جب لاطینی زبان میں طب کی بھی تعلیم شروع ہوئی تو طبیبوں کو بھی ڈاکٹر کہنے لگے، قانون کے کامیاب علماء کو ڈاکٹر کا لقب سب سے پہلے ۱۱۳۰ء میں بولونی فرانس میں دیا گیا، پھر اس لفظ نے یہاں تک وسعت اختیار کی کہ اب فلسفہ، زبان، تاریخ، موسیقی، اور دوسرے علمی شعبے کے ماہروں کو بھی یہ لقب دیا جانے لگا۔

"معارف"

تبصرہ

رسائل

"تعلیم و تربیت"۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کا سہ ماہی رسالہ ہے جو ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب پی ایچ ڈی، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی اور خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے ایم ای ڈی ایسے ماہرین تعلیم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ ہندوستان تعلیم کے معاملہ میں دنیا کے مہذب ممالک سے ابھی بہت پیچھے ہے اور اس قسم کی کوئی باقاعدہ اور منظم تحریک بھی موجود نہیں جو ہماری قوم کو تعلیمی ضروریات اور اصلاحات سے روشناس کرتی رہے، دنیا کے تازہ ترین تعلیمی تجربات سے آگاہ کرے اور دوسری قوموں کے بار آور تعلیمی انقلابات سے ہر وقت ہم کو باخبر رکھے۔ یہ رسالہ انہیں کمیوں کو پورا کرنے کے لئے بعض دور بین اور ترقی پسند اصحاب نے جاری کیا ہے، چنانچہ ہر جانیہ میں "صنعتی تعلیم"۔ "جامعات اسکاٹستان" اور "ایک مدرسۂ جدید بلجیم میں" وہ مضامین ہیں جن سے ان مقاصد کی تکمیل بوجہ احسن ہو رہی ہے۔ باقی تمام مضامین بھی نہایت بلند پایہ ہیں۔ جو اصحاب ملک کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لیتے ہوں اور تعلیم و تربیت کی تحریکات جدیدہ سے واقف رہنا چاہتے ہوں انہیں یہ رسالہ ضرور پڑھنا چاہیئے حجم ڈیڑھ سو صفحے سے زیادہ اور قیمت پانچ روپے سالانہ ہے کاغذ کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے۔

"مخزن" کا سالگرہ نمبر"۔ "مخزن" ایک ایسا رسالہ ہے جس نے دور حاضر کی عامیانہ روش سے انحراف کرتے ہوئے ملک کے سامنے مفید اور متین ادبیات پیش کرنے کے لئے اپنی کوششیں وقف کر دی ہیں حضرت حفیظ جن کے ہاتھ میں اس رسالے کی عنانِ ادارت ہے نہایت سلیم مذاق رکھتے ہیں۔ اور انہوں نے سالگرہ نمبر کو ہر پہلو سے قابل تعریف بنایا ہے اُن کی کہانی "افسانہ در افسانہ" اور اُن کی نظم "تربیت کا گیت" اس نمبر کے بہترین مضامین ہیں حفیظ کی تحریر میں جھوٹی شان و شوکت نہیں اور نہ اُن کے تخیل میں دور از کار بلند پروازی ہے۔ اُن کا افسانہ ہماری تہذیب اور تمدن کا صحیح صحیح نقشہ ہے۔ اور اس پر اُن کی ٹھیٹ اور سلیس زبان نے اُسے اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔ پرچے کا حجم ڈیڑھ سو صفحات کے قریب ہے اور قیمت چودہ آنے (۱۴ر) منیجر "مخزن" بھاٹی گیٹ لاہور سے طلب فرمائیے۔

"طور" لاہور سے اس نام کے ایک نئے علمی و ادبی مصور رسالے کا اجرا ہوا ہے جلال الدین صاحب اکبر جن کا کلام اکثر ہمایوں میں شائع ہوتا رہتا ہے اس کے ایڈیٹر ہیں۔ رسالہ کو کارآمد اور دیدہ زیب بنانے میں انہوں نے کافی محنت کی ہے اور اس کے لئے مشہور ادیبوں سے مضامین حاصل کئے ہیں۔ رسالے کی اُٹھان شاندار ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ

یہ خوب ترقی کرے گا۔ اپنے ناظرین سے ہم سفارش کرتے ہیں۔ کہ وہ بھی "طور" کی سپر کریں"۔ طور ہر ماہ کی سولھویں تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ ملنے کا پتہ :۔ مینجر رسالہ "طور" شیراں والا دروازہ لاہور

"پیمانہ" مولانا سیماب اکبر آبادی اور جناب ساغر نظامی نے اس رسالے کو تیسری مرتبہ دار السلطنت دہلی سے جاری کیا ہے۔ ساغر و سیماب کے احباب اُن کے طرزِ تحریر اور اُن کی ادبی قابلیتوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے ہمیں یہاں اُن کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پیمانہ اپنی تمام قدیم خصوصیات کو لئے ہوئے تیسری مرتبہ دور میں آیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ میکشانِ ادب اس کا پُر جوش خیر مقدم کریں گے۔ رسالہ مصور ہے حجم ۸۰ صفحے ہے سالانہ قیمت للعہ ر علاوہ محصول ملنے کا پتہ دار التصنیف دہلی۔

تصاویر

یورپ کے بہترین مصوّروں کے شاہکار۔ یہ پچیس کارڈوں کا ایک خوبصورت اور نفیس مجموعہ ہے جن پر اعلیٰ درجہ کے رنگ و روغن سے یورپ کے اُن مصوروں کی حُسن کاری کے منتخب شاہکار جمع کئے گئے ہیں۔ جو اقلیم فن میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ رنگوں کی نمائش شگفتہ اور دل کش ہے۔ اور کارڈوں کے کنارے سنہری ہیں بعض تصاویر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً دولت کا تعاقب۔ محوِ دریا۔ محبت کا دروازے کے باہر۔ طوفان۔ رومیو اور جولیا۔ اقلیمِ خداوندی کا سفر۔ حرم کا نیا چراغ۔ جھولا۔ دریافتِ موسیٰ علیہ السلام۔ سحرِ موسیقی۔ روتھ اور ناومی۔ ماں اور بچہ۔ رفعِ نقاب اور اندھا بھکاری۔ دولت کا تعاقب اتنی وسیع المعنی تصویر ہے کہ اُس کو دیکھ کر مصور کے دماغ کی داد دینی پڑتی ہے۔ دولت کی دیوی ایک پانی کے بلبلے پر سوار اُڑی چلی جارہی ہے اِس کے پیچھے ایک کم عرض پل پر جس کے نیچے زور شور سے ایک دریا بہ رہا ہے دو سوار اِس دیوی کے تعاقب میں اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا رہے ہیں۔ سواروں میں سے ایک غالباً ناکامی اور نامرادی کا بھوت ہے جو دولت کے تمنائی کو روک رہا ہے مگر وہ ہر خطرے سے بے پروا ہو کر چلا جاتا ہے اُس کے گھوڑے کے پاؤں تلے ایک نازنین کچلی جارہی ہے جس کا شاید یہ مطلب ہے کہ وہ دولت کے حصول کے لئے دنیا پر ہر ظلم و ستم توڑنے کے لئے تیار ہے محوِ دریا میں دکھایا گیا ہے کہ غروبِ آفتاب کے وقت ایک لڑکی سمندر کے کنارے پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کی موجوں کے زیر و بم میں محو ہے۔ اس تصویر کی خوبی یہ ہے کہ اس کی ہر چیز حیرت میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ محبت دروازے کے باہر ایک ایسی تصویر ہے جس سے محبت کی مجبوریاں ٹپک رہی ہیں۔ اسی طرح تمام تصویریں نہایت بلیغ اور پُر معنی ہیں۔ البتہ دو تین تصاویر میں عریانی بھی موجود ہے گو باعتبارِ فن ہم اُن میں بھی کوئی نقص نہیں پاتے۔ مجموعہ کی قیمت للعہ روپے ہے۔ ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس ۱۲۵ لاہور سے منگائیے۔

۹۰ فیصدی شریف المخلوقات کی دائمی تکالیف کا قلع قمع

قبض اصل بدہضمی جو تمام امراض کی جڑ ہیں۔ تقریباً ۹۰ فیصدی انسان ان سے نالاں ہیں۔ طرح طرح کی تدابیر کرتے ہوئے بھی پوری صحت حاصل نہیں کر سکتے بلکہ دیگر امراض کے شکار بن جاتے ہیں۔ ایسے کیلئے ہماری تیار کردہ مشہور عالم آتنک نگرہ گولیاں غیبی امداد ہیں۔ یہ گولیاں قبض بدہضمی کو دفع کرکے معدہ کو مضبوط بناتی ہیں۔ قوت ہاضمہ کو تیز کرکے خوراک اچھی طرح ہضم کرکے خون صالح پیدا کرکے اعلےٰ درجہ کی طاقت و توانائی بخشتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے امراض کے شرطیہ علاج ہیں۔ لاکھوں اشخاص مستفید ہو کر صحت حاصل کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ ضرور تجربہ کریں۔ قیمت فی ڈبیہ ۱۶ روز کیلئے صرف ایک روپیہ۔ پانچ ڈبیاں صرف چار روپے۔ للعہ ر

امرتار نواو ہیرنی (بجرا ابجیات) نحیف الاجسام۔ ضعیف الدماغ و قوائے کے لئے امرتار نواو ہیرنی بہ صفت موصوف ہے۔ جسم کو معتدل فربہی دیکر دماغ اور دل کو فرحت بخشتا ہے۔ قبل از وقت کی ضعیفی کو دور کرکے قوی الجسم بنا دیتا ہے۔ مقوی آیورویدک ادویہ کا مرکب ہے۔ نہایت لذیذ اور مزیدار صبح بطور ناشتہ ایک تولہ استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ۱ صرف دو روپیہ عہ ر

وید شاستری منی شنکر گووندجی جام نگر کاٹھیاواڑ

اصلی ہارکہ ڈی فیری آف دی ہوم

شوکین رعایت

گھر کی زینت

بیگمات کیلئے نہایت کارآمد تحفہ!

پیارے ناظرین۔ صرف ایک عرض کر دینا میرا فرض ہے آگے عمل کرنا مشغلہ آپکا کام ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنی شریف بیگمات اور عزیز لڑکیوں کو بیکار نہ رہنے دیں۔ ورنہ وہ کاہل سست اور ہمیشہ کیلئے مریض ہو جاوینگی۔ اگر آپ انکو ہنر کے میدان میں ترقی کروانا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک کشیدہ کاڑھنے کی مشین انکو خرید کر دیں۔ پھر دیکھیں کہ وہ کمرے کی سجاوٹ کیلئے کیا کیا چیزیں تیار کرتی ہیں۔ اس مشین سے تھوڑے ہی عرصے میں اور ذرا سی محنت سے نہایت خوبصورت اور نفیس اونی اور ریشمی کشیدہ کاری بہت بڑھیا اور پائیدار بنائی جا سکتی ہے۔ اس مشین سے بنات مخمل ململ و لٹھا و دیگر تمام قسم کے موٹے کپڑوں پر اعلےٰ درجے کے نقش بیل بوٹے۔ پھول پتے۔ تکیوں کے غلاف۔ بچوں کی ٹوپیاں۔ مخمل کی گورگابیاں سلیپر۔ ٹیبل کلاتھ۔ جھالر۔ حروف۔ جانور وغیرہ ہر قسم کی گلکاری اس مشین کے ذریعے نہایت آسانی سے بنائی جاتی ہیں کوئی گھر کوئی گرلز اسکول اس مشین سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ اسکی ترکیب استعمال نہایت ہی آسان ہے۔ جو کہ ہمراہ مشین ارسال ہوگی۔ ایک مشین ضرور منگوائیں۔ بڑے کام کی چیز ہے۔ غریبوں کے لئے روزگار کا شریفانہ ذریعہ اور امیر گھروں کی زینت اور سجاوٹ کا تحفہ ہے۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت صرف درجہ اول تین روپے آٹھ آنہ درجہ دوم دو روپیہ آٹھ آنہ۔ نقلی ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ محصول معاف۔ گول فریم بڑھیا دو روپے درجہ دوم ۸ ریشم کی لچھیاں ۱۲ درجن ان اشیا کا محصول ڈاک علاوہ یکمشت تمام اشیا یعنی مشین۔ فریم دھاگہ ریشم منگوانے پر محصول ڈاک معاف
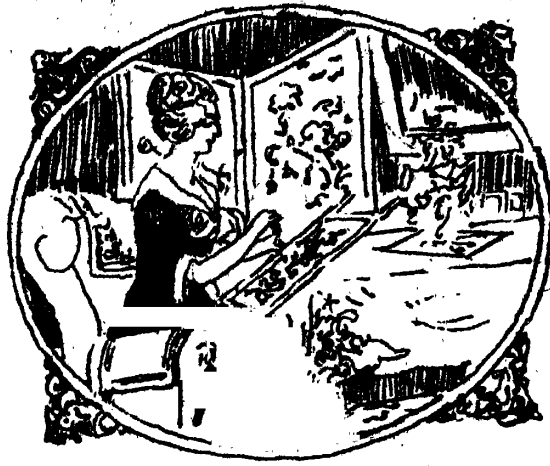
فہرست مفت طلب کرو

پتہ: دی ناولسٹی مارٹ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۷۔ لاہور پنجاب

نو ایجاد قابل دید اور عقل دنگ کرنیوالے تحفے

کشمیری مصالحہ

تمام دُنیا کو معلوم ہے۔ کہ کشمیریوں کا کھانا نہایت لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔ اسواسطے ہم نے اس مصالحہ کو بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کیا ہے۔ ایک سیر چیز مثلاً گوشت و ترکاری۔ دال وغیرہ پکاتے وقت ایک چمچہ ڈالدیجئے۔ نئی رُوح پھونک دیگا۔ یہ روح طعام ہے۔ اور صحت دوام کے لئے اکسیر ہے۔ جہاں یہ کھانے کو لذیذ بنا دیتا ہے۔ وہاں اسکے استعمال سے بدہضمی۔ کھٹے ڈکار۔ اور ہر قسم کی معدے کی تکلیفوں کو چند روز میں فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور معدہ کو نئی طاقت دیتا ہے۔ خوبصورت ڈبوں میں بند کیا ہوا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ صرف ایکروپیہ آٹھ آنہ۔ تین عدد بکس چار روپیہ محصولڈاک معاف۔ ایک دفعہ منگوا کر ضرور آزمائش کریں ۔

جرمن کی حیرت انگیز بالکل نئی ایجاد

یعنی خودبخود ضرب دینیوالی نالٹی پنسل معہ ہولڈر ہے۔ یہ پنسل عقل ہی میں جرمن سے بن کر آئی اسکی ہر ایک کلرک۔ منشی۔ سٹوڈنٹ وغیرہ کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے بھی لگا ہوا ہے قیمت ۳ عدد عہ

سالانہ رعایتی اعلان

خریدار کو ساتھ ایک عدد انگلینڈ کا بنا ہوا وکٹوریا آفیسر اسکے ساتھ ہولڈر فی درجن عہ محصول معاف یکمشت ایک درجن کے ۳ درجن کے خریدار گولڈ پلیٹیڈ لاسلف فونٹین پن مفت بطور انعام دیا جائے گا۔ کو ایک عدد ریلوے ریگولیٹر پاکٹ واچ گارنٹی چار سال معہ چین کیس بکس ساتھ مفت دینگے جلد آرڈر دیں خریداران تھوک کو رعایت

کپڑے سینے کی مشین

یہ مشین بڑی مشین کی طرح ہی سلائی کرتی کرتی ہے۔ لڑکیوں کو کام سکھانے کے لئے مفید اور اعلیٰ چیز ہے۔ سائز ۷×۷ انچ ہے۔ رعایتی قیمت نو روپے لعہ محصولڈاک معاف ہے

گراموفون باجہ

یہ جرمن کی حیرت انگیز ایجاد ہے۔ کاریگر نے اس گراموفون کو اس حسن و خوبی سے تیار کیا ہے گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ خوبی یہ ہے۔ کہ ہارن بھی بکس کے اندر بند ہوکر ایک خوشنما ہلکا بکس بن جاتا ہے۔ جیسے جہاں چاہیں۔ سفر میں اپنے پاس رکھیں اور جسوقت چاہیں طرح طرح کے گانوں سے لطف اُٹھائیں :۔ رعایتی قیمت فی عدد بارہ روپیہ للعہ اسکے ہمراہ ایک ریکارڈ ساتھ مفت دیا جاوے گا ۔ فالتو ریکارڈ۔ جو دونوں طرف بجینگے۔ قیمت فی عدد ایکروپیہ چار آنہ عہ۔ فی درجن بارہ روپے۔ فالتو سوئیاں کا بکس ۱۲/۔ آرڈر دیتے وقت پیشگی کا ضرور خیال رکھیں۔ ملنے کا پتہ ہمیشہ یاد رکھیں۔ ایک کارڈ لکھکر ترکرو جنتری مفت منگوائیں ۔

پتہ۔ ترکرو اینڈ کمپنی (الف) مچھی ہٹہ بازار لاہور۔ (پنجاب)

رفیق حیات رجسٹرڈ

امراض سینہ کیواسطے یہ شربت مثل انگریزی ایل شربت کیموافق دیسی لعوبات سے تیار کیا گیا ہے۔ جسکے استعمال سے ہر قسم کی کھانسی رفع ہو جاتی ہے۔ بدن میں تازہ خون پیدا کرتا ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ مقوی اعضاء رئیسہ ہے۔ دائمی کھانسی نزلہ۔ ذات الجنب تپ کہنہ جملہ امراض سینہ کا شرطیہ علاج۔ مرد اور مستورات صاحبان کو بہت طاقت دیتا ہے۔ دماغی کام کرنیوالے اصحاب بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سل اور دق کے مریض بھی اس سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ بیمار اور تندرست یکساں اٹھا سکتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ۲۰ خوراک آٹھ اونس ایک روپیہ (عہ) محصول بذمہ خریدار

سات سو سے زائد ہر مرض کے مجربات قابل اطمینان جن کی تفصیل اور فوائد ایک سو بیس (۱۲۰) صفحہ کی مع جنتری فہرست ہذا میں موجود ہے۔ جو کہ طلب کرنے مفت روانہ کیجاتی ہے۔

بیرونجات کے پارسلوں کی فوراً تعمیل کیجاتی ہے۔ مرکب نسخہ جات بھی اجرت پر تیار کئے جاتے ہیں حکیم اور دوا کا ملا صاحبان کو خاص رعایت

المشتہر مینیجر قدیمی مشہور و مستند دواخانہ یونانی دہلی رجسٹرڈ بازار مچھی ہٹہ لاہور پنجاب

...اخبار الغازی جالندھر شہر سے

ضرورت

۱- دو تجربہ کار کاتبوں کی۔ کم سے کم تنخواہ جو منظور ہو اور سابقہ تجربہ تحریر کریں۔
۲- ایک لائق اور تجربہ کار سب ایڈیٹر کی جو ساتھ ہی ایک ماہوار رسالہ کی ایڈیٹری بھی کر سکے کم سے کم تنخواہ لکھئے۔
۳- ایک سو اشتہاری و فروختنی ایجنٹوں کی
۴- ... مستقل طور پر اشتہار دینے والوں کی۔
۵- اعزازی نامہ نگاروں کی جو علاوہ مضامین ارسال کرنے کے مقامی خبریں بھی لکھتے رہیں اخبار مفت بھیجا جائیگا
۶- ایک ایڈورٹائزنگ مینجر کی۔ درخواست کے ساتھ کم سے کم تنخواہ اور سابقہ تجربہ لکھئے۔
۷- ایک تجربہ کار مصور کی کم سے کم تنخواہ لکھئے۔

المشتہر مینجنگ پروپرائٹر اخبار "الغازی" جالندھر شہر

انعامی مقابلہ

مندرجہ ذیل مضامین پر غازی کے کپ بطور انعام دیئے جائینگے تمام مضامین ۳۱ مئی تک غازی ٹریڈنگ کمپنی (ن ہ) بستی نو جالندھر کے دفتر میں جانے چاہئیں۔ انعامات ۱۵ جون کو تقسیم ہونگے ہر مضمون کے ہمراہ ۲ ایک ایک پیسہ والے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

۱- تجارت اس کی دیگر اقسام اور اسکی دیگر پیشیوں پر فوقیت
۲- اشتہار۔
۳- ۱۰ عدد ملی یا صنعتی مصنوعات۔
۴- تجارتی خط و کتابت یا غازی تجارتی ڈائرکٹری کے سرورق کا ڈیزائن
۵- میل آرڈر بزنس یا خانہ داری۔
۶- بیمہ یا جائنٹ سٹاک کمپنیاں
۷- بہی کھاتہ یا کوئی تجارتی نوع کا افسانہ۔

المشتہر مینجر غازی ٹریڈنگ کمپنی (ن ہ)
بستی نو جالندھر پنجاب

...روزنامہ "الغازی" جالندھر شہر کا سالانہ چندہ

...وام سے ۶ ر
...لباء سے ۵ ر
...اجروں سے (مع اندراج نام و پتہ سال بھر تک) ۱۵ ر
...وساء سے ۲۵ ر
...الیان ریاست سے ۵۰ ر
...ائبریریوں سکولوں اور کالجوں سے انجمنوں اور سوسائیٹیوں سے جنکے ممبروں کی تعداد کم سے کم ۱۰۰ ہو } سے ۳ ر

نمونہ مفت منگوائیں

المشتہر مینجنگ پروپرائٹر اخبار "الغازی"
جالندھر شہر

نسوانی دنیا کو مژدہ

یعنی رسالہ نور جہاںؒ کا معرکۃ الآرا سالانمبر

جو محض عورتوں ہی کی خالص کوشش اور محنت سے پونے دوسو صفحات کی ضخیم۔ شاندار اور باتصویر لطیف ادبی کتاب کی صورت میں ابھی ابھی شائع ہوا ہے اور ہاتھوں ہاتھ خریدا جا رہا ہے (اس رسالہ کی ایڈیٹر منیجر اسسٹنٹ منیجر اور کلرک وغیرہ کل کی کل عورتیں ہیں۔ جو نہایت قابلیت سے تمام انتظام و انصرام کو انجام دے رہی ہیں۔ اس سالانہ نمبر میں ایڈیٹر صاحبہ کی چار بڑی بڑی شاندار دلچسپ نظموں کے علاوہ دیگر مشہور شاعرہ و ادیب خواتین ہند کی گراں پایہ نظمیں اور مضامین و افسانے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے مسلم الثبوت اور ہر دل عزیز ادیب و شاعر بھائیوں کے شاہکار نظم و نثر بھی موجود ہیں۔ نصیحت آموز عبرت انگیز اور روح عمل کو بیدار کرنیوالے ضمیر کو مضبوط تر بنانیوالے دلچسپ و دلکش افسانے بھی ہیں غرضکہ یہ نسوانی رسالہ حقیقی معنوں میں نسوانی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ گراں قدر مردانہ رسائل سے کسی طرح کم دلچسپ نہیں ہے جنس اناث کیلئے تو ایک بے نظیر تحفہ ہے۔ لیکن مرد بھی اسے ہاتھوں ہاتھ خرید رہے ہیں۔ جلد منگوائیے۔ ورنہ بعد میں مایوسی ہوگی۔ قیمت سالانہ نمبر ایک روپیہ (عہ؍) لیکن اگر آپ چار روپیہ کا منی آرڈر کردیں۔ تو آپکو علاوہ سالانہ نمبر کے رسالہ نور جہاںؒ سال بھر تک ملتا رہیگا۔

منیجر رسالہ نور جہاںؒ منزل امرتسر

مشہور و معروف

رسالہ زمانہ کانپور

کا پچیس ۲۵ سالہ جوبلی نمبر

آخر فروری ۱۹۲۸ء میں

شائع ہوگا

جسمیں

دو سو ۲۰۰ صفحات کے قریب مضامین نظم و نثر کے علاوہ

قریباً پچاس رنگین و سادہ تصویریں ہونگی

اُردو کی موجودہ ترقی کا نمونہ دیکھنا ہو تو اس پرچہ کو ملاحظہ فرمایئے

قیمت - عہ؍ - ۲۰ فروری سے قبل پیشگی

قیمت دینے والے خریداروں کیلئے عہ؍

المشتہر

زمانہ کانپور

سفرنامہ اندلس

مرتبہ عالیجناب قاضی ولی محمد صاحب سکرٹری اسٹیٹ کونسل

جس میں یکصد دیار و امصار۔ قصبات و حصون۔ میدان جنگ وغیرہ کی چشم دید تاریخی حالات مصنف ممدوح الشان نے سنہ ۲۴ء میں طولانی سیاحت کر کے قلمبند کیے ہیں اور جس میں قرطبہ۔ غرناطہ اشبیلہ۔ بطلیوس۔ بلنشیہ۔ مرسیہ۔ برشلونہ۔ طلیطلہ۔ شلب۔ وادی الحجارہ۔ جبل طارق جزیرۃ الخضرا۔ ارجونہ۔ سرقسطہ۔ قلعہ رباح۔ طنجہ۔ قصر الصغیر۔ وغیرہ کے مفصل حالات معہ یکصد تصاویر عکسی و نقشہ جات آثار اسلامی مثل مساجد۔ قلعہ جات۔ پل۔ محلات۔ منارہ جات۔ پن چکی۔ زنانہ و مردانہ لباس مسلمانان اندلس۔ زیورات۔ الحمرا۔ القصر الطارق۔ قصر جعفریہ۔ مسجد قرطبہ۔ مدینہ زہرا۔ وغیرہ وغیرہ قابل دید ہیں۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ضخامت ۳۵۰ صفحات۔ عبارت دلچسپ و دلکش اور حالات تاریخی و جغرافیائے میں نہایت صحت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر ایک روز کے مطالعہ کے بعد ناپسند ہو تو واپس کر دینے پر بعد منہائی محصولڈاک ما بقے قیمت واپس کر دیجاتی ہے۔ قیمت سے ر کلدار محصولڈاک وغیرہ ۴ار۔ اسقدر تصاویر آج تک کسی اردو کتاب میں شائع نہیں ہوئیں۔ مصنف ممدوح الشان سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

المشتہر

مرتبہ قاضی ولی محمد صاحب سکرٹری اسٹیٹ کونسل

(بھوپال)

قواعد

۱- ہمایوں بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب اُمور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک)، فی پرچہ ۸ ر، نمونہ ۸ ر

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اُوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۴- مزنگ روڈ - لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

فہرستِ مضامین

جلد ۱۴ **بابت ماہِ اگست ۱۹۲۸ء** **نمبر ۲**

تصویر۔ فرشتے

قواعد

۱- ہمایوں بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب اُمور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸، نمونہ ۱۰

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اُوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۴- مزنگ روڈ- لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

فہرستِ مضامین

جلد ۱۴ بابت ماہِ اگست سنہ ۱۹۲۸ء نمبر ۲

تصویر: فرشتے

جہاں نما

شہریارِ افغانستان کی مراجعتِ وطن

تاجدارِ افغانستان اور اُن کی ملکہ سرحدِ پشاور سے لے کر دارالسلطنتِ کابل تک ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ اُس قابلِ یادگار سیاحت سے کامیاب و کامران اپنی قوم اور اپنی رعایا میں واپس پہنچے جو غالباً اُن تمام شاہی سیاحتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو آج تک بادشاہانِ مشرق بنے کی ہیں۔

قندھار پہنچنے پر اکتیس توپوں کی سلامی اُتاری گئی اور سرکاری طور پر خیر مقدم ہونے سے پہلے شاہِ امان اللہ ایک خانقاہ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔

ایک مختصر سی تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ یورپ اور مشرقِ قریب کی سیاحت سے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان ممالک نے نظم و نسق کے دستور و آئین کو کہاں تک ترقی دی ہے۔ لیکن میں اُس وقت تک ان مشاہدات کو اپنے ملک میں نافذ نہ کروں گا جب تک کہ اُن پر اپنی قوم کے نمائندوں کے ساتھ مل کر بحث و مشورہ نہ کر لوں۔

انہوں نے کہا کہ جن ممالک کی میں نے سیاحت کی ہے وہاں کی قومی زندگی میں جو حصّہ عورتیں لے رہی ہیں اُس کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہُوا ہوں۔ وہ ترقی کی ہر تحریک میں نمایاں طور پر شریک تھیں۔

اُس لائحہ عمل کا سب سے ضروری جزو جسے امیر اپنے ملک میں نافذ دیکھنا چاہتے ہیں رسل و رسائل کے ذرائع کی اصلاح ہے۔

قندھار سے براہِ ہرات، فرح، جریش اور شیخ آباد، کابل تک اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت رعایا کے اُس ہجوم کی مسرت و عقیدت کو شرفِ قبولیت بخشتے رہے جو ملک کے کونے کونے سے نکل کر اُن مقامات پر جمع ہو گیا تھا۔

مسرت و شادمانی کے اُن نظاروں کی ایک دھندلی سی تصویر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار خصوصی نے اپنے الفاظ میں کھینچی ہے جن کی نمائش اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت کے ورود پر کابل میں ہوئی:-

میں کابل کے پُر رونق بازاروں میں کھڑا حیرت و استعجاب کے ساتھ افغانستان کے مختلف الہیئت مگر ہم خیال لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو دلی مسرت کے ساتھ اپنے بادشاہ اور ملکہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

شہر کے قدیم اور جدید دونوں حصے پھولوں اور جھنڈیوں سے آراستہ کیے گئے تھے اور ہر شخص کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

لوگوں کے ہجوم میں جو صبح ہی سے آکر اُن مقامات پر جم گئے تھے جہاں سے شاہی جلوس کا گزر ہونے والا تھا تمام ایشیائی قوموں کے افراد موجود تھے: کرد۔ بخاری۔ ایرانی اور یہودی۔

کئی دنوں سے لوگ ملک کے ہر کونے سے جوق در جوق کابل میں آرہے تھے۔ سنگلاخ اور دشوار گزار کوہستانوں اور سرسبز و شاداب وادیوں میں سے نکل کر حریت و قومیت کے نوزائیدہ جذبات پر لبیک کہتے ہوئے آرہے تھے۔

تمام رات شہر میں جشن برپا رہا۔ ہر دوکان کا رنگ سبز تھا اور ہر دوکان میں کم از کم بارہ رنگین لمپ روشن تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج رات کوئی نہیں سویا۔

خوبصورت محرابوں سے جو بازاروں میں اس تقریب پر جگہ جگہ تعمیر کی گئی تھیں بڑے بڑے فانوس لٹک رہے تھے۔ اور لوگوں کے رہنے کے مکانات کی جھنڈیوں اور روشنیوں کی نمائش عجب شانِ تقابل دکھا رہی تھی۔

شہر کی آرائش و زیبائش کے لیے ایک فنڈ کھول دیا گیا تھا جس میں لوگوں نے نہایت فراخ دلی سے چندہ دیا۔ اسی لیے تقریباً ہر شہری یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس جشن میں اُس کا بھی ایک حصہ ہے۔

بادشاہ اور ملکہ کے آنے سے بہت پہلے پولیس زرق برق وردیاں پہن کر جلوس کے گزرنے کے راستوں میں اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی تھی۔

آخر صبح دس بجے طیاروں کی پرواز کا شور سنائی دیا اور پھر آسمان کی صاف اور روشن فضا میں چھ طیارے اڑتے نظر آئے۔ یہ لوگوں کے جذبات کو گرمانے کے لیے ایک اشارہ تھا جس سے نعرہ ہائے مسرت کی ایک لہر اُٹھی اور شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچ گئی۔

بادشاہ اور ملکہ ایک خوبصورت اور مصفا رولس رائس گاڑی میں بیٹھ کر جس کا رنگ ہلکا سفید تھا شہر میں داخل ہوئے سواروں کے محافظ دستے نے گاڑی کو گھیر رکھا تھا اور اُن کے اسلحہ کی آواز اور وردیوں کے گوناگوں رنگ عجب کیفیت پیدا کر رہے تھے، جلوس مشرق و مغرب کے فرق کو نمایاں کر رہا تھا۔

اعلیٰحضرت اور علیاحضرت جن کے دلوں میں مشرق و مغرب کی کئی ایک دارالسلطنتوں کے استقبالوں کی یاد ابھی تازہ تھی ان نظاروں کو دیکھ دیکھ کر اُس دلی مسرت سے مسکرا رہے تھے جو وطن میں پہنچ کر پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں نے اس قدر پھول برسائے کہ موٹر کار اُن میں تقریباً چھپ گئی۔

اعلیٰحضرت کھڑے ہو گئے اور انہوں نے رعایا کے اظہار عقیدت کا شکریہ ادا کیا۔ ملکہ کے چہرے پر نیلے رنگ کا ایک تکا

سانقاب تھا اور وہ جھک جھک کر لوگوں کے سلام قبول فرما رہی تھیں۔

پھر جلوس قصرِ دلکشا کی طرف روانہ ہوگیا جہاں ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ یہاں خیر مقدم کے طور پر نائب السلطنت نے ایک سپاس نامہ پڑھا۔ اسی شام قصرِ دلکشا میں ایک شاندار سرکاری ضیافت کا بھی انتظام کیا گیا۔

جشن تین روز تک جاری رہیں گے۔ اسی اثنا میں ملکہ ثریا خانم کا خیر مقدم خواتینِ کابل کی طرف سے ہوگا۔ آج وہ قصرِ علیا میں ایک ضیافت پر مدعو ہیں۔ اور کل شام کابل کے مدرسۂ نسواں کی طالبات اُن کو ایک جلسہ دیں گی۔

اخباروں کی جنگ

فلیٹ سٹریٹ آج کل میدانِ کارزار بنی ہوئی ہے اور ایک دلچسپ اور پُر لطف جنگ وہاں جاری ہے۔ "ڈیلی میل" اور "ڈیلی ایکسپریس" انگلستان کی صحافتِ عامہ کے دو سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ ان دونوں اخباروں کے درمیان روزانہ اشاعت، اشتہارات کی آمدنی اور مستقل خریداروں کے لئے مفت انشورنس کے انتظامات کے رقیبانہ دعاوی پر ایک زبردست جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اول الذکر نے اپنے صفحات میں ایک تصدیق شائع کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی روزانہ فروخت ۱۹۱۹۵۷۰ ہے اور آخر الذکر کی تعداد اشاعت ۱۳۴۵۳۷۱ تصدیق ہوئی ہے۔

ایک تیسرا اخبار "مارننگ پوسٹ" بھی شریکِ جنگ ہوگیا ہے اور ظاہرا طور پر اس وقت "میل" کے خلاف "ایکسپریس" کا ساتھ دے رہا ہے جیسا کہ اس اخبار کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے حالات نے نہایت شدید صورت اختیار کرلی ہے:

"ڈیلی میل" اُس جھگڑالو اور اُس کرار روزانہ اخبار نے کل کی اشاعت میں ایک افتتاحیہ لکھا ہے جس میں اُس نے اشتہار دینے والوں اور اشتہارات کے ایجنٹوں کو اپنا کاروبار چلانے کا ایک نیا سبق دیا ہے۔ یہ سبق بڑا آسان ہے۔ اُس نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے تمام ذرائعِ اشتہارات کو یک قلم ترک کر کے "ڈیلی میل" میں اشتہار دینا شروع کردیں۔ اسی مضمون کے دوران میں "مارننگ پوسٹ" پر بھی ایک حملہ کیا گیا تھا جس کا جواب دینے کا ہم یہاں ارادہ رکھتے ہیں۔

"مارننگ پوسٹ" ایک اعلیٰ درجہ کا اخبار ہے جس کا سرپرست صرف قوم کا تعلیم یافتہ اور عالی دماغ طبقہ ہے "ڈیلی میل" کی طرح اُس کی زندگی کا مدار انشورنس اور کوپن کے ٹکڑوں پر نہیں ہے۔

"مارننگ پوسٹ" اپنی ترقی پر نازاں ہے۔ وہ ہر مہینے اپنے مشتہرین کو اخبار کی اشاعت سے مطلع کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے خبروں کے کالموں کو اشتہارات کی مقدار کے ماتحت نہیں رکھتا۔

"ڈیلی میل" اخبار کے ایک اندرونی صفحہ کے لئے نوسو پونڈ وصول کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں "ڈیلی ایکسپریس" چھ سو چھپتر پونڈ لیتا ہے۔

۱۹۲۲ء سے اب تک ڈیلی میل کی اشاعت بقدر ۹۴۵۹ پرچوں کے بڑھی مگر "ڈیلی ایکسپریس" کی اشاعت میں اسی عرصہ

کے اندر ۸۱۹۰۸۷ کا اضافہ ہوا۔ اگر اسی شرح سے ترقی جاری رہی تو بہت جلد اُس کی اشاعت "ڈیلی میل" سے اگر بڑھے گی نہیں تو اُس کے برابر ضرور ہو جائے گی۔

بچّوں کے لئے ورزش گاہیں

جرمنی کے ایک سابق فوجی افسر میجر نیومین نیور وڈ نے برلن میں ایک نئی قسم کی ورزش گاہیں جاری کر رکھی ہیں۔ نیویارک کا ہفتہ وار اخبار "سائنس" لکھتا ہے کہ یہ ورزش گاہیں صرف اُن بچوں کے لئے مخصوص ہیں جن کی عمریں ایک سال سے متجاوز نہیں ہوئیں۔

بچّوں کو اُن کی انائیں ورزش کا لباس پہنا کر یہاں لے آتی ہیں۔ یہ لباس بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ بچّوں کو مخمل سے منڈھی ہوئی میزوں پر لٹا دیا جاتا ہے اور انہیں ورزش شروع کرائی جاتی ہے۔ ہر بچّے کو میجر موصوف کا ایک ایک تربیت یافتہ مددگار ورزش کراتا ہے۔ ورزش کرانے والا بچے کے بازوؤں یا ٹانگوں کو پکڑ لیتا ہے اور میجر کے احکام پر اُن کو اسی طرح حرکت دیتا ہے جس طرح بڑی ورزش گاہوں کے لڑکے اپنے آپ ورزش کرتے ہیں۔ ان مشقوں کو جو اب عام بچوں کو کرائی جا رہی ہیں سب سے پہلے میجر نیومین نیور وڈ نے خود اپنے بچّوں پر آزمایا تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ مشقیں تمام بچّوں کے لئے مفید ہیں اور پانچ مہینے کی عمر سے شروع کی جا سکتی ہیں۔

جرمنی کے مدرسوں میں تقریباً ایک چوتھائی تعداد اُن طلبا کی ہے جن کی نخاع میں کم و بیش کوئی اہم نقص موجود ہے۔ میجر موصوف کی رائے میں اُس کا علاج و انسداد صرف بچپن کی ورزشوں سے ہو سکتا ہے۔ یہ مشقیں اُن بچوں کیلئے مفید سمجھی گئی ہیں جنہیں اعصاب کی بیماری ہو یا پیدائش کے وقت جن کے سر کو صدمہ پہنچا ہو۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جسے اب اطبا غیر معمولی نہیں سمجھتے۔

رنگ اور نیند

میونچ کی مجلسِ تحقیقاتِ نور نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ رنگ اور نیند میں باہم ایک رشتہ اور تعلق ہے۔ یہ تحقیقات اُن لوگوں کے لئے ضرور دلچسپی کا موجب ہوگی جو بے خوابی کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ اور یوں بھی ایک عجیب بات ہے کہ نیند لانے میں بعض مخصوص رنگ حیرت انگیز طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ شیشوں پر نقاشی کرنے والے جب نیلگوں آسمانی رنگ کو استعمال کرنے لگے تو اُن کو وہیں نیند آگئی اور وہ سو گئے۔ دماغ کے مریضوں کے لئے پہلے بھی اطبا نیلی دیواروں اور نیلے پردوں والے کمرے کی اقامت تجویز کیا کرتے تھے، کیونکہ تسکین اور آرام دینے میں نیلا رنگ غیر معمولی طور پر موثر ثابت ہوا ہے۔

فرشتے

کیا تمہارے لئے اتنا کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار آسمان سے تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کرے ۔۔۔ قرآن مجید

خدا نے فرشتوں کو اپنا قاصد بنایا جن کے دو دو، تین تین اور چار چار پر ہیں۔ وہ اپنی مخلوقات کی بناوٹ میں جو چیز چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے ۔۔۔۔ قرآن مجید

فرشتے وہی کرتے ہیں جس کا اُن کو خدا کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے ۔۔۔۔ قرآن مجید

ہم فرشتوں جیسے کبھی نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہمارے جذبات نہ مٹ جائیں ۔۔۔ ڈیکر

اس تیرہ خاکدان میں جہاں ہر وقت افکار کے بادل چھائے رہتے ہیں ہمیں علم بھی نہیں ہوتا اور فرشتے چپکے چپکے ہمارے ساتھ ہوتے ہیں ہماری آنکھیں اُن کے سفید سفید پروں کو آسمانوں میں اُڑتا ہوا دیکھتی ہیں اور حیران رہ جاتی ہیں ۔۔۔۔ میسی

وہ خاموشی کے پروں پر کس خوش آئند ادا سے رات کے خالی گنبد میں تیرتے رہے اور جھک جھک کر لیلائے شب کو گدگدی کرتے رہے یہاں تک کہ آخر وہ مسکرا پڑی ۔۔۔۔ ملٹن

اگر تم بیداری میں فرشتوں کی مصاحبت کی خواہش رکھتے ہو تو وہ ضرور خواب میں تمہارے پاس آئیں گے ۔۔۔
پرنٹیس

احمق لوگ وہاں تک بڑھے چلے جاتے ہیں، جہاں فرشتے بھی پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں ۔۔۔۔ پوپ

منصور احمد

ونتی

تاریخِ دنیا پر ایک نظر

روما اور زمانۂ وسطیٰ

۱۸

مسیحی کلیسا

انجیل کے لئے تیاری۔ سلطنتِ روما کی شان و شوکت پر مسیحی کلیسا کی فتح کو عیسائی مورخین دنیا کی تاریخ کے حیرت انگیز واقعات میں شمار کرتے ہیں۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ یہ ہے خاص مثال اُس طریقے کی جس سے اِس دنیا کی کمزور چیزیں قوی چیزوں پر غلبہ پا لیتی ہیں جس سے ایک پتھر کا ٹکڑا جسے معمار شروع میں ردی کر کے پھینک دے آخرکار عمارت میں نمایاں ترین جگہ پا لیتا ہے۔ لیکن مسیحیت کی فتح کچھ ایسا لاینحل معما بھی نہیں۔ اُس شدّ جہد للبقا کے جو نوعِ انسان میں مسیحی سن سے پہلے تک جاری رہی دو نتیجے ہوئے۔ ایک طرف تو چونکہ افراد محافظت اور تسخیر و مخاصمت کی غرض سے معاشرتی حلقوں اور ملتوں میں جمع ہو گئے تھے اِس لئے اب یہ جنگ پہلے سے زیادہ تیز اور خوفناک ہو گئی۔ لیکن دوسری طرف اِن حلقوں کے اندر ایک نئے انداز کی معاشرتی اور شہری خوبیاں پیدا ہوئیں جو حقیقی تعاون کے لئے لابدی تھیں مثلاً فرماں برداری دیانت داری اور ایثار۔ ایمان امید اور محبت جنگی سلسلے کے پہلو بہ پہلو اُسی ایک سرچشمہ سے اخلاقی سلسلہ بھی رونما ہو گیا۔ اب صرف اتنی ضرورت باقی تھی کہ اِن نئے اخلاقی خیالات کی عام طور پر ترویج کر دی جائے اور عیسائیوں کے قول کے مطابق خدا کی "ابویت" اور انسان کی اخوت کی صورت میں چار دانگِ عالم میں اُن کا اعلان کیا جائے۔

اِس اعلان سے پہلے کم از کم مغربی دنیا کا دل و دماغ ایسے خیالات سے محض بے بہرہ تھا۔ بدھ نے تقریباً اسی قسم کا اعلان کیا تھا لیکن مختلف وجوہ سے اُس کے خیالات مغرب تک نہ پہنچ سکے۔ آخری عبرانی پیغمبروں نے اس کے لئے رستہ صاف کیا تھا لیکن انہوں نے ایسے لوگوں کو تلقین کی تھی جو ایک تنگ و تار قومیت میں مقید تھے بِن

عیسوی سے تین صدیاں پہلے جو مذاہب (مثلاً سبل اسٹارت آئیسس اور مترس کے ادیان) ایشیائے کوچک شام مصر اور ایران میں رائج ہوئے وہ تمام عالمگیر مذاہب تھے۔ تمام کی بنا اخوتِ انسانی تھی اور تمام ایک حد تک بااخلاق تھے۔ نیز وہ تمام فلسفے جو عین اسی وقت میں ایرانی حکمت اور مشرقی تصوّف کے امتزاج سے پیدا ہوئے مثلاً زینو کی رواقیت اور پوسی ڈونیس کی انتخابیت (Eclecticism) اُن سب میں عالمگیری کا جذبہ ایک ہمہ گیر بابرکت قانونِ فطرت کا یقین اور ضابطہ کی پابندی و ادائے فرض کا گہرا اخلاقی خیال مرکوز تھا۔ یہ گویا مسیحیت کی تیاریاں تھیں اور مسیحیت انہی کے اثرات میں پیدا ہوئی۔

لیکن عیسائیوں کا دعوےٰ ہے کہ دنیا کے لئے امن و محبت کا سچا پیغام لانے والے اُسے صحت و صراحت کے ساتھ بیان کرنے والے حضرت عیسٰی اور اُن کے حواری پال ساکن ٹارسس تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہی نے پہلے پہل انسانیت کو روحانی جدوجہد اور خودی سے نجات دلائی انہیں نے نجات یافتہ انسانیت کو یک جہتی کی بشارت دی اور انہی نے دنیا میں پہلی بار انسان اور خدائے رحیم کے درمیان ہم کلامی کی راہ دکھائی۔

کفر روما۔ روما کی سلطنت جس میں پہلے پہل انجیل کی اشاعت کی گئی مختلف وجوہ سے اِس پیغام کے سننے کے لئے تیار تھی۔ ایک نواحِ روما تمام جسمانی لذات سے جو بے پایاں طاقت اور بے شمار دولت سے حاصل کی جاسکتی تھیں جی بھر کے لطف اُٹھا چکے تھے اور دیکھ چکے تھے کہ یہ چیزیں آنی جانی ہیں اِن کا لطف تکلیف کا اور اُن کی مستی بیزاری کا پیش خیمہ ہے۔ جسمانی لذتوں کو دیکھ بھال کر اب وہ خوشی کو اُس نئے طریقے سے حاصل کرنا چاہتے تھے جو پاکیزگی اور جاں نثاری ہم جنسوں کی خدمت اور خدا کی ریاضت کی راہ تھی۔ دوسرے روما کی فہم و ذکا جو یونانی علم و حکمت اور ایشیائی تخیل سے تیز تر ہو چکی تھی اب پرانے دیوتاؤں جوپیٹر ایپولو مارز وغیرہ کی پرستش سے اپنے آباد اجداد کی طرح تسکین نہ پاسکتی تھی۔ پرانے دیوتاؤں کی پرستش محض سیاسی تھی۔ حکومت کا ایک شعبہ ضروری رسومات اور قربانیوں کے ذریعہ سے دولتِ روما اور آسمانی طاقتوں کے مابین اچھے تعلقات قائم رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ پونٹی فیکس میکسی مس (امامِ اعظم) کے عہدے پر کوئی مذہبی نمائندہ مامور نہ تھا بلکہ ایک سیاسی مدبر۔ مذہب عہدنامہ کی قسم کا ایک تمسک تھا جس کی رو سے اُدھر مناسب رسومات اور اِدھر حسنِ سلوک ہونا ضروری قرار پایا۔ ایک موقع پر اربابِ حکومت نے سمجھا کہ نپٹیون (جس نے ایک جہاز تباہ کر دیا تھا) اپنے قول و قرار پر قائم نہیں رہا تو انہوں نے کھلے طور پر ایک عام جلسے میں جہاں اُن کے بت کو جگہ دی جاتی اُسے شامل نہ کیا۔

قدیم رومیوں کو ایک ذاتی یا اخلاقی مذہب کی ضرورت کا سرے سے احساس ہی نہ تھا۔ اُن کی عبادت و

توجہ کا مطمح فقط اُن کا شہر روما تھا جس کے لئے وہ اپنی جانیں نثار کرنے کو ہمیشہ تیار تھے۔ اُن کو پروا نہ تھی کہ انہیں دنیا میں اس کا کچھ انعام ملے یا مرکر وہ پھر جئیں یا نہ جئیں۔ لیکن اُن کی اولاد کے دل کی یہ حالت نہ رہی۔ اُن کے خلف گناہ کا احساس کرنے لگے۔ نجات کا ذریعہ ڈھونڈنے لگے۔ طاقتِ ربانی تک پہنچ سکنے کی راہ تلاش کرنے لگے۔ انہیں بقا کی دھن لگ گئی۔ وہ بقا جس کی رنگ آمیزیوں نے مشرقی مذاہب کو اس قدر دل آویز بنا دیا تھا۔ فرجی سبل کی پوجا ۲۰۴ ق م ہی میں روما میں رائج ہوگئی تھی۔ سُلا کے وقت میں مصری خدا آئیسس کی پُر شکوہ رسوم جاری کی گئیں۔ اور پومپے کے زمانے میں ایرانی مترس (شمس پرست) کا مذہب اس قدر مقبول ہوا کہ عجب نہ تھا کہ یہی مذہب ساری روما کی سلطنت میں پھیل جاتا۔

مسیحی زمانے کے آغاز کے ساتھ رومی کفر میں دو تازہ تحریکیں شروع ہوئیں اول مدبرین کی کوشش کہ روما کی پوجا کو شاہنشہی شخصیت کی پرستش بنا کر پھر رائج کریں اس مذہب سے دولت روما کی یکسانیت کا اظہار اور تمام مذاہب کے پیروؤں کو ایک رشتے میں منسلک کرنا مقصود تھا۔ دوسرے فلسفیوں نے کوشش کی کہ سلطنت روما کے بے شمار مذاہب کی غیر مطابق وثنیات کو یہ کہہ کر عقل کی لڑی میں پرو دیں کہ یہ سب ایک ہی ربانی حقیقت کے مظاہر ہیں۔

مسیحیت کا طلوع و کمال۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ مسیحیت کو جو لڑائی اپنی زندگی کی پہلی تین صدیوں میں لڑنی پڑی وہ پرانے دیوتاؤں کے پیروؤں کے خلاف نہ تھی بلکہ اُن سیاسی مدبروں کے خلاف تھی جو شاہنشاہ کی ربانیت کا صریح اقرار چاہتے تھے اور اُن فلسفیوں کے خلاف تھی جو سارے کے سارے پرانے کفر کو نئی افلاطونیت کا لباس پہنا کر برقرار رکھنا اور از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے تھے۔

روما کی حکومت مذہب کے معاملے میں نہایت روادار تھی۔ اس کی وسیع سلطنت میں جتنے مختلف مذاہب تھے وہ سب چین سے جس طرح چاہتے تھے اپنی رسوم ادا کرتے تھے۔ مسیحیت کی طرف بھی پہلے حکومت کا رویہ عنایت آمیز رواداری کا تھا۔ بظاہر وہ صرف یہودیت کی جو عبرانی محکوموں کا قومی مذہب تھا ایک وہمی سی شکل معلوم ہوتی تھی اور یہی دہر نشا کے قول کے مطابق مسیحیت تھی بھی۔ ابتدائی پیروؤں کے لئے حضرتِ عیسیٰ فقط مسیح موعود تھے جن کا کام بنی اسرائیل کی نجات اور خوشحالی تھا۔ ایک عیسائی مورخ کہتا ہے کہ یہ صرف پال ٹارسس کے باشندے کا (جس کی تربیت مشرق و مغرب کی جائے اقبال سلیسیا میں ہوئی) روحانی وجدان اور مذہبی بالغ نظری تھی جس نے یہ بات تاڑلی کہ حضرتِ عیسیٰ نہ صرف یہودی شریعت کی تکمیل اور عبرانی پیشگوئیوں کی صداقت کے لئے آئے بلکہ غیر یہودیوں

کو اس خدا کی راہ دکھانے کے لئے وارد ہوئے جس کی مدتوں سے وہ اپنی وثنیات میں عبث تلاش کرتے آئے تھے۔ انہوں نے بجائے فلسفیوں کے نظریات کے مذہب کو اُن کے سامنے اپنے ربانی الہام کے قابلِ وثوق دعوے کے ساتھ نئے لباس میں پیش کیا۔

وہ مسیحیت جسے پال نے روما کی لاطینی یونانی اور ایشیائی سلطنت کے سامنے پیش کیا محض یہودیت اور مشرقی غیبی علوم کا سا مذہب نہ تھا۔ بلکہ اُس کا دعوے تھا کہ مسیحیت اُن سب کو منسوخ کر کے اُن سب کی جگہ لینے کے لئے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اُس نے اپنے پیروؤں کو شاہنشاہ کی قربان گاہ پر بخورات جلانے سے منع کر دیا۔ اُس نے پارتھینون (معبدِ ایتھنز) کے دیوتاؤں کو شیطانوں کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کافروں کے حلقے میں اس طرزِ عمل پر تشویش اور غصہ پیدا ہوا اور آخر کار عیسائیوں پر کھلم کھلا تشدد ہونے لگا۔ یہ تشدد زیادہ شدید ہوگیا جب عیسائیوں نے ایک "کافر" حکومت کی خدمت کرنے سے انکار کردیا اور سلطنتِ روما کے اصول و معاشرت سے الگ تھلگ ہو کر اپنے آپ کو گرجاؤں کے حلقوں میں منتظم کرنا شروع کر دیا۔ دو صدیوں تک یہ عناد مسیحی کلیسا اور "کافر" سلطنت کے درمیان بڑھتا گیا یہاں تک کہ آخر کار ۲۴۹ء تا ۳۱۱ء کے عام تشدد کی مہلک کشمکش صورت پذیر ہوئی۔ دراصل یہ دو قطعی مخالف و مختلف طرزِ خیال و معاشرت کا معرکہ تھا۔ ڈیسئس سے لے کر ڈایوکلیشین تک سارے شاہنشاہوں نے جتنی قوت اُن کے بس میں تھی صرف کردی کہ ایک ایسی منتظم جماعت کو جو شاہنشاہی یکسانیت اور حاکمانہ اقتدار کا قلع قمع کر رہی ہے نیست کردیں۔ ڈیسئس نے کہا کہ ہمیں ایک حریف سیزر کا وجود منظور ہے لیکن روما کے اسقف کا وجود منظور نہیں"۔ لیکن وہ طاقت جو اسقفِ موصوف کی پشت پناہ تھی مطلق العنان شاہنشاہ کی طاقت سے بھی زیادہ طاقتور نکلی۔ تشدد ناکام رہا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ڈایوکلیشین کے جانشین نے اس کامران مذہبی انجمن سے اتحاد کرلیا۔

کلیسا کی کامرانی۔ ٹیکیٹیٹس اور سینٹ آگسٹائن کے زمانے سے گبن ملمین سیک اور دوشین کے وقت تک مختلف الرائے مورخین نے سلطنتِ روما کے خلاف کلیسا کی کامرانی کے مختلف اسباب گنوائے ہیں مورخِ دنیا کے لئے یہ سب چار قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ مذہبی اخلاقی نفسیاتی اور سیاسی۔

پہلا اور سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مسیحیت نے اپنے تمام حریف مذاہب کے مقابل میں اہلِ مغرب کے مذہبی احساس کو سب سے زیادہ مطمئن کیا۔ مسیحی مورخین کا دعوے ہے کہ اُس کی وحدانیت زیادہ بلند اور زیادہ پاکیزہ تھی۔ اُس کی ربّانی ابوبیت کا نظریہ متریت (شمس پرستی) اور دیگر ادیان کے مقابل میں خدا اور انسان کے تعلق کی ایک نہایت دلکش شکل تھی۔ اُس کے اعتقاد نے کہ خدا کا بیٹا دنیا میں مجسم بن کر آیا زمین و آسمان میں ایک مضبوط رشتہ قائم

کردیا جس سے نجات کا یقین اور ذاتی بقا کی امید استوار ہوگئی۔ روح القدس کے متعلق اُس کے اعلان سے کہ وہ ایمان لانے والے کی روح کو اپنا مسکن بناتی ہے زندگی کو ایک اعلیٰ مرتبہ ملا اور انسان کو موت پر ایسا اختیار حاصل ہوگیا جو کسی اور ذریعے سے نہ ہوسکتا تھا۔

دوسرے عیسائیت کا اخلاقی معیار تمام دوسرے معروف مذاہب کے معیار سے زیادہ بلند تھا۔ روما کے پرانے دیوتا غیر اخلاقی تھے۔ تمام مشرقی مذاہب جن کا اہلِ مغرب کو علم تھا، کے اخلاق یا غیر مکمل تھے یا نہایت پست۔ اِن میں بہترین متریت تھا جس میں دلیری دیانت اور وفاداری کی فوجی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ کسی نے عیسائیت کی طرح عصمت، انکسار، برادرانہ ملاطفت اور محبت کی سی دل گداز نیکیوں کی اشاعت نہ کی تھی۔ کسی نے زندگی کے زخم پر نیک کاموں کا ایسا تسکین دہ مرہم نہ لگایا تھا۔

تیسرے عیسائیت نے دنیا کے سامنے اپنے بانی کی شخصیت میں اپنے بلند پایہ اخلاق کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اُس کا دعوے تھا کہ مسیح پر ایمان لانے سے بُرے سے بُرا آدمی ولی کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے۔ غالباً روما کی زوال آمادہ سلطنت کی گناہ آلود معاشرت پر سب سے زیادہ اثر اُن نجات دینے والے معجزوں کا ہُوا جو مسیح کے نام پر کئے گئے۔ پینٹی کوسٹ دیوم روح القدس) کی طرح کے روحانی کایا پلٹ کے نظاروں سے لوگوں کے دل غایت درجہ متاثر ہوئے۔

آخری سبب یہ ہُوا کہ عیسائیوں کے گروہ کے گروہ اپنے اسقفوں اور پادریوں کے تحت میں گرجاؤں میں یکجا ہوئے اور اسقف اور پادری اپنے صدر اسقفوں اور سر اسقفوں کے زیرِ فرمان کام کرتے تھے۔ اس سے ایک نہایت منظم اور زبردست کلیسائی قلمرو یعنی روما کی سلطنت کے اندر ایک عظیم الشان خود مختار اجنبی اور مخالف مذہبی انجمن قائم ہوگئی۔ روما کا مذہبی تشدد پہلے پہل اسقفوں کے خلاف جو ان چھوٹی چھوٹی مخفی انجمنوں کے صدر تھے عمل میں آیا۔

۱۹

شمالئے اور خانہ بدوش

شمالیوں کے حملے ۔گبن اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "زوال وہبوطِ سلطنتِ روما" کے آخری باب میں لکھتا ہے کہ سلطنتِ روما کے زوال کا اولین سبب "پادری اور وحشی" تھے۔ ہر نشاید ظاہر کرتے ہوئے کہ اس کے

علاوہ دوسرے زیادہ اہم سیاسی معاشرتی اخلاقی اور معاشی اسباب بھی تھے تسلیم کرتا ہے کہ ادھر مسیحی کلیسانے فی الحقیقت اندر سے "کافر" سلطنت کو کھوکھلا کر دیا اُدھر شمالی وحشی باہر سے حملہ کر کے اُس کے علاقے میں گھس آئے + لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ عیسائیوں اور شمالی قوموں نے صرف تباہی و بربادی کا کام کیا + اگر انہوں نے ایک سلطنت کو جو اپنا مدعا پورا کر چکی تھی تباہ کیا اور ایک تمدن جو ناکارہ اور ذلیل ہو گیا تھا برباد کر دیا تو اُن کے کھنڈروں پر انہوں نے ایک نئی دنیا بھی تعمیر کر دی +

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسیح کے زمانے سے دو ہزار سال قبل تک شمالی یورپ کے جنگلوں اور چراگاہوں سے کس طرح حملہ آوروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جنوب کے روشن و زندہ تمدنوں پر چھاپے مارتے رہے + میدی اور ایرانی یارتھی اور ارمنی یونانی اور لاطینی باری باری آئے اور عراق سے لے کر بحر متوسط کے سارے علاقے میں جا بجا بس گئے۔ ان کے بعد کلتی زبان بولنے والے لوگ آئے۔ "گال" اطالیہ پر چوتھی صدی ق م میں چڑھ آئے۔ انہوں نے اٹرسکی طاقت کو توڑ دیا روما کو ۳۹۰ ق م میں تہ و بالا کیا اور آخر وہ ایلپس اور ایپی نائین کے کوہستانوں کے مابین اس علاقے میں بس گئے جس کا نام اسی وجہ سے "ایلپس سے ورے کا گال" پڑ گیا + بعد کی صدی میں اسی نسل کے "گالیسیوں" نے اناطولی سرزمین پر اپنی بستی قائم کر دی +

سنِ عیسوی سے ایک صدی قبل سمبری اور ٹیوٹن قومیں جنوبی ملکوں کی طرف بڑھیں۔ یہ شمالی حملہ آوروں کی پہلی جماعت تھی جو جرمنی کے جنگلوں بحیرۂ بالٹک کے ساحلوں اور سکینڈ نیویا کی دُور دراز بنجر زمینوں کی رہنے والی تھی۔ جب اہلِ روما کو ان وحشیوں کے مقابل میں پے در پے شکستیں ہوئیں تو انہوں نے اپنی سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لئے (۱۰۲ تا ۱۰۱ ق م میں) اپنی ساری مساعی صرف کر دیں + آخری صدی ق م میں یہی شمالی خطرہ تھا جس سے ڈر کر روما نے "ایلپس کے پرے کے گال" پر قبضہ جمایا اور دریائے رائین کی سرحد کو مضبوط کیا + جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں آگسٹس نے کوشش کی کہ وہ رائین اور ایلب کے درمیانی علاقے کو ملحق کر کے اس خطرے کو دور کر دے لیکن ناکام رہا (۹ سنہء) + غرض شمالی خطرہ قائم رہا اور روز بروز بڑھتا گیا اور بعد کے شاہنشاہوں سے صرف یہی ہو سکا کہ ادھر محافظت کے سامان کرتے رہیں اور اُدھر کبھی کبھی گوشمالی کے لئے غنیم کے علاقے میں مہمیں بھیجتے رہیں +

نئی قومیں - یہ شمالی لوگ جو پہلی تین عیسوی صدیوں میں روما کی سلطنت کے افق پر ایک ابرِ سیاہ کی طرح چھائے رہے دو بڑی شاخوں میں منقسم تھے + ایک تو ٹیوٹانی شاخ تھی جس کے فرنیکوں اور المانیوں کے جتھے رائین کے پار قائم تھے سیکسن گوییز اور ایلب دریاؤں کے آخری حصے میں آباد تھے اور لومبارڈ اور برگنڈی قومیں ایلب اور وسچولا کے

دریاؤں کے مابین دوسری گاتھی شاخ تھی جس کا وطنِ مالوف غالباً سکینڈ نیویا تھا۔ نارس سویڈ ڈین جوٹ کے علاوہ جو بالٹک کے ساحلوں پر آباد رہے اس میں وہ گاتھ جیپیڈی اور وینڈل شامل تھے جو مدتوں دور دور تک گھومتے رہے اور عیسوی سن کے شروع میں وہ ڈنیوب اور بحیرۂ اسود کے اُن مقامات پر پہنچ گئے جو سلطنتِ روما کی آخری سرحد تھی۔ انہی لوگوں کی یورشوں کو روکنے کے لئے ڈایوکلیشین نے نکومیڈیا کو اور قسطنطین نے جدید روما کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ تیسری صدی عیسوی میں بلقان اور ایشیا میں ان لوگوں کے حملے غائت درجہ تباہ کن ثابت ہوئے۔

یہ نئے حملہ آور ایک عظیم الشان جنگی نسل سے تھے۔ اُن کا قد لانبا بال ہلکے رنگ کے اور سر لمبوترے تھے۔ اُن میں آزادی کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اُن کی فطرت میں انفرادیت کا جذبہ بہ درجۂ اتم موجود تھا۔ وہ انتہا درجہ محنت کش اور تیز فہم بھی تھے۔ اُن کا معاشرتی اور سیاسی نظام جمہوری رنگ کا تھا اور اُن کے ہاں اداراتِ نیابیہ بھی موجود تھے۔ بمقابلہ رومیوں اور کلٹیوں کے وہ پادریوں کے دباؤ کو زیادہ برداشت نہ کرسکتے تھے۔ اُن کی خانگی زندگی پُرجوش اور مقابلتہً پاکیزہ تھی۔

روما کی حدود پر حملے کرنے سے بہت پہلے اُن پر بحرِ متوسط کا تمدن اثر انداز ہو چکا تھا۔ ایک تو اہلِ روما اُن کے ملکوں سے اپنی گھٹتی ہوئی فوجوں کے لئے رنگروٹ بھرتی کرتے تھے بلکہ وہ اکثر اُن لوگوں کو سلطنت کے اُن حصوں میں جنہیں طاعون نے برباد کر دیا تھا آباد کر کے اُن میں کھیتی باڑی کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ دوسرے روما کے تاجر اُن کے ملکوں میں آتے جاتے اور تجارت کا ایک خاصا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ عیسائی مبلغوں نے خاص طور پر گاتھوں کے ہاں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ بالخصوص وہ شمالی وحشی جو زاین ڈنیوب اور بحیرۂ اسود کے مضافات میں رہتے تھے اس وقت جب کہ چوتھی صدی کا سانحہ پیش آیا نہایت جلد رومی اور مسیحی اثر قبول کر رہے تھے۔

خانہ بدوشوں کی یورشیں - چوتھی صدی کا سانحہ خانہ بدوشوں کا دھاوا تھا۔ کچھ عرصے سے ایشیائی میدانوں کے گلہ بان آوارہ گرد بے چین اور خوفناک ہو رہے تھے۔ اُن کی مخصوص شورش کے اسباب نامعلوم ہیں۔ لیکن دو وجوہ پیش کی گئی ہیں ایک یہ کہ اُن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور دوسرے وسطِ ایشیا میں خشک سالی کا دور دورہ ہوا جس کی وجہ سے اُن کے گلوں اور ریوڑوں کے لئے وہاں چارے کا سامان نہ رہا۔ کچھ بھی ہو ۳۷۲ء میں اُن کا ایک انبوہِ کثیر جن کو ہن کے نام سے پکارا گیا اُس کھلے "دروازۂ اقوام" میں سے گھس کر جو بحیرۂ خزر اور یورال کے کوہستان کے درمیان ہے دریائے والگا کو عبور کرتے ہوئے مشرقی یورپ کے باشندوں پر حملہ آور ہوا۔ اُن کی تعدادِ کثیر اُن کی خونخواری اُن کی شہسواری اُن کی تیر اندازی اور اُن کے دھاووں کا جوش و خروش ایسا تھا کہ یورپ کا بچہ بچہ

ن کے نام پر کانپنے لگا اور کچھ عرصہ تک وہ جہاں گئے اُن کا مقابلہ ناممکن ہوگیا +

پہلے وہ ایک ہندی یورپی قوم ایلن پر جو کوہ قفقاز کے شمال میں رہتی تھی آپڑے + بہتوں کو انہوں نے قتل
یا اکثروں کو انہوں نے غلام بنالیا ۔ باقی ماندہ جان بچاکر مغرب کی طرف سرماشیا اور وہاں سے جرمنی میں جاگزین ہوئے
ن کے بعد وہ مشرقی گاتھوں (آسٹرو گاتھوں) پر جو بحیرۂ اسود کے شمالی ساحلوں پر رہتے تھے اور مغربی گاتھوں (وزی
تھوں) پر جو ڈنیوب کے نچلے حصّے میں جہاں اب رومانیا ہے رہتے تھے حملہ آور ہوئے + یہ گاتھ لوگ بڑے جنگجو تھے
لیکن یہ بھی اُن نئے حملہ آوروں کی مقاومت کی تاب نہ لاسکے + مشرقی گاتھ اکثر مغلوب ہنوں کے ساتھ مغرب کی
رف "ہنگری" اور پینونیا میں لے جائے گئے + مغربی گاتھوں نے حکومتِ روما کے آگے عاجزانہ درخواست کی کہ
ہیں ڈنیوب کے پار آجانے کی اجازت دی جائے اور وعدہ کیا کہ وہ روما کے فرمانبردار بن کر اُس کی سرحد کی محافظت
ں پوری پوری مدد دیں گے + ۳۷۶ء میں بدقسمتی سے مطلوبہ اجازت دے دی گئی + دو سال بعد جب ہنی خطرہ
ل گیا تو ان مغربی گاتھوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اڈریانوپل پر ایک بڑی بھاری رومی فوج کو شکست دی اور
ہید ڈیسیا میزیا اور تھریس پر قبضہ کرلیا + سلطنتِ روما کی ڈنیوبی سرحد اس طوفان میں غرقِ آب ہوگئی (۳۷۸ء)

۴۰۶ء میں رائن کی سرحد پر دشمن کا ایسا زور ہوا کہ مقابلہ مشکل ہوگیا + ایلن وینڈل اور سوئیو قوموں کے گروہ
گروہ سلطنت میں گھس آئے اور تین سال تک گال کے علاقہ میں لوٹ مار کرکے سپین میں جا پہنچے + حکومتِ روما انہیں
ی قلمرو سے باہر نہ نکال سکی اور آخر کار اُسے اُن کے ساتھ صلح کرکے اجازت دینی پڑی کہ یہیں آباد ہوجائیں + لیکن
۴۵۰ء میں قدیمی رومیوں اور ان نئے شمالی نوآبادوں کو ایک نئے خطرے کا سامنا ہوا جب ہن اپنے بادشاہ اٹیلا
ے زیر کمان پھر آگے کو بڑھتے ہوئے رائین کے اس پار آگئے ۔ اور گال کے میدانوں میں تباہی پھیلانے لگے + اس
ہی خطرے نے ٹیوٹن اور لاطینی قوموں کو ایک مضبوط اتحاد میں منسلک کردیا ۔ شاہنشاہی فوجیں اور وحشی قومیں
نوں مل کر مغربی تمدّن کے بچانے کے لئے شالون کے مشہور میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہوئیں ۔

عیسائیتِ وسطیٰ کی تعمیر و تشکیل ۔ ۴۵۱ء میں شالون پر اٹیلا اور اُس کے ہنوں کی قطعی اور
یہ خیز شکست اور اس کے بعد اطالیہ میں ایک معمولی سی یورش کے بعد ۴۵۴ء میں اٹیلا کی وفات پر اُس کی سلطنت
خاتمہ ہوگیا +

اِس کے بعد روما کی سلطنت بغیر کسی بیرونی مداخلت کے اپنے تئیں اُن نئے حالات کے سانچے میں ڈھالنے
جو شمالی حملہ آوروں نے پیدا کردیئے تھے + پانچویں صدی میں (۳۹۵ء تا ۴۷۶ء) سلطنت میں ایک نہایت اہم انتظامی

تقسیم عمل میں آئی جس کے درمیان حدِ فاصل بحیرۂ ایڈریاٹک تھا + مشرق کی طرف یونانی اور ایشیائی صُوبے تھے جن کا صدر مقام قسطنطنیہ قرار پایا + یہاں ایک مضبوط و کامیاب حکومت قائم ہوئی جو بہت سے تغیرات کے باوجود برابر ۱۴۵۳ء تک برقرار رہی - اُس نے متعدد بار وحشیوں اور ایشیائیوں کے حملوں کو روکا اور صدیوں تک عیسائیت کو اس کے بے شمار دشمنوں سے بچائے رکھا اور قدیمی مغربی تمدن کا چراغ مدتوں اُس کی محافظت میں فروزاں رہا - مغرب میں لاطینی اور کلتی صُوبے ظاہرا طور پر ایک حکومت کے حلقے میں شامل کئے گئے جس کا پایۂ تخت ملان یا راونیا ہوا لیکن بہت جلد شمالی قوموں نے اپنی طاقت اور اپنے رعب کا سکّہ جاری کرلیا اور ۴۷۶ء میں کٹھ پتلی بادشاہ رومولس آگسٹس کے تخت سے اتارے جانے کے ساتھ مغرب میں شاہنشاہی نظم ونسق کا قلع قمع ہوگیا +

روما کی مغربی قلمرو کے کھنڈروں پر مندرجہ ذیل نامی "شمالی" حکومتیں قائم ہوئیں :- (۱) مغربی گاتھ بہت سی آوارہ گردی کے بعد جس کے دوران میں انہوں نے اطالیہ کو تہ و بالا کیا اور ۴۱۰ء میں شہر روما میں لوٹ مار کی آخر کار سپین میں آباد ہوئے + (۲) وینڈل سپین سے جلاوطن ہوکر افریقہ کو نقل مکانی کرگئے اور ۴۳۹ء میں انہوں نے کارتھیج کو اپنا صدر مقام بنالیا + (۳) مشرقی گاتھ اپنے با اقتدار بادشاہ تھیوڈورک کی قیادت میں ہینونیا سے نکلے اور اطالیہ کو فتح کرکے انہوں نے وہاں پیویا میں ۴۹۳ء میں اپنی حکومت قائم کرلی + (۴) فرینک جو ممالکِ نشیبی میں بسے ہوئے تھے مغرب کی طرف چل نکلے - یہاں تک کہ اپنے بادشاہ کلووس کے عہد میں (۴۸۱ء تا ۵۱۱ء) انہوں نے اپنی مملکت مغرب میں بحر اوقیانوس تک اور جنوب میں پرنیز کے پہاڑوں تک پھیلالی + (۵) برگندی دریائے رھون میں آباد ہوگئے (۶) اینگل سیکسن اور جوٹ ایلب کے نچلے حصوں سے اُٹھ کر متروکہ رومی صوبے برطانیہ پر قابض ہونے لگے (۴۵۰ء)

لیکن اگرچہ اِن تغیراتِ ملکی کے باعث روما کی حکومت مٹ گئی تاہم روما کی روایات سارے مغرب میں نہ صرف قائم رہیں بلکہ ہر جگہ قومی زندگی پر اثر انداز رہیں + وحشی سردار اور بادشاہ عام طور پر ۴۷۶ء تک راوینا کے رومی شاہنشاہ کی رسمی فرمانروائی کا اعتراف کرتے رہے + وہ اُس سے شاہی خطابات و مراتب حاصل کرنے پر اور قنصل اور امراء کے جبّے ملنے پر فخر کرتے تھے + اور اس پر طرّہ یہ کہ انہوں نے اپنا قدیمی کفر چھوڑ دیا اور سلطنتِ روما کا مذہب قبول کرلیا + اس طور سے روما نے اپنے روحانی اقتدار کے ذریعے سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور رعب پالیا اور نئی وحشی شخصی حکومتوں میں زمانۂ وسطیٰ کی عیسائیت کی شاندار یکسوئی پیدا کردی !

بشیر احمد

تجلّیات

دل ہے کسی کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے
ذرّہ ہے آفتابِ تجلّی لئے ہوئے

نامِ خدا! اِدھر بھی نظر ہو کہ ساقیا!
بیٹھے ہیں ہم بھی دل میں تمنّا لئے ہوئے

پھر آرہا ہے جھوم کے مستِ شبابِ حسن
آنکھوں میں موجِ قلزمِ صہبا لئے ہوئے

معمور کائنات ہے تیرے جمال سے
ہر شے ہے تیرے حسن کا جلوہ لئے ہوئے

پھر آگئی بہارِ گل افشان و مے فشاں
دامن ہیں صد ہزار تماشا لئے ہوئے

پہنائے کائنات ہے فردوسِ رنگ و بُو
ہر شے ہے جلوۂ طرب افزا لئے ہوئے

ہے چودھویں کا چاند کہ سرچشمۂ جمال
آغوش میں ہے حُسن کی دنیا لئے ہوئے

لیلائے شب ہے سازِ محبت پہ نغمہ زن
حورِ سحر ہے دوش پہ مینا لئے ہوئے

ہر آستانِ حسن پہ جُھک جُھک گئی جبیں
سر میں ہوں بے قراریٔ سجدہ لئے ہوئے

کیوں روح جذب ہو گئی حسنِ مجاز میں
یارب ہیں جلوہ ہائے بتاں کیا لئے ہوئے

خورشید و ماہتاب ہیں یا ساقیٔ بہار
میرے لئے ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

ہر گل کو چومتا ہوں اثرؔ فرطِ شوق میں
ہر گل ہے اُن کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے

اثرؔ صہبائی

ملکِ بابل

اُس لق و دق میدان کو جس کا نام اہلِ یونان نے میسو پوٹے میا (Mesopotamia) رکھا تھا قدرت نے دو حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ اُس کا نصف حصہ شمالی سنگلاخ ہے اور موسم برسات میں چراگاہ کا کام دیتا ہے۔ اولادِ اشر (Assyrians) کے وہاں آباد ہو جانے سے اسیریا (Assyria) مشہور ہو گیا۔ عرب اس خطہ کو الجزیرہ کہتے ہیں۔ جنوبی حصہ متعدد انہار کی وجہ سے غیر معمولی طور پر زرعی بن گیا تھا۔ اہلِ یونان اس کو بے بی لونیا (Babylonia) اور عرب العراق کہتے ہیں۔ اِس خطہ میں قوم تورانی اور اولادِ سام کے آباد ہو جانے سے نصف حصہ کا نام شومیر (Sumer) اور نصف کا نام اکد (Akkad) ہو گیا تھا۔ شمالی مشرقی حصہ کو اکد اور جنوبی مشرقی حصہ کو جو خلیج فارس کے گرد اور اُس کے جانب واقع تھا شومیر کہتے تھے۔ یہ دونوں خطے دریائے دجلہ اور دریائے فرات کی جنوبی وادی میں واقع تھے اور کوئی قدرتی حدِ فاصل اِن دونوں خطوں کے درمیان نہیں ہے۔ ان کے مغرب اور جنوب میں ریگستانِ عرب اور خلیج فارس واقع تھے۔ دریائے دجلہ غالباً اُن کی مشرقی حد تھی اور ایک خط اگر شہر سمارہ واقع دجلہ کے ذرا نیچے سے شہر ہت واقع فرات تک کھینچا جائے تو اسے شمالی حد سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ امر استعجاب سے خالی نہیں کہ باوجود ہزاروں برس کی سلطنت اور لاثانی شان و شوکت کے جن کا اثر آج تک ہر قوم و ملت کے دل پر باقی ہے ملکِ بابل کی قدیم تہذیب و تمدن کے آثار کا بڑا حصہ فنا ہو گیا۔ آج سے کچھ پہلے ممالکِ بابل اور اسیریا کی تہذیب و تاریخ کا علم قطعاً محدود تھا۔ صرف توریت کی معدودے چند آیات ہراڈوٹس[۱] اور زینوفن[۲]

۱؎ ہراڈوٹس مشہور سیاحی اور قدیم یونانی مورخ۔ فنِ تاریخ کا موجد ہے ۴۸۴ء قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۲۵ء قبل مسیح میں فوت ہوا۔ یہ ہیلی کارنیسس (Helicarnassus) واقع ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا جو کیریا (Caria) میں ڈوریا والوں (Dorians) کی ایک بستی تھی۔ اُس کی پیدائش کے زمانہ میں صوبہ کیریا کی حاکمہ دارا گشتاسپ (Darius Hystaspes) شاہِ ایران کی ایک سہیلی یا خواص ارتیمز (Arthemes) نام کی تھی۔

۲؎ زینوفن مشہور ایرانی مورخ و جنرل جس کی ذہانت و ذکاوت۔ فہم و فراست۔ حزم و احتیاط سے دس ہزار یونانی فوج کی بخیر و عافیت بعد ہزیمت واپسی ہوئی تھی۔ مورخ مذکور داراب ثانی شاہِ ایران ۴۲۴-۳۶۱ ق م کے خلاف اس کے بھائی کارس کی طرف سے لڑا تھا۔

کے سرسری بیانات۔ جوزیفس[۵۱] اور ٹی سیاس[۵۲] کی تصانیف جو برو سس[۵۳] بابلی کی تاریخ بابل کا اقتباس ہیں نیز دیگر یونانی اور لاطینی مورخوں کی مختصر تصانیف ہماری رہبر تھیں لیکن یہ مصالح اس قدر کافی نہ تھے جن کی امداد سے اُن ممالک کی تہذیب کا کامل اندازہ ہو سکتا یا صحیح تاریخ مرتب ہو سکتی۔

بخلاف مصر بابل اور اسیریا کے دلفریب آثار جو سیاحوں کی کشش کا باعث ہو سکتے تھے نابود ہو چکے تھے لیکن اپنی فوجی قوت۔ تعجب خیز بلند منادر۔ عالی شان محلات۔ رشکِ ارم باغات۔ انہار کے جال اور کرشمہ ہائے نجوم و سحر سے بنی آدم کے دلوں پر ایسا سکہ بٹھایا تھا کہ آج تک اُن کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ دریائے فرات اور دریائے دجلہ کی سالانہ طغیانی سے گو زمین غیر معمولی طور پر زرخیز بن گئی تھی تاہم انہار کا جال جب تک باقاعدہ نہیں پھیلا یا گیا جان اور مال معرضِ خطر میں رہے اور اضلاع کے اضلاع ہفتوں بلکہ مہینوں غرقِ آب رہتے تھے۔ بعدِ زوالِ سلطنتِ بابل انہار کی صفائی اور درستی میں غفلت اور تساہل سے وہی انہار جو محافظِ جان و مال تھیں غارت گر بن گئیں۔ وہ عمارات جو متعدد نسلوں کی محنت و مشقت کی یادگار تھیں بہت جلد فنا ہو گئیں۔ وہ نادر مصالح یعنی خشت و قیر جن کی خوبی کے باعث اس عہدِ عتیق کے کاریگروں نے بلند شاندار اور مشہور عمارات تعمیر کی تھیں عالمِ ہیولانی بلکہ کاغذی گھروندے کی طرح ناپائیدار اور بے ثبات ثابت ہوئے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

بادشاہ بخت نصر ثانی[۵۴] کا قول ہے کہ مرمت کی طرف سے غفلت کی جائے تو پینتالیس سال میں اعلیٰ سے اعلیٰ

---

۵۱ جوزیفس مشہور یہودی مورخ پہلی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔

۵۲ ٹی سیاس داراب ثانی شاہِ ایران (Artaxerxes Memnon Alias Darius ii) کا طبیب تھا۔ بادشاہ مذکور کا عہد ۴۰۵ قبلِ مسیح سے ۳۶۱ قبل مسیح تک تھا۔

۵۳ بروسس بابلی۔ مورخ ہیئت دان اور پوجاری مندر مردوخ۔ بروسس مذکور نے تاریخِ بابل پیدائشِ عالم سے سکندر اعظم کے عہد تک قلمبند کر کے سکندرِ اعظم کی حضور میں پیش کی تھی۔ بقولِ مورخ جوزیفس اہلِ بابل کو ناز تھا کہ واقعات متعلقہ ہیئت۔ احکامِ نجوم اور تقویم وغیرہ طوفانِ نوح کے ایک سو پندرہ سال کے بعد سے سکندرِ اعظم کے عہد تک اُن کے پاس محفوظ ہیں۔ حکیم ارسطو کو علم ہوا تو اُسے اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے شاگرد کیلس تنیز (Calesthenes) سے فرمائش کی کہ جو سب سے صحیح نسخہ ہو اُس کے مطالعہ کے واسطے بھیجے چنانچہ بعد کوشش بسیار اُس نے ایک نسخہ بروسس بابلی سے حاصل کر کے اپنے اُستاد کو بھیجا۔ خود بھی ایک رسالہ مرتب کیا جو ڈی کولو (Decolo) کے نام سے مشہور ہے۔

۵۴ بخت نصر ثانی بادشاہ بابل ۶۰۵-۵۶۱ قبلِ مسیح میں گذرا ہے۔

اور مستحکم سے مستحکم عمارات کھنڈر ہو جاتی ہیں۔ اس قول سے تصور ہو سکتا ہے کہ دو ہزار سال تک غیر آباد اور کس مپرسی کی حالت میں رہنے سے اُن عمارات کی کیا صورت بن گئی ہوگی اور اُن کی تحقیقات میں کس قدر دردسری اور مشکلات کا سامنا ہؤا ہوگا۔

تمام عمارات منہدم ہو کر بہ حیثیت کھنڈروں کی صورت میں مبدل ہوگئی تھیں اور تند و تیز ہوائے صحرا کے ریگ کو اڑا اڑا کر ان کھنڈروں پر لا ڈالا تھا حتیٰ کہ ریگ سے تمام آثار پوشیدہ ہو کر ٹیلوں کی صورت بن گئے تھے دراصل قدرت نے اِن کھنڈروں کو ریگ صحرا سے پوشیدہ کر کے اپنے فضل و کرم کا اظہار فرمایا کیونکہ مذکورہ کھنڈر اگر کھلے رہتے تو دریاؤں کی طغیانی اور برسات کے پانی کے اثر سے وہ کلی کتبے جو آج تاریخی دنیا میں ہمارے رہبر ہیں نیست و نابود ہو جاتے اور قیامت تک تاریخ بابل پردۂ خفا یا صحیفۂ مختوم کی صورت میں رہتی۔ ریگ کے طبق نے اُن کی ایسی حفاظت کی کہ کھنڈروں کے زیریں حصے سے آج عہدِ عتیق کے ہزاروں بے بہا مختلف البیئت کتبے بت مہریں قبریں اور دیگر یادگاریں برآمد ہو چکی ہیں جن کے طفیل تاریخ بابل پر کافی روشنی پڑ گئی ہے۔ اصل واقعات کے تاریکی میں رہنے سے یا لاعلمی کے سبب عموماً روایات مقبولِ خاص و عام ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اُن روایات کی تحقیق سے اصل واقعہ کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔

شہر موصل کے متصل متعدد ٹیلے ہیں۔ بعض پر عرب آباد ہو گئے ہیں اور فی زماننا وہ آبادی کا نجوق کے نام سے مشہور ہے۔ ان ٹیلوں میں سے ایک پر ایک مسجد اور ایک قبر ہے جس کو وہاں کے باشندے مزارِ حضرتِ یونس علیہ السلام کہتے ہیں۔ گو یورپی سیاح اِس کو فرضی مزارِ حضرتِ یونس علیہ السلام سمجھتے ہیں تاہم شہر نینوا سے حضرت یونسؑ کے جو تعلقات

سلہ حضرت یونس علیہ السلام تغلط پلیسر شاہ اسیریا کے ہمعصر تھے جو ۸۶۲ قبل مسیح میں گزرا ہے۔ شہر نینوا اس کا دارالامارت تھا۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل میں حضرتِ یونسؑ شہرِ نینوا میں بغرضِ ہدایت تشریف لے گئے تھے۔ توریت میں آپ کے نینوا تشریف لے جانے کا واقعہ درج ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے یوناہ بن امتی کو خدا نے حکم دیا کہ نینوا جا کر وہاں کے باشندوں کو ہدایت کرو کیونکہ اُن کے اعمال ہماری ناخوشی کا باعث ہیں۔ یوناہ نے بجائے نینوا کے ترسیش (جنوبی اسپین) کی راہ لی اور جوپا (یافہ) پہنچ کر کشتی پر جو ترسیش جانے والی تھی سوار ہو گیا کچھ دور کشتی مذکور پہنچی تھی کہ خدا نے ایسا طوفان بھیجا کہ کشتی ڈوبنے لگی۔ ملاحوں نے یاس و ہراس سے اپنے اپنے معبود کو یاد کیا اور کشتی کو ہلکا کرنے کی غرض سے اجناس سمندر میں پھینک دیں۔ اس وقت یوناہ کشتی کے زیریں حصہ میں سوتا تھا۔ ناخدا نے جگا کر یادِ الٰہی کی ہدایت کی۔ پھر اہلِ کشتی نے قرعہ ڈال کر دریافت کیا کہ وہ غیر معمولی طوفان یوناہ کی وجہ سے آیا تھا .... یوناہ کی درخواست پر اُس کو سمندر میں پھینک دیا اور طوفان فرو ہوا۔ خدا کے حکم سے ایک مچھلی یوناہ کو نگل گئی اور تین شب و روز یوناہ مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ یوناہ نے

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

رہے ہیں وہ ان ٹیلوں پر شہرِ نینوا کا شبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔ چنانچہ کھودنے سے ثابت ہوگیا کہ جس ٹیلے پر مزارِ مذکور ہے وہ قدیم شہرِ نینوا کا ایک حصّہ ہے اور دیگر ٹیلے اِس عظیم الشان شہر کے محلے تھے۔ اسی طرح بغداد سے چالیس میل کے فاصلہ پر چند ٹیلے ہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام وہاں کے عرب باشندے بابل بتاتے تھے۔ تحقیق سے اُن کا قول پایۂ ثبوت کو پہنچا۔ بہر حال روایات ہی ذریعۂ سراغ ہوئیں۔

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی سے اِن روایات نے یورپی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا شدہ شدہ یورپ کی ہر بڑی سلطنت نے اپنے نمایندوں کو بھیج کر تحقیقات شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں جب کہ ایک یہودی رہبان بنجامن ساکن ٹیوڈیلہ ضلع نوار شہرِ بغداد میں وارد ہوا تو اُس سے وہاں کے یہودیوں نے بیان کیا کہ مقامِ حلہ کے آس پاس کھنڈروں میں اب بھی بادشاہ بخت نصر ثانی کے محل کے آثار اس گلخن کے قریب پائے جاتے ہیں جس میں حنانیاہ[1]۔ مشائیل[2] اور ازاریہ[3] ڈالے گئے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۵) عفوِ گناہ اور رہائی کی دعا مانگی تو بحکمِ خدا مچھلی نے اس کو خشکی میں اگل دیا۔ پھر خدا کے حکم سے شہرِ نینوا پہنچ کر ہدایت شروع کی۔ توریت سے زیادہ مشرح و مفصل حالات یونس علیہ السلام تاریخِ طبری روضۃ الصفا وغیرہ میں درج ہیں۔ اکثر یورپین مورخ اس واقعہ سے منکر ہیں۔ اُن کے خیال میں تین روز کے بعد مچھلی کے معدہ سے زندہ برآمد ہونا خلافِ عقل ہے۔ اور مذکورہ واقعے کی تشریح میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ گو بالاستیعاب نظرِ تنقید ڈالنے سے اُن کی تشریح کا کوئی پہلو پایۂ ساینت کو نہیں پہنچتا تاہم نقلِ کفر کفر نباشد پر کاربند ہو کر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بعض یورپین مورخوں (Mr. Ragozin Chilperic Edwards & Others) کا قول ہے کہ شہرِ نینوا کا نام زبانِ اہلِ شہر میں نِنوا ہے جو مشابہ نونو کے ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں۔ علاوہ اہلِ شہر کی زبان میں ننوا اگر لکھا جائے تو تیر نما حروف کی کشش سے ایک مچھلی تالاب میں بن جاتی ہے مثلاً یہ شکل:-

لہذا جس مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگلا تھا وہ شہرِ نینوا تھا اور رہائی کے واسطے اُن کی گریہ و زاری اور دعا کا مانگنا متعدد ندشوں و تکالیف کے باعث ہوگا۔

[1] [2] [3] بعد فتحِ بیت المقدس ۶۰۶ قبل مسیح میں یہ تینوں یہودی شہزادے بخت نصر ثانی کے حضور میں قید ہو کر آئے۔ حسب الحکم عام قیدیوں کے ہمراہ بابل بھیج دیئے گئے۔ بعد تعلیم و تربیت بادشاہ مذکور نے اپنی روبکاری میں متعین کیا۔ حنانیا کا نام تبدیل ہو کر شدراخ۔ ازاریہ کا نام عبید نگو اور مشائیل کا نام میشاخ رکھا گیا۔ بخت نصر ثانی نے جب ایک ساٹھ کیوبٹ (یونانی کیوبٹ برابر ہے ۱۸۔ انچ اور ۲۰ جو انگریزی کے) کا طلائی بت رکھ کر اُس کی پرستش کا اذن عام دیا تو اِن تینوں شاہزادوں نے انکار کیا۔ بقولِ یہود سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں وہ گلخن میں ڈال دیئے گئے لیکن آگ نے اُن پر کچھ اثر نہیں کیا۔ بادشاہِ مذکور نے متعجب ہو کر حکم دیا کہ کوئی شخص اس دن سے یہود کے خدا کو بُرا نہ کہے ورنہ گردن ماری جائے گی (کتاب حضرت دانیال ۱-۱۱-۳-۴)

بقول مسٹر راجرز (Mr. Rogers) ربیؔان مذکور کا لا طائل بیان خود شاہد ہے کہ اُس کا بابل کی طرف کبھی گذر ہی نہیں ہوا تھا - جس قدر حالات اُس نے قلمبند کئے ہیں سب روایتوں پر مبنی ہیں - بہر حال بنجامن مذکور کو مغالطہ ہوا - بیرس نمرود کو وہ مینارِ بابل سمجھا - کیونکہ اس کا بیان ہے کہ بجلی کے صدمہ سے مینارِ مذکور بنیاد تک شق ہو گیا ہے - دراصل مندر بورسپ پا کی جو البیرس یا بیرس نمرود میں واقع ہے ایسی ہی صورت ہے - دبورسپ پا کا حال انشاءاللہ تعالیٰ آیندہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا)

سولھویں صدی عیسوی میں ایک انگریز تاجر جان الڈرڈ کا تین دفعہ شہر بغداد میں گذر ہوا جس کا اُس نے جدید بابل کے نام سے ذکر کیا ہے - وہ لکھتا ہے کہ حسبِ معمول اُس کا گذر اُس مقام پر ہوا جہاں کسی زمانہ میں عظیم شہر بابل آباد تھا جس کے متعدد کھنڈر دور دور تک اس بیابان میں پھیلے ہوئے تھے - اکثر فرصت کے وقت وہ کھنڈروں کی سیر کرنے جایا کرتا تھا -

۱۶۰۰-۱۵۹۹ء میں انٹی شرلی کا اُدھر سے گذر ہوا اور کچھ زمانہ بعد ۱۶۱۶ء میں اٹلی کے ایک باشندہ پیٹرو ڈیلاوالے[۲] وہاں پہنچا - اُس نے قدرے صحت کے ساتھ مینارِ بابل کی تحقیق کی اور مینارِ بابل کا مقام اُس ٹیلے کو قرار دیا جہاں شہر بابل واقع تھا اور جہاں سے وہ بخت نصر ثانی کے عہد کے چند روغنی چوکے جن پر بادشاہ مذکور کا نام لکھا ہوا تھا روم ڈالی لے گیا - غالباً آثارِ قدیمہ کا یہ سب سے پہلا مجموعہ گو حقیر تھا جو ملکِ بابل سے یورپ پہنچا تاہم اُس نے مقناطیس کا کام کیا - یورپ کی ہر بڑی سلطنت بابل اور اسیریا کی تہذیب و تمدن کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئی - ظاہر ہے کہ یورپ کا تمدن و معاشرت ان عظیم الشان قوموں سے مختلف ہے لیکن قدیم ادبیات اور فنون وغیرہ کی تحقیق کے شوق نے ایک روح پرور ولولہ پیدا کر دیا -

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۸۱۱ء میں مسٹر ریچ نے اور ۱۸۵۰ء میں مسٹر لے یارڈ نے ۱۸۵۲-۵۴ء میں سلطنتِ فرانس کی طرف سے جولز اوپرٹ نے اور برٹش گورنمنٹ کی طرف سے سر ہنرز ریسم نے ۱۸۷۸ء و ۱۸۸۹ء میں شہر بابل کے مختلف کھنڈروں کو کھودا لیکن تحقیقات کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی - ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۹ء میں جرمن گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹر کالڈیوی نے قصرِ بخت نصر کے مشرقی حصہ سے کچھ روغنی چوکے نکال کر جرمنی روانہ کئے جن کو جرمنی کے عجائب خانۂ شاہی ڈاکٹر ریچرڈ شون نے نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا اور ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر موصوف کی زیرِ نگرانی

---

۵۱ 1. The Itenerary of Benjamin of Tudela (Jewish Quarterly Review Vol XVIII)

۵۲ 2. Pietro della Valles "Viaggi" (Rome 1650 A.D.)

رہے ہیں وہ ان ٹیلوں پر شہر نینوا کا شبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔ چنانچہ کھودنے سے ثابت ہوگیا کہ جس ٹیلے پر مزار مذکور ہے وہ قدیم شہر نینوا کا ایک حصہ ہے اور دیگر ٹیلے اِس عظیم الشان شہر کے محلے تھے۔ اسی طرح بغداد سے چالیس میل کے فاصلہ پر چند ٹیلے ہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام وہاں کے عرب باشندے بابل بتاتے تھے تحقیق سے اُن کا قول پایۂ ثبوت کو پہنچا۔ بہر حال روایات ہی ذریعۂ سراغ ہوئیں۔

سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی سے اِن روایات نے یورپی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا شدہ شدہ یورپ کی ہر بڑی سلطنت نے اپنے نمایندوں کو بھیج کر تحقیقات شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب کہ ایک یہودی رہبان بنجامن ساکن ٹیوڈیلہ ضلع نوار شہر بغداد میں وارد ہوا تو اُس سے وہاں کے یہودیوں نے بیان کیا کہ مقام حلہ کے آس پاس کھنڈروں میں اب بھی بادشاہ بخت نصر ثانی کے محل کے آثار اس گلخن کے قریب پائے جاتے ہیں جس میں حنانیا[۱]۔ مشائیل[۲] اور ازاریہ[۳] ڈالے گئے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۵) عفو گناہ اور رہائی کی دعا مانگی تو بحکم خدا مچھلی نے اس کو خشکی میں اگل دیا۔ پھر خدا کے حکم سے شہر نینوا پہنچ کر ہدایت شروع کی۔ (توریت سے زیادہ مشرح و مفصل حالات یونس علیہ السلام تاریخ طبری روضۃ الصفا وغیرہ میں درج ہیں) اکثر یورپین مورخ اس واقعہ سے منکر ہیں۔ اُن کے خیال میں تین روز کے بعد مچھلی کے معدہ سے زندہ برآمد ہونا خلاف عقل ہے۔ اور مذکورہ واقعے کی تشریح میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ گو بالاستیعاب نظر تنقید ڈالنے سے اُن کی تشریح کا کوئی پہلو پایۂ ثقاہت کو نہیں پہنچتا تاہم نقل کفر کفر نباشد پر کاربند ہو کر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بعض یورپین مورخوں (Mr. Ragozin Chilperic Edwards & Others) کا قول ہے کہ شہر نینوا کا نام زبان اہل شہر میں نینوا ہے جو مشابہ نونو کے ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں۔ علاوہ اہل شہر کی زبان میں نینوا اگر لکھا جائے تو تیر نما حروف کی کشش سے ایک مچھلی تالاب میں بن جاتی ہے مثلاً یہ شکل:۔

لہٰذا جس مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگلا تھا وہ شہر نینوا تھا اور رہائی کے واسطے اُن کی گریہ و زاری اور دعا کا مانگنا منقذ شدن از تکالیف کے باعث ہوگا۔

[۱] [۲] [۳] بعد فتح بیت المقدس ۶۰۶ قبل مسیح میں یہ تینوں یہودی شہزادے بخت نصر ثانی کے حضور میں قید ہو کر آئے حسب الحکم عام قیدیوں کے ہمراہ بابل بھیج دیئے گئے بعد تعلیم و تربیت بادشاہ مذکور نے اپنی روبکاری میں متعین کیا حنانیا کا نام تبدیل ہو کر شدراخ۔ ازاریہ کا نام عبید نگو اور مشائیل کا نام میشاخ ہوگیا۔ بخت نصر ثانی نے جب ساٹھ کیوبٹ (یونانی کیوبٹ برابر ہے ۱۸۔ انچ اور ۲۰ جو انگریزی کے) کا طلائی بت رکھ کر اُس کی پرستش کا اذن عام دیا تو ان تینوں شاہزادوں نے انکار کیا۔ بقول یہود سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں وہ گلخن میں ڈال دیئے گئے لیکن آگ نے اُن پر کچھ اثر نہیں کیا۔ بادشاہ مذکور نے متعجب ہو کر حکم دیا کہ کوئی شخص اس دن سے یہود کے خدا کو بُرا نہ کہے ورنہ گردن ماری جائے گی (کتاب حضرت دانیال ۱۔ ۳۔ ۱۱۔ ۴)

بقول مسٹر راجرز (Mr. Rogers) رہبانؔ[1] مذکور کا لاطائل بیان خود شاہد ہے کہ اُس کا بابل کی طرف کبھی گذر ہی نہیں ہؤا تھا۔ جس قدر حالات اُس نے قلمبند کئے ہیں سب روایتوں پر مبنی ہیں۔ بہرحال بنجامن مذکور کو مغالطہ ہؤا۔ بیرس نمرود کو وہ مینارِ بابل سمجھا۔ کیونکہ اس کا بیان ہے کہ بجلی کے صدمہ سے مینارِ مذکور بنیاد تک شق ہو گیا ہے۔ دراصل مندر بورسپ پا کی جو البیرس یا بیرس نمرود میں واقع ہے ایسی ہی صورت ہے۔ (بورسپ پا کا حال انشااللہ تعالیٰ آیندہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا)

سولھویں صدی عیسوی میں ایک انگریز تاجر جان الڈرڈ کا تین دفعہ شہرِ بغداد میں گذر ہؤا جس کا اُس نے جدید بابل کے نام سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حسبِ معمول اُس کا گذر اُس مقام پر ہؤا جہاں کسی زمانہ میں عظیم شہر بابل آباد تھا جس کے متعدد کھنڈر دور دور تک اس بیابان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اکثر فرصت کے وقت وہ کھنڈروں کی سیر کرنے جایا کرتا تھا۔

۱۵۹۹-۱۶۰۰ء میں انٹی شرلی کا اُدھر سے گذر ہؤا اور کچھ زمانہ بعد ۱۶۱۶ء میں اٹلی کے ایک باشندہ پیٹرو ڈیلاوال[2] وہاں پہنچا۔ اُس نے قدرے صحت کے ساتھ مینارِ بابل کی تحقیق کی اور مینارِ بابل کا مقام اُس ٹیلے کو قرار دیا جہاں شہرِ بابل واقع تھا اور جہاں سے وہ بخت نصر ثانی کے عہد کے چند روغنی چوکے جن پر بادشاہِ مذکور کا نام لکھا ہؤا تھا روم (اٹلی) لے گیا۔ غالباً آثارِ قدیمہ کا یہ سب سے پہلا مجموعہ گو حقیر تھا جو ملکِ بابل سے یورپ پہنچا تاہم اُس نے مقناطیس کا کام کیا۔ یورپ کی ہر بڑی سلطنت بابل اور اسیریا کی تہذیب و تمدن کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یورپ کا تمدن و معاشرت ان عظیم الشان قوموں سے مختلف ہے لیکن قدیم ادبیات اور فنون وغیرہ کی تحقیق کے شوق نے ایک روح پرور ولولہ پیدا کر دیا۔

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۸۱۱ء میں مسٹر ریچ نے اور ۱۸۵۰ء میں مسٹر لے یارڈ نے ۱۸۵۲-۵۴ء میں سلطنتِ فرانس کی طرف سے جولز اوپرٹ نے اور برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہرمز ریسم نے ۱۸۷۸ء و ۱۸۸۹ء میں شہرِ بابل کے مختلف کھنڈروں کو کھودا لیکن تحقیقات کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۹ء میں جرمن گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹر کالڈیوی نے قصرِ بخت نصر کے مشرقی حصہ سے کچھ روغنی چوکے نکال کر جرمنی روانہ کئے جن کو جرمنی کے عجائب خانۂ شاہی ڈاکٹر ریچرڈ شون نے نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا اور ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر موصوف کی زیرِ نگرانی

؎۱ The Itenerary of Benjamin of Tudela (Jewish Quarterly Review Vol XVIII)

؎۲ Pietro della Valles "Viaggi" (Rome 1650 A.D.)

شہرِ بابل کی باقاعدہ کھدوائی شروع کی گئی اور سولہ سال تک مسلسل تحقیقات جاری رہی۔

یونانی حکما نے تمام روئے زمین کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک حصہ کا نام اقلیم رکھا ہے۔ ہر اقلیم خ
استوا کی جانب سے شروع ہو کر قطبِ شمالی کی جانب منتہی ہوتی ہے۔ اس یونانی حساب کے بموجب بابل کا طول جز
خالدات سے ۴۴ درجہ، ۱۲ دقیقہ اور ۳۰ پل ہے اور عرض اس کا خطِ استوا سے ۳۲ درجہ اور ۴۴ دقیقہ ہے۔

اولادِ سام کی زبان میں شہرِ بابل کا اصل نام باب ایلی تھا جس کے معنی ہیں دیوتاؤں کا دروازہ بعض کتبا
میں باب ایلو یعنی خدا کا دروازہ بھی لکھا ہے۔ اس سے قدیم تر نام اس کا اہلِ شومیر کی زبان میں کادنگر را یا کادیر
تھا اور اس کے معنی بھی وہی ہیں۔ اہلِ اکدّ کی زبان میں تن تر کی تھا جس کے معنی مقامِ حیات کے ہیں۔

توریت کے باب ۱۱۔ آیت ۲ سے واضح ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی اولاد نے طوفان سے ایک مدت
جانبِ مشرق سفر کیا اور ملکِ شنعار کے وسیع میدان میں پہنچ کر آباد ہو گئی[۵۱] اور شہرِ بابل تعمیر کیا۔

بقول پادری نیوٹن براؤن (Rev. Newton Brown) نوح علیہ السلام کے پرپوتے نمرود نے ا
(بابل) کو رونق اور وسعت دی۔ ملکِ اسیریا کی مشہور شاہزادی سیمی[۵۲] رامس نے ۱۲۰۰ قبلِ مسیح میں شہرِ بابل کو از سر

---

[۵۱] توریت باب ۱۱۔ آیت ۲۔ جب وہ (اولادِ نوح) مشرق سے روانہ ہو کر ملکِ شنعار میں پہنچی تو انھوں نے ایک میدان دیکھا اور اس میں آ
ہو گئی۔ آیت ۳۔ اور آپس میں صلاح کی کہ خشت بنا کر آگ میں پکائیں + آیت ۴۔ پھر مشورہ کیا کہ ایک شہر تعمیر کیا جائے نیز ایک
مینار جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے تاکہ یادگار قائم رہے اگر روئے زمین پر منتشر ہو جائیں۔

شارحینِ توریت نے تعینِ سن میں غلطی کی ہے اُن کے قول کے موافق ۲۲۳۳ ق م میں شہرِ بابل کو اولادِ نوح نے آباد کیا
۲۲۱۸ ق م یا ۲۰۰۰ ق م میں نوح علیہ السلام کے پرپوتے نمرود نے اس کو رونق اور وسعت دی۔ تعینِ تاریخ و سنہ کا جہاں تک
تعلق ہے شارحینِ توریت کے اقوال پایۂ ثبوت سے ساقط ہیں کیونکہ نمرود کے کم و بیش ایک ہزار سال بعد حضرتِ ابراہیم خلیل
کا زمانہ تھا۔ حمورابی بادشاہِ بابل آنحضرت کا ہمعصر تھا۔ جدید تحقیقات سے بادشاہ مذکور کا عہد ۲۲۱۳-۲۲۶۷ ق م تھا لہذا
کا زمانہ کم از کم تین ہزار سال قبلِ مسیح ہونا چاہئے۔

[۵۲] سیمی رامس۔ اس نام کی کئی شاہزادیاں گزری ہیں۔ نمرود کے لڑکے کی زوجہ کا نام بھی یہی تھا۔ اسی نام کی ایک شاہزادی ۱۲۲۹
گذری ہے اور ممکن ہے کہ یہ شاہزادی وہی ہو جس کے عہد میں بقول ہیلانیکس مشہور محاصرہ شہر ٹرائے (Troy) کا ہوا
زوجہ الوالیش یا شمس ہداد چہارم (۸۱۱-۸۲۳ ق م) کا نام بھی یہی تھا۔ اس شاہزادی کی یادگار میں ایک سنگین لاٹھ شہر اشر ملک
میں نصب کی گئی تھی جس کو چند سال ہوئے ڈاکٹر اندرائی نے برآمد کیا تھا۔

تعمیر کیا۔ بادشاہ نبو پولیسر[۵۱] نے ۶۲۵-۶۰۴ ق م میں اور اُس کے لڑکے بخت نصر ثانی نے ۶۰۴-۵۶۱ ق م میں اُس کو نہایت مستحکم و خوبصورت بنا کر رشک ارم کر دیا تھا۔

شہر بابل کی قدامت کے متعلق یہودیوں کو مغالطہ ہوا۔ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ملک شنعار (بابل) میں اولاد نوح کے پہنچنے سے بہت پہلے بنی آدم وہاں آباد تھے۔ وہ لوگ قوم تورانی کی ایک شاخ تھے جو مدت مدید سے خطۂ شومیر میں آباد ہونے کے باعث اہل شومیر کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ اہل شومیر کے اعتقاد کے موافق شہر بابل کا وجود پیدائش عالم کے ساتھ اور پیدائش انسان سے قبل ہوا تھا (کیونکہ بقول اہل شومیر شہر بابل خداؤں کا مسکن تھا) بہر حال بابل کی قدامت میں کچھ شک نہیں۔ گو بادشاہ حامورابی[۵۲] ہمعصر حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے پیشتر کے اکثر تاریخی واقعات ہنوز پنہاں ہیں تاہم قرین قیاس ہے کہ شہر بابل کی جو شان اور شوکت۔ قدر و منزلت بادشاہ بخت نصر ثانی کے عہد میں تھی وہی قریب قریب ڈیڑھ ہزار سال قبل بادشاہ مورابی کے عہد میں ہو گی البتہ اول الذکر نے جدید باغات و محلات کی تعمیر سے شہر کو بہت وسیع اور زیادہ خوشنما بنا دیا تھا۔

افسوس ہے کہ اس قدیم اور عظیم الشان شہر کو سیناچیرب بادشاہ اسیریا نے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے کتبے میں شہر بابل کی تباہی کے متعلق بیان کرتا ہے "جب میں اہل بابل کی متواتر یورش اور غدر سے عاجز ہو گیا تو میں نے دیگر شہروں کی رعایا کو عبرت دلانے کی غرض سے بابل کی تمام قدیم عمارات مسمار کر دیں۔ دریا کا بند توڑ دیا اور شہر کو غرق آب کر کے اُس کا نام و نشان مٹا دیا" یہ عبرت ناک واقعہ ۶۸۹ قبل مسیح میں ظہور میں آیا۔

قدیم شہر بابل کی تباہی کے بعد ایسر حیدن[۵۳] بادشاہ نے ۶۷۸ ق م میں اس کی دوبارہ تعمیر کی لیکن بادشاہ

---

۵۱ نبو پولیسر۔ بادشاہ بابل ۶۲۵-۶۰۴ ق م میں گذرا ہے یونانی اس کو بلسیز (Belsis) اور ایرانی گودرز کہتے تھے۔

۵۲ حامورابی بادشاہ بابل جس کو توریت کے باب ۱۴ میں امرافل سے خطاب کیا گیا ہے اس کا عہد ۲۲۶۷-۲۲۱۳ ق م تھا۔

۵۳ ایسرحیدن کا بابلی نام اشراحی الدینا تھا۔ اُس کا عہد ۶۸۰-۶۶۸ ق م تھا۔ یہ سیناچیرب بادشاہ اسیریا کا دوسرا لڑکا تھا۔ اس نے دار الامارت بابل کو تجویز کیا تھا۔ بادشاہ مذکور کے کتبے شاہد ہیں کہ بابل میں اُس نے منادر کی مرمت و محلات کی تعمیر کی۔ اسی کے عہد میں مناسہ بادشاہ بیت المقدس گرفتار ہو کر آیا۔ ۶۶۸ ق م میں شمس دوکن نے بغاوت کر کے بابل پر قبضہ کر لیا۔ اشربانی پال ثانی نے اپنے عہد میں بابل کو دوبارہ فتح کیا۔ بادشاہ مذکور کے لڑکے اشر امت ایلی شاہ اسیریا نے کیکاؤس بادشاہ ایران کے حملہ کے وقت نبو پولیسر کو صوبہ دار بابل متعین کیا لیکن صوبہ دار مذکور نے دشمن کے ساتھ مل کر نینوا دار الامارت اسیریا کا محاصرہ کیا۔ شہر نینوا کی فتح کے بعد کیکاؤس نے نبو پولیسر کو مستقل بادشاہ بابل بنا دیا۔

اشر بانی پال[51] کے محاصرہ اور فتح کے بعد یہ پھر برباد ہو گیا۔

قدرت خدا کی دیکھیئے کہ آتش زن یا ققنس کی طرح اپنی خاک سے شہر بابل نے ہمیشہ دوسرا جنم لیا اور ہر دفعہ جواں بخت وجواں دولت ثابت ہوا۔ نے بوپولیسر بادشاہ کے عہد میں پھر سر بفلک۔ منار و عالی شان عمارات تعمیر ہو گئیں جاہ و جلال۔ سطوت و جبروت۔ عظمت و شوکت کا نقارہ مثل سابق بجنے لگا اور دبدبہ وہیبت۔ حکومت و سلطنت کے خورشید کی تجلیاں عالم کو خیرہ کرنے لگیں۔ سچ ہے، مالک نے جو چاہا سو کیا۔ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ اور جو چاہے گا سو کرے گا۔

غائب قدرت ہے تیری موجود — نابود ہو بود، بود نابود

چھوٹا ہو بڑا بلند ہو پست، — ہو ہست سے نیست نیست سے ہست

گویا ہیں لب ملائے اعلیٰ — سبحانک شانہٗ تعالیٰ

مشہور سیاح وقدیم یونانی مورخ ہراڈوٹس اور حکیم ٹی سیاس نے بابل کے متعلق جو حالات قلمبند کئے ہیں وہ قابل وقعت اس وجہ سے ہیں کہ اول الذکر نے شہر بابل کو اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس کی خوب سیر کی تھی اور آخر الذکر شاہ ایران داراب ثانی[52] کا طبیب تھا۔ اس کو بابل کی سیر کا اکثر اتفاق ہوا تھا۔

بقول ہراڈوٹس شہر بابل ایک مربع قطعہ پر واقع تھا۔ شہر پناہ کی ہر دیوار ایک سو بیس اسٹیڈیا[53] یعنی قریبًا چودہ میل کی تھی اس حساب سے اس کا دور کم وبیش دو سو میل مربع تھا۔ فصیل مذکور اسی فیٹ چوڑی اور دو سو شاہی کیوبٹ یعنی ۳۳۷ فیٹ ۸ انچ یا ۳۳۷ فیٹ ۴ انچ بلند تھی[54]

---

[51] اشر بانی پال، بادشاہ اسیریا ۶۲۶-۶۶۸ ق م میں گذرا ہے۔ یونانی اس کو سارڈانا پلس کہتے تھے اور توریت میں اس کو اسنا پر سے خطاب کیا ہے۔

[52] داراب ثانی، (۳۶۱-۴۰۵ ق م) ایران کا بادشاہ تھا۔ یونانی اس کو Artaxerxes Memnon alias Darius II کہتے تھے۔

[53] اسٹیڈیا۔ ایک اسٹیڈیا برابر ہے ۶۰۶ فیٹ اور نو انچ انگریزی کے۔

[54] بعض یورپین مورخ عرض وطول شہر بابل کے متعلق ہراڈوٹس اور ٹی سیاس کے بیانات کو اس وجہ سے مبالغہ آمیز سمجھتے ہیں کہ اس قدیم زمانہ میں تحقیق حال کی طرف میلان طبع کم اور روایتوں پر بلا کد و کاوش اعتماد زیادہ تھا۔ سکندر اعظم کے عہد کے مورخوں کا بیان ہے کہ (ارسٹوبیولس جس کے اقوال یوسی بیس نے نقل کئے ہیں) فصیل گیارہ میل ہر طرف اور دور میں کم وبیش ایک سو تیس

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ)

فصیل کے گرد عمیق اور چوڑی خندق تھی جو دریائے فرات کے پانی سے لبریز رہتی تھی۔ خندق کا فرش اُس کی مٹی سے بنائی ہوئی پختہ اینٹ کے کھرنجہ کا تھا جس میں چونے کی جگہ قیر کو پگھلا کر گرم گرم استعمال کیا تھا خندق کی مٹی سے اینٹیں پکا کر فصیلِ شہر تعمیر کی گئی تھی جس کے کناروں پر جابجا آمنے سامنے بروج اور سپاہیوں کے واسطے حجرے بنے ہوئے تھے۔ حجروں کے درمیان اس قدر جگہ چھوڑی گئی تھی کہ ایک چوکڑی آسانی سے گھوم سکتی تھی۔ اس کی چنائی بھی خشت و قیر سے کی گئی تھی اور ہر تیس ردوں کے بعد ایک تہ نرسل کی دے کر پہلوؤں کو مضبوط کیا گیا تھا۔

اس فصیل میں ایک سو عالی شان دروازے آمد و برآمد کے لئے بنائے گئے تھے۔ کواڑ اور چوکھٹ پیتل کے تھے اُن کواڑوں کا ذکر یسعیاہ پیغمبر یعنی اشعیا علیہ السلام نے اپنی کتاب کے چودھویں باب میں کیا ہے [۱]
شہرِ بابل کی دوہری فصیل تھی۔ ایک شالخو یعنی فصیلِ بیرونی جو نہایت مستحکم اور نی مت[۲] تی بعل کے نام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰۰) میل مربع تھی۔ حکیم ٹی سیاس کا بیان ہے کہ ہر دیوار پینٹھ اسٹیڈیا تھی اور پچاس فیدم یعنی دو سو معمولی کیوبٹ جس کے تین سو فیٹ ہوئے بلندی میں تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تخمینے نظری تھے۔ باقاعدہ پیمائش کسی نے نہیں کی۔ اگر سکندر کے مورخوں کے اقوال کو ہی صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی شہر لندن سے پانچ گنا یا چھ گنا وسعت میں ہوا۔

ڈاکٹر کالڈیوی کا خیال ہے کہ شہر پناہ کا اس قدر طویل ہونا کچھ تعجب خیز نہیں اور نہ ناممکن خیال کی جا سکتی ہے جب کہ ہم کو علم ہے کہ ملکِ چین کی مشہور دیوار طول میں پندرہ سو میل ہے۔ (سرہنری رالن سن ۱۲ سو میل بتاتے ہیں۔)

ڈاکٹر کنگ اس تمثیل کی تردید میں بیان کرتے ہیں کہ چین کی دیوار مملکت چین کی سرحد ہے شہر پناہ نہیں۔ اگر مقابلہ کیا جائے تو شہر نانکن واقع چین سے جس کی فصیل کا دور ۲۴ میل سے کم ہے۔

جولز اوپرٹ ہراڈوٹس کی پیمائش کے موید ہیں۔ انہوں نے اپنے مرتبہ نقشہ میں فصیل کو شہر بابل سے بیرس نمرود تک دکھایا ہے اور فصیل کا سلسلہ ہر کھنڈر اور ٹیلے کے کھودنے سے برآمد ہوا۔

قریہ سنجار کے متصل کچھ فصیلوں کے آثار پائے جاتے ہیں جن کو ڈاکٹر ویسباخ (Weisbach) نے اپنے نقشۂ بابل میں دکھایا ہے مگر اُن کے شامل کرنے سے مغربی حصہ مشرقی حصہ سے چھوٹا ہو گیا ہے۔

چونکہ ہر مورخ کے نقشہ میں اختلاف ہے لہذا کوئی قطعی رائے فصیل کے طول کی نسبت اس وقت تک قائم نہیں کی جا سکتی جب تک کہ کامل تحقیقات نہ کی جائے۔ اہلِ جرمنی اس کی تحقیق میں مصروف تھے لیکن جنگِ عمومی کی وجہ سے تمام انتظامات درہم برہم ہو گئے۔

[۱] Isiah XIV. 1-2 [۲] بقول ابی ڈینس اور یوسی بیس بیرونی فصیل کو بادشاہ بیلس (مروخ) یعنی مشتری نے تعمیر کیا تھا۔

موسوم تھی جس کے معنی ہیں دیوتا بعل میری بنیاد ہے۔ دوسری فصیل اندرونی دور د کہلاتی تھی جس کا لقب اگر بعل تھا یعنی دیوتا بعل کا کرم ہے۔ استحکام میں یہ بھی بیرونی فصیل سے کچھ کم نہ تھی ۵۱

شہر کے ہر کوچہ میں ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا تھا۔ دریائے فرات وسطِ شہر میں موجزن تھا جس کے کناروں پر دورویہ بلند دیواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے دروازے دریائے فرات کی طرف کھلے ہوئے تھے گھاٹ کی سیڑھیاں سطحِ آب کے نیچے تک تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر دو عالی شان دروازوں کے وسط میں تین برج فصیل سے دس فیٹ بلند محافظینِ شہر کے لئے اور چاروں کونوں پر بڑے بڑے گنبد نہایت خوبصورت اور خوشنما بنے ہوئے تھے۔ کل بروج دو سو پچاس تھے ۵۲

مندرجہ بالا بیان سے اس فصیل کی تعمیر بیس کروڑ مربع فیٹ سے زیادہ ہوئی اور مملکتِ چین کی فصیل سے[۵۳] بحساب مکسر فٹ دوگنی ہوئی۔ شہرِ بابل کی فصیل کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا گیا تھا۔

ہراڈوٹس اور ٹی سیاس کے زمانہ میں فصیل مذکور اپنی اصلی حالت میں تھی۔ زینوفن کے زمانہ میں مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بہت شکستہ ہوگئی تھی اور بلندی میں کہیں کہیں سو فیٹ رہ گئی تھی۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں کلہم پچہتّر فیٹ بلند رہ گئی تھی۔ حوادث گاہِ عالم میں ایسے ہی انقلاب ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

محمد حامد دہلوی

---

۵۱ جدید تحقیقات شاہد ہے کہ عہدِ بخت نصر ثانی سے بہت پہلے بھی بابل کی فصیل دوہری تھی اور دونوں کے نام قدیم سے اگر بعل اور نی مت تی بعل چلے آتے تھے۔ اکثر بادشاہوں نے اُن کی مرمت کی تھی مثلاً بادشاہ شرغانی شرری (سارگن) نے سنہ ۷۱۰ ق م میں بادشاہ اشربانی پال نے سنہ ۶۴۸ ق م میں اور بادشاہ نبوپولیسر نے سنہ ۶۰۴ ق م میں۔

۵۲ ڈاکٹر کالڈیوی کا قول ہے کہ شمال مشرقی دیوار میں کم از کم نوے بروج تھے صرف پندرہ کی کامل تحقیقات ہو سکی۔

۵۳ مملکتِ چین کی دیوار بارہ سو یا پندرہ سو میل میں ہے۔ بلندی مختلف مقامات پر ۱۵ سے ۵۰ فیٹ تک ہے۔ سنہ ۱۸۲۳ء کے تخمینہ کی رو سے دیوار مذکور میں سلطنتِ انگلشیہ کی تمام عمارات سے زیادہ تعمیری مصالح صرف ہوا ہے

قلبیّات

۱

رگِ نیاز میں گر موجِ برقِ ناز نہیں
فتادگی ہے سراپا، امیں! نیاز نہیں

مذاقِ غزنوئی سومناتِ دل ہے وہی
توہی ایاز نہیں ہے۔ توہی ایاز نہیں

۲

ترے جگر میں اگر شمع کا گداز نہیں
تو بزمِ یار میں جلنے کا تو مجاز نہیں

دلِ حزیں سے ہے خالی اگر ترا پہلو
ترے نیاز کا خواہاں وہ بے نیاز نہیں

۳

نگاہِ شوق میں گر سرمۂ نیاز نہیں
حضورِ یار میں اٹھنے کی وہ مجاز نہیں

زبانِ حسن سے میں نے سنا ہے یہ مصرع
کہ دل وہ دل ہی نہیں ہے جو پاکباز نہیں

۴

اگر تجھے دلِ خود سر پہ اپنے ناز نہیں
قبولِ خاطرِ جاناں ترا نیاز نہیں

تو اپنے ذوقِ نظر کا اگر نہیں کشتہ
حریمِ ناز میں آنے کا بھی مجاز نہیں

امینِ حزیں

خالد

(ایک ماخوذ افسانہ)

ایک چھوٹے سے آراستہ کمرے میں انگیٹھی کے سامنے ہم چند نوجوان بیٹھے حسب معمول باتیں کر رہے تھے، موسم سرما کی ایک طویل شب کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا، سماوار میں چائے کا پانی گرم ہو رہا تھا، گفتگو مشکل سے کسی خاص بحث پر پہنچی تھی بلکہ اب تک ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر منتقل ہو جاتی تھی، آخر کار دوران بحث میں دنیا کی نمایاں ہستیوں کا ذکر آگیا۔ اُن ہستیوں کا جو عوام الناس سے بلند تر ہوتی ہیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے خیالات اپنی ذاتی قابلیت کے اعتبار سے بیان کئے، آوازیں بلند ہوکر شور و شغب کی کیفیت پیدا کرنے لگیں، اسی دوران میں ایک مختصر سا شخص چائے پیتا اور سگار سلگاتا ہوا کھڑا ہوگیا، اور ان الفاظ میں ہم سب کو مخاطب کرنے لگا۔

"حضرات! آپ کی سنجیدہ رائیں اس معاملہ میں اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں، مگر فائدہ سے بالکل خالی ہیں، ہم میں سے ہر شخص نے اپنے مخالف کے خیالات سنے مگر اپنے خیالات کو اب تک قابل ترجیح سمجھا۔ ہماری زندگی کا یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ہم اس طرح ایک جگہ آملے ہیں، اور ہم نے بحث و مباحثہ کا باب کھولا ہے، اس لئے ہم ایک دوسرے کے خیالات و عقائد و خصائل سے کماحقہ واقف ہیں۔"

اس کے بعد اس مختصر سے آدمی نے سگار کی راکھ آتشدان میں جھاڑ دی، آنکھیں نیچی کرکے مسکرانا شروع کیا۔ ہم بھی اُس کی جانب متوجہ ہوئے، اسی دوران میں اُس سے یہ سوال کیا گیا،

"تو پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہئے، تاش کھیلیں یا سو جائیں، یا پھر اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیں؟"

"تاش کھیلنا ایک خوشگوار مشغلہ ہے، نیند بھی مفید ہوتی ہے" اس مختصر سے شخص نے جواب دیا، "مگر ابھی گھر چلے جانا بہت قبل از وقت ہوگا، غالباً آپ میرا مدعا سمجھ نہیں سکے، آؤ، ہم میں سے ہر شخص ایک نمایاں ہستی کا ذکر کرے جس سے کہ وہ اپنی زندگی میں ملا ہو، میرا دعویٰ ہے کہ بیان خواہ کتنا ہی ناقص ہو بہتر سے بہتر دلیل سے زیادہ بامعنی ہوتا ہے"

ہم سب اس تجویز پر غور کرنے لگے،

ہم میں سے ایک نے کہا، "علاوہ اپنی ذات کے میں کسی حیرت انگیز ہستی سے واقف نہیں ہوں اور مجھ سے آپ بہت بخوبی واقف ہیں،" اس گفتگو کے تمسخرانہ انداز نے حاضرین کے دلوں کو گرمانا شروع کر دیا۔ ایک اور صاحب

فرمانے لگے۔

"بے شک ہم کسی سے واقف نہیں ہیں"۔ مجوز کی جانب متوجہ ہو کر گفتگو یوں جاری رکھی، "آپ ہی آئیے اور اپنا تجربہ بیان کیجئے، مگر یاد رہے کہ اگر ہمیں آپ کے قصہ میں لطف نہ آیا تو ہم بلا تکلف آپ پر پھبتیاں کہنے لگیں گے"۔

پست قامت مجوز آتشدان کے قریب کھڑا ہو گیا، ہم سب اُس کے چاروں طرف بیٹھ گئے اور خاموشی کے ساتھ اُس کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے، مقرر نے ہمیں غور سے دیکھا، ایک نگاہ چھت پر ڈالی، اور اپنی تقریر کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا۔

"میرے عزیز دوستو! دس سال ہوئے میں علی گڈھ میں تعلیم پاتا تھا، میرے والد کی آمدنی معقول تھی، مگر اول تو وہ کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے دوسرے اپنے علاقہ میں ریل سے بہت دور دیہاتی زندگی بسر کرتے تھے، اس لئے انہوں نے میرے قیام و طعام کا انتظام ایک پروفیسر کے ہاں کر دیا، اور اُن کو میرے اخلاقی نشو و نما کا بھی ذمہ دار بنا دیا۔

پروفیسر صاحب موصوف نہایت متین اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ اور بالطبع اُن کو تکلفات وظاہری رسمیات سے عشق تھا۔ ایک مدت تک میں اُن سے بے حد مرعوب و خائف رہا، ایک روز شام کے وقت کھیل سے واپس آیا، اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدلنے لگا، قہقہوں کی مسلسل آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں، میں حیرت زدہ ہو گیا، بھلا کجا پروفیسر صاحب کی کوٹھی اور کجا آزادانہ و بے پروایانہ قہقہوں کی اس قدر مسلسل آوازیں! میں ضبط نہ کر سکا، لپک کر ملاقات کے کمرے میں جا دھمکا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے، پروفیسر صاحب اپنے دوستوں کو لئے ہوئے ایک گول میز کے قریب بیٹھے شراب ناب کے پیالے پیا پے خالی کر رہے تھے، اُن کا چہرہ سُرخ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں، مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے، مجھ سے مصافحہ کیا، اور اپنے دوستوں کے روبرو چند تعارفی کلمات کے ساتھ مجھے پیش کیا، میں ایک پاس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فلسفۂ تاریخ پر ایک نہایت عالمانہ بحث چھڑی ہوئی تھی، مَیں بھی بحث میں شریک ہو کر اپنی جدتِ طبع کے جوہر دکھانے لگا، مباحثہ کے بعد حاضرین نے میری فہم و فراست کی تعریف کی، نشۂ غرور نے میرا سر بلند کر دیا، اور میں اپنے مستقبل کی پاکیزہ مگر خیالی تصاویر دیکھ دیکھ کر جھومنے لگا، اُس کے بعد پروفیسر صاحب مجھ سے آخر دم تک یکساں طور پر ہمیشہ بے تکلف اور آزاد رہے، مجھے اُن کی صحبت میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا، میں اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اُن کی خدمت میں صرف کرتا تھا،

پروفیسر صاحب ممدوح کی بیوی کو بھی میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، تھیں نوجوان مگر اُن کے کپڑوں میں سے ہمیشہ دھوئیں کی بُو آتی تھی اور آگے کے دانت بھی گر چکے تھے، عورتوں کا ایک بدنصیب گروہ قبل از وقت چہرہ

کی یہ زیبائش کھو بیٹھتا ہے"۔

"جناب! آپ اصل موضوع سے ہٹے جا رہے ہیں" سب نے بہ آواز بلند للکار کر کہا۔

"معاف کیجئے، لیجئے میں قصہ پھر شروع کرتا ہوں، میں کالج میں اچھا خاصا ہر دلعزیز ہو چلا تھا، لڑکوں سے میری واقفیت دوستی کے درجہ تک پہنچنے لگی تھی۔ ان دوستوں میں ایک طالب علم بدر تھے۔ بہت معقول اور شریف النفس، وہ اکثر مجھ سے ملنے آتے تھے، میں بھی اُن کو پسند کرتا تھا، تھوڑی ہی مدت میں ہم دونوں بڑے گہرے دوست ہو گئے، علی گڈھ کی پوری آبادی میں میرا کوئی عزیز نہ تھا، میں شہر میں کسی کے ہاں نہ جاتا، اور عورتوں کی صحبت سے بہت خائف رہتا تھا، کالج کے احباب کے والدین و اعزا سے میں نے ہمیشہ قصداً پرہیز کیا، اُن کے گھروں پر جانا مجھے ایک دن بھی نہ بھایا۔

میری مالی حالت بہت اچھی تھی، میرے والد مجھے ہر ماہ میں دو تین مرتبہ نوٹوں کا ایک پلندہ بھیج دیتے تھے جن کو نہ کبھی میں نے گنا اور نہ کبھی اُن کا حساب رکھا۔ اسی لئے میرے کمرے میں میرے احباب کے علاوہ اکثر چند خوشامدی بھی جمع ہو جاتے تھے۔

اور نوجوانوں کی حالت سے میری حالت کا آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں، میرے سینہ میں بھی وہ ابال اٹھتا تھا جو تھوڑے ہی عرصہ میں چند بے معنی غزلیات کی صورت میں رونما ہو کر ہوا ہو جاتا ہے، مجھے بھی کسی شے کی آرزو تھی، میں بھی کسی شے کا جویاں رہتا تھا اور میں بھی عالم رویا میں کسی کا نظارہ کیا کرتا تھا، مگر مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ میں کس کا آرزومند اور کس کا شیدائی تھا، شاید یہ ہو کہ میں اپنی تنہائی سے عاجز آ گیا تھا، اور زندہ دل افراد کی صحبت کے لئے ترستا تھا، "زندگی" کے لفظ سے میرے سینہ میں ہوک اُٹھتی تھی اور میں دردِ دروں کو سینہ میں چھپائے رکھتا تھا، احمد! ذرا ایک سگرٹ دینا"۔

سگرٹ سلگا کر اُس شخص نے سلسلۂ کلام یوں جاری رکھا،

"ایک روز صبح کے وقت بدر ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "لو، تم نے اور بھی کچھ سنا، خالد، خالد آ گئے"۔

"کون خالد؟"

"ارے تم خالد کو نہیں جانتے، افسوس، ابھی چلو، اسی وقت اُٹھ کھڑے ہو، ابھی میں اُن سے تمہاری ملاقات کرائے دیتا ہوں، رات ہی تو وہ تعطیل سے واپس آئے ہیں، ایک حیرت انگیز شخص ہیں"!

"حیرت انگیز"؟

"نہایت"!

"خیر تو تم تنہا ہو آؤ، میں تمہارے حیرت انگیز شخصوں سے مل چکا ہوں"۔

"نہیں نہیں تمہیں خالد سے ملنا ہوگا، ایسا شخص تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا"،

میں کہنے کو تھا کہ خالد کو پہلے میرے یہاں آنا چاہیئے، مگر خدا جانے کیوں میں نے بدر کے ارشاد کی تعمیل کی اور اُس کے ساتھ ہولیا، بدر مجھے علی گڈھ کی سب سے زیادہ گندی اور تنگ و تاریک گلیوں میں لے گیا جس مکان میں خالد رہتا تھا وہ نہایت بوسیدہ اور تکلیف دہ نکلا، ہم دونوں صحن میں پہنچے، ایک تنومند اصیل الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے دھوپ میں پھیلا رہی تھی، بچے چوبی زینہ پر کود رہے تھے، ہم دونوں ایک تاریک راستہ میں سے گذر کر خالد کے کمرے میں پہنچے، اندر داخل ہوئے، آپ کو بخوبی اندازہ ہے کہ ایک غریب مفلوک الحال طالب علم کا کیسا کمرہ ہوتا ہے، دروازے کے سامنے ہی خالد میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا سگار پی رہا تھا اُس نے بدر سے مصافحہ کیا، اور خوش مزاجی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ ہماری دونوں کی نگاہیں دوچار ہوئیں، مَیں خود بخود اُس کی جانب مائل ہونے لگا، حضرات! بدر ٹھیک کہتا تھا، خالد یقیناً دنیا کا ایک حیرت انگیز انسان تھا، حیرت انگیز۔ محیّر العقول لو، ذرا میں تفصیل سے بیان کئے دیتا ہوں، لمبا قد، بہت پتلا پتلا چھریرا بدن، چہرہ مہرہ دلآویز، مجموعی طور سے نہایت خوش منظر، اُس کے چہرے کی صحیح تصویر کھینچنا نہایت دشوار ہے، چہرہ کے ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ خوب بیان کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بتانا کہ اُس چہرے میں کیا تھا یعنی خاص وہ چہرہ کون سے پیغام کا حامل تھا ایک نہایت دشوار امر ہے"۔

"یعنی چہرہ کی موسیقی" حاضرین میں سے ایک نے کہا۔

"بیشک، چہرے کی موسیقی، اس لئے میں اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ چہرے کا وہ مخصوص انداز ایک نہ مٹنے والے تبسم سے ہمیشہ دست و گریباں رہتا تھا، خالد کے والدین اُس کی یاد سے قبل فوت ہو چکے تھے، اُس نے اپنے ایک دُور کے عزیز کے مکان میں آنکھ کھولی جو اخلاقاً بہت پست خیال تھا، پندرہ برس کی عمر تک وہ دیہات میں زندگی گذارتا رہا، پھر وہ علی گڈھ میں آگیا، انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخل ہوا، ٹیوشن سے اُس کی گذر اوقات ہوتی تھی، خالد نہ تو بہت زیادہ بذلہ سنج تھا، اور نہ ذکی، مگر خدا معلوم کیوں ہر شخص اُس کے دام میں گرفتار ہوجاتا تھا۔ ہم بھی اُس کے رطب اللسان تھے، اُس کے الفاظ، اُس کی نگاہیں، اُس کے انداز شباب کی دلآویزی

سے اِس قدر معمور ہوتے تھے کہ اُس کے سارے احباب اُس پر پروانہ وار فدا ہوتے تھے، پروفیسر اُسے ایک اچھا خاصا ذہین طالب علم سمجھتے تھے، مگر سست اور کاہل۔ اُن کے نزدیک اُس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

خالد نے ہماری شام کی مجلسوں میں ایک تازہ روح پھونک دی، اُس کی موجودگی میں ہماری زندہ دلی پر کبھی بدمذاقی کا اثر غالب نہ ہُوا، اگر ہم کسی وجہ سے دل گرفتہ ہوتے تو ہم اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ مناسب موضوع پر بات چیت کرنے لگتے، اُس حالت میں بھی دل نہ گھبراتا۔ غرض یہ کہ خالد ہماری جماعت کا روح رواں تھا، وہ شمع تھا اور ہم سب اس کے پروانہ وار شیدائی ہیں اُسے دل وجان سے چاہتا تھا، میں نے کسی عورت کو بھی اس قدر شدت سے کبھی نہیں چاہا، اب بھی میں اس محبت کو یاد کرکے شرمندہ نہیں ہوتا۔ بیشک وہ گہری محبت تھی، جس میں مجھے فراق جدائی رشک اور رقابت کی ساری مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں، مثلاً خالد ہم سب کو ایک سا چاہتا تھا مگر احمد کے ساتھ اُس کا برتاؤ اور لگاؤ خصوصیت کا تھا، ہم نے احمد سے اُسے کبھی جدا نہ دیکھا، اکثر وہ اُس سے خفیہ بات چیت کرنے لگتا اور کبھی کبھی دو دو تین تین دن کے لئے اُس کے ساتھ علی گڈھ سے غائب ہوجاتا، مگر یہ کس کی مجال تھی کہ کوئی خالد سے سوال کرے، نتیجہ یہ ہوتا کہ میں مضطرب رہتا، خالد کا غائب ہوجانا کسی طرح سمجھ میں نہ آتا، میرے اضطراب کی ایک وجہ یہ بھی تھی، میں خود خالد کا مستقل ساتھی بننا چاہتا تھا، اور اسی لئے میں احمد کو اپنا رقیب سمجھ کر اُس سے نفرت کرتا تھا۔

بے اندازہ غور وفکر کے بعد بھی میں خالد کے غائب ہوجانے کی توضیح نہ کرسکا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کے چہرہ میں استعجاب پیدا کرنے والی ایسی کوئی کیفیت نہ تھی جس پر نوجوان اکثر فخر کیا کرتے ہیں۔ اور نہ اُس کا وہ بے پروایانہ انداز تھا جس سے یہ خیال ہو کہ متعدد قوتیں اس میں خفتہ ہیں۔ مگر ہر موقع پر بروئے کار لائی جاسکتی ہیں، نہیں' اس کا چہرہ سراسر بے لوث اور کھلا کھلا رہتا تھا، مگر جب اُس پر جوش کا غلبہ ہوتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اُس کی ہر متعلقہ شے ایک شدید قوت کی حامل ہے، اُس نے اپنی قوت کو کبھی فضول صرف نہ کیا۔ اور نہ کسی حالت میں اُس پر تصنع کا رنگ جما، اِن باتوں کے باوجود میں ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے خالد کی فطری حسیات کا پتہ لگایا، شاید اس لئے کہ محبت میں آدمی دل کی گہرائیوں تک سے واقف ہوجاتا ہے، میں نے تمام خطرات کے باوجود خالد کا اعتماد حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا، مجھے خالد کو خوش کرنے میں زیادہ زحمت گوارا نہ کرنی پڑی، میں ایک بے لوث بچے کی طرح اُس کی پرستش کرتا تھا، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ خالد مجھے کبھی مشکوک نگاہوں سے دیکھتا، مگر مجھے یہ معلوم کرکے شدید روحانی تکلیف ہوئی کہ خالد میری بے تکلفانہ قربت کو ناپسند کرتا ہے، اُسے میری گرویدگی سے تکلیف پہنچتی تھی، ایک دن اُس نے مجھ سے کچھ روپے قرض مانگے اور دوسرے ہی دن طنزیہ شکریہ کے ساتھ واپس کردیئے، موسم سرما پورا گذر گیا،

مگر ہمارے تعلقات میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا۔ میں احمد سے اکثر اپنا مقابلہ کرتا، مگر میری سمجھ میں نہ آتا کہ وہ مجھ سے کس طرح قابلِ ترجیح ہے۔ یکایک واقعات نے ایک پلٹا کھایا، اپریل کے وسط میں احمد یکایک سخت بیمار پڑا، اور دو ہی دن میں خالد کے زانو پر سر رکھے ہوئے اس دنیا سے چل بسا۔ کامل ایک ہفتہ تک خالد اُسی کمرے میں بیٹھا روتا رہا، نہ باہر نکلا اور نہ کسی سے ہم کلام ہؤا، ہم سب کو احمد کی جدائی کا سخت صدمہ تھا۔ احمد کے چہرہ کی ابدی زردی اغلبًا اُس کی آنے والی موت کا صحیح پیش خیمہ تھی، میں بھی ان واقعات سے کئی دن تک دل گرفتہ رہا، مگر میرے دل میں ایک نامعلوم توقع کسی مخفی طریقہ سے پرورش پا رہی تھی۔

ایک روز شام کے وقت میں صوفے پر تنہا لیٹا ہوا تھا اور میری نگاہیں چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی شخص جلدی سے میرے کمرے میں داخل ہؤا اور آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، میں نے اپنا سر اُٹھایا، وہ خالد تھا، وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور صوفے پر میرے پاس بیٹھ گیا، اور بھرائی ہوئی متفکر آواز میں کہنے لگا:

"میں تمہارے ہی پاس آیا ہوں، کیونکہ تم سے زیادہ اور کسی کو میرا خیال نہیں ہے ۔۔۔۔۔ (آنسوؤں کو پی کر) تمہیں معلوم ہے کہ میرا عزیز ترین دوست مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے (کچھ رُک کر) اب مجھے تنہائی شاق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تم میں سے کوئی شخص بھی احمد سے پوری طرح واقف نہ تھا، ایک بھی نہیں" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہؤا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

"تم اُس کی جگہ لینا چاہتے ہو؟" یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ عہد و پیمان کو مضبوط کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں دے دیا، میں کود کر اُس کے سینہ سے چپٹ گیا، میری حقیقی مسرت مجھے دیوانہ بنا رہی تھی، میرے الفاظ کا خزانہ خالی تھا، گلے میں میرا سانس گھٹ رہا تھا، خالد نے مجھ پر ایک غائر نظر ڈالی اور مسکرانے لگا، اس کے بعد ہم دونوں نے چائے پی، وہ برابر احمد کی وفاشعاری کے افسانے سناتا رہا، اُس زرد رُو کمزور لڑکے نے ایک مرتبہ سینہ سپر ہو کر خالد کی جان بچائی تھی۔ میں یہ قصہ سنتا تھا اور اپنی قسمت پر نازاں تھا، رات کے آٹھ بج گئے، خالد اُٹھ کھڑا ہؤا کھڑکی کے پاس جا کر شیشوں کو کھٹ کھٹانے لگا۔ اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا، میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا: خالد میں تمہارے بھروسے اور اعتماد کا یقینًا مستحق ہوں"۔ خالد نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا، "اگر یہ ہے تو ٹوپی اوڑھ لو اور میرے ساتھ چلو"۔

ہم دونوں چل کھڑے ہوئے، ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور شہر کے باہر چل دیئے، شہر کے باہر پہنچ کر تانگہ کو رخصت

کردیا گیا۔ ہم دونوں ایک پگڈنڈی پر چلے جارہے تھے کہ کوئی پون میل جانے کے بعد خالد رُکا، رات کا تاریک سایہ اب ہر جگہ پڑرہا تھا، دائیں جانب ہلکے دھوئیں سے لبریز فضا میں کچھ ٹمٹماتے ہوئے چراغ نظر آرہے تھے، بائیں جانب ایک مختصر سے کھیت میں دو سفید گھوڑے چر رہے تھے، ہمارے سامنے دُور تک کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ تھا، میں خاموشی کے ساتھ خالد کا تعاقب کررہا تھا، وہ یکایک رُکا، سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا کہ بس ہمیں یہیں آنا تھا، سامنے ایک چھوٹا سا تاریک مکان تھا، جس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں میں سے دھندلی روشنی نکل رہی تھی۔ خالد نے کہا" اس مکان میں ایک پنشن یافتہ فوجی رہتا ہے۔ اپنی بہن، اپنی لڑکی اور ایک ماما کے ساتھ اِس فوجی کی زندگی کا زیادہ زمانہ افریقہ اور یورپ میں گذرا ہے، عجب اکھڑ مزاج کا آدمی ہے، میں تمہیں اپنا عزیز بتاؤں گا" تم اُس کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کردینا، تاش کے کھیل سے اُسے عشق ہے"

میں نے سرِ تسلیم خم کیا، خصوصاً یہ جتانے کے لئے کہ میں بھی احمد کی طرح اطاعت شعار بن سکتا ہوں، لیکن میں تلاشِ حقیقت کے لئے شدت سے بے چین تھا، ہم دونوں مکان میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ کھڑکی میں سے میں نے ایک نازک اندام لڑکی کو دیکھا۔ وہ غالباً ہماری ہی منتظر تھی، اور ہمیں دیکھتے ہی غائب ہوگئی، ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اندر کے کمرے میں پہنچے ایک پنجاہ سالہ شخص نے ہمارا خیر مقدم کیا، میں نے اُسے غور سے دیکھا، چہرہ ملول و غمگین، سر کے بال کھڑے کھڑے، تنگ پیشانی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی بڑی مونچھیں، موٹے موٹے ہونٹ،

"خالد! بہت مدت کے بعد آئے، کہاں رہے؟ بہت انتظار دکھایا، احمد کو نہیں لائے؟"

"احمد تو بیچارے مرگئے!"

"نہیں، مرگئے؟ یہ کون ہیں؟"

"میرے ایک عزیز ہیں، آپ سے ملنے آئے ہیں"

"بہت خوب، بہت خوب، تاش کھیلتے ہیں؟"

"بہت مزے سے"

"نہایت خوب، لو، ہم بھی بیٹھے جاتے ہیں، ذرا جیرن سے کہو کہ گول میز اور تاش کی گڈی لے آئے"

یہ کہہ کر میں اور وہ پنشن یافتہ فوجی دوسرے کمرے میں آگئے، جو پہلے سے زیادہ مختصر تھا" وہ صوفے پر بیٹھ کر تاش پھانٹنے لگا، برابر ہی کرسی پر ایک نہایت دبلی پتلی عورت عینک لگائے بیٹھی تھی، اُس عورت سے تعارف کراتے ہوئے

فوجی نے کہا، "پہلا شخص انتقال کر گیا، خالد اُن کی بجائے انہیں لائے ہیں۔ دیکھیں یہ کیسا کھیلتے ہیں"۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا خالد غائب ہو چکا تھا، تاش کا کھیل شروع ہُوا، فوجی میری ذرا سی غلطی پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے زیادہ افسوس کے قابل بات یہ تھی کہ اپنی بہن کی غلطی پر بھی اُس کے غصہ میں ذرا کمی واقع نہ ہوتی تھی۔ اخلاق کے اس مظاہرے کو دیکھ کر جی تو یہی چاہا کہ اس قعرِ ذلت سے بھاگ نکلوں۔ مگر خالد کی محبت کی طلائی زنجیر بے دست و پا کئے ہوئے تھی، ایک موقع پر اُس کی بہن فوجی کے توہین آمیز الفاظ کو ضبط نہ کر سکی اور اپنے سنگ دل بھائی سے کہنے لگی: "تمہیں اپنی بیوی کی موت کا باعث ہوئے، کیا اب مجھے بھی کھڑے کھڑے قبر میں اتارنا چاہتے ہو، تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، ہرگز نہیں"۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس مکالمہ کے دوران میں میری حالت کسی طرح قابلِ رشک نہ تھی۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر خالد نے مجھے اِس مصیبت میں کس غرض سے پھنسایا ہے، میں تاش کھیلنے میں ماہر نہیں تھا، مگر اُس روز معمول سے زیادہ خراب کھیل رہا تھا، یہ کشمکش کوئی دو گھنٹہ تک جاری رہی، مگر اس دوران میں میری روح سمٹ کر ایک نقطہ میں منجمد ہو چکی تھی۔ آخری ربر کے ختم ہونے پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، خالد موجود تھا، اُس کے قریب ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی، اور میری طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی، "سکینہ! ذرا میرا حقہ لاؤ"، فوجی نے کہا، لڑکی ہوا ہو گئی، وہ کچھ بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی، بہت پتلی دبلی، چہرہ زردی مائل، مگر میں نے آج تک نہ ایسی رسیلی آنکھیں دیکھیں اور نہ ایسے پیارے دلفریب بال دیکھے۔ ربر ختم ہُوا، خدا خدا کر کے روپے دے کر میں نے اپنی جان چھڑائی۔ فوجی حقہ گڑگڑانے لگا۔ خالد نے سکینہ سے میرا تعارف کرایا، ہم دونوں چند منٹ تک بدحواس سے رہے، لیکن چند ہی منٹ میں خالد نے حسبِ معمول سب کو بشاش اور بے تکلف بنا دیا، اُس کی روح کی دلآویزی بہت تھوڑے عرصہ میں پورے ماحول میں سرایت کر جاتی تھی، کبڑی ماما نے آکر میز پر دسترخوان بچھایا، ہم سب کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

خالد کے عضو عضو سے مسرت و انبساط کی شعاعیں نکل رہی تھیں، خوب بے تکلفی سے وہ چٹ پٹی کہانیاں سنانے لگا، فوجی کے قہقہوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، میں سکینہ کو دیکھنے لگا، اُس کی نظریں خالد پر جمی ہوئی تھیں، میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ اُس کی محبوبہ ہے، اور اُسے دل سے چاہتی بھی ہے، اُس کے لب خفیف سے جُدا تھے، اُس کا سر آگے کو جھکا ہُوا تھا، اور اُس کے چہرہ پر مسرت کا ایک دلکش رنگ رقص کر رہا تھا، کبھی کبھی وہ آہیں بھرنے لگتی اور پھر خود بخود ہنسنے لگتی تھی، میں خالد کی خوش نصیبی پر مسرور تھا، مگر ساتھ ساتھ خدا پناہ میں رکھے اُس پر

رشک آمیز نگاہیں بھی ڈال رہا تھا،

کھانے کے بعد ہم دونوں رخصت ہوئے، سکینہ ہمیں رخصت کرنے دروازہ تک آئی، اور خالد سے کہنے لگی، ——

"اب کب آؤ گے؟"

"دو تین دن میں"

"ضرور آنا"

"یقیناً"

(میری طرف اشارہ کرکے) "انہیں بھی اپنے ساتھ لانا"

"ضرور لاؤں گا"

"اچھا خدا حافظ"

راستہ میں مجھے یہ انوکھا قصہ معلوم ہوا ——

خالد سے اس فوجی کا اچانک چھ ماہ ہوئے تعارف ہوا تھا، بارش میں رات کے وقت خالد شہر کی جانب شکار سے واپس آ رہا تھا، کہ شاہراہ کے قریب ہی اُسے گالیاں بکنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیں، اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی، وہ اُس آواز پر چل کھڑا ہوا، تھوڑی ہی دُور ایک گڑھے میں ایک شخص اپنی مضروب ایڑی لئے ہوئے چلا رہا تھا، یہ وہی فوجی تھا جس سے ہم بخوبی واقف ہو چکے ہیں، بڑی دقت سے اُس نے اُسے اُٹھایا، اُس کے مکان تک لے گیا، اُسے اُس کی خوف زدہ بہن اور بیٹی کے سپرد کیا، اور خود ڈاکٹر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی جستجو کے بعد ڈاکٹر ملا اُسے اپنے ساتھ لے کر فوجی کے مکان پر آیا، پھر شہر سے دوا لایا، اسی اثنا میں پو پھٹنے لگی، خالد بہت زیادہ تھک چکا تھا، اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر شہر کی جانب واپس ہو، سکینہ سے اجازت لے کر صوفے پر لیٹ گیا، نیند کا غلبہ تھا، صبح آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ گھر والوں سے اجازت مانگی، مگر اُنہوں نے چائے کے لئے اُسے ٹھہرا لیا۔ رات میں اُس نے دو مرتبہ سکینہ کو دیکھا تھا، مگر صبح کو دیکھنے سے سکینہ کی ہیئت نے اُس کے دل پر ایک عجب خوشگوار اثر پیدا کیا، سکینہ کی پھوپی نے خالد کی جانفشانی اور مہربانی کا شکریہ ادا کیا، مگر خود سکینہ خاموش رہی۔ چائے دانی میں سے خالد کی پیالی میں چائے ڈالتی رہی، پھر اُس نے بالائی کی پلیٹ اور شکر دان اُس کی جانب بڑھا دیا، اسی اثنا میں فوجی بیدار ہوا اور چلانے لگا،

"کوئی ہے؟ سب مر گئے، حقہ لاؤ"

اُس کی بہن لپک کر اُس کی خواب گاہ میں گئی، وہ پھر چلایا "ہاں پھر اُس ظالم کا کیا ہؤا، اُس کم بخت کا نام تو بتاؤ، کیا وہ چلا گیا؟ ———"

خالد۔ "نہیں۔ جناب! میں موجود ہوں، کہئے آپ کا مزاج اب کیسا ہے؟"

"ہاں اب ذرا اچھا ہوں، ذرا یہاں کرم کیجئے"

خالد کمرے میں داخل ہؤا۔ فوجی نے اُس کو دیکھا، اور کہا،

"آپ کا شکریہ، آپ پھر کبھی ضرور آیئے اور مجھ سے ملئے، آپ کا کیا نام ہے؟"

"خالد"

"بہت خوب، آپ ضرور تشریف لایئے، اب آپ کو یہاں ٹھیرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے گھر پر آپ کی تلاش ہو رہی ہوگی"

خالد نے سلام کیا، اجازت چاہی، اور چل کھڑا ہؤا، اس کے بعد آنا جانا شروع ہوگیا، پھر جلد جلد اور بے تکلفی کی ملاقاتیں ہونے لگیں، موسم گرما آگیا ——— خالد اکثر صبح کو ہاتھ میں بندوق لے لیتا، اور چل کھڑا ہوتا، لوگ یہ خیال کرتے کہ وہ شکار کو گیا ہے، حالانکہ وہ سیدھا فوجی کے مکان پر پہنچتا، اور شام تک گپیں ہانکتا رہتا۔

سکینہ کے والد نے فوج میں پچیس سال ملازمت کی تھی، اُن کی ملازمت کا زیادہ حصہ جنوبی افریقہ، مصر، سوڈان دردانیال اور فلینڈرس میں صرف ہؤا تھا، سالہا سال آبادی سے دُور فوجی کیمپ میں مقیم رہے۔ اور انگریزی افسروں کی نیم سرکاری اور نیم سوشل صحبت میں وقت گذارتے رہے، رفتہ رفتہ اُن کی عادتیں بھی مغربی ہوگئیں، پنشن لینے کے بعد جب وطن میں آئے تو ہزارہا دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر دُھن کے پکے تھے، شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر اپنا مکان مشرقی عزیزوں اور دوستوں سے علیحدہ بنا لیا، اُس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا چمن تیار کرایا، اُسی میں رہتے تھے۔ وطن کے احباب اور اعزا سے بہت نالاں تھے، نہ وہ کبھی کسی کے پاس جاتے نہ اُن کے پاس کوئی آتا تھا لکھنا پڑھنا کچھ یوں ہی جانتے تھے، مگر ظاہری بھدے پن اور بے تکی باتوں کے باوجود کافی ہوش مند اور چالاک تھے، اور ضرورت کے وقت ریشہ دوانی تک کر گذرتے تھے، اُن میں فطرت نے خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، بالطبع بہت ضدی اور خود پسند واقع ہوئے تھے، معمولاً کج خلق اور نامہربان معلوم ہوتے تھے، بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر ضد کرنا اُن کا شیوہ تھا، اُن کے خیالات نے ایک عجیب تمسخر آمیز صورت اختیار کر لی تھی، ایک مرتبہ ہم سب بیٹھے ہوئے اُن سے شادی پر گفتگو کرنے

لگے ،فرمایا "شادی؟ اُسے لعنت بھیجو، دیکھو میں کسی کو اپنی لڑکی سے شادی نہ کرنے دوں گا - وہ کیا کرے گا - وہی نا جو میں نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا، یعنی اُسے اِدھر اُدھر لئے پھرے گا - علاوہ ازیں پھر میں کس کے ساتھ رہوں گا۔ لاحول ولا قوۃ"

امید ہے کہ میں نے کافی وضاحت کے ساتھ حاضرین سے سکینہ کے والد کو روشناس کر دیا ہے، خالد کا وہاں جانا اور اس قدر پابندی سے جانا ظاہر ہے کہ محض سکینہ کی وجہ سے تھا، مجھ سے خود خالد نے پہلے ہی روز یہ کہہ دیا تھا۔

"میں سکینہ سے محبت کرتا ہوں، کیسی پیاری لڑکی ہے، اُس نے تمہیں بھی پسند کیا ہے"۔

میں شاید یہ عرض کرنا بھول گیا ہوں کہ اس وقت تک میں عورتوں کی صحبت سے بہت خائف تھا اور اسی لئے ان سے اجتناب کیا کرتا تھا - سکینہ پہلی لڑکی تھی جس سے مجھے ضرورتاً ہمکلام ہونا پڑا - ویسے تو سکینہ کوئی غیر معمولی لڑکی نہ تھی، مگر مقدس ہندوستان کی پوری آبادی ایسی شریف النفس لڑکیاں بہت کم پیدا کرتی ہے، آپ ضرور دریافت کرنا چاہتے ہونگے کہ یہ کیسے؟ میں اس کا مختصر سا جواب دیئے دیتا ہوں کہ میں نے اُس کی کسی حرکت میں بناوٹ، تصنع اور ریاکاری کا شائبہ تک نہ دیکھا - مجھے اُس کا تبسم زیر لبی مدت تک یاد رہے گا - اُس کی دل میں اُتر جانے والی باریک آواز، اُس کے لطیف و نازک قہقہے، اُس کی متوجہ نگاہیں میں کبھی نہ بھولوں گا - اُس کے چہرہ سے بمشکل کسی توقع کا اندازہ ہو سکتا تھا، مگر یہ ناممکن تھا کہ آپ اُسے دیکھ کر اُس کی تعریف نہ کریں۔ اس طرح جیسے ایک گھنے جنگل میں کسی پوشیدہ شاخ پر کوئی پرند چہچہاتا ہے، اور اُس کے لحن پر سننے والا عش عش کرتا ہے۔

حضرات! مجھے یقین ہے کہ آپ چونکہ مہذب اور تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے دورانِ حیات میں .... نہیں .... بلکہ عالمِ شباب میں آپ بھی کسی پر فریفتہ ہوئے ہونگے، اور آپ کو بخوبی علم ہوگا کہ محبت کس طرح پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی ہے، بدیں وجہ میں اس مبحث کو نظر انداز کرتا ہوں اور اُس تفصیل سے آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا کہ میرے دل میں محبت کیسے پیدا ہوئی اور منزل بمنزل کیسے بڑھی۔ مختصر یہ کہ میں سکینہ کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا، اور دردِ فراق کی لذتوں اور ملاقات کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا + سکینہ کے گھر ہم دونوں اکثر جایا کرتے، میں اُس کے باپ کے ساتھ تاش کھیلنے لگتا، اور اُس کہن سال فوجی کی بدمزاجیوں کا نشانہ بنتا۔ لیکن محبوب کی قربت بجائے خود ایک مسرت تھی، میں نے اُس امنڈتے ہوئے جذبہ کو روکنے کی کبھی کوشش نہ کی، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ قبل اس کے کہ میں اس جذبہ کی صحیح نوعیت سے واقف ہوں، یہ طوفان میرے قبضۂ قدرت سے تجاوز کر گیا، میں نے خفیہ طور پر جذبات کی پرورش کی اور اغیار کی نگاہوں سے اُسے ہمیشہ بہت پوشیدہ رکھا - اس جذبۂ خاموش کے وقتی اُبھار اور ابال کو میں نے

ہمیشہ تفریح طبع کا ذریعہ سمجھا۔ نہ میری بھوک زائل ہوئی، اور نہ نیند، پھر بھی شبانہ روز میں سکینہ کے جذبات کے اُس تموج کا احساس کرتا رہتا تھا جو محبت کی ایک صحیح علامت ہے۔

حیات کی وہ کشاکش جس سے مجھے اکثر دوچار ہونا پڑا، ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ میرے قلم میں وہ طاقت نہیں کہ میں اُن کا مرقع پیش کرسکوں، مثلاً ایک مرتبہ خالد اور سکینہ باغ سے برآمد ہوئے، سکینہ کا چہرہ محبت اور مسرت کی تابش سے جگمگا رہا تھا۔ اور اُس کے اعضا پر شگفتگی کے وہ تمام اثرات موجود تھے جو غیر معمولی انبساط اور خوش نصیبی کی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ سکینہ مکمل طور پر خالد کی حیات میں پیوست ہوگئی تھی، حتیٰ کہ بے خبری کے عالم میں اُس کے حرکات و سکنات کا تتبع کرنے لگی تھی، اُس کی نگاہیں خالد کی نگاہیں تھیں اُس کا قہقہہ اور تبسم خالد کا قہقہہ و تبسم تھے، اب تک میری یاد میں وہ لمحات محفوظ ہیں جو اُس نے خالد کے پہلو میں گذارے تھے، اور سرشارِ محبت ہوکر اُٹھی تھی،

مگر خالد اب تک آزاد تھا، سکینہ کی عدم موجودگی میں خالد کو کبھی اُس کا خیال تک نہ آتا تھا، اب تک وہ ویسا ہی آزاد منش، بے خبر، ہنس مکھ نوجوان تھا، اُس کی زندگی کے کسی پہلو میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی ——

وقت گذرتا گیا، وہ دونوں نہایت شادان و فرحاں تھے، اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اُن کی خوشیوں کے واقعات مفصل بیان کروں، آخر کار مجھے محسوس ہونے لگا کہ سکینہ کی طفلانہ سبک اندازی نے ایک اضطراب آمیز وقار کی صورت اختیار کرلی۔ مگر رفتہ رفتہ اُس بات کا خطرہ نظر آنے لگا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا یعنی خالد کے جذبات ختم ہونے لگے، اُس کے دل کی گہرائیوں میں سرد مہری آچلی، اس احساس نے مجھے مسرور بھی کیا اور مغموم بھی، مگر مجھے خالد پر ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ اب اُن کی ملاقاتیں کم اور مختصر ہوتیں، سکینہ کی آنکھوں میں اکثر آنسو نظر آتے، شکوے شکایت کے دفتر کھلتے، ملامت آمیز لہجہ سنائی دیتا، اور اکثر رونا دھونا بھی ہوتا، میں خالد سے اکثر کہتا "آج سکینہ کے گھر چلوگے؟" وہ سرد مہری سے مجھے دیکھ کر کہہ دیتا "نہیں آج تو ارادہ نہیں"، میں ایک طویل عرصہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں احمد کا صحیح جانشین نہ ہوسکا، وہ مجھ سے کہیں زیادہ اطاعت شعار اور احمق تھا۔

ایک بات اور یاد آگئی، افسوس ہے کہ میں نے اب تک کیوں نہ کہی، اب تک میں نے آپ سے اپنے دوست ظفر کا تعارف نہ کرایا اُس کی عمر پچیس سال کی ہوگی، گذشتہ دس سال سے وہ علی گڈھ میں تعلیم پا رہا تھا، ظفر میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی ظاہری حسن نہ تھا، چہرہ لانبا، زرد زرد چھوٹی چھوٹی بادامی آنکھیں، ناک لمبی مگر آگے سے جھکی ہوئی، ہونٹ پتلے مگر ہموار، آواز بھی اکثر کانوں کو بھلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر اُس کے ساتھ ہی ذکی الطبع، تیز فہم، ہوشمند

اور شیریں گفتار تھا، اکثر ایسی برجستہ چھوٹی سی مثل کہ کر ہمیں خاموش کر دیتا، کہ ہم اس پر استعجاب کی نظریں ڈالنے لگتے ظفر ایسے طالب علموں کے لئے موت کا فرشتہ تھا جو ٹھوس مضامین کے مطالعہ سے بھاگتے ہیں، اور چند بے معنی اور لغو غزلیں کہہ کر سامعین سے داد لینا چاہتے ہیں، مگر یہ تعجب ہے کہ خود ظفر کو ہم نے کبھی پڑھتے نہ دیکھا تھا، ظفر اُس محبت کا مذاق اُڑاتا تھا جو مجھے خالد سے تھی، پہلی مرتبہ میں نے اُس کے طنزیہ فقرات سنے، اور کہہ دیا کہ جاؤ میرا سر نہ کھاؤ، دوسری مرتبہ میرا غصہ کم ہوُا، میں نے متانت سے اُسے سمجھانا چاہا کہ یہ محبت اور دوستی تمہارے دائرۂ ادراک سے باہر ہے" اس کے بعد وہ کچھ سمجھ گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہم دونوں گہرے دوست ہو گئے"۔――――

پندرہ دن سے میں نے سکینہ کو نہ دیکھا تھا۔ دل مضطرب و بے چین تھا، غرور، نخوت، محبت، آنے والے واقعات کا ایک دھندلا سا پرتو، متعدد اور مختلف جذبات دل اور دماغ میں طوفان برپا کئے ہوئے تھے، ایک ڈوبتے ہوئے دل کو اپنے پہلو میں لے کر میں چل دیا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں اُس کے مکان تک کیسے پہنچا، ہاں اس قدر ضرور یاد ہے کہ راستہ میں دو تین جگہ بیٹھ بیٹھ گیا، تھکن کی وجہ سے نہیں بلکہ جذبات کی فراوانی کی وجہ سے، مجھے دُور سے دیکھتے ہی سکینہ میرا خیر مقدم کرنے کے لئے لپکی، اور بے اختیار ہو کر پوچھنے لگی۔

"خالد کہاں ہیں"

"وہ تو نہیں آئے"

"نہیں آئے! کیوں؟"

"وہ ایک کام کی وجہ سے رُک گئے"

مجھے اس کا مطلق علم نہ ہوُا کہ میں نے کیا کہا، مجھے آنکھیں اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی، سکینہ میرے سامنے خاموش اور ساکت کھڑی تھی، میں نے ہمت کر کے اُسے دیکھا، اُس نے منہ پھیر لیا، دو بڑے بڑے آنسو اُس کے رخساروں پر حرکت کر رہے تھے، اُس کے چہرہ سے ایک فوری اور گہری روحانی کوفت کا پتہ چلتا تھا، شرم، رنج، اور بھروسے کی نمایاں کش مکش اس قدر شدت سے اُس کے ہاتھوں کی حرکات سے ظاہر ہوتی تھی کہ میرے دل میں درد پیدا ہو گیا، میں ذرا آگے کو جھکا، وہ چونکی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

ملاقات کے کمرے میں سکینہ کے والد نے میرا استقبال ان الفاظ سے کیا،

"دوست! آج اکیلے کیسے آئے؟"

"بے شک، میں تنہا آیا ہوں"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر فوجی بہادر ہنستا ہوا دوسرے کمرے میں جا چکا تھا،
ایسی حالت میں آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری پوزیشن کیسی تکلیف دہ تھی، مگر کیا ہو سکتا تھا اس خندۂ بیہم کی علت، غایت؟ سکینہ کی پھوپی اسی دوران میں ایک پھٹی پرانی کتاب ہاتھ میں لئے آموجود ہوئی، میں اُس سے باتیں کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد سکینہ بھی آگئی، بہت نڈھال اور غمگین، پنشن یافتہ فوجی نے خالد پر فقرے چست کرنے شروع کئے، سکینہ جلدی سے اُٹھ کر چل دی، چائے آگئی، میں نے اُن کے ساتھ چائے پی اور رخصت مانگی، فوجی افسر نے مصافحہ کیا اور کہا:-

"مہربانِ من پھر آپ سے کب ملنا ہوگا؟"

میں ہوں ہاں کر کے واپس ہوا، میں درحقیقت اُس سے بے حد خائف تھا،

سیڑھیوں پر ایک سرد ہاتھ نے میرے شانے کو مس کیا، میں نے مڑ کر دیکھا، وہ سکینہ تھی، کہنے لگی۔

"مجھے تم سے کچھ باتیں کہنی ہیں، کل ذرا اول وقت آجانا، سیدھے باغ میں، ابا جان کھانے کے بعد سو جاتے ہیں"

میں نے اُس کا ہاتھ دبایا اور چل کھڑا ہوا۔

دوسرے دن سہ پہر کو تین بجے میں فوجی افسر کے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا، صبح کے وقت میں کوشش کرنے پر بھی خالد سے نہ مل سکا، موسم خوشگوار تھا، نازک نازک زرد گھاس موسمِ خزاں کا پتہ دے رہی تھی، چست و چالاک گلہری شاخوں کے گچھوں میں کبھی روپوش ہو جاتی اور کبھی پھر رقص کرنے لگتی تھی، ایک خرگوش باغ کے ایک پوشیدہ سے گوشہ میں جست لگا رہا تھا۔ فوجی افسر کے گھوڑے کا بچھیرا سایہ میں کھڑا اِدھر اُدھر بے معنی نگاہیں ڈال رہا تھا، میں نے نارنگی کے ایک درخت کے نیچے سکینہ کو ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے پایا، اُس کا لباس سیاہ اور کچھ غیر مرتب سا تھا، اُس کی آنکھیں اور اُس کے بالوں کا انداز اُس کی سوزشِ پنہاں کا پتہ دے رہے تھے۔ میں بھی اُس کے پاس بیٹھ گیا، ہم دونوں خاموش تھے، بہت دیر تک وہ نارنگی کی ایک چھوٹی سی ٹہنی کو توڑتی رہی، پھر اُس نے اپنا سر جھکا دیا۔ اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

"خالد"

میں نے اُس کی جنبشِ لب سے فوراً تاڑ لیا کہ وہ عنقریب رو دینا چاہتی ہے، میں نے اُس کی تشفی کی اور خالد کی محبت کا یقین دلایا، وہ میری تقریر سنتی رہی اور غمگین انداز سے اپنا سر ہلاتی رہی آہستہ لہجہ میں کچھ کہا اور پھر خاموش ہو گئی وہ لمحے جن کا مجھے سب سے زیادہ خوف تھا یوں آسانی سے ختم ہو گئے۔ پھر اُس نے جستہ جستہ خالد کے متعلق باتیں کیں۔

"مجھے معلوم ہے کہ اب اُسے مجھ سے محبت نہیں ...... خیر اُس کا خدا حافظ و ناصر ہو۔
"سمجھ میں نہیں آتا کہ بغیر اُس کے میری زندگی کیسے گذرے گی، ساری ساری رات روتی رہتی ہوں۔
"........ یا اللہ! اب کیا کروں .... تو ہی مددگار ہے"
اُس کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں،
"میں اُسے ایسا اچھا سمجھتی تھی، مگر ...... وہ ...."

سکینہ نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں، اور اطمینان سے پہلو بدل کر بیٹھ گئی، پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگی،
"معلوم ہوتا ہے کہ خالد ابھی ابھی یہاں سے گئے ہیں"

مَیں اُس کے بیانات کو خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ میری روح اک جاں گسل سعادتِ بشری سے مملو ہو رہی تھی، مَیں اپنی نگاہیں اُن نمناک آنکھوں، اُن لانبی ابروؤں اور اُن لرزتے ہوئے لبوں سے نہ ہٹا سکا، کیا اس موقع پر مجھے اجازت دوگے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے جذبات کے اجزا آپ کے ملاحظہ کے واسطے پیش کروں، میں سخت ملول تھا کہ سکینہ میرے علاوہ کسی اور پر جان دیتی ہے، اور کوئی اَور اُس کے دردِ دل کا موجب ہے، مگر میں خوش تھا کہ وہ اپنے دلی جذبات مجھ سے بے تکلفی سے کہہ رہی تھی، مَیں مسرور تھا کہ میں نے اُس سے ہمدردی کرکے اُسے شکر گذار ہونے کا موقع دیا، مَیں دل میں عہد کر رہا تھا کہ میں خالد اور سکینہ کو پھر ایک مرتبہ ہمکنار کرا دوں گا۔ میری یہ فیاضی کس قدر لائقِ تحسین تھی، کبھی یہ بھی خیال گذرتا تھا کہ شاید میرا ایثار اُسکے دل میں میرے لئے کچھ گنجائش پیدا کردے۔

گھنٹہ گھڑی سے پانچ بجنے کی آواز آئی، شام کی تاریکی در و دیوار پر تیزی سے چھا رہی تھی، سکینہ جلد اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ہاتھ میں ایک خط دے کر چل دی۔ میں نے خالد کے لانے کا وعدہ کیا، اور ایک عاشق کی طرح کھڑکی میں سے ہوتا ہُوا باغ کے باہر آگیا۔ لفافہ پر یہ الفاظ تحریر تھے، "مسٹر محمد خالد کی خدمت میں"

دوسرے روز علی الصباح میں خالد کے مکان پر پہنچا، میں صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ گو میرا ارادہ نہ صرف بے لوث تھا بلکہ ایک حد تک ایثار سے بھی خالی نہ تھا لیکن خالد کا سامنا کرنے میں مجھے ایک قسم کا تکلف محسوس ہونے لگا، میں کچھ سہما سہما تھا، دل دھڑکنے لگا! اور رگوں میں خون کی گردش نے غیر معمولی سرعت اختیار کرلی، میں ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ آخر کار خالد کا دروازہ نظر پڑا، میں اُس کے کمرے میں داخل ہُوا، یونیورسٹی کا ایک طالب علم جس کی عمر کوئی بیس برس کی تھی اور جس سے میں زیادہ واقف نہ تھا اُس کے پاس بیٹھا ہُوا اپنی ایک نظم سنا رہا تھا، نظم میں اُس نے اُس عورت کے جذبات قلمبند کرنے کی کوشش کی تھی جو مرد کی بے وفائی کا شکار ہوجاتی ہے، اُس د

انشکار جس نے مدتوں اُس کے سامنے محبت اور عقیدت کے راگ گائے ہوں نظم بلند پایہ نہ تھی، اٹھارہ اور پچیس سال کی درمیانی عمر میں کالج کے ہزارہا طلبا محبت کے افسانے، الفت کے خطوط، اور عشقیہ نظمیں لکھتے ہیں اور دوستوں کو سناتے پھرتے ہیں، دنیا میں اس سے زیادہ جلد فنا ہونے والا اور کوئی لٹریچر نہیں، آخر کار نظم ختم ہوئی، طالب علم کو استحقاق سے زیادہ داد ملی، اور تھوڑی دیر بعد پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے وہ چل دیا۔ اب ہم دونوں تنہا تھے، میں نے دل مضبوط کیا اور بغیر رسمی الفاظ کے وہ خط خالد کو دے دیا۔ خالد نے اول تو میرے اوپر تعجب کی نگاہیں ڈالیں، پھر لفافہ چاک کر کے خط کا مضمون پڑھا، کچھ مسکرایا اور کہنے لگا،

"تم آج سکینہ سے مل آئے؟"

"ہاں میں وہاں کل شام تنہا گیا تھا"

"خوب"

"تمہیں اُس کا مطلق کچھ خیال نہیں، کاش تم اُس کی اشک آلود آنکھیں دیکھتے!"

میں نے اپنی پوری فصاحت صرف کرنے کی کوشش کی اور سکینہ کی حالتِ زار کا صحیح مرقع خالد کے سامنے پیش کیا، مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا سگار پیتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"تم نارنگی کے درخت کے نیچے اُس کے پاس بیٹھے .... خوب .... گذشتہ مئی میں اُسی جگہ میں بھی اُس کے ساتھ اُسی بنچ پر بیٹھا کرتا تھا، .... باغ پر جوششِ بہار تھا۔ درخت کی سبز سبز چمکدار پتیاں ہم پر گرتی رہتی تھیں اور میں اپنے ہاتھ میں سکینہ کا ہاتھ لئے ہوتا تھا عجب مسرت کا زمانہ تھا، .... اب پتیاں زرد پڑ گئی ہیں اور نارنگیاں بھی ترش ہو گئی ہیں"

یہ تقریر سُن کر مجھے غصہ آگیا، خالد کی سرد مہری اور ظلم آرائی پر میں اُسے ملامت کرنے لگا، "آخر اُس لڑکی سے یوں یکایک دست بردار ہو جانے کا تمہیں کیا حق حاصل ہے، بالخصوص ایسی حالت میں جب تم نے اُس کے دل میں شمعِ محبت روشن کی، اور اُسے اپنا شیدائی بنالیا" میں نے خالد کی منت سماجت کی اور اُسے ترغیب دی کہ وہ کم از کم آخری مرتبہ پھر سکینہ سے مل آئے، خالد خاموشی سے میری تقریر سنتا رہا،

خالد۔ "یہ صحیح ہے کہ دوست کی حیثیت سے تمہیں میرے افعال پر نکتہ چینی کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن بہتر ہو کہ اس سے پیشتر میرا جواب سن لو" یہ کہہ کر وہ کچھ رکا اور مسکرانے لگا۔

"سکینہ ایک بہترین لڑکی ہے" اُس نے کہا" اُس نے میرے ساتھ کوئی بھی برائی نہیں کی، اس کے برخلاف میں

اُس کا بے حد مرہونِ منت ہوں، اُس کی نوازشوں کو میں کبھی نہ بھولوں گا، مگر اب میں نے اُس کے پاس جانا، اور اُس کی پروا کرنا ترک کر دیا ہے، اُس کی ایک معمولی سی وجہ ہے، بہت معمولی سی"

"وہ کیا وجہ ہے" میں نے سوال کیا۔

"خدا جانے کیا...... جب تک میں نے اُس سے محبت کی میں ہمہ تن اُس کا تھا، میں نے مستقبل پر کبھی غور نہ کیا۔ میری ہر چیز کی حتیٰ کہ میری حیات تک کی وہ حقدار اور مالک تھی،...... مگر اب میرا یہ جذبہ ختم ہو گیا ہے، شاید تم مجھے لغو خیال کرو گے کہ میں محبت کے جذبات سے بچوں کی طرح کھیلتا رہا۔ مگر کیوں؟ اُس پر ترس کھا کر؟ اگر وہ ایک معقول لڑکی ہے تو اب اُسے تمہارے ترس کھانے کی پروا نہ ہوگی، اور اگر تمہاری ہمدردی سے وہ مطمئن ہو جاتی ہے تو مجھے اُس کی پروا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے.......،"

خالد کے ان ظالم اور بے رحم الفاظ نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی، بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ اُس ہستی کے متعلق تھے جس کا میں شیدائی تھا، رگوں میں میرا خون کھولنے لگا، خالد سے اگر میں مرعوب نہ ہوتا تو یقیناً میں اُس سے دست و گریباں ہو جاتا، گو میرے دلی جذبات میرے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے، مگر خالد نے اُن کی مطلق پروا نہ کی، ٹوپی سر پر رکھ کر وہ چلنے لگا، میں نے دریافت کیا،

"کہاں جاتے ہو"

"سیر کرنے، اُس طالب علم کی نظم نے اور تمہاری بکواس نے دردِ سر پیدا کر دیا ہے"

"تم خفا ہو گئے؟"

"بالکل نہیں" مسکراتے اور مصافحہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"اچھا، سکینہ سے کیا کہہ دوں؟"

"رخصتی سلام کہہ دینا" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا، میں نے زینہ پر اُسے پھر پکڑ لیا۔

"کیا وہ بہت پریشان ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"بہت، نہایت"

"بیچاری کی تسلی کرتے رہنا، اب تو تم اُس کے چاہنے والے ہو"

"ہاں، مجھے اُس سے اُنس ضرور ہے"

"جی، اُنس کس جانور کا نام ہے، عشق" اُس نے مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ہم دونوں جدا ہو گئے، میں مکان

پروا پس آیا، مگر مجھے بخار چڑھا ہوا تھا،

"میں نے اپنا فرض انجام دیا" میں نے اپنے دل میں کہا، "خود غرضی کو پسِ پشت ڈالا، خالد کو ترغیب دی کہ وہ سکینہ کے پاس پھر واپس جائے، اب میں حق پر ہوں"۔

خالد کے بے پروایانہ انداز نے مجھے مجروح کر دیا، اُس نے مجھ پر رشک آمیز نگاہیں ہی نہ ڈالیں، بلکہ مجھے ہدایت کی کہ میں اُس کی تسلی کرتا رہوں ...... کیا سکینہ کوئی معمولی لڑکی ہے، کیا وہ ہمدردی کی بھی مستحق نہیں، مگر اس سے کیا حاصل؟ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی، ...... خالد سے ناامید ہو کر بھی اُس کا دل نہ پسیجا ...... مگر ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد ...... میری وفاشعاری اس کے دل پر اثر کر جائے، اِس وقت مجھے اپنے حقوق پیش نہیں کرنے چاہئیں، میں سراسر اُسی کا بندۂ بے دام بن جاؤں گا، کیا پھر بھی سکینہ مجھ سے محبت نہ کرے گی؟

یہ خیالات تھے جن میں میں اپنے پروفیسر کے مکان پر ۱۹۰۳ء کے زمانہ میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا کبھی رونے لگتا، کبھی غشی کی حالت طاری ہو جاتی، موسم شدت سے تکلیف دہ تھا علی گڈھ کی جہنم نشان گرمی سے کون واقف نہیں ہفتہ میں چھ دن شام کے وقت خطرناک ہوا کے بجائے آندھی، دن بھر لُو کی روح فرسا شدت، خدا کی پناہ! صبح ساڑھے سات بجے سے آٹھ نو بجے رات تک گرمی اور لُو سے کہیں بھی عافیت نہ ملتی تھی،

سامعین میں سے ایک نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود اپنی داستانِ محبت سنانا چاہتے ہیں، جی نہیں، آپ تو صرف حیرت انگیز خالد کا ذکر کیجئے"

"معافی چاہتا ہوں، بڑی غلطی ہوئی، دل سے مجبور تھا ...... بڑی غلطی ......"

ایک ہفتہ کے بعد میں پھر سکینہ کے مکان پر پہنچا۔ ملاقات کے کمرے میں گھر کے سارے ارکان موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر سکینہ سپید پڑ گئی۔ غالباً میرے چہرے سے حزن و ملال کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد میں سکینہ سے تنہائی میں بات چیت کر سکا، سکینہ نے کہا۔

"آپ تنہا ہیں"

"بالکل تنہا ...... اور شاید ایک مدت کے لئے"

"آپ نے میرا خط دے دیا تھا؟"

"اسی دن"

"خوب" وہ سانس لینے کے لئے رُکی۔ میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا، میرے دل میں حاسدانہ

مسرت کا غلبہ تھا، میں نے کہا، "خالد سے اب توقع رکھنا عبث ہے!"

سکینہ نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھا، سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا، کچھ لڑکھڑائی اور کمرے سے غائب ہوگئی، میں اور دو گھنٹے وہاں موجود رہا، پھر واپس آگیا، مگر نہایت منفعل اور بدحواس تھا، سکینہ سے محجوب تھا، اور خود اپنی ذات سے شرمندہ، کہتے ہیں کہ ناقص عضو کو جلد سے جلد کاٹ ڈالنا چاہئیے، لیکن اس غریب لڑکی کے دل پر مجھے کیا اختیار تھا۔ بہت دیر تک بستر پر لیٹا ہؤا کروٹیں بدلتا رہا، آخر کار نیند آہی گئی،

اِس کے بعد میں برابر خالد سے ملتا رہا، اُس کی زبان پر پھر کبھی سکینہ کا نام نہ آیا، سکینہ سے بھی مجھے اکثر ملنے کا موقع ملا، رفتہ رفتہ اُس کو مجھ سے بہت گرویدگی ہوگئی، مگر اُس قسم کی گرویدگی جس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، اُس نے میری ہمدردی کی دل سے قدر کی، مجھ سے گھنٹوں رازِ دل کہتی تھی، اور خالد کا ذکر کرتی تھی، اب تک ان تمام مراحل کے بعد بھی خالد اُس کی رگ رگ میں پیوست تھا، میں نے بارہا اُس کے نسوانی غرور کو بیدار کرنا چاہا، لیکن وہ یا تو خاموش ہو جاتی یا پھر خالد کے افسانے سنانے لگتی مجھے اُس زمانہ میں اس کا خیال بھی نہ تھا کہ وہ رنج والم جس میں گویائی کا مادہ بڑھ جاتا ہے خاموش کر دینے والے غم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ میرے لئے نہایت کرب اور بے چینی کا زمانہ تھا، رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خالد کا جانشین نہیں ہوسکتا، اور نہ سکینہ کا زریں ماضی ازسرِنو پیدا کرسکتا ہوں، اُس دوران میں وہ بہت دبلی ہوگئی تھی، میری ناکام کوششیں چار سال تک جاری رہیں، پورے چار سال تک، اب تک سکینہ اُسی طرح ملول و غمگین رہتی ہے، اور اُس کی زبان پر اب تک خالد کی محبت کے افسانے جاری ہیں +

عبدالشکور بریلوی

پتیاں

سچے حسن سے سچی محبت پیدا ہوتی ہے۔

دنیا وہ نہیں جسے ہم دیکھیں۔ دنیا وہ ہے جسے ہم تصوّر کریں۔

دیکھو کہ تمہیں نظر آئے۔ ڈھونڈو کہ تم پالو۔ دوڑو کہ تم پہنچ جاؤ۔

باغبان

چاند سے جھڑپ

ٹھنڈے ٹھنڈے جائے چاند   جلتوں کو نہ جلائے چاند
پہلو میں وہ چاند نہیں   کس سے دیکھا جائے چاند
میری طبیعت بھی خوش ہو   مجھ کو کیا خوش آئے چاند
مجھ کو لبھائے جب جانوں   دنیا بھر کو لبھائے چاند
مجھ کو رجھائے جب مانوں   عالم بھر کو رجھائے چاند
سب کو بھائے، مجھ کو کیا   مجھ کو بھی تو بھائے چاند
میرے سامنے آ آ کر   میرا منہ نہ چڑائے چاند
مجھ کو تنہا پا پا کر   میرا جی نہ دُکھائے چاند
اس کا نتیجہ کیا ہوگا   غور بھی تو فرمائے چاند

~~~~

ٹیڑھی چالیں ٹھیک نہیں   ان سے باز آجائے چاند
سیدھی طرح اک کام کرے   اُلٹے پاؤں جائے چاند
جس سے مرا گھر روشن تھا   اُس کو ڈھونڈ کے لائے چاند
جس سے یہ آنکھیں بینا تھیں   اُس کا جلوہ دکھائے چاند
جس سے مل کر چین ملے   اُس کو لا کے ملائے چاند
جیسے کہ خود نُور افشاں ہے   اپنے رخ کو لگائے چاند
یوں ہی میرے گھر کو بھی   بقعۂ نور بنائے چاند
واہ وہ روشن ساعت جب   گھر کا گھر بن جائے چاند

~~~~

اور جو اُس کو لا نہ سکے   مجھ کو منہ نہ دکھائے چاند

میرا گھر محتاج نہیں   میرے گھر سے جائے چاند
مجھ سے ضدوں کی لے لیکر   باہم ضد نہ بڑھائے چاند
مجھ کو کچوکے دے دے کر   پیہم دل نہ دکھائے چاند
حد سے زیادہ دق کر کے   غصّہ تو نہ دلائے چاند
میں بھی آپے میں نہ رہوں   اتنا تو نہ ستائے چاند
میں بھی تحمل کھو بیٹھوں   ایسا قہر نہ ڈھائے چاند
اب بھی فسادوں پر نہ تلے   اب بھی شر نہ اٹھائے چاند
اب بھی عقل کے ناخن لے   اب بھی ہوش میں آئے چاند
ورنہ میرے منہ آ کر   شاید منہ کی کھائے چاند

~~~~

لیکن اب میں کیوں چُوکوں   دکھ پائے تو پائے چاند
کیوں نہ اک ایسی چٹکی لوں   جس سے تڑپ ہی جائے چاند
مجھ پہ تو چوٹیں کرلیں اب   اپنی چوٹ بچائے چاند
سورج سے ضو لے لے کر   اپنا نور بڑھائے چاند
نظروں کو جُل دے دے کر   اپنا عیب چھپائے چاند
مانگے تانگے جوبن پر   غرّہ کرے، اترائے چاند
ظلم ہے اک تاریک کرہ   اپنے کو کہلائے چاند
قہر ہے، صرف اک تودۂ خاک   اپنے کو منوائے چاند

آزاد اب تو سامنے آئے
اب تو آنکھ ملائے چاند

حکیم آزاد انصاری
~~~~

جھوٹ

"تم جھوٹ بولتی ہو! میں جانتا ہوں تم جھوٹ بولتی ہو"!

"تم نے شور کیوں مچا رکھا ہے؟ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟

یہ اُس نے ایک اور جھوٹ بولا، کیونکہ میں شور نہیں مچا رہا تھا۔ میں نہایت آہستگی کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی اور آہستگی سے باتیں کر رہا تھا جب یہ زہر آلود لفظ "جھوٹ" سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا نمودار ہوا۔

اُس نے کہا "مجھے تم سے محبت ہے اور تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا"؟ اور اُس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملا دیئے لیکن جونہی میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گلے سے لگانا چاہا وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ تاریک برآمدے کو طے کر کے وہ کمرے میں داخل ہوئی جہاں ایک مسرور محفل برخاست ہو رہی تھی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ میں یہاں کیونکر آیا تھا؟ اُس نے مجھ سے اس جگہ آنے کو کہہ رکھا تھا اور اسی لئے میں یہاں موجود تھا۔ میں تمام رات لوگوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میری طرف کوئی نہ آیا نہ مجھے کسی نے مخاطب کیا۔ میں سب کے لئے اجنبی تھا اور ایک کونے میں سازندوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پینل کے ایک بہت بڑے باجے کا منہ سیدھا میری طرف تھا۔ اور کوئی اس باجے میں چھپ کر مجھ پر ٹھٹھا اُڑا رہا تھا اور بار بار ایک کرخت اور ہچکیہ آمیز قہقہے کے ساتھ ہنستا تھا۔ "ہو! ہو! ہو!"

وقتاً فوقتاً ایک سفید اور خوشبو سے مہکا ہوا بادل میرے قریب آکر چلا جاتا تھا۔ یہ وہ تھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس طرح دوسروں کی نظریں بچا کر مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھی لیکن ایک اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لئے اُس کا کندھا میرے کندھے آکر چھُو جاتا اور اسی اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لئے میں اپنی آنکھیں نیچی کر کے اُس کی سفید نورانی گردن کو دیکھ لیتا تھا۔ جب میں نظریں اوپر اُٹھاتا تو مجھے ایک ایسی سفید سنجیدہ اور پُر صداقت یک رخی تصویر نظر آتی کہ اُس پر ایک مغموم و دلگیر فرشتے کا دھوکا ہوتا۔ میں اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا جو بڑی بڑی روشنی کے لئے حریص، خوبصورت، اور پُرسکون تھیں۔ اُن کی نیلاہٹ میں پتلیوں کی سیاہی چمکتی اور جب کبھی میں اُن میں جھانکتا وہ سیاہ ہو جاتیں اور اُن کی گہرائی اتھاہ معلوم ہونے لگتی شاید وہ لمحہ جس میں میں اُن کی طرف دیکھتا اس قدر مختصر ہوتا کہ میرے قلب کی حرکت کے وقفے بھی اُس سے طویل ہونگے لیکن خوف اور درد و کرب سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ساری زندگی کھنچ کر اُس کی آنکھوں میں سما گئی ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ سے اجنبی ہو جاتا۔ خاموش تنہا مُردے کی طرح۔ پھر وہ رقص کی ایک گردش کے ساتھ مجھے چھوڑ جاتی میری زندگی

مجھ سے چھین کر اپنے ساتھ لے جاتی اور اپنے بلند قامت مغرور لیکن حسین و جمیل شریک کے ساتھ رقص کرنے لگتی۔ میں اُس شخص کی ہر چیز کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اُس کی جوتیوں کی طرز و وضع کا، اُس کے متناسب اعضا کا، اُس کے پُرپیچ و سرکش بالوں کی لہروں کا، مگر اُس کا بے پروایانہ انداز اُس کی کم نگہی مجھے زہن میں پیوست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور مجھے خاک کی طرح باطل اور بے معنی بناتی ہوئی نظر آتی تھی۔

جب انہوں نے شمعیں بجھانی شروع کیں تو میں اُس کے پاس گیا اور اُس سے کہا "اب جانے کا وقت ہے۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔"

اُس نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا "مگر میں تو اُس کے ساتھ جارہی ہوں اور اُس نے اُسی شخص کی طرف اشارہ کیا۔ جو میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور اُس نے مجھے چُوم لیا۔

"یہ سب جھوٹ ہے" میں نے آہستہ سے کہا

اُس نے جواب دیا "ہم کل ملیں گے۔ تم ضرور میرے ہاں آنا"

جب میں گھر کی طرف جارہا تھا تو کہر سے بھری ہوئی زمردیں صبح کی شعاعیں اونچے اونچے مکانوں کی چھتوں پر پڑرہی تھیں۔ سڑک پر صرف ہم دو شخص تھے۔ گاڑی والا اور میں۔ وہ تیز و تند ہوا سے اپنے چہرے کو بچانے کے لئے آگے کو جھک گیا اور اُس کے پیچھے میں نے اپنے چہرے کو آنکھوں تک ڈھانپ لیا۔ گاڑی والے کے دل میں اپنے خیالات تھے اور میرے دل میں اپنے، اُدھر مکانوں کی پختہ دیواروں کے پیچھے ہزاروں لوگ سوئے پڑے تھے اور اُن کے اپنے اپنے خواب اور اپنے اپنے خیالات تھے میرے دل میں اُس کا خیال تھا اور اُس کے جھوٹ کا خیال تھا میں نے موت کا خیال کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ دیواریں جو صبح کا نور جذب کررہی ہیں مجھے ابھی سے مردہ تصور کر کے میری طرف دیکھ رہی ہیں شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی بے رخی اور سرد مہری سے کھڑی تھیں میں نہیں جانتا کہ گاڑی والے کے خیالات کیا تھے نہ مجھے اُن لوگوں کے خوابوں کا علم ہے جن کو دیواروں نے چھپا رکھا تھا۔ مگر وہ بھی تو میرے خیالات اور خواب نہ جانتے تھے۔

پس ہم بازار کی لمبی سیدھی سڑک پر سے گزرتے گئے صبح مکانوں کی رفیع و بلند چھتوں پر طلوع ہورہی تھی اور ہمارے چاروں طرف سکون برس رہا تھا۔ ایک خوشبو سے لدا ہوا بادل میرے قریب آیا اور کسی غیر مرئی ہستی نے سیدھا میرے کانوں میں قہقہہ لگایا "ہو! ہو! ہو!"

۲

اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ نہ آئی اور میں بے فائدہ اُس کا انتظار کرتا رہا تیرہ فام آسمان سے ایک دھندلا منجمد اندھیرا سا

اُتر کر زمین پر مستولی ہوگیا اور میں نے نہ جانا کہ کب شفق شام میں تبدیل ہوئی اور کب شام سے رات ہوگئی۔ مجھے یہ تمام کا تمام عرصہ ایک رات معلوم ہو رہا تھا۔ میں انتہائے افسردگی میں برابر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے ہموار اور یکساں قدم اُٹھاتا رہا۔ میں رفیع الشان مکان سے دو رہی دور رہا جس میں میری محبوبہ رہتی تھی۔ میں ڈیوڑھی کے اُس دروازے کے قریب بھی نہ گیا جس کی دہلیز پر سنہری چھت کا عکس پڑ رہا تھا، بلکہ میں بازار کی مقابل والی طرف اختیار کرکے اسی ایک چال سے پھرتا رہا ـــــ آگے اور پیچھے، آگے اور پیچھے۔ جب میں آگے بڑھتا تو میری آنکھیں اُس آب دار دروازے پر جم جاتیں اور جب میں واپس ہوتا تو میں اکثر ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا، تب برف کی تیز تیز سوئیاں میرے چہرے پر گر گر کر اُسے چھلنی کر ڈالتیں اور وہ سوئیاں لمبی اتنی تیز اتنی ظالم ہوتیں کہ میرے سینے میں اتر جاتیں اور میرے دل کو میرے اس یاس آمیز انتظار پر پژمردگی اور غصّے کے تیر سے پاش پاش کر دیتیں۔ برفانی ہوا چیختی چلاتی ہوئی روشن شمال سے تاریک جنوب کو چل رہی تھی۔ وہ مکانوں کی برفانی چھتوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی نیچے اترتی تھی اور میرے چہرے پر برف کے چھوٹے چھوٹے تیز گالوں کے تھپیڑے لگاتی ہوئی رکوچے کی ان شمعوں کے شیشوں سے جا کر ٹکراتی تھی جن میں تنہا زرد رو شعلہ سردی سے کانپ کانپ کر تند و تیز ہوا کے آگے جھک جاتا تھا۔ اس بے کس و بے نوا شعلہ کو دیکھ کر میں بہت رنجیدہ ہوا۔ اُس کی زندگی بس رات کی رات تھی اور میں نے خیال کیا کہ اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کوچہ میں حیات کی ایک رمق بھی باقی نہ رہ جائے گی اور صرف برف کے گالے خالی فضا میں اُڑتے پھریں گے اور زرد رُو شعلہ اس تنہائی اور سردی میں کانپتا اور ٹھٹھرتا رہے گا۔

میں اُس کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ تنہا شعلہ اور میں ایک ہی جیسے ہیں سوائے اس کے کہ میرا فانوس اُس کی طرح خالی نہ تھا۔ کیونکہ کبھی کبھی کوئی انسان اُس مقام پر آنکلتا تھا جسے میں اپنے قدموں سے ناپ رہا تھا، وہ چُپ چاپ میرے پیچھے پیچھے بڑھتے چلے آتے، میرے پاس سے گزر جاتے اور یکایک کسی خیالی تصویر کی طرح اُس سفید عظیم الشان عمارت کے کسی کونے کے پیچھے غائب ہو جاتے۔ پھر دوبارہ وہ اس کونے کی اوٹ سے نمودار ہوکر میرے قریب پہنچتے اور پھر آہستہ آہستہ کہر سے لدی ہوئی وسیع فضا میں جسے خاموشی سے گرنے والی برف نے پیدا کر رکھا تھا، غائب ہو جاتے۔ لپٹے لپٹائے بے وضع و قطع اور خاموش، وہ ایک دوسرے سے اور مجھ سے ایسی مماثلت رکھتے تھے کہ ایسا ظاہر ہوتا تھا: بیسیوں آدمی میری ہی طرح، اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، خاموش ہیں اور اپنے پیچ دار پیچ انگیز خیالات میں منہمک ہیں +

میں اُس کا انتظار کرتا رہا اور وہ نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس درد و کرب میں چیخ چیخ کر کیوں نہ رویا۔ میں نہیں جانتا میں اُس وقت کیوں ہنستا تھا اور خوش تھا، اور اپنی انگلیوں کو اس طرح بند کرتا تھا جیسے وہ کسی خونخوار جانور کے پنجے ہیں،

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے فشار میں مَیں اُس زہریلے سانپ کو پیس رہا ہوں جس کا نام "جھوٹ" ہے۔ وہ میری باہوں سے لپٹا ہوا تھا اور میرے قلب کو ڈس رہا تھا یہاں تک کہ میرا سر اُس کے زہر سے چکر کھانے لگا، دنیا کی ہر بات ایک "جھوٹ" تھی۔ اُس وقت جب میں ابھی پیدا نہ ہوا تھا اور اُس وقت کے درمیان جب مجھے یہ زندگی ملی ایک حدِ فاصل تھی جو اُٹھ گئی اور میں نے خیال کیا کہ میں ہمیشہ سے زندہ ہوں اور اگر یہ نہیں تو پہلے کبھی نہ تھا۔ اور ہمیشہ میری زندگی سے پہلے اور میری زندگی کے دور میں اُس نے مجھ پر حکومت کی ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ اُس کا کوئی نام اور کوئی جسم بھی ہے اور اُس کے وجود کی کوئی ابتدا اور کوئی انتہا بھی ہے۔ اُس کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ وہ تھی جس نے جھوٹ بولا اور جس ہمیشہ ایک ابدی انتظار میں رکھا اور کبھی نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں، مگر میں ہنسا۔ برف کی تیز سوئیاں میرے دل کو زخمی کر رہی تھیں اور کوئی غیر مرئی ہستی میرے کان میں قہقہے لگا رہی تھی: "ہو! ہو! ہو!"

اپنی آنکھیں کھول کر میں نے ایک نگاہ اُس عالی شان مکان کی روشن کھڑکیوں پر ڈالی اور انہوں نے چپکے چپکے اپنی زرد اور سرخ زبانوں کے ساتھ مجھ سے کہا:-

"وہ تم کو دھوکا دے رہی ہے۔ تم یہاں آوارہ منتظر اور مضطرب پھر رہے ہو اور وہ حسن، مسرت اور فریب میں ڈوبی ہوئی اپنے گھر کے اندر اُس بالا قد اور خوبصورت شخص کی سرگوشیاں سن رہی ہے جو تمہیں حقارت سے دیکھتا ہے۔ اگر تم اندر گھس جاؤ اور اُس کو قتل کر ڈالو تو تم ایک نیک کام کرو گے۔ کیونکہ درحقیقت تم جھوٹ کو قتل کرو گے۔"

میں نے اپنے اُس ہاتھ کو زور سے بند کر لیا جس میں چاقو تھا، اور ہنستے ہوئے جواب دیا: "ہاں میں اُسے ضرور مار ڈالوں گا۔"

کھڑکیوں نے مجھے حسرت اور اندوہ سے دیکھا اور کہا "تم اُسے کبھی قتل نہ کر سکو گے۔ کبھی نہیں، کیونکہ تمہارے ہاتھ کا ہتھیار بھی اُس کی محبت کی طرح جھوٹا ہے۔"

خاموش سائے مدت ہوئی غائب ہو چکے تھے اور اُس زمہریر میں مَیں اکیلا رہ گیا تھا ـــــ میں اور شعلہ کی بے کس و تنہا زبان سردی اور مایوسی میں کانپ رہے تھے۔ پاس کے گرجا میں سے گھنٹے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ اُداس و لرزتی آواز تھرتھراتی اور سسکیاں لیتی ہوئی فضا میں پرواز کرتی اور پھر ہوا میں دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے برف کے گالوں میں گم ہو جاتی تھی۔ میں نے ضربوں کو گننا شروع کیا اور مجھے بے اختیار ہنسی آگئی: کلاک نے پندرہ بجائے! یہ ایک پرانا گھنٹہ گھر تھا اور یہی طرح کلاک بھی پرانا تھا، اور گو اس کا وقت درست ہوتا تھا لیکن گھنٹہ اس کا بے تحاشا ہی بجا کرتا تھا، اس طرح کہ اکثر بوڑھے گھنٹہ بجانے والے کو کلاک کے مینار پر چڑھ کر اُس کی زبان کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے بند کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، گھنٹے کی اس اداس اور تھرتھراتی ہوئی آواز نے جو کہر کی ظلمت سے الجھی ہوئی اور لپٹی ہوئی ہے آخر یہ "جھوٹ" کس لئے بولا ہے؟ آہ، یہ

بے فائدہ جھوٹ کس قدر ذلیل اور بے سروپا ہے۔

گھنٹے کی آخری آواز کے ساتھ وہ چمکتا ہوا دروازہ کھلا اور وہ بلند و بالاقد کا شخص سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ صرف اُس کی پشت پر میری نظر پڑی لیکن میں نے اُسے شناخت کر لیا۔ کیونکہ غرور اور تبختر کے اُس پتلے کو ابھی میں نے کل شام ہی دیکھا۔ میں نے اُس کا قدم پہچان لیا جو گزشتہ شام کی بہ نسبت زیادہ ہلکا اور زیادہ مطمئن پڑ رہا تھا۔ میں بھی اکثر اوقات اس کو یوں ہی نکلا تھا۔ اُس کی یہ چال مردوں کی وہی چال تھی جو اُس وقت پیدا ہوتی جب اُن کے لب کسی عورت کے جھوٹے لبوں سے ملتے ہیں۔

۳

میں نے اُس کی منتیں کیں، اُسے دھمکایا، اُس پر دانت پیستا رہا۔

"بتاؤ، مجھے سچ سچ بتاؤ!"

مگر برف جیسے سرد مہر چہرے کے ساتھ، اُٹھے ہوئے متحیر ابروؤں کے ساتھ، سیاہ عمیق چمکتی ہوئی پُراسرار و پُرسکوں آنکھوں کے ساتھ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں"۔

وہ جانتی تھی کہ میں ثابت نہ کر سکوں گا کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے اور یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ اُس کے ایک لفظ، اُس کے ایک جھوٹے لفظ سے میرے اِن جاں خراش و جاں ستاں خیالات کا تمام بوجھ یکسر ہلکا ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لفظ کا مجھے انتظار تھا اور وہ اُس کے شیریں لبوں سے ٹپکا۔ صداقت کی تمام رنگینیوں کو لئے ہوئے موتی کی طرح چمکتا ہوا! مگر اُس کی گہرائیوں میں اب بھی وہی تاریکی موجود تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کیا میں کلیتہً تمہاری ہی نہیں ہوں؟"

ہم شہر سے دور تھے اور برف پوش کھیت تاریک کھڑکیوں میں سے نظر آ رہے تھے۔ اُن کے اوپر تاریکی تھی اور اُن کے چاروں طرف تاریکی تھی، بے حرکت، خاموش تاریکی، لیکن کھیت اپنی ذاتی روشنی سے اس طرح چمک رہے تھے جیسے اندھیرے میں کسی لاش کا چہرہ نظر آ رہا ہو۔ کمرہ خوب گرم تھا اور صرف ایک مومی بتی اُسے روشن کر رہی تھی اور اُس بتی کے سرخ شعلہ پر بھی سرد کھیتوں کی زردی کا اثر پڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا "میں حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہوں خواہ وہ میرے لئے کتنی ہی پُر الم کیوں نہ ہو۔ شاید میں اُسے سن کر مر جاؤں لیکن موت میرے لئے بہتر ہے اُس زندگی سے جس میں جھوٹ کو دخل ہو۔ تمہارے لبوں میں ایک جھوٹ ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایک بطلان ہے۔ مجھ سے سچ کہہ دو اور میں ہمیشہ کے لئے تم کو چھوڑ دوں گا۔" مگر وہ خاموش رہی اور اُس کی متجسس نگاہ

میرے دل میں اتر گئیں۔ میری روح کو انہوں نے کھینچ کر باہر نکال لیا اور ایک عجیب پرجستجو طریقہ سے انہوں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں چلا کر بولا "میری بات کا جواب دو، ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا"!

اُس نے نہایت مطمئن لہجہ میں جواب دیا "مجھے مار ڈالو۔ بعض اوقات زندگی ایسی ہی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مگر دھمکیوں سے تمہیں حق نہ مل سکے گا"۔

میں اُس کے سامنے جھک کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھوں کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رو رو کر اس سے رحم اور حق کے لئے التجا کرنے لگا۔

"آہ اے غریب"! اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

میں نے منت سے کہا "مجھ پر رحم کرو۔ میری روح حق کے لئے بیتاب ہے"۔

میں نے اُس کی شفاف پیشانی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے حق اُس کی اُس باریک مانگ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ میرے دل میں اُس کے سر کو توڑ کر حق کو اُس میں سے نکال لینے کی ناقابلِ ضبط آرزو پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کا دل اُس کے سینے میں دھڑک رہا تھا اور میں دیوانہ وار اُس سینے کو اپنے ناخنوں سے پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ انسان کے دل کو عریانی میں دیکھنے کے لئے، خواہ وہ ایک ہی دفعہ کے لئے کیوں نہ ہو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ مومی بتی کا نوکدار زرد شعلہ جواب خاموش ہوا ہی چاہتا تھا بے حرکت ہو رہا تھا۔ مکان کی دیواریں بڑھتی ہوئی تاریکی کے اندر وسعتِ فضا میں گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ غم بےکسی اور ہیبت ہر طرف چھا رہی تھی۔

"آہ اے غریب!" اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

بتی کے زرد شعلے پر تشنج سا طاری ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے وہ تڑپا اور پھر بجھ گیا۔ تاریکی کی چادر نے ہم کو اپنے اندر لپیٹ لیا۔ اب نہ میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا اور نہ اُس کی آنکھوں کو، اور جھوٹ بھی اب مجھے نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ میں سوچتا تھا اور نہ اپنے جسم میں زندگی محسوس کرتا تھا، بلکہ صرف اُس کے ہاتھوں کے مس کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا اور یہ مجھے سچ معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس اندھیرے میں اُس کی دھیمی سی سہمی اور ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"اپنی آغوش میں مجھے چھپا لو۔ میں ڈر گئی ہوں"!

"تم حق معلوم کرنا چاہتے ہو ـــــ مگر کیا میں اُس سے واقف ہوں؟ آہ، کاش کہ میں اُس سے واقف ہوتی۔ مجھے بچا لو ـــــ آہ، میں ڈر گئی ہوں"!

میں نے اپنی آنکھیں کھول ڈالیں۔ زرد رو تاریکی بلند کھڑکیوں میں سے نکل کر دیوار کے قریب جمع ہو گئی اور ادھر اُدھر کونوں

میں اپنا سر چھپانے لگی۔ پھر نہایت آہستہ سے کسی بہت بڑی اور نہایت سفید چیز نے کھڑکیوں میں سے اندر کی طرف جھانکا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کی مردہ آنکھیں ہمیں تلاش کر رہی ہیں اور اپنی نگاہ کے برفانی تاروں سے جکڑ رہی ہیں۔ کانپتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے ساتھ اور زور سے چمٹ گئے۔ اُس نے پھر آہستہ سے کہا "آہ، میں ڈر گئی ہوں"!

۴

میں نے اُسے مار ڈالا۔

میں نے اُسے مار ڈالا اور جب وہ کھڑکی کے قریب ایک بے جان تختے کی طرح چت پڑی ہوئی تھی تو میں اُس کی لاش پر اپنا پاؤں رکھ کر خوب ہنسا۔ یہ ہنسی کسی مجنون کی ہنسی نہ تھی، نہیں! میں اس لیئے ہنسا کہ میرا سینہ اب ہلکا ہو گیا تھا، اُس میں اب سکون اور مسرت کی حکومت تھی اور میرے دل سے وہ کرم جھڑ کر گر پڑا تھا جو اُسے دم بدم کھائے جا رہا تھا۔ جھک کر میں نے اُس کی مردہ آنکھوں میں نگاہ ڈالی۔ وہ بڑی بڑی روشنی کے لئے حریص آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور چینی کی گڑیا کی آنکھوں کی مانند گول اور بے نور نظر آ رہی تھیں۔ میں اُن کو اپنی انگلیوں سے چھو سکتا تھا انہیں کھول سکتا اور بند کر سکتا تھا اور مجھے اُن سے کسی قسم کا خوف نہ آتا تھا کیونکہ اب اُن سیاہ اور عمیق تپلیوں میں جھوٹ اور شک کا دیو موجود نہ تھا جس نے اتنی طویل مدت تک حریصانہ میرا خون چوسا تھا۔

جب انہوں نے مجھے گرفتار کیا تو میں ہنس پڑا اور میری یہ حرکت گرفتار کرنے والوں کو نہایت وحشیانہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے نفرت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر لیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ اور لوگ لعنت اور نفرین بھیجتے ہوئے میری طرف بڑھے لیکن جب انہوں نے میری مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو اُن کے چہرے زرد پڑ گئے اور اُن کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

وہ مجھے دیوانہ کہتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دیوانہ کہہ کر انہیں تسکین ہو جاتی ہے کیونکہ یہی وہ لفظ تھا جو انہیں قتل کے معمے کو حل کرنے میں مدد دیتا تھا۔۔۔ کیونکر ممکن تھا کہ میں ایک عاشق ہو کر اپنی محبوبہ کو قتل کر دوں اور پھر ہنسوں۔ صرف ایک موٹا تازہ اور خوش بخوش آدمی مجھے ایک دوسرے نام سے پکارتا تھا جس سے ایک دھچکا سا آ کر مجھے لگتا تھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

"آہ اے غریب آدمی!" اُس نے رحیمانہ لہجہ میں کہا۔ اُس کو بالکل غصہ نہ آیا کیونکہ وہ ترو تازہ اور خوش تھا "آہ اے غریب آدمی"!

میں نے چلا کر کہا "خبردار! مجھے اس طرح مخاطب نہ کرو"!

میں نہیں جانتا کہ میں کیوں اُس پر جھپٹا۔ میں یقیناً اُسے مارنا نہ چاہتا تھا لیکن مجھ سے ڈرے ہوئے یہ تمام لوگ جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھے تھے اور زیادہ خائف ہو گئے اور اس طرح چیخیں مارنے لگے کہ مجھے پھر ہنسی آ گئی۔

جب وہ مجھے اُس کمرے میں لے گئے جہاں لاش پڑی ہوئی تھی تو اُس لحیم و شحیم اور سرد آدمی کی طرف دیکھ کر میں
بے بلند اور بیٹھی آواز میں کہنا شروع کر دیا "میں خوش ہوں۔ میں خوش ہوں"
اور یہ سچ تھا۔

۵

بچپن میں ایک مرتبہ چڑیا گھر میں مَیں نے ایک چیتے کو دیکھا تھا۔ جس کا تصوّر میرے دل میں مدتوں رہا اور مدتوں میرے
اُس کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ دوسرے درندوں کی طرح احمقانہ نشے میں سرشار پڑا نہ رہتا تھا اور نہ ہی بیہودہ
تماشائیوں کی طرف مبہوت ہو کر دیکھتا تھا۔ وہ ایک خطِ مستقیم پر سیدھا ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتا
ہر بار ایک ہی مقام سے پلٹتا تھا اور ہر دفعہ اُس کی صاف اور چمکیلی کھال اُس کے پنجرے کی ایک ہی سلاخ سے ٹکراتی تھی
خونخوار سر جھکا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں بالکل سامنے کی طرف متوجہ تھیں۔ کبھی ایک دفعہ بھی اُس نے اِدھر اُدھر نظر
ڈالی۔ دن بھر لوگ آ آ کر اُس کے پنجرے کے سامنے شور مچاتے تھے مگر وہ برابر ایک نہج پر آگے اور پیچھے چلتا رہتا تھا اور
نظر اٹھا کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھتا تھا۔ ہجوم میں سے چند مسکراتے تھے مگر اکثر سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے بلکہ افسردگی اور پژمردگی
زندہ تصویر کو دیکھ کر مغموم ہو جاتے تھے ایک آہ بھر کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور جب وہ کچھ دور نکل جاتے تو ایک مرتبہ پھر ایک
سرانہ اور متحیرانہ نگاہ اُس پر ڈالتے جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ اُن کی اپنی انسانی حالت میں اور اس مقید
کی حالت میں کوئی بات مشترک ہے جو فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اور جب میں بڑا ہوا اور لوگوں کی زبانوں کو اور کتابوں
واابد کا تذکرہ کرتے دیکھا تو مجھے وہ چیتا پھر یاد آ گیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیشگی اور اُس کے رنج و تعب کی ایک
میں نے کبھی دیکھا ہے۔

اُس چیتے کی طرح میں اپنے پتھر کے پنجرے میں بند تھا۔ ٹہلتا تھا اور سوچتا تھا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک
لکیر پر میں چلتا تھا اور میرے خیالات بھی ایک ایسے ہی خطِ مختصر پر سفر کرتے تھے لیکن یہ خیالات اتنے بوجھل تھے کہ مجھے یہ
ہوتا تھا کہ میں نے صرف ایک سر کو اُٹھا رکھا ہے بلکہ مجھے اپنے کندھوں پر ایک دنیا کا بار پڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ تمام
صرف ایک لفظ پر مشتمل تھے لیکن کیا ہی وسیع، کتنا پُر عذاب اور کیسا تباہ کن تھا وہ لفظ!

وہ لفظ: "جھوٹ"

تمام کونوں سے وہ پھنکارتا ہوا نکلتا تھا اور میری سوچ کے گرد لپٹ جاتا تھا۔ لیکن اب وہ چھوٹا سا سانپ نہ رہا تھا، اب
بڑا، خونخوار، شعلہ ریز اژدہا بن گیا تھا وہ مجھ کو ڈستا تھا اور اپنی آہنین لپیٹوں میں جکڑ کر مجھے نیم جاں کر دیتا تھا۔ میرے
چھوٹے چھوٹے سانپوں کا ایک طوفان امڈا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں درد و کرب سے چیخ اُٹھتا تھا اُس وقت میرے منہ سے

وہی ایک پھنکارتا ہوا خوفناک لفظ نکلتا تھا "جھوٹ"!

اور جب میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا قیدخانہ میں ٹہلتا تھا تو اُس کا بھورا بھورا فرش میری آنکھوں کے سامنے ایک بھورے رنگ کے شفاف غار میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ میرے پاؤں فرش کو چھوتے معلوم نہ ہوتے تھے اور میں خیال کرتا تھا کہ میں کسی ناقابلِ فہم بلندی پر کھڑی کی تاریکیوں میں بہا چلا جا رہا ہوں۔ اور جب میرے سینے سے وہ سنسناتا ہوا نعرہ نکل جاتا تو نیچے سے کہر کے اس ناقابلِ نفوذ پردے کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ایک ہیبت ناک گونج اٹھتی اور اتنی آہستہ اور دھیمی ہوتی گویا وہ ہزارہا سال کے زمانے میں سے گزر کر آرہی ہے اور دھند کے ایک ایک بجزے میں اُس کی طاقت کا ایک ایک ذرہ گم ہو گیا ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہاں، نیچے یہ اُس آندھی کی طرح چل رہی ہے جس سے درخت بھی اکھڑ اکھڑ کر گر پڑتے ہیں، لیکن جب یہ میرے کانوں تک پہنچتی تو اس کی بساط اُس مختصر سے لفظ سے زیادہ نہ رہتی جو سرگوشی کی آواز میں کہا جائے "جھوٹ"!

یہ ذلیل اور کمینہ سرگوشی مجھے طیش میں لے آتی اور میں زور سے زمین پر پاؤں مارتا اور چلا کر کہتا "جھوٹ کہیں بھی موجود نہیں۔ میں نے جھوٹ کو مار ڈالا ہے"!

میں جان بوجھ کر پرے ہٹ جاتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب مجھے کیا ملے گا ——— اور اتھاہ غار میں سے آہستہ آہستہ جواب اوپر کو آتا "جھوٹ"!

جانتے ہو، میں نے ایک خطرناک غلطی کی۔ عورت کو قتل کر کے میں نے جھوٹ کو ابدی زندگی دے دی۔ عورت کو کبھی قتل نہ کرو۔ یہاں تک کہ دعا، رنج اور عذاب سہہ سہہ کر تم اُس کی روح سے سچ کو پالو۔

۶

تاریک اور خوفناک ہے وہ جگہ جہاں وہ سچ کو اپنے ساتھ لے گئی، اور جھوٹ کو ——— اور وہیں میں بھی جا رہا ہوں۔ شیطان کے تخت کے نیچے میں اُسے پکڑ لوں گا اور اُس کے سامنے جھک کر اور رو رو کر اُس سے کہوں گا "مجھے سچ بتاؤ! مجھے سچ بتاؤ"!

لیکن خدا! اے خدا! یہ بھی تو جھوٹ ہے۔ یہاں تو خلا ہی خلا ہے، صدیوں کا خلا، بے پایاں خلا، مگر وہ کہاں ہے ——— وہ کہیں بھی نہیں ہے لیکن جھوٹ کو وہ باقی چھوڑ گئی ہے۔ یہ غیر فانی ہو گیا ہے۔ میں ہوا کے ہر ذرے میں اُسے پاتا ہوں اور جب میں سانس لیتا ہوں تو یہ میرے سینے میں داخل ہو کر پھنکارتا ہے اور کاٹ کاٹ کر میرے دل کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔

اوہ! کسی شخص کے لئے حق کی تلاش کتنا بڑا جنون ہے، کتنا بڑا دکھ ہے۔

بچاؤ! مجھے اس دکھ سے بچاؤ!

اندریف ——— منصور احمد

شاعر کی التجا

(محبت کی دیوی سے)

سر جھکائے ہوئے، خاموش پجاری کی طرح
تیرے دربار میں آیا ہوں بھکاری کی طرح

روح افسردگیٔ ذوق سے بے حد ہے ملول
خلشِ شوق کے ناپید ہیں اسبابِ حصول

سازِ دل نغمۂ بیتاب سے یکسر خالی
کشتِ جاں موجۂ شاداب سے یکسر خالی

زندگی خشکیٔ جذبات سے برباد و خراب
بے حسی وہ کہ جوانی بھی مری ننگِ شباب

ذہن ناکام و مقید ہے، نگاہیں محدود
طائرِ شوق کے پرواز کی راہیں مسدود

روح ٹھٹھری ہوئی بیگانۂ تابش ہے الگ
عقل افسردہ و محرومِ نوازش ہے الگ

دل سے جولانیٔ ارماں کی حرارت مفقود
کشمکشہائے تمنا کی جسارت مفقود

قلب پر ابرِ کثافت کی گرانباری ہے
سینۂ سرد پہ خاموشیٔ غم طاری ہے

پھونک دے وہ نفسِ گرم مرے سینے میں
بال پڑ جائے مرے قلب کے آئینے میں

فطرتِ عشق کو اسبابِ ضیا باری دے
دل کے سوئے ہوئے جذبات کو بیداری دے

طائرِ روح کو مل جائے وہ پروازِ خیال
لے اڑے بامِ فلک کو بھی تگ و تازِ خیال

چشمِ پُرشوق کو مخمورِ تماشا کر دے
دل میں "وجدانِ محبت" کا اجالا کر دے

میرے الفاظ میں وہ سوز و اثر پیدا ہو
ہر طرف شعلہ نوائی کا مری چرچا ہو

سارے عالم پہ ہو محویتِ وجداں طاری
جھوم جائے مرے اشعار سے دنیا ساری!!

ذوقی

جوہری

کاروبار کے جھمیلے میں نو بج گئے اور کثرتِ کار کے سبب میرا دماغ چکرانے لگا۔ تازہ دم ہونے کے لئے آخر "چانسری لین" سے نکل کر میں "امبینک منٹ" کی طرف چل دیا۔

راستے میں دریا کی درخشانی فردوسِ نظر تھی۔ میں ہوا کا تماشا دیکھنے کے لئے رکا ہی تھا کہ معًا میرے کانوں میں یہ آواز آئی: "رات گرم ہے"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو ایک شخص پل پر دیوار سے سہارا لئے کھڑا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ شخص راندۂ روزگار اور آوارۂ قسمت ہے۔ اگر اس کو جواب دیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ کھانے پینے کا سوال کر بیٹھے۔ میری نظریں اُس کے چہرہ پر مرکوز ہو گئیں۔ اُس کا چہرہ اُس کی پریشانیٔ خاطر کا بھانڈا پھوڑ رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر ذہانت و فطانت کے آثار ہویدا تھے اور اُسکے ہونٹ متحرک اور مرتعش تھے۔

میں نے جواب دیا "رات واقعی گرم ہے لیکن اس جگہ دریا کے قرب کی وجہ سے کچھ خنکی سی پیدا ہو گئی ہے"

اُس نے دریا کے اُس پار نظر ڈال کر کہا: "اُس شخص کے لئے جو سارا دن فکرِ دنیا میں سر کھپائے لندن بھر میں یہی ایک پُر کیف جگہ ہے جہاں دماغ کو تازگی اور نظروں کو آسودگی ملتی ہے . . . . پھر اُس نے رک رک کر کہا: زندگی کاہشوں سے لبریز ہے ---- میرا خیال ہے کہ آپ بھی میری طرح تھکے ماندے اور غمِ روزگار کے شاکی ہیں ---- دل چاہتا ہے کہ نام و نمود کی ہنگامہ طرازیوں سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہو جاؤں اور زر و مال کو تج دوں" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور مجھے اضمحلالِ شکستہ کے ساتھ مڑ کر متحیّر نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے عمر بھر اس جیسا حیرانی و حسرت کا مارا انسان نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا ملبوس میلا چکٹ اور دریدہ تھا۔ مجھے اس سے ایک بوئے کنگی آنے لگی۔ اُس کے طرزِ تخاطب سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کوئی دیوانہ ہے۔

میں نے کہا: "واقعی زندگی کاہشوں سے لبریز ہے۔ زندگی میں فائز المرام ہونے کے لئے سر کھپانا پڑتا ہے -- کہو کسبِ معاش کا کیا ذریعہ ہے؟"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "کیا کہوں آپ کو یقین نہیں آئے گا ---- میرا کاروبار نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا ہے لیکن اب کچھ تکالیف کا سامنا ہو رہا ہے۔ میں . . . . . . ہیرے . . . . . . بنا سکتا ہوں"

"شاید اب کام سرد پڑ گیا ہے؟"

"نہیں ــــــ مصیبت یہ ہے کہ لوگ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے"

پھر اُس نے اپنے صدتار کوٹ کے بٹن کھول کر جیب سے کپڑے کا ایک ٹکڑا نکالا اور اُس سے ایک بڑا ہیرا نکال کر میرے ہاتھ میں دیا اور کہا: "ایک سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ میں علم الطبعیات کی آخری سند لے چکا ہوں۔ یہ ہیرا خود ساختہ ہیرا ہے"

حقیقتاً یہ ہیرا بہت موٹا اور بڑا تھا۔ میں نے اطمینان کی غرض سے پہلے تو گھڑی کے شیشے کو کاٹا اور پھر چاقو کو خراش دی۔ میرے دل میں خلش تفحص پیدا ہوگئی اور پوچھا: "یہ ہیرا ہے ــــــ کہو یہ کیسے ہاتھ آیا ہے؟"

اُس نے ہیرا میرے ہاتھ سے لے کر کہا: "میں کہہ چکا ہوں کہ یہ ہیرا خود ساختہ ہیرا ہے۔ آپ سے ایک سو پاؤنڈ کی حقیر رقم لوں گا جو اس کی قیمت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے"

یہ سن کر میرے دل میں کئی قسم کے شبہات پیدا ہوئے: "اگر یہ ہیرا ہے تو اس آشفتہ سر کے ہاتھ کیونکر آیا ہوگا اور یہ اسے بیچنا کیوں چاہتا ہے؟"

پھر ہماری نگاہیں دوچار ہوئیں اور مجھے اُس کی دیانت داری اور ایمانداری کا یقین سا ہوگیا۔ ادھر یہ خیال میرے دل میں جاگزین ہوگیا کہ ہیرا یقیناً بے حد قیمتی اور گراں مایہ ہے۔ جواہراتِ عالم پر جب کوئی کتاب لکھی جائے گی تو اس ہیرے کا تذکرہ کیا جائے گا۔ میں یہ ہیرا خرید لیتا لیکن مصیبت یہ تھی کہ یک صد پونڈ میرے پاس پس انداز نہیں تھے۔ یہ رقم راس المال سے دینی پڑتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کاروبار میں دشواریاں پیدا ہوجائیں۔

میں نے اطمینان کی غرض سے ایک بار پھر پوچھا: "آپ نے یہ ہیرا کہاں سے لیا ہے؟"

یہ ہیرا خود ساختہ ہیرا ہے پھر اُس نے آہ کھینچ کر کہا: "دل چاہتا ہے کہ آپ کو اپنی سرگذشت سنادوں شاید آپ کے شکوک رفع ہوجائیں ــــــ لیکن . . . . "

پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں ہیرے کے کیمیاوی اجزا پر ایک بصیرت افروز علمی لیکچر دیا اور کہا کہ میں نے سترہ سال کی عمر میں یہ کام شروع کیا تھا۔ اب میری عمر بتیس سال ہے۔ گویا پندرہ سال اس شغل کی نذر ہوچکے ہیں۔ میرا کل اندوختہ اِسی جنوں کی تکمیل میں صرف ہؤا اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور برابر تجربات کرتا رہا۔ میرے لئے سب سے بڑی مشکل اس راز کا چھپانا تھا۔ میں نے کنگسٹن ٹاؤن میں تن تنہا اپنے مختصر سے معمل میں ایک عجیب النوع تجربہ کیا۔ کاربن اور بعض سیال چیزوں کے امتزاج کو بندوق کی نلی میں ڈال کر اُسے گلخن کے سپرد کردیا"

میں نے کہا: "یہ تجربہ تو خطرناک ثابت ہؤا ہوگا"

اُس نے جواب دیا "نلی پھٹ گئی اور دروازہ کھڑکی اور جو کچھ اثاث البیت باقی تھا سب جل بجھ کر رہ گیا۔ پھر میں نے پیرس کے ایک محل میں جا کر یہ خطرناک کھیل کھیلا اور وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر مایوس ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ اور ایک دن فولادی سلنڈر میں بعض کیمیاوی اجزا بھر کر اُسے لَو دیتے ہوئے گلخن میں ڈال کر سیر کو نکل گیا"۔

یہ سُن کر میں بے اختیار ہنس دیا اور کہا: "کیا اس کمرہ میں آدمی نہیں تھے یا تمہیں پچھلا تلخ تجربہ بھول گیا تھا"

اُس نے جی کڑا کر کے کہا: اِس قسم کے خمیازے تجربات کے شوق میں کھینچنے ہی پڑتے ہیں ——— بالائی منزل میں مالنیں رہتی تھیں اور نیچے ایک بڑا کنبہ اقامت گزیں تھا۔ میں سیر سے واپس آیا تو سلنڈر صحیح وسالم پڑا تھا۔ میں نے اس ڈر سے کہ شاید ایک آنچ کی کسر کا معاملہ کہیں پیش نہ آئے اُس کو گلخن سے نکالنا مناسب نہ سمجھا گو دل ایک کشمکش اور اضطراب میں تھا۔ ان دنوں میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اِدھر مکان کے کرایہ کا تقاضا ہو رہا تھا۔ اِس جنون میں جو کچھ کیا اُس کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہے مختصر یہ ہے کہ دربانی کی، اخبار بیچے، سائیس بننا منظور کیا اور ایک ہفتہ تو کاسۂ گدائی ہاتھوں میں لے کر دریوزہ گری کرتا رہا۔

ایک بار دو دن کا فاقہ تھا، اِدھر گلخن کی آگ ٹھنڈی ہو رہی تھی اور کوئلے ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ حسن اتفاق سے ایک چھوٹی بچی کو اُٹھا کر اُس کے گھر پہنچا آیا اور وہاں سے چھ پیسے ملے جن کے آتے ہی کوئلے خرید لئے۔

تین ہفتوں کے بعد وہ سلنڈر نکال کر دیکھا تو کیمیاوی اجزا کبریتِ احمر کی طرح کھول رہے تھے۔ جب سلنڈر سرد پڑ گیا تو اُسے کھولا۔ اُس میں سے تین بڑے بڑے اور پانچ چھوٹے چھوٹے ہیرے برآمد ہوئے۔ میں اُنہیں دیکھ رہا تھا کہ ایک نشے میں مخمور شرابی میرے کمرے میں در آیا۔ مَیں نے جھنجھلا کر اُس کا منہ نوچ لیا اور پھر دھکے دے کر اُسے مکان سے نکال دیا۔ گو وہ بنکارتا رہا لیکن میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی اور اپنی دُھن میں لگا رہا کمبخت نے یہاں سے نکل کر پولیس میں میرے خلاف چغلی کھائی اور مجھے تھانہ میں اپنے سربستہ راز کو خود ہی افشا کرنا پڑا۔ اگر حقیقت کا اعلان نہ کرتا تو بہت ممکن تھا کہ کسی سازش کے الزام میں دھر لیا جاتا، صبح کو اخبارات نے جو ہمیشہ بے پر کی اڑاتے ہیں میرے کلبۂ احزان کو "رکنگسٹن ٹاؤن بم فیکٹری" لکھا۔

آپ ہی دنیا بھر میں پہلے شخص ہیں جن سے یہ راز کی بات کہہ رہا ہوں کیونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے"۔

میں نے ازراہِ تمسخر کہا: "خدا کا شکر ادا کیجئے کہ سستے چھوٹے ورنہ کیا معلوم کہ کونسی افتاد پڑتی؟"

اس سرگذشت کے بعد میرے لئے ہیرے کا خریدنا حماقت کا کام تھا۔ اِس لئے میں نے جواب دیا کہ "مجھے

پوری طرح سے تو نہیں، کچھ نہ کچھ یقین ضرور ہو گیا ہے - بہتر ہے کہ کل آپ میری دوکان پر تشریف لے آئیں تاکہ مکمل گفتگو ہو سکیں۔"

اُس نے جھلّا کر کہا: "آپ ملاقات کا دن معیّن کر کے مجھے گرفتار کرانا چاہتے ہیں ــــــ لیکن میں کچی گولیاں نہیں کھیلا۔"

میں نے آواز کے مطمئن لہجہ میں جواب دیا: "یہ آپ کا سوءِ ظن ہے - مجھے آپ پر اعتماد ہے ــــــ اچھا کل نہ سہی کسی دن تشریف لائیے - یہ ہے میرا کارڈ۔"

اُس نے کارڈ لے کر جاتے ہوئے کہا: "اگر آپ نے یہ راز افشانہ کیا تو معقول ہدیہ دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تاریکی میں غائب ہو گیا اور میں بھی چلا آیا - کچھ دنوں کے بعد اُس کے دو خطوط ملے جن میں لکھا تھا کہ فلاں پتے پر بینک نوٹ بھیج دو - لیکن میں نے دونوں تحریروں کا کوئی جواب نہ دیا - ایک بار میں کہیں باہر تھا کہ وہ میری دوکان پر آیا۔

واپسی پر میرے ملازم نے مجھ سے کہا کہ "ایک شخص آپ سے ملنے کے لئے آیا تھا - جس کا ملبوس کہنہ اور دریدہ تھا - اُسے کالی کھانسی کا روگ بھی تھا۔"

یہ سُن کر مجھے خیال آیا کہ غالباً وہی دیوانہ جوہری آیا ہو گا - میں اکثر راتوں کو سوچتا رہتا ہوں کہ کیا واقعی وہ ہیرے بنا سکتا ہو گا ــــــ یا کوئی دیوانہ ہو گا - اب وہ مر چکا ہو گا اور اب اُس کے ہیرے پھینک دیئے گئے ہوں گے - پھر رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہو گا اور ہیروں کو بیچتا پھرتا ہو گا۔

(مختار) صادق ایّوبی

اگر میرے پاس آسمانوں کی اقلیم کے قالین ہوتے ــــــ نور کی سیمیں و زریں کرنوں سے مزیّن قالین، رات دن اور شام کے نیلے دھندلے اور سیاہ قالین،

تو میں اُن کو تمہارے قدموں میں بچھا دیتا،

مگر میں نادار ہوں اور میرے پاس صرف میرے خواب ہیں،

مَیں نے اپنے خوابوں کو تمہاری راہ میں بچھا دیا ہے،

آہستہ چلو، کیونکہ تمہارے قدموں کے نیچے میرے خواب ہیں۔

ییٹ

کنول

کیسا جھلک رہا ہے رنگ آب میں کنول کا
کیا خوشنما ہے منظر تالاب میں کنول کا

کیا صبح ہو رہی ہے کیا نور کا سماں ہے
پانی پہ اللہ اللہ کیا فرشِ ارغواں ہے

ہوتے ہی صبح انجم گردوں سے سب سدھارے
پر جلوہ گر ہیں کیسے پانی کے یہ ستارے

ہے داغ دار لالہ وہ کس حساب میں ہے
نسبت کنول سے کیا دوں کانٹا گلاب میں ہے

ہے سطحِ آب ساکن یا روئے آب فق ہے
ہے طرفہ تر تماشا پانی پہ بھی شفق ہے

تاباں نہیں کنول میں شبنم کا قطرہ قطرہ
موتی سے ہے لبالب یاقوت کا پیالہ

روشن نہ ہوں کنول سے کیوں رمزِ حسنِ فطرت
اس کا ورق ورق ہے اک دفترِ حقیقت

ڈنٹھل ہیں نرم و نازک پتے ہرے ہرے ہیں
کیسے بڑے بڑے ہیں کیسے بچھے ہوئے ہیں

ہے دلفریب کیسا نظارۂ زرِ گل
رکھا ہوا ہے گویا اک تاج برسرِ گل

کیا آ رہی ہیں کرنیں خورشید سے نکل کر
کیا کھل رہی ہیں کلیاں رنگت بدل بدل کر

کیا اُڑ رہے ہیں بھونرے کیا آ کے گر رہے ہیں
کیا جاں چھڑک رہے ہیں کیا گرد پھر رہے ہیں

کیا لوٹتی ہیں موجیں پھولوں کی اس ہنسی سے
بے تاب خود ہے جل بھی ان کی شگفتگی سے

لہروں کے پیچ و خم کا کیا دل کشا ہے نقشا
پھولوں میں ہے ہوا سے یہ اہتزاز کیسا

پانی میں بھی ہے قائم، یہ نشہ رنگ کا ہے
رہ رہ کے ہائے کیسا ہر پھول جھومتا ہے

دکھلا رہا ہے کیا کیا اپنی بہار ساگر
کثرت سے ہے کنول کی اک لالہ زار ساگر

نسریں، گلاب، سوسن ہیں خندہ زن چمن میں
چمپا، چنار، جوہی، ٹیسو، کھلے ہیں بن میں

لالہ بنا ہے زینت افزائے کوہسار اں
ہے پردۂ حجر میں نورِ شرار پنہاں

یعنی نہیں کوئی جا حسنِ ازل سے خالی
پانی کی سطح رہتی کیونکر کنول سے خالی

میر سعادت حسین نجیب

ابدی خواب

وہ ایک صاف شفاف چشمے کے کنارے محوِ خواب تھا کل کی طرح آج پھر اُس کے گھنگریالے بال سرخ گلاب کو شرمانے والے رخساروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی اور مستیوں میں بھیگی ہوئی ہواؤں کے جھونکے آتے اور اُس کے سنہرے بال رقص کرنے لگتے۔ کتنا خوبصورت؟ ـــــ بہت ہی حسین! منظر ہو، مگر سونے والے کو کیا خبر؟ یہ چشمہ ایک شاداب وادی میں ہچکولے لے رہا تھا۔ بہت ہی سرسبز وادی میں۔ وہ لوگ جو اس سبزہ زار، اس رنگ و بوزار سے لطف اندوز ہونے کے لئے سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے سیر کے لئے نکل پڑتے ہیں خوب جانتے ہیں کہ ہنگام سحر یہ شبستانِ فطرت کس قدر نظر نواز ہوتا ہے۔

آفتاب بلند ہو رہا تھا اور سنہری کرنیں شبنم کے موتیوں میں تابشِ زریں پیدا کر رہی تھیں، پاس کے گاؤں کی دوشیزہ لڑکیاں اور مناظر پرست نوجوان سیر سے فارغ ہو کر لوٹ رہے تھے۔ بے فکر ـــــ دنیا سے آزاد ـــــ نوجوان ابھی تک گہری نیند میں تھا، ایک کہن سال بوڑھے دہقان نے نوجوان کے پاس سے گذرتے ہوئے کہا:۔

"نکما ـــــ اور دنیا کے لئے بیکار، محض بے کار" ـــــ ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد!" جوانی میں مَیں بھی اسی طرح آزاد تھا۔ بیوقوف لڑکے تو بھی میری طرح زمانے کی ٹھوکریں کھائے گا!"

نوجوان اُسی طرح محوِ خواب تھا۔

اب ایک فلاسفر کی باری آئی اور اُسے چشمہ کے کنارے بے فکر سوتے دیکھ کر اُس نے دل ہی دل میں کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ نوعمر لڑکا دنیا کا بہترین فلاسفر ہوگا زندگی اگر نام ہے سکون اور آزادی کا تو وہ اُسے حاصل ہے"

فلاسفر چلا بھی گیا مگر سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا۔

دوشیزہ لڑکیوں کے قہقہے اب قریب سے قریب تر ہو رہے تھے۔

یہ "طوفانِ جمال" اب اُس کے بالیں پر تھا اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔ "اُف کس قدر حسین نوجوان ہے" ایک

دوشیزہ نے کہا جو صبح کا بہترین لباس پہنے ہوئے "حسن کی شہزادی" معلوم ہوتی تھی۔

"غریب لڑکیوں کا دل لینے والے! بیدار ہو جا!" بہت سی لڑکیوں نے ایک ساتھ کہا ایک حسین ترین لڑکی جھکی اور اُس کے کان کے قریب ہو کر بولی "آدمی کے بھیس میں سونے والے کیوپڈ کیا تو میرے سجدوں کا منتظر ہے" کافر جمال لڑکا ابھی تک نیند کے مزے لے رہا تھا ـــــ

ایک شوخ حسینہ نے اپنی پھولوں کی ٹوکری کے سب پھول اُس پر قربان کر دیئے مگر نتیجہ؟ مایوسی! ـــــ

"سرد اور نہایت سرد پانی کے چھینٹے" انتہائی شوخ دوشیزہ نے کہا اور بہت سی لڑکیوں نے چشمہ کا پانی اچھالنا شروع کر دیا۔ مگر سونے والا برابر سوتا رہا۔

مایوس ـــــ ناکام ـــــ محروم ـــــ لڑکیاں غصے میں اپنے لبوں کو دانتوں میں دباتی ہوئی چلی گئیں انہیں افسوس اور انتہائی افسوس تھا کہ ایک جوانی کی نیند سونے والا اُن کی تمام کوششوں کے باوجود نہ جاگ سکا وہ لڑکی جس نے سونے والے کو کیوپڈ قرار دیا تھا کچھ سوچ کر لوٹی اور نوجوان کے پاس پہنچ کر ایک لڑکے اور لڑکی میں محبت پیدا کر دینے والا گیت گانے لگی۔ سونے والے نے ایک انگڑائی لی پاؤں سکیڑے اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا ـــــ اُس نے حُسن کی ملکہ کو دیکھا اور "میری پیاری معشوقہ" کہہ کر اُسے آغوش میں لے لیا۔

حسین لڑکی اُس سے رخصت طلب کر رہی تھی "میری پیاری ملکہ" کل میں یہیں تمہارا منتظر ہونگا ـــ جاؤ ـــ خدا حافظ۔ لاؤ یہ پھولوں کی ٹوکری مجھے دو" اُس نے ایک پھول اُٹھایا ـــــ اور ناک کے قریب لے جا کر بولا۔ "بہت ہی خوشبودار ـــــ پھول ـــــ لو یہ تمہیں نذر کرتا ہوں مگر نیچے اس سے اچھے پھول ہونگے اُس نے ٹوکری کو کریدنا شروع کر دیا ـــــ "سی" کی صورت میں ایک خوفناک آواز اُس کی زبان سے نکلی اور خاموش حسینہ نے گھبرا کر اُس کی خون آلودہ انگلی کو دیکھا اور پھر اُس زہریلے مگر چھوٹے سے سانپ کو جو ٹوکری کے پھولوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے نازک دل کی حرکت بند ہو گئی۔

سانپ! ـــــ اُف سانپ!" اُس کی زبان سے نکلا اور "ابدی خواب" میں سونے والے کے برابر لیٹ گئی۔

روشن صدیقی

پیاری دوستی

خوش نما رنگیں ادا ننھی سی پیاری دوستی
دوستی سی دوستی ہے یہ ہماری دوستی

زندگی معمور ہو جاتی ہے حق کے نُور سے
جب فضائے روح میں ہوتی ہے طاری دوستی

مصلحت نا آشنا راحت سے یکسر بے نیاز
دل کی مجبوری ہے اور بے اختیاری دوستی

جان و دل صاف و سبک ہوتے ہیں دیدِ دوست سے
دردِ فرقت میں مگر دل پر ہے بھاری دوستی

دوست کا ملنا نہ ہو صد حیف اپنے دوست سے
بے قراری دوستی ہے آہ و زاری دوستی

کب وہ دن آئے کہ میرے دل کا بھی غنچہ کھلے
ہے کسی سے مجھ کو بھی بادِ بہاری دوستی

"گلریز"

عمل اور علم

انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اُس کی زندگی تمام کی تمام قلب سے ظہور کرتی ہے اور قلب اُس کی عادات کا مجموعہ ہے جسے وہ پیہم کوشش سے ایک غیر معین حد تک تبدیل کر سکتا ہے؛ اور جس پر وہ کامل غلبہ اور اقتدار حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طریقہ سے وہ کلید اُس کے قبضہ میں آجاتی ہے جس سے نجات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

لیکن زندگی کی مصائب و آفات سے (جو دراصل انسان کے اپنے ہی قلب کی مصائب و آفات ہیں) ایک ایسا معاملہ ہے جو بتدریج نفس سے نشو و نما پاتا ہے اور یکایک کہیں باہر سے اس کا حصول ناممکن ہے۔ ہر گھڑی ہر روز نفس کی تربیت ایسی ہونی چاہئے کہ اُس میں بے لوث خیالات پیدا ہوں اور وہ اُن حالات میں بھی جو انسان کو غلط کاری اور ظلم کی طرف لے جاتے ہیں، راست بازی اور انصاف پسندی کی طرف مائل ہو۔ اُس صابر و شاکر بُت تراش کی طرح جو مجسمہ کے ایک ایک عضو پر پہروں صرف کر دیتا ہے راستی کی زندگی کے طالب کو اپنے نفس کے سنگین مجسمہ پر نہایت صبر و استقلال سے بتدریج کام کرنا چاہئے، یہاں تک کہ وہ اپنے اُس مطمح نظر کو پالے جس کے پاکیزہ اور شیریں خواب وہ دیکھا کرتا تھا۔

اس قسم کے بلند پایہ نتائج حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے سب سے نچلی اور آسان ترین سیڑھی پر قدم رکھا جائے اور بلند اور مشکل مقامات کی طرف باقاعدہ اور بتدریج ترقی کی جائے۔ نشو و ارتقا اور ترقی و فلاح کا یہ قانون کہ آہستہ آہستہ اور درجہ بہ درجہ بام رفعت تک پہنچا جائے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب ہونے کے لئے اپنے اندر ایک قطعیت رکھتا ہے اور جہاں اس قانون، اس دستور العمل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے قطعی ناکامی اس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ علم پڑھنے میں، فن سیکھنے میں یا کوئی تجارت اختیار کرنے میں اس دستور العمل کو پوری طرح تسلیم کیا جاتا ہے اور اس پر نہایت دقت نظر سے عمل کیا جاتا ہے، لیکن نیکی سیکھنے میں، صداقت کا سبق پڑھنے میں اور زندگی کا حقیقی تجربہ اور علم حاصل کرنے میں اسے عموماً بھلا دیا جاتا ہے اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے نیکی، صداقت اور کامل زندگی ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے۔

یہ فرض کر لینا ایک عام غلطی ہے کہ اعلیٰ زندگی محض دینیاتی اور مابعد الطبیعاتی قیاسات کو پڑھ لینے اور اُن پر یقین کر لینے کا معاملہ ہے اور یہ کہ اس طریقہ سے روحانی حقائق سمجھے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ زندگی نام ہے خیالاً، لفظاً اور عملاً اعلیٰ زندگی بسر کرنے کا۔ اور اُن روحانی حقائق کا علم جو انسان میں اور کائنات میں مرکوز ہیں صرف اخلاق فاضلہ کی پیروی

ل کی باقاعدگی سے حاصل ہوتا ہے۔

قبل اس کے کہ زیادہ کو جانا اور سمجھا جائے کم کو کامل طور پر جان اور سمجھ لینا چاہئے، اور یہ ایک کلیہ ہے کہ عمل ہنیہ حقیقی علم پر مقدم ہوتا ہے۔ مدرسہ کا استاد کبھی اپنے شاگردوں کو ابتدا میں ریاضی کے مختصر اور دقیق اصول نہیں بتاتا۔ جانتا ہے کہ اس طریقہ سے پڑھانا بیکار اور پڑھنا ناممکن ہوجائے گا۔ وہ پہلے پہل اُن کے سامنے ایک سادہ اور آسان ل رکھ دیتا ہے اُس کے حل کا طریق انہیں سمجھاتا ہے اور پھر انہیں حل کرنے کو کہتا ہے۔ جب بار بار کی ناکامیوں اور پے کوششوں کے بعد وہ اس کا صحیح جواب نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں ایک اور اس سے مشکل سوال ا ہے اور پھر ایک اور، اور ایک اور۔ یہاں تک کہ جب طالب علم سالہا سال کی مسلسل مشق سے ریاضی کے تمام اسباق عادی ہو جاتے ہیں تو اُس وقت استاد اُنہیں علمِ ریاضی کے وہ حقایق بتاتا ہے جو پہلے اُن سے پوشیدہ تھے۔

اول اول کسی فن کے حاصل کرنے میں مبتدی کو اُس فن کے حقائق و اصول نہیں بتائے جاتے بلکہ ایک معمولی سا اوزار اُس کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اور اُسے اُسکے استعمال کرنے کا صحیح صحیح طریقہ بتاکر کوشش اور مشق کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے روں کو درست طور پر استعمال کرنے لگتا ہے تو پہلے سے زیادہ مشکل کام اُس کو تفویض کئے جاتے ہیں یہاں تک چند سالوں کی یاب مشق کے بعد وہ اس فن کے حقائق کو سمجھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

ایک مہذب خاندان میں پہلے بچے کو فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اُسے یہ بتایا بھی نہیں جاتا کہ وہ ایسا کیوں ے اور ایسا کیوں نہ کرے بلکہ اُسے حکم دیا جاتا ہے اور بہت بعد میں جاکر اُسے علم ہوتا ہے کہ اُسے نیکی اور صداقت کی تعلیم کیوں دی ی تھی۔ کوئی باپ اپنے بچے کو اُس وقت تک اخلاقیات کی غایت نہیں بتائے گا جب تک کہ وہ اُس میں ماں باپ کے لئے اطاعت ور دوسروں کے لئے نیکی کا مادہ پیدا نہ کرے۔

یوں ہی معمولی سے معمولی دنیاوی امور میں بھی عمل ہمیشہ علم پر سبقت رکھتا ہے، اور روحانی امور میں اور اعلیٰ زندگی بسر کرنے میں تو یہ قانون اور ں شدید قطعیت رکھتا ہے نیکی صرف عمل سے مل سکتی ہے اور صداقت کا علم صرف نیکی کے ساتھ اپنے نفس کی تکمیل میں حاصل ہو سکتا ہے وہ شخص جو نیکی کے حصول اور عمل میں کامل ہو گیا اُس نے حقیقت و صداقت کو پالیا۔

صداقت صرف اس طریق سے حاصل ہو سکتی ہے کہ ہر روز اور ہر گھڑی نیکی کے اسباق کا مطالعہ کیا جائے اور آسان ترین اسباق سے روع کرکے بتدریج مشکل اسباق پر عبور حاصل کیا جائے جس طرح ایک بچہ مدرسہ کے اندر نہایت صبر اور اطاعت شعاری سے سبق پڑھتا ہے مسلسل اور متواتر مشق سے تمام مشکلوں اور ناکامیوں پر غالب آ جاتا ہے بالکل اسی طرح صداقت کا علم سیکھنے والا ابتدا ہی بھی ناکامیوں سے بے پروا ہو کر مشکلات سے اپنی طاقت کو بڑھاکر اپنے آپ کو خیال اور عمل کی نیکی میں مصروف کر دیتا ہے اور جب نیکی کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ں کا دل حقیقت اور صداقت کے علم سے معمور ہو جاتا ہے اور یہ وہ علم ہے جس کی موجودگی میں وہ امن و آرام کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

منصور احمد

"ایلین"

محفلِ ادب

جنگلی پھول

اُف یہ رنگینی و دلآویزی — اُف یہ رعنائی وجنوں خیزی
اُف یہ نقش ونگارِ زیبائی — اُف یہ جوشِ بہارِ زیبائی
شوق نے حشر کردیا دل میں — سوز ہی سوز بھر دیا دل میں
اُف مرے اضطراب کا عالم — دل ہے اور ایک لرزشِ پیہم
چاہتا ہوں کہ رازِ حسن کہوں — ہائے مَیں اپنے آپ میں کب ہوں
کیا کہوں تو جہاں میں کیا شے ہے — عقل جاتی رہی مری سے ہے
ایک تصویر تیرا نقشہ ہے — دفترِ حُسن کا خلاصہ ہے
اور بھی پھول ہیں جہاں میں بہت — قدر ہے جن کی گلستاں میں بہت
اُن میں یہ خوبیٔ جمال کہاں — اُن میں یہ شانِ ذوالجلال کہاں
ماند ہے تجھ سے رونقِ گلزار — گرد ہے تیرے آگے رنگِ بہار
پھونک ڈالے دل وجگر میرے — بھر دیئے سینے میں شرر میرے
آہ صبر وقرار کھو بیٹھا — راحتِ زندگی کو رو بیٹھا
ہے عجب کیف لیکن اس غم میں — اڑ رہا ہوں میں اور عالم میں
اب یہی جان کی تمنا ہے — اب یہی روح کا تقاضا ہے
تیرے سائے میں خاک پر بیٹھوں — دین و دنیا سے بے خبر بیٹھوں
اور سجدے میں ہو جبیں میری — تر ہو اشکوں سے آستیں میری

"زمانہ"

تعلیم اور ظرافت

بیچارے معلموں کو اپنے پیشہ کی بدولت جو بیماریاں ہو جایا کرتی ہیں اُن میں دماغ کی خشکی بھی ہے۔ آپ خیال تو کیجیے کہ جو شخص

خود روز دس بجے سے چار بجے تک ناک بھوں چڑھائے آنکھیں نکالے نہی عن المنکر کی صورت بنائے بیٹھا ہے۔ اور آدمیوں کے بچوں کو مولویوں کی طرح "صمم بکم" بنا کر بٹھائے رکھے، جو نہ خود ہنسے نہ دوسروں کو ہنسنے دے اُس کے دماغ کا کیا حال ہوگا علم خشک کی حالت اصل میں زاہد خشک سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ کیونکہ زاہد تو دنیا کی دلچسپیوں کو سائمن کمیشن یا بدیسی کپڑا سمجھ کر سرے سے بائیکاٹ کر چکا ہے لیکن معلم ان دلچسپیوں میں رہنے کے باوجود اُن کا لطف اُٹھانے سے محروم ہے۔

معلم میں ظرافت کی کمی اور متانت کی زیادتی سے خود اُس کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے کہیں زیادہ مضر اثر طالب علموں پر پڑتا ہے۔ بچے اور نوجوان جو گھر کا سکھ چین چھوڑ کر زندگی کے کٹھن سفر کی تیاری کے لئے مدرسے میں آتے ہیں۔ انہیں پہلے ہی قدم پر ایک مجسم مارشل لا سے سابقہ پڑے تو اُن کے دل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ جہاں ڈر بیٹھا تو سمجھئے کہ روح کی بالیدگی اور آزاد نشو و نما رخصت ہوئی۔ یہ عمر کھیل اور کام" سادگی و پرکاری بے خودی و ہوشیاری" کی درمیانی منزل ہے اور ان اضداد کی ترکیب جیسی صحیح ظرافت میں ہوتی ہے اور کسی چیز میں ناممکن ہے۔ اگر اس کا استعمال صحیح اور احتیاط کے ساتھ کیا جائے تو نوجوان زندگی کا بوجھ ہنستے کھیلتے اٹھا لیتے ہیں۔ تعلیم کا یہ اہم ترین مسئلہ باتوں باتوں میں حل ہو جاتا ہے۔

جہاں معلم کے لئے یہ جائز نہیں کہ نوجوانوں کو دنیا کی تصویر ضرورت سے زیادہ مہیب دکھائے وہاں یہ بھی دیانتداری اور احتیاط کے خلاف ہے کہ وہ اُن کے سامنے زندگی کو "خالہ جی کے گھر" کی صورت میں پیش کرے۔ یا کسی نیم سرکاری یونیورسٹی کی شکل میں پیش کرے جہاں انسان اصولِ تقویم کے خلاف دن کو عید رات کو شب برات مناتا ہے اور دین و دنیا کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے۔ ہنسی دل لگی کی زیادتی انسان میں دماغی کاہلی پیدا کرتی ہے۔ وہ زندگی کے اہم مسائل پر غور کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور ہر بات کو مذاق میں ٹالنا چاہتا ہے۔

ظرافت سے پورا تعلیمی فائدہ اُٹھانے کے لئے نیک نیتی بھی ضروری ہے معلم کو اس بات کا پورا احساس ہونا چاہئے کہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی قوت ہے جسے وہ ایمانداری کے ساتھ طلبہ کی بہبود کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہے محض ذاتی جانبداری یا مخالفت کرنے کے لئے یا محض زورِ طبع آزمانے کے واسطے بچوں کو نشانۂ ظرافت بنانا بڑے کمینہ پن کی بات ہے ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اگر معلم ظرافت سے کام لے تو یقین ہے کہ وہ بچوں کے لئے بہترین رہنما اور رفیق ثابت ہوگا۔ خود سوداوی امراض کمیشن کی شہادت اور کونسل کی ممبری سے محفوظ رہے گا اور اپنے دوستوں کے لئے تفننِ طبع کا باعث ہوگا۔

"تعلیم و تربیت"

ماں اور بچہ

ماں نے کہا "ننھے بچے تو میری مسرتوں کا خزانہ ہے۔ تو میرے ارمانوں کا گنجینہ ہے"

بچہ ہنسنے لگا۔ اس طرح جیسے گلستاں کی کلیاں ایک ساتھ چٹک گئی ہوں ۔

"ہاں ماں! پھر کہہ۔ میں کیا ہوں"

"خوبصورت پھول! تو میری روحانی مسرتوں کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ تو قدرت کی بے نظیر دستکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے"

بچہ مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ جیسے یاقوت کی موتیوں سے لبریز، ڈبیا کھل گئی ۔

"ماں پھر کہہ میں کیا ہوں"

"تو میری دنیاوی محبت کا ثمر ہے۔ خدا کا بیش بہا عطیہ ہے" بچہ خفا ہوگیا "میں یہ نہیں جانتا۔ اور کہہ"

"آہ تو معصوم ہے۔ گلِ نو شگفتہ ہے۔ میرے لئے دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ میری خوشیاں تجھ سے وابستہ ہیں۔ تو میری راحت اور سکون کا سامان ہے"

بچہ رونے لگا۔ اُس کے پھول جیسے رخساروں پر گوہرِ اشک ڈھلکنے لگا "میں نہ سنوں گا، مجھے نہیں معلوم"

"میرے لال۔ تو میرا بچہ ہے۔ اللہ نے تیری صورت میری تسکین کے لئے بنائی ہے مجھے کھیلنے کو ایک چلتا پھرتا اور بولتا ہُوا کھلونا دیا ہے"

بچہ زور سے ہنس پڑا "ہاں ماں میں بھی ایسا ہی کھلونا لوں گا"

"بیشک اے معصومیت و نیکی کی تصویر! چند روز بعد تو بھی بہت سے کھلونوں کا مالک ہوگا۔ لیکن میں اُس وقت کیا ہونگی؟ ایک کمر خمیدہ بڑھیا۔ دھوپ جیسے سفید بالوں والی۔ ننھے میں درخت ہوں اور تو ابھی پودا ہے۔ چند روز بعد تو ثمردار شجر ہوگا اور موت میری جڑ اکھاڑ دے گی"

بچہ زور سے اچھل پڑا "ماں موت کیا ہے؟ میں اُسے نہ آنے دوں گا!"

"میرے ننھے سیدھے راستہ پر چل۔ خوش رہ۔ نیکی کر۔ لطف و محبت سے ہر انسان کے ساتھ پیش آ۔ میں پھر نہ مروں گی"

"عصمت"

موسم بہار کے پردہ میں کون ہے؟

موسم بہار آیا، راحت و انبساط کا پیغام لے کر آیا، لوگ موسم بہار کی رنگینیوں کو دیکھ رہے ہیں، میں موسم بہار میں رنگ بھرنے والے کی تلاش میں ہوں، تیتریوں کو یہ خوبصورتی کس نے دی، پھولوں میں یہ رنگ کس نے بھرا غنچوں کو یہ دلکشی کس نے عطا کی، لوگوں کے دلوں میں یہ مسرت کی لہر کس نے دوڑائی،

خوبصورت عورتیں سمندر کے ساحل پر تیتریوں کی طرح رنگ رنگ کا لباس پہنے ہوئے، اپنے دوستوں کے ساتھ موسمِ بہار کا لطف

اٹھا رہی ہیں، لیکن میں موسمِ بہار سے لطف اٹھانے والوں کی امنگوں کا مطالعہ کر رہا ہوں کہ یہ امنگیں کس نے پیدا کیں، اور یہ روح پرور نظارے کس نے عطا کئے،

یہ ایک مخفی طاقت ہے، یہ ایک پوشیدہ قوت ہے، اگر اس قوت کا مشاہدہ کرنے میں ہم کامیاب ہو جائیں تو دنیا کی ساری مسرتیں اور ساری بہاریں ہمیں خزاں نظر آنے لگیں، اور حقیقی اور سچی راحت ہمیں میسر آ جائے۔

اِنسانی زندگی کی رُوح

دولت مند دولت کو راحت سمجھتے ہیں، عیش پرست عیش کو زندگی کی روح بتاتے ہیں، لیکن زندگی کی روح ضمیر کی وہ آواز ہے جو انسان کی ہمیشہ راستی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جب انسان تاریکیوں میں بھٹکتا ہے جب انسان گناہ میں پھنس جاتا ہے، جب انسان اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، جب انسان دیانت کو چھوڑتا ہے تو یہ خاموش آواز اُسے ہدایت کرتی ہے کہ اے تاریکی کی طرف جانے والے سنبھل جا، اے گناہ کی وادی میں تباہ ہونے والے ہوش میں آ، اے اخلاقی جرائم کے مرتکب اپنے فرائض کو پہچان، اے بددیانتی کے تمنائی دیانت کی خوبصورت دیوی تجھ پر لعنت کر رہی ہے بیدار ہو، لیکن جب انسان آواز کی طرف رخ نہیں کرتا تو اُس کی زندگی کی روح مر جاتی ہے،

تمہاری زندگی کی روح تمہارا ضمیر ہے، اگر تم نے اُس کی آواز پر توجہ نہ کی تو تمہارا ہونا نہ ہونا بیکار ہے۔

"طور"

رام کا رتھ

راون کو کل سامانِ جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اُس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا رام کو دوسری طرف دیکھ کر بھبھیکن جیسے راسخ الاعتقاد اور وفادار بھگت کا دل بھی دہل گیا۔ وہ مہاراج رامچندر سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج! فتح کیسے ہوگی؟ ہائے کیا روحانیت اور اخلاقی تہذیب پیروں سے کچلی جانے ہی کے لئے بنی ہے؟ اس موقع پر مہاراج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اُس کے اجزا کی تفصیل اے بھبھیکن سنو۔

بہادری اور استقلال جس رتھ کے پہیے ہیں، مضبوط سچائی اور محبت جس کے جھنڈے اور پھریرے ہیں۔
طاقت، تمیز، نفس کشی اور پر اوپکار، یہ چار گھوڑے عفو، رحم و مساوات کے باگ ڈور سے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں۔
ایشور کا بھجن اُس رتھ کا چلانے والا ہے اُس کی ڈھال بیراگ اور تلوار قناعت ہے۔
فیاضی اُس کا پھرسا اور عقلِ سلیم شکتی بان ہے اور افضل ترین علم اُس کی مضبوط کمان ہے۔
پاک اور مستقل طبیعت جس کا ترکش ہے اور سنجم (اصولِ اخلاقِ ذاتی) اور نیم (اصولِ اخلاقِ تمدنی) سپر ہیں۔
زرہ بکتر سچے برہمن کی خلوصِ دل سے پرستش ہے، اُس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے۔

"نگار"

تبصرہ

اسلامی کہانیاں۔ مرتبہ شیخ عبدالسلام صاحب فضلی بی اے۔ بی ٹی۔ اس کتاب میں تاریخِ اسلام کا خلاصہ نہایت آسان اور دلچسپ پیرایہ میں درج کیا گیا ہے۔ چھوٹے بچوں کو اپنی قومی روایات سے واقف کرانے کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ حجم ۹۰ صفحات اور قیمت آٹھ آنے ہے۔

پھولوں کی ڈالی۔ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب ایڈیٹر رسالہ کائنات نصیحت آمیز، آسان اور سلیس نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ جو ہر مذہب و ملت کے بچوں کے لئے یکساں مفید ہیں۔ حجم ۴۳ صفحے اور قیمت چار آنے ہے۔

جنت کے پھول۔ چھوٹی تقطیع پر سولہ صفحے کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں تبلیغی نظمیں درج کی گئی ہیں جوش عمل پیدا کرنے کے لئے مفید چیز ہے۔ قیمت دو پیسے رکھی گئی ہے۔ تینوں کتابیں مینیجر حالی بک ڈپو پانی پت سے طلب فرمائیے۔

یورپین شعرائے اردو۔ اس کتاب میں انگریزی، فرانسیسی اور پرتگیزی شعرائے اردو کے صحیح مختصر حالات اور اُن کے منتخب اردو کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ اپنی قسم کا پہلا تذکرہ ہے حجم ۸۲ صفحے اور قیمت آٹھ آنے ہے۔

تذکرہ شعرائے اورنگ آباد۔ جب اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اُس نے اورنگ آباد کو اپنا دار حکومت قرار دیا۔ اس سے اورنگ آباد علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور وہاں بڑے بڑے نامور شعرا پیدا ہوئے۔ اس مختصر تذکرے میں اُن کے حالات اور منتخب کلام درج ہے۔ حجم ۴۰ صفحے اور قیمت چھ آنے ہے۔ دونوں کتابیں کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد دکن سے منگائیے۔

بلقیس ۴۸ صفحے کا ایک دردانگیز و نتیجہ خیز افسانہ ہے جس کے مصنف سید محمد رشید الملک صاحب ہیں۔ انداز تحریر موثر اور دلکش ہے۔ قیمت چار آنے ہے مینیجر بلیع آباد گزٹ۔ مقام فتح پور (ہسوہ)

آئینہ حساب حصۂ اول و دوم۔ ان دو کتابوں میں گنتی، پہاڑوں اور پیمانوں کو شکلوں اور نقشوں کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے بچوں کے لئے یہ کتابیں نہایت مفید ہیں۔ ابتدائی حساب کی تعلیم ان میں ایسے طریقہ سے دی ہے کہ نہایت آسانی سے ہر بات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ زین الدین بنگڑی والا۔ دادر مارکٹ ۱۴ بمبئی۔

کامل صابون ساز۔ صابون سازی ایک کارآمد فن ہے۔ اس کتاب میں دیسی انگریزی اور دواوالے صابون بنانے کے سہل اور آسان نسخے لکھے ہیں۔ حجم ۲۴ صفحے ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت پانچ آنے مقرر ہے۔ کامل بک ڈپو لاہور سے مل سکتی ہے۔

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے

۲۔ علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں +

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے +

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے +

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا +

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے +

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ نمونہ ۶/ +

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیے +

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

اُٹھو! دگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
ہمایوں

یادگارِ علامہ فخیۂ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں۔ بی، اے
منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۴ بابت ماہِ اگست ۱۹۲۸ء نمبر ۲

تصویر۔ فرشتے

جہاں نما

شہریارِ افغانستان کی مراجعتِ وطن

تاجدارِ افغانستان اور اُن کی ملکہ سرحدِ پشاور سے لے کر دارالسلطنتِ کابل تک ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ اُس قابلِ یادگار سیاحت سے کامیاب و کامران اپنی قوم اور اپنی رعایا میں واپس پہنچے جو غالباً اُن تمام شاہی سیاحتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو آج تک بادشاہانِ مشرق نے کی ہیں۔

قندھار پہنچنے پر اکتیس توپوں کی سلامی اتاری گئی اور سرکاری طور پر خیر مقدم ہونے سے پہلے شاہِ امان اللہ ایک خانقاہ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔

ایک مختصر سی تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ یورپ اور مشرقِ قریب کی سیاحت سے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان ممالک نے نظم و نسق کے دستور و آئین کو کہاں تک ترقی دی ہے۔ لیکن میں اُس وقت تک ان مشاہدات کو اپنے ملک میں نافذ نہ کروں گا جب تک کہ اُن پر اپنی قوم کے نمائندوں کے ساتھ مل کر بحث و مشورہ نہ کرلوں۔

انہوں نے کہا کہ جن ممالک کی میں نے سیاحت کی ہے وہاں کی قومی زندگی میں جو حصہ عورتیں لے رہی ہیں اُس کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ وہ ترقی کی ہر تحریک میں نمایاں طور پر شریک تھیں۔

اُس لائحہ عمل کا سب سے ضروری جزو جسے امیر اپنے ملک میں نافذ دیکھنا چاہتے ہیں رسل و رسائل کے ذرائع کی اصلاح ہے۔

قندھار سے براہِ ہرات، فرح، جریشں اور شیخ آباد، کابل تک اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت رعایا کے اُس ہجوم کی مسرت و عقیدت کو شرفِ قبولیت بخشتے رہے جو ملک کے کونے کونے سے نکل کر اُن مقامات پر جمع ہوگیا تھا۔

مسرت و شادمانی کے اُن نظاروں کی ایک دھندلی سی تصویر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار خصوصی نے اپنے الفاظ میں کھینچی ہے جن کی نمائش اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت کے ورود پر کابل میں ہوئی:-

میں کابل کے پُر رونق بازاروں میں کھڑا حیرت و استعجاب کے ساتھ افغانستان کے مختلف الہیئت مگر ہم خیال لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو دلی مسرت کے ساتھ اپنے بادشاہ اور ملکہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

شہر کے قدیم اور جدید دونوں حصے پھولوں اور جھنڈیوں سے آراستہ کئے گئے تھے اور ہر شخص کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

لوگوں کے ہجوم میں جو صبح ہی سے آکر اُن مقامات پر جم گئے تھے جہاں سے شاہی جلوس کا گزر ہونے والا تھا تمام ایشیائی قوموں کے افراد موجود تھے: کرد۔ بخاری۔ ایرانی اور یہودی۔

کئی دنوں سے لوگ ملک کے ہر کونے سے جوق در جوق کابل میں آ رہے تھے۔ سنگلاخ اور دشوار گزار کوہستانوں اور سرسبز و شاداب وادیوں میں سے نکل کر حریت و قومیت کے نوزائیدہ جذبات پر لبیک کہتے ہوئے آ رہے تھے۔

تمام رات شہر میں جشن برپا رہا۔ ہر دوکان کا رنگ سبز تھا اور ہر دوکان میں کم از کم بارہ بجلیں لیمپ روشن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج رات کوئی نہیں سویا۔

خوبصورت محرابوں سے جو بازاروں میں اس تقریب پر جگہ جگہ تعمیر کی گئی تھیں بڑے بڑے فانوس لٹک رہے تھے۔ اور لوگوں کے رہنے کے مکانات کی جھنڈیوں اور روشنیوں کی نمائش عجب شانِ تقابل دکھا رہی تھی۔

شہر کی آرائش و زیبائش کے لئے ایک فنڈ کھول دیا گیا تھا جس میں لوگوں نے نہایت فراخ دلی سے چندہ دیا۔ اسی لئے تقریباً ہر شہری یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس جشن میں اُس کا بھی ایک حصہ ہے۔

بادشاہ اور ملکہ کے آنے سے بہت پہلے پولیس زرق برق وردیاں پہن کر جلوس کے گزرنے کے راستوں میں اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی تھی۔

آخر صبح دس بجے طیاروں کی پرواز کا شور سنائی دیا اور پھر آسمان کی صاف اور روشن فضا میں چھ طیارے اڑتے نظر آئے۔ یہ لوگوں کے جذبات کو گرمانے کے لئے ایک اشارہ تھا جس سے نعرہ ہائے مسرت کی ایک لہر اُٹھی اور شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچ گئی۔

بادشاہ اور ملکہ ایک خوبصورت اور مصفا رولس رائس گاڑی میں بیٹھ کر جس کا رنگ ہلکا سفید تھا شہر میں داخل ہوئے سواروں کے محافظ دستے نے گاڑی کو گھیر رکھا تھا اور اُن کے اسلحہ کی آوازا اور وردیوں کے گوناگوں رنگ عجب کیفیت پیدا کر رہے تھے، جلوس مشرق و مغرب کے فرق کو نمایاں کر رہا تھا۔

اعلیٰحضرت اور علیاحضرت جن کے دلوں میں مشرق و مغرب کی کئی ایک دارالسلطنتوں کے استقبالوں کی یاد ابھی تازہ تھی ان نظاروں کو دیکھ دیکھ کر اُس دلی مسرت سے مسکرا رہے تھے جو وطن میں پہنچ کر پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں نے اس قدر پھول برسائے کہ موٹر کار اُن میں تقریباً چھپ گئی۔

اعلیٰحضرت کھڑے ہو گئے اور انہوں نے رعایا کے اظہارِ عقیدت کا شکریہ ادا کیا۔ ملکہ کے چہرے پر نیلے رنگ کا ایک ہلکا

سانقاب تھا اور وہ جھک جھک کر لوگوں کے سلام قبول فرما رہی تھیں۔

پھر جلوس قصرِ دلکشا کی طرف روانہ ہوگیا جہاں ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ یہاں خیر مقدم کے طور پر نائب السلطنت نے ایک سپاس نامہ پڑھا۔ اسی شام قصرِ دلکشا میں ایک شاندار سرکاری ضیافت کا بھی انتظام کیا گیا۔

جشن تین روز تک جاری رہیں گے۔ اسی اثنا میں ملکہ ثریا خانم کا خیر مقدم خواتینِ کابل کی طرف سے ہوگا۔ آج وہ قصرِ علیا میں ایک ضیافت پر مدعو ہیں۔ اور کل شام کابل کے مدرسۂ نسواں کی طالبات اُن کو ایک جلسہ دیں گی۔

اخباروں کی جنگ

فلیٹ سٹریٹ آج کل میدانِ کارزار بنی ہوئی ہے اور ایک دلچسپ اور پُر لطف جنگ وہاں جاری ہے۔ "ڈیلی میل" اور "ڈیلی اکسپرس" انگلستان کی صحافتِ عامہ کے دو سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ ان دونوں اخباروں کے درمیان روزانہ اشاعت اشتہارات کی آمدنی اور مستقل خریداروں کے لئے مفت انشورنس کے انتظامات کے رقیبانہ دعاوی پر ایک زبردست جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اول الذکر نے اپنے صفحات میں ایک تصدیق شائع کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی روزانہ فروخت ۱۹۱۹۵۷۰ ہے اور آخر الذکر کی تعداد اشاعت ۱۳۴۵۳۷۱ تصدیق ہوئی ہے۔

ایک تیسرا اخبار "مارننگ پوسٹ" بھی شریکِ جنگ ہوگیا ہے اور ظاہرا طور پر اس وقت "میل" کے خلاف "اکسپرس" کا ساتھ دے رہا ہے جیسا کہ اس اخبار کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے حالات نے نہایت شدید صورت اختیار کرلی ہے:

"ڈیلی میل" اُس جھگڑالو اور اُس کرٹا بازروزانہ اخبار نے کل کی اشاعت میں ایک افتتاحیہ لکھا ہے جس میں اُس نے اشتہار دینے والوں اور اشتہارات کے ایجنٹوں کو اپنا کاروبار چلانے کا ایک نیا سبق دیا ہے۔ یہ سبق بڑا آسان ہے، اُس نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے تمام ذرائعِ اشتہارات کو یک قلم ترک کر کے "ڈیلی میل" میں اشتہار دینا شروع کردیں۔ اسی مضمون کے دوران میں "مارننگ پوسٹ" پر بھی ایک حملہ کیا گیا تھا جس کا جواب دینے کا ہم یہاں ارادہ رکھتے ہیں۔

"مارننگ پوسٹ" ایک اعلیٰ درجہ کا اخبار ہے جس کا سرپرست صرف قوم کا تعلیم یافتہ اور عالی دماغ طبقہ ہے "ڈیلی میل" کی طرح اُس کی زندگی کا مدار انشورنس اور کوپن کے ٹکڑوں پر نہیں ہے۔

"مارننگ پوسٹ" اپنی ترقی پر نازاں ہے۔ وہ ہر مہینے اپنے مشتہرین کو اخبار کی اشاعت سے مطلع کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے خبروں کے کالموں کو اشتہارات کی مقدار کے ماتحت نہیں رکھتا۔

"ڈیلی میل" اخبار کے ایک اندرونی صفحہ کے لئے نو سو پونڈ وصول کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں "ڈیلی اکسپریس" چھ سو پچیس پونڈ لیتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۲ء سے اب تک ڈیلی میل کی اشاعت بقدر ۹۴۵۹ پرچوں کے بڑھی مگر "ڈیلی اکسپرس" کی اشاعت میں اسی عرصہ

کے اندر ۸۱۹۰۸۷ کا اضافہ ہوا۔ اگر اسی شرح سے ترقی جاری رہی تو بہت جلد اُس کی اشاعت "ڈیلی میل" سے اگر بڑھ نہ گئی نہیں تو اُس کے برابر ضرور ہو جائے گی۔

بچّوں کے لئے ورزش گاہیں

جرمنی کے ایک سابق فوجی افسر میجر نیومین نیورو ڈ نے برلن میں ایک نئی قسم کی ورزش گاہیں جاری کر رکھی ہیں۔ نیویارک کا ہفتہ وار اخبار "سائنس" لکھتا ہے کہ یہ ورزش گاہیں صرف اُن بچوں کے لئے مخصوص ہیں جن کی عمر یں ایک سال سے متجاوز نہیں ہوئیں۔

بچّوں کو اُن کی انائیں ورزش کا لباس پہنا کر یہاں لے آتی ہیں۔ یہ لباس بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ بچّوں کو مخمل سے منڈھی ہوئی میزوں پر لٹا دیا جاتا ہے اور انہیں ورزش شروع کرائی جاتی ہے۔ ہر بچّے کو میجر موصوف کا ایک ایک تربیت یافتہ مددگار ورزش کراتا ہے۔ ورزش کرانے والا بچے کے بازوؤں یا ٹانگوں کو پکڑ لیتا ہے اور میجر کے احکام پر اُن کو اسی طرح حرکت دیتا ہے جس طرح بڑی ورزش گاہوں کے لڑکے اپنے آپ ورزش کرتے ہیں۔ ان مشقوں کو جو اب عام بچوں کو کرائی جا رہی ہیں سب سے پہلے میجر نیومین نیورو ڈ نے خود اپنے بچّوں پر آزمایا تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ مشقیں تمام بچّوں کے لئے مفید ہیں اور پانچ مہینے کی عمر سے شروع کی جا سکتی ہیں۔

جرمنی کے مدرسوں میں تقریباً ایک چوتھائی تعداد اُن طلبا کی ہے جن کی نخاع میں کم و بیش کوئی اہم نقص موجود ہے۔ میجر موصوف کی رائے میں اُس کا علاج و انسداد صرف بچپن کی ورزشوں سے ہو سکتا ہے۔ یہ مشقیں اُن بچوں کیلئے مفید بھی سمجھی گئی ہیں جنہیں اعصاب کی بیماری ہو یا پیدائش کے وقت جن کے سر کو صدمہ پہنچا ہو۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جسے اب اطبا غیر معمولی نہیں سمجھتے۔

رنگ اور نیند

میونچ کی مجلسِ تحقیقاتِ نور نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ رنگ اور نیند میں باہم ایک رشتہ اور تعلق ہے۔ یہ تحقیقات اُن لوگوں کے لئے ضرور دلچسپی کا موجب ہوگی جو بے خوابی کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ اور یہ یوں بھی ایک عجیب بات ہے کہ نیند لانے میں بعض مخصوص رنگ حیرت انگیز طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ شیشوں پر نقاشی کرنے والے جب نیلگوں آسمانی رنگ کو استعمال کرنے لگے تو اُن کو وہیں نیند آگئی اور وہ سو گئے۔ دماغ کے مریضوں کے لئے پہلے بھی اطبا نیلی دیواروں اور نیلے پردوں والے کمرے کی اقامت تجویز کیا کرتے تھے، کیونکہ تسکین اور آرام دینے میں نیلا رنگ غیر معمولی طور پر موثر ثابت ہوا ہے۔

فرشتے

کیا تمہارے لئے اتنا کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار آسمان سے تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کرے ـــــ قرآن مجید

خدا نے فرشتوں کو اپنا قاصد بنایا جن کے دو دو تین تین اور چار چار پر ہیں۔ وہ اپنی مخلوقات کی بناوٹ میں جو چیز چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے ـــــ قرآن مجید

فرشتے وہی کرتے ہیں جس کا اُن کو خدا کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے ـــــ قرآن مجید

ہم فرشتوں جیسے کبھی نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہمارے جذبات نہ مٹ جائیں ـــــ ڈیکر

اس تیرہ خاکدان میں جہاں ہر وقت افکار کے بادل چھائے رہتے ہیں ہمیں علم بھی نہیں ہوتا اور فرشتے چپکے چپکے ہمارے ساتھ ہوتے ہیں ہماری آنکھیں اُن کے سفید سفید پروں کو آسمانوں میں اُڑتا ہوا دیکھتی ہیں اور حیران رہ جاتی ہیں ـــــ میسی

وہ خاموشی کے پروں پر کس خوش آئند ادا سے رات کے خالی گنبد میں تیرتے رہے اور جھک جھک کر لیلائے شب کو گدگدی کرتے رہے یہاں تک کہ آخر وہ مسکرا پڑی ـــــ ملٹن

اگر تم بیداری میں فرشتوں کی مصاحبت کی خواہش رکھتے ہو تو وہ ضرور خواب میں تمہارے پاس آئیں گے ـــــ پرنٹس

احمق لوگ وہاں تک بڑھے چلے جاتے ہیں، جہاں فرشتے بھی پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں ـــــ پوپ

منصور احمدؐ

تاریخِ دنیا پر ایک نظر

روما اور زمانۂ وسطیٰ

۱۸

مسیحی کلیسا

انجیل کے لئے تیاری۔ سلطنتِ روما کی شان و شوکت پر مسیحی کلیسا کی فتح کو عیسائی مورخین دنیا کی تاریخ کے حیرت انگیز واقعات میں شمار کرتے ہیں۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ یہ ہے خاص مثال اُس طریقے کی جس سے اِس دنیا کی کمزور چیزیں قوی چیزوں پر غلبہ پا لیتی ہیں جس سے ایک پتھر کا ٹکڑا جسے معمار شروع میں ردی کر کے پھینک دے آخر کار عمارت میں نمایاں ترین جگہ پا لیتا ہے۔ لیکن مسیحیت کی فتح کچھ ایسا لاینحل معما بھی نہیں۔ اُس شدید جہد للبقا کے جو نوعِ انسان میں مسیحی سن سے پہلے تک جاری رہی دو نتیجے ہوئے۔ ایک طرف تو چونکہ افراد محافظت اور تسخیر و مخاصمت کی غرض سے معاشرتی حلقوں اور ملتوں میں جمع ہو گئے تھے اِس لئے اب یہ جنگ پہلے سے زیادہ تیز اور خوفناک ہو گئی۔ لیکن دوسری طرف اِن حلقوں کے اندر ایک نئے انداز کی معاشرتی اور شہری خوبیاں پیدا ہوئیں جو حقیقی تعاون کے لئے لابدی تھیں مثلاً فرماں برداری دیانت داری اور ایثار۔ ایمان امید اور محبت جنگی سلسلے کے پہلو بہ پہلو اُسی ایک سرچشمہ سے اخلاقی سلسلہ بھی رونما ہو گیا۔ اب صرف اتنی ضرورت باقی تھی کہ اِن نئے اخلاقی خیالات کی عام طور پر ترویج کر دی جائے اور عیسائیوں کے قول کے مطابق خدا کی "ابویت" اور انسان کی اخوت کی صورت میں چار دانگِ عالم میں اُن کا اعلان کیا جائے۔

اِس اعلان سے پہلے کم از کم مغربی دنیا کا دل و دماغ ایسے خیالات سے محض بے بہرہ تھا۔ بدھ نے تقریباً اسی قسم کا اعلان کیا تھا لیکن مختلف وجوہ سے اُس کے خیالات مغرب تک نہ پہنچ سکے۔ آخری عبرانی پیغمبروں نے اس کے لئے رستہ صاف کیا تھا لیکن انہوں نے ایسے لوگوں کو تلقین کی تھی جو ایک تنگ و تار قومیت میں مقید تھے۔ بس

عیسوی سے تین صدیاں پہلے جو مذاہب (مثلاً سبل اسنارت آئیسس اور مترس کے ادیان) ایشیائے کوچک شام مصر اور ایران میں رائج ہوئے وہ تمام عالمگیر مذاہب تھے۔ تمام کی بنا اخوتِ انسانی تھی اور تمام ایک حد تک بااخلاق تھے۔ نیز وہ تمام فلسفے جو عین اسی وقت میں ایرانی حکمت اور مشرقی تصوّف کے امتزاج سے پیدا ہوئے مثلاً زینو کی رواقیت اور پوسی ڈونیس کی انتخابیت (Eclecticism) اُن سب میں عالمگیری کا جذبہ ایک ہمہ گیر بابرکت قانونِ فطرت کا یقین اور ضابطہ کی پابندی و ادائے فرض کا گہرا اخلاقی خیال مرکوز تھا۔ یہ گویا مسیحیت کی تیاریاں تھیں مسیحیت انہی کے اثرات میں پیدا ہوئی۔

لیکن عیسائیوں کا دعوےٰ ہے کہ دنیا کے لئے امن و محبت کا سچا پیغام لانے والے اُسے صحت و صراحت کے ساتھ بیان کرنے والے حضرت عیسیٰ اور اُن کے حواری پال ساکن ٹارسس تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہی نے پہلے پہل انسانیت کو روحانی جدوجہد اور خودی سے نجات دلائی انہیں نے نجات یافتہ انسانیت کو ایک جنتی کی بشارت دی اور انہی نے دنیا میں پہلی بار انسان اور خدائے رحیم کے درمیان ہم کلامی کی راہ دکھائی۔

کفرِ روما۔ روما کی سلطنت جس میں پہلے پہل انجیل کی اشاعت کی گئی مختلف وجوہ سے اس پیغام کے سننے کے لئے تیار تھی۔ ایک تو اہلِ روما تمام جسمانی لذات سے جو بے پایاں طاقت اور بے شمار دولت سے حاصل کی جاسکتی تھیں جی بھر کے لطف اُٹھا چکے تھے اور دیکھ چکے تھے کہ یہ چیزیں آتی جاتی ہیں اِن کا لطف تکلیف کا اور اُن کی مستی بیزاری کا پیش خیمہ ہے۔ جسمانی لذتوں کو دیکھ بھال کر اب وہ خوشی کو اُس نئے طریقے سے حاصل کرنا چاہتے تھے جو پاکیزگی اور جاں نثاری ہم جنسوں کی خدمت اور خدا کی ریاضت کی راہ تھی۔ دوسرے روما کی فہم و ذکا جو یونانی علم و حکمت اور ایشیائی تخیل سے تیز تر ہو چکی تھی اب پرانے دیوتاؤں جو پیٹرا پیولو مارز وغیرہ کی پرستش سے اپنے آباؤ اجداد کی طرح تسکین نہ پاسکتی تھی۔ پرانے دیوتاؤں کی پرستش محض سیاسی تھی۔ حکومت کا ایک شعبہ ضروری رسومات اور قربانیوں کے ذریعہ سے دولتِ روما اور آسمانی طاقتوں کے مابین اچھے تعلقات قائم رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ پونٹی فیکس میکسی مس (امامِ اعظم) کے عہدے پر کوئی مذہبی نمائندہ مامور نہ تھا بلکہ ایک سیاسی مدبر۔ مذہب عہدنامہ کی قسم کا ایک تمسک تھا جس کی رو سے اُدھر مناسب رسومات اور اِدھر حسنِ سلوک ہونا ضروری قرار پایا۔ ایک موقع پر اربابِ حکومت نے سمجھا کہ نپٹیون (جس نے ایک جہاز تباہ کر دیا تھا) اپنے قول و قرار پر قائم نہیں رہا تو انہوں نے کھلے طور پر ایک عام جلسے میں جہاں اُن کے بت کو جگہ دی جاتی اُسے شامل نہ کیا۔

قدیم رومیوں کو ایک ذاتی یا اخلاقی مذہب کی ضرورت کا سرے سے احساس ہی نہ تھا۔ اُن کی عبادت و

توجہ کا مطمح فقط اُن کا شہر روما تھا جس کے لئے وہ اپنی جانیں نثار کرنے کو ہمیشہ تیار تھے۔ اُن کو پروا نہ تھی کہ انہیں دنیا میں اس کا کچھ انعام ملے یا مر کر وہ پھر جئیں یا نہ جئیں۔ لیکن اُن کی اولاد کے دل کی یہ حالت نہ رہی۔ اُن کے خلف گناہ کا احساس کرنے لگے۔ نجات کا ذریعہ ڈھونڈنے لگے۔ طاقتِ ربانی تک پہنچ سکنے کی راہ تلاش کرنے لگے۔ انہیں بقا کی دھن لگ گئی۔ وہ بقا جس کی رنگ آمیزیوں نے مشرقی مذاہب کو اس قدر دل آویز بنا دیا تھا۔ فرجی سبل کی پوجا ۲۰۴ ق م ہی میں روما میں رائج ہو گئی تھی۔ سُلا کے وقت میں مصری خدا آئیسس کی پُر شکوہ رسوم جاری کی گئیں۔ اور پومپے کے زمانے میں ایرانی مترس (شمس پرست) کا مذہب اس قدر مقبول ہوا کہ عجب نہ تھا کہ یہی مذہب ساری روما کی سلطنت میں پھیل جاتا۔

مسیحی زمانے کے آغاز کے ساتھ رومی کفر میں دو تازہ تحریکیں شروع ہوئیں اول مدبرین کی کوشش کہ روما کی پوجا کو شاہنشاہی شخصیت کی پرستش بنا کر پھر رائج کریں اس مذہب سے دولت روما کی یکسانیت کا اظہار اور تمام مذاہب کے پیروؤں کو ایک رشتے میں منسلک کرنا مقصود تھا۔ دوسرے فلسفیوں نے کوشش کی کہ سلطنت روما کے بے شمار مذاہب کی غیر مطابق وثنیات کو یہ کہہ کر عقل کی لڑی میں پرو دیں کہ یہ سب ایک ہی ربانی حقیقت کے مظاہر ہیں۔

مسیحیت کا طلوع و کمال۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ مسیحیت کو جو لڑائی اپنی زندگی کی پہلی تین صدیوں میں لڑنی پڑی وہ پرانے دیوتاؤں کے پیروؤں کے خلاف نہ تھی بلکہ اُن سیاسی مدبروں کے خلاف تھی جو شاہنشاہ کی ربانیت کا صریح اقرار چاہتے تھے اور اُن فلسفیوں کے خلاف تھی جو سارے کے سارے پرانے کفر کو نئی افلاطونیت کا لباس پہنا کر برقرار رکھنا اور از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے تھے۔

روما کی حکومت مذہب کے معاملے میں نہایت روادار تھی۔ اس کی وسیع سلطنت میں جتنے مختلف مذاہب تھے وہ سب چین سے جس طرح چاہتے تھے اپنی رسوم ادا کرتے تھے۔ مسیحیت کی طرف بھی پہلے حکومت کا رویہ عنایت آمیز رواداری کا تھا۔ بظاہر وہ صرف یہودیت کی جو عبرانی محکوموں کا قومی مذہب تھا ایک وہمی سی شکل معلوم ہوتی تھی اور یہی (ہرنشا کے قول کے مطابق) مسیحیت تھی بھی۔ ابتدائی پیروؤں کے لئے حضرتِ عیسیٰ فقط مسیح موعود تھے جن کا کام بنی اسرائیل کی نجات اور خوشحالی تھا۔ ایک عیسائی مورخ کہتا ہے کہ یہ صرف پال ٹارسس کے باشندے کا (جس کی تربیت مشرق و مغرب کی جائے اقبال سیلیسیا میں ہوئی)، روحانی وجدان اور مذہبی بالغ نظری تھی جس نے یہ بات تاڑلی کہ حضرتِ عیسیٰ نہ صرف یہودی شریعت کی تکمیل اور عبرانی پیشگوئیوں کی صداقت کے لئے آئے بلکہ غیر یہودیوں

کو اس خدا کی راہ دکھانے کے لئے وارد ہوئے جس کی مدتوں سے وہ اپنی وثنیات میں عبث تلاش کرتے آئے انہوں نے بجائے فلسفیوں کے نظریات کے مذہب کو اُن کے سامنے اپنے ربانی الہام کے قابلِ وثوق دعوے کے ساتھ نئے لباس میں پیش کیا۔

وہ مسیحیت جسے پال نے روما کی لاطینی یونانی اور ایشیائی سلطنت کے سامنے پیش کیا محض یہودیت مشرقی غیبی علوم کا سا مذہب نہ تھا۔ بلکہ اُس کا دعوے تھا کہ مسیحیت اُن سب کو منسوخ کر کے اُن سب کی جگہ کے لئے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اُس نے اپنے پیرووں کو شاہنشاہ کی قربان گاہ پر بخورات جلانے سے منع کیا۔ اُس نے پارتھینون (معبدِ ایتھنز) کے دیوتاؤں کو شیطانوں کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کافر حلقے میں اس طرزِ عمل پر تشویش اور غصہ پیدا ہوا اور آخرکار عیسائیوں پر کھلم کھلا تشدد ہونے لگا۔ یہ تشدد زیادہ ہوگیا جب عیسائیوں نے ایک "کافر" حکومت کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا اور سلطنتِ روما کے اصول و معاشرت سے الگ تھلگ ہو کر اپنے آپ کو گرجاؤں کے حلقوں میں منتظم کرنا شروع کر دیا۔ دو صدیوں تک یہ عناد مسیحی کلیسا اور "کافر" سلطنت کے درمیان بڑھتا گیا یہاں تک کہ آخرکار ۲۴۹ء تا ۳۱۱ء کے عام تشدد کی مہلک کشمکش صورت پذیر ہوئی۔ دراصل یہ دو مخالف و مختلف طرزِ خیال و معاشرت کا معرکہ تھا۔ ڈیسیئس سے لے کر ڈایوکلیشین تک سارے شاہنشاہوں نے جتنی قوت کہ بس میں تھی صرف کر دی کہ ایک ایسی منتظم جماعت کو جو شاہنشاہی یکسانیت اور حاکمانہ اقتدار کا قلع قمع کر رہی ہے برباد کر دیں۔ ڈیسیئس نے کہا کہ "ہمیں ایک حریف سیزر کا وجود منظور ہے لیکن روما کے اسقف کا وجود منظور نہیں"۔ لیکن وہ طاقت جو اسقفِ موصوف کی پشت پناہ تھی مطلق العنان شاہنشاہ کی طاقت سے بھی زیادہ طاقتور نکلی۔ تشدد ناکام رہا اور جیسا ہم دیکھ چکے ہیں ڈایوکلیشین کے جانشین نے اس کامران مذہبی انجمن سے اتحاد کر لیا۔

کلیسا کی کامرانی ٹیکٹینیٹس اور سینٹ آگسٹائن کے زمانے سے گبن ملمین لیکی اور دوسرے وقت تک مختلف الرائے مورخین نے سلطنتِ روما کے خلاف کلیسا کی کامرانی کے مختلف اسباب گنوائے ہیں جو دنیا کے لئے یہ سب چار قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ مذہبی اخلاقی نفسیاتی اور سیاسی۔

پہلا اور سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مسیحیت نے اپنے تمام حریف مذاہب کے مقابل میں اہلِ مغرب کے مذہبی احساس کو سب سے زیادہ مطمئن کیا۔ مسیحی مورخین کا دعوے ہے کہ اُس کی وحدانیت زیادہ بلند اور زیادہ پاک تھی۔ اُس کی ربانی ابوبیت کا نظریہ مثریت (شمس پرستی) اور دیگر ادیان کے مقابل میں خدا و انسان کے تعلق کی ایک نہایت دلکش شکل تھی۔ اُس کے اعتقاد نے کہ خدا کا بیٹا دنیا میں مجسم بن کر آیا زمین و آسمان میں ایک مضبوط رشتہ

دیا جس سے نجات کا یقین اور ذاتی بقا کی امید استوار ہوگئی۔ روح القدس کے متعلق اس کے اعلان سے کہ ایمان لانے والے کی روح کو اپنا مسکن بناتی ہے زندگی کو ایک اعلیٰ مرتبہ ملا اور انسان کو موت پر ایسا اختیار مل ہوگیا جو کسی اور ذریعے سے نہ ہوسکتا تھا۔

دوسرے عیسائیت کا اخلاقی معیار تمام دوسرے معروف مذاہب کے معیار سے زیادہ بلند تھا۔ روما کے دیوتا غیر اخلاقی تھے۔ تمام مشرقی مذاہب جن کا اہلِ مغرب کو علم تھا ان کے اخلاق یا غیر مکمل تھے یا نہایت پست میں بہترین متربیت تھا جس میں دلیری دیانت اور وفاداری کی فوجی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ کسی عیسائیت کی طرح عصمت، انکسار، برادرانہ ملاطفت اور محبت کی سی دل گداز نیکیوں کی اشاعت نہ کی تھی۔ ی نے زندگی کے زخم پر نیک کاموں کا ایسا تسکین دہ مرہم نہ لگایا تھا۔

تیسرے عیسائیت نے دنیا کے سامنے اپنے بانی کی شخصیت میں اپنے بلند پایہ اخلاق کا بہترین نمونہ پیش یا۔ اس کا دعوےٰ تھا کہ مسیح پر ایمان لانے سے بڑے سے بڑا آدمی وہاں تک مرتبے کو پہنچ سکتا ہے۔ غالباً روما زوال آمادہ سلطنت کی گناہ آلود معاشرت پر سب سے زیادہ اثر ان نجات دینے والے معجزوں کا ہوا جو مسیح کے نام پر کئے گئے۔ پینٹی کوسٹ ڈے یوم روح القدس کی طرح کے روحانی کایا پلٹ کے نظاروں سے لوگوں ل غائت درجہ متاثر ہوئے۔

آخری سبب یہ ہوا کہ عیسائیوں کے گروہ کے گروہ اپنے اسقفوں اور پادریوں کے تحت میں گرجاؤں میں یکجا ہوئے اور اسقف اور پادری اپنے صدر اسقفوں اور سر اسقفوں کے زیر فرمان کام کرتے تھے۔ اس سے ایک نہایت منظم اور زبردست کلیسائی قلمرو یعنی روما کی سلطنت کے اندر ایک عظیم الشان خود مختار اجنبی اور مخالف مذہبی انجمن قائم ہوگئی۔ روما کا مذہبی تشدد پہلے پہل اسقفوں کے خلاف ہوا ان چھوٹی چھوٹی مخفی انجمنوں کے صدر تھے عمل میں

۱۹

شمالئے اور خانہ بدوش

شمالیوں کے حملے گبن اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "زوال و ہبوطِ سلطنتِ روما" [illegible] لکھتا ہے کہ سلطنتِ روما کے زوال کا اولین سبب مذہبی پادری اور وحشی تھے۔ مزید [illegible] کرتے ہوئے کہ اس کے

علاوہ دوسرے زیادہ اہم سیاسی معاشرتی اخلاقی اور معاشی اسباب بھی تھے تسلیم کرتا ہے کہ ادھر مسیحی کلیسا نے فی الحقیقت اندر سے "کافر" سلطنت کو کھوکھلا کر دیا اُدھر شمالی وحشی باہر سے حملہ کر کے اُس کے علاقے میں گھس آئے + لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ عیسائیوں اور شمالی قوموں نے صرف تباہی و بربادی کا کام کیا + اگر انہوں نے ایک سلطنت کو جو اپنا مدعا پورا کر چکی تھی تباہ کیا اور ایک تمدن جو ناکارہ اور ذلیل ہوگیا تھا برباد کر دیا تو اُن کے کھنڈروں پر انہوں نے ایک نئی دنیا بھی تعمیر کر دی +

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسیح کے زمانے سے دو ہزار سال قبل تک شمالی یورپ کے جنگلوں اور چراگاہوں سے کس طرح حملہ آوروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جنوب کے روشن و زندہ تمدنوں پر چھاپے مارتے رہے + میدی اور ایرانی پارتھی اور ارمنی یونانی اور لاطینی باری باری آئے اور عراق سے لے کر بحرِ متوسط کے سارے علاقے میں جا بجا بس گئے + ان کے بعد کلتی زبان بولنے والے لوگ آئے "گال" اطالیہ پر چوتھی صدی ق م میں چڑھ آئے - انہوں نے اٹرسکی طاقت کو توڑ دیا روما کو ۳۹۰ ق م میں تہ و بالا کیا اور آخر وہ ایلپس اور ایپی نائین کے کوہستانوں کے مابین اس علاقے میں بس گئے جس کا نام اسی وجہ سے "ایلپس سے ورے کا گال" پڑ گیا + بعد کی صدی میں اسی نسل کے "گالیسیوں" نے اناطولی سرزمین پر اپنی بستی قائم کر دی +

سنِ عیسوی سے ایک صدی قبل سمبری اور ٹیوٹن قومیں جنوبی ملکوں کی طرف بڑھیں - یہ شمالی حملہ آوروں کی پہلی جماعت تھی جو جرمنی کے جنگلوں بحیرۂ بالٹک کے ساحلوں اور سکینڈینیویا کی دُور دراز بنجر زمینوں کی رہنے والی تھی - جب اہلِ روما کو ان وحشیوں کے مقابل پے در پے شکستیں ہوئیں تو انہوں نے اپنی سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لئے (۱۰۲ تا ۱۰۱ ق م میں) اپنی ساری مساعی صرف کر دیں - آخری صدی ق م میں یہی شمالی خطرہ تھا جس سے ڈر کر روما نے "ایلپس کے پرے کے گال" پر قبضہ جمایا اور دریائے رائین کی سرحد کو مضبوط کیا + جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں آگسٹس نے کوشش کی کہ وہ رائین اور ایلب کے درمیانی علاقے کو ملحق کر کے اس خطرے کو دور کر دے لیکن ناکام رہا (سنہ ۹ء) + غرض شمالی خطرہ قائم رہا اور روز بروز بڑھتا گیا اور بعد کے شاہنشاہوں سے صرف یہی ہو سکا کہ ادھر محافظت کے سامان کرتے رہیں اور اُدھر کبھی کبھی گوشمالی کے لئے غنیم کے علاقے میں مہمیں بھیجتے رہیں +

نئی قومیں - یہ شمالی لوگ جو پہلی تین عیسوی صدیوں میں روما کی سلطنت کے افق پر ایک ابرِ سیاہ کی طرح چھائے رہے دو بڑی شاخوں میں منقسم تھے + ایک تو ٹیوٹانی شاخ تھی جس کے فرنیکوں اور المانیوں کے جتھے رائین کے پار قائم تھے سیکسن گوپز اور ایلب دریاؤں کے آخری حصے میں آباد تھے اور بوبارڈ اور برگنڈی قومیں ایلب اور وسچولا کے

دریاؤں کے مابین دوسری گاتھی شاخ تھی جس کا وطنِ مالوف غالباً سکینڈ نیویا تھا ۔ نارس سویڈ ڈین جوٹ کے علاوہ جو بالٹک کے ساحلوں پر آباد رہے اس میں وہ گاتھ جیپڈی اور وینڈل شامل تھے جو مدتوں دور دور تک گھومتے رہے اور عیسوی سن کے شروع میں وہ ڈنیوب اور بحیرۂ اسود کے اُن مقامات پر پہنچ گئے جو سلطنتِ روما کی آخری سرحد تھی ۔ انہی لوگوں کی یورشوں کو روکنے کے لئے ڈایوکلیشین نے نکومیڈیا کو اور قسطنطین نے جدید روما کو اپنا دارالسلطنت بنایا ۔ تیسری صدی عیسوی میں بلقان اور ایشیا میں ان لوگوں کے حملے غائت درجہ تباہ کن ثابت ہوئے ۔

یہ نئے حملہ آور ایک عظیم الشان جنگی نسل سے تھے ۔ اُن کا قد لانبا بال ہلکے رنگ کے اور سر لمبوترے تھے ۔ اُن میں آزادی کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔ اُن کی فطرت میں انفرادیت کا جذبہ بہ درجۂ اتم موجود تھا ۔ وہ انتہا درجہ محنت کش اور تیز فہم بھی تھے ۔ اُن کا معاشرتی اور سیاسی نظام جمہوری رنگ کا تھا اور اُن کے ہاں اداراتِ نیابیہ بھی موجود تھے ۔ بمقابلہ رومیوں اور کلتیوں کے وہ پادریوں کے دباؤ کو زیادہ برداشت نہ کر سکتے تھے ۔ اُن کی خانگی زندگی پُرجوش اور مقابلتہً پاکیزہ تھی ۔

روما کی حدود پر حملے کرنے سے بہت پہلے اُن پر بحرِ متوسط کا تمدن اثر انداز ہو چکا تھا ۔ ایک تو اہلِ روما اُن کے ملکوں سے اپنی گھٹتی ہوئی فوجوں کے لئے رنگروٹ بھرتی کرتے تھے بلکہ وہ اکثر اُن لوگوں کو سلطنت کے اُن حصوں میں جنہیں طاعون نے برباد کر دیا تھا آباد کر کے اُن میں کھیتی باڑی کرنے کی ترغیب دیتے تھے ۔ دوسرے روما کے تاجر اُن کے ملکوں میں آتے جاتے اور تجارت کا ایک خاصا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھے ۔ ان کے علاوہ عیسائی مبلغوں نے خاص طور پر گاتھوں کے ہاں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی ۔ بالخصوص وہ شمالی وحشی جو رائین ڈنیوب اور بحیرۂ اسود کے مضافات میں رہتے تھے اس وقت جب کہ چوتھی صدی کا سانحہ پیش آیا نہایت جلد رومی اور مسیحی اثر قبول کر رہے تھے ۔

خانہ بدوشوں کی یورشیں ۔ چوتھی صدی کا سانحہ خانہ بدوشوں کا دھاوا تھا ۔ کچھ عرصے سے ایشیائی میدانوں کے گلہ بان آوارہ گرد بے چین اور خوفناک ہو رہے تھے ۔ اُن کی مخصوص شورش کے اسباب نامعلوم ہیں ۔ لیکن دو وجوہ پیش کی گئی ہیں ایک یہ کہ اُن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور دوسرے وسطِ ایشیا میں خشک سالی کا دور دورہ ہوا جس کی وجہ سے اُن کے گلوں اور ریوڑوں کے لئے وہاں چارے کا سامان نہ رہا ۔ کچھ بھی ہو ۳۷۲ء میں اُن کا ایک انبوہِ کثیر جن کو ہن کے نام سے پکارا گیا اُس کھلے "دروازۂ اقوام" میں سے گھس کر جو بحیرۂ خزر اور یورال کے کوہستان کے درمیان ہے دریائے والگا کو عبور کرتے ہوئے مشرقی یورپ کے باشندوں پر حملہ آور ہوا ۔ اُن کی تعدادِ کثیر اُن کی خونخواری اُن کی شہسواری اُن کی تیر اندازی اور اُن کے دھاووں کا جوش و خروش ایسا تھا کہ یورپ کا بچہ بچہ

اُن کے نام پر کانپنے لگا اور کچھ عرصہ تک وہ جہاں گئے اُن کا مقابلہ ناممکن ہوگیا +

پہلے وہ ایک ہندی یورپی قوم ایلن پر جو کوہِ قفقاز کے شمال میں رہتی تھی آپڑے + بہتوں کو انہوں نے قتل کیا اکثروں کو انہوں نے غلام بنالیا - باقی ماندہ جان بچاکر مغرب کی طرف سرما شیا اور وہاں سے جرمنی میں جاگزین ہوئے اس کے بعد وہ مشرقی گاتھوں (آسٹرو گاتھوں) پر جو بحیرۂ اسود کے شمالی ساحلوں پر رہتے تھے اور مغربی گاتھوں (وزی گاتھوں) پر جو ڈنیوب کے نچلے حصے میں جہاں اب رومانیا ہے رہتے تھے حملہ آور ہوئے + یہ گاتھ لوگ بڑے جنگجو تھے لیکن یہ بھی اُن نئے حملہ آوروں کی مقاومت کی تاب نہ لاسکے + مشرقی گاتھ اکثر مغلوب ہنوں کے ساتھ مغرب کی طرف "ہنگری" اور "پینونیا" میں لے جائے گئے + مغربی گاتھوں نے حکومتِ روما کے آگے عاجزانہ درخواست کی کہ انہیں ڈنیوب کے پار آجانے کی اجازت دی جائے اور وعدہ کیا کہ وہ روما کے فرمانبردار بن کر اُس کی سرحد کی حافظت میں پوری پوری مدد دیں گے + ۳۷۶ء میں بدقسمتی سے مطلوبہ اجازت دے دی گئی + دو سال بعد جب ہنی خطرہ ٹل گیا تو اِن مغربی گاتھوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا ایڈریانوپل پر ایک بڑی بھاری رومی فوج کو شکست دی اور جدید ڈیسیا میزیا اور تھریس پر قبضہ کرلیا + سلطنتِ روما کی ڈنیوبی سرحد اس طوفان میں غرقِ آب ہوگئی (۳۷۸ء)

۴۰۶ء میں رائین کی سرحد پر دشمن کا ایسا زور ہوا کہ مقابلہ مشکل ہوگیا + ایلن وینڈل اور سوئیو قوموں کے گروہ کے گروہ سلطنت میں گھس آئے اور تین سال تک گال کے علاقہ میں لوٹ مار کرکے سپین میں جا پہنچے + حکومتِ روما انہیں اپنی قلمرو سے باہر نہ نکال سکی اور آخر کار اُسے اُن کے ساتھ صلح کرکے اجازت دینی پڑی کہ یہیں آباد ہوجائیں + لیکن ۴۵۱ء میں قدیمی رومیوں اور ان نئے شمالی نوآبادوں کو ایک نئے خطرے کا سامنا ہوا جب ہن اپنے بادشاہ اٹیلا کے زیرِ کمان پھر آگے کو بڑھتے ہوئے رائین کے اس پار آگئے - اور گال کے میدانوں میں تباہی پھیلانے لگے + اس قریبی خطرے نے ٹیوٹن اور لاطینی قوموں کو ایک مضبوط اتحاد میں منسلک کردیا - شاہنشاہی فوجیں اور وحشی قومیں دونوں مل کر مغربی تمدن کے بچانے کے لئے شالون کے مشہور میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہوئیں -

عیسائیتِ وسطیٰ کی تعمیر و تشکیل - ۴۵۱ء میں شالون پر اٹیلا اور اُس کے ہنوں کی قطعی اور نتیجہ خیز شکست اور اس کے بعد اطالیہ میں ایک معمولی سی یورش کے بعد ۴۵۳ء میں اٹیلا کی وفات پر اُس کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا +

اِس کے بعد روما کی سلطنت بغیر کسی بیرونی مداخلت کے اپنے تئیں اُن نئے حالات کے سانچے میں ڈھالنے لگی جو شمالی حملہ آوروں نے پیدا کردیئے تھے + پانچویں صدی میں (۳۹۵ء تا ۴۷۶ء) سلطنت میں ایک نہایت اہم انتظامی

تقسیم عمل میں آئی جس کے درمیان حدِ فاصل بحیرۂ ایڈریاٹک تھا۔ مشرق کی طرف یونانی اور ایشیائی صوبے تھے جن کا صدر مقام قسطنطنیہ قرار پایا۔ یہاں ایک مضبوط و کامیاب حکومت قائم ہوئی جو بہت سے تغیرات کے باوجود برابر ۱۴۵۳ء تک برقرار رہی۔ اُس نے متعدد بار وحشیوں اور ایشیائیوں کے حملوں کو روکا اور صدیوں تک عیسائیت کو اُن کے بے شمار دشمنوں سے بچائے رکھا اور قدیم مغربی تمدن کا چراغ مدتوں اُس کی محافظت میں فروزاں رہا۔ مغرب میں لاطینی اور کلتی صوبے ظاہرا طور پر ایک حکومت کے حلقے میں شامل کئے گئے جس کا پایۂ تخت میلان یا راوینا ہوا لیکن بہت جلد شمالی قوموں نے اپنی طاقت اور اپنے رعب کا سکّہ جاری کر لیا اور ۴۷۶ء میں کٹھ پتلی بادشاہ رومیولس آگسٹس کے تخت سے اتارے جانے کے ساتھ مغرب میں شاہنشاہی نظم و نسق کا قلع قمع ہوگیا۔

روما کی مغربی قلمرو کے کھنڈروں پر مندرجہ ذیل نامی "شمالی" حکومتیں قائم ہوئیں:- (۱) مغربی گاتھ بہت سی آوارہ گردی کے بعد جس کے دوران میں انہوں نے اطالیہ کو تہ و بالا کیا اور ۴۱۰ء میں شہر روما میں لوٹ مار کی آخر کار سپین میں آباد ہوئے۔ (۲) وینڈل سپین سے جلاوطن ہو کر افریقہ کو نقل مکانی کر گئے اور ۴۳۹ء میں انہوں نے کارتھیج کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ (۳) مشرقی گاتھ اپنے با اقتدار بادشاہ تھیوڈورک کی قیادت میں پینونیا سے نکلے اور اطالیہ کو فتح کر کے انہوں نے وہاں پیویا میں ۴۹۳ء میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ (۴) فرینک جو ممالکِ نشیبی میں بسے ہوئے تھے مغرب کی طرف چل نکلے۔ یہاں تک کہ اپنے بادشاہ کلووس کے عہد میں (۴۸۱ء تا ۵۱۱ء) انہوں نے اپنی مملکت مغرب میں بحرِ اوقیانوس تک اور جنوب میں پرنیز کے پہاڑوں تک پھیلا لی۔ (۵) برگنڈی دریائے رھون میں آباد ہوگئے (۶) اینگل سیکسن اور جوٹ ایلب کے نچلے حصوں سے اُٹھ کر متروکہ رومی صوبہ برطانیہ پر قابض ہونے لگے (۴۵۵ء)

لیکن اگرچہ اِن تغیراتِ ملکی کے باعث روما کی حکومت مٹ گئی تاہم روما کی روایات سارے مغرب میں نہ صرف قائم رہیں بلکہ ہر جگہ قومی زندگی پر اثر انداز رہیں۔ وحشی سردار اور بادشاہ عام طور پر ۴۷۶ء تک راوینا کے رومی شاہنشاہ کی رسمی فرمانروائی کا اعتراف کرتے رہے۔ وہ اُس سے شاہی خطابات و مراتب حاصل کرنے پر اور قنصل اور امراء کے جبّے ملنے پر فخر کرتے تھے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ انہوں نے اپنا قدیم کفر چھوڑ دیا اور سلطنتِ روما کا مذہب قبول کر لیا۔ اس طور سے روما نے اپنے روحانی اقتدار کے ذریعے سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت او رعب پا لیا اور نئی وحشی شخصی حکومتوں میں زمانۂ وسطیٰ کی عیسائیت کی شاندار یکسوئی پیدا کر دی!

بشیر احمد

تجلّیات

دِل ہے کسی کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے
ذرّہ ہے آفتابِ تجلّی لئے ہوئے

نامِ خدا ! اِدھر بھی نظر ہو کہ ساقیا!
بیٹھے ہیں ہم بھی دِل میں تمنّا لئے ہوئے

پھر آرہا ہے جُھوم کے مستِ شبابِ حسن
آنکھوں میں موجِ قلزمِ صہبا لئے ہوئے

معمور کائنات ہے تیرے جمال سے
ہر شے ہے تیرے حسن کا جلوہ لئے ہوئے

پھر آگئی بہارِ گُل افشان و مے فشاں
دامن میں صد ہزار تماشا لئے ہوئے

پہنائے کائنات ہے فردوسِ رنگ و بُو
ہر شے ہے جلوۂ طرب افزا لئے ہوئے

ہے چودھویں کا چاند کہ سرچشمۂ جمال
آغوش میں ہے حُسن کی دنیا لئے ہوئے

لیلائے شب ہے سازِ محبت پہ نغمہ زن
حورِ سحر ہے دوش پہ مینا لئے ہوئے

ہر آستانِ حسن پہ جُھک جُھک گئی جبیں
سر میں ہوں بے قراریٔ سجدہ لئے ہوئے

کیوں روح جذب ہو گئی حسنِ مجاز میں
یارب ہیں جلوہ ہائے نہاں کیا لئے ہوئے

خورشید و ماہتاب ہیں یا ساقیٔ بہار
میرے لئے ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

ہر گل کو چومتا ہوں اثؔر فرطِ شوق میں
ہر گل ہے اُن کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے

اثؔر صہبائی

ملکِ بابل

اُس لق و دق میدان کو جس کا نام اہلِ یونان نے میسوپوٹے میا (Mesopotamia) رکھا تھا قدرت نے دو حصّوں پر تقسیم کیا ہے۔ اُس کا نصف حصّہ شمالی سنگ لاخ ہے اور موسم برسات میں چراگاہ کا کام دیتا ہے۔ اولادِ اشر (Assyrians) کے وہاں آباد ہو جانے سے اسیریا (Assyria) مشہور ہو گیا۔ عرب اس خطہ کو الجزیرہ کہتے ہیں۔ جنوبی حصہ متعدد انہار کی وجہ سے غیر معمولی طور پر زرخیز بن گیا تھا۔ اہلِ یونان اس کو بے بی لونیا (Babylonia) اور عرب العراق کہتے ہیں۔ اِس خطہ میں قوم تورانی اور اولادِ سام کے آباد ہو جانے سے نصف حصّہ کا نام شومیر (Sumer) اور نصف کا نام اکدّ (Akkad) ہو گیا تھا۔ شمالی مشرقی حصہ کو اکدّ اور جنوبی مشرقی حصہ کو جو خلیجِ فارس کے گرد اور اُس کے جانب واقع تھا شومیر کہتے تھے۔ یہ دونوں خطّے دریائے دجلہ اور دریائے فرات کی جنوبی وادی میں واقع تھے اور کوئی قدرتی حدِ فاصل اِن دونوں خطّوں کے درمیان نہیں ہے۔ ان کے مغرب اور جنوب میں ریگستانِ عرب اور خلیج فارس واقع تھے۔ دریائے دجلہ غالباً اُن کی مشرقی حد تھی اور ایک خط اگر شہر سمارہ واقع دجلہ کے ذرا نیچے سے شہر ہیت واقع فرات تک کھینچا جائے تو اسے شمالی حد سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ امر استعجاب سے خالی نہیں کہ باوجود ہزاروں برس کی سلطنت اور لاثانی شان و شوکت کے جن کا اثر آج تک ہر قوم و ملّت کے دل پر باقی ہے ملکِ بابل کی قدیم تہذیب و تمدن کے آثار کا بڑا حصّہ فنا ہو گیا۔ آج سے کچھ پہلے ممالکِ بابل اور اسیریا کی تہذیب و تاریخ کا علم قطعاً محدود تھا۔ صرف توریت کی معدودے چند آیات ہرادوٹس[1] اور زینوفن[2]

---

[1] ہرادوٹس مشہور سپاہی اور قدیم یونانی مورخ۔ فنِ تاریخ کا موجد ہے ۴۸۴ء قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۲۵ قبل مسیح میں فوت ہوا۔ یہ ہیلی کارنیسس (Helicarnassus) واقع ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا جو کیریا (Caria) میں ڈوریا والوں (Dorians) کی ایک بستی تھی۔ اُس کی پیدائش کے زمانہ میں صوبہ کیریا کی حاکمہ دارا گشتاسپ (Darius Hystaspes) شاہ ایران کی ایک سہیلی یا خواص ارتیمز (Arthemes) نام کی تھی۔

[2] زینوفن مشہور ایرانی مورخ و جنرل جس کی ذہانت و ذکاوت۔ فہم و فراست۔ حزم و احتیاط سے دس ہزار یونانی فوج کی بخیر و عافیت بعد ہزیمت واپسی ہوئی تھی۔ مورخ مذکور دارا ثانی شاہِ ایران (۴۲۴-۴۰۵ ق م) کے خلاف اس کے بھائی سائرس کی طرف سے لڑا تھا۔

کے سرسری بیانات۔ جوزیفس[1] اور ٹی سیاس[2] کی تصانیف جو بروسس[3] بابلی کی تاریخ بابل کا اقتباس ہیں نیز دیگر یونانی اور لاطینی مورخوں کی مختصر تصانیف ہماری رہبر تھیں لیکن یہ مصالح اس قدر کافی نہ تھے جن کی امداد سے اُن ممالک کی تہذیب کا کامل اندازہ ہو سکتا یا صحیح تاریخ مرتب ہو سکتی۔

بخلاف مصر بابل اور اسیریا کے دلفریب آثار جو سیاحوں کی کشش کا باعث ہو سکتے تھے نابود ہو چکے تھے لیکن اپنی فوجی قوت۔ تعجب خیز بلند منادر۔ عالی شان محلات۔ رشکِ ارم باغات۔ انہار کے جال اور کرشمہ ہائے نجوم وسحر سے بنی آدم کے دلوں پر ایسا سکّہ بٹھایا تھا کہ آج تک اُن کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ دریائے فرات اور دریائے دجلہ کی سالانہ طغیانی سے گو زمین غیر معمولی طور پر زرخیز بن گئی تھی تاہم انہار کا جال جب تک باقاعدہ نہیں پھیلایا گیا جان اور مال معرضِ خطر میں رہے اور اضلاع کے اضلاع ہفتوں بلکہ مہینوں غرقِ آب رہتے تھے۔ بعد زوالِ سلطنتِ بابل انہار کی صفائی اور درستی میں غفلت اور تساہل سے وہی انہار جو محافظِ جان و مال تھیں غارت گر بن گئیں۔ وہ عمارات جو متعدد نسلوں کی محنت و مشقت کی یادگار تھیں بہت جلد فنا ہو گئیں۔ وہ نادر مصالح یعنی خشت و قیر جن کی خوبی کے باعث اس عہدِ عتیق کے کاریگروں نے بلند شاندار اور مشہور عمارات تعمیر کی تھیں عالمِ ہیولانی بلکہ کاغذی گھروندے کی طرح ناپائیدار اور بے ثبات ثابت ہوئے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

بادشاہ بخت نصر ثانی[4] کا قول ہے کہ مرمت کی طرف سے غفلت کی جائے تو پینتالیس سال میں اعلیٰ سے اعلیٰ

---

۱ جوزیفس مشہور یہودی مورخ پہلی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔

۲ ٹی سیاس داراب ثانی شاہِ ایران (Arlaxerxes Memnon Alias Darius ii) کا طبیب تھا۔ بادشاہ مذکور کا عہد ۴۰۵ قبلِ مسیح سے ۳۶۱ قبلِ مسیح تک تھا۔

۳ بروسس بابلی۔ مورخ ہیئت دان اور پوجاری مندر مردوخ۔ بروسس مذکور نے تاریخ بابل پیدائشِ عالم سے سکندر اعظم کے عہد تک قلمبند کر کے سکندرِ اعظم کی حضور میں پیش کی تھی۔ بقولِ مورخ جوزیفس اہلِ بابل کو ناز تھا کہ واقعات متعلقہ ہیئت و احکامِ نجوم اور تقویم وغیرہ طوفانِ نوح کے ایک سو پندرہ سال کے بعد سے سکندرِ اعظم کے عہد تک اُن کے پاس محفوظ ہیں۔ حکیم ارسطو کو علم ہوا تو اُسے اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے شاگرد کلیس تینیز (Calesthenes) سے فرمائش کی کہ جو سب سے صحیح نسخہ ہو اُس کے مطالعہ کے واسطے بھیجے چنانچہ بعد کوشش بسیار اُس نے ایک نسخہ بروسس بابلی سے حاصل کر کے اپنے اُستاد کو بھیجا اور خود بھی ایک رسالہ مرتب کیا جو ڈی کولو (Decolo) کے نام سے مشہور ہے۔

۴ بخت نصر ثانی بادشاہ بابل ۶۰۴–۵۶۱ قبلِ مسیح میں گذرا ہے۔

اور مستحکم سے مستحکم عمارات کھنڈر ہو جاتی ہیں۔ اس قول سے تصور ہو سکتا ہے کہ دو ہزار سال تک غیر آباد اور کس مپرسی کی حالت میں رہنے سے اُن عمارات کی کیا صورت بن گئی ہوگی اور اُن کی تحقیقات میں کس قدر دردِ سری اور مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا۔

تمام عمارات منہدم ہو کر بدہیئت کھنڈروں کی صورت میں مبدل ہوگئی تھیں اور تند و تیز ہوا نے صحرا کے ریگ کو اڑا اڑا کر ان کھنڈروں پر لاڈالا تھا حتی کہ ریگ سے تمام آثار پوشیدہ ہو کر ٹیلوں کی صورت بن گئے تھے دراصل قدرت نے اِن کھنڈروں کو ریگِ صحرا سے پوشیدہ کر کے اپنے فضل و کرم کا اظہار فرمایا کیونکہ مذکورہ کھنڈر اگر کھلے رہتے تو دریاؤں کی طغیانی اور برسات کے پانی کے اثر سے وہ گل کتبے جو آج تاریخی دنیا میں ہمارے رہبر ہیں نیست و نابود ہو جاتے اور قیامت تک تاریخ بابل پردۂ خفا یا صحیفۂ مختوم کی صورت میں رہتی۔ ریگ کے طبق نے اُن کی ایسی حفاظت کی کہ کھنڈروں کے زیرین حصے سے آج عہدِ عتیق کے ہزاروں بے بہا مختلف الہیئت کتبے بت مہریں قبریں اور دیگر یادگاریں برآمد ہو چکی ہیں جن کے طفیل تاریخ بابل پر کافی روشنی پڑ گئی ہے۔ اصل واقعات کے تاریکی میں رہنے سے یا لاعلمی کے سبب عموماً روایات مقبولِ خاص و عام ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اُن روایات کی تحقیق سے اصل واقعہ کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔

شہرِ موصل کے متصل متعدد ٹیلے ہیں۔ بعض پر عرب آباد ہو گئے ہیں اور فی زماننا وہ آبادی کا یُنجوق کے نام سے مشہور ہے۔ ان ٹیلوں میں سے ایک پر ایک مسجد اور ایک قبر ہے جس کو وہاں کے باشندے مزارِ حضرتِ یونس علیہ السلام کہتے ہیں۔ گو یورپی سیاح اِس کو فرضی مزارِ حضرتِ یونس علیہ السلام سمجھتے ہیں تاہم شہرِ نینوا سے حضرتِ یُونس کے جو تعلقات

---

[۱] حضرتِ یونس علیہ السلام تغلط پلیسر شاہ اسیریا کے ہمعصر تھے جو ۸۶۲ قبل مسیح میں گزرا ہے۔ شہرِ نینوا اس کا دارالامارت تھا۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل میں حضرتِ یونسؑ شہرِ نینوا میں بغرضِ ہدایت تشریف لے گئے تھے۔ توریت میں آپ کے نینوا تشریف لے جانے کا واقعہ درج ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے یوناہ بن امتی کو خدا نے حکم دیا کہ نینوا جا کر وہاں کے باشندوں کو ہدایت کرو کیونکہ اُن کے اعمال ہماری ناخوشی کا باعث ہیں۔ یوناہ نے بجائے نینوا کے ترسیش (جنوبی اسپین) کی راہ لی اور جوپا (یافہ) پہنچ کر کشتی پر جو ترسیش جانے والی تھی سوار ہو گیا کچھ دور کشتی مذکور پہنچی تھی کہ خدا نے ایسا طوفان بھیجا کہ کشتی ڈوبنے لگی۔ ملاحوں نے یاس و ہراس سے اپنے اپنے معبود کو یاد کیا اور کشتی کو ہلکا کرنے کی غرض سے اجناس سمندر میں پھینک دیں۔ اس وقت یوناہ کشتی کے زیرین حصہ میں سوتا تھا۔ ناخدا نے جگا کر یادِ الٰہی کی ہدایت کی۔ پھر اہلِ کشتی نے قرعہ ڈال کر دریافت کیا کہ وہ غیر معمولی طوفان یوناہ کی وجہ سے آیا تھا۔ . . . . یوناہ کی درخواست پر اُس کو سمندر میں پھینک دیا اور طوفان فرو ہوا۔ خدا کے حکم سے ایک مچھلی یوناہ کو نگل گئی اور تین شب و روز یوناہ مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ یوناہ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

رہے ہیں وہ ان ٹیلوں پر شہرِ نینوا کا شبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔ چنانچہ کھودنے سے ثابت ہوگیا کہ جس ٹیلہ پر مزار مذکور ہے وہ قدیم شہرِ نینوا کا ایک حصہ ہے اور دیگر ٹیلے اِس عظیم الشان شہر کے محلے تھے۔ اسی طرح بغداد سے چالیس میل کے فاصلہ پر چند ٹیلے ہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام وہاں کے عرب باشندے بابل بتاتے تھے تحقیق سے اُن کا قول پایۂ ثبوت کو پہنچا۔ بہر حال روایات ہی ذریعۂ سراغ ہوئیں۔

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی سے اِن روایات نے یورپی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا شدہ شدہ یورپ کی ہر بڑی سلطنت نے اپنے نمایندوں کو بھیج کر تحقیقات شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب کہ ایک یہودی رہبان بنجامن ساکن ٹیوڈیلہ ضلع نوار شہرِ بغداد میں وارد ہوا تو اُس سے وہاں کے یہودیوں نے بیان کیا کہ مقامِ حلہ کے آس پاس کھنڈروں میں اب بھی بادشاہ بخت نصر ثانی کے محل کے آثار اس گلخن کے قریب پائے جاتے ہیں جس میں حنانیا[۱] ۔ مشائیل[۲] اور ازاریہ[۳] ڈالے گئے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۵) عفوِ گناہ اور رہائی کی دعا مانگی تو بحکمِ خدا مچھلی نے اس کو خشکی میں اگل دیا پھر خدا کے حکم سے شہرِ نینوا پہنچ کر ہدایت شروع کی" (توریت سے زیادہ مشرح و مفصل حالات یونس علیہ السلام تاریخ طبری روضۃ الصفا وغیرہ میں درج ہیں) اکثر یورپین مورخ اس واقعہ سے منکر ہیں۔ اُن کے خیال میں تین روز کے بعد مچھلی کے معدہ سے زندہ برآمد ہونا خلافِ عقل ہے۔ اور مذکورہ واقعے کی تشریح میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ گو بالاستیعاب نظرِ تنقید ڈالنے سے اُن کی تشریح کا کوئی پہلو پایۂ صداقت کو نہیں پہنچتا تاہم نقل کفر کفر نباشد پر کاربند ہو کر ذیل میں درج کرتے ہیں۔
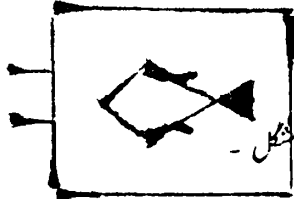
بعض یورپین مورخوں (Mr. Ragozin Chilperic Edwards & Others) کا قول ہے کہ شہرِ نینوا کا نام زبانِ اہلِ اشر میں نینوا ہے جو مشابہ نونو کے ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں علاوہ اہلِ اشر کی زبان میں نینوا اگر لکھا جائے تو تیر نما حروف کی کشمکش سے ایک مچھلی تالاب میں بن جاتی ہے مثلاً یہ شکل۔ لہٰذا جس مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگلا تھا وہ شہرِ نینوا تھا اور رہائی کے واسطے اُن کی گریہ وزاری اور دعا کا مانگنا متعدد خدشوں و تکالیف کے باعث ہوگا۔

[۱]، [۲]، [۳] ۵۴ بعد فتحِ بیت المقدس سنہ ۶۰۶ قبل مسیح میں یہ تینوں یہودی شہزادے بخت نصر ثانی کے حضور میں قید ہو کر آئے حسب الحکم عام قیدیوں کے ہمراہ بابل بھیج دیئے گئے بعد تعلیم و تربیت بادشاہ مذکور نے اپنی روبکاری میں متعین کیا حنانیا کا نام تبدیل ہو کر شدراخ۔ ازاریہ کا نام عبید نیگو اور مشائیل کا نام میشاخ کیا بخت نصر ثانی نے جب اپنا ساٹھ کیوبٹ (یونانی کیوبٹ برابر ہے ۱۸۔ انچہ اور ۲۰ جو انگریزی کے) کا طلائی بت رکھ کر اُس کی پرستش کا اذن عام دیا تو ان تینوں شاہزادوں نے انکار کیا۔ بقولِ یہود سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں وہ گلخن میں ڈال دیئے گئے لیکن آگ نے اُن پر کچھ اثر نہیں کیا۔ بادشاہِ مذکور نے متعجب ہو کر حکم دیا کہ کوئی شخص اس دن سے یہود کے خدا کو بُرا نہ کہے ورنہ گردن ماری جائے گی (کتاب حضرت دانیال ۱۔ ۳۔ ۱۱۔ ۴)

بقول مسٹر راجرز (Mr. Rogers) ربیان مذکور کا اطالی بیان خود شاہد ہے کہ اُس کا بابل کی طرف کبھی گذر ہی نہیں ہوا تھا۔ جس قدر حالات اُس نے قلمبند کئے ہیں سب روایتوں پر مبنی ہیں۔ بہر حال بنجامن مذکور کو مغالطہ ہوا۔ بیرس نمرود کو وہ مینار بابل سمجھا۔ کیونکہ اس کا بیان ہے کہ بجلی کے صدمہ سے مینار مذکور بنیاد تک شق ہو گیا ہے۔ دراصل مثل بورسپ پا کی جو البیرس یا بیرس نمرود میں واقع ہے ایسی ہی صورت ہے۔ بورسپ پا کا حال انشاءاللہ تعالیٰ آیندہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا)

سولھویں صدی عیسوی میں ایک انگریز تاجر جان الڈرڈ کا تین دفعہ شہر بغداد میں گذر ہوا جس کا اُس نے جدید بابل کے نام سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حسب معمول اُس کا گذر اُس مقام پر ہوا جہاں کسی زمانہ میں عظیم شہر بابل آباد تھا جس کے متعدد کھنڈر دور دور تک اس بیابان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اکثر فرصت کے وقت وہ کھنڈروں کی سیر کرنے جایا کرتا تھا۔

۱۵۹۹-۱۶۰۰ء میں انٹی شرلی کا اُدھر سے گذر ہوا اور کچھ زمانہ بعد ۱۶۱۶ء میں اٹلی کے ایک باشندہ پٹرو ڈیلاوال[2] وہاں پہنچا۔ اُس نے قدرے صحت کے ساتھ مینار بابل کی تحقیق کی اور مینار بابل کا مقام اُس ٹیلے کو قرار دیا جہاں شہر بابل واقع تھا اور جہاں سے وہ بخت نصر ثانی کے عہد کے چند روغنی چوکے جن پر بادشاہ مذکور کا نام لکھا ہوا تھا روم واپس لے گیا۔ غالباً آثار قدیمہ کا یہ سب سے پہلا مجموعہ گو حقیر تھا جو ملک بابل سے یورپ پہنچا تاہم اُس نے مقناطیس کا کام کیا۔ یورپ کی ہر بڑی سلطنت بابل اور اسیریا کی تہذیب وتمدن کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یورپ کا تمدن ومعاشرت ان عظیم الشان قوموں سے مختلف ہے لیکن قدیم ادبیات اور فنون وغیرہ کی تحقیق کے شوق نے ایک روح پرور ولولہ پیدا کر دیا۔

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۸۱۱ء میں مسٹر رچ نے اور ۱۸۵۰ء میں مسٹر لے یارڈ نے ۱۸۵۲-۵۴ء میں سلطنت فرانس کی طرف سے جونز اوپرٹ نے اور برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہرمز رسیم نے ۱۸۷۸ء و ۱۸۸۹ء میں شہر بابل کے مختلف کھنڈروں کو کھودا لیکن تحقیقات کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۹ء میں جرمن گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹر کالڈوی نے قصر بخت نصر کے مشرقی حصہ سے کچھ روغنی چوکے نکال کر جرمنی روانہ کئے جن کو جرمنی کے معتمد عجائب خانۂ شاہی ڈاکٹر ریچرڈشون نے نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا اور ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر موصوف کی زیر نگرانی

سلہ 1. The Itenerary of Benjamin of Tudela (Jewish Quarterly Review Vol. XVIII)

سلہ 2. Pietro della Valles "Viaggi" (Rome 1650 A.D.)

شہرِ بابل کی باقاعدہ کھدوائی شروع کی گئی اور سولہ سال تک مسلسل تحقیقات جاری رہی۔

یونانی حکما نے تمام روئے زمین کو سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک حصہ کا نام اقلیم رکھا ہے۔ ہر اقلیم خطِ استوا کی جانب سے شروع ہو کر قطبِ شمالی کی جانب منتہی ہوتی ہے۔ اس یونانی حساب کے بموجب بابل کا طول جزائرِ خالدات سے ۴۴ درجہ، ۱۲ دقیقہ اور ۳۰ پل ہے اور عرض اس کا خطِ استوا سے ۳۲ درجہ اور ۴۳ دقیقہ ہے۔

اولادِ سام کی زبان میں شہرِ بابل کا اصل نام باب ایلی تھا جس کے معنی ہیں دیوتاؤں کا دروازہ بعض کتبوں میں باب ایلو یعنی خدا کا دروازہ بھی لکھا ہے۔ اس سے قدیم تر نام اس کا اہلِ شومیر کی زبان میں کادنگررا یا کادیررا تھا اور اس کے معنی بھی وہی ہیں۔ اہلِ اکد کی زبان میں تن تر کی تھا جس کے معنی مقامِ حیات کے ہیں۔

توریت کے باب ۱۱۔ آیت ۲ سے واضح ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی اولاد نے طوفان سے ایک مدت بعد جانبِ مشرق سفر کیا اور ملکِ شنعار کے وسیع میدان میں پہنچ کر آباد ہو گئی[۵] اور شہرِ بابل تعمیر کیا۔

بقول پادری نیوٹن براؤن (Rev. Newton Brown) نوح علیہ السلام کے پرپوتے نمرود نے اس (بابل) کو رونق اور وسعت دی۔ ملکِ اسیریا کی مشہور شاہزادی سیمی رامس[۶] نے ۱۲۰۰ قبلِ مسیح میں شہرِ بابل کو از سرِ نو

۵؎ توریت باب ۱۱ آیت ۲۔ جب وہ (اولادِ نوح) مشرق سے روانہ ہو کر ملکِ شنعار میں پہنچی تو انہوں نے ایک میدان دیکھا اور اس میں آباد ہو گئی۔ آیت ۳۔ اور آپس میں صلاح کی کہ خشت بنا کر آگ میں پکائیں + آیت ۴۔ پھر مشورہ کیا کہ ایک شہر تعمیر کیا جائے نیز ایک مینار جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے تاکہ یادگار قائم رہے اگر روئے زمین پر منتشر ہو جائیں۔

شارحینِ توریت نے تعینِ سن میں غلطی کی ہے اُن کے قول کے موافق ۲۲۳۳ ق م میں شہرِ بابل کو اولادِ نوح نے آباد کیا اور ۲۲۱۵ ق م یا ۲۰۰۰ ق م میں نوح علیہ السلام کے پرپوتے نمرود نے اس کو رونق اور وسعت دی۔ تعینِ تاریخ و سنہ کا جہاں تک تعلق ہے شارحینِ توریت کے اقوال پایۂ ثبوت سے ساقط ہیں کیونکہ نمرود کے کم و بیش ایک ہزار سال بعد حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ کا زمانہ تھا۔ حمورابی بادشاہِ بابل آنحضرت کا ہمعصر تھا۔ جدید تحقیقات سے بادشاہ مذکور کا عہد ۲۲۱۳-۲۲۶۷ ق م تھا لہٰذا نمرود کا زمانہ کم از کم تین ہزار سال قبلِ مسیح ہونا چاہیئے۔

۶؎ سیمی رامس۔ اس نام کی کئی شاہزادیاں گزری ہیں۔ نمرود کے لڑکے کی زوجہ کا نام بھی یہی تھا۔ اسی نام کی ایک شاہزادی ۱۲۲۹ ق م میں گذری ہے اور ممکن ہے کہ یہ شاہزادی وہی ہو جس کے عہد میں بقول ھیلانیکس مشہور محاصرہ شہر ٹرائے (Troy) کا ہوا تھا۔ زوجہ الوالیش یا شمس ہداد چہارم (۸۱۱-۸۲۳ ق م) کا نام بھی یہی تھا۔ اس شاہزادی کی یادگار میں ایک سنگین لاٹھ شہرِ اشر ملکِ ... میں نصب کی گئی تھی جس کو چند سال ہوئے ڈاکٹر اندرائی نے برآمد کیا تھا۔

تعمیر کیا۔ بادشاہ نے بوپولیسر[۱] نے سنہ ۶۲۵-۶۰۴ ق م میں اور اُس کے لڑکے بخت نصر ثانی نے سنہ ۶۰۴-۵۶۱ ق م میں اُس کو نہایت مستحکم و خوبصورت بنا کر رشکِ ارم کر دیا تھا۔

شہرِ بابل کی قدامت کے متعلق یہودیوں کو مغالطہ ہوا۔ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ملکِ شنعار (بابل) میں اولادِ نوح کے پہنچنے سے بہت پہلے بنی آدم وہاں آباد تھے۔ وہ لوگ قومِ تورانی کی ایک شاخ تھے جو مدتِ مدید سے خطۂ شومیر میں آباد ہونے کے باعث اہلِ شومیر کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ اہلِ شومیر کے اعتقاد کے موافق شہرِ بابل کا وجود پیدائشِ عالم کے ساتھ اور پیدائشِ انسان سے قبل ہوا تھا (کیونکہ بقولِ اہلِ شومیر شہرِ بابل خداؤں کا مسکن تھا) بہرحال بابل کی قدامت میں کچھ شک نہیں۔ گو بادشاہ حاموراِبی[۲] ہمعصر حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ سے پیشتر کے اکثر تاریخی واقعات ہنوز پنہاں ہیں تاہم قرینِ قیاس ہے کہ شہرِ بابل کی جو شان اور شوکت۔ قدر اور منزلت بادشاہ بخت نصر ثانی کے عہد میں تھی وہی قریب قریب ڈیڑھ ہزار سال قبل بادشاہ حامورابی کے عہد میں ہو گی البتہ اول الذکر نے جدید باغات و محلات کی تعمیر سے شہر کو بہت وسیع اور زیادہ خوشنما بنا دیا تھا۔

افسوس ہے کہ اس قدیم اور عظیم الشان شہر کو سیناحیرب بادشاہِ اسیریا نے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے کتبے میں شہرِ بابل کی تباہی کے متعلق بیان کرتا ہے "جب میں اہلِ بابل کی متواتر یورش اور غدر سے عاجز ہو گیا تو میں نے دیگر شہروں کی رعایا کو عبرت دلانے کی غرض سے بابل کی تمام قدیم عمارات مسمار کر دیں۔ دریا کا بند توڑ دیا اور شہر کو غرقِ آب کر کے اُس کا نام و نشان مٹا دیا" یہ عبرت ناک واقعہ سنہ ۶۸۹ قبلِ مسیح میں ظہور میں آیا۔

قدیم شہرِ بابل کی تباہی کے بعد ایسرحیدن[۳] بادشاہ نے سنہ ۶۷۶ ق م میں اس کی دوبارہ تعمیر کی لیکن بادشا

---

[۱] نے بوپولیسر۔ بادشاہِ بابل سنہ ۶۲۵-۶۰۴ ق م میں گذرا ہے یونانی اس کو بلسز (Belsis) اور ایرانی گودرز کہتے تھے۔

[۲] حامورابی بادشاہِ بابل جس کو توریت کے باب ۱۴ میں امرافل سے خطاب کیا گیا ہے اس کا عہد سنہ ۲۲۶۷-۲۲۱۳ ق م تھا۔

[۳] ایسرحیدن کا بابلی نام اشراخی الدینا تھا۔ اُس کا عہد سنہ ۶۸۰-۶۶۸ ق م تھا۔ یہ سیناحیرب بادشاہِ اسیریا کا دوسرا لڑکا تھا۔ اس نے دارالامارت بابل کو تجویز کیا تھا۔ بادشاہِ مذکور کے کتبے شاہد ہیں کہ بابل میں اُس نے منادر کی مرمت اور محلات کی تعمیر کی۔ اسی کے عہد میں مناسہ بادشاہ بیت المقدس گرفتار ہو کر آیا۔ سنہ ۶۴۸ ق م میں شمس دوکن نے بغاوت کر کے بابل پر قبضہ کر لیا۔ اشربانی پال ثانی نے اپنے عہد میں بابل کو دوبارہ فتح کیا۔ بادشاہ مذکور کے لڑکے اشرامت ایلی شاہِ اسیریا نے کےکاؤس بادشاہِ ایران کے حملہ کے وقت نے بوپولیسر کو صوبہ دارِ بابل متعین کیا لیکن صوبہ دار مذکور نے دشمن کے ساتھ مل کر نینوا دارالامارتِ اسیریا کا محاصرہ کیا۔ شہرِ نینوا کی فتح کے بعد کےکاؤس نے نے بوپولیسر کو مستقل بادشاہِ بابل بنا دیا۔

اشر بانی پال[51] کے محاصرہ اور فتح کے بعد یہ پھر برباد ہو گیا۔

قدرت خدا کی دیکھئے کہ آتش زن یا ققنس کی طرح اپنی خاک سے شہر بابل نے ہمیشہ دوسرا جنم لیا اور ہر دفعہ جواں بخت و جواں دولت ثابت ہؤا۔ نے بوپولیسر بادشاہ کے عہد میں پھر سر بفلک منادر و عالی شان عمارات تعمیر ہو گئیں جاہ و جلال۔ سطوت و جبروت۔ عظمت و شوکت کا نقارہ مثل سابق بجنے لگا اور دبدبہ و ہیبت۔ حکومت و سلطنت کے خورشید کی تجلیاں عالم کو خیرہ کرنے لگیں۔ سچ ہے، مالک نے جو چاہا سو کیا۔ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ اور جو چاہے گا سو کرے گا۔

غائب قدرت سے تیری موجود ‏ ‏ ‏ نابود ہو بود، بود نابود

چھوٹا ہو بڑا بلند ہو پست ‏ ‏ ‏ ہو ہست سے نیست نیست سے ہست

گویا ہیں لب ملائے اعلیٰ ‏ ‏ ‏ سبحانک شانہٗ تعالیٰ

مشہور سیاح و قدیم یونانی مورخ ہراڈوٹس اور حکیم ٹی سیاس نے بابل کے متعلق جو حالات قلمبند کئے ہیں وہ قابلِ وقعت اس وجہ سے ہیں کہ اول الذکر نے شہرِ بابل کو اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اُس کی خوب سیر کی تھی اور آخرالذکر شاہِ ایران داراب[52] ثانی کا طبیب تھا۔ اُس کو بابل کی سیر کا اکثر اتفاق ہوا تھا۔

بقول ہراڈوٹس شہرِ بابل ایک مربع قطعہ پر واقع تھا۔ شہر پناہ کی ہر دیوار ایک سو بیس اسٹیڈیا[53] یعنی قریباً چودہ میل کی تھی اس حساب سے اُس کا دور کم و بیش دو سو میل مربع تھا۔ فصیلِ مذکور اسی فیٹ چوڑی اور دو سو شاہی کیوبٹ یعنی ۳۲۷ فیٹ ۸ انچ یا ۳۷۳ فیٹ ۴ انچ بلند تھی[54]

---

[51] اشر بانی پال بادشاہ اسیریا ۶۶۸-۶۲۶ق م میں گذرا ہے۔ یونانی اس کو سارڈاناپلس کہتے تھے اور توریت میں اس کو اسناپر سے خطاب کیا ہے۔

[52] داراب ثانی۔ (۴۰۵-۳۶۱ ق م) ایران کا بادشاہ تھا۔ یونانی اس کو Arlaxerxes Memnon alias (Darius II) کہتے تھے۔

[53] اسٹیڈیا۔ ایک اسٹیڈیا برابر ہے ۶۰۶ فیٹ اور نو انچ انگریزی کے۔

[54] بعض یورپین مورخ عرض و طولِ شہرِ بابل کے متعلق ہراڈوٹس اور ٹی سیاس کے بیانات کو اس وجہ سے مبالغہ آمیز سمجھتے ہیں کہ اس قدیم زمانہ میں تحقیقِ حال کی طرف میلانِ طبع کم اور روایتوں پر بلا کدّ و کاوش اعتماد زیادہ تھا۔ سکندرِ اعظم کے عہد کے مورخوں کا بیان ہے کہ (ارسٹوبیولس جس کے اقوال یوسی بیس نے نقل کئے ہیں) فصیل گیارہ میل ہر طرف اور دور میں کم و بیش ایک سو تیس

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ)

فصیل کے گرد عمیق اور چوڑی خندق تھی جو دریائے فرات کے پانی سے لبریز رہتی تھی ۔ خندق کا فرش اُس کی مٹی سے بنائی ہوئی پختہ اینٹ کے کھرنجہ کا تھا جس میں چونے کی جگہ قیر کو پگھلا کر گرم گرم استعمال کیا تھا خندق کی مٹی سے اینٹیں پکا کر فصیلِ شہر تعمیر کی گئی تھی جس کے کناروں پر جا بجا آمنے سامنے بروج اور سپاہیوں کے واسطے حجرے بنے ہوئے تھے ۔ حجروں کے درمیان اس قدر جگہ چھوڑی گئی تھی کہ ایک چوکڑی آسانی سے گھوم سکتی تھی ۔ اس کی چنائی بھی خشت و قیر سے کی گئی تھی اور ہر تیس ردوں کے بعد ایک تہ نرسل کی دے کر پہلوؤں کو مضبوط کیا گیا تھا ۔

اس فصیل میں ایک سو عالی شان دروازے آمد و برآمد کے لئے بنائے گئے تھے ۔ کواڑ اور چوکھٹ پیتل کے تھے اُن کواڑوں کا ذکر یسعیاہ پیغمبر یعنی اشعیا علیہ السلام نے اپنی کتاب کے چودھویں باب میں کیا ہے [1]

شہرِ بابل کی دوہری فصیل تھی ۔ ایک شالخو یعنی فصیل بیرونی جو نہایت مستحکم اور نی مت [2] تی بعل کے نام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰۰) میل مربع تھی ۔ حکیم ٹی سیاس کا بیان ہے کہ شہر دیوار پینسٹھ اسٹیڈیا تھی اور پچاس فیدم یعنی دو سو معمولی کیوبٹ جس کے تین سو فیٹ ہوئے بلندی میں تھی ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تخمینے نظری تھے ۔ باقاعدہ پیمائش کسی نے نہیں کی ۔ اگر سکندر کے مورخوں کے اقوال کو ہی صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی شہر لندن سے پانچ گنا یا چھ گنا وسعت میں ہوا ۔

ڈاکٹر کالڈیوی کا خیال ہے کہ شہر پناہ کا اس قدر طویل ہونا کچھ تعجب خیز نہیں اور نہ نا ممکن خیال کی جا سکتی ہے جب کہ ہم کو علم ہے کہ ملک چین کی مشہور دیوار طول میں پندرہ سو میل ہے ۔ (سر ہنری رالن سن ۱۲ سو میل بتاتے ہیں ۔)

ڈاکٹر کنگ اس تمثیل کی تردید میں بیان کرتے ہیں کہ چین کی دیوار مملکت چین کی سرحد ہے شہر پناہ نہیں ۔ اگر مقابلہ کیا جائے تو شہر نانکن واقع چین سے جس کی فصیل کا دور ۲۴ میل سے کم ہے ۔

جولز اوپرٹ ہیراڈوٹس کی پیمائش کے موید ہیں ۔ انہوں نے اپنے مرتبہ نقشہ میں فصیل کو شہر بابل سے بیرس نمرود تک دکھایا ہے اور فصیل کا سلسلہ بر کھنڈر اور ٹیلے کے کھودنے سے برآمد ہوا ۔

قریہ سنجار کے متصل کچھ فصیلوں کے آثار پائے جاتے ہیں جن کو ڈاکٹر ویسباخ (Weisbach) نے اپنے نقشۂ بابل میں دکھایا ہے مگر اُن کے شامل کرنے سے مغربی حصہ شرقی حصہ سے چھوٹا ہو گیا ہے ۔

چونکہ ہر مورخ کے نقشہ میں اختلاف ہے لہذا کوئی قطعی رائے فصیل کے طول کی نسبت اس وقت تک قائم نہیں کی جا سکتی جب تک کہ کامل تحقیقات نہ کی جائے ۔ اہلِ جرمنی اس کی تحقیق میں مصروف تھے لیکن جنگِ عمومی کی وجہ سے تمام انتظامات درہم برہم ہو گئے ۔

[1] Isiah XIV, 1-2 [2] بقول ابی ڈینس اور یوسی بیس بیرونی فصیل کو بادشاہ بیلس (مروخ) یعنی مشتری نے تعمیر کیا تھا ۔

موسوم تھی جس کے معنی ہیں دیوتا بعل میری بنیاد ہے۔ دوسری فصیل اندرونی دورو کہلاتی تھی جس کا لقب امگر بعل تھا یعنی دیوتا بعل کا کرم ہے۔ استحکام میں یہ بھی بیرونی فصیل سے کچھ کم نہ تھی۔[۵۱]

شہر کے ہر کوچہ میں ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا تھا۔ دریائے فرات وسطِ شہر میں موجزن تھا جس کے کنارں پر دورویہ بلند دیواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے دروازے دریائے فرات کی طرف کھلے ہوئے تھے گھاٹ کی سیڑھیاں سطحِ آب کے نیچے تک تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر دو عالی شان دروازوں کے وسط میں تین برج فصیل سے دس فیٹ بلند محافظینِ شہر کے لئے اور چاروں کونوں پر بڑے بڑے گنبد نہایت خوبصورت اور خوشنما بنے ہوتے تھے۔ کل بروج دو سو پچاس تھے[۵۲]

مندرجہ بالا بیان سے اس فصیل کی تعمیر بیس کروڑ مربع فیٹ سے زیادہ ہوئی اور مملکتِ چین کی فصیل[۵۳] بحساب مکسر فٹ دوگنی ہوئی۔ شہرِ بابل کی فصیل کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا گیا تھا۔

ہراڈوٹس اور ٹی سیاس کے زمانہ میں فصیل مذکور اپنی اصلی حالت میں تھی۔ زینوفن کے زمانہ میں مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بہت شکستہ ہوگئی تھی اور بلندی میں کہیں کہیں سو فیٹ رہ گئی تھی۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں کلہم پچہتر فیٹ بلند رہ گئی تھی۔ حوادث گاہِ عالم میں ایسے ہی انقلاب ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

محمد حامد دہلوی

---

[۵۱] جدید تحقیقات شاہد ہے کہ عہد بخت نصر ثانی سے بہت پہلے بھی بابل کی فصیل دوہری تھی اور دونوں کے نام قدیم سے امگر اور نی مت تی بعل چلے آتے تھے۔ اکثر بادشاہوں نے اُن کی مرمت کی تھی مثلاً بادشاہ شرغانی شرری (سارگن) نے سنہ قم میں بادشاہ اشر بانی پال نے ۶۶۸ قم میں اور بادشاہ نے بوپوسیر نے ۶۰۴ قم میں۔

[۵۲] ڈاکٹر کالڈیوی کا قول ہے کہ شمال مشرقی دیوار میں کم از کم نوے بروج تھے صرف پندرہ کی کامل تحقیقات ہو سکی۔

[۵۳] مملکتِ چین کی دیوار بارہ سو یا پندرہ سو میل میں ہے۔ بلندی مختلف مقامات پر ۲۰ سے ۵۰ فیٹ تک ہے۔ سنہ ۱۸۲۳ء تخمینہ کی رو سے دیوار مذکور میں سلطنتِ انگلشیہ کی تمام عمارات سے زیادہ تعمیری مصالح صرف ہوا ہے

قلبیّات

۱

رگِ نیاز میں گر موجِ برقِ ناز نہیں
فتادگی ہے سراپا امیں انیاز نہیں

مذاقِ غزنوئی سومناتِ دل ہے وہی
تو ہی ایاز نہیں ہے۔ تو ہی ایاز نہیں

۲

ترے جگر میں اگر شمع کا گداز نہیں
تو بزمِ یار میں جلنے کا تو مجاز نہیں

دلِ حزیں سے ہے خالی اگر ترا پہلو
ترے نیاز کا خواہاں وہ بے نیاز نہیں

۳

نگاہِ شوق میں گر سرمۂ نیاز نہیں
حضورِ یار میں اُٹھنے کی وہ مجاز نہیں

زبانِ حسن سے میں نے سنا ہے یہ مصرع
کہ دل وہ دل ہی نہیں ہے جو پاکباز نہیں

۴

اگر تجھے دلِ خود سر پہ اپنے ناز نہیں
قبولِ خاطرِ جاناں ترا نیاز نہیں

تُو اپنے ذوقِ نظر کا اگر نہیں کشتہ
حریمِ ناز میں آنے کا بھی مجاز نہیں

امینِ حزیں

خالد

(ایک ماخوذ افسانہ)

ایک چھوٹے سے آراستہ کمرے میں انگیٹھی کے سامنے ہم چند نوجوان بیٹھے حسب معمول باتیں کر رہے تھے، موسم سرما کی ایک طویل شب کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا، سماوار میں چائے کا پانی گرم ہو رہا تھا، گفتگو مشکل سے کسی خاص مبحث پر پہنچی تھی بلکہ اب تک ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر منتقل ہو جاتی تھی، آخرکار دوران بحث میں دنیا کی نمایاں ہستیوں کا ذکر آ گیا۔ اُن ہستیوں کا جو عوام الناس سے بلند تر ہوتی ہیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے خیالات اپنی ذاتی قابلیت کے اعتبار سے بیان کئے، آوازیں بلند ہو کر شور و شغب کی کیفیت پیدا کرنے لگیں، اسی دوران میں ایک مختصر سا شخص چائے پیتا اور سگار سلگاتا ہوا کھڑا ہو گیا، اور ان الفاظ میں ہم سب کو مخاطب کرنے لگا۔

"حضرات! آپ کی سنجیدہ رائیں اس معاملہ میں اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں، مگر فائدہ سے بالکل خالی ہیں، ہم میں سے ہر شخص نے اپنے مخالف کے خیالات سنے مگر اپنے خیالات کو اب تک قابل ترجیح سمجھا۔ ہماری زندگی کا یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ہم اس طرح ایک جگہ آ ملے ہیں، اور ہم نے بحث و مباحثہ کا باب کھولا ہے، اس لئے ہم ایک دوسرے کے خیالات وعقائد و خصائل سے کماحقہ واقف ہیں"

اس کے بعد اس مختصر سے آدمی نے سگار کی راکھ آتشدان میں جھاڑ دی، آنکھیں نیچی کر کے مسکرانا شروع کیا۔

ہم بھی اُس کی جانب متوجہ ہوئے، اسی دوران میں اُس سے یہ سوال کیا گیا،

"تو پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے، تاش کھیلیں یا سو جائیں، یا پھر اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیں؟"

"تاش کھیلنا ایک خوشگوار مشغلہ ہے، نیند بھی مفید ہوتی ہے" اس مختصر سے شخص نے جواب دیا، "مگر ابھی گھر چلے جانا بہت قبل از وقت ہوگا، غالباً آپ میرا مدعا سمجھ نہیں سکے، آؤ، ہم میں سے ہر شخص ایک نمایاں ہستی کا ذکر کرے جس سے کہ وہ اپنی زندگی میں ملا ہو، میرا دعویٰ ہے کہ بیان خواہ کتنا ہی ناقص ہو بہتر سے بہتر دلیل سے زیادہ بامعنی ہوتا ہے"

ہم سب اس تجویز پر غور کرنے لگے،

ہم میں سے ایک نے کہا، "علاوہ اپنی ذات کے میں کسی حیرت انگیز ہستی سے واقف نہیں ہوں اور مجھ سے آپ بہت بخوبی واقف ہیں،" اس گفتگو کے مسخرانہ انداز نے حاضرین کے دلوں کو گرمانا شروع کر دیا۔ ایک اور صاحب

زمانے لگے۔

"بے شک ہم کسی سے واقف نہیں ہیں"، مجوز کی جانب متوجہ ہو کر گفتگو یوں جاری رکھی، "آپ ہی آئیے اور اپنا تجربہ بیان کیجئے، مگر یاد رہے کہ اگر ہمیں آپ کے قصہ میں لطف نہ آیا تو ہم بلا تکلف آپ پر پھبتیاں کہنے لگیں گے"۔

پست قامت مجوز آتشدان کے قریب کھڑا ہو گیا، ہم سب اُس کے چاروں طرف بیٹھ گئے اور خاموشی کے ساتھ اُس کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے، مقرر نے ہمیں غور سے دیکھا، ایک نگاہ چھت پر ڈالی، اور اپنی تقریر کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا۔

"میرے عزیز دوستو! دس سال ہوئے میں علی گڈھ میں تعلیم پاتا تھا، میرے والد کی آمدنی معقول تھی، مگر اول تو وہ کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے دوسرے اپنے علاقہ میں ریل سے بہت دور دیہاتی زندگی بسر کرتے تھے، اس لئے انہوں نے میرے قیام و طعام کا انتظام ایک پروفیسر کے ہاں کر دیا، اور اُن کو میرے اخلاقی نشو و نما کا بھی ذمہ دار بنا دیا۔

پروفیسر صاحب موصوف نہایت متین اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ اور بالطبع اُن کو تکلفات و ظاہری رسمیات سے عشق تھا۔ ایک مدت تک میں اُن سے بے حد مرعوب و خائف رہا، ایک روز شام کے وقت کھیل سے واپس آیا، اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدلنے لگا۔ قہقہوں کی مسلسل آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں، میں حیرت زدہ ہو گیا، بھلا کجا پروفیسر صاحب کی کوٹھی اور کجا آزادانہ و بے پروایانہ قہقہوں کی اس قدر مسلسل آوازیں! میں ضبط نہ کر سکا، لپک کر ملاقات کے کمرے میں جا دھمکا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے، پروفیسر صاحب اپنے دوستوں کو لئے ہوئے ایک گول میز کے قریب بیٹھے شرابِ ناب کے پیالے پیاپے خالی کر رہے تھے، اُن کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں، مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے، مجھ سے مصافحہ کیا، اور اپنے دوستوں کے روبرو چند تعارفی کلمات کے ساتھ مجھے پیش کیا، میں ایک پاس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فلسفۂ تاریخ پر ایک نہایت عالمانہ بحث چھڑی ہوئی تھی، مَیں بھی بحث میں شریک ہو کر اپنی جدّتِ طبع کے جوہر دکھانے لگا، مباحثہ کے بعد حاضرین نے میری فہم و فراست کی تعریف کی، نشۂ غرور نے میرا سر بلند کر دیا، اور میں اپنے مستقبل کی پاکیزہ مگر خیالی تصاویر دیکھ دیکھ کر جھومنے لگا، اُس کے بعد پروفیسر صاحب مجھ سے آخر دم تک یکساں طور پر ہمیشہ بے تکلف اور آزاد رہے، مجھے اُن کی صحبت میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا، میں اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصّہ اُن کی خدمت میں صرف کرتا تھا،

پروفیسر صاحب ممدوح کی بیوی کو بھی میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، نفیس نوجوان مگر اُن کے کپڑوں میں سے ہمیشہ دھوئیں کی بُو آتی تھی اور آگے کے دانت بھی گر چکے تھے، عورتوں کا ایک بدنصیب گروہ قبل از وقت چہرہ

کی یہ زیبائش کھو بیٹھتا ہے"۔

"جناب! آپ اصل موضوع سے ہٹے جا رہے ہیں" سب نے بہ آواز بلند للکار کر کہا۔

"معاف کیجئے، لیجئے میں قصہ پھر شروع کرتا ہوں، میں کالج میں اچھا خاصا ہر دلعزیز ہو چلا تھا، لڑکوں سے میری واقفیت دوستی کے درجہ تک پہنچنے لگی تھی۔ ان دوستوں میں ایک طالب علم بدر تھے۔ بہت معقول اور شریف النفس، وہ اکثر مجھ سے ملنے آتے تھے، میں بھی اُن کو پسند کرتا تھا، تھوڑی ہی مدت میں ہم دونوں بڑے گہرے دوست ہو گئے، علی گڈھ کی پوری آبادی میں میرا کوئی عزیز نہ تھا، میں شہر میں کسی کے ہاں نہ جاتا، اور عورتوں کی صحبت سے بہت خائف رہتا تھا، کالج کے احباب کے والدین واعزا سے میں نے ہمیشہ قصداً پرہیز کیا، اُن کے گھروں پر جانا مجھے ایک دن بھی نہ بھایا۔

میری مالی حالت بہت اچھی تھی، میرے والد مجھے ہر ماہ میں دو تین مرتبہ نوٹوں کا ایک پلندہ بھیج دیتے تھے جن کو نہ کبھی میں نے گنا اور نہ کبھی اُن کا حساب رکھا۔ اسی لئے میرے کمرے میں میرے احباب کے علاوہ اکثر چند خوشامدی بھی جمع ہو جاتے تھے۔

اور نوجوانوں کی حالت سے میری حالت کا آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں، میرے سینہ میں بھی وہ ابال اٹھتا تھا جو تھوڑے ہی عرصہ میں چند بے معنی غزلیات کی صورت میں رونما ہو کر ہوا ہو جاتا ہے، مجھے بھی کسی شے کی آرزو تھی، میں بھی کسی شے کا جویاں رہتا تھا اور میں بھی عالم رویا میں کسی کا نظارہ کیا کرتا تھا، مگر مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ میں کس کا آرزومند اور کس کا شیدائی تھا، شاید یہ ہو کہ میں اپنی تنہائی سے عاجز آ گیا تھا، اور زندہ دل افراد کی صحبت کے لئے ترستا تھا، "زندگی" کے لفظ سے میرے سینہ میں ہوک اُٹھتی تھی اور میں دردِ دروں کو سینہ میں چھپائے رکھتا تھا، احمد! ذرا ایک سگرٹ دینا"۔

سگرٹ سلگا کر اُس شخص نے سلسلۂ کلام یوں جاری رکھا،

"ایک روز صبح کے وقت بدر ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور کہنے لگا" لو، تم نے اور بھی کچھ سنا، خالد خالد آ گئے"۔

"کون خالد؟"

"ارے تم خالد کو نہیں جانتے، افسوس، ابھی چلو، اسی وقت اُٹھ کھڑے ہو، ابھی میں اُن سے تمہاری ملاقات کرائے دیتا ہوں، رات ہی تو وہ تعطیل سے واپس آئے ہیں، ایک حیرت انگیز شخص ہیں"!

"حیرت انگیز"؟

"نہایت"!

"خیر تو تم تنہا ہو آؤ، میں تمہارے حیرت انگیز شخصوں سے مل چکا ہوں"۔

"نہیں نہیں تمہیں خالد سے ملنا ہوگا، ایسا شخص تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا"

میں کہنے کو تھا کہ خالد کو پہلے میرے یہاں آنا چاہیئے، مگر خدا جانے کیوں میں نے بدر کے ارشاد کی تعمیل کی اور اُس کے ساتھ ہولیا، بدر مجھے علی گڈھ کی سب سے زیادہ گندی اور تنگ و تاریک گلیوں میں سے گیا جس مکان میں خالد رہتا تھا وہ نہایت بوسیدہ اور تکلیف دہ نکلا، ہم دونوں صحن میں پہنچے، ایک تنومند اصیل الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے دھوپ میں پھیلا رہی تھی، بچے چوبی زینہ پر کود رہے تھے، ہم دونوں ایک تاریک راستہ میں سے گذر کر خالد کے کمرے میں پہنچے، اندر داخل ہوئے، آپ کو بخوبی اندازہ ہے کہ ایک غریب مفلوک الحال طالب علم کا کیسا کمرہ ہوتا ہے، دروازے کے سامنے ہی خالد میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا سگار پی رہا تھا، اُس نے بدر سے مصافحہ کیا، اور خوش مزاجی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ ہماری دونوں کی نگاہیں دوچار ہوئیں، میں خود بخود اُس کی جانب مائل ہونے لگا، حضرات! بدر ٹھیک کہتا تھا، خالد یقیناً دنیا کا ایک حیرت انگیز انسان تھا، حیرت انگیز۔ محیّر العقول لو، ذرا میں تفصیل سے بیان کئے دیتا ہوں، لمبا قد، بہت پتلا پتلا چھریرا بدن، چہرہ مہرہ دلآویز، مجموعی طور سے نہایت خوش منظر، اُس کے چہرے کی صحیح تصویر کھینچنا نہایت دشوار ہے، چہرہ کے ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ خوب بیان کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بتانا کہ اُس چہرے میں کیا تھا یعنی خاص وہ چہرہ کون سے پیغام کا حامل تھا ایک نہایت دشوار امر ہے"۔

"یعنی چہرہ کی موسیقی" حاضرین میں سے ایک نے کہا۔

"بیشک، چہرے کی موسیقی، اس لئے میں اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ چہرے کا وہ مخصوص انداز ایک نہ مٹنے والے تبسم سے ہمیشہ دست و گریباں رہتا تھا، خالد کے والدین اُس کی یاد سے قبل فوت ہو چکے تھے، اُس نے اپنے ایک دُور کے عزیز کے مکان میں آنکھ کھولی جو اخلاقاً بہت پست خیال تھا، پندرہ برس کی عمر تک وہ دیہات میں زندگی گذارتا رہا، پھر وہ علی گڈھ میں آگیا، انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخل ہوا، ٹیوشن سے اُس کی گذر اوقات ہوتی تھی، خالد نہ تو بہت زیادہ بذلہ سنج تھا، اور نہ ذکی، مگر خدا معلوم کیوں ہر شخص اُس کے دام میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ ہم بھی اُس کے رطب اللسان تھے، اُس کے الفاظ، اُس کی نگاہیں، اُس کے انداز شباب کی دلآویزی

سے اِس قدر معمور ہوتے تھے کہ اُس کے سارے احباب اُس پر پروانہ وار فدا ہوتے تھے، پروفیسر اُسے ایک اچھا خاصا ذہین طالب علم سمجھتے تھے، مگر سست اور کاہل۔ اُن کے نزدیک اُس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

خالد نے ہماری شام کی مجلسوں میں ایک تازہ روح پھونک دی، اُس کی موجودگی میں ہماری زندہ دلی پر کبھی بدمذاقی کا اثر غالب نہ ہوُا، اگر ہم کسی وجہ سے دل گرفتہ ہوتے تو ہم اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ مناسب موضوع پر بات چیت کرنے لگتے، اُس حالت میں بھی دل نہ گھبراتا۔ غرض یہ کہ خالد ہماری جماعت کا روح و رواں تھا، وہ شمع تھا اور ہم سب اس کے پروانہ وار شیدائی ہیں اُسے دل وجان سے چاہتا تھا، میں نے کسی عورت کو بھی اس قدر شدت سے کبھی نہیں چاہا، اب بھی میں اس محبت کو یاد کرکے شرمندہ نہیں ہوتا بیشک وہ گہری محبت تھی، جس میں مجھے فراق جدائی رشک اور رقابت کی ساری مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں، مثلاً خالد ہم سب کو ایک سا چاہتا تھا مگر احمد کے ساتھ اُس کا برتاؤ اور لگاؤ خصوصیت کا تھا، ہم نے احمد سے اُسے کبھی جدانہ دیکھا، اکثر وہ اُس سے خفیہ بات چیت کرنے لگتا اور کبھی کبھی دو دو تین تین دن کے لئے اُس کے ساتھ علی گڈھ سے غائب ہو جاتا، مگر یہ کس کی مجال تھی کہ کوئی خالد سے سوال کرے، نتیجہ یہ ہوتا کہ میں مضطرب رہتا، خالد کا غائب ہو جانا کسی طرح سمجھ میں نہ آتا، میرے اضطراب کی ایک اور وجہ بھی تھی، میں خود خالد کا مستقل ساتھی بننا چاہتا تھا، اور اسی لئے میں احمد کو اپنا رقیب سمجھ کر اُس سے نفرت کرتا تھا۔

بے اندازہ غور وفکر کے بعد بھی میں خالد کے غائب ہو جانے کی توضیح نہ کرسکا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کے چہرہ میں استعجاب پیدا کرنے والی ایسی کوئی کیفیت نہ تھی جس پر نوجوان اکثر فخر کیا کرتے ہیں۔ اور نہ اُس کا وہ بے پروایانہ انداز تھا جس سے یہ خیال ہو کہ متعدد قوتیں اس میں خفتہ ہیں مگر ہر موقع پر بروئے کار لائی جاسکتی ہیں نہیں، اس کا چہرہ سراسر بے لوث اور کھلا کھلا رہتا تھا، مگر جب اُس پر جوش کا غلبہ ہوتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اُس کی ہر متعلقہ شے ایک شدید قوت کی حامل ہے، اُس نے اپنی قوت کو کبھی فضول صرف نہ کیا۔ اور نہ کسی حالت میں اُس پر تصنع کا رنگ جما، اِن باتوں کے باوجود میں ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے خالد کی فطری حسیات کا پتہ لگایا، شاید اس لئے کہ محبت میں آدمی دل کی گہرائیوں تک سے واقف ہو جاتا ہے، میں نے تمام خطرات کے باوجود خالد کا اعتماد حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا، مجھے خالد کو خوش کرنے میں زیادہ زحمت گوارا نہ کرنی پڑی، میں ایک بے لوث بچے کی طرح اُس کی پرستش کرتا تھا، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ خالد مجھے کبھی مشکوک نگاہوں سے دیکھتا، مگر مجھے یہ معلوم کرکے شدید روحانی تکلیف ہوئی کہ خالد میری بے تکلفانہ قربت کو ناپسند کرتا ہے، اُسے میری گرویدگی سے تکلیف پہنچتی تھی، ایک دن اُس نے مجھ سے کچھ روپے قرض مانگے اور دوسرے ہی دن طنزیہ شکریہ کے ساتھ واپس کردیئے، موسم سرما پورا گذر گیا،

مگر ہمارے تعلقات میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا۔ میں احمد سے اکثر اپنا مقابلہ کرتا، مگر میری سمجھ میں نہ آتا کہ وہ مجھ سے کس طرح قابلِ ترجیح ہے۔ یکایک واقعات نے ایک پلٹا کھایا، اپریل کے وسط میں احمد یکایک سخت بیمار پڑا، اور دو ہی دن میں خالد کے زانو پر سر رکھے ہوئے اس دنیا سے چل بسا۔ کامل ایک ہفتہ تک خالد اُسی کمرے میں بیٹھا روتا رہا، نہ باہر نکلا اور نہ کسی سے ہم کلام ہؤا، ہم سب کو احمد کی جدائی کا سخت صدمہ تھا۔ احمد کے چہرہ کی ابدی زردی اغلباً اُس کی آنے والی موت کا صحیح پیش خیمہ تھی، میں بھی ان واقعات سے کئی دن تک دل گرفتہ رہا، مگر میرے دل میں ایک نامعلوم توقع کسی مخفی طریقہ سے پرورش پا رہی تھی۔

ایک روز شام کے وقت میں صوفے پر تنہا لیٹا ہوا تھا اور میری نگاہیں چھت پر لگی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔۔ کوئی شخص جلدی سے میرے کمرے میں داخل ہؤا اور آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، میں نے اپنا سر اُٹھایا، وہ خالد تھا، وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور صوفے پر میرے پاس بیٹھ گیا، اور بھرائی ہوئی متفکر آواز میں کہنے لگا:

"میں تمہارے ہی پاس آیا ہوں، کیونکہ تم سے زیادہ اور کسی کو میرا خیال نہیں ہے ——— (آنسوؤں کو پی کر) تمہیں معلوم ہے کہ میرا عزیز ترین دوست مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے (کچھ رُک کر) اب مجھے تنہائی شاق ہے۔۔۔۔۔۔ تم میں سے کوئی شخص بھی احمد سے پوری طرح واقف نہ تھا، ایک بھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہؤا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

"تم اُس کی جگہ لینا چاہتے ہو؟" یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ عہد و پیمان کو مضبوط کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں دے دیا، میں کود کر اُس کے سینہ سے چمٹ گیا، میری حقیقی مسرت مجھے دیوانہ بنا رہی تھی، میرے الفاظ کا خزانہ خالی تھا، گلے میں میرا سانس گھٹ رہا تھا، خالد نے مجھ پر ایک غائر نظر ڈالی اور مسکرانے لگا، اس کے بعد ہم دونوں نے چائے پی، وہ برابر احمد کی وفاشعاری کے افسانے سناتا رہا، اُس زرد رُو کمزور لڑکے نے ایک مرتبہ سینہ سپر ہو کر خالد کی جان بچائی تھی۔ میں یہ قصہ سنتا تھا اور اپنی قسمت پر نازاں تھا، رات کے آٹھ بج گئے، خالد اُٹھ کھڑا ہؤا، کھڑکی کے پاس جا کر شیشوں کو کھٹ کھٹانے لگا۔ اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا، میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا: "خالد میں تمہارے بھروسے اور اعتماد کا یقیناً مستحق ہوں"، خالد نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا، "اگر یہ ہے تو ٹوپی اوڑھ لو اور میرے ساتھ چلو۔"

ہم دونوں چل کھڑے ہوئے، ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور شہر کے باہر چل دیئے، شہر کے باہر پہنچ کر تانگہ کو رخصت

کرویا گیا۔ ہم دونوں ایک پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے کہ کوئی پون میل جانے کے بعد خالد رُکا، رات کا تاریک سایہ اب ہر جگہ پڑ رہا تھا، دائیں جانب ہلکے دھوئیں سے لبریز فضا میں کچھ ٹمٹماتے ہوئے چراغ نظر آرہے تھے، بائیں جانب ایک مختصر سے کھیت میں دو سفید گھوڑے چر رہے تھے، ہمارے سامنے دُور تک کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ خالد کا تعاقب کر رہا تھا، وہ یکایک رُکا، سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا کہ بس ہمیں یہیں آنا تھا، سامنے ایک چھوٹا سا تاریک مکان تھا، جس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں میں سے دھندلی روشنی نکل رہی تھی۔ خالد نے کہا "اس مکان میں ایک پنشن یافتہ فوجی رہتا ہے۔ اپنی بہن، اپنی لڑکی اور ایک ماما کے ساتھ اِس فوجی کی زندگی کا زیادہ تر افریقہ اور یورپ میں گذرا ہے، عجب اکھڑ مزاج کا آدمی ہے، میں تمہیں اپنا عزیز بتاؤں گا، تم اُس کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کر دینا، تاش کے کھیل سے اُسے عشق ہے"

میں نے سرِ تسلیم خم کیا، خصوصاً یہ جتانے کے لئے کہ مَیں بھی احمد کی طرح اطاعت شعار بن سکتا ہوں لیکن مَیں تلاشِ حقیقت کے لئے شدت سے بےچین تھا، ہم دونوں مکان میں داخل ہو رہے تھے کہ کھڑکی میں سے میں نے ایک نازک اندام لڑکی کو دیکھا۔ وہ غالباً ہماری ہی منتظر تھی، اور ہمیں دیکھتے ہی غائب ہوگئی، ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اندر کے کمرے میں پہنچے ایک پنجاہ سالہ شخص نے ہمارا خیر مقدم کیا، میں نے اُسے غور سے دیکھا، چہرہ مَلول و غمگین، سر کے بال کھڑے کھڑے، تنگ پیشانی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی بڑی مونچھیں، موٹے موٹے ہونٹ،

"خالد! بہت مدت کے بعد آئے، کہاں رہے؟ بہت انتظار دکھایا، احمد کو نہیں لائے؟"

"احمد تو بیچارے مر گئے!"

"نہیں، مر گئے؟ یہ کون ہیں؟"

"میرے ایک عزیز ہیں، آپ سے ملنے آئے ہیں"

"بہت خوب، بہت خوب، تاش کھیلتے ہیں؟"

"بہت مزے سے"

"نہایت خوب، لو، ہم بھی بیٹھے جاتے ہیں، ذرا خیرن سے کہو کہ گول میز اور تاش کی گڈی لے آئے"
یہ کہہ کر میں اور وہ پنشن یافتہ فوجی دوسرے کمرے میں آگئے، جو پہلے سے زیادہ مختصر تھا" وہ صوفے پر بیٹھ کر تاش پھانٹنے لگا، برابر ہی کرسی پر ایک نہایت دبلی پتلی عورت عینک لگائے بیٹھی تھی، اُس عورت سے تعارف کرانے ہوئے

فوجی نے کہا۔ "یہ پہلا شخص انتقال کر گیا۔ خالد اُن کی بجائے انہیں لائے ہیں۔ دیکھیں یہ کیسا کھیلتے ہیں"۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا خالد غائب ہو چکا تھا۔ تاش کا کھیل شروع ہوا، فوجی میری ذرا سی غلطی پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے زیادہ افسوس کے قابل بات یہ تھی کہ اپنی بہن کی غلطی پر بھی اُس کے غصہ میں ذرا کمی واقع نہ ہوتی تھی۔ اخلاق کے اس مظاہرے کو دیکھ کر جی تو یہی چاہا کہ اس قعرِ مذلت سے بھاگ نکلوں۔ مگر خالد کی محبت کی طلائی زنجیر بے دست و پا کئے ہوئے تھی۔ ایک موقع پر اُس کی بہن فوجی کے توہین آمیز الفاظ کو ضبط نہ کر سکی اور اپنے سنگ دل بھائی سے کہنے لگی:۔ "تمہیں اپنی بیوی کی موت کا باعث ہوئے، کیا اب مجھے بھی کھڑے کھڑے قبر میں اتارنا چاہتے ہو، تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، ہرگز نہیں"۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس مکالمہ کے دوران میں میری حالت کسی طرح قابلِ رشک نہ تھی۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر خالد نے مجھے اس مصیبت میں کس غرض سے پھنسایا ہے۔ میں تاش کھیلنے میں ماہر نہیں تھا، مگر اُس روز معمول سے زیادہ خراب کھیل رہا تھا، یہ کشمکش کوئی دو گھنٹہ تک جاری رہی، مگر اس دوران میں میری روح سمٹ کر ایک نقطہ میں منجمد ہو چکی تھی۔ آخری ربر کے ختم ہونے پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، خالد موجود تھا، اُس کے قریب ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی، وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی، "سکینہ! ذرا میرا حقہ لاؤ" فوجی نے کہا۔ لڑکی ہوا ہو گئی، وہ کچھ بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی، بہت پتلی دبلی، چہرہ زردی مائل، مگر میں نے آج تک نہ ایسی رسیلی آنکھیں دیکھیں اور نہ ایسے پیارے دلفریب بال دیکھے۔ ربر ختم ہوا، خدا خدا کر کے روپے دے کر میں نے اپنی جان چھڑائی، فوجی حقہ گڑگڑانے لگا۔ خالد نے سکینہ سے میرا تعارف کرایا، ہم دونوں چند منٹ تک بدحواس سے رہے۔ لیکن چند ہی منٹ میں خالد نے حسبِ معمول سب کو بشاش اور بے تکلف بنا دیا، اُس کی روح کی دلآویزی بہت تھوڑے عرصہ میں پورے ماحول میں سرایت کر جاتی تھی، کبڑی ماما نے آ کر میز پر دسترخوان بچھایا، ہم سب کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

خالد کے عضو عضو سے مسرت و انبساط کی شعاعیں نکل رہی تھیں، خوب بے تکلفی سے، وہ چٹ پٹی کہانیاں سنانے لگا، فوجی کے قہقہوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں سکینہ کو دیکھنے لگا، اُس کی نظریں خالد پر جمی ہوئی تھیں، میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ اُس کی محبوبہ ہے، اور اُسے دل سے چاہتی بھی ہے۔ اُس کے لب خفیف سے جُدا تھے، اُس کا سر آگے کو جھکا ہوا تھا، اور اُس کے چہرہ پر مسرت کا ایک دلکش رنگ رقص کر رہا تھا، کبھی کبھی وہ آہیں بھرنے لگتی اور پھر خود بخود ہنسنے لگتی تھی، میں خالد کی خوش نصیبی پر مسرور تھا، مگر ساتھ ساتھ خدا پناہ میں رکھے اُس پر

رشک آمیز نگاہیں بھی ڈال رہا تھا،

کھانے کے بعد ہم دونوں رخصت ہوئے، سکینہ ہمیں رخصت کرنے دروازہ تک آئی، اور خالد سے کہنے لگی، ———

"اب کب آؤ گے ؟"

"دو تین دن میں"

"ضرور آنا"

"یقیناً"

(میری طرف اشارہ کرکے) "انہیں بھی اپنے ساتھ لانا"

"ضرور لاؤں گا"

"اچھا خدا حافظ"

راستہ میں مجھے یہ انوکھا قصہ معلوم ہوا ———

خالد سے اس فوجی کا اچانک چھ ماہ ہوئے تعارف ہوا تھا، بارش میں رات کے وقت خالد شہر کی جانب شکار سے واپس آرہا تھا، کہ شاہراہ کے قریب ہی اُسے گالیاں بکنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیں، اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی، وہ اُس آواز پر چل کھڑا ہوا، تھوڑی ہی دور ایک گڑھے میں ایک شخص اپنی مضروب ایڑی لئے ہوئے چلا رہا تھا، یہ وہی فوجی تھا جس سے ہم بخوبی واقف ہو چکے ہیں، بڑی دقت سے اُس نے اُسے اُٹھایا، اُس کے مکان تک لے گیا، اُسے اُس کی خوف زدہ بہن اور بیٹی کے سپرد کیا، اور خود ڈاکٹر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی جستجو کے بعد ڈاکٹر ملا اُسے اپنے ساتھ لے کر فوجی کے مکان پر آیا، پھر شہر سے دوا لایا، اسی اثنا میں پو پھٹنے لگی، خالد بہت زیادہ تھک چکا تھا، اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر شہر کی جانب واپس ہو، سکینہ سے اجازت لے کر صوفے پر لیٹ گیا، نیند کا غلبہ ہوا، صبح آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ گھر والوں سے اجازت مانگی، مگر انہوں نے چائے کے لئے اُسے ٹھیرا لیا۔ رات میں اُس نے دو مرتبہ سکینہ کو دیکھا تھا، مگر صبح کو دیکھنے سے سکینہ کی ہیئت نے اُس کے دل پر ایک عجب خوشگوار اثر پیدا کیا، سکینہ کی پھوپھی نے خالد کی جانفشانی اور مہربانی کا شکریہ ادا کیا، مگر خود سکینہ خاموش رہی۔ چائے دانی میں سے خالد کی پیالی میں چائے انڈیلتی رہی، پھر اُس نے بالائی کی پلیٹ اور شکر دان اُس کی جانب بڑھا دیا، اسی اثنا میں فوجی بیدار ہوا اور پکارنے لگا

"کوئی ہے؟ سب مر گئے، حقہ لاؤ"

اُس کی بہن لپک کر اُس کی خواب گاہ میں گئی، وہ پھر چلّایا "ہاں پھر اُس ظالم کا کیا ہوا، اُس کم بخت کا نام تو بتاؤ۔ کیا وہ چلا گیا؟ ——"

خالد۔ "نہیں۔ جناب! میں موجود ہوں، کہئے آپ کا مزاج اب کیسا ہے؟"

"ہاں اب ذرا اچھا ہوں، ذرا یہاں کرم کیجئے"

خالد کمرے میں داخل ہُوا۔ فوجی نے اُس کو دیکھا، اور کہا،

"آپ کا شکریہ، آپ پھر کبھی ضرور آئیے اور مجھ سے ملئے۔ آپ کا کیا نام ہے؟"

"خالد"

"بہت خوب، آپ ضرور تشریف لائیے۔ اب آپ کو یہاں ٹھیرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے گھر پر آپ کی تلاش ہو رہی ہوگی"

خالد نے سلام کیا، اجازت چاہی، اور چل کھڑا ہُوا، اس کے بعد آنا جانا شروع ہوگیا، پھر جلد جلد اور بے تکلفی کی ملاقاتیں ہونے لگیں، موسم گرما آگیا —— خالد اکثر بہن کر ہاتھ میں بندوق لے لیتا، اور چل کھڑا ہوتا، لوگ یہ خیال کرتے کہ وہ شکار کو گیا ہے، حالانکہ وہ سیدھا فوجی کے مکان پر پہنچتا، اور شام تک کہیں نہ نکلتا رہتا۔

سکینہ کے والد نے فوج میں پچیس سال ملازمت کی تھی، اُن کی ملازمت کا زیادہ حصّہ جنوبی افریقہ، مصر، سوڈان دردانیال اور فلینڈرس میں صرف ہُوا تھا، سالہا سال آبادی سے دُور فوجی کیمپ میں مقیم رہے۔ اور انگریزی افسروں کی نیم سرکاری اور نیم سوشل صحبت میں وقت گذارتے رہے، رفتہ رفتہ اُن کی عادتیں بھی مغربی ہوگئیں، پنشن لینے کے بعد جب وطن میں آئے تو ہزار ہا دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، گردھن کے پکّے تھے، شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر اپنا مکان مشرقی عزیزوں اور دوستوں سے علیحدہ بنا لیا، اُس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا چمن تیار کرایا، اُسی میں رہتے تھے۔ وطن کے احباب اور اعزا سے بہت نالاں تھے، نہ وہ کبھی کسی کے پاس جاتے نہ اُن کے پاس کوئی آتا تھا، کھنا پڑتا کچھ یوں ہی جانتے تھے، مگر ظاہری بھدّے پن اور بے تکی باتوں کے باوجود کافی ہوش مند اور چالاک تھے، اور ضرورت کے وقت ریشہ دوانی تک کر گذرتے تھے، اُن میں فطرت نے خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، بالطبع بہت ضدی اور خود پسند واقع ہوئے تھے، معمولاً کج خلق اور نامہربان معلوم ہوتے تھے، بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر ضد کرنا اُن کا شیوہ تھا، اُن کے خیالات نے ایک عجیب تمسخر آمیز صورت اختیار کر لی تھی، ایک مرتبہ ہم سب بیٹھے ہوئے اُن سے شادی پر گفتگو کرنے

لگے، فرمایا "شادی؟ اُسے لعنت بھیجو، دیکھو میں کسی کو اپنی لڑکی سے شادی نہ کرنے دوں گا - وہ کیا کرے گا - وہی نا
میں نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا، یعنی اُسے اِدھر اُدھر لیئے پھرے گا - علاوہ ازیں پھر میں کس کے ساتھ رہوں گا
لاحول ولا قوۃ"

امید ہے کہ میں نے کافی وضاحت کے ساتھ حاضرین سے سکینہ کے والد کو روشناس کر دیا ہے، خالد کا وہاں
اور اس قدر پابندی سے جانا ظاہر ہے کہ محض سکینہ کی وجہ سے تھا، مجھ سے خود خالد نے پہلے ہی روز یہ کہہ دیا تھا۔
"میں سکینہ سے محبت کرتا ہوں، کیسی پیاری لڑکی ہے، اُس نے تمہیں بھی پسند کیا ہے"

میں شاید یہ عرض کرنا بھول گیا ہوں کہ اس وقت تک میں عورتوں کی صحبت سے بہت خائف تھا اور اسی لئے
سے اجتناب کیا کرتا تھا - سکینہ پہلی لڑکی تھی جس سے مجھے ضرورتاً ہمکلام ہونا پڑا - ویسے تو سکینہ کوئی غیر معمولی لڑکی نہ تھی،
مقدس ہندوستان کی پوری آبادی ایسی شریف النفس لڑکیاں بہت کم پیدا کرتی ہے، آپ ضرور دریافت کرنا چاہتے ہونگے
کہ یہ کیسے؟ میں اس کا مختصر سا جواب دیئے دیتا ہوں کہ میں نے اُس کی کسی حرکت میں بناوٹ، تصنع اور ریاکاری کا شائبہ
تک نہ دیکھا - مجھے اُس کا تبسم زیر لبی مدت تک یاد رہے گا - اُس کی دل میں اُتر جانے والی باریک آواز، اُس کے لطیف
نازک قہقہے، اُس کی متوجہ نگاہیں میں کبھی نہ بھولوں گا - اُس کے چہرہ سے بمشکل کسی توقع کا اندازہ ہو سکتا تھا، مگر یہ ناممکن تھا
کہ آپ اُسے دیکھ کر اُس کی تعریف نہ کریں - اس طرح جیسے ایک گھنے جنگل میں کسی پوشیدہ شاخ پر کوئی پرند چہچہاتا ہے، اور اُس
کے لحن پر سننے والا عش عش کرتا ہے۔

حضرات! مجھے یقین ہے کہ آپ چونکہ مہذب اور تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے دوران حیات میں . . . . . . نہیں
بلکہ عالم شباب میں آپ بھی کسی پر فریفتہ ہوئے ہونگے، اور آپ کو بخوبی علم ہو گا کہ محبت کس طرح پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی
ہے، بدیں وجہ میں اس مبحث کو نظر انداز کرتا ہوں اور اُس تفصیل سے آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا کہ میرے
دل میں محبت کیسے پیدا ہوئی اور منزل بمنزل کیسے بڑھی - مختصر یہ کہ میں سکینہ کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا، اور روز افزوں
کی لذتوں اور ملاقات کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا - سکینہ کے گھر ہم دونوں اکثر جایا کرتے، میں اُس کے
باپ کے ساتھ تاش کھیلنے لگتا، اور اُس کہن سال فوجی کی بدمزاجیوں کا نشانہ بنتا - لیکن محبوب کی قربت بجائے خود
ایک مسرت تھی، میں نے اُس امڈتے ہوئے جذبہ کو روکنے کی کبھی کوشش نہ کی، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ قبل اس
کہ میں اس جذبہ کی صحیح نوعیت سے واقف ہوں، یہ طوفان میرے قبضۂ قدرت سے تجاوز کر گیا، میں نے خفیہ طور پر جذبہ
کی پرورش کی اور اغیار کی نگاہوں سے اُسے ہمیشہ بہت پوشیدہ رکھا - اس جذبۂ خاموش کے وقتی اُبھار اور ابال کو میں

ہمیشہ تفریحِ طبع کا ذریعہ سمجھا۔ نہ میری بھوک زائل ہوئی، اور نہ نیند، پھر بھی شبانہ روز میں سکینہ کے جذبات کے اُس تموّج کا احساس کرتا رہتا تھا جو محبت کی ایک صحیح علامت ہے۔

حیات کی وہ کشاکش جس سے مجھے اکثر دوچار ہونا پڑا، ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر بھی لکھ سکتا ہے، میرے قلم میں وہ طاقت نہیں کہ میں اُن کا مرقع پیش کرسکوں، مثلاً ایک مرتبہ خالد اور سکینہ باغ سے برآمد ہوئے، سکینہ کا چہرہ محبت اور مسرت کی تابش سے جگمگا رہا تھا۔ اور اُس کے اعضا پر شگفتگی کے وہ تمام اثرات موجود تھے جو غیر معمولی انبساط اور خوش نصیبی کی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ سکینہ مکمل طور پر خالد کی حیات میں پیوست ہوگئی تھی، حتیٰ کہ بے خبری کے عالم میں اُس کے حرکات و سکنات کا تتبع کرنے لگی تھی، اُس کی نگاہیں خالد کی نگاہیں تھیں اُس کا قہقہہ اور تبسم خالد کا قہقہہ و تبسم تھے، اب تک میری یاد میں وہ لمحات محفوظ ہیں جو اُس نے خالد کے پہلو میں گذارے تھے، اور سرشارِ محبت ہوکر اُٹھی تھی،

مگر خالد اب تک آزاد تھا، سکینہ کی عدم موجودگی میں خالد کو کبھی اُس کا خیال تک نہ آتا تھا، اب تک وہ ویسا ہی آزاد منش، بے خبر، ہنس مکھ نوجوان تھا، اُس کی زندگی کے کسی پہلو میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی ــــــ

وقت گذرتا گیا، وہ دونوں نہایت شادان و فرحاں تھے، اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اُن کی خوشیوں کے واقعات مفصل بیان کروں، آخر کار مجھے محسوس ہونے لگا کہ سکینہ کی طفلانہ سبک اندازی نے ایک اضطراب آمیز وقار کی صورت اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ اُس بات کا خطرہ نظر آنے لگا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا، یعنی خالد کے جذبات ختم ہونے لگے، اُس کے دل کی گہرائیوں میں سرد مہری آچلی، اس احساس نے مجھے مسرور بھی کیا اور مغموم بھی، مگر مجھے خالد پر ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ اب اُن کی ملاقاتیں کم اور مختصر ہوتیں، سکینہ کی آنکھوں میں اکثر آنسو نظر آتے، شکوے شکایت کے دفتر کھلتے، ملامت آمیز لہجہ سنائی دیتا، اور اکثر رونا دھونا بھی ہوتا، میں خالد سے اکثر کہتا "آج سکینہ کے گھر چلو گے؟" وہ سرد مہری سے مجھے دیکھ کر کہہ دیتا "نہیں آج تو ارادہ نہیں"۔ میں ایک طویل عرصہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں احمد کا صحیح جانشین نہ ہوسکا، وہ مجھ سے کہیں زیادہ اطاعت شعار اور احمق تھا۔

ایک بات اور یاد آگئی، افسوس ہے کہ میں نے اب تک کیوں نہ کہی، اب تک میں نے آپ سے اپنے دوست ظفر کا تعارف نہ کرایا اُس کی عمر پچیس سال کی ہوگی، گذشتہ دس سال سے وہ علی گڈھ میں تعلیم پا رہا تھا، ظفر میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی ظاہری حسن نہ تھا، چہرہ لانبا، زرد زرد چھوٹی چھوٹی بادامی آنکھیں، ناک لمبی مگر آگے سے جھکی ہوئی، ہونٹ پتلے مگر ہموار، آواز بھی اکثر کانوں کو بھلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر اُس کے ساتھ ہی ذکی الطبع، تیز فہم، ہوشمند

اور شیریں گفتار تھا، اکثر ایسی برجستہ چھوٹی سی مثل کہہ کر ہمیں خاموش کر دیتا، کہ ہم اس پر استعجاب کی نظریں ڈالنے لگتے۔ ظفر ایسے طالب علموں کے لئے موت کا فرشتہ تھا جو ٹھوس مضامین کے مطالعہ سے بھاگتے ہیں، اور چند بے معنی اور لغو غزلیں کہہ کر سامعین سے داد لینا چاہتے ہیں، مگر یہ تعجب ہے کہ خود ظفر کو ہم نے کبھی پڑھتے نہ دیکھا تھا، ظفر اُس محبت کا مذاق اُڑاتا تھا جو مجھے خالد سے تھی، پہلی مرتبہ میں نے اُس کے طنزیہ فقرات سنے، اور کہہ دیا کہ جاؤ میرا سر نہ کھاؤ، دوسری مرتبہ میرا غصہ کم ہوا، میں نے متانت سے اُسے سمجھانا چاہا کہ یہ محبت اور دوستی تمہارے دائرۂ ادراک سے باہر ہے اس کے بعد وہ کچھ سمجھ گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہم دونوں گہرے دوست ہو گئے۔ ———

پندرہ دن سے میں نے سکینہ کو نہ دیکھا تھا۔ دل مضطرب و بے چین تھا، غرور، نخوت، محبت، آنے والے اتفاق کا ایک دھندلا سا پرتو، متعدد اور مختلف جذبات دل اور دماغ میں طوفان برپا کئے ہوئے تھے، ایک ڈوبتے ہوئے دل کو اپنے پہلو میں لے کر میں چل دیا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں اُس کے مکان تک کیسے پہنچا، ہاں اس قدر ضرور یاد ہے کہ راستہ میں دو تین جگہ بیٹھ بیٹھ گیا، تھکن کی وجہ سے نہیں بلکہ جذبات کی فراوانی کی وجہ سے، مجھے دور سے دیکھتے ہی سکینہ میرا خیر مقدم کرنے کے لئے لپکی، اور بے اختیار ہو کر پوچھنے لگی۔

"خالد کہاں ہیں"

"وہ تو نہیں آئے"

"نہیں آئے! کیوں؟"

"وہ ایک کام کی وجہ سے رُک گئے"۔

مجھے اس کا مطلق علم نہ ہوا کہ میں نے کیا کہا، مجھے آنکھیں اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی، سکینہ میرے سامنے خاموش اور ساکت کھڑی تھی، میں نے ہمت کر کے اُسے دیکھا، اُس نے منہ پھیر لیا، دو بڑے بڑے آنسو اُس کے رخساروں پر حرکت کر رہے تھے، اُس کے چہرہ سے ایک فوری اور گہری روحانی کوفت کا پتہ چلتا تھا، شرم، رنج، اور بھرتے کی نمایاں کش مکش اس قدر شدت سے اُس کے ہاتھوں کی حرکات سے ظاہر ہوتی تھی کہ میرے دل میں درد پیدا ہو گیا، میں ذرا آگے کو جھکا، وہ چونکی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

ملاقات کے کمرے میں سکینہ کے والد نے میرا استقبال ان الفاظ سے کیا،

"دوست! آج اکیلے کیسے آئے؟"

"بے شک، میں تنہا آیا ہوں"۔

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر فوجی بہادر ہنستا ہوا دوسرے کمرے میں جاچکا تھا۔
ایسی حالت میں آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ میری پوزیشن کیسی تکلیف دہ تھی، مگر کیا ہوسکتا تھا اس خندۂ بیہم کی علت، غایت؟ سکینہ کی پھوپی اسی دوران میں ایک چھٹی پرانی کتاب ہاتھ میں لئے آموجود ہوئی، میں اُس سے باتیں کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد سکینہ بھی آگئی، بہت نڈھال اور غمگین، پنشن یافتہ فوجی نے خالد پر فقرے چست کرنے شروع کئے، سکینہ جلدی سے اُٹھ کر چل دی، چائے آگئی، میں نے اُن کے ساتھ چائے پی اور رخصت مانگی، فوجی افسر نے مصافحہ کیا اور کہا:-

"مہربانِ من پھر آپ سے کب ملنا ہوگا؟"

میں ہوں ہاں کرکے واپس ہوا، میں درحقیقت اُس سے بے حد خائف تھا۔
سیڑھیوں پر ایک سرد ہاتھ نے میرے شانے کو مس کیا، میں نے مڑ کر دیکھا، وہ سکینہ تھی، کہنے لگی۔

"مجھے تم سے کچھ باتیں کہنی ہیں، کل ذرا اول وقت آجانا، یہ سے باغ میں، ابا جان کھانے کے بعد سوجاتے ہیں"

میں نے اُس کا ہاتھ دبایا اور چل کھڑا ہوا۔
دوسرے دن سہ پہر کو تین بجے میں فوجی افسر کے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا، صبح کے وقت میں کوشش کرنے پر بھی خالد سے نہ مل سکا، موسم خوشگوار تھا، نازک نازک زرد گھاس موسمِ خزاں کا پتہ دے رہی تھی، چست وچالاک گلہری شاخوں کے گچھوں میں کبھی روپوش ہوجاتی اور کبھی پھر رقص کرنے لگتی تھی، ایک خرگوش باغ کے ایک پوشیدہ سے گوشہ میں جست لگا رہا تھا۔ فوجی افسر کے گھوڑے کا بچھیرا سایہ میں کھڑا ادھر اُدھر بےمعنی نگاہیں ڈال رہا تھا، میں نے نارنگی کے ایک درخت کے نیچے سکینہ کو ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے پایا، اُس کا لباس سیاہ اور کچھ غیر مرتب سا تھا، اُس کی آنکھیں اور اُس کے بالوں کا انداز اُس کی سوزشِ پنہاں کا پتہ دے رہے تھے۔ میں بھی اُس کے پاس بیٹھ گیا، ہم دونوں خاموش تھے، بہت دیر تک وہ نارنگی کی ایک چھوٹی سی ٹہنی کو توڑتی رہی، پھر اُس نے اپنا سر جھکا دیا، اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

"خالد"

میں نے اُس کی جنبشِ لب سے فوراً تاڑ لیا کہ وہ عنقریب رویا چاہتی ہے، میں نے اُس کی تشفی کی اور خالد کی محبت کا یقین دلایا، وہ میری تقریر سنتی رہی اور غمگین انداز سے اپنا سر ہلاتی رہی آہستہ لہجہ میں کچھ کہا اور پھر خاموش ہوگئی وہ ذہن لمحے جن کا مجھے سب سے زیادہ خوف تھا یوں آسانی سے ختم ہوگئے۔ پھر اُس نے جستہ جستہ خالد کے متعلق باتیں کیں۔

"مجھے معلوم ہے کہ اب اُسے مجھ سے محبت نہیں ...... خیر اُس کا خدا حافظ و ناصر ہو۔
"سمجھ میں نہیں آتا کہ بغیر اُس کے میری زندگی کیسے گذرے گی، ساری ساری رات روتی رہتی ہوں۔
"........ یا اللہ! اب کیا کروں .... تو ہی مددگار ہے"
اُس کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں،
"میں اُسے ایسا اچھا سمجھتی تھی، مگر .... وہ ...."

سکینہ نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں، اور اطمینان سے پہلو بدل کر بیٹھ گئی، پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگی
"معلوم ہوتا ہے کہ خالد ابھی ابھی یہاں سے گئے ہیں"

مَیں اُس کے بیانات کو خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ میری روح اک جاں گسل سعادتِ بشری سے مملو ہو رہی تھی، مَیں اپنی نگاہیں اُن نمناک آنکھوں، اُن لانبی ابروؤں اور اُن لرزتے ہوئے لبوں سے نہ ہٹا سکا، کیا اس موقع پر مجھے اجازت دو گے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے جذبات کے اجزا آپ کے ملاحظہ کے واسطے پیش کروں، میں سخت ملول تھا کہ سکینہ میرے علاوہ کسی اور پر جان دیتی ہے، اور کوئی اَور اُس کے دردِ دل کا موجب ہے، مگر میں خوش تھا کہ وہ اپنے دلی جذبات مجھ سے بے تکلفی سے کہہ رہی تھی ہیں مسرور تھا کہ میں نے اُس سے ہمدردی کر کے اُسے شکرگذار ہونے کا موقع دیا، میں دل میں عہد کر رہا تھا کہ میں خالد اور سکینہ کو پھر ایک مرتبہ ہمکنار کرا دوں گا۔ میری یہ فیاضی کس قدر لائقِ تحسین تھی، کبھی یہ بھی خیال گذرتا تھا کہ شاید میرا ایثار اُسکے دل میں میرے لئے کچھ گنجائش پیدا کر دے۔

گھنٹہ گھڑی سے پانچ بجنے کی آواز آئی، شام کی تاریکی درودیوار پر تیزی سے چھا رہی تھی، سکینہ جلد اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ہاتھ میں ایک خط دے کر چل دی۔ میں نے خالد کے لانے کا وعدہ کیا، اور ایک عاشق کی طرح کھڑکی میں سے ہوتا ہوا باغ کے باہر آگیا۔ لفافہ پر یہ الفاظ تحریر تھے، "مسٹر محمد خالد کی خدمت میں"

دوسرے روز علی الصباح میں خالد کے مکان پر پہنچا، میں صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ گو میرا ارادہ نہ صرف بے لوث تھا بلکہ ایک حد تک ایثار سے بھی خالی نہ تھا لیکن خالد کا سامنا کرنے میں مجھے ایک قسم کا تکلف محسوس ہونے لگا، میں کچھ سہما سہما تھا، دل دھڑکنے لگا!! اور رگوں میں خون کی گردش نے غیر معمولی سرعت اختیار کر لی، میں ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ آخر کار خالد کا دروازہ نظر پڑا، میں اُس کے کمرے میں داخل ہوا، یونیورسٹی کا ایک طالب علم جس کی عمر کوئی بیس برس کی تھی اور جس سے میں زیادہ واقف نہ تھا اُس کے پاس بیٹھا ہوا اپنی ایک نظم سنا رہا تھا، نظم میں اُس نے اُس عورت کے جذبات قلمبند کرنے کی کوشش کی تھی جو مرد کی بے وفائی کا شکار ہو جاتی ہے، اُس

کا تسکار جس نے مدتوں اُس کے سامنے محبت اور عقیدت کے راگ گائے ہوں نظم بلند پایہ نہ تھی۔ اٹھارہ اور پچیس سال کی درمیانی عمر میں کالج کے ہزار ہا طلبا محبت کے افسانے، الفت کے خطوط، اور عشقیہ نظمیں لکھنے میں اور دوستوں کو سناتے پھرتے ہیں، دنیا میں اس سے زیادہ جلد فنا ہونے والا اور کوئی لٹریچر نہیں۔ آخر کار نظم ختم ہوئی، طالب علم کو استحقاق سے زیادہ داد ملی۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا۔ اب ہم دونوں تنہا تھے میں نے دل مضبوط کیا اور بغیر رسمی الفاظ کے وہ خط خالد کو دے دیا۔ خالد نے اول تو حیرت اور تعجب کی نگاہیں ڈالیں۔ پھر لفافہ چاک کر کے خط کا مضمون پڑھا، کچھ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"تم آج سکینہ سے مل آئے؟"

"ہاں میں وہاں کل شام تنہا گیا تھا"

"خوب"

"تمہیں اُس کا مطلق کچھ خیال نہیں، کاش تم اُس کی اشک آلود آنکھیں دیکھتے!"

میں نے اپنی پوری فصاحت صرف کرنے کی کوشش کی اور سکینہ کی حالتِ زار کا صحیح مرقع خالد کے سامنے پیش کیا، مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا سگار پیتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"تم نارنگی کے درخت کے نیچے اُس کے پاس بیٹھے . . . . . خوب . . . . . گذشتہ بہار میں اُسی جگہ میں بھی اُس کے ساتھ اُسی بنچ پر بیٹھا کرتا تھا . . . . باغ پر جوشش بہار تھا۔ درخت کی سبز چمکدار پتیاں ہم پر گرتی رہتی تھیں اور میں اپنے ہاتھ میں سکینہ کا ہاتھ لئے ہوتا تھا عجب مسرت کا زمانہ تھا . . . . . . اب پتیاں زرد پڑ گئی ہیں اور نارنگیاں بھی ترش ہو گئی ہیں"

یہ تقریر سن کر مجھے غصہ آ گیا، خالد کی سرد مہری اور ظلم آرائی پر میں اُسے ملامت کرنے لگا "آخر اُس لڑکی سے یوں یکایک دست بردار ہو جانے کا تمہیں کیا حق حاصل ہے، بالخصوص ایسی حالت میں جب تم نے اُس کے دل میں شمع محبت روشن کی، اور اُسے اپنا شیدائی بنا لیا" میں نے خالد کی منت سماجت کی اور اُسے ترغیب دی کہ وہ کم از کم آخری مرتبہ پھر سکینہ سے مل آئے۔ خالد خاموشی سے میری تقریر سنتا رہا۔

خالد۔ "یہ صحیح ہے کہ دوست کی حیثیت سے تمہیں میرے افعال پر نکتہ چینی کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن بہتر ہو کہ اس سے پیشتر میرا جواب سن لو" یہ کہہ کر وہ کچھ رکا اور مسکرانے لگا۔

"سکینہ ایک بہترین لڑکی ہے" اُس نے کہا "اُس نے میرے ساتھ کوئی بھی برائی نہیں کی۔ اس کے برخلاف میں

اُس کا بے حد مرہونِ منت ہوں، اُس کی نوازشوں کو میں کبھی نہ بھولوں گا، مگر اب میں نے اُس کے پاس جانا، اور اُس کی پروا کرنا ترک کر دیا ہے، اُس کی ایک معمولی سی وجہ ہے، بہت معمولی سی"

"وہ کیا وجہ ہے" میں نے سوال کیا۔

"خدا جانے کیا...... جب تک میں نے اُس سے محبت کی میں ہمہ تن اُس کا تھا، میں نے مستقبل پر کبھی غور نہ کیا۔ میری ہر چیز کی حتیٰ کہ میری حیات تک کی وہ حقدار اور مالک تھی...... مگر اب میرا یہ جذبہ ختم ہو گیا ہے، شاید تم مجھے لغو خیال کرو گے کہ میں محبت کے جذبات سے بچوں کی طرح کھیلتا رہا۔ مگر کیوں؟ اُس پر ترس کھا کر! اگر وہ ایک معقول لڑکی ہے تو اب اُسے تمہارے ترس کھانے کی پروا نہ ہو گی، اور اگر تمہاری ہمدردی سے وہ مطمئن ہو جاتی ہے تو مجھے اُس کی پروا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے......"

خالد کے ان ظالم اور بے رحم الفاظ نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی، بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ اُس ہستی کے متعلق تھے جس کا میں شیدائی تھا، رگوں میں میرا خون کھولنے لگا، خالد سے اگر میں مرعوب نہ ہوتا تو یقیناً میں اُس سے دست و گریباں ہو جاتا۔ گو میرے دلی جذبات میرے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے، مگر خالد نے اُن کی مطلق پروا نہ کی، ٹوپی سر پر رکھ کر وہ چلنے لگا، میں نے دریافت کیا،

"کہاں جاتے ہو"

"سیر کرنے، اُس طالب علم کی نظم نے اور تمہاری بکواس نے دردِ سر پیدا کر دیا ہے"

"تم خفا ہو گئے؟"

"بالکل نہیں" مسکراتے اور مصافحہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"اچھا، سکینہ سے کیا کہہ دوں؟"

"رخصتی سلام کہہ دینا" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا، میں نے زینہ پر اُسے پھر پکڑ لیا۔

"کیا وہ بہت پریشان ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"بہت، نہایت"

"بیچاری کی تسلی کرتے رہنا، اب تو تم اُس کے چاہنے والے ہو"

"ہاں، مجھے اُس سے اُنس ضرور ہے"

"جی، اُنس کس جانور کا نام ہے عشق" اُس نے مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ہم دونوں جدا ہو گئے۔ میں مکان

پر واپس آیا، مگر مجھے بخار چڑھا ہوا تھا،

"میں نے اپنا فرض انجام دیا" میں نے اپنے دل میں کہا۔" خود غرضی کو پس پشت ڈالا، خالد کو ترغیب دی کہ وہ سکینہ کے پاس پھر واپس جائے، اب میں حق پر ہوں"۔

خالد کے بے پرواہانہ انداز نے مجھے مجروح کر دیا، اُس نے مجھ پر رشک آمیز نگاہیں ہی نہ ڈالیں، بلکہ مجھے ہدایت کی کہ میں اُس کی تسلی کرتا رہوں ...... کیا سکینہ کوئی معمولی لڑکی ہے، کیا وہ ہمدردی کی بھی مستحق نہیں، مگر اس سے کیا حاصل؟ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی، ...... خالد سے نا امید ہو کر بھی اُس کا دل نہ پسیجا ...... مگر ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد ...... میری وفا شعاری اس کے دل پر اثر کر جائے، اِس وقت مجھے اپنے حقوق پیش نہیں کرنے چاہئیں، میں سراسر اُسی کا بندۂ بے دام بن جاؤں گا، کیا پھر بھی سکینہ مجھ سے محبت نہ کرے گی؟

یہ خیالات تھے جن میں میں اپنے پروفیسر کے مکان پر ۱۹۰۳ء کے زمانہ میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا کبھی رونے لگتا، کبھی غشی کی حالت طاری ہو جاتی، موسم شدت سے تکلیف دہ تھا علی گڈھ کی جہنم نشان گرمی سے کون واقف نہیں ہفتہ میں چھ دن شام کے وقت خوفناک ہوا کے بجائے آندھی، دن بھر لوئی روح فرسا شدت، خدا کی پناہ! صبح ساڑھے سات بجے سے آٹھ نو بجے رات تک گرمی اور لُو سے کہیں بھی عافیت نہ ملتی تھی،

سامعین میں سے ایک نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود اپنی داستانِ محبت سنانا چاہتے ہیں، جی نہیں، آپ تو صرف حیرت انگیز خالد کا ذکر کیجئے"

"معافی چاہتا ہوں، بڑی غلطی ہوئی، دل سے مجبور تھا ...... بڑی غلطی ......"

ایک ہفتہ کے بعد میں پھر سکینہ کے مکان پر پہنچا۔ ملاقات کے کمرے میں گھر کے سارے ارکان موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر سکینہ سپید پڑ گئی۔ غالباً میرے چہرے سے حزن و ملال کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد میں سکینہ سے تنہائی میں بات چیت کر سکا، سکینہ نے کہا۔

"آپ تنہا ہیں"

"بالکل تنہا ...... اور شاید ایک مدت کے لئے"

"آپ نے میرا خط دے دیا تھا؟"

"اُسی دن"

"خوب" وہ سانس لینے کے لئے رُکی۔ میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا، میرے دل میں حاسدانہ

مسرت کا غلبہ تھا، میں نے کہا،" خالد سے اب توقع رکھنا عبث ہے!"

سکینہ نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھا، سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا، کچھ لڑکھڑائی اور کمرے سے غائب ہوگئی میں اور دو گھنٹے وہاں موجود رہا، پھر واپس آگیا، مگر نہایت منفعل اور بدحواس تھا، سکینہ سے محجوب تھا، اور خود اپنی ذات سے شرمندہ، کہتے ہیں کہ ناقص عضو کو جلد سے جلد کاٹ ڈالنا چاہیئے، لیکن اس غریب لڑکی کے دل پر مجھے کیا اختیار تھا۔ بہت دیر تک بستر پر لیٹا ہؤا کروٹیں بدلتا رہا، آخر کار نیند آ ہی گئی،

اس کے بعد میں برابر خالد سے ملتا رہا، اُس کی زبان پر پھر کبھی سکینہ کا نام نہ آیا، سکینہ سے بھی مجھے اکثر ملنے کا موقع ملا، رفتہ رفتہ اُس کو مجھ سے بہت گرویدگی ہوگئی، مگر اُس قسم کی گرویدگی جس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، اُس نے میری ہمدردی کی دل سے قدر کی، مجھ سے گھنٹوں رازِ دل کہتی تھی، اور خالد کا ذکر کرتی تھی، اب تک ان تمام مراحل کے بعد بھی خالد اُس کی رگ رگ میں پیوست تھا، میں نے بارہا اُس کے نسوانی غرور کو بیدار کرنا چاہا لیکن وہ یا تو خاموش ہو جاتی یا پھر خالد کے افسانے سنانے لگتی مجھے اُس زمانہ میں اس کا خیال بھی نہ تھا کہ وہ رنج والم جس میں گویائی کا مادہ بڑھ جاتا ہے خاموش کر دینے والے غم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ میرے لئے نہایت کرب اور بے چینی کا زمانہ تھا، رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خالد کا جانشین نہیں ہو سکتا، اور نہ سکینہ کا زریں ماضی از سرِ نو پیدا کر سکتا ہوں، اُس دوران میں وہ بہت دبلی ہوگئی تھی، میری ناکام کوششیں چار سال تک جاری رہیں، پورے چار سال تک، اب تک سکینہ اُسی طرح ملول و غمگین رہتی ہے، اور اُس کی زبان پر اب تک خالد کی محبت کے افسانے جاری ہیں +

عبدالشکور بریلوی

پتیاں

سچے حسن سے سچی محبت پیدا ہوتی ہے۔

دنیا وہ نہیں جسے ہم دیکھیں۔ دنیا وہ ہے جسے ہم تصور کریں۔

دیکھو کہ تمہیں نظر آئے۔ ڈھونڈو کہ تم پالو۔ دوڑو کہ تم پہنچ جاؤ۔

باغبان

چاند سے جھڑپ

ٹھنڈے ٹھنڈے جائے چاند — جلتوں کو نہ جلائے چاند
پہلو میں وہ چاند نہیں — کس سے دیکھا جائے چاند
میری طبیعت بھی خوش ہو — مجھ کو کیا خوش آئے چاند
مجھ کو بھائے جب جانوں — دنیا بھر کو بھائے چاند
مجھ کو رجھائے جب مانوں — عالم بھر کو رجھائے چاند
سب کو بھائے، مجھ کو کیا — مجھ کو بھی تو بھائے چاند
میرے سامنے آ آ کر — میرا منہ نہ چڑائے چاند
مجھ کو تنہا پا پا کر — میرا جی نہ دکھائے چاند
اس کا نتیجہ کیا ہوگا — غور بھی تو فرمائے چاند

میرا گھر محتاج نہیں — میرے گھر سے جائے چاند
مجھ سے ضدوں کی لے لیکر — باہم ضد نہ بڑھائے چاند
مجھ کو کچوکے دے دے کر — پیہم دل نہ دکھائے چاند
حد سے زیادہ دق کرکے — غصہ تو نہ دلائے چاند
میں بھی آپے میں نہ رہوں — اتنا تو نہ ستائے چاند
میں بھی تحمل کھو بیٹھوں — ایسا قہر نہ ڈھائے چاند
اب بھی فسادوں پر تلے — اب بھی شر نہ اٹھائے چاند
اب بھی عقل کے ناخن لے — اب بھی ہوش میں آئے چاند
ورنہ میرے منہ آکر — شاید منہ کی کھائے چاند

ٹیڑھی چالیں ٹھیک نہیں — ان سے باز آ جائے چاند
سیدھی طرح اک کام کرے — الٹے پاؤں جائے چاند
جس سے مرا گھر روشن تھا — اس کو ڈھونڈ کے لائے چاند
جس سے یہ آنکھیں بینا تھیں — اس کا جلوہ دکھائے چاند
جس سے مل کر چین ملے — اس کو لا کے ملائے چاند
جیسے کہ خود نور افشاں ہے — اپنے رخ کو لگائے چاند
یوں ہی میرے گھر کو بھی — بقعۂ نور بنائے چاند
واہ وہ روشن ساعت جب — گھر کا گھر بن جائے چاند

اور جو اس کو لا نہ سکے — مجھ کو منہ نہ دکھائے چاند

لیکن اب میں کیوں چوکوں — دکھ پائے تو پائے چاند
کیوں نہ اک ایسی چٹکی لوں — جس سے تڑپ ہی جائے چاند
مجھ پہ تو چوٹیں کریں اب — اپنی چوٹ بچائے چاند
سورج سے ضو لے لے کر — اپنا نور بڑھائے چاند
نظروں کو جل دے دے کر — اپنا عیب چھپائے چاند
مانگے تانگے جوبن پر — غرہ کرے، اترائے چاند
ظلم ہے اک تاریک کرہ — اپنے کو کہلائے چاند
تھر ہے، صرف اک تودۂ خاک — اپنے کو منوائے چاند

آزاد اب تو سامنے آئے
اب تو آنکھ ملائے چاند

حکیم آزاد انصاری

جھوٹ

”تم جھوٹ بولتی ہو! میں جانتا ہوں تم جھوٹ بولتی ہو“!

”تم نے شور کیوں مچا رکھا ہے؟ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟

یہ اُس نے ایک اور جھوٹ بولا، کیونکہ میں شور نہیں مچا رہا تھا۔ میں نہایت آہستگی کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی اور آہستگی سے باتیں کر رہا تھا جب یہ زہر آلود لفظ ”جھوٹ“ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا نمودار ہوا۔

اُس نے کہا ”مجھے تم سے محبت ہے اور تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا؟“ اور اُس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملا دیئے لیکن جونہی میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گلے سے لگانا چاہا وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ تاریک برآمدے کو طے کر کے وہ کمرے میں داخل ہوئی جہاں ایک مسرور محفل برخاست ہو رہی تھی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ میں یہاں کیونکر آیا تھا؟ اُس نے مجھ سے اس جگہ آنے کو کہہ رکھا تھا اور اسی لیئے میں یہاں موجود تھا۔ میں تمام رات لوگوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میری طرف کوئی نہ آیا نہ مجھے کسی نے مخاطب کیا۔ میں سب کے لیئے اجنبی تھا اور ایک کونے میں سازندوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پیتل کے ایک بہت بڑے باجے کا منہ سیدھا میری طرف تھا۔ اور کوئی اُس باجے میں چھپ کر مجھ پر ٹھٹھا اُڑا رہا تھا اور بار بار ایک کرخت اور ہچکیہ آمیز قہقہے کے ساتھ ہنستا تھا۔ ”ہو! ہو! ہو!“

وقتاً فوقتاً ایک سفید اور خوشبو سے مہکا ہوا بادل میرے قریب آ کر چلا جاتا تھا۔ یہ وہ تھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس طرح دوسروں کی نظریں بچا کر مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھی لیکن ایک اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لیئے اُس کا کندھا میرے کندھے سے آ کر چھو جاتا اور اسی اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لیئے میں اپنی آنکھیں نیچی کر کے اُس کی سفید نورانی گردن کو دیکھ لیتا تھا۔ جب میں نظریں اوپر اُٹھاتا تو مجھے ایک ایسی سفید سنجیدہ اور پُر صداقت یک رُخی تصویر نظر آتی کہ اُس پر ایک مغموم و دلگیر فرشتے کا دھوکا ہوتا۔ میں اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا جو بڑی بڑی روشنی کے لیئے حریص، خوبصورت اور پُرسکون تھیں۔ اُن کی نیلاہٹ میں پتلیوں کی سیاہی چمکتی اور جب کبھی میں اُن میں جھانکتا وہ سیاہ ہو جاتیں اور اُن کی گہرائی اتھاہ معلوم ہونے لگتی شاید وہ لمحہ جس میں میں اُن کی طرف دیکھتا اس قدر مختصر ہوتا کہ میرے قلب کی حرکت کے وقفے بھی اُس سے طویل ہونگے لیکن خوف اور درد و کرب سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ساری زندگی کھنچ کر اُس کی آنکھوں میں سما گئی ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ سے اجنبی ہو جاتا۔ خاموش تنہا، مُردے کی طرح۔ پھر وہ رقص کی ایک گردش کے ساتھ مجھے چھوڑ جاتی۔ میری زندگی

مجھ سے چھین کر اپنے ساتھ لے جاتی اور اپنے بلند قامت مغرور لیکن حسین وجمیل شریک کے ساتھ رقص کرنے لگتی۔ میں اُس شخص کی ہر چیز کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اُس کی جوتیوں کی طرز و وضع کا، اُس کے متناسب اعضا کا، اُس کے پُر پیچ و سرکش بالوں کی لہروں کا، مگر اُس کا بے پروایانہ انداز اُس کی کم نگہی مجھے ذہن میں پیوست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور مجھے خاک کی طرح باطل اور بے معنی بناتی ہوئی نظر آتی تھی۔

جب انہوں نے شمعیں بجھانی شروع کیں تو میں اُس کے پاس گیا اور اُس سے کہا "اب جانے کا وقت ہے۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا"۔

اُس نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا "مگر میں تو اُس کے ساتھ جا رہی ہوں" اور اُس نے اسی شخص کی طرف اشارہ کیا۔ جو میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور اُس نے مجھے چوم لیا۔

"یہ سب جھوٹ ہے" میں نے آہستہ سے کہا

اُس نے جواب دیا "ہم کل ملیں گے۔ تم ضرور میرے ہاں آنا"۔

جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا تو کہر سے بھری ہوئی زرد سی صبح کی شعاعیں اونچے اونچے مکانوں کی چھتوں پر پڑ رہی تھیں۔ سڑک پر صرف ہم دو شخص تھے۔ گاڑی والا اور میں۔ وہ تیز و تند ہوا سے اپنے چہرے کو بچانے کے لئے آگے کو جھک گیا اور اُس کے پیچھے میں نے اپنے چہرے کو آنکھوں تک ڈھانپ لیا۔ گاڑی والے کے دل میں اپنے خیالات تھے اور میرے دل میں اپنے، اُدھر مکانوں کی پختہ دیواروں کے پیچھے ہزاروں لوگ سوئے پڑے تھے اور اُن کے اپنے اپنے خواب اور اپنے اپنے خیالات تھے میرے دل میں اُس کا خیال تھا اور اُس کے جھوٹ کا خیال تھا میں نے موت کا خیال کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ دیواریں جو صبح کا نور جذب کر رہی ہیں مجھے ابھی سے مردہ تصور کر کے میری طرف دیکھ رہی ہیں شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی بے رخی اور سرد مہری سے کھڑی تھیں میں نہیں جانتا کہ گاڑی والے کے خیالات کیا تھے نہ مجھے اُن لوگوں کے خوابوں کا علم ہے جن کو دیواروں نے چھپا رکھا تھا۔ مگر وہ بھی تو میرے خیالات اور خواب نہ جانتے تھے۔

پس ہم بازار کی لمبی سیدھی سڑک پر سے گزرتے گئے صبح مکانوں کی رفیع و بلند چھتوں پر طلوع ہو رہی تھی اور ہمارے چاروں طرف سکون برس رہا تھا۔ ایک خوشبو سے لدا ہوا بادل میرے قریب آیا اور کسی غیر مرئی ہستی نے سیدھا میرے کانوں میں قہقہہ لگایا "ہو! ہو! ہو!"

۴

اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ نہ آئی اور میں بے فائدہ اُس کا انتظار کرتا رہا تیرہ فام آسمان سے ایک دھندلا مٹیالا اندھیرا سا

اُتر کر زمین پر مستولی ہوگیا اور میں نے نہ جانا کہ کب شفق شام میں تبدیل ہوئی اور کب شام سے رات ہوگئی۔ مجھے یہ تمام کا تمام عرصہ ایک طویل رات معلوم ہو رہا تھا۔ میں انتہائے افسردگی میں برابر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے ہموار اور یکساں قدم اُٹھاتا رہا۔ میں اس رفیع الشان مکان سے دور ہی دور رہا جس میں میری محبوبہ رہتی تھی۔ میں ڈیوڑھی کے اُس دروازے کے قریب بھی نہ گیا جس کی دہلیز پر سنہری چھت کا عکس پڑ رہا تھا، بلکہ میں بازار کی مقابل والی طرف اختیار کرکے اسی ایک چال سے پھرتا رہا ــــ آگے اور پیچھے، آگے اور پیچھے۔ جب میں آگے بڑھتا تو میری آنکھیں اُس آب دار دروازے پر جم جاتیں اور جب میں واپس ہونے لگتا تو میں اکثر ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا، تب برف کی تیز تیز سوئیاں میرے چہرے پر گر گر کر اُسے چھلنی کر ڈالتیں اور وہ سوئیاں اتنی لمبی اتنی تیز اتنی ظالم ہوتیں کہ میرے سینے میں اتر جاتیں اور میرے دل کو میرے اس یاس آمیز انتظار پر پژمردگی اور غصے کے تیروں سے پاش پاش کر دیتیں۔ برفانی ہوا چیختی چلاتی ہوئی روشن شمال سے تاریک جنوب کو چل رہی تھی۔ وہ مکانوں کی برفانی چھتوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی نیچے اترتی تھی اور میرے چہرے پر برف کے چھوٹے چھوٹے تیز گالوں کے تھپیڑے لگاتی ہوئی سنسان کوچے کی ان شمعوں کے شیشوں سے جا کر ٹکراتی تھی جن میں تنہا زرد رو شعلہ سردی سے کانپ کانپ کر تند و تیز ہوا کے آگے جھک جھک جاتا تھا۔ اس بے کس و بے نوا شعلہ کو دیکھ کر میں بہت رنجیدہ ہوا۔ اُس کی زندگی بس رات کی رات تھی اور میں نے خیال کیا کہ اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کوچہ میں حیات کی ایک رمق بھی باقی نہ رہ جائے گی اور صرف برف کے گالے خالی فضا میں اُڑتے اُڑتے پھریں گے اور زرد رُو شعلہ اس تنہائی اور سردی میں کانپتا اور ٹھٹھرتا رہے گا۔

میں اُس کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ تنہا شعلہ اور میں ایک ہی جیسے ہیں، سوائے اس کے کہ میرا فانوس اُس کی طرح خالی نہ تھا، کیونکہ کبھی کبھی کوئی انسان اُس مقام پر آ نکلتا تھا جسے میں اپنے قدموں سے ناپ رہا تھا، وہ چُپ چاپ میرے پیچھے پیچھے بڑھتے چلے آتے، میرے پاس سے گزر جاتے اور یکایک کسی خیالی تصویر کی طرح اُس سفید عظیم الشان عمارت کے کسی کونے کے پیچھے غائب ہو جاتے۔ پھر دوبارہ وہ اس کونے کی اوٹ سے نمودار ہوتے میرے قریب پہنچتے اور پھر آہستہ آہستہ کہر سے لدی ہوئی وسیع فضا میں جسے خاموشی سے گرنے والی برف نے پیدا کر رکھا تھا جذب ہو جاتے۔ لپٹے لپٹائے بے وضع و قطع اور خاموش، وہ ایک دوسرے سے اور مجھ سے ایسی مماثلت رکھتے تھے کہ ایسا ظاہر ہوتا جیسے بیسیوں آدمی میری ہی طرح، اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، خاموش ہیں اور اپنے پیچ در پیچ اور الم انگیز خیالات میں منہمک ہیں۔

میں اُس کا انتظار کرتا رہا اور وہ نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس درد و کرب میں چیخ چیخ کر کیوں نہ رویا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اُس وقت کیوں ہنستا تھا اور خوش تھا، اور اپنی انگلیوں کو اس طرح بند کرتا تھا جیسے وہ کسی خونخوار جانور کے پنجے ہیں، اور

ہے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے فشار میں مَیں اُس زہریلے سانپ کو پیس رہا ہوں جس کا نام "جھوٹ" ہے۔ وہ میری بانہوں سے لپٹا ہوا تھا اور میرے قلب کو ڈس رہا تھا یہاں تک کہ میرا سر اُس کے زہر سے چکرانے لگا، دنیا کی ہر بات ایک "جھوٹ" ہے۔ اُس وقت جب میں ابھی پیدا نہ ہوا تھا اور اُس وقت کے درمیان جب مجھے یہ زندگی ملی ایک حدِ فاصل تھی جو اٹھ گئی اور میں نے خیال کیا کہ میں ہمیشہ سے زندہ ہوں اور اگر یہ نہیں تو پہلے کبھی نہ تھا۔ اور ہمیشہ میری زندگی سے پہلے اور میری زندگی کے دور میں اُس نے مجھ پر حکومت کی ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ اُس کا کوئی نام اور کوئی جسم بھی ہے اور اس کے وجود کی کوئی ابتدا اور کوئی انتہا بھی ہے۔ اُس کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ زندہ تھی جس نے جھوٹ بولا اور جس نے ہمیشہ ایک ابدی انتظار میں رکھا اور کبھی نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں، مگر میں ہنسا۔ برف کی تیز سوئیاں میرے دل کو زخمی کر رہی تھیں اور کوئی غیر مرئی ہستی میرے کان میں قہقہے لگا رہی تھی: "ہو! ہو! ہو!"

اپنی آنکھیں کھول کر میں نے ایک نگاہ اُس عالی شان مکان کی روشن کھڑکیوں پر ڈالی اور انہوں نے چپکے چپکے اپنی زرد و سرخ زبانوں کے ساتھ مجھ سے کہا:۔

"وہ تم کو دھوکا دے رہی ہے۔ تم یہاں آوارہ منتظر اور مضطرب پھر رہے ہو اور وہ حسن، مسرت اور فریب میں ڈوبی ہوئی اپنے گھر کے اندر اُس بالا قد اور خوبصورت شخص کی سرگوشیاں سن رہی ہے جو تمہیں حقارت سے دیکھتا ہے۔ اگر تم اندر گھس جاؤ اور اُس کو قتل کر ڈالو تو تم ایک نیک کام کرو گے۔ کیونکہ درحقیقت تم جھوٹ کو قتل کرو گے۔"

میں نے اپنے اُس ہاتھ کو زور سے بند کر لیا جس میں چاقو تھا، اور ہنستے ہوئے جواب دیا: "ہاں میں اُسے ضرور مار ڈالوں گا،" کھڑکیوں نے مجھے حسرت اور اندوہ سے دیکھا اور کہا "تم اُسے کبھی قتل نہ کر سکو گے۔ کبھی نہیں، کیونکہ تمہارے ہاتھ کا ہتھیار بھی اُس کی محبت کی طرح جھوٹا ہے۔"

خاموش سائے مدت ہوئی غائب ہو چکے تھے اور اُس زمہریر میں میں اکیلا رہ گیا تھا ـــــ میں اور شعلہ کی بے کس و تنہا زبان سردی اور مایوسی میں کانپ رہے تھے۔ پاس کے گرجا میں سے گھنٹے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ اُداس و دلدوز آواز تھرتھراتی اور سسکیاں لیتی ہوئی فضا میں پرواز کرتی اور پھر ہوا میں دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے برف کے گالوں میں گم ہو ہو جاتی تھی۔ میں نے ضربوں کو گننا شروع کیا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی: کلاک نے پندرہ بجائے! یہ ایک پرانا گھنٹہ گھر تھا اور اسی طرح کلاک بھی پرانا تھا، اور گو اس کا وقت درست ہوتا تھا لیکن گھنٹہ اس کا بے تحاشا ہی بجا کرتا تھا، اس طرح کہ اکثر بوڑھے گھنٹہ بجانے والے کو کلاک کے مینار پر چڑھ کر اُس کی زبان کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے بند کرنا پڑتا تھا، میں نے اپنے دل میں کہا، گھنٹے کی اس اداس اور تھرتھراتی ہوئی آواز نے جو کہر کی ظلمت سے الجھی ہوئی اور لپٹی ہوئی ہے آخر یہ "جھوٹ" کس لئے بولا ہے؟ آہ، یہ

بے فائدہ جھوٹ کس قدر ذلیل اور بے سروپا ہے۔

گھنٹے کی آخری آواز کے ساتھ وہ چمکتا ہؤا دروازہ کھلا اور وہ بلند و بالاقد کا شخص سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ صرف اُس کی پشت پر میری نظر پڑی لیکن میں نے اُسے شناخت کرلیا۔ کیونکہ غرور اور تبختر کے اُس پتلے کو ابھی میں نے کل شام ہی دیکھا تھا میں نے اُس کا قدم پہچان لیا جو گزشتہ شام کی بہ نسبت زیادہ ہلکا اور زیادہ مطمئن پڑ رہا تھا۔ میں بھی اکثر اوقات اس گھر سے یوں ہی نکلا تھا۔ اُس کی یہ چال مردوں کی وہی چال تھی جو اُس وقت پیدا ہوتی جب اُن کے لب کسی عورت کے جھوٹے لبوں سے ملتے ہیں۔

۳

میں نے اُس کی منتیں کیں، اُسے دھمکایا، اُس پر دانت پیستا رہا۔

"بتاؤ، مجھے سچ سچ بتاؤ!"

مگر برف جیسے سرد مہر چہرے کے ساتھ، اُٹھے ہوئے متحیر ابروؤں کے ساتھ، سیاہ عمیق چمکتی ہوئی پُر اسرار و پُر سکون آنکھوں کے ساتھ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں"۔

وہ جانتی تھی کہ میں ثابت نہ کرسکوں گا کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے اور یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ اُس کے ایک لفظ سے اُس کے ایک جھوٹے لفظ سے میرے اِن جاں خراش و جاں ستاں خیالات کا تمام بوجھ یکسر ہلکا ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لفظ کا مجھے انتظار تھا اور وہ اُس کے شیریں لبوں سے ٹپکا۔ صداقت کی تمام رنگینیوں کو لئے ہوتے موتی کی طرح چمکتا ہؤا ٹپکا مگر اُس کی گہرائیوں میں اب بھی وہی تاریکی موجود تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کیا میں کلیتہً تمہاری ہی نہیں ہوں؟"

ہم شہر سے دور تھے اور برف پوش کھیت تاریک کھڑکیوں میں سے نظر آرہے تھے۔ اُن کے اوپر تاریکی تھی اور اُن کے چاروں طرف تاریکی تھی، بے حرکت، خاموش تاریکی، لیکن کھیت اپنی ذاتی روشنی سے اس طرح چمک رہے تھے جیسے اندھیرے میں کسی لاش کا چہرہ نظر آرہا ہو۔ کمرہ خوب گرم تھا اور صرف ایک مومی بتّی اُسے روشن کررہی تھی اور اُس بتی کے سرخ شعلہ پر بھی مردہ کھیتوں کی زردی کا اثر پڑتا ہؤا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا "میں حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہوں خواہ وہ میرے لئے کتنی ہی پُرالم کیوں نہ ہو۔ شاید میں اُسے سن کر مر جاؤں لیکن موت میرے لئے بہتر ہے اُس زندگی سے جس میں جھوٹ کو دخل ہو۔ تمہارے لبوں میں ایک جھوٹ ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایک بطلان ہے۔ مجھ سے سچ کہہ دو اور میں ہمیشہ کے لئے تم کو چھوڑ دوں گا"۔ مگر وہ خاموش رہی اور اُس کی متجسس نگاہیں

میرے دل میں اتر گئیں۔ میری روح کو انہوں نے کھینچ کر باہر نکال لیا اور ایک عجیب پرجستجو طریقہ سے انہوں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں چلا کر بولا "میری بات کا جواب دو، ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا"!

اُس نے نہایت مطمئن لہجہ میں جواب دیا "مجھے مار ڈالو۔ بعض اوقات زندگی ایسی ہی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مگر دھمکیوں سے تمہیں حق نہ مل سکے گا"

میں اُس کے سامنے جھک کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھوں کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رو رو کر اس سے رحم اور حق کے لئے التجا کرنے لگا۔

"آہ اے غریب"! اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

میں نے منت سے کہا "مجھ پر رحم کرو۔ میری روح حق کے لئے بیتاب ہے"

میں نے اُس کی شفاف پیشانی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے حق اُس کی اُس باریک مانگ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ میرے دل میں اُس کے سر کو توڑ کر حق کو اُس میں سے نکال لینے کی ناقابلِ ضبط آرزو پیدا ہو رہی تھی اُس کا دل اُس کے سینے میں دھڑک رہا تھا اور میں دیوانہ وار اُس سینے کو اپنے ناخنوں سے پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ انسان کے دل کو عریانی میں دیکھنے کے لئے، خواہ وہ ایک ہی دفعہ کے لئے کیوں نہ ہو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ مومی بتی کا نوکدار زرد شعلہ جواب خاموش ہوا ہی چاہتا تھا بے حرکت ہو رہا تھا۔ مکان کی دیواریں بڑھتی ہوئی تاریکی کے اندر وسعتِ فضا میں گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ غم بے کسی اور ہیبت ہر طرف چھا رہی تھی۔

"آہ اے غریب!" اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

بتی کے زرد شعلے پر تشنج سا طاری ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے وہ تڑپا اور پھر بجھ گیا۔ تاریکی کی چادر نے ہم کو اپنے اندر لپیٹ لیا۔ اب نہ میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا اور نہ اُس کی آنکھوں کو، اور جھوٹ بھی اب مجھے نظر نہ آتا تھا میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ میں سوچتا تھا اور نہ اپنے جسم میں زندگی محسوس کرتا تھا، بلکہ صرف اُس کے ہاتھوں کے مس کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا اور یہ مجھے سچ معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس اندھیرے میں اُس کی دھیمی سی سہمی اور ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"اپنی آغوش میں مجھے چھپا لو۔ میں ڈر گئی ہوں"!

"تم حق معلوم کرنا چاہتے ہو — مگر کیا میں اُس سے واقف ہوں؟ آہ، کاش کہ میں اُس سے واقف ہوتی۔ مجھے بچا لو — آہ، میں ڈر گئی ہوں"!

میں نے اپنی آنکھیں کھول ڈالیں۔ زرد رو تاریکی بلند کھڑکیوں میں سے نکل کر دیوار کے قریب جمع ہو گئی اور اِدھر اُدھر کونوں

بے فائدہ جھوٹ کس قدر ذلیل اور بے سروپا ہے۔

گھنٹے کی آخری آواز کے ساتھ وہ چمکتا ہوُا دروازہ کھلا اور وہ بلند و بالا قد کا شخص سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ صرف اُس کی پشت پر میری نظر پڑی لیکن میں نے اُسے شناخت کر لیا۔ کیونکہ غرور اور تبختر کے اُس پتلے کو ابھی میں نے کل شام ہی دیکھا تھا میں نے اُس کا قدم پہچان لیا جو گزشتہ شام کی بہ نسبت زیادہ ہلکا اور زیادہ مطمئن پڑ رہا تھا۔ میں بھی اکثر اوقات اس گھر سے یوں ہی نکلا تھا۔ اُس کی یہ چال مردوں کی وہی چال تھی جو اُس وقت پیدا ہوتی جب اُن کے لب کسی عورت کے جھوٹے لبوں سے ملتے ہیں۔

۳

میں نے اُس کی منتیں کیں، اُسے دھمکایا، اُس پر دانت پیستا رہا۔

"بتاؤ، مجھے سچ سچ بتاؤ!"

مگر برف جیسے سرد مہر چہرے کے ساتھ، اُٹھے ہوئے متحیر ابروؤں کے ساتھ، سیاہ عمیق چمکتی ہوئی پُراسرار و پُرسکون آنکھوں کے ساتھ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں"

وہ جانتی تھی کہ میں ثابت نہ کرسکوں گا کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے اور یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ اُس کے ایک لفظ سے اُس کے ایک جھوٹے لفظ سے میرے اِن جاں خراش و جاں ستاں خیالات کا تمام بوجھ یکسر ہلکا ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لفظ کا مجھے انتظار تھا اور وہ اُس کے شیریں لبوں سے ٹپکا۔ صداقت کی تمام رنگینیوں کو لئے ہوتے موتی کی طرح چمکتا ہوُا ٹپکا مگر اُس کی گہرائیوں میں اب بھی وہی تاریکی موجود تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کیا میں کلیتہً تمہاری ہی نہیں ہوں؟"

ہم شہر سے دور تھے اور برف پوش کھیت تاریک کھڑکیوں میں سے نظر آرہے تھے۔ اُن کے اوپر تاریکی تھی اور اُن کے چاروں طرف تاریکی تھی، بے حرکت، خاموش تاریکی، لیکن کھیت اپنی ذاتی روشنی سے اس طرح چمک رہے تھے جیسے اندھیرے میں کسی لاش کا چہرہ نظر آرہا ہو۔ کمرہ خوب گرم تھا اور صرف ایک مومی بتّی اُسے روشن کر رہی تھی اور اُس بتی کے سرخ شعلہ پر بھی سرد کھیتوں کی زردی کا اثر پڑتا ہوُا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا "میں حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہوں خواہ وہ میرے لئے کتنی ہی پُرالم کیوں نہ ہو۔ شاید میں اُسے سن کر مر جاؤں لیکن موت میرے لئے بہتر ہے اُس زندگی سے جس میں جھوٹ کو دخل ہو۔ تمہارے لبوں میں ایک جھوٹ ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایک بطلان ہے۔ مجھ سے سچ کہہ دو اور میں ہمیشہ کے لئے تم کو چھوڑ دوں گا" مگر وہ خاموش رہی اور اُس کی متجسس نگاہیں

میرے دل میں اتر گئیں۔ میری روح کو انہوں نے کھینچ کر باہر نکال لیا اور ایک عجیب پرجستجو طریقہ سے انہوں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں چلا کر بولا "میری بات کا جواب دو، ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا"!

اُس نے نہایت مطمئن لہجہ میں جواب دیا "مجھے مار ڈالو۔ بعض اوقات زندگی ایسی ہی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مگر دھمکیوں سے تمہیں حق نہ مل سکے گا"۔

میں اُس کے سامنے جھک کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھوں کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رو رو کر اس سے رحم اور حق کے لئے التجا کرنے لگا۔

"آہ اے غریب"! اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

میں نے منت سے کہا "مجھ پر رحم کرو۔ میری روح حق کے لئے بیتاب ہے"۔

میں نے اُس کی شفاف پیشانی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے حق اُس کی اُس باریک مانگ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ میرے دل میں اُس کے سر کو توڑ کر حق کو اُس میں سے نکال لینے کی ناقابلِ ضبط آرزو پیدا ہو رہی تھی اُس کا دل اُس کے سینے میں دھڑک رہا تھا اور میں دیوانہ وار اُس سینے کو اپنے ناخنوں سے پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا، انسان کے دل کو عریانی میں دیکھنے کے لئے، خواہ وہ ایک ہی دفعہ کے لئے کیوں نہ ہو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ مومی بتی کا نوکدار زرد شعلہ جواب خاموش ہوا ہی چاہتا تھا بے حرکت ہو رہا تھا۔ مکان کی دیواریں بڑھتی ہوئی تاریکی کے اندر وسعتِ فضا میں گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ غم بے کسی اور ہیبت ہر طرف چھا رہی تھی۔

"آہ اے غریب!" اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

بتی کے زرد شعلے پر تشنج سا طاری ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے وہ تڑپا اور پھر بجھ گیا۔ تاریکی کی چادر نے ہم کو اپنے اندر لپیٹ لیا۔ اب نہ میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا اور نہ اُس کی آنکھوں کو، اور جھوٹ بھی اب مجھے نظر نہ آتا تھا میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ میں سوچتا تھا اور نہ اپنے جسم میں زندگی محسوس کرتا تھا، بلکہ صرف اُس کے ہاتھوں کے مس کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا اور یہ مجھے سچ معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس اندھیرے میں اُس کی دھیمی سی سہمی اور ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"اپنی آغوش میں مجھے چھپا لو۔ میں ڈر گئی ہوں"!

"تم حق معلوم کرنا چاہتے ہو —— مگر کیا میں اُس سے واقف ہوں؟ آہ، کاش کہ میں اُس سے واقف ہوتی۔ مجھے بچا لو —— آہ، میں ڈر گئی ہوں"!

میں نے اپنی آنکھیں کھول ڈالیں۔ زرد رو تاریکی بلند کھڑکیوں میں سے نکل کر دیوار کے قریب جمع ہو گئی اور اِدھر اُدھر کونوں

میں اپنا سر چھپانے لگی۔ پھر نہایت آہستہ سے کسی بہت بڑی اور نہایت سفید چیز نے کھڑکیوں میں سے اندر کی طرف جھانکا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کی مردہ آنکھیں ہمیں تلاش کر رہی ہیں اور اپنی نگاہ کے برفانی تاروں سے جکڑ رہی ہیں۔ کانپتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے ساتھ اور زور سے چمٹ گئے۔ اُس نے پھر آہستہ سے کہا "آہ، میں ڈر گئی ہوں"!

۴

میں نے اُسے مار ڈالا۔

میں نے اُسے مار ڈالا اور جب وہ کھڑکی کے قریب ایک بے جان تختے کی طرح چت پڑی ہوئی تھی تو میں اُس کی لاش پر اپنا پاؤں رکھ کر خوب ہنسا۔ یہ ہنسی کسی مجنون کی ہنسی نہ تھی، نہیں! میں اس لئے ہنسا کہ میرا سینہ اب ہلکا ہو گیا تھا، اُس میں اب سکون اور مسرت کی حکومت تھی اور میرے دل سے وہ کرم جھرہ گر پڑا تھا جو اُسے دم بدم کھائے جا رہا تھا۔ جھک کر میں نے اُس کی مردہ آنکھوں میں نگاہ ڈالی۔ وہ بڑی بڑی روشنی کے لئے حریص آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور چینی کی گڑیا کی آنکھوں کی مانند گول اور بے نور نظر آ رہی تھیں۔ میں اُن کو اپنی انگلیوں سے چھو سکتا تھا انہیں کھول سکتا اور بند کر سکتا تھا اور مجھے اُن سے کسی قسم کا خوف نہ آتا تھا کیونکہ اب اُن سیاہ اور عمیق تپلیوں میں جھوٹ اور شک کا دیو موجود نہ تھا جس نے اتنی طویل مدت تک حریصانہ میرا خون چوسا تھا۔

جب انہوں نے مجھے گرفتار کیا تو میں ہنس پڑا اور میری یہ حرکت گرفتار کرنے والوں کو نہایت وحشیانہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے نفرت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر لیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ اور لوگ لعنت اور نفرین بھیجتے ہوئے میری طرف بڑھے لیکن جب انہوں نے میری مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو اُن کے چہرے زرد پڑ گئے اور اُن کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

وہ مجھے دیوانہ کہتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دیوانہ کہہ کر انہیں تسکین ہو جاتی ہے کیونکہ یہی وہ لفظ تھا جو انہیں قتل کے معمے کو حل کرنے میں مدد دیتا تھا — کیونکر ممکن تھا کہ میں ایک عاشق ہو کر اپنی محبوبہ کو قتل کر دوں اور پھر ہنسوں۔ صرف یک موٹا تازہ اور خوش بخوش آدمی مجھے ایک دوسرے نام سے پکارتا تھا جس سے ایک دھچکا سا آ کر مجھے لگتا تھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

"آہ اے غریب آدمی!" اُس نے رحیمانہ لہجہ میں کہا۔ اُس کو بالکل غصہ نہ آیا کیونکہ وہ ترو تازہ اور خوش تھا "آہ اے غریب آدمی!"

میں نے چلا کر کہا "خبردار! مجھے اس طرح مخاطب نہ کرو"۔

میں نہیں جانتا کہ میں کیوں اُس پر جھپٹا۔ میں یقیناً اُسے مارنا نہ چاہتا تھا لیکن مجھ سے ڈرے ہوئے یہ تمام لوگ جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھتے تھے اور زیادہ خائف ہو گئے اور اس طرح چیخیں مارنے لگے کہ مجھے پھر ہنسی آ گئی۔

جب وہ مجھے اُس کمرے میں لے گئے جہاں لاش پڑی ہوئی تھی تو اُس لحیم و شحیم اور مسرور آدمی کی طرف دیکھ کر میں نے پے بہ پے بلند اور پتلی آواز میں کہنا شروع کر دیا "میں خوش ہوں۔ میں خوش ہوں"۔

اور یہ سچ تھا۔

۵

بچپن میں ایک مرتبہ چڑیا گھر میں مَیں نے ایک چیتے کو دیکھا تھا جس کا تصوّر میرے دل میں مدتوں رہا اور مدتوں میرے خیالات اُس کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ دوسرے درندوں کی طرح احمقانہ نشے میں سرشار پڑا نہ رہتا تھا اور نہ ہی بیہودہ طور سے تماشائیوں کی طرف مبہوت ہو کر دیکھتا تھا۔ وہ ایک خطِ مستقیم پر سیدھا ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتا تھا اور ہر بار ایک ہی مقام سے پلٹتا تھا اور ہر دفعہ اُس کی صاف اور چمکیلی کھال اُس کے پنجرے کی ایک ہی سلاخ سے ٹکراتی تھی اُس کا خونخوار سر جھکا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں بالکل سامنے کی طرف متوجہ تھیں۔ کبھی ایک دفعہ بھی اُس نے اِدھر اُدھر نظر نہیں ڈالی۔ دن بھر لوگ آ آ کر اُس کے پنجرے کے سامنے شور مچاتے تھے مگر وہ برابر ایک نہج پر آگے اور پیچھے چلتا رہتا تھا اور کبھی آنکھ اٹھا کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھتا تھا۔ ہجوم میں سے چند مسکراتے تھے مگر اکثر سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے بلکہ افسردگی اور پژمردگی کی اس زندہ تصویر کو دیکھ کر مغموم ہو جاتے تھے ایک آہ بھر کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور جب وہ کچھ دور نکل جاتے تو ایک مرتبہ پھر ایک مستفسرانہ اور متحیرانہ نگاہ اُس پر ڈالتے جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ اُن کی اپنی انسانی حالت میں اور اس مقید درندے کی حالت میں کوئی بات مشترک ہے جو فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اور جب میں بڑا ہوا اور لوگوں کی زبانوں کو اور کتابوں کو ازل و ابد کا تذکرہ کرتے دیکھا تو مجھے وہ چیتا پھر یاد آگیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیشگی اور اُس کے رنج و تعب کی ایک تصویر کو میں نے کبھی دیکھا ہے۔

اُس چیتے کی طرح میں اپنے پتھر کے پنجرے میں بند تھا۔ ٹہلتا تھا اور سوچتا تھا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک سیدھی لکیر پر میں چلتا تھا اور میرے خیالات بھی ایک ایسے ہی خطِ مختصر پر سفر کرتے تھے لیکن یہ خیالات اتنے بوجھل تھے کہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میں نے صرف ایک سر کو اُٹھا رکھا ہے بلکہ مجھے اپنے کندھوں پر ایک دنیا کا بار پڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ تمام خیالات صرف ایک لفظ پر مشتمل تھے لیکن کیا ہی وسیع، کتنا پُر عذاب اور کیسا تباہ کن تھا وہ لفظ!

وہ لفظ: "جھوٹ"

تمام کونوں سے وہ پھنکارتا ہوا نکلتا تھا اور میری روح کے گرد لپٹ جاتا تھا۔ لیکن اب وہ چھوٹا سا سانپ نہ رہا تھا وہ بہت بڑا، خونخوار، شعلہ ریز اژدھا بن گیا تھا وہ مجھ کو ڈستا تھا اور اپنی آہنیں لپیٹوں میں جکڑ کر مجھے نیم جاں کر دیتا تھا۔ میرے سینے میں چھوٹے چھوٹے سانپوں کا ایک طوفان اُمڈا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں درد و کرب سے چیخ اُٹھتا تھا اُس وقت میرے منہ

وہی ایک پھنکارتا ہوا خوفناک لفظ نکلتا تھا "جھوٹ"!

اور جب میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا قید خانہ میں ٹہلتا تھا تو اُس کا بھورا بھورا فرش میری آنکھوں کے سامنے ایک بھورے رنگ کے شفاف غار میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ میرے پاؤں فرش کو چھوتے معلوم نہ ہوتے تھے اور میں خیال کرتا تھا کہ میں کسی ناقابلِ فہم بلندی پر کھڑی کی تاریکیوں میں بہا چلا جا رہا ہوں۔ اور جب میرے سینے سے وہ سنسناتا ہوا نعرہ نکل جاتا تو نیچے سے گہرے اس ناقابلِ نفوذ پردے کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ایک ہیبت ناک گونج اٹھتی اور اتنی آہستہ اور دھیمی ہوتی گویا وہ ہزارہا سال کے زمانے میں سے گزر کر آرہی ہے اور دھند کے ایک ایک بخرے میں اُس کی طاقت کا ایک ایک ذرہ گم ہو گیا ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہاں، نیچے یہ اُس آندھی کی طرح چل رہی ہے جس سے درخت بھی اکھڑ اکھڑ کر گر پڑتے ہیں، لیکن جب یہ میرے کانوں تک پہنچتی تو اس کی بساط اُس مختصر سے لفظ سے زیادہ نہ رہتی جو سرگوشی کی آواز میں کہا جائے "جھوٹ"!

یہ ذلیل اور کمینہ سرگوشی مجھے طیش میں لے آتی اور میں زور سے زمین پر پاؤں مارتا اور چلا کر کہتا "جھوٹ کہیں بھی موجود نہیں میں نے جھوٹ کو مار ڈالا ہے"!

میں جان بوجھ کر پرے ہٹ جاتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب مجھے کیا ملے گا ——— اور انتھاہ غار میں سے آہستہ آہستہ جواب اوپر کو آتا "جھوٹ"!

جانتے ہو، میں نے ایک خطرناک غلطی کی۔ عورت کو قتل کر کے میں نے جھوٹ کو ابدی زندگی دے دی۔ عورت کو کبھی قتل نہ کرو۔ یہاں تک کہ دعا، رنج اور عذاب سہہ سہہ کر تم اُس کی روح سے سچ کو پا لو۔

۶

تاریک اور خوفناک ہے وہ جگہ جہاں وہ سچ کو اپنے ساتھ لے گئی، اور جھوٹ کو ——— اور وہیں میں بھی جا رہا ہوں۔ شیطان کے تخت کے نیچے میں اُسے پکڑ لوں گا اور اُس کے سامنے جھک کر اور رو رو کر اُس سے کہوں گا "مجھے سچ بتاؤ! مجھے سچ بتاؤ"!

لیکن خدا! اے خدا! یہ بھی تو جھوٹ ہے۔ یہاں تو خلا ہی خلا ہے، صدیوں کا خلاء، بے پایاں خلا، مگر وہ کہاں ہے ——— وہ کہیں بھی نہیں ہے لیکن جھوٹ کو وہ باقی چھوڑ گئی ہے۔ یہ غیر فانی ہو گیا ہے۔ میں ہوا کے ہر ذرے میں اُسے پاتا ہوں اور جب میں سانس لیتا ہوں تو یہ میرے سینے میں داخل ہو کر پھنکارتا ہے اور کاٹ کاٹ کر میرے دل کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔

اوہ! کسی شخص کے لیے حق کی تلاش کتنا بڑا جنون ہے، کتنا بڑا دکھ ہے۔

بچاؤ! مجھے اس دکھ سے بچاؤ!

اندریف ——— منصور احمد

شاعر کی التجا

(محبت کی دیوی سے)

سر جھکائے ہوئے، خاموش پجاری کی طرح
تیرے دربار میں آیا ہوں بھکاری کی طرح

روح افسردگیٔ ذوق سے بے حد ہے ملول
خلشِ شوق کے ناپید ہیں اسبابِ حصول

سازِ دل نغمۂ بیتاب سے یکسر خالی
کشتِ جاں موجۂ شاداب سے یکسر خالی

زندگی خشکیٔ جذبات سے برباد و خراب
بے حسی وہ کہ جوانی بھی مری ننگِ شباب

ذہن ناکام و مقید ہے، نگاہیں محدود
طائرِ شوق کے پرواز کی راہیں مسدود

روح ٹھٹھری ہوئی بیگانۂ تابش ہے الگ
عقل افسردہ و محرومِ نوازش ہے الگ

دل سے جولانیٔ ارماں کی حرارت مفقود
کشمکشہائے تمنا کی جسارت مفقود

قلب پر ابرِ کثافت کی گرانباری ہے
سینۂ سرد پہ خاموشیٔ غم طاری ہے

پھونک دے وہ نفسِ گرم مرے سینے میں
بال پڑ جائے مرے قلب کے آئینے میں

فطرتِ عشق کو اسبابِ ضیا باری دے
دل کے سوئے ہوئے جذبات کو بیداری دے

طائرِ روح کو مل جائے وہ پروازِ خیال
لے اڑے بامِ فلک کو بھی تگ و تازِ خیال

چشمِ پُر شوق کو مخمورِ تماشا کر دے
دل میں "وجدانِ محبت" کا اجالا کر دے

میرے الفاظ میں وہ سوز و اثر پیدا ہو
ہر طرف شعلہ نوائی کا مری چرچا ہو

سارے عالم پہ ہو محویتِ وجداں طاری
جھوم جائے مرے اشعار سے دنیا ساری!!

ذوقی

جوہری

کاروبار کے جھمیلے میں نو بج گئے اور کثرتِ کار کے سبب میرا دماغ چکرانے لگا۔ تازہ دم ہونے کے لئے آخر "چانسری لین" سے نکل کر میں "ام بینک منٹ" کی طرف چل دیا۔

راستے میں دریا کی درخشانی فردوسِ نظر تھی۔ میں بہاؤ کا تماشا دیکھنے کے لئے رکا ہی تھا کہ معاً میرے کان میں یہ آواز آئی: "رات گرم ہے"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو ایک شخص پل پر دیوار سے سہارا لیئے کھڑا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ شخص راندۂ روزگار اور آوارۂ قسمت ہے۔ اگر اس کو جواب دیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ کھانے پینے کا سوال کر بیٹھے۔ میری نظریں اُس کے چہرہ پر مرکوز ہو گئیں۔ اُس کا چہرہ اُس کی پریشانیٔ خاطر کا بھانڈا پھوڑ رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر ذہانت و فطانت کے آثار ہویدا تھے اور اُسکے ہونٹ متحرک اور مرتعش تھے۔

میں نے جواب دیا "رات واقعی گرم ہے لیکن اس جگہ دریا کے قرب کی وجہ سے کچھ خنکی سی پیدا ہو گئی ہے"

اُس نے دریا کے اُس پار نظر ڈال کر کہا: "اُس شخص کے لیئے جو سارا دن فکرِ دنیا میں سر کھپائے لندن بھر میں یہی ایک پُرکیف جگہ ہے جہاں دماغ کو تازگی اور نظروں کو آسودگی ملتی ہے .... پھر اُس نے رک رک کر کہا: زندگی کاوشوں سے لبریز ہے ——— میرا خیال ہے کہ آپ بھی میری طرح تھکے ماندے اور غمِ روزگار کے شاکی ہیں ——— دل چاہتا ہے کہ نام و نمود کی ہنگامہ طرازیوں سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہو جاؤں اور زر و مال کو تج دوں" یہ کہ کر وہ خاموش ہو گیا اور مجھے اضمحلالِ شکستہ کے ساتھ مڑ کر متحیر نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے عمر بھر اس جیسا حیرانی و حسرت کا مارا انسان نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا ملبوس میلا چکٹ اور دریدہ تھا۔ مجھے اس سے ایک بوئے گندگی آنے لگی۔ اُس کے طرزِ تخاطب سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کوئی دیوانہ ہے۔

میں نے کہا: "واقعی زندگی کاوشوں سے لبریز ہے۔ زندگی میں فائز المرام ہونے کے لئے سر کھپانا پڑتا ہے ——— آپ کے معاش کا کیا ذریعہ ہے؟"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "کیا کہوں آپ کو یقین نہیں آئے گا ——— میرا کاروبار نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا ہے لیکن اب کچھ تکالیف کا سامنا ہو رہا ہے۔ میں .... ہیرے ..... بنا سکتا ہوں"

"شاید اب کام سرد پڑ گیا ہے؟"

"نہیں ــــ مصیبت یہ ہے کہ لوگ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے"

پھر اُس نے اپنے صدتار کوٹ کے بٹن کھول کر جیب سے کپڑے کا ایک ٹکڑا نکالا اور اُس سے ایک بڑا ہیرا نکال کر میرے ہاتھ میں دیا اور کہا: "ایک سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ میں علم الطبعیات کی آخری سند لے چکا ہوں۔ یہ ہیرا خود ساختہ ہیرا ہے"

حقیقتاً یہ ہیرا بہت موٹا اور بڑا تھا۔ میں نے اطمینان کی غرض سے پہلے تو گھڑی کے شیشے کو کاٹا اور پھر چاقو کو خراش دی۔ میرے دل میں خلش تفحص پیدا ہو گئی اور پوچھا: "یہ ہیرا ہے ــــ کہو یہ کیسے ہاتھ آیا ہے؟"

اُس نے ہیرا میرے ہاتھ سے لے کر کہا: "میں کہہ چکا ہوں کہ یہ میرا خود ساختہ ہیرا ہے۔ آپ سے ایک سو پاؤنڈ کی حقیر رقم لوں گا جو اس کی قیمت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

یہ سن کر میرے دل میں کئی قسم کے شبہات پیدا ہوئے: "اگر یہ ہیرا ہے تو اس آشفتہ سر کے ہاتھ کیونکر آیا ہوگا اور یہ اسے بیچنا کیوں چاہتا ہے؟"

پھر ہماری نگاہیں دو چار ہوئیں اور مجھے اُس کی دیانت داری اور ایمانداری کا یقین سا ہو گیا۔ ادھر یہ خیال میرے دل میں جاگزین ہو گیا کہ ہیرا یقیناً بے حد قیمتی اور گراں مایہ ہے۔ جواہرات عالم پر جب کوئی کتاب لکھی جائے گی تو اس ہیرے کا تذکرہ کیا جائے گا۔ میں یہ ہیرا خرید لیتا لیکن مصیبت یہ تھی کہ یک صد پونڈ میرے پاس پس انداز نہیں تھے۔ یہ رقم راس المال سے دینی پڑتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کاروبار میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں۔

میں نے اطمینان کی غرض سے ایک بار پھر پوچھا: "آپ نے یہ ہیرا کہاں سے لیا ہے؟"

یہ میرا خود ساختہ ہیرا ہے پھر اُس نے آہ کھینچ کر کہا: "دل چاہتا ہے کہ آپ کو اپنی سرگذشت سنا دوں شاید آپ کے شکوک رفع ہو جائیں ــــ لیکن ..."

پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں ہیرے کے کیمیاوی اجزا پر ایک بصیرت افروز علمی لیکچر دیا اور کہا کہ میں نے سترہ سال کی عمر میں یہ کام شروع کیا تھا۔ اب میری عمر بتیس سال ہے۔ گویا پندرہ سال اس شغل کی نذر ہو چکے ہیں۔ میرا کل اندوختہ اسی جنوں کی تکمیل میں صرف ہوا اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور برابر تجربات کرتا رہا۔ میرے لئے سب سے بڑی مشکل اس راز کا چھپانا تھا۔ میں نے کنگسٹن ٹاؤن میں تن تنہا اپنے مختصر سے معمل میں ایک عجیب النوع تجربہ کیا۔ کاربن اور بعض سیال چیزوں کے امتزاج کو بندوق کی نلی میں ڈال کر اُسے گلخن کے سپرد کر دیا۔"

میں نے کہا: "یہ تجربہ تو خطرناک ثابت ہوا ہوگا"

اُس نے جواب دیا "نلی پھٹ گئی اور دروازہ کھڑکی اور جو کچھ اثاث البیت باقی تھا سب جل بجھ کر رہ گیا۔ پھر میں نے پیرس کے ایک محل میں جاکر یہ خطرناک کھیل کھیلا اور وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر مایوس ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ اور ایک دن فولادی سلنڈر میں بعض کیمیاوی اجزا بھر کر اُسے لو دیتے ہوئے گلخن میں ڈال کر سیر کو نکل گیا۔"

یہ سُن کر میں بے اختیار ہنس دیا اور کہا: "کیا اس کمرہ میں آدمی نہیں تھے یا تمہیں پچھلا تلخ تجربہ بھول گیا تھا"

اُس نے جی کڑا کر کے کہا: اِس قسم کے خمیازے تجربات کے شوق میں کھینچنے ہی پڑتے ہیں ـــــ بالائی منزل میں مالنیں رہتی تھیں اور نیچے ایک بڑا کنبہ اقامت گزیں تھا۔ میں سیر سے واپس آیا تو سلنڈر صحیح و سالم پڑا تھا۔ میں نے اس ڈر سے کہ شاید ایک آنچ کی کسر کا معاملہ کہیں پیش نہ آئے اُس کو گلخن سے نکالنا مناسب نہ سمجھا گو دل ایک کشمکش اور اضطراب میں تھا۔ ان دنوں میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اِدھر مکان کے کرایہ کا تقاضا ہو رہا تھا۔ اِس جنون میں جو کچھ کیا اُس کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دربانی کی، اخبار بیچے، سائیس بننا منظور کیا اور ایک ہفتہ تو کاسۂ گدائی ہاتھوں میں لے کر دریوزہ گری کرتا رہا۔

ایک بار دو دن کا فاقہ تھا، اِدھر گلخن کی آگ ٹھنڈی ہو رہی تھی اور کوئلے ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ حسنِ اتفاق سے ایک چھوٹی بچی کو اُٹھا کر اُس کے گھر پہنچا آیا اور وہاں سے چھ پیسے ملے جن کے آتے ہی کوئلے خرید لئے۔

تین ہفتوں کے بعد وہ سلنڈر نکال کر دیکھا تو کیمیاوی اجزا کبریتِ احمر کی طرح کھول رہے تھے۔ جب سلنڈر سرد پڑ گیا تو اُسے کھولا۔ اُس میں سے تین بڑے بڑے اور پانچ چھوٹے چھوٹے ہیرے برآمد ہوئے۔ میں اُنہیں دیکھ رہا تھا کہ ایک نشے میں مخمور شرابی میرے کمرے میں در آیا۔ میں نے جھنجھلا کر اُس کا منہ نوچ لیا اور پھر دھکے دے کر اُسے مکان سے نکال دیا۔ گو وہ بکتا رہا لیکن میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی اور اپنی دُھن میں لگا رہا۔ کمبخت نے یہاں سے نکل کر پولیس میں میرے خلاف چغلی کھائی اور مجھے تھانہ میں اپنے سربستہ راز کو خود ہی افشا کرنا پڑا۔ اگر حقیقت کا اعلان نہ کرتا تو بہت ممکن تھا کہ کسی سازش کے الزام میں دھر لیا جاتا۔ صبح کو اخبارات نے جو ہمیشہ بے پر کی اڑاتے ہیں میرے کلبۂ احزان کو "کنگسٹن ٹاؤن بم فیکٹری" لکھا۔

آپ ہی دنیا بھر میں پہلے شخص ہیں جن سے یہ راز کی بات کہہ رہا ہوں کیونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے"

میں نے ازراہ تمسخر کہا: "خدا کا شکر ادا کیجئے کہ سستے چھُٹے ورنہ کیا معلوم کہ کونسی افتاد پڑتی۔"

اس سرگذشت کے بعد ہیرے کا خریدنا حماقت کا کام تھا۔ اِس لئے میں نے جواب دیا کہ "مجھے

پوری طرح سے تو نہیں، کچھ نہ کچھ یقین ضرور ہو گیا ہے۔ بہتر ہے کہ کل آپ میری دوکان پر تشریف لے آئیں تاکہ کھل کر باتیں ہو سکیں"

اُس نے جھلّا کر کہا: "آپ ملاقات کا دن معیّن کر کے مجھے گرفتار کرانا چاہتے ہیں —— لیکن میں کچی گولیاں نہیں کھیلا"

میں نے آواز کے مطمئن لہجہ میں جواب دیا: "یہ آپ کا سوءِ ظن ہے۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے —— اچھا کل نہ سہی کسی دن تشریف لائیے۔ یہ ہے میرا کارڈ"

اُس نے کارڈ لے کر جاتے ہوئے کہا: "اگر آپ نے یہ راز افشا نہ کیا تو معقول ہدیہ دوں گا"

یہ کہہ کر وہ تاریکی میں غائب ہو گیا اور میں بھی چلا آیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُس کے دو خطوط ملے جن میں لکھا تھا کہ فلاں پتے پر بینک نوٹ بھیج دو۔ لیکن میں نے دونوں تحریروں کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بار میں کہیں باہر تھا کہ وہ میری دوکان پر آیا۔

واپسی پر میرے ملازم نے مجھ سے کہا کہ "ایک شخص آپ سے ملنے کے لئے آیا تھا جس کا ملبوس کہنہ اور دریدہ تھا۔ اُسے کالی کھانسی کا روگ بھی تھا"

یہ سُن کر مجھے خیال آیا کہ غالباً وہی دیوانہ جوہری آیا ہوگا۔ میں اکثر راتوں کو سوچتا رہتا ہوں کہ کیا واقعی وہ ہیرے بنا سکتا ہوگا —— یا کوئی دیوانہ ہوگا۔ اب وہ مر چکا ہوگا اور اب اُس کے ہیرے پھینک دیئے گئے ہونگے۔ پھر رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہوگا اور ہیروں کو بیچتا پھرتا ہوگا۔

(مختار) **صادق ایّوبی**

اگر میرے پاس آسمانوں کی اقلیم کے قالین ہوتے —— نور کی سیمیں و زریں کرنوں سے مزیّن قالین، رات دن اور شام کے نیلے دھندلے اور سیاہ قالین،

تو میں اُن کو تمہارے قدموں میں بچھا دیتا،

مگر میں نادار ہوں اور میرے پاس صرف میرے خواب ہیں،

مَیں نے اپنے خوابوں کو تمہاری راہ میں بچھا دیا ہے،

آہستہ چلو، کیونکہ تمہارے قدموں کے نیچے میرے خواب ہیں۔

ییٹ

کنول

کیسا جھلک رہا ہے رنگ آب میں کنول کا
کیا خوشنما ہے منظر تالاب میں کنول کا

کیا صبح ہو رہی ہے کیا نور کا سماں ہے
پانی پہ اللہ اللہ کیا فرشِ ارغواں ہے

ہوتے ہی صبح انجم گردوں سے سب سدھارے
پر جلوہ گر ہیں کیسے پانی کے یہ ستارے

ہے داغ دار لالہ وہ کس حساب میں ہے
نسبت کنول سے کیا دوں کانٹا گلاب میں ہے

ہے سطحِ آب ساکن یا روئے آب فق ہے
ہے طرفہ تر تماشا پانی پہ بھی شفق ہے

تاباں نہیں کنول میں شبنم کا قطرہ قطرہ
موتی سے ہے لبالب یاقوت کا پیالہ

~~~

روشن نہ ہوں کنول سے کیوں رمزِ حسنِ فطرت
اس کا ورق ورق ہے اک دفترِ حقیقت

ڈنٹھل ہیں نرم و نازک پتے ہرے ہرے ہیں
کیسے بڑے بڑے ہیں کیسے بچھے ہوئے ہیں

ہے دلفریب کیسا نظارۂ زرِ گل
رکھا ہوا ہے گویا اک تاج برسرِ گل

کیا آ رہی ہیں کرنیں خورشید سے نکل کر
کیا کھل رہی ہیں کلیاں رنگت بدل بدل کر

کیا اڑ رہے ہیں بھونرے کیا آ کے گر رہے ہیں
کیا جاں چھڑک رہے ہیں کیا گرد پھر رہے ہیں

کیا لوٹتی ہیں موجیں پھولوں کی اس ہنسی سے
بے تاب خود ہے جل بھی ان کی شگفتگی سے

لہروں کے پیچ و خم کا کیا دل کشا ہے نقشا
پھولوں میں ہے ہوا سے یہ اہتزار کیسا

پانی میں بھی ہے قائم، یہ نشہ رنگ کا ہے
رہ رہ کے ہائے کیسا ہر پھول جھومتا ہے

دکھلا رہا ہے کیا کیا اپنی بہار ساگر
کثرت سے ہے کنول کی اک لالہ زار ساگر

~~~

نسریں، گلاب، سوسن ہیں خندہ زن چمن میں
چمپا، چنار، جوہی، ٹیسو، کھلے ہیں بن میں

لالہ بنا ہے زینت افزائے کوہساراں
ہے پردۂ حجر میں نورِ شرار پنہاں

یعنی نہیں کوئی جا حسنِ ازل سے خالی
پانی کی سطح رہتی کیونکر کنول سے خالی

میر سعادت حسین نجیب

ابدی خواب

وہ ایک صاف شفاف چشمے کے کنارے محوِ خواب تھا کل کی طرح آج پھر اُس کے گھنگریالے بال سرخ گلاب کو شرمانے والے رخساروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی اور مسنیوں میں بھیگی ہوئی ہواؤں کے جھونکے آتے اور اُس کے سنہرے بال رقص کرنے لگتے۔ کتنا خوبصورت؟ ــــــ بہت ہی حسین! منظر ہو۔ مگر سونے والے کو کیا خبر؟ یہ چشمہ ایک شاداب وادی میں بہکو لے رہا تھا۔ بہت ہی سرسبز وادی میں۔ وہ لوگ جو اس سبزہ زار، اس رنگ و بو زار سے لطف اندوز ہونے کے لیے سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے سیر کے لئے نکل پڑتے ہیں خوب جانتے ہیں کہ ہنگامِ سحر یہ شبنمستانِ فطرت کس قدر نظر نواز ہوتا ہے۔

آفتاب بلند ہو رہا تھا اور سنہری کرنیں شبنم کے موتیوں میں تابشِ زریں پیدا کر رہی تھیں۔ پاس کے گاؤں کی دوشیزہ لڑکیاں اور مناظر پرست نوجوان سیر سے فارغ ہو کر لوٹ رہے تھے۔ بے فکر ــــــ دنیا سے آزاد ــــــ نوجوان ابھی تک گہری نیند میں تھا، ایک کہن سال بوڑھے دہقان نے نوجوان کے پاس سے گذرتے ہوئے کہا:۔
"نکما ــــــ اور دنیا کے لئے بیکار محض بے کار" ــــــ ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد! "جوانی میں میں بھی اسی طرح آزاد تھا۔ بیوقوف لڑکے تو بھی میری طرح زمانے کی ٹھوکریں کھائے گا"!

نوجوان اُسی طرح محوِ خواب تھا۔

اب ایک فلاسفر کی باری آئی اور اُسے چشمہ کے کنارے بے فکر سوتے دیکھ کر اُس نے دل ہی دل میں کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ نوعمر لڑکا دنیا کا بہترین فلاسفر ہو گا زندگی اگر نام ہے سکون اور آزادی کا تو وہ اُسے حاصل ہے"
فلاسفر چلا بھی گیا مگر سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا۔

دوشیزہ لڑکیوں کے قہقہے اب قریب سے قریب تر ہو رہے تھے۔
یہ "طوفانِ جمال" اب اُس کے بالیں پر تھا اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔ "اُف کس قدر حسین نوجوان ہے" ایک

دوشیزہ نے کہا جو صبح کا بہترین لباس پہنے ہوئے "حسن کی شہزادی" معلوم ہوتی تھی۔
"غریب لڑکیوں کا دل لینے والے! بیدار ہو جا!" بہت سی لڑکیوں نے ایک ساتھ کہا ایک حسین ترین لڑکی جھکی اور اُس کے کان کے قریب ہو کر بولی "آدمی کے بھیس میں سونے والے کیوپڈ کیا تو میرے سجدوں کا منتظر ہے"
کافر جمال لڑکا ابھی تک نیند کے مزے لے رہا تھا ـــــــ
ایک شوخ حسینہ نے اپنی پھولوں کی ٹوکری کے سب پھول اُس پر قربان کر دیئے مگر نتیجہ ؟ مایوسی! ـــــــ
"سرد اور نہایت سرد پانی کے چھینٹے" انتہائی شوخ دوشیزہ نے کہا اور بہت سی لڑکیوں نے چشمہ کا پانی اچھالنا شروع کر دیا۔ مگر سونے والا برابر سوتا رہا۔

مایوس ـــــ ناکام ـــــ محروم ـــــ لڑکیاں غصے میں اپنے لبوں کو دانتوں میں دباتی ہوئی چلی گئیں انہیں افسوس اور انتہائی افسوس تھا کہ ایک جوانی کی نیند سونے والا اُن کی تمام کوششوں کے باوجود نہ جاگ سکا وہ لڑکی جس نے سونے والے کو کیوپڈ قرار دیا تھا کچھ سوچ کر لوٹی اور نوجوان کے پاس پہنچ کر ایک لڑکے اور لڑکی میں محبت پیدا کر دینے والا گیت گانے لگی۔ سونے والے نے ایک انگڑائی لی پاؤں سکیڑے اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا ـــــ اُس نے حُسن کی ملکہ کو دیکھا اور "میری پیاری معشوقہ" کہہ کر اُسے آغوش میں لے لیا۔

حسین لڑکی اُس سے رخصت طلب کر رہی تھی "میری پیاری ملکہ" کل میں یہیں تمہارا منتظر ہونگا ـــ جاؤ ـــ خدا حافظ۔ لاؤ یہ پھولوں کی ٹوکری مجھے دو" اُس نے ایک پھول اُٹھایا ـــــ اور ناک کے قریب لے جا کر بولا۔ "بہت ہی خوشبودار ـــــ پھول ـــــ لو یہ تمہیں نذر کرتا ہوں مگر نیچے اس سے اچھے پھول ہونگے اُس نے ٹوکری کو کریدنا شروع کر دیا ـــــ "سی" کی صورت میں ایک خوفناک آواز اُس کی زبان سے نکلی اور خاموش حسینہ نے گھبرا کر اُس کی خون آلودہ انگلی کو دیکھا اور پھر اُس زہریلے مگر چھوٹے سے سانپ کو جو ٹوکری کے پھولوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے نازک دل کی حرکت بند ہو گئی۔
سانپ! ـــــ اُف سانپ!" اُس کی زبان سے نکلا اور "ابدی خواب" میں سونے والے کے برابر لیٹ گئی۔

روش صدیقی

پیاری دوستی

خوش نما رنگیں ادا ننھی سی پیاری دوستی
دوستی سی دوستی ہے یہ ہماری دوستی

زندگی معمور ہو جاتی ہے حق کے نور سے
جب فضائے روح میں ہوتی ہے طاری دوستی

مصلحت ناآشنا راحت سے یکسر بے نیاز
دل کی مجبوری ہے اور بے اختیاری دوستی

جان و دل صاف و سبک ہوتے ہیں دیدِ دوست سے
دردِ فرقت ہیں مگر دل پر ہے بھاری دوستی

دوست کا ملنا نہ ہو صد حیف اپنے دوست سے
بے قراری دوستی ہے آہ و زاری دوستی

کب وہ دن آئے کہ میرے دل کا بھی غنچہ کھلے
ہے کسی سے مجھ کو بھی یادِ بہاری دوستی

"گلریز"

عمل اور علم

انسان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس کی زندگی تمام کی تمام قلب سے ظہور کرتی ہے اور قلب اُس کی عادات کا ایک مجموعہ ہے جسے وہ پیہم کوشش سے ایک غیر معین حد تک تبدیل کرسکتا ہے؛ اور جس پر وہ کامل غلبہ اور اقتدار حاصل کرسکتا ہے۔ اسی طریقہ سے وہ کلید اُس کے قبضہ میں آجاتی ہے جس سے نجات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

لیکن زندگی کی مصائب و آفات سے (جو دراصل انسان کے اپنے ہی قلب کی مصائب و آفات ہیں) نجات ایک ایسا معاملہ ہے جو بتدریج نفس سے نشو و نما پاتا ہے اور یکایک کہیں باہر سے اس کا حصول ناممکن ہے۔ ہر گھڑی اور ہر روز نفس کی تربیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اُس میں بے لوث خیالات پیدا ہوں اور وہ اُن حالات میں بھی جو انسان کو غلط کاری اور ظلم کی طرف لے جاتے ہیں، راست بازی اور انصاف پسندی کی طرف مائل ہو۔ اُس صابر و شاکر بُت تراش کی طرح جو مجسمہ کے ایک ایک عضو پر پہروں صرف کردیتا ہے راستی کی زندگی کے طالب کو اپنے نفس کے سنگین مجسمہ پر نہایت صبر و استقلال سے بتدریج کام کرنا چاہیئے، یہاں تک کہ وہ اپنے اُس مطمحِ نظر کو پالے جس کے پاکیزہ اور شیریں خواب وہ دیکھا کرتا تھا۔

اس قسم کے بلند پایہ نتائج حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے سب سے نچلی اور آسان ترین سیڑھی پر قدم رکھا جائے اور بلند اور مشکل مقامات کی طرف باقاعدہ اور بتدریج ترقی کی جائے۔ نشو و ارتقا اور ترقی و فلاح کا یہ قانون کہ آہستہ آہستہ اور درجہ بہ درجہ بامِ رفعت تک پہنچا جائے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب ہونے کے لئے اپنے اندر ایک قطعیت رکھتا ہے اور جہاں اس قانون، اس دستور العمل کو نظر انداز کردیا جاتا ہے قطعی ناکامی اس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ علم پڑھنے میں، فن سیکھنے میں یا کوئی تجارت اختیار کرنے میں اس دستور العمل کو پوری طرح تسلیم کیا جاتا ہے اور اس پر نہایت دقتِ نظر سے عمل کیا جاتا ہے، لیکن نیکی سیکھنے میں، صداقت کا سبق پڑھنے میں اور زندگی کا حقیقی تجربہ اور علم حاصل کرنے میں اسے عموماً بھلا دیا جاتا ہے اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے نیکی، صداقت اور کامل زندگی ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے۔

یہ فرض کرلینا ایک عام غلطی ہے کہ اعلیٰ زندگی محض دینیاتی اور مابعد الطبیعاتی قیاسات کو پڑھ لینے اور اُن پر یقین کرلینے کا معاملہ ہے اور یہ کہ اس طریقہ سے روحانی حقائق سمجھے جاسکتے ہیں۔ اعلیٰ زندگی نام ہے خیالاً، لفظاً اور عملاً اعلیٰ زندگی بسر کرنے کا۔ اور اُن روحانی حقائق کا علم جو انسان میں اور کائنات میں مرکوز ہیں صرف اخلاقِ فاضلہ کی پیروی

عمل کی باقاعدگی سے حاصل ہوتا ہے۔

قبل اس کے کہ زیادہ کو جانا اور سمجھا جائے کم کو کامل طور پر جان اور سمجھ لینا چاہئے، اور یہ ایک کلیہ ہے کہ عمل ہمیشہ حقیقی علم پر مقدم ہوتا ہے۔ مدرسہ کا استاد کبھی اپنے شاگردوں کو ابتدا میں ریاضی کے مختصر اور دقیق اصول نہیں بتاتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس طریقہ سے پڑھانا بیکار اور پڑھنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ پہلے پہل اُن کے سامنے ایک سادہ اور آسان سوال رکھ دیتا ہے اُس کے حل کا طریق انہیں سمجھاتا ہے اور پھر انہیں حل کرنے کو کہتا ہے۔ جب بار بار کی ناکامیوں اور پے بہ پے کوششوں کے بعد وہ اس کا صحیح جواب نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں ایک اور اس سے مشکل سوال بتاتا ہے اور پھر ایک اور، اور ایک اور۔ یہاں تک کہ جب طالب علم سالہا سال کی مسلسل مشق سے ریاضی کے تمام اسباق پر حاوی ہو جاتے ہیں تو اُس وقت استاد اُنہیں علم ریاضی کے وہ حقائق بتاتا ہے جو پہلے اُن سے پوشیدہ تھے۔

اول اول کسی فن کے حاصل کرنے میں مبتدی کو اُس فن کے حقائق و اصول نہیں بتائے جاتے بلکہ ایک معمولی سا اوزار اُس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے اور اُسے اُسکے استعمال کرنے کا صحیح صحیح طریقہ بتا کر کوشش اور مشق کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے اوزاروں کو درست طور پر استعمال کرنے لگتا ہے تو پہلے سے زیادہ مشکل کام اُس کو تفویض کئے جاتے ہیں یہاں تک چند سالوں کی کامیاب مشق کے بعد وہ اس فن کے حقائق کو سمجھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

ایک مہذب خاندان میں پہلے بچے کو فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اُسے یہ بتایا بھی نہیں جاتا کہ وہ ایسا کیوں کرے اور ایسا کیوں نہ کرے بلکہ اُسے حکم دیا جاتا ہے اور بہت بعد میں جا کر اُسے علم ہوتا ہے کہ اُسے نیکی اور صداقت کی تعلیم کیوں دی گئی تھی۔ کوئی باپ اپنے بچے کو اُس وقت تک اخلاقیات کی غایت نہیں بتائے گا جب تک کہ وہ اُس میں ماں باپ کے لئے اطاعت اور دوسروں کے لئے نیکی کا مادہ پیدا نہ کرلے۔

یوں ہی معمولی سے معمولی دنیاوی امور میں بھی عمل ہمیشہ علم پر سبقت رکھتا ہے، اور روحانی امور میں اور اعلیٰ زندگی بسر کرنے میں تو یہ قانون اور بھی شدید قطعیت رکھتا ہے۔ نیکی صرف عمل سے مل سکتی ہے اور صداقت کا علم صرف نیکی کے ساتھ اپنے نفس کی تکمیل میں حاصل ہو سکتا ہے اور وہ شخص جو نیکی کے حصول اور عمل میں کامل ہو گیا اُس نے حقیقت و صداقت کو پا لیا۔

صداقت صرف اس طریق سے حاصل ہو سکتی ہے کہ ہر روز اور ہر گھڑی نیکی کے اسباق کا مطالعہ کیا جائے اور آسان ترین اسباق سے شروع کر کے بتدریج مشکل اسباق پر عبور حاصل کیا جائے جس طرح ایک بچہ مدرسہ کے اندر نہایت صبر اور اطاعت شعاری سے سبق پڑھتا ہے پھر مسلسل اور متواتر مشق سے تمام مشکلوں اور ناکامیوں پر غالب آ جاتا ہے بالکل اسی طرح صداقت کا علم سیکھنے والا ابتدا ہی ناکامیوں سے بے پروا ہو کر اور مشکلات سے اپنی طاقت کو بڑھا کر اپنے آپ کو خیال اور عمل کی نیکی میں مصروف کر دیتا ہے اور جب نیکی کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اُس کا دل حقیقت اور صداقت کے علم سے معمور ہو جاتا ہے اور یہ وہ علم ہے جس کی موجودگی میں وہ امن و آرام کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

منصور احمد

محفلِ ادب

جنگلی پھول

اُف یہ رنگینی و دلآویزی
اُف یہ رعنائی و جنوں خیزی

اُف یہ نقش و نگارِ زیبائی
اُف یہ جوشِ بہارِ زیبائی

شوق نے حشر کر دیا دل میں
سوزہی سوز بھر دیا دل میں

اُف مرے اضطراب کا عالم
دل ہے اور ایک لرزشِ پیہم

چاہتا ہوں کہ رازِ حسن کہوں
ہائے مَیں اپنے آپ میں کب ہوں

کیا کہوں تو جہاں میں کیا شے ہے
عقل جاتی رہی مری ہے ہے

ایک تصویر تیرا نقشہ ہے
دفترِ حسن کا خلاصہ ہے

اور بھی پھول ہیں جہاں میں بہت
قدر ہے جن کی گلستاں میں بہت

اُن میں یہ خوبیٔ جمال کہاں
اُن میں یہ شانِ ذوالجلال کہاں

ماند ہے تجھ سے رونقِ گلزار
گرد ہے تیرے آگے رنگِ بہار

پھونک ڈالے دل و جگر میرے
بھر دیئے سینے میں شرر میرے

آہ صبر و قرار کھو بیٹھا
راحتِ زندگی کو رو بیٹھا

ہے عجب کیف لیکن اس غم میں
اڑ رہا ہوں میں اور عالم میں

اب یہی جان کی تمنا ہے
اب یہی روح کا تقاضا ہے

تیرے سائے میں خاک پر بیٹھوں
دین و دنیا سے بے خبر بیٹھوں

اور سجدے میں ہو جبیں میری
تر ہو اشکوں سے آستیں میری

"زمانہ"

تعلیم اور ظرافت

بیچارے معلموں کو اپنے پیشہ کی بدولت جو بیماریاں ہو جایا کرتی ہیں اُن میں دماغ کی خشکی بھی ہے۔ آپ خیال تو کیجئے کہ جو شخص

خود روز دس بجے سے چار بجے تک ناک بھوں چڑھائے آنکھیں نکالے نہی عن المنکر کی صورت بنائے بیٹھا رہے۔ اور آدمیوں کے بچوں کو مولویوں کی طرح "صم بکم" بنا کر بٹھائے رکھے جو نہ خود ہنسے نہ دوسروں کو ہنسنے دے اس کے دماغ کا کیا حال ہوگا معلم خشک کی حالت اصل میں زاہد خشک سے زیادہ قابل رحم ہے۔ کیونکہ زاہد تو دنیا کی دلچسپیوں کو سائنٹفک یا مذہبی کیڑا سمجھ کر سرے سے بائیکاٹ کر چکا ہے لیکن معلم ان دلچسپیوں میں رہنے کے باوجود ان کا لطف اٹھانے سے محروم ہے۔

معلم میں ظرافت کی کمی اور متانت کی زیادتی سے خود اس کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے کہیں زیادہ مضر اثر طالب علموں پر پڑتا ہے۔ بچے اور نوجوان جو گھر کا سکھ چین چھوڑ کر زندگی کے کٹھن سفر کی تیاری کے لئے مدرسے میں آتے ہیں۔ انہیں پہلے ہی قدم پر ایک مجسم مارشل لا سے سابقہ پڑے تو اُن کے دل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ جہاں ڈر بیٹھا تو سمجھئے کہ روح کی بالیدگی اور آزاد نشو و نما رخصت ہوئی۔ یہ عمر کھیل اور کام، سادگی و پرکاری بے خودی و ہوشیاری کی درمیانی منزل ہے اور ان اضداد کی ترکیب جیسی صحیح ظرافت میں ہوتی ہے اور کسی چیز میں ناممکن ہے۔ اگر اس کا استعمال صحیح اور احتیاط کے ساتھ کیا جائے تو نوجوان زندگی کا بوجھ ہنستے کھیلتے اٹھا لیتے ہیں تعلیم کا یہ اہم ترین مسئلہ باتوں باتوں میں حل ہو جاتا ہے۔

جہاں معلم کے لئے یہ جائز نہیں کہ نوجوانوں کو دنیا کی تصویر ضرورت سے زیادہ مہیب کھینچے وہاں یہ بھی دیانت داری اور احتیاط کے خلاف ہے کہ وہ اُن کے سامنے زندگی کو "خالہ جی کے گھر" کی صورت میں پیش کرے۔ یا کسی نیم سرکاری یونیورسٹی کی شکل میں پیش کرے جہاں انسان اصول تقویم کے خلاف دن کو عید رات کو شب برات مناتا ہے اور دین و دنیا کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے۔ ہنسی دل لگی کی زیادتی انسان میں دماغی کاہلی پیدا کرتی ہے۔ وہ زندگی کے اہم مسائل پر غور کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور ہر بات کو مذاق میں ٹالنا چاہتا ہے۔

ظرافت سے پورا تعلیمی فائدہ اٹھانے کے لئے نیک نیتی بھی ضروری ہے معلم کو اس بات کا پورا احساس ہونا چاہئے کہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی قوت ہے جسے وہ ایمانداری کے ساتھ طلبہ کی بہبود کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہے محض ذاتی جانبداری یا مخالفت کرنے کے لئے یا محض زورِ طبع آزمانے کے واسطے بچوں کو نشانہ ظرافت بنانا بڑے کمینہ پن کی بات ہے ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اگر معلم ظرافت سے کام لے تو یقین ہے کہ وہ بچوں کے لئے بہترین رہنما اور رفیق ثابت ہوگا۔ خود سوداوی امراض کمیشن کی شہادت اور کونسل کی ممبری سے محفوظ رہے گا اور اپنے دوستوں کے لئے تفنن طبع کا باعث ہوگا۔

"تعلیم و تربیت"

ماں اور بچہ

ماں نے کہا "ننھے بچے تو میری مسرتوں کا خزانہ ہے۔ تو میرے ارمانوں کا گنجینہ ہے۔"

بچہ ہنسنے لگا۔ اس طرح جیسے گلستاں کی کلیاں ایک ساتھ چٹک گئی ہوں +

"ہاں ماں! پھر کہہ۔ میں کیا ہوں۔"

"خوبصورت پھول! تو میری روحانی مسرتوں کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ تو قدرت کی بے نظیر دستکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے"

بچہ مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ، جیسے یاقوت کی موتیوں سے لبریز، ڈبیا کھل گئی +

"ماں پھر کہہ میں کیا ہوں"

"تو میری دنیاوی محبت کا ثمر ہے۔ خدا کا بیش بہا عطیہ ہے۔" بچہ خفا ہو گیا "میں یہ نہیں جانتا۔ اور کہہ"

"آہ تو معصوم ہے۔ گل نوشگفتہ ہے۔ میرے لئے دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ میری خوشیاں تجھ سے وابستہ ہیں۔ تو میری راحت اور سکون کا سامان ہے۔"

بچہ رونے لگا۔ اُس کے پھول جیسے رخساروں پر گوہر اشک ڈھلکنے لگا۔ "میں نہ سنوں گا، مجھے نہیں معلوم"

"میرے لال۔ تو میرا بچہ ہے۔ اللہ نے تیری صورت میری تسکین کے لئے بنائی ہے مجھے کھیلنے کو ایک چلتا پھرتا اور بولتا ہوا کھلونا دیا ہے۔"

بچہ زور سے ہنس پڑا۔ "ماں ماں میں بھی ایسا ہی کھلونا لوں گا"

"بیشک اے معصومیت ونیکی کی تصویر! چند روز بعد تو بھی بہت سے کھلونوں کا مالک ہوگا۔ لیکن میں اُس وقت کیا ہونگی؟ ایک کمر خمیدہ بڑھیا۔ دھوپ جیسے سفید بالوں والی۔ ننھے میں درخت ہوں اور تو ابھی پودا ہے۔ چند روز بعد تو ثمر دار شجر ہوگا اور موت میری جڑ اکھاڑ دے گی۔"

بچہ زور سے اچھل پڑا۔ "ماں موت کیا ہے؟ میں اُسے نہ آنے دوں گا!"

"میرے ننھے سیدھے راستہ پر چل۔ خوش رہ۔ نیکی کر۔ لطف و محبت سے ہر انسان کے ساتھ پیش آ۔ میں پھر نہ مروں گی"

"عصمت"

موسمِ بہار کے پردہ میں کون ہے؟

موسمِ بہار آیا، راحت و انبساط کا پیغام لے کر آیا، لوگ موسمِ بہار کی رنگینیوں کو دیکھ رہے ہیں، میں موسمِ بہار میں رنگ بھرنے والے کی تلاش میں ہوں، تیتریوں کو یہ خوبصورتی کس نے دی، پھولوں میں یہ رنگ کس نے بھرا غنچوں کو یہ دل کشی کس نے عطا کی، لوگوں کے دلوں میں یہ مسرت کی لہر کس نے دوڑائی،

خوبصورت عورتیں سمندر کے ساحل پر تیتریوں کی طرح رنگ برنگ کا لباس پہنے ہوئے، اپنے دوستوں کے ساتھ موسمِ بہار کا لطف

اٹھارہی ہیں، لیکن میں موسمِ بہار سے لطف اٹھانے والوں کی امنگوں کا مطالعہ کر رہا ہوں کہ یہ امنگیں کس نے پیدا کیں، اور یہ روح پرور نظارے کس نے عطا کئے،

یہ ایک مخفی طاقت ہے، یہ ایک پوشیدہ قوت ہے، اگر اس قوت کا مشاہدہ کرنے میں ہم کامیاب ہو جائیں تو دنیا کی ساری مسرتیں اور ساری بہاریں ہمیں خزاں نظر آنے لگیں، اور حقیقی اور سچی راحت ہمیں میسر آ جائے۔

اِنسانی زندگی کی رُوح

دولت مند دولت کو راحت سمجھتے ہیں، عیش پرست عیش کو زندگی کی روح بتاتے ہیں، لیکن زندگی کی روح ضمیر کی وہ آواز ہے جو انسان کی ہمیشہ راستی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جب انسان تاریکیوں میں بھٹکتا ہے جب انسان گناہ میں پھنس جاتا ہے، جب انسان اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، جب انسان دیانت کو چھوڑتا ہے تو یہ خاموش آواز اُسے ہدایت کرتی ہے کہ اے تاریکی کی طرف جانے والے سنبھل جا، اے گناہ کی وادی میں تباہ ہونے والے ہوش میں آ، اے اخلاقی جرائم کے مرتکب اپنے فرائض کو پہچان، اے بددیانتی کے تمنائی دیانت کی خوبصورت دیوی تجھ پر لعنت کر رہی ہے بیدار ہو، لیکن جب انسان آواز کی طرف رخ نہیں کرتا تو اُس کی زندگی کی روح مر جاتی ہے،

تمہاری زندگی کی روح تمہارا ضمیر ہے، اگر تم نے اُس کی آواز پر توجہ نہ کی تو تمہارا ہونا نہ ہونا بیکار ہے۔

"طور"

رام کا رتھ

راون کو کل سامانِ جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اُس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا رام کو دوسری طرف دیکھ کر بھبھیکن جیسے راسخ الاعتقاد اور وفادار بھگت کا دل بھی دہل گیا۔ وہ مہاراج رامچندر سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج! فتح کیسے ہو گی؟ ناتھ کیا روحانیت اور اخلاقی تہذیب پیروں سے کچلی جانے ہی کے لئے بنی ہے؟ اس موقع پر مہاراج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اُس کے اجزا کی تفصیل اے بھبھیکن سنو۔

بہادری اور استقلال جس رتھ کے پہیے ہیں، مضبوط سچائی اور محبت جس کے جھنڈے اور پھریرے ہیں۔
طاقت، تمیز، نفس کشی اور پراوپکار، یہ چار گھوڑے عفو، رحم و مساوات کے باگ ڈور سے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں
ایشور کا بھجن اُس رتھ کا چلانے والا ہے اُس کی ڈھال ویراگ اور تلوار قناعت ہے۔
فیاضی اُس کا پھرسا اور عقلِ سلیم شکتی بان ہے اور افضل ترین علم اُس کی مضبوط کمان ہے۔
پاک اور مستقل طبیعت جس کا ترکش ہے اور سنجم (اصولِ اخلاقِ ذاتی) اور نیم (اصولِ اخلاقِ تمدنی) سپر ہیں۔
زرہ بکتر سچے برہمن کی خلوصِ دل سے پرستش ہے، اُس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے۔

"نگا"

تبصرہ

اسلامی کہانیاں۔ مرتبہ شیخ عبد السلام صاحب فضلی بی۔اے۔بی ٹی۔ اس کتاب میں تاریخ اسلام کا خلاصہ نہایت آسان اور دلچسپ پیرایہ میں درج کیا گیا ہے۔ چھوٹے بچوں کو اپنی قومی روایات سے واقف کرانے کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ حجم ۹۰ صفحات اور قیمت آٹھ آنے ہے۔

پھولوں کی ڈالی۔ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب ایڈیٹر رسالہ کائنات نصیحت آمیز، آسان اور سلیس نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ جو ہر مذہب و ملت کے بچوں کے لئے یکساں مفید ہیں۔ حجم ۲۳ صفحے اور قیمت چار آنے ہے۔

جنت کے پھول۔ چھوٹی تقطیع پر سولہ صفحے کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں تبلیغی نظمیں درج کی گئی ہیں جوشِ عمل پیدا کرنے کے لئے مفید چیز ہے۔ قیمت دو پیسے رکھی گئی ہے۔ تینوں کتابیں مینیجر حالی بک ڈپو پانی پت سے طلب فرمائیے۔

یورپین شعرائے اردو۔ اس کتاب میں انگریزی، فرانسیسی اور پرتگیزی شعرائے اردو کے صحیح مختصر حالات اور اُن کے منتخب اردو کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ اپنی قسم کا پہلا تذکرہ ہے حجم ۴۸ صفحے اور قیمت آٹھ آنے ہے۔

تذکرہ شعرائے اورنگ آباد۔ جب اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اُس نے اورنگ آباد کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا۔ اس سے اورنگ آباد علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور وہاں بڑے بڑے نامور شعرا پیدا ہوئے۔ اس مختصر تذکرے میں اُن کے حالات اور منتخب کلام درج ہے۔ حجم ۴۰ صفحے اور قیمت چھ آنے ہے۔ دونوں کتابیں کتب خانہ مسجد چوک حیدر آباد دکن سے منگائیے۔

بلقیس ۵۴ صفحے کا ایک دردانگیز و نتیجہ خیز افسانہ ہے جس کے مصنف سید محمد رشید الملک صاحب ہیں۔ اندازِ تحریر مؤثر اور دلکش ہے۔ قیمت چار آنے ہے۔ مینیجر بلیج آباد گزٹ۔ مقام فتح پور (ہسوہ)

آئینہ حساب حصۂ اول و دوم۔ ان دو کتابوں میں گنتی، پہاڑوں اور پیمانوں کو شکلوں اور نقشوں کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے بچوں کے لئے یہ کتابیں نہایت مفید ہیں۔ ابتدائی حساب کی تعلیم ان میں ایسے طریقہ سے دی ہے کہ نہایت آسانی سے ہر بات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ زین الدین بنگڑی والا۔ دادر مارکٹ ۱۴ بمبئی۔

کامل صابون ساز۔ صابون سازی ایک کارآمد فن ہے۔ اس کتاب میں دیسی، انگریزی اور دوا والے صابون بنانے کے سہل اور آسان نسخے لکھے ہیں۔ حجم ۲۴ صفحے ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت پانچ آنے مقرر ہے۔ کامل بک ڈپو لاہور سے مل سکتی ہے۔

دو زبان میں اپنے رنگ کی بہترین کتابیں

ناٹک ساگر۔ زبان اردو میں تاریخ ڈراما کی پہلی اور ایک ہی کتاب جس میں دنیا بھر کے ڈراما نگاروں اور ایکٹروں
نخ حیات۔ جملہ ممالک عالم سٹیج کے عروج وزوال اور فن ڈراما کی ارتقائی کیفیت بیان کرکے ڈراما اور سٹیج کے
ؤ معائب آئینہ کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے صلہ میں پنجاب یونیورسٹی نے ساڑھے سات سو روپیہ کی گرانقدر رقم
نین کو عطا کی۔ ہندوستان کے بے شمار اردو اور انگریزی رسائل وجرائد نے نہایت شاندار ریویو کئے ہیں جنہوں نے
ے خود ایک کتاب کی صورت اختیار کرلی۔ کتابت، طباعت وکاغذ دیدہ زیب۔ حجم بڑی تقطیع کے قریباً پانچ سو
حات قیمت مجلد ے بلا جلد عہ

ناٹک ساگر کے دو باب۔ آنرزانِ اردو کا نصاب قیمت فی جلد عہ

موجودہ لندن کے اسرار۔ لندن کا حیرت انگیز وسنسنی پیدا کرنے والی وارداتوں کا آئینہ ایک فلسفیانہ مضمون
کہانی کی سی دلآویزی۔ ایکدفعہ شروع کرو بغیر ختم کرنے کے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا لندن کی اندرونی زندگی کی
تصویر اس میں عیاریاں آپ دیکھیں گے جو طلسم ہوشربا کے عیاروں کو بھی مات کردیں گی قیمت مجلد عہ

ڈراما بگڑے دل۔ فرانس کے زندہ جاوید ڈراما نگار مولیئر کے ظرافت آفریں شاہکار کا ترجمہ۔ ایک مرتبہ
مطالعہ کیجیے اور اگر ہنسی آپ کا پیچھا چھوڑے تو ہمارا ذمہ قیمت ۸

ڈراما تین ٹوپیاں۔ اگر آپ نے فسانہ آزاد کے خوجی کے خاندان کا نقشہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو ضرور
ملاحظہ فرمائیے۔ بہترین ظرافت۔ بہترین مصنف اور بہترین ترجمہ دلی یونیورسٹی کے طلبا نے اس ڈراما کو نہایت کامیابی
سے سٹیج کیا قیمت ۸

ڈراما قزاق۔ جرمنی کے شہرۂ آفاق ڈراما نگار شلر کے ایک نہایت کامیاب ڈراما کا دلآویز ترجمہ۔ اس تصنیف
پر مصنف کو خود ناز ہے اور یہ مختلف ممالک سے خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔ ایسی سوزوگداز میں ڈوبی ہوئی تحریر شاید
ہی آپ نے ملاحظہ فرمائی ہو۔ قیمت ۸

ڈراما ظفر کی موت۔ بلجیم کے چابکدست ڈراما نگار میٹرلنک کے ایک سنگلاخ ڈراما کا کامیاب ترجمہ
محبت کی ناکامی کی رقت انگیز تصویر

یہ تمام کتب محمد عمر۔ نورالٰہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ۲۵ سے زیادہ کتب کے خریداروں کو کمیشن

ملنے کا پتہ:۔ **محمود برادرس (جموں) ، تاجران کتب جموں (پنجاب)**

عصمت کا جوبلی نمبر
اردو رسائل میں نظیر نہیں نکل سکتی
ہندوستان کے مشہور زنانہ رسالہ عصمت کا جوبلی نمبر شائع ہو چکا ہے اور ذوق سلیم رکھنے والے ہر شخص نے تسلیم کر لیا ہے کہ مضامین تصاویر آرٹ، نثر، نظم، چھپائی، ضخامت غرض کسی اعتبار سے عصمت جوبلی نمبر سے بہتر خاص نمبر آج تک اردو زبان میں شائع نہیں ہوا۔
مضامین
عام اشاعتوں سے قریباً دوگنے سائز کے ڈھائی سو صفحوں سے بھی زیادہ پر صرف مضامین ہیں (ٹائٹل تصاویر اشتہارات کے صفحات انکے علاوہ ہیں) اور یہ مضامین ہندوستان کے چوٹی کے لکھنے والے مردوں عورتوں کے بہترین مضامین ہیں۔ جو نہایت قابلیت سے مرتب کیے گئے ہیں جنہیں ۴ بے نظیر مضامین حضرت علامہ راشد الخیری کے ہیں ۲ بے مثل مضامین پروفیسر ستار خیری نے جرمنی سے بھیجے ہیں۔
تصاویر
ہاف ٹون بلاک کی ۶۰ تصویریں ہیں ۶ بے نظیر رنگین اور ۵۴ سادہ، جن میں ۱۲ بلاک جرمنی میں طیار ہوئے ہیں اور اسقدر دلاویز تصویریں ہیں کہ آپ دیکھ کر پھڑک اٹھیں گے۔ یقیناً کسی ہندوستانی رسالہ میں اس پایہ کی اعلیٰ تصاویر نہیں چھپیں۔ نصف کے قریب رسالہ رنگین چھپا ہے ٹائٹل پیج ۴ رنگین خوبصورت بلاک کا ہے ہندوستانی رسالے تو الگ رہے اکثر اعتبار سے
عصمت جوبلی نمبر انگریزی رسائل پر بھی فوقیت رکھتا ہے
آپ نے اگر نہ دیکھا تو ہمیشہ آپ کو افسوس رہے گا قیمت صرف ۴ ہے علاوہ محصولڈاک لیکن عصمت کے مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ ہی میں ملیگا۔ سالانہ چندہ صرف قسم دوم مع محصول ڈاک ہے۔
بنات
مسلمان لڑکیوں کے لیے خالص مذہبی رسالہ علامہ راشد الخیری کی نگرانی میں تربیت گاہ بنات دہلی سے کامیابی سے شائع ہو رہا ہے سالانہ چندہ ایک روپیہ گیارہ آنے نمونہ مفت
مینیجر عصمت و بنات دہلی

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں +

۳- دل آزار تنقیدیں اور دِل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے +

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے +

۶- ہمایوں کی ضخامت کم ازکم بہتّر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا +

۸- جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے +

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍ نمونہ ۶؍ +

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے +

۱۱- خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۳۲- لارنس روڈ- لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

اُٹھو اوگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
ہمایوں

بیادگارِ علامہ فیضِ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر { حامد علی خاں۔ بی۔ اے
منصور احمد

جلد ۱۲

فہرستِ مضامین

بابت ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء

تصویر:- روحوں کی کشتی

جہاں نما

ایران

سردار اقبال علی شاہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مشرقی اسلامی ممالک کی سیاحت کے سلسلہ میں تقریباً چالیس ہزار میل کی مسافت طے کی ہے۔ اخبار "مارننگ پوسٹ" "میں مستقبل اسلام" کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں ایران کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:-

"موجودہ اسلام کی کوئی کہانی اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہم اُن کوائف و حالات کا مطالعہ نہ کریں جو ایران اور افغانستان میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ترکی اور عرب کی طرح یہاں بھی وہ یک دماغی کوششیں نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں جو وہاں کے بادشاہوں کے کام کو ممتاز کرتی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی اور امان اللہ خاں دونوں ترکی کی بیداری کی تقلید کر رہے ہیں۔ دونوں انگورہ کے قومی رہنما کی طرح سمجھتے ہیں کہ مغربی اقتصادی دباؤ کا مقابلہ منظم اعتدال و ارتقا ہی سے ہوگا اور اُس کے لئے محض یورپی طور طریقوں کا اختیار کرنا کافی نہیں۔

پہلوی ٹوپی جس کا پہننا ہر ایرانی اہلکار کے لئے ضروری ہے، فرانسیسی فوجی ٹوپی سے مشابہ ہے اور اُن کا لباس ہندوستانی سوار فوج کے لباس سے ملتا جلتا ہے لیکن حیران کن یہ بات ہے کہ جب ایک افسر بولتا ہے تو حافظ یا عمر خیام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بولتا ہے میں نے اس لئے کہا کہ میں نے کبھی کسی ایرانی کو چلاتے نہیں سنا، یہاں تک کہ قواعد کرانے والا تند و تیز سارجنٹ بھی آہستہ بولتا ہے۔

فوجی ساز و سامان میں جدید ترین قسم کی بندوقیں، توپیں بلکہ ٹینک تک اُن کے پاس موجود ہیں اور طہران کے میدانِ سپاہ میں آپ ہر روز اُن کے دستے اور ٹولیاں دیکھ سکتے ہیں لیکن فوجی اکھڑ پن آپ اُن میں نہ پائیں گے۔ ایک دن دو سپاہی بھنے ہوئے چنے اور سوکھے ہوئے پھل خرید رہے تھے اور اُن کے قریب ہی میں قواعد میدان کی تصویر اتار رہا تھا۔ ایک نے اُن میں سے پوچھا "ان تصویروں کو تم کیا کرتے ہو" دوسرے سپاہی نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ تصویریں یورپ جائیں گی"۔ پھر یہ دونوں اپنا من بھاتا کھاجا اڑاتے ہوئے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اُسی وقت ایک موٹر آندھی کی طرح اڑتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئی اور ہر سپاہی کو تعظیم کی طرف متوجہ کرتی گئی۔ یہ اُن کا بادشاہ تھا جو غیر متوقع طور پر کسی شعبہ کا معائنہ کرنے کے لئے جا رہا تھا۔

شام کے قریب پولیس کے ایک سپاہی سے جو چوک میں ایک چھوٹی سی چھتری کے نیچے کھڑا گاڑیوں کی آمد و رفت

کی رہنمائی کر رہا تھا۔ میں نے سینما کا پتہ دریافت کیا۔ وہ میرے ساتھ ہولیا ۔"روسی سینما یہ ہے" کہ کر اُس نے مجھے جھک کر سلام کیا اور خود اُس ہجوم میں مل گیا جس میں مردوں کے علاوہ نقاب پوش عورتیں بھی شامل تھیں۔ میں اُن فلموں کو دیکھنے لگا جو ماسکو کے ہوائی راستوں کے ذریعہ سے ایران میں لائی گئی تھیں۔ ایک ترجمان پردے پر آنے والے الفاظ کا ترجمہ کرتا جاتا تھا۔ لیکن ناظرین بڑے بڑے جوش آور نظاروں کو دیکھ کر بھی ایسی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے تھے جس سے شور و غوغا پیدا ہو۔ شاید ایسا کرنا ایرانی متانت کے خلاف تھا۔

کچھ دیر کے بعد پردے کے پیچھے سے زنانہ آواز میں ایک فارسی نغمہ سنائی دیا۔ حاضرین پر کامل سکوت طاری ہوگیا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک نوجوان ایرانی نے مجھ سے کہا "یہ بوڑھی عورت اچھا گاتی ہے لیکن میری بہن کی آواز اس سے بھی اچھی ہے مگر وہ صرف بہار کے دنوں میں کبھی کبھی اپنے باغ میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے سامنے گاتی ہے"۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ سچ ہے کہ تجدید کی لہر ایران میں پہنچ گئی ہے مگر ایرانیوں نے مغرب اور مشرق کے امتزاج سے ایک ایسی فضا پیدا کر لی ہے جو اُن کے ملک کے لئے موزوں و مناسب ہے۔ ہاں، اسلام کی صورت بدل رہی ہے مگر اُس کا قلب کبھی نہ بدلے گا۔

دوسری رات میں مسجد سپہ سالار میں تھا جو ایرانی پارلیمنٹ کی عمارت سے متصل واقع ہے۔ اجتماع کثیر تھا کیونکہ ایک اعلیٰ درجہ کے مجتہد جنگِ شہدا کے متعلق صحیح معلومات سے مومنین کو مستفیض کرنے والے تھے۔ جب مجلس گرما گئی تو واعظ نے کہا "ان سب باتوں کو اب گذرا ہوا سمجھو۔ اب وہ وقت ہے کہ ہم اتحاد اور یک جہتی میں ایک دوسرے سے پیوستہ ہو جائیں اور اسلام کے اُس مقصد کو سمجھیں جو پیغمبر اسلام کے پیشِ نظر تھا"۔ اتحاد بین المسلمین کی تحریک ایک مرتبہ پھر میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بجلی کے قمقموں کی روشنی ماند پڑ گئی یہاں تک کہ اُن میں محض ایک جھلک سی باقی رہ گئی۔ ہم سب منتشر ہو گئے اور اپنے اپنے راستے پر پڑ لئے۔ لوگ کہتے تھے کہ روشنی اس لئے گھٹا دی گئی ہے کہ بادشاہ خود شہر کو دیکھنے نکلے ہیں۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے بتیاں پھر روشن ہو گئیں، دورِ حاضر کا نوشیرواں اپنا دورہ ختم کر چکا تھا"۔

ترکی میں لاطینی رسم الخط کا رواج

جاپان کی طرح ترکی میں بھی کچھ مدت سے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تحریک ہو رہی تھی، چنانچہ اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی، جس کا دفتر پہلے انگورہ میں تھا، لیکن پھر قسطنطنیہ میں تبدیل کر دیا گیا، تاکہ کمیٹی کے ارکان کو وزیر معارف اور صدر جمہوریہ سے مشورہ لینے میں آسانی ہو۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ترکی حکومت کے بعض صیغوں میں لاطینی رسم الخط کا استعمال شروع ہو گیا ہے اور جہاز ران کمپنیوں نے جہازوں کے نام اسی رسم الخط میں

لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا اس مسئلہ پر خاص توجہ صرف کرتے ہیں۔ کاظم پاشا رئیس مجلس وطنی نے اپنی ایک ... میں کہا کہ "پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں رسم الخط کا مسئلہ زبردست اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ تمام لوگوں کو اس ... ضرورت ہے اور ترکی قوم کی داخلی اصلاح پر بھی اس کا نمایاں اثر پڑے گا۔ عربی رسم الخط کی تعقیدات ذہن ... سے آتی ہیں اور یہ ترکوں کے جاہل رہ جانے کا ایک بہت بڑا سبب ثابت ہوا ہے چونکہ جدید رسم الخط میں تعقید ... بہت کم ہیں اس ... اس کے رواج سے عام جہالت ایک حد تک جاتی رہے گی۔"

کمیٹی ... یس حروف بجا مقرر کئے ہیں ۱۷ اور ... کو حذف کر دیا گیا ہے۔ حروف متحرکہ آٹھ ہونگے ... کہ O اور U میں ... یک کی دو آوازیں ہیں جن کا امتیاز دو فوقانی نقطوں سے ہوا کریگا جیسا کہ جرمن رسم الخط میں ...

جدید رسم الخط کی ترویج سے عام لوگ نیک شگون لے رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے متعلمیں ... تعداد میں بھی معتدبہ اضافہ ہوگا۔

تصنیف کا مقصد

مشہور و معروف ادیب مسٹر آرنلڈ بنیٹ کے متعلق اُن کے ایک ہم عصر ڈرامانویس (جو اپنے فن میں انتہادرجہ ... بھی ہیں) کہتے ہیں کہ ایک دن آرنلڈ بنیٹ کے پاس ایک متین و سنجیدہ نوجوان امریکن آیا اور اُس نے دریافت ...

"مسٹر بنیٹ جب آپ لکھتے ہیں تو اُس وقت آپ کے سامنے کون سی چیز ہوتی ہے؟"

مسٹر بنیٹ نے جواب دیا "روپیہ"

نوجوان امریکن نے کہا: "نہیں، نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کسی بڑی معرکۃ الآرا تصنیف ... ہوتے ہیں تو اُس وقت آپ کے خیال میں کونسی چیز ہوتی ہے؟

بنیٹ نے پھر اُسی متانت سے کہا: "روپیہ"

جب وہ امریکن نوجوان جا چکا تو وہ کامیاب ڈرامانویس صاحب جنہیں اب اس معاملہ سے خود بڑی دلچسپی ... گئی تھی آگے بڑھے اور جیسے ایک نامی آدمی دوسرے نامی آدمی سے کوئی امر دریافت کرتا ہے حقیقت معلوم کرنے کی امید ... سے کہنے لگے!

"بنیٹ، سچ سچ بتاؤ جب تم ایک بلند پایہ تصنیف میں مصروف ہوتے ہو اُس وقت تمہارے دل میں کس ... خیال ہوتا ہے؟"

مسٹر بینیٹ نے جھک کر اُن کے کان میں نہایت رازداری کے لہجہ میں کہا: "روپے کا"

خون کی تجارت

ویانا میں انسانی خون کی فروخت کا مقابلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ایک پیٹر (۱۲ پیٹر - ایک گیلن) خون کی قیمت صرف پچاس آسٹرین شلنگ رہ گئی ہے۔

یہ خون ایک شخص کے جسم سے نکال کر دوسرے کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ ویانا میں یہ عمل اس قدر رواج پا گیا ہے کہ وہاں اس نے ایک باقاعدہ تجارت کی صورت اختیار کر لی ہے اور بعض لوگوں کا تو گزارا ہی اب اپنے خون کی فروخت پر رہ گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ بارہ بارہ چودہ چودہ مرتبہ اپنا خون نکلوا چکے ہیں۔ ایک شخص نے سولہ مرتبہ اپنا خون فروخت کیا۔ ایلس برگ تقسیم خون کا مرکز ہے۔ خون بیچنے والے اس جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور یہاں سے مختلف ہسپتالوں میں حسب ضرورت بھیج دیئے جاتے ہیں۔

عسرت زدوں کے لئے خون کی تجارت دراصل آخری مامن ہے۔ تقریباً چودہ مرتبہ خون نکلوانے کے بعد وہ اپنے آپ کو بے زور اور بے زر پاتے ہیں اور زندگی کی جدوجہد کی قابلیت اُن کے دست و بازو سے مفقود ہو جاتی ہے۔

اُن مریضوں کے نام جن کی جانیں ایسے لوگوں کے خون سے بچائی جاتی ہیں پوشیدہ رکھے جاتے ہیں تاکہ خون فروش آئندہ کبھی اُن کے سامنے دست سوال دراز نہ کریں۔ اس طرح اُن کا احسان شخصی طور پر انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

حال ہی میں خون فروشوں نے ایک انجمن قائم کرنے کی تجویز کی تھی تاکہ اُن کے خون کی قیمت بڑھ سکے لیکن یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی اور خون کی تجارت اب تک غیر منظم دوکانداری کے اصول پر ہو رہی ہے۔

رُوحوں کی کشتی کے ناخدا سے خطاب

لئے جا رہا ہے ہمیں تُو عدم کو
مگر شک نہیں اِس حقیقت میں ہم کو

کہ باطل ہے معدوم ہونا ہمارا
عدم کا خرابہ ہی آباد ہوگا

ہر اِک گھر کے بسنے کو اِک کا اُجڑنا
اور اِک شے کے بننے کو اِک کا بگڑنا

سراسر یہ آئین ترا ناروا ہے
یہ دنیا ہے یا کھیل بچّوں کا؟ کیا ہے؟

ابھی نیست سے ہست میں آرہے ہیں
ابھی ہست سے نیست میں جارہے ہیں

نہ مرنے کی فرصت نہ جینے کی مہلت
نہ ہنگامِ آمد، نہ آہنگِ رخصت

بسانی ہے تجھ کو اگر کوئی بستی
فضا جس کی ہے زندگی کو ترستی

اور اُس کا بسانا ہے دشوار تجھ کو
جو ہے عجزِ قدرت کا اقرار تجھ کو

تو اک اور آدم کو اُس میں بسا دے
جو اُس دشت کو بھی گلستاں بنا دے

حامد علی خاں

مردوں دی کشتی

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE

سرمایۂ مشترک

قومیت کا سنگِ بنیاد۔ سیاسیات کا یہ مسلمہ مسئلہ کہ اتحادِ زبان قومیت کا پیشرو ہے مزید بحث و تمحیص کا محتاج نہیں۔ صاف بات ہے کہ جب تک کسی ملک کی زبان ایک نہ ہو اُس کے باشندے قوم کہلانے کے حقدار نہیں ہوتے۔ چند ایسے شخص جن کی زبانیں مختلف ہوں ایک جگہ جمع ہو جائیں مگر کوئی مشترک زبان نہ جانتے ہوں تو وہ اپنا مافی الضمیر بوضاحت ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کر سکتے اور اُن کی اس خاموش ملاقات سے کوئی موانستِ باہمی پیدا نہیں ہوتی۔ تبادلۂ خیالات کا فقدان جس طرح انفرادی طور پر ربط ضبط کے خلاف ہے اُسی طرح قومیت کے نشوونما کے منافی ہے۔ اس سوال پر نفسیاتی پہلو سے نگاہ ڈالیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اتحادِ زبان نردبان ہے اتحادِ ذہنی کی اور اتحادِ ذہنی پیش خیمہ ہے اتحادِ عمل کا اور اتحادِ عمل معراجِ قومیت ہے۔ جب زبان اس طرح ایک قوم کے سرمایۂ مشترک کی صورت اختیار کرلے اور یہ دھارا چل پڑے تو فروعی اختلافات کی پایاب ندیاں آپ سے آپ اس میں آملتی ہیں، اور جملہ منافقانہ تحریکیں بلامنتِ تدبیر اپنی موت آپ مرجاتی ہیں۔ پس جو لوگ قوم یا ملت بنانا چاہیں اُن کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ بیک زبان زبان کے سرمایۂ مشترک ہونے کو تسلیم کریں۔ ایسی زبان کو جو اتحادِ اقوام کی شیرازہ بندی میں حبل المتین کا کام دے قومی یا ملکی زبان کہتے ہیں۔

قومی زبان۔ ہندوستان ماشاءاللہ اس قدر وسیع اور آباد ملک ہے کہ اس میں ایک برِّ اعظم کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مذاہب والسنہ کے تنوع کو چھوڑ کر بولیوں کا یہ عالم ہے کہ ہر صوبہ بجائے خود بابل بن رہا ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ ان لوگوں کے دل و دماغ ایک روش پر چل رہے ہیں۔ اس ذہنی افتراق کے انسداد کی یہی سبیل ہے کہ زبانوں اور بولیوں کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کیا جائے اور ہندوستان کی کسی موزوں زبان کو قومی زبان قرار دیا جائے تاکہ یہ غرضِ مشترک سب کو ایک ذہنی سطح پر لے آئے۔ اس انتخاب میں زیادہ جھنجھٹ کی ضرورت نہیں۔ بس وہ زبان اٹھا لیجئے جو سب زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اس بارے میں مردم شماری کی رپورٹ یہ شہادت دیتی ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ وہ بولی سمجھی جاتی ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد اور فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ اُسے ہندوی ریختہ، دہلوی، اردو، ہندوستانی یا ہندی

کسی نام سے موسوم کرو، فارسی، دیوناگری یا رومن کیرکٹر میں لکھو، مگر زبان وہی ہے جسے عرفِ عام میں اردو کہتے ہیں اور موجودہ پنجابی، دکھنی، ملتانی، سندھی، اور ہندی اُس کی ابتدائی شکلیں ہیں۔

دوسری منزل - مگر مردم شماری کی یہ سند کافی نہیں اور اُردو کو قومی زبان بنانے میں ابھی بہت سی مشکلوں کے پہاڑ کاٹنے ہیں۔ مغائرت کے اسباب کو ملیامیٹ کرنا، مشکلاتِ تحصیل کو حل کرنا، زبان کو اس قابل بنانا کہ وہ علوم و فنونِ جدیدہ کا لنگر سنبھال سکے اور اسی قسم کے تردد ہیں جنہیں کئے بغیر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ، مرکزِ اردو کی تخصیص، اردو ہندی کا قضیہ، شیخ و برہمن کی منافرت، صرف و نحو کی پیچیدگیاں گو محض سطحی خرخشے ہیں اور محبت و رواداری کے دریا کے سامنے خس و خاشاک سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے مگر ہٹ دھرمی ضد اور تمنائے استبداد نے ان رائی کے دانوں کو پربت بنا رکھا ہے۔ جب تک ان کا تدارک نہ ہو جائے اور ازمنۂ ماضیہ کی طرح آج بھی ہندو اور مسلمان اردو کو اپنی مادری زبان اور سرمایۂ مشترک نہ خیال کریں اردو ہندوستان کی قومی زبان نہیں بن سکتی۔

ہم ان امور پر محض اس لئے اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ وہ حضرات جو اس میدان کے مرد ہیں توجہ گرامی مبذول فرمائیں اور اپنے ناخنِ تدبیر سے اس عقدہ کو حل کر دیں ورنہ اس ضمن میں اپنا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے ہمارے لئے اتنا ہی بس ہے کہ ہم نے ان امور کو معرضِ بحث میں لانے کی جسارت کی۔

اہلِ زبان - اہلِ زبان کہلانے کا خبط کوئی نئی بات نہیں محض اہلِ فارسی کی تقلید ہے۔ عرب ایرانیوں کو عجمی کہتے تھے۔ ایرانی شعرائے ہند کو "پوچ گویاں" کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ ایرانیوں پر بس نہ چلا تو ہند کے مسلمان ہندو ادبائے فارسی کی زبان کے متعلق "بوئے کچوری مے آید" کہہ کر دل کی بھڑاس نکالنے لگے جب دہلی میں اردو کا چرچا ہؤا تو اہلِ دہلی نے اپنے اہلِ زبان ہونے کا اعلان کر کے ماورائے سکانِ دہلی ہر جگہ کے باشندوں کو غیر اہلِ زبان یا بے زبان قرار دیا حتّٰی کہ لکھنؤ بایں ادعائے زبان اس لپیٹ میں آگیا درحالیکہ خود دہلی کا اردوئے معلّٰی لکھنو میں اس انداز سے منتقل ہؤا تھا کہ بقول علامہ طباطبائی خود "دلّی گوش برآواز لکھنو ہو گئی۔ شرح غالب صفحہ ۱۵۸"۔ لکھنو کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ دہلی کی سیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ چنانچہ لکھنؤ میں زبان کا جدید سکول قائم ہو گیا۔ اسی طرح جب پنجاب کی باری آئی تو اُس نے بھی حلقۂ غلامی اتار پھینکا۔ اور اہلِ زبان اُس شخص کا نام رکھا جو خدمتِ زبان کی اہلیت رکھے۔ جو خواہ کوئی ہو کہیں کا رہنے والا ہو۔ زبان کی عمدگی کا معیار مکان کی بجائے عمل کو قرار دیا گیا۔ مذہب و ملت اور رنگ و مسکنت کے حجاب دور کر دیئے گئے

اگرچہ صاحب فرہنگِ آصفیہ (جلد اول صفحہ ۲۳) اہلِ زبان کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ اہلِ زبان اُس شخص کو کہتے ہیں جس کی زبان دانی مسلم الثبوت ہو" لیکن اکثر اہلِ دہلی ہنوز اس بات پر اڑے بیٹھے ہیں کہ صرف اہلِ دہلی ہی اہلِ زبان اور اردو کے واحد وارث ہیں۔ چنانچہ صاحبِ تسہیل البلاغت صفحہ ۱۵ میں فرماتے ہیں "دہلی کا ہر چھوٹا بڑا عالم ہو یا جاہل، شریف ہو یا رذیل اہلِ زبان ہے" اس سے پہلے بھی ایک صاحب "نصرت الاخبار" دہلی مورخہ ۱۱- اپریل ۱۸۷۸ء میں لکھ گئے ہیں " دہلی میں درباری اور بازاری زبان ایک ہے" یعنی ہر کس و ناکس جو دلی وال ہو اہلِ زبان ہے۔ اور دربارِ ادب میں چھدامی بھٹیارا داغ کے برابر کرسی کا مستحق ہے۔ یہ دعویٰ اتنا بلند ہے کہ کچھ کہنے کی جرات نہیں پڑتی مگر دریائے لطافت میں سید انشائے دہلوی اس کا ساکت و صامت جواب بار بار دے گئے ہیں:-

" ازراہِ حماقت فصاحت و بلاغت را مقید کردہ اند بتولدِ شخص در شاہجہان آباد۔ وندانند کہ منبع فصاحت و معدنِ بلاغت کہ زبانِ شاں مشہور برار دوست سوائے بادشاہِ ہندوستان کہ تاج فصاحت بر سر او مے زیبد چند امیر و مصاحب شاں و چند زنِ قابل از قسم بیگم و خانم و کسبی ہستند ہر لفظے کہ در ینہا استعمال یافت زبانِ اردو باشد نہ ایں کہ ہر کس کہ در شاہجہان آباد باشد ہر چہ گفتگو کند معتبر باشد صفحہ ۲۶ "فصاحت در دلی نصیب ہر کس نیست صفحہ ۲۲" فصاحت بر تولدِ کسے در شاہجہان آباد نیست صفحہ ۲۳" دریائے لطافت کے ان مندرجات کے بین السطور سے عیاں ہے کہ اُس زمانے میں بھی دہلی کی طرف سے اس قسم کے دعاوی ہوتے تھے جنہیں خود دہلی کے فصحا لغو سمجھتے تھے۔ اُس زمانے میں جن کے دم سے چراغِ فصاحت بقولِ انشا دہلی میں روشن تھا اُن میں سے اب کسبیاں ہوں تو ہوں باقی سامان رخصت ہو گئے۔ زمانۂ حال میں مرزا یاس اس کے متعلق چراغِ سخن صفحہ ۱۰ میں تحریر فرماتے ہیں "۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے یہ مشہور تھا کہ اردو زبان فقط دہلی اور لکھنؤ والوں کی ملک ہے۔ اور اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ اس وقت تک یہ خیال کسی حد تک صحیح تھا مگر غدر کے بعد یہ خیال بالکل باطل ثابت ہو گیا۔ آج بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زبانِ اردو کے مالک بلا شرکتِ غیرے لکھنو اور دہلی والے ہیں مگر یہ صرف اُنہیں لوگوں کا خیال ہے جو کبھی اپنی چار دیواری سے باہر نہیں نکلے جنہیں یہ نہیں معلوم کہ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا اور اردو کہاں سے کہاں پھیل گئی" بہرحال اگر اس دعوے کو تسلیم کیا جائے تو زبانِ اردو کی حیثیت محض مقامی ہو جاتی ہے اور وہ قومی زبان نہیں رہتی۔ یہ دعویٰ کر کے یہ حضرات زبان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

مرکزِ زبان - یہ دعویٰ گزشتہ ادعا کی صدائے بازگشت ہے - اہلِ دہلی فرماتے ہیں کہ دہلی ایامِ قدیم سے زبانِ اردو کا مرکز ہے اور چاہتے ہیں کہ جو الفاظ، محاورات اور اصطلاحات چلن پائیں اُن پر اہلِ دہلی کی مہر ہو۔ ہم مرکزِ زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ایک مجلس کی شکل میں - تاکہ چار کھونٹ کی زبان ہموار ہو اور تباین تفاوت کا اندیشہ نہ رہے - لیکن مقامی مرکزیت سراسر مآل اندیشی کے خلاف ہے - اس امتیاز سے تجنتر و استبداد کے علم بلند ہونگے - اور اُن کے سایہ میں بغض اور حسد اور رشکِ رقابت کے بازار گرم ہونگے - نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایۂ مشترک منتشر ہو جائے گا اور اُردو ہندوستان کی قومی زبان بننے سے عاجز ہو جائے گی - مگر اس میں کلام نہیں کہ انتزاعِ سلطنتِ مغلیہ سے پہلے دہلی اور لکھنو کو مرکزیت کی منزلت حاصل تھی اور انہیں زیب دیتی تھی نشر و اشاعتِ زبان مشاعروں اور مکتبوں تک محدود تھی کتابیں کمیاب تھیں اور اُن کا معقول التزام فقط دار السلطنت میں ممکن تھا - کیونکہ رسل و رسائل اور آمد و رفت کے وسائل ناقص تھے - پایۂ تخت علوم و فنون کا مرکز، تجارت کی منڈی اور روایاتِ بذل و سخا کا محلِ وقوع تھا - اور بلا شبہ ایسی جگہ میں زبان مفصلات کی بہ نسبت زیادہ پنپ سکتی ہے - دراصل دہلی اور لکھنؤ سے مراد وہ اینٹ پتھر نہیں جن سے لال قلعہ جامع مسجد اور قیصر باغ کی دیواریں کھڑی ہوئیں، بلکہ دہلی و لکھنؤ عبارت ہے اُن خوبیوں سے جو افسوس ہے کہ اب نہیں اور مرکزیت کا دعوے ساتھ لے گئیں -

وہ تو باقی ہی نہیں جن سے کہ دہلی تھی مراد
دھوکا اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز (مجروح)

ہم کہتے ہیں کہ اگر سلطنتِ مرحوم قائم بھی ہوتی تو دورِ حاضر کے پریس ریل ڈاک اور تار کی مستعدی کے ہوتے مقامی مرکزیت کی بہت کم ضرورت رہتی - بے شک سلطنت کے سایہ میں زبان بہت ترقی کرسکتی لیکن مرکز بے معنی چیز ہو جاتی - اب بھی جس شہر میں یہ باتیں ہوں اُسے مرکزِ زبان بنانے میں ترجیح دے سکتے ہیں لیکن فرعونِ بے سامان کا سکہ نہیں چل سکتا -

صاحبِ تسہیل البلاغت (صفحہ ۱۱) مندرجہ ذیل اصول وضع کر کے دہلی کے مرکز ہونے کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں:-

الف - وہ زبان اُس خاص قریہ میں پیدا ہو اور وہاں سے تمام ملک میں پھیلے -

ب - شہر کے خاص و عام وہی زبان بولیں یہ نہیں کہ خواص کی زبان کچھ اور ہو اور عوام کی کچھ اور - جیسے لاہور میں

خواص کی زبان اردو اور عوام کی پنجابی ہے۔ پورب کے عام لوگ پوربی بولتے ہیں اور خواص اردو۔

ج۔ اس شہر میں ایسے بہت سے لوگ ہوں جو زبان کو تراش خراش کر خوشنما اصلاحیں دیں، موثر اور دل نشین انداز بیان نکالیں۔ نئے نئے اسالیبِ بیان پیدا کریں اور زبان کو ایسی وسعت دیں کہ وہ ہر طرح کے ادائے مطلب پر قادر ہو جائے۔

د۔ ان لوگوں کے کلام دوسرے لوگوں کے لئے زبان دانی میں سبق آموز ہوں:۔

لازم ہے کہ ہم ان پر سلسلہ وار نگاہ ڈالیں۔

الف۔ کا جواب کلیتاً نفی میں ہے۔ اردو زبان نہ دہلی میں پیدا ہوئی نہ وہاں سے دیگر ملکوں میں پھیلی حکیم نجم الغنی فرماتے ہیں "یہ صرف شاہجہاں کا اقبال ہے کہ یہ زبان اُس کے اردو کی طرف منسوب ہوئی ورنہ بنا اُس کی اُس زمانہ میں پڑ گئی تھی جب کہ مسلمانوں کا قدم پہلے پہل ہندوستان میں آیا (بحر الفصاحت صفحہ ۴۸)" حکیم شمس الدین قادری ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں "تاریخ زبانِ اردو کا یہ حصہ اگر روشنی میں لایا جاتے اور اس کی بنیاد پر اردو زبان کی عہد بعہد ترقیاں مطالعہ کی جائیں تو ماننا پڑتا ہے کہ آلِ سبکتگین کے زمانہ میں اردو کی ابتدا ہوئی۔ اردوئے قدیم صفحہ ۱۸" خدا جانے یہ حضرات معموں میں کیوں باتیں کرتے ہیں اور صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آلِ سبکتگین کی حکومت پنجاب میں تھی لاہور اُن کا مستقر تھا اور یہیں زبانِ اردو کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اب رہا یہ سوال کہ زبان ملک میں پھیلی کس طرح تو اس بارے میں یہ عرض ہے کہ "غوریوں کے عہد میں یہ زبان لاہور سے دہلی پہنچی وہاں سے خلجی اسے گجرات اور دکھن لے گئے۔ محمد تغلق جب دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرنے پر آمادہ ہوا تو یہ زبان اِن نو آبادکاروں کی زبان بن کر دکھن میں پھیل گئی۔ (دیباچہ "پنجاب میں اردو" از حافظ محمود شیرانی صفحات و ھ) وہاں سے پھر دلّی اورنگ آبادی کا دیوان آتا ہے۔ اور دہلی میں دکن کی طرح زبانِ اردو ادبی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ اور محمد شاہ کے عہد سے شاہِ عالم ثانی کے زمانے تک اردو صرف دلّی کی مِلک رہی اس سے ظاہر ہے کہ زبان کی ابتدا بھی لاہور سے ہوئی جو اس زبان کا جنم بھوم ہے۔

ب۔ یہ درست نہیں۔ آج کل کا اندازہ تو ہر شخص آسانی سے دہلی جا کر لگا سکتا ہے اور ماضی کے متعلق سُننے سیّد انشا کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

"اگر چنیں باشد ساکنانِ مغل پورہ چہ تقصیر کردہ اند کہ زبانِ ایشاں معیوب و خلافِ اردو شمردہ شود با فرزندانِ سادات بارہہ کہ در دار الخلافت می باشند از کجا گفتگوئے ایشاں سند نباشد۔ دریائے لطافت صفحہ ۴۶" رہا لاہور تو اُس کے

متعلق میرزا صاحب کو تسامح ہؤا ہے۔ اس شہر میں سب لوگ کیا ہندو کیا مسلمان اردو ہی بولتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ عوام قدیم اردو میں بات چیت کرتے ہیں جسے دکنی کی طرح پنجابی کہتے ہیں اور خواص وہ اردو جو ذرا سنور گئی ہے پنجابی دراصل کوئی جداگانہ زبان نہیں بلکہ اردو کے دورِ ارتقا کی ابتدائی یا درمیانی منزل کا نام ہے چنانچہ مولوی سید احمد مرحوم فرہنگِ آصفیہ جلد ا صفحہ ۲۳۵۰ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "پنجابی میں اکثر ہندی الفاظ اپنی اصلی ہیئت پر موجود ہیں" یعنی پنجاب میں زبان کی وہی حالت رہی مگر دہلی میں اُس نے زیادہ مہذب شکل اختیار کر لی۔

(ج) اسلاف کے ذکرِ خیر کو چھوڑ کر کوئی تفصیل سے نہیں بتا سکتا کہ عہدِ رواں میں اہلِ دہلی نے کون کون سے نئے اسالیبِ بیان پیدا کئے اور زبان کو کیا وسعت دی۔ اِس عہد میں لے دے کے فرہنگِ آصفیہ ایک کام کی چیز پیدا ہوئی جس کی طباعت کا سہرا لاہور کے سر ہے اور امداد کا فخر دکن کو۔ اگر یہ دو طاقتیں بروئے کار نہ آتیں تو سید احمد اُس کی اشاعت کی حسرت قبر میں ساتھ لے جاتے۔ بلکہ اخبارِ عام لاہور مورخہ ۱۹۔ اکتوبر ۱۸۹۸ء کا یہ مبہم فقرہ بہت معنی خیز ہے کہ "خود اہلِ دہلی کی عنایت تھی جو مصنف کو بہت عرصہ تک پریشان ہونا پڑا"۔ اب سنئے حکیم نجم الغنی رامپوری جیسا ایک غیر جانبدار گواہ جس کا پنجاب دہلی اور لکھنؤ کسی سے بھی تعلق نہیں کیا کہتا ہے "زباندانانِ لکھنؤ کو الفاظ کی تراش و خراش کا بڑا خیال رہتا ہے اور حضراتِ دہلی ایسی باتوں کو فضول سمجھتے ہیں۔ بحر الفصاحت صفحہ ۳۸" ہم ذیل میں وہ اصلاحات درج کرتے ہیں جو فصحائے لکھنؤ نے دورِ حاضر میں یعنی امیر اور داغ کے بعد زبان میں کیں۔ حامیانِ دہلی بھی ارشاد فرمائیں کہ اِس دور میں اُن کے "یاں" کیا کارِ نمایاں ہوئے؟

(۱) صیغۂ امرِ حاضر میں "ئیو جیو" کا اضافہ نہ کرو جیسے آئیو۔ جائیو۔ آئیے۔ جائیے کہو۔

(۲) جب ترکیب فارسی ہو تو آخر لفظ کے نون کا اعلان نہ کرو۔ جیسے تابعِ فرماں۔

(۳) مضارع کے صیغوں میں واؤ زیادہ نہ کرو۔ مثلاً آویں جاویں نہ کہو۔ آئیں جائیں بولو۔

(۴) جو لفظ خود جمع ہے اُس کی جمع بقاعدہ اردو بنانا ناجائز ہے جیسے احباب سے احبابوں

(۵) فارسی میں "ہا" علامتِ جمع ہے اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے۔ جیسے گُلہا۔ داغہا۔ ہزار ہا۔

(۶) آخر کلمہ کی یائے معروف کو مشدد استعمال نہ کرنا چاہئے۔ جیسے۔ کیوں کیا حال "بتائیے" دل کا۔

(۷) "رشکِ گل" "رشکِ پری" "غیرتِ ماہ" وغیرہ الفاظ جن سے کنایتاً معشوق مراد ہوتا ہے بغیر اشارہ کے استعمال کرنا غیر مطبوع ہے۔

(۸) مصادرِ فارسی کا استعمال متروک ہے مثلاً "بعدِ مُردن" کی جگہ اب پسِ مرگ یا بعدِ مرگ بولتے ہیں۔

(۹) تا۔ جو۔ جب۔ غرض۔ کاش اور گو کے ساتھ "کہ" کا اضافہ خلافِ فصاحت ہے۔
(۱۰) جو شخص مر گیا ہو اُس کے نام کے ساتھ "صاحب" کا لفظ لگانا معیوب ہے۔
(۱۱) مصدر کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال نہ کرو۔ مثلاً۔ آیا چاہیئے۔ دیکھا چاہیئے۔
(۱۲) "ساتھ" اور "ہاتھ" کو "بات" اور "رات" کے ساتھ قافیہ نہ کرو۔
(۱۳) "اوپر" کی جگہ جو "بر" کے معنوں میں آتا ہے "پر" استعمال کرو
(۱۴) لفظِ فارسی یا عربی اور ہندی کے درمیان واؤ عاطفہ نہ لاؤ۔
(۱۵) جو نون آخر الفاظِ فارسی یا عربی میں بلا ترکیب ہو اُسے باعلان استعمال کیا جائے۔ باستثنا۔ خزاں۔ رواں طپاں۔ عیاں۔ وغیرہ۔
(۱۶) مضاف الیہ میں نون واقع ہو تو اس کا اعلان نہ کرو۔
(۱۷) "اور" کہ حرفِ عطف ہے اس میں ظاہر ہونا واؤ اور رائے مہملہ کا ضرور ہے۔
(۱۸) بائے موحدہ کو الفاظِ عربی اور فارسی کے قبل نہ لگاؤ۔ مثلاً بوقتِ صبح۔ بہنگام شام۔
(۱۹) عرصہ بمعنی دیر کے لئے دفعہ استعمال کرو۔
(۲۰) آتے ہے۔ جائے ہے کی جگہ آتا ہے جاتا ہے کہو۔
(۲۱) رکھا۔ چکھا۔ اٹھا کو حرفِ اوسط کی تشدید سے استعمال کرو۔
(۲۲) اِس باب میں کی بجائے اِس بارے میں استعمال کرو۔
(۲۳) لفظِ ہر کو جمع کے ساتھ استعمال نہ کرو (دیباچۂ نور اللغات و بحر الفصاحت صفحہ ۴۳ و اصلاحِ زبانِ اردو)

مندرجہ ذیل الفاظ جو داغ و امیر اور اُن کے معاصرین نے استعمال کئے ہیں متروک قرار دیئے:۔

مارے۔ باعث۔ (امیر) یہ خبر سنتے ہی میں مارے خوشی کے مر گیا۔
نجانے۔ نہ معلوم (شاد) کیا گذرتی ہے نہ جانے وطن آواروں پر۔
آپی۔ آپ ہی۔ (داغ) ہم نظر آپی چرا جاتے ہیں اکثر دیکھ کر۔
آخر کو۔ آخر۔ (نوح) آخر کو گذر جائے گی میری شبِ ہجراں۔
آسا۔ مانند (امیر) شمع آسا کبھی جلتے کبھی روتے گذری۔
اتنے لیئے۔ اِس واسطے۔ (امیر) لوٹتا ہوں نہ خنجر فقط اتنے لئے میں۔

اخیر۔ آخر۔ (داغ) اخیر کچھ نہ بنی صبر اختیار کیا۔
اس طرح سے۔ اس طرح (داغ) اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے آگے۔
امداد۔ مرحمت (داغ) جو عطا غیر کو ہو وہ مجھے امداد نہ ہو۔
اے بلبلو۔ اے زاہدو۔ (شاد) حباب وار تم اے بلبلوؤ بھر لینا۔
بارے۔ ایسا ہو۔ (امیر) بارے جھپٹ کے میں نے گلے سے لگا لیا۔
برابر میں۔ ساتھ میں (داغ) آپ کیوں میرے برابر میں چلے آتے ہیں۔
برخلاف۔ خلاف (داغ) کس درجہ برخلاف ہے دل کس قدر خلاف۔
بلا۔ بغیر (جلیل) ملنے لگا ہے مجھ سے بلا واسطہ وہ شوخ۔
بل بے۔ واہ رے (شاد) بل بے ناکامی کہ ہے حسرت ہی حسرت جانِ زار۔
بن۔ بغیر (آتش) دام میں لا کر کیا جب بن چھری مجھ کو حلال۔
پَیر۔ پاؤں (داغ) جب اُس کی بات کا کوئی سَر ہو نہ پَیر ہو۔
تڑپن۔ تڑپ (شاد) دکھائیں کس طرح تڑپن دلِ مضطر کی ڈرتے ہیں۔
تلک۔ تک (امیر) جب تلک تم تھے کشیدہ دل تھا شکووں سے بھرا۔
تلے۔ نیچے (داغ) وہ دل ہے جو ترے تلووں تلے ہوا پامال
جُوں تُوں۔ بہر طور (داغ) ہو گیا جُوں تُوں گذارا ہو گیا۔
خود سے۔ آپ سے آپ (جلال) خود سے ادھر نہ جائیں ہم۔
دلا۔ اے دل (امیر) دلا ہم سے گِلہ اُس دلربا کا۔
سدا۔ ہمیشہ (شاد) سدا دیدہ بازی میں اے شاد گذری
سمیت۔ ساتھ (شاد) آئے تھے تنہا چلے رنج و غم و ارماں سمیت۔
سر پرسے۔ سر سے (داغ) صدقہ کر ڈالیں ترے سر پرسے ہم۔
سندیسا۔ پیغام (داغ) آئے ہیں آپ محبت کا سندیسا لے کر۔
صفا۔ صاف (داغ) سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کتا ہے۔
کتنے۔ کیسے (شاد) دیکھنے میں غریب کتنے ہیں۔

کتی ۔ کم (شاد) کیا لہو رونے سے کتی شاد مجھ ناشاد کو۔

کون مدت ۔ کتنی مدت (داغ) کون مدت سے ہے عادت مجھے تنہائی کی۔

میاں ۔ صاحب (امیر) کیوں میاں کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا جاتا رہا۔

ناپیدا ۔ ناپید (داغ) مدعا یہ تھا کہ پیدا کر کے ناپیدا کروں

نگھرا ۔ بے گھر (امیر) نگھرا کر کے تو ہیں آپ سدھارے گھر کو۔

وار ۔ باری (داغ) کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے وار پر۔

وصلت ۔ وصال (شاد) خواہش وصلت نے پھاڑا جامۂ یوسف جواں۔

واں ۔ وہاں (امیر) واں جام سے دریغ یہاں سے ہے صبوپسند۔ (قرار اصطلاحات صفحہ ۲۳ لغایت ۵۰)

یہ اصطلاحات اچھی ہوں یا بُری اس سے بحث نہیں ۔لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کون اُن کے موجد ہیں ۔ سندِ جواز کہاں سے ملی ۔ اگر اردو صرف لکھنو کی زبان ہے تو جو چاہیں کریں ورنہ جو اس وقت اُس کی خدمت کر رہے ہیں ان سے استصواب لازم آئے گا ۔ حکومت قانون بناتی ہے تو رعیت کی رائے لیتی ہے اور یہاں تو مساوات اور برادری کا معاملہ ہے

زبان کی اصلاح کے علاوہ لکھنؤ کو ڈراما ، مرثیہ ، سلام ، ناول اور ریختی رنگین کا تفنن کسی شمار میں نہیں ۔ لکھنو کے ایجاد ہیں ۔ نعت میں بھی لکھنو نے بہت کام کیا ہے ۔ امانت ۔ دلگیر ۔ انیس ، دبیر ، نفیس ، اوج ، محسن ، امیر ، سرشار اور حالی صاحب کے مدِمقابل پیدا کرنے میں دہلی کی سرزمین عاجز نظر آتی ہے لیکن یہ لفظی زیب و زینت حقیقت کی نگاہ میں چنداں وقعت نہیں رکھتی اس سے فہم و ادراک ، علومِ جدیدہ کے انکشاف اور تراجم میں کوئی مدد نہیں ملتی ، زبان میں کوئی وسعت نہیں ہوتی ، البتہ ذرا رنگ شوخ ہو جاتا ہے ۔ ہم آیندہ چل کر بتائیں گے کہ اُن کی جدت طرازیوں نے زبان کے اثر کو محدود کر دیا ہے اور تصنع اور تکلف کی بدولت تاثیر ، شیرینی اور گھلاوٹ میں فرق آ رہا ہے ۔ ہاں اگر سرمایۂ کمال فقط زبان ہی زبان ہے اور معاملہ بندش روزمرہ اور محاورہ ہی علم و فضل کی کل کائنات ہے اور زبان میں مزید وسعت کی ضرورت نہیں تو اور بات ہے ۔ لیکن اگر جدید علوم سے اردو کو مالامال کرنا ہے ۔ اگر اردو کو مغربی زبانوں کے دوش بدوش دیکھنا ہے تو ایسے لغات اور محاورات اردو میں آ کر رہیں گے جن سے موجودہ فصاحت کے کان ہنوز نا آشنا ہیں ۔ اِن اگلے وقتوں کے لوگوں سے کوئی پوچھے کہ یہ غزل ، قصیدے اور طلسمات کے پرانے سکے کب تک دکھاؤ گے ۔ زمانہ بدل گیا اور اگر زمانہ کے ساتھ یہ نہ بدلے تو کہیں ٹھکانا نہ ملے گا۔

وہ دن گئے جب علم و ادب محض تفریح کے سامان تھے۔ اب تو زندگی کا مدار انہی پر ہے۔ جو زبان زیادہ علوم کو اپنے دامن میں پناہ دے گی وہی پھولے پھلے گی۔ اور صرف حسنِ صوری محفلِ علم میں درخور کا ضامن نہ ہوگا۔ یہ تعلیوں کا نہیں، کام کا وقت ہے۔ اردو کب تک کھلونا بنی رہے گی۔ اسے اب مادی اور ذہنی ترقی کا آلہ بنا دیجیے۔ اسے سرمایۂ مشترک سمجھئے اور مل کر کام کرنا سیکھئے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں یہ جمِ غفیر کس طرح سمائے گا۔

ھ۔ یہ قول واضح نہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ طالبانِ علم مرکز میں حاضر ہو کر کسبِ فیض کریں تو اُس کے متعلق عرض ہو چکا کہ دورِ حاضر میں اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ باکمالوں کے دواوین سے محاسنِ زبان ڈھونڈ کر نکالے جائیں، محاورات جمع کئے جائیں، تراکیب کی فرد مرتب ہو، تذکیر و تانیث کی فہرست قلم بند کی جائے، تو معاف فرمائیے، آج کل ہر دنیا دار سے اس کھڑاگ کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اہلِ لکھنؤ کی طرح دستور العمل بنا کر دکھائیے۔ مگر آپ نے تو اس طرف توجہ ہی نہیں کی اور جب کسی نے کچھ پوچھا بھی تو انگلی پکڑ کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لڑھکنے کے لئے چھوڑ آئے۔

ہندی اور اُردو۔ زبانِ اردو کی عالمگیر حیثیت اختیار کرنے میں یہ شاخسانہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اصل میں صرف آپس کا ہمنسی مذاق تکدرِ خاطر کی حد تک جا پہنچا ہے۔ ہندو اپنے قابلِ احترام بزرگوں کی طرح اردو کی خدمت میں کمربستہ تھے، مگر مسلمانوں میں ہندو دوست اور رواداری پسند ہستیاں جھنجنے لگیں۔ چند غیر ذمہ دار مسلمان نوجوانوں نے ہندوؤں کی زبان پر حرف رکھنا شروع کیا اور اُن کی زبان کا نام "دھوتی پرشادوں کی بھاشا" رکھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ متروکات کا خنجر اُٹھایا اور بہت سے معصوم ہندی الفاظ کا سر اڑا دیا۔ ضد اور کش مکش نے اس پر کفایت نہ کی بلکہ ایسے محاورات جو ہندوؤں سے خاص تھے فصاحت کے متباین قرار دیئے۔ اور فارسی و عربی کے غیر مانوس الفاظ کا ایک لشکر اردو میں داخل کر دیا۔ متحمل مزاج اور آشتی پسند ہندو تو پی گئے لیکن اُن میں آتش مزاج نوجوانوں کی قلت نہ تھی انہوں نے بڑے تپاک سے اِس چیلنج کا استقبال کیا اور اُنہی ہتھیاروں سے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے جو اُن کے حریفوں نے چھانٹے تھے۔ رسم الخط کے لئے دیوناگری منتخب ہوئی عربی فارسی کی جگہ سنسکرت نے سنبھالی وہ تلمیحات اور اصطلاحات جو مسلمانوں سے وابستہ تھیں متروک قرار پائیں۔ ہندی پر پرزے سنبھال کر اردو کے سامنے ڈٹ گئی۔ ہمارے عندیہ میں گو اردو موجود ہے اور اُس کا ستارۂ اقبال روشن ہے لیکن اس جنگ میں اُس کی ماہیت کھو گئی اور اس نام سے پکارے جانے کے قابل نہ رہی۔ اردو اُس سرمایۂ مشترک کا نام تھا جو فارسی اور بھاشا کے انفصال سے پیدا ہوا جب بھاشا کی علیحدگی سے اس میں پراگندگی آگئی تو اردو کے

سے خود بخود اکھڑ گئے اور قصرِ اقبال متزلزل ہوگیا۔ ہندوؤں نے بھی ہندی کی چندی نکالنے میں کسی مآل اندیشی کا ثبوت نہیں دیا، بلکہ جوشِ غضب سے ہندوستان کی قومیت پر وہ چرکا لگایا ہے جس کا اندمال قرنوں میں ہو تو ہو۔ اردو ہندو مسلمان اتحاد کی ایک زندہ یادگار ہے جسے ہمارے بزرگوں نے بڑی جانکاہی سے استوار کیا تھا۔ اس میں رخنہ ڈالنا قصرِ قومیت کی بنیادیں اکھیڑنا ہے اس کے علاوہ پرانی بھاشا کو پھر سے زندہ کرنے میں انہوں نے اُلٹی زقند بھری ہے اور زبان کی ترقی یافتہ شکل سے اغماض کرکے اس کی ابتدائی ہیئت کی پرورش کرنے لگے ہیں۔ گویا وہ ازسرِنو وہی کام کر رہے ہیں جو ایک مدت کا ہوچکا ہے۔ بعینہٖ یہی عالم اُن پنجابی حضرات کا ہے جو پنجابی کو اردو سے علیحدہ خیال کرکے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

ہندو اپنی فطرت کے مطابق ذرا بردباری سے کام لیتے تو اُن مسلمانوں کو انہیں کے منتخب طریق میں جواب دے سکتے تھے۔ وہ قوم جو ٹیک چند بہار، ہرگوپال تفتہ، سرب سنگھ دیوانہ، طوطا رام شایان، مادھو رام سرشار اور کیفی جیسے فارسی دان پیدا کرسکتی ہے کیا وہ فارسی ہی میں مسلمانوں کا منہ بند کرسکتی تھی؟

اب وقت کا تقاضا یہی ہے کہ رسم الخط خواہ دیوناگری ہو یا فارسی مگر زبان وہی رہے جسے اردو کہتے ہیں۔ موجودہ اردو میں غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ نہ لائے جائیں اور ہندی کو سنسکرت کے بھولے بسرے شبدوں سے سرفراز نہ فرمایا جائے۔ ورنہ قومی زبان بنانے کا خیال دل سے نکال دو اور لڑے جاؤ۔ ارشد کہتے ہیں کہ ؎

زبانِ ترکی کو کون ناداں بھلا بنائے کا برج بھاشا
زبانِ ہندی پہ کون جاہل بھلا کرے گا گمانِ اردو

لیکن وہ یہ شاعرانہ رو سے فرما گئے ہیں ورنہ حضرت داغ کی تو یہ رائے ہے۔ ؎

کہتے ہیں اُسے زبانِ اردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

یعنی اردو سے فارسی رنگ نکالو تو جو باقی رہتا ہے وہ ٹھیٹھ اردو ہے۔

(باقی) "ڈرامی"

ذوقِ فطرت

پئے تسکینِ خاطر حسن اگر ہو تو یہی بس ہے
یہ ساکت رات یہ ٹھنڈی ہوا یہ چاندنی بس ہے

انہیں کی دید سے ہوتی ہے پیدا تازگی جاں میں
سحر کی نور پاشی، دلفریبی شام کی بس ہے

ضرورت انجمن کی ہے نہ حاجت ہے احبا کی
یہ تنہائی یہ کنجِ عافیت یہ خامشی بس ہے

نہیں ثروت نہ ہو جمعیتِ خاطر نہیں کچھ کم
دو روزہ زندگی میں زیست اطمینان کی بس ہے

بہت کافی ہے مجھ کو سیرِ باغ و کوہ و صحرا کی
گیاہ و لالہ و گل سے مری دلبستگی بس ہے

کہوں کیا چھاؤں سے ہوتی ہے کیسی قلب کو فرحت
مری تسکینِ دل کو سایۂ اشجار ہی بس ہے

حقیقت میں یہی ہے انبساطِ روح کا سامان
یہ غنچوں کا تبسم اور پھولوں کی ہنسی بس ہے

نظر افروز کیا ہی جلوہ ہے اس حسنِ فضاں کا
نگاہِ نکتہ بیں کے واسطے اک تیتری بس ہے

کبھی ہے کوک کویل کی کبھی پی پی پپیہے کی
نشاطِ طبع کو وہ راگ اور یہ راگنی بس ہے

بہت دل کو لبھاتی ہیں صدائیں آبشاروں کی
یہ موسیقی حقیقت کی یہ صوتِ سرمدی بس ہے

مجھے بے خود بنانے کو مجھے مدہوش کرنے کو
مرے ہی گیت کافی ہیں مری ہی بانسری بس ہے

گھٹا میں ہائے کیا عالم ہے بگلوں کی قطاروں کا
اگر ہے ذوقِ نظارہ تو نظارہ یہی بس ہے

یہ وادی یہ شجر یہ جھیل یہ طاؤس یہ سارس
انہیں سے شاد ہوں اتنا ہی لطفِ زندگی بس ہے

نجیب ان سے نہیں ہے کوئی اندیشہ برائی کا
درختوں اور پرندوں ہی سے اپنی دوستی بس ہے

میر سعادت حسین نجیب

ضریاب

تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے بسا اوقات ایسے اشخاص کے حالاتِ زندگی نظر سے گزرتے ہیں۔ جو اپنے فن میں لاثانی اور اپنے دائرۂ عمل میں بے مثال تھے مگر جن کو زمانے نے ایسا فراموش کردیا کہ اُن کی یاد میں آنسو بہانا تو درکنار کوئی نام لینے والا بھی نہیں رہا۔ ان ہی ہستیوں میں سے وہ ماہِ آسمانِ موسیقی تھا جس نے مطلعِ فارس سے نکل کر مطلعِ بغداد پر جھلک دکھائی اور اندلس پر ضیا پاشی کرتا ہؤا وہیں غروب ہوگیا۔ ضریاب جو سلطان عبدالرحمٰن ثانی شاہِ اندلس کے زمانے میں مشہور ترین آدمی گزرا ہے فارس میں پیدا ہؤا اور خلیفہ ہارون الرشید کے دربار کے مشہور مغنی اسحاقِ موصلی کا شاگرد بنا، یا یوں کہئے کہ اسحاقِ موصلی سے فنِ موسیقی کی ابجد پڑھ کر اُس نے وہ کمال پیدا کیا کہ استاد کی شہرت اور فخر کا باعث ہؤا۔ یہاں تک کہ معلم متعلم کو نگاہِ رشک سے دیکھنے لگا۔

اسحاقِ موصلی کے ساتھ ضریاب بھی ہارون الرشید کے دربار میں علوم وفنون کی محفلوں میں شمولیت کے لئے جایا کرتا تھا۔ اس کی ذہانت اور حافظہ جسے ظاہر کرنے کا اسے اکثر موقع مل جاتا تھا سمجھنے والے دلوں میں طرح طرح کی امیدیں پیدا کرتا تھا اور دُور بین نظروں کو اُس کا مستقبل شاندار دکھائی دیتا تھا۔ ایک روز خلیفہ کے حضور میں نغمۂ سرود جاری تھا اور تمام ماہرینِ فن جمع تھے جب ضریاب کی باری آئی تو بدقسمتی سے اُس نے وہی راگ جو اسحاق گا چکا تھا اُسی سر سے گانا شروع کیا اور استاد پر سبقت لے گیا۔ محفل کے برخاست ہونے پر بادشاہ نے اُسے حکم دیا کہ یا تو بغداد کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دے یا مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ ضریاب نے جلا وطنی کو موت پر ترجیح دی اور بغداد سے نکل کر اندلس کی راہ لی۔

یہاں اُن دنوں عبدالرحمٰن ثانی سریرِ مملکت پر جلوہ افروز تھا اور شاہانِ اسلام کا تخت ایک صدی سے زیادہ عرصے کی حکومت کے بعد اب بالکل مستحکم ہو چکا تھا۔ بغداد کی علمی اور ادبی مجلسوں کی شہرت اور دربارِ ہارون الرشید کی شان وشوکت سن کر سلطان کے دل میں دارالخلافۂ اندلس (قرطبہ) کو رشکِ بغداد بنانے کا شوق تھا اس لئے اُس نے ضریاب کا بڑے شوق سے خیر مقدم کیا۔ سکونت اور خوراک کے علاوہ جس کا انتظام اُس نے اپنے ذمے لیا ایک معقول وظیفہ اور دیگر حقوق عطا فرمائے۔ اس طرح بے وطن ضریاب اپنے ہنر کی بدولت بہت مال دار ہو

گیا اور آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنے لگا۔

قدر شناس سلطان اُس کے علم و ہنر اور قابلیت پر اس قدر ممنون ہؤا کہ جب یہ عندلیب فارس اپنی راگنی چھیڑتا تو گھنٹوں بیٹھا سنا کرتا اور اکثر کھانے میں بھی اپنے ساتھ شریک کرلیتا۔ ضریاب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اس لئے وہ مختلف مضامین پر دیر تک گفتگو کرسکتا تھا۔ وہ شاہانِ سلف کے کارنامے ادبی حکایتیں اور علمی باتیں سُنا کر سلطان کی محفل کو گرم رکھتا تھا۔ اُس کو ایک ہزار سے زیادہ نظمیں یاد تھیں اور اُن میں سے ہر ایک نظم کو ایک مخصوص سُر کے ساتھ گایا کرتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ اُس نے تمام سُر ہوا کی حرکت اور اس کی فطری آواز سے سیکھے ہیں۔ اُس نے چار تاروں کی بجائے عود میں پانچ تار لگائے اور اُس کے بجانے کا طریقہ دوسرے ماہرینِ فن سے مختلف ہونے کے علاوہ اِس قدر موثر تھا کہ جو بھی سن پاتا تھا اُس کو پھر دوسرے کے راگ میں لطف نہ آتا تھا۔

جو شخص اُس کے پاس علم موسیقی سیکھنے کے لئے آتا تھا اُس کا امتحان ایک عجیب و غریب اور نرالے طریقے سے کرتا تھا۔ وہ اُسے اپنے پاس بٹھا کر اونچی سے اونچی آواز کے ساتھ گانے کا حکم دیتا۔ اگر آواز بہت ہلکی ہو تو اُس کی کمر کے گرد ایک پٹی بندھوا تا جس سے اُس کی آواز بلند ہو جاتی۔ اگر اُس کی زبان میں کوئی رکاوٹ یا تتلاہٹ ہو تو اُس کا علاج بھی عجیب ذریعے سے کرتا تھا۔ متعلم کا منہ اس قدر کھلواتا جتنا وہ کھول سکے۔ اُس کے بعد وہ اُس کو لفظ "آہ" کہنے کا حکم دیتا تھا۔ اگر وہ شخص لفظ "آہ" کافی بلند آواز سے نکال سکے تو اُس کو اپنا شاگرد بنا لیتا تعلیم و تربیت میں مصروف ہو جاتا اور سمجھ لیتا کہ اُس کی تتلاہٹ دور ہو جانے والی ہے ورنہ نکما سمجھ کر چھوڑ دیتا۔

ضریاب طرزِ کلام اور آدابِ محفل سے خوب واقف تھا۔ اُس کے زمانے میں کوئی شخص اُس سے زیادہ خوش خلق اور خندہ پیشانی نہ تھا ان صفات نے ہر شخص کے دل میں اُس کی صحبت کا شوق پیدا کردیا تھا۔ ہر مہذب گھر میں اُس کے نام اور قابلیت کا چرچا تھا۔ تمام اندلس میں وہ طرزِ معاش طرزِ لباس اور طریقِ خورد نوش کا رہنما تھا۔ اُس کو دیکھ کر لوگوں نے اپنے بال کٹوانے کا طریقہ بدل دیا۔ اندلس میں کئی قسم کے کھانے اُسی کے اختراع کردہ ہیں اور ایک قسم کی پلیٹ بہت دیر تک اُسی کے نام سے منسوب رہی۔ دھات کی بجائے شیشے کے برتنوں میں پہلے اُسی نے شراب نوشی شروع کی، پھر تمام لوگ اُس کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ چمڑے کے بستر پر سوتے اور چمڑے کی چٹائیوں پر کھانا کھانے کی مثال پہلے اُسی نے پیش کی۔ وہ اس بات پر بہت زور دیا

کرتا تھا کہ موسمِ سرما کے گرم کپڑے پہنتے پہنتے ایک دم گرمیوں کا باریک لباس زیبِ تن کرلینا بہت بُرا ہے بجائے اس کے لباس کو بتدریج تبدیل کرنا چاہئے۔

جو کچھ بھی وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا لوگ اُسے ضروری اور افضل و احسن سمجھ کر بغیر کسی اعتراض کے اختیار کرلیتے تھے۔ یہاں تک کہ امورِ معاشرت میں بادشاہ بھی اُس کی پیروی کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عبد الرحمٰن ثانی اپنے عہدِ حکومت میں چار اشخاص کے زیرِ اثر رہا (۱) یحییٰ جو اُس کے زمانے کا بہت بڑا مذہبی عالم تھا (۲) ملکہ زینب (۳) اُس کا غلام نصر اور (۴) ضریاب سیاسی جھگڑوں میں پڑنے سے ضریاب بہت بچتا تھا اس لئے اُس نے اپنے اثر کو امورِ معاشرت ہی تک محدود رکھا اور انتہا تک پہنچایا۔

تاج محمّد

غُصّہ

ناراضگی پر رات نہ پڑنے دو۔

غصہ حماقت میں شروع ہوتا ہے اور ندامت میں ختم۔

وہ شخص جاہل ہے جو غصّے میں نہ آسکے اور وہ عقلمند جو غصّے میں نہ آئے۔

غصّہ ور آدمی اپنا منہ کھول دیتا ہے اور اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے۔

غصّے میں پہلے وہی آتا ہے جو راستی پر نہ ہو۔

گلچیں

رُباعیات

(۱)

جب اشکوں سے آنکھ میری بھر آئی ہے
بجلی سی جھلک کے تیری نظر آئی ہے
ہوتا ہے غمِ دل پہ گماں یوں جیسے
لپٹی ہوئی کُہر سے سحر آئی ہے

(۲)

پیدا لاکھوں شرر کرے گی دل میں
کیسا ہی ہو دل اثر کرے گی دل میں
اس آہ کو بیکار نہ سمجھو افسرؔ
دل سے نکلی ہے گھر کرے گی دل میں

(۳)

دنیا کیا ہے یہ بھول جانا ہوگا
دنیا میں بہشت اک بنانا ہوگا
راحت ہر شخص کو میسر ہوگی
اللہ اللہ کیسا زمانا ہوگا

(۴)

راحت کے خمار کی کثرت ہوگی
ہم کو نہ زمانے کو ضرورت ہوگی
زندہ ہیں تو ہم بھی دیکھ لیں گے افسرؔ
دنیا جسے کہتے ہیں وہ جنت ہوگی

حامد اللہ افسر میرٹھی

بکھرے ہوئے موتی

معصومیت مسرّت کی بُنیاد ہے۔

لاعلمی اطمینان ہے۔

مسکراہٹ اظہارِ تشکّر کا ایک لطیف ذریعہ ہے۔

صحت کا راز مسکراہٹ میں پوشیدہ ہے۔

الفت آنکھوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

انسان کے خصائل کا عکس اُس کے قلم کی جنبش میں پنہاں ہے۔

خاموشی بزرگی میں اضافہ کرتی ہے۔

ناکامی کامیابی کی قدر کو دوبالا کر دیتی ہے۔

پشیمانی نیکی کا احترام ہے۔

شکرگزاری شرافت کی جان ہے۔

نیکیاں مرجاتی ہیں گناہ زندہ رہتے ہیں۔

عملی جنت خیالی جنت سے بہتر ہے۔

ابدی خوشی ازلی خوشی سے بالاتر ہے۔

بدگمانی غلط فہمی کی ماں ہے۔

وقعت محبت سے پیدا ہوتی ہے۔

تقریر کھو جاتی ہے تحریر نہیں کھوتی۔

عزم استقلال کی کنجی ہے۔

پہلا گناہ انسان کو دلیر بنا دیتا ہے۔

ایک گناہ سو گناہوں کی جڑ ہے۔

اخلاق فاطمہ

تاریخِ دنیا پر ایک نظر

نشاۃ الثانیہ اور اصلاحِ مذہبی

(۲۱)

عیسائیتِ وسطیٰ

فرنگی بادشاہت - گیارہویں صدی کے اخیر میں مغربی عیسائیت سے درخواست کی گئی کہ وہ مشرقی عیسائیت کو سلجوق ترکوں کے ہاتھوں سے اور فلسطین کی ارضِ مقدس کو مسلمان "کافروں" کے ہاتھوں سے رہائی دلائے۔

جب ہم نے آخری بار مغربی عیسائیت پر ایک نگاہ ڈالی تھی تو ہم نے دیکھا تھا کہ وہ متعدد "شمالی" حکومتوں یعنی مغربی گاتھی وینڈل مشرقی گاتھی فرنگی برگندی اور انگریزی حکومتوں پر مشتمل تھی جو روما کی سلطنت کے کھنڈروں پر بنی تھیں۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کس طرح یہ حکومتیں کچھ روما کی روایات لیکن زیادہ تر پاپائیت کی زندہ قوت سے ایک حقیقی اتحاد میں منسلک ہو رہی تھیں۔

اُن پانچ صدیوں میں جو اِن "شمالی" حکومتوں کے قیام اور اُن کے صلیبی جنگوں میں حصہ لینے کے زمانے کے درمیان (تقریباً ۶۰۰ء سے ۱۱۰۰ء تک) گذریں مغربی دنیا میں بعض قابلِ غور تغیرات وقوع میں آئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے وینڈلوں اور مشرقی گاتھوں کو قسطنطنین نے ملیامیٹ کر دیا اور مغربی گاتھوں کو عربوں نے۔ صرف فرنگی اور انگریز جو باقی رہے ترقی کرتے رہے۔ انگریز ابھی تک دور دنیا کے ایک کونے پر اپنے جزیرے میں ایک منقطع زندگی بسر کر رہے تھے اور ابھی دنیا کی تاریخ پر اُن کا کچھ اثر نہ ہو رہا تھا۔

فرنگیوں کا حال دگرگوں تھا۔ ابتدا ہی میں کیتھلک عیسائیت اختیار کر کے اور پاپائیت سے زبردست امداد حاصل کر کے انہوں نے اپنی قلمرو کو وسعت دی یہاں تک کہ ۸۰۰ء میں وہ براعظم یورپ کے بیشتر حصے پر حکومت کرنے لگے۔ وہ سارے گال پر حکمران ہو گئے۔ برگندی اُن کے علاقے میں شامل ہو گئی۔ مشرق کی جانب جرمنی میں پیش قدمی

کرکے انہوں نے اُن خطوں میں عیسائی تمدن کا جھنڈا گاڑ دیا جہاں روما کے فرماں رواؤں کی رسائی نہ ہوسکی تھی بلکہ انہوں نے سلاؤں اور ایشیائی حملہ آوروں کو بھی زیرنگین کیا۔ شمالی اطالیہ کو انہوں نے لمبارڈوں سے (جو تقریباً ۵۶۸ء سے ۷۷۴ء تک اُس خطے میں جہاں سے مشرقی گاتھ نکل چکے تھے آباد ہوکر حکومت کرتے رہے) چھین لیا اور جنوب مغرب کی طرف انہوں نے مسلمانوں کو دریائے ایبرو کے شمال سے پرے ہٹا کر عیسائیت کے لئے سپین کی بازیافت کا کام بھی شروع کردیا۔

فرنگی بادشاہت کی شان وشوکت اور قوت چارلس مارٹل کے پوتے (وہی چارلس مارٹل جس نے عربوں کو ٹور کے میدان میں شکست دی تھی)، چارلس اعظم (شارلمین ۷۶۸ء تا ۸۱۴ء) کے عہد میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچی۔ اُس نے نہ صرف قلمرو کو غایت درجہ وسعت دی بلکہ اُس نے ایک نہایت اعلیٰ نظامِ حکومت کے ذریعے سے اُسے ایک عجیب وغریب سیاسی اتحاد سے منتظم کردیا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ایک بلند نظر، ماہرِ تعلیم، علم ادب کا مربی، کلیسا کا محافظ اور ایک جنگجو مبلغ تھا۔ وہی شخص تھا جس کو پاپا نے شاہنشاہِ روما کا مدتوں سے فراموش شدہ لقب عطا فرمایا (۸۰۰ء)

مقدس سلطنتِ روما۔ ۸۰۰ء میں چارلس اعظم کی تاج پوشی سے مغرب میں سلطنتِ روما کی برائے نام بحالی زمانۂ متوسط کی تاریخ میں ایک نہایت عجیب وغریب اور غیرمعمولی واقعہ تھا۔ اس سے خاص طور پر روما کی روایات کی برقراری اور پاپائیت کی قوت ثابت ہوتی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے رومیولس آگسٹس کے ۴۷۶ء میں تخت سے اتارے جانے کے معنی بظاہر صرف یہ ہی ہوئے کہ روما کا شہنشاہی اقتدار سب کا سب اُس حکمران کی شخصیت میں جمع ہوگیا جو قسطنطنیہ پر متمکن تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے مغرب کے وحشی بادشاہوں کو دنیا کے اصل فرمانروا" سے شہنشاہی عہدے کا نشان حاصل کرنے کی تمنا تھی۔ پھر ہم یہ بھی ملاحظہ کرچکے ہیں کہ شاہنشاہ جسطنطین نے رسمی اقتدار سے مطمئن نہ ہوکر گو تھوڑے عرصہ کے لئے ہی سہی روما کی اصلی حکمرانی کو کھوئے ہوئے لاطینی صوبوں پر پھر قائم کردیا۔

جسطنطین کے اطالیہ کی مشرقی گاتھی بادشاہت کو تباہ کردینے کے اہم اور زیادہ تر بُرے نتیجے ہوئے قسطنطنیہ اپنی فتوحات کی حفاظت نہ کرسکا۔ ۵۶۸ء میں لومبارڈی "وحشیوں" نے جولی ایلپس کو عبور کیا اور وہ سارے میدانی علاقے میں آباد ہونے لگ گئے۔ لیکن انہوں نے سارے اطالیہ پر قبضہ نہ کیا کیونکہ اُن کے پاس فصیل والے شہروں کو سر کرنے کا سازوسامان نہ تھا نہ انہیں ایسا کرنے کی خواہش تھی۔ لہٰذا وینس نیپلز اور بالخصوص روما جیسے شہروں پر کبھی اُن کا قبضہ نہ ہوسکا اور وہ بظاہر بازنطینی شاہنشاہ کی رعایا بنے رہے۔ لیکن اُدھر بازنطینی شاہنشاہ اپنے ایشیائی صوبوں کی بغاوتوں میں اتنا منہمک تھا کہ وہ اپنی اطالوی رعایا کی کسی طرح نگہداشت نہ کرسکا۔ علاوہ بریں بازنطینی شاہنشاہ

اورمشرقی کلیسا جس پر اُسے اختیار حاصل تھا لغو الحادوں اور ضرر رساں تفرقوں میں پڑ گئے یہاں تک کہ آخرکار پاپائیت کے لئے قسطنطنیہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ناممکن ہوگیا + سن ۸۰۰ء میں پوپ لیو سوم نے کچھ تو بازنطینی حکمرانی سے قطعی انحراف ظاہر کرنے کے لئے اور کچھ اطالیہ میں ایک واقعی زبردست فرماں روا کی محافظت حاصل کرنے کی غرض سے ۸۰۰ء میں کرسمس کے دن یونانی شاہنشاہ کو چھوڑ کر فرنگی شاہنشاہ کی خدمت میں اپنی اطاعت پیش کی۔

یہ مقدس سلطنتِ روما جو یوں ظہور میں آئی بجائے ایک حقیقی ارادہ کے محض ایک خیال تھا + اس کا وجود صرف دلچسپی لینے والوں کے تخیل میں ایک سراب کی مانند تھا + لیکن یہ سراب فرنگی دانشمندی کے لئے بغایت نقصان دہ ثابت ہؤا + یہ اسی کی وجہ تھی کہ شارلمین اور اُس کے جانشین جرمنی میں حکومت کے فرائض ادا کرنے کے بجائے اطالیہ میں بے معنی یورشوں اور دنیا کے مسخر کرنے کے خوابوں میں ہمہ تن منہمک رہے +

نظامِ جاگیرداری شارلمین کے عہد کا زمانہ سادگی استواری اور امن وامان کا زمانہ تھا + ہندوستان کے حدود سے لے کر بحرِ اوقیانوس کے ساحلوں تک متمدن دنیا چار عیسائی اور دو مسلمان عظیم الشان سلطنتوں پر مشتمل تھی۔ ان چاروں کے مابین ایک نہایت جچا تُلا توازنِ قوت موجود تھا۔ ایک طرف مقدس سلطنتِ روما اور خلافتِ بغداد تھیں اور دوسری طرف اُن کی حریف بازنطینی سلطنت اور امارتِ قرطبہ ہسپانیہ۔ سیاسی طمانیت میں کسی قسم کا فضول مذہبی جوش رخنہ انداز نہ تھا۔

لیکن شارلمین کی موت کے بعد ۸۱۴ء میں بادلوں کے دل پھر شمال سے اُٹھے اور عیسائیت اور اسلام دونوں پر بربریت کا ایک نیا طوفان جیسا پہلے شاید کم کبھی آیا ہوگا ٹوٹ پڑا + "شمالی" وحشی اور خانہ بدوش یکبارگی متمدن وشائستہ جنوب پر آپڑے اور دو صدیوں تک انہوں نے قتل وغارت کا بازار گرم رکھا + کسی زمانے کو "زمانۂ تاریکی" کہا جاسکتا ہے تو بلا شبہ وہ ۸۵۰ء سے ۱۰۵۰ء تک کا زمانہ تھا +

خانہ بدوشوں کے بہت سے گروہوں میں سے جنہوں نے قفقاز سے لے کر کارپتھین تک کی سرحدوں پر یورشیں کیں سب سے زیادہ خوفناک لوگ میگیار تھے جو زبردستی وادئ ڈنیوب کے اندر آگھسے پھر جرمنی اور اطالیہ میں لوٹ مار کر کے ہنگری میں آبسے + نئے شمالی حملہ آور وہ ہیبت ناک بحری قزاق تھے جو سیکنڈے نیویا میں اپنی کھاڑیوں سے نکل کر عیسائی دنیا میں چاروں طرف تاخت وتاراج کرنے لگے، وہ خونخوار کافر تھے جنہوں نے کلیساؤں اور خانقاہوں پر بدترین ظلم ڈھائے + انہوں نے انگلستان پر دھاوا کیا اور آخرکار وہ دریائے ٹیمز سے لے کر دریائے ٹائن تک کے سارے ساحل پر آباد ہوگئے۔ شمال کی طرف وہ آرکنیز شیٹلینڈز ہیبریڈیز اور فیروز پر قابض ہوگئے + آئس لینڈ (برفستان)

اور گرین لینڈ (سبزستان) میں اُن کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں بلکہ وہ امریکہ بھی پہنچ گئے (۱۰۰۰ء) انھوں نے فرنگیوں کی پُررعب سلطنت کا خاتمہ کردیا اور اُس کی سرحدوں پر جابجا چھاپے مارنے کے بعد وہ نارمنڈی (۹۱۲ء) میں بس گئے۔ مشرق کی طرف بھی انھوں نے قدم بڑھایا اور بحیرہ ہائے بالٹک اور اسود کے درمیان کے بکھرے ہوئے سلافی لوگوں پر اپنی حکومت جماکر انھوں نے روس کی سلطنت کی بنا ڈالی۔

شارلمین کے جانشین آپ اپنے وقت کے اُن خطرات کا سدباب کرنے کے بالکل ناقابل ثابت ہوئے۔ وہ کمزور تھے۔ اپنے پادریوں کے آگے سرنگوں رہتے تھے اور خاندانی جھگڑوں اور خانہ جنگیوں میں گرفتار تھے۔ وہ سلطنت جس پر اُن کی حکومت تھی اتحاد سے عاری تھی اور وہ فرنگیوں کی اس حماقت سے کہ وہ شاہی خاندان کے مختلف ارکان میں تقسیمِ قوت کے خوگر ہوگئے تھے اور بھی زیادہ کمزور پڑتی گئی۔

نویں صدی میں مرکزی طاقت کے عام انتشار کے دوران میں عیسائیت کے لئے لازم ہوگیا کہ بربادی سے بچنے کے لئے وہ اپنے تئیں جاگیری روش پر منتظم و محفوظ کرے۔ قلعے اور فصیلی برج ہر طرف نظر آنے لگے بے بس آزاد رعایا نے اپنے تئیں مقامی رؤسا کے سپرد کردیا کہ اُن کی خدمت و تواضع کرکے جان کی امان پائیں۔ حکومت کی ذمہ داریاں اور اختیارات بے شمار چھوٹے چھوٹے شہزادوں اور "معدودی" لمبدیوں میں منقسم ہوگئے۔

صلیبی لڑائیاں - جاگیرداری نظام نے بلاشبہ مغربی عیسائیت کو کفار کے اُس طوفانِ بے تمیزی سے جو نویں اور دسویں صدی میں اُس پر ٹوٹ پڑا بچائے رکھا۔ لیکن ۱۰۰۰ء تک یہ خطرہ دُور ہوچکا تھا بحری قزاقوں کی لُوٹ مار ختم ہوچکی تھی اور وہ لٹیرے جو انگریزی "ڈین لا" اور فرنگی "نارمنڈی" میں آباد ہوگئے تھے بپتسمہ لے چکے تھے اور عیسائی تمدن اختیار کرچکے تھے۔ خانہ بدوش میگیاروں نے بھی اپنی خانہ بدوشی چھوڑ دی، پاپائیت کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا اور اُن کی ہنگری کی مملکت عیسائی قوموں کے دائرے میں لے لی گئی۔ وہ کالی گھٹائیں جو یورپ پر دو سو سال تک چھائی رہیں چھٹ گئیں۔ زمانۂ تاریکی کا خاتمہ ہوا۔ ایک نئی اور معمور زندگی کی ضیا و مسرت عیسائی دنیا کے کونے کونے میں ظاہر ہونے لگی۔ آخر کار رومی اور ٹیوٹنی کے درمیان مصالحت ہوکر وہ زمانۂ متوسط کے سچے آدمی بن گئے۔ علم و ادب اُبھرا۔ قانون جلا پانے لگا نئے ایجادات ظہور میں آئے۔ نئے نویلے خیالات حکما کے دل میں چٹکیاں لینے لگے۔ دینیات کا تخیل حرکت میں آیا۔ فلسفہ پھر جیکا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فن نے اپنا سر نکالا اور خوش منظر گاتھی طرزِ تعمیر زمانۂ وسطیٰ کے خیالات و تصورات کی سچی عظمت کو نمایاں کرنے لگی۔

یہ تھی وہ پُرامن و متناسب اور زندہ و باہمت عیسائی دنیا جس نے مسلمان "کافروں" کے خلاف بازنطینی

سلطنت کی چیخ پکار اور ارضِ مقدس کی دلگداز صدا سُنی ۔ نکمّے جاگیر دار اور بڑے بڑے اُمرا جو شہرت کے پیاسے اور جوع الارض کے مارے تھے ترقی یافتہ شہر جو ایشیائی تجارت حاصل کرنے کے تمنائی تھے ۔ کاشتکار جو جاگیرداری خدمات ادا کرتے کرتے چُور ہو گئے تھے ۔ متقی ۔ زائرین جن کا تن من شہادت کی آگ میں جلنے کے لئے بے تاب تھا ۔ پوپ اور مجتہدین جو اپنے مذہب کے گہوارے کو اپنا بنا لینے کے لئے بے قرار اور بیوانت میں حواریوں کے عہد کے صدر اسقفی صوبے حاصل کرنے کے آرزو مند اور ہمہ گیر کلیسا کے مدتوں کے منقطع شدہ ٹکڑوں کو جوڑ لینے کے واسطے مضطرب تھے ۔ عیسائی دنیا کے اِن سب مختلف نمائندوں کے لئے مشرق کی طرف بڑھنے کا نعرہ انتہا درجہ موثّر اور ولولہ خیز تھا ۔

تاریخِ دنیا میں ایسی گھڑیاں اکثر آئی ہیں جب اک ظلمت سے ابھرتی ہوئی قوم یا مجموعۂ اقوام کے دل و دماغ میں ایسے جذبات نے ایک ہیجانِ عظیم برپا کر دیا ہے جن کی ترکیب میں راستی و ناراستی اور فہم و ناعاقبت اندیشی کے عناصر بیک وقت شامل ہو گئے ہیں ۔ موجودہ زمانے میں عہدِ نپولین کی داستان اور تازہ ترین جنگِ فرنگ کے واقعات اِسی ضمن سے ہیں + کچھ ایسی ہی تھیں صلیبی لڑائیاں جن کے دوران میں یورپ اپنے سر کو جس میں اب پیشتر کی بہ نسبت عقل و خرد کے خون کا زیادہ دور دورہ تھا اسلامیوں کی مضبوط چٹانوں سے مدتوں تک بے سود پٹکتا رہا ۔

صلیبی نعرے کا سب سے پہلے سننے والا پوپ گرگوری ہفتم (ہلڈ برینڈ) تھا جس کے سامنے بازنطینی شاہنشاہ نے منت سماجت کے ساتھ ایک درخواست ۱۰۷۳ء میں مان زی کرٹ کی تباہ کن جنگ کے دو سال بعد بھیجی ۔ اُس نے شاہنشاہ کی خواہش کے پورا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن وقت یہ تھی کہ وہ ادھر نظامِ جاگیرداری کے ساتھ ایک کشمکش میں جسے مباحثہ رسمِ تشریف کہتے ہیں مبتلا ہو رہا تھا ۱۰۹۵ء میں جو درخواست پوپ اربن دوم کے آگے کی گئی وہ زیادہ کامیاب ہوئی + اُس نے کلیسا کی انجمن کے پے در پے دو جلسے کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت بیک ساعت متفق ہو کر اُٹھی اور مشرق پر جا پڑی +

بشیر احمد

حُقّہ

ہے خاک میں جوش آب کا آتش کا ہوا کا
دریائے عناصر میں ہے طوفان بلا کا
یعنی لب شاعر پہ ہے پیغام خدا کا
سب ہاتھ اٹھاؤ کہ ہے یہ وقت دعا کا

اس شان سے اس طرز سے حقّے کی ثنا ہو
ہر طرف سے اک نعرۂ یا صلِّ علیٰ ہو

دیکھو نہیں معشوق سے کم بانکپن اِس کا
کیا حسن کے سانچے میں ڈھلا ہے بدن اِس کا
ہے پھولوں کی چادر سے بنا پیرہن اِس کا
پھولا پھلا رہتا ہے ہمیشہ چمن اِس کا

سوزاں ہے چلم آتشِ رُخسار کی صورت
اور اُس پہ دھواں گیسوئے خمدار کی صورت

جو بات ہے حقے میں کسی شے میں نہیں ہے
یہ کیفیت افیوں میں نہیں مے میں نہیں ہے
گُڑ گُڑ سا ترنم بھی کسی نے میں نہیں ہے
جو لطف ہے اِس نے میں کسی نے میں نہیں ہے

اللہ رے بلاغت تری اللہ رے آواز
اعجاز ہے اعجاز ہے اعجاز ہے اعجاز

حقّے کا جو دشمن ہے وہ انسان کا دشمن
ہوش و خرد و عقل کا اوسان کا دشمن
ایمان کا ایقان کا عرفان کا دشمن
ہندو کا مسیحی کا مسلمان کا دشمن

دنیا کے لئے باعثِ عشرت ہے تو یہ ہے
عقبیٰ کے لئے چشم بصیرت ہے، تو یہ ہے

دنیا میں مساوات ہے حقّے ہی کے دم سے
تخصیصِ ملاقات ہے حقّے ہی کے دم سے
خاطر ہے مدارات ہے حقّے ہی کے دم سے
جو چیز ہے جو بات ہے حقّے ہی کے دم سے

ہستی میں اولوالعزمیٔ ہمت ہے تو حقّہ
پستی میں خیالات کی رفعت ہے تو حقّہ

محفل میں ہوں یا بیٹھے ہوں آرام سے گھر میں
یا جاتے ہوئے ہوں کہیں گاڑی کے سفر میں

ہے اس کا دھواں سینے میں اور شکل نظر میں
یہ دلبرِ دمساز یہ معشوق ہے بر میں

ہم اور کسی شے کا اجارا نہیں کرتے
حقّے کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے

ہے چرخ پہ جب تک رخِ خورشیدِ منوّر
اور فرش پہ تابندہ ہیں جب تک زر و گوہر

جب تک مئے توحید کے چلتے رہیں ساغر
جب تک ہے ترا نام زمانے کی زباں پر

یا رب تو جو دائم ہے تو دائم رہے حقّہ
یہ بزم سلامت رہے قائم رہے حقّہ

مرسلہ عبدالغفور مہجور

تاثرات

ترے حجاب میں ہے شانِ بے حجابانہ
حریم راز ہے تیرا جہانِ افسانہ

جمالِ یار! تجھے بے نیازیوں کی قسم
بس ایک جلوہ "بشانِ نیازمندانہ"

وہ لب کھلیں تو تڑپ جائیں سینکڑوں نغمے
وہ آنکھ اُٹھے تو برس جائے کیفِ میخانہ

ابھی تو دُور ہے رسوائی گناہِ نظر
کہ پردہ پوش ہیں انداز ہائے مستانہ

نگاہِ غیر! محبت کی لغزشوں کو نہ دیکھ
کہ یہ جہان ہے "نا آشنائے بیگانہ"

روشؔ جو کوئی نگاہِ عمیق سے دیکھے
ہر ایک ذرۂ تاریک ہے ضیا خانہ

روشؔ صدیقی

اقوالِ زرّیں

تمہارا محبت آمیز سلوک تمہیں دائرۂ احباب کا مرکز بنادے گا۔ اپنے تئیں پاک اور دلکش بنائے رکھو۔
ب عالم کو تمہارے ساتھ بے غرض محبّت اور حقیقی عشق پیدا ہو جائے گا۔

عالمگیر وہی ہے جس نے اپنے نفس کو فتح کیا ہو۔

صحیح خیالات اور صحیح کوششیں لامحالہ صحیح نتائج پیدا کریں گی۔

بےعقل انسان اپنے حصولِ مقصد کی محض خواہش کرتا ہے اور بے صبری کا اظہار۔ خلاف ازیں ایک
قل کامیابی کے لئے سچّی کوشش کرتا ہے اور انتظار۔

ہر وہ شخص جو اپنی ذات پر حکومت کر کے اپنے تئیں قابو میں رکھ سکتا ہے صحیح معنوں میں دوسروں پر
لمرانی کرنے کا مجاز ہے۔

پہلی منزل میں صحیح خیالات میرے ساتھ ساتھ تھے اور دوسری میں پاکیزگیٔ کلام تیسری منزل میں نیک
مال کی ہمراہی نے مجھے یکایک اُس تخت پر متمکن کر دیا جو فردوسِ بریں کو مزیّن کئے ہوئے تھا۔

ہر تندرست و توانا شخص جو صبح دم کے خاموش اور بے بہا لمحات کو نیند کے خمار میں ضائع کرتا ہے ہرگز
رگز عظیم الشان رفعت حاصل نہیں کر سکتا۔

جیسے سورج کی روشنی سے ایک نابینا شخص محروم رہتا ہے اسی طرح صداقت کے ضیا پاش نور سے محض
ہ لوگ محروم رہتے ہیں جن کی بصیرت پر خود غرضی نے چھاپا مار کر انہیں بصارت سے محروم کر دیا ہو۔

سخاوت و صداقت لازم و ملزوم ہیں۔ جس انسان میں سخاوت کا عنصر غالب ہو اُس کی فطرت میں صداقت
وٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

جس طرح ہر شے کا سایہ اُس کے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے اور آگ پر پھونکنے کے بعد دھوئیں کا اُٹھنا لازمی
ہے۔ اسی طرح ہمارا ہر فعل اور ہمارا ہر عمل تاثرات سے بری نہیں۔ ہماری ہر عشرت اور ہماری ہر عسرت ہمارے
خیالات اور ہمارے اعمال کا لازمی نتیجہ ہیں۔

ماخوذ — سیّد نیاز احمد ترمذی

رتناولی

(یہ کہانی سری ہرش دیو والئی قنوج کے رتناولی ناٹک سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں چند نہایت دلآویز ڈرامے لکھے جنہیں سنسکرت زبان میں درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پراچین ہندوستان کے ادیب پلاٹ کی ترتیب پر کس قدر قدرت رکھتے ہیں)

کسی زمانہ میں وتس (موجودہ الہ آباد) کا ایک راجہ اپنی راجدھانی کوسمبی میں راج کرتا تھا جس کا نام اُد
تھا اُس کے منتری یگندرائن کو یہ لگن تھی کہ کسی طرح اُس کا سوامی پرتھوی راج ہو جائے۔ آخر ایک رشی نے اُسے بتایا کہ سنہال (سیلون) میں بکرم باہو ایک راجہ ہے جو تمہاری مہارانی واسودتا کا ماموں ہے اُس کی ایک بیٹی ہے جسے رتناولی کہتے ہیں اس سے تمہارے راجہ کی شادی ہو تو پرتھوی راج کا تلک ملے۔

یہ سُن کر یگندرائن نے کسی کو کانوں کان خبر نہ کی اور چپکے سے ایک ایلچی سیلون روانہ کر دیا کہ رتناولی کو ڈ
لے آئے۔ جب ایلچی سیلون پہنچا تو بکرم باہو ویسے تو بڑے تپاک سے پیش آیا مگر رشتہ سے اس لئے انکار کیا کہ بیٹی کو بھانجی کا سَوت بنانا اچھا نہیں۔ ایلچی اپنا سا منہ لے کر چلا آیا مگر یگندرائن کے دل پر اُس کا کچھ اثر نہ ہوا ا
اُس نے سیلون میں اپنے آدمی بھیج کر یہ خبر اڑا دی کہ رانی واسودتا کے محل کو اچانک آگ لگ گئی اور وہ جل کر خاکستر ہو گئی۔ یہ بات اڑتے اڑتے بکرم باہو کے کانوں تک پہنچی اور اُس نے اسے سچ سمجھا۔ جب یگندرائن کو پتہ ملا کہ بکرم باہو پر اُس کا جادو چل گیا تو اُس نے وہی سندیسہ دے کر ایک اور ایلچی اُس کے پاس بھیجا۔ اب انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی راجہ نے اپنے ایک اہلکار واسوبھوٹ کے ساتھ رتناولی کو جہاز پر سوار کر دیا۔ اکلوتی بیٹی کو جس قدر بھی جہیز ملے تھوڑا ہے مگر اُس نے رتناولی کو موتیوں کی مالا دی اُس کا جواب دنیا بھر میں نہ تھا۔ ایک لڑی کی مالا تھی مگر ساری دنیا کے جوہری اُس کی قیمت نہیں آنک سکتے تھے۔ جہاز کچھ دن تو آرام سے چلتا رہا لیکن ایک دن سمندر میں طوفان آیا جہاز بھنور میں پھنسا اور ڈوب گیا۔ رتناولی سمندر میں غوطے کھا رہی تھی بس معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ایک اور ریلا اُس کے پران لے کر رہے گا اتنے میں کوسمبی کے ایک سوداگر کا جہاز وہاں آ نکلا۔ اُس نے یہ شا دیکھتے ہی جھٹ اپنے ملاحوں کو اُس کے بچانے کا حکم دیا ملا
کود پڑے اور ادھ مری رتناولی کو ہاتھوں ہاتھ جہاز پر پہنچا دیا۔ سوداگر کو جب رتناولی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے بادبان

رخ پھیرا اور کوسمبی کو واپس چل پڑا جب وہاں پہنچا تو سیدھا گیندراجن کے پاس گیا۔ ساری رام کہانی سنائی اور رتناولی اُس کے سپرد کر کے چلا آیا۔ منتری رتناولی کو لے کر مہارانی واسودتا کے پاس گیا اور کہا کہ ایک سوداگر کو یہ لڑکی سمندر میں ڈوبتی ہوئی ملی تھی لیکن اس کا کچھ اور حال اُسے معلوم نہ تھا شکل صورت سے کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مہارانی کی داسیوں کی سوبھا بڑھائے گی۔ واسودتا نے مان لیا اور سمندر کو دھیان میں رکھ کر اُس کا نام ساگریکا رکھا۔ لاکھوں داسیوں کی مالکہ پرتھوی راج کا تلک دلانے والی رتناولی آج ہاتھ باندھے داسیوں کی قطار میں کھڑی ہے مایا مایا تیرے کھیل نیارے۔

ہولی کے دن تھے سارا شہر رنگ رلیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ رنگ اڑ رہا تھا۔ ہون ہو رہے تھے۔ ہولی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ رنواس میں پوجا کی تیاریاں ہو چکیں تو رانی نے آکر سب کچھ دیکھا بھالا تسلی ہوئی تو ایک داسی کو راجہ کے بلانے کو بھیجا رانی کے پاس ساگریکا کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے کی دمک سورج کو ماند کر رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پریم کی دنیا سوتی تھی۔ گدرایا ہوا جوبن سڈول جسم سے مل کر مدھر سماں پیدا کر رہا تھا اُس کے سادے لباس میں ہزار پھبن تھی۔ اُس کی سادگی پر لگاوٹ ہٹی جا رہی تھی۔ اُس کی زبان پر کھلاوٹ نثار ہوتی تھی۔ اُس کا نیچی نظروں سے دیکھنا دیکھنے والوں کو سنسار کے اتار چڑھاؤ دکھا رہا تھا۔ رانی ایک نظر میں بھانپ گئی کہ ساگریکا کو راجہ کی نظروں سے اوجھل رکھنا رنواس کے راج کی خیر منانا ہے۔ راجہ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ساگریکا کسی کام پر بھیجی گئی۔ آسمان سمجھ گیا کہ چاند سورج کی جوت سے ڈر کر منہ ڈھانپ رہا ہے۔ ساگریکا سامنے سے ٹل تو گئی مگر ایک درخت کی اوٹ لے کر پوجا کا نظارہ دیکھنے لگی۔ دیوتا کی پوجا ہو چکی تو رانی اپنے سوامی کی پوجا کرنے لگی۔ ساگریکا نے راجہ کو دیوتا سمجھا۔ اسے بڑا اچنبا ہوا کہ ہندوستان میں جیتے جاگتے چلتے پھرتے دیوتا پوجا کے وقت پر کاشت ہوتے ہیں۔ پاس تو نہ جا سکتی تھی وہیں کھڑے کھڑے پوجا کی رسمی ادا کر کے ایک طرف کو نکل گئی۔ اتنے میں بھاٹ آگیا اور کبت اچارنے لگا۔ اب ساگریکا سمجھ گئی کہ وہ دیوتا نہ تھا بلکہ وتس کا راجہ تھا جس سے اُس کی شادی قرار پائی تھی دیوتا ہو یا راجہ اُس کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی اور ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔

پوجا کے ساتھ ساری چہل پہل ختم ہوئی اور رنواس میں معمولی کام کاج ہونے لگا تو ساگریکا چنبیلی کے جھنڈ کی تنہائی میں اپنے خیالوں سے کھیلنے لگی۔ بھوج اِس کے سامنے تھا اور گیروے کی ڈلی ہاتھ میں۔ بے خبری کے عالم میں بے پروائی کے انداز سے وہ کچھ لکیریں کھینچتی رہی لیکن تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتی ہے کہ ان لکیروں نے ایک تصویر کی شکل اختیار کر لی ہے اُس کے اچنبے کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ یہ ہو بہو اُس تصویر کا چربہ ہے جو کبھی اُس کے

دل میں آنکلتی ہے اور کبھی اُس کی آنکھوں سے جھانکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ لگن پھل سے بے پروا ہوتی ہے اور یہ بھی
درست کہ حسن کا پرتو آنکھوں پر ایسی پٹی باندھتا ہے کہ انجام کا دھڑکا نظروں میں نہیں جچتا مگر یہ مدن کے سدھ
پجاریوں کی باتیں ہیں۔ ساگریکا نے پہلی بار اِن مہاراج کو پرنام کیا تھا۔ اس لیئے اُس کا کوئی دوش نہیں کہ کیوں
اُس نے رسوائی کے کھٹکے سے اپنے اس پریم پتر کو پھاڑنے کا دھیان کیا۔ بدھی کہتی تھی اری کیا کرتی ہے آگ سے
نہ کھیل۔ مٹادے۔ اس کا نشان تک نہ رکھ۔ دھو ڈال۔ لگن چلاتی تھی بتو ایسی چیزیں ہر روز نہیں ملا کرتیں مدن
کی اس دہن کو بسنت کی اس نشانی کو سنبھال کر رکھ۔ ہوا تک نہ لگنے دے۔ ساگریکا جذبات کی اس جھوڑ کے
تماشے میں مگن تھی کہ ایک اور داسی سوسنتگا دبے پاؤں آئی اور پیٹھ پیچھے سے تصویر اُڑا لی۔ اُسے دیکھ کر پوچھا اچھی
یہ کس کی تصویر بنائی ہے؟" ساگریکا نے جواب دیا "وہی دیوتا تو ہیں جن کی آج پُوجا ہو رہی تھی۔ سوسنتگا بولی
"پر ایک کسر رہ گئی۔ دیوتا جی مہاراج اکیلے گھبرا رہے ہونگے۔ اُن کی دیوی بھی پاس براجتی تو بات تھی" یہ کہہ کر
اُس نے رنگ اُٹھایا اور ساگریکا کی سورت بنادی۔ ہمجولیوں میں ہنسی ٹھٹھول بول چال میں داخل ہے ایسی باتوں
کی اتنی ہی کائنات ہوتی ہے کہ اِدھر سنی اُدھر بھلا دی۔ بس۔ پر اس میں ایک راز کھل رہا تھا۔ اس لیئے ساگریکا
بہت بگڑی مگر اس بگاڑنے بناؤ کی صُورت پیدا کردی۔ اُس کا چہرہ کنول روپ ہوگیا۔ اور پسینے نے اس پر اوس برسا کر
وہ سماں پیش کیا کہ اگر اندر بھی دیکھتے تو جھوم جاتے۔ سوسنتگا ساگریکا کی طرح الہڑ کنیا نہ تھی وہ جانتی تھی کہ کام دیوتا
جب کسی پر ریجھتے ہیں تو اُس کی کیا گت بناتے ہیں۔ اُسے پتہ تھا کہ مدن کے بان جو گھاؤ کرتے ہیں اُن کو جھانک
کر دیکھو تو دل کی دنیا ہتھیلی کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ ساگریکا کی یہ گرمی دیکھ کر سوسنتگا ہنس پڑی اور میٹھی میٹھی
باتیں کرکے ساگریکا کو ایسا بھایا کہ اُس نے اپنے دل کی بات اُسے کہہ سنائی۔ سوسنتگا نے اُسے لاکھ ڈھارس
بندھائی پر وہ اس واقعہ کو سپنا ہی سمجھتی رہی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ اِن باتوں کا تانتا نہ ٹوٹنے پائے۔ اِن میں ایک
رس تھا، ایک نشہ تھا جس کا مزہ اُس نے آج تک نہ چکھا تھا ہر لفظ جو سوسنتگا کے منہ سے نکلتا تھا ساگریکا کے
کانوں تک پہنچتے ہی راگنی بن جاتا تھا۔ اتنے میں بلڑ ہُوا کہ طویلے سے ایک بندر چھُوٹ کر رنواس میں گھس آیا ہے
اور جو اُس کے ہتّے چڑھتا ہے اُسے نوچ ڈالتا ہے۔ یہ سُن کر ساگریکا اور سوسنتگا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تصویر
کو وہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اور دور کھڑی ہوکر تماشا دیکھنے لگیں۔ راجہ کے بدوشک وسنتک پیٹ
پکڑے دوڑ پھاند رہے تھے انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ آج ہنومان بلیدان لے کر رہیں گے۔ جب ہانپ گئے تو چنبیلی
کے اُس جھنڈ میں گھس گئے اور دم لینے کے لیئے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ راجہ بھی ساتھ لگا ہنستا ہُوا پہنچ گیا۔ اصل

میں یہ صرف دل لگی تھی، وسنتک کو بنانا چاہتے تھے، نہ کوئی بندر چھوٹا نہ رنواس میں آیا۔ راجہ کی شکل دیکھی تو وسنتک
کی ڈھارس بندھ گئی۔ اوسان درست ہوئے تو سامنے تصویر پڑی پائی۔ اٹھائی اور راجہ کو دے دی۔ وسنتک جی کو
اپنے سوا کسی کی شکل نہ بھاتی تھی اور اس لئے انہیں کسی کی تصویر کو دیکھنا تک گوارا نہ تھا۔ راجہ کی نظر تصویر
پر پڑی تو اچھل پڑا۔ ساگریکا اور سوسنتگا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور یہ سننے کے لئے کان لگائے کھڑی تھیں
کہ راجہ کیا کہتا ہے۔ راجہ نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور اُس مصوّر کو جس نے اُس کی تصویر بنائی تھی آسمان
پر پہنچا دیا۔ اب سوسنتگا آگے بڑھی اور کہنے لگی کہ مہاراج بناؤ کا سماں ہے میں نے اتنے جتن سے اپنی سہیلی
ساگریکا کی تصویر بنائی اور وہ الٹا مجھ سے بگڑ رہی ہے۔ اب سرکار ہی بیچ بچاؤ کرا دیں تو بات بنتی ہے۔ راجہ اور
وسنتک دو سہیلیوں کی صلح کرانے چلے۔

ساگریکا انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر کچھ کھوسی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاجونتی کی ڈالی جسے کسی نے
چھوا ہو جھوم رہی ہے۔ ساگریکا کو دیکھ کر وسنتک جی کی آنکھیں چندھیا گئیں اور ایسے بوکھلائے کہ چلا کر کہنے
لگے "او ہو۔ او ہو۔ اس کے سامنے اوپسرا اپَن کیا مال ہیں۔ سنسار میں ایسی اُوپ روپی سندری کہاں سے آ گئی
برہما بھی اس کی ٹکر کی لڑکی پیدا کرنے سے رہے۔ جب اسے بنایا ہوگا تو حضور نے بھی گھڑیوں اپنے ہاتھ چومے ہونگے
مہاراج یہ دیوی بھوکی دکھائی دیتی ہے اور برہمن کا پیٹ بھی خالی ہے۔ کہیں تو بھوجن کا سربندھ ہو جائے۔" یہ
انوکھی باتیں سُن کر ساگریکا پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ ہرن کی طرح بھاگنے لگی۔ مگر راجہ نے کلائی پکڑ لی۔ اب
ساگریکا ایک بے روح بدن ایک بے حس بُت تھی جس میں چلنے پھرنے بولنے چالنے کی سکت نہ رہی تھی۔ ابھی راجہ
کے ہزاروں سوالوں میں سے اُس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا تھا کہ وسنتک نے رانی آگئی، رانی آگئی کی
ہانک لگائی۔ یا اُس نے رانی کو دُور سے آتے دیکھ لیا تھا۔ بہرصورت میں تھوڑی دیر کے بعد رانی سچ مچ آتی دکھائی
دی اور راجہ نے وسنتک سے کہا کہ جھٹ پٹ تصویر کو چھپا دے تاکہ رانی نہ دیکھنے پائے۔ وسنتک نے تصویر تو
بغل میں داب لی اور تھوڑی دیر کے بعد بھول گئے۔ مگر باتوں ہی باتوں میں جوش آگیا اور ہاتھ کھل گئے اور تصویر
زمین پر آ رہی۔ ایک داسی نے اُٹھا کر رانی کو دے دی۔ اپنے پتی کے پہلو میں غیر استری کی تصویر کو دیکھ کر رانی
آگ بگولا ہو گئی۔ ترچھی نظروں سے راجہ کو دیکھا۔ زہر بھری آنکھ وسنتک پر ڈالی اور انہوں نے سمجھا کہ اس بگڑی
ہوئی بات کا بنانا اس کا کام ہے۔ وسنتک نے راجہ کو اشارہ کیا کہ گھبرائیے نہیں۔ چٹکیوں میں سب کچھ راس
کئے دیتا ہوں یہ کہہ کر رانی کی طرف منہ کر کے بولے "مہارانی آپ نے دیکھا اب سرکار کا ہاتھ کس قدر صاف ہو گیا

ہے اور اپنی تصویر کیا پیاری اتاری ہے" راجہ نے اس طرح مسکراتے ہوئے دیکھا۔ گویا داد مانگ رہے ہیں۔ رانی نے راجہ سے کہا " یہ دوسری کون اس ٹھسّے سے بیٹھی ہیں" راجہ نے جواب دیا " یہ صرف خیال کی پیدائش ہے اس کی اصل آج تک ہم نے نہیں دیکھی" وسنتک نے جھٹ جنیو ہاتھ میں لے کر کہا " مہارانی۔ سرکار سچ کہتے ہیں برہمن بھی سوگند کھا رہا ہے کہ آج سے پہلے ایسی شکل دیکھی ہو تو دیدے پھٹ جائیں" ساگریکا کو تو وہ پہچان گئی مگر اس تصویر کی پہیلی اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔

رانی نے اپنے خاص بھروسے کی داسیوں سے صلاح کی۔ تریا چلتر کا جادو جاگا۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہ ٹھہری کہ وسنتک سے کہا جائے کہ ساگریکا رانی کے کپڑے پہن کر پھول بن کے نچلے حصّے میں راجہ سے ملنا چاہتی ہے۔ اگر یہ چال پٹ پڑی تو بھانڈا صاف پھُوٹ جائے گا۔ یہ چال پوری اُتری اور راجہ اس بات پر راضی ہوگیا۔ جو جگہ ملاپ کے لئے ٹھہرائی گئی تھی رانی وہاں پہلے ہی پہنچ گئی۔ راجہ آیا اور رانی کو ساگریکا سمجھ کر پریم بھاؤ کی باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تو رانی چُپ سنتی رہی آخر اُس نے گھونگٹ اٹھایا تو راجہ کی آنکھیں کھلیں۔ رانی بغیر منہ سے بولے چپکے چلی گئی۔ اور اس چپ کی داد یہ ملی کہ راجہ اُسے ڈھونڈنے لگا۔

ادھر ساگریکا راجہ کی تلاش میں باولی ہوئی پھرتی تھی اُس نے سمجھا کہ سب نے مل کر اُسے بنایا ہے۔ وہ کچھ ایسی کٹ گئی کہ جان پر کھیلنے پر اُتر آئی۔ اُس نے دوپٹے میں گرہ دے کر اُسے پیپل کے درخت سے لٹکا دیا۔ وہ گرہ میں گردن ڈال کر لٹکنے ہی کو تھی کہ راجہ رانی کو ڈھونڈتا ہؤا آنکلا۔ اور ساگریکا کو رانی سمجھ کر اُسے منانے لگا۔ " جب رانی کی تیوری پر بل آتا ہے تو میں بے کل ہو جاتا ہوں۔ جب وہ اداس ہوتی ہے تو سنسار میری آنکھوں میں اندھیر ہو جاتا ہے۔ جب وہ بگڑتی ہے تو میں سر جھکا دیتا ہوں" اتنا ہی کہا تھا کہ راجہ کو اپنی غلطی کا پتہ لگ گیا۔ اور یہ کہہ کر بات کو الٹایا " پھر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ رانی ہے مگر وہ موتی جو پریم کے ساگر سے اُچھلتے ہیں تمہارے پاؤں پر ڈالتا ہوں"

رانی ایک درخت کی آڑ سے یہ سب باتیں سُن کے سامنے آئی اور کہنے لگی " مہاراج جو کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں اس میں سندیہہ کا سان گمان نہیں" رانی چلی گئی۔ ساگریکا ہوا ہو گئی تو راجہ یہ سوچتا ہؤا اپنے شیش محل کو گیا کہ ساگریکا کو رانی کے کرودھ کی آنچ سے بچائے۔

راجہ نے ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گذار دی۔ دن چڑھا تو وسنتک پوجا پاٹ کر کے یہ بڑا تلک لگا کر آئے۔ راجہ نے چھوٹتے ہی پوچھا " کہو ساگریکا پر کیا گزری" وسنتک نے منہ ڈھیلا کر کے اور رونی صورت

بنا کر کہا "بس کچھ نہ پوچھئے نہیں۔ لٹیا ڈوب گئی۔ اب سنجوگ کی کوئی آس نہیں" راجہ یہ سمجھا کہ ساگریکا چل بسی اور اُسے غش آگیا۔ وسنتک کی کوشش سے جب اُسے ہوش آیا تو وسنتک بولے "مہاراج آپ سنتے سناتے تو ہیں نہیں اور بے ہوش ہونے کو دوڑ پڑتے ہیں۔ ان دنیاداری کی باتوں کے بعد مجھے یہ کہنا تھا کہ رانی نے ساگریکا کو اوجین بھیج دیا ہے۔ اور پھر مجھے یہ مالا آپ کو دینا تھا جو ساگریکا آپ کے لئے چھوڑ گئی ہے" راجہ مالا دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ اُسے چوما، دل سے لگایا، اور گلے میں ڈال لیا۔ اتنے میں اوجین کا ایک مداری آگیا جو بھان متی کے کھیلوں میں جگت گورو مانا جاتا تھا۔ اُس نے کہا مہاراج کیا دیکھیں گے چاند زمین پر اُتر آئے، پہاڑ ہوا میں تیرنے لگیں، پانی میں آگ اُگے، چاند کی بغل میں سورج نظر آئے، جو مہاراج چاہیں وہی ہو جائے سکھیئے تو وہی سامنے آ کر پرنام کرے جو من میں بس رہی ہے"

راجہ نے رانی کو بھی بلالیا اور تماشا شروع ہؤا۔ برہما کنول پر سوار ہو کر آئے۔ اندر اپنے مکنے ہاتھی پر بیٹھے اپنی ساری رونق سمیت دکھائی دیئے۔ مداری نے اس طرح کے کئی شعبدے دکھائے۔ چاروں طرف واہ واہ ہو رہی تھی۔ کہ جگیندراین کے نوکر داسو بھٹ کو لے کر آئے جو رتناولی کی طرح سمندر سے بچ نکلا تھا۔ تماشا بند ہو گیا تو داسو بھٹ نے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کی۔ ابھی اُس نے تھوڑا سا حال ہی بیان کیا تھا کہ شور مچ گیا۔ اور رنواس میں آگ لگ گئی۔ آگ لگ گئی کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ سن کر مہارانی واسودتا کے اوسان خطا ہو گئے۔ گھبرا کر بولی کہ مہاراج میں ساگریکا کو ایک کوٹھڑی میں بند کرآئی تھی۔ اُس کے بچاؤ کا اپاؤ کیجئے۔ اگر اُس پر آنچ آئی تو میں کنبے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ راجہ آگ کی لپٹوں کو پھاندتا ہؤا گیا اور ساگریکا کو نکال لایا۔ یہ آگ نری لاگ تھی جو جگیندراین کے کہنے پر مداری نے لگائی تھی۔ اب رانی نے ساگریکا کا حال بتایا۔ مالا اور داسو بھٹ کی تائید سے ثابت ہو گیا کہ ساگریکا اور رتناولی ایک ہی دیوی کے نام ہیں۔ اتنے میں جگیندراین آئے اور انہوں نے سب اونچ نیچ سمجھائی راجہ بگڑنے کو تھا کہ وسنتک کی باتوں پر سب کو ہنسی آگئی۔ واسودتا بھی مان گئی اور راجہ اوین اور راجکماری رتناولی کی شادی ہو گئی۔

نور الٰہی

محمد عمر

بزمِ یگانہ

(۱)

کیوں کھول دیئے از ازل سے ناحق
پیچ میں پھنسے آپ اجل سے ناحق
ہاں کیوں نہ اٹھے شور انا الحق پی کر
بڑبار اٹھے پپیہے کے بگلے ناحق

(۲)

یارانِ شباب رات کٹنے کی ہے
بجھتا ہے کنول ہوا پلٹنے کی ہے
محفل میں جو شمع ہو سکے کب تک
آنکھیں کھلنے کی دل الٹنے کی ہے

(۳)

ہر گام پہ استخارہ کرتے نہ بنی
تھی دل سے لگی کنارہ کرتے نہ بنی
دیوانہ بتائے کیا کدھر جاتا ہے
منزل کی طرف اشارہ کرتے نہ بنی

(۴)

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے
طوفانِ بلا سے نہیں ڈرنے والے
سمجھیں نہ چلا تو جان پہ کھیل آئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

میرزا یگانہ لکھنوی

بیش بہا زمرّد

شیفرڈ اپنے ہیر کھڑکی کی چوکھٹ پر پھیلائے ہوئے بید کی ایک بوسیدہ کرسی پر بیٹھا کسی خیال میں محو تھا۔ سوادِ شام پورٹر سٹریٹ کو اپنی سیاہ نقاب میں آہستہ آہستہ چھپا رہا تھا لیکن شام کی تاریکی سے اس سڑک کی کوئی تحقیر نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورٹر سٹریٹ میں کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو کسی راہگیر کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتی ہو۔

شیفرڈ بیٹھا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بیس ہزار روپے کی گراں قدر رقم پنہاں ہے جو میری جائز میراث ہے۔ کاش مجھے یہی معلوم ہو جاتا کہ یہ رقم کہاں پوشیدہ ہے۔ بہرکیف جہاں کہیں ہو، ہے ضرور، مگر میرے لئے تو یہ رقم ایسی ہی ہے جیسے خشک گھاس کے ڈھیر میں ایک سوئی۔

اُس کی اس اُدھیڑ بُن کی وجہ یہ تھی کہ ایک سال قبل اڈمنڈ گرانڈن نامی ایک شخص لندن میں مرا۔ یہ شخص کسی وقت بہت دولت مند اور شیفرڈ کا گہرا دوست تھا لیکن نامساعدتِ روزگار کے ہاتھوں اُس کی تونگری کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کے زوال کے اسباب میں ایک بیش بہا انگوٹھی کا پُراسرار طور پر غائب ہو جانا بھی ایک منحوس سبب تھا۔ اس انگوٹھی میں نہایت نایاب زمرد کا ایک ٹکڑا نصب تھا۔ زمرد کے آس پاس دو چھوٹے چھوٹے ہیرے بھی جڑے تھے۔ مرنے والے نے اپنے وصیت نامہ میں لکھ دیا تھا کہ یہ گمشدہ انگوٹھی مل جائے تو شیفرڈ اس کا جائز وارث ہوگا۔ انگوٹھی کے زمرد کی قیمت کم از کم بیس ہزار روپیہ تھی، لیکن موجودہ حالت میں ایسی وراثت بیس پیسوں کے برابر بھی نہ تھی۔ شیفرڈ مغربی ممالک سے مفلسی اور تہی دستی کی حالت میں واپس آیا اور لندن پہنچتے ہی اس کو اُس وصیت نامہ کی اطلاع ملی۔ ایسی مفلسی میں لندن کا قیام اُس کے لئے سوہانِ روح ہو رہا تھا۔ اگر ایسے وقت میں یہ بیس ہزار کی رقم اُس کے ہاتھ آجاتی تو وہ مغربی ممالک میں جا کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا۔ انہی خیالات میں محو وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

"اگر میں اس وہم میں مبتلا رہا تو کیا عجب ہے کہ میرا دماغ خراب ہو جائے۔ میں کچھ احمق نہیں۔ اس لئے مجھے اس روح فرسا خیال سے باز آنا چاہئے۔ وہ زمرد اس وسیع کرۂ ارضی کے کسی گوشہ میں ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ بحرِ عمیق کی تہ میں ہو۔ یا کسی شاہزادی کی نازک انگلی کو زیب دے رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شاطر چور کے صندوق میں ہو۔ یا خاک میں مل چکا ہو اور اُس کے ذرّے ہوا میں منتشر ہو چکے ہوں۔ بہرنوع میں متوفی گرانڈن کا بے وجہ ممنون ہوں۔ خیر اپنے دل و دماغ

سے اس خیال کو نکالے دیتا ہوں"

اتنے میں پشت کے کمرہ سے کسی کے مسلسل کھانسنے اور کراہنے کی دردناک آواز آئی - اس آواز میں کچھ ایسا درد تھا کہ شیفرڈ بے چین ہوگیا - وہ طبعاً دوسروں کی تکلیف سے بہت متاثر ہو جاتا تھا - آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا:

"اُف یہ مقام کیسا گندہ ہے! اگر میں فوراً اس ناپاک جگہ کو خالی نہ کردوں تو کیا عجب ہے کہ میری صحت اور اُس کے ساتھ ساری امیدیں خاک میں مل جائیں - یہاں کی گندگی اور فلاکت میری رگ وپے میں پیوست اور میرے دل و دماغ میں سرایت کر جائے گی - آہ کاش میں اُس کا خیال ...... "

اچانک اسکو یہ محسوس ہؤا کہ کوئی اُس کا نام لے کر پکار رہا ہے - وہ کان لگا کر سننے لگا - لیکن پھر کھانسی کی آواز نے اُسے کچھ نہ سننے دیا - وہ اُٹھ کھڑا ہؤا اور اُس طرف چل دیا - کھانسی کی آواز رکی اور اُس نے کسی کو صاف اپنا نام لے کر پکارتے سنا - وہ ساتھ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہؤا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا -

"کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟"

بیمار "کیا آپ کا نام مسٹر شیفرڈ ہے؟

شیفرڈ - "جی ہاں"

بیمار - (رُک رُک کر) "براہ ...... کرم ...... آگے ...... آئیے ...... میں ...... آپ ...... سے ...... کچھ کہنا ...... چاہتا ...... ہوں"

کمرے کی کثیف حالت دیکھ کر شیفرڈ کے سارے جسم میں لرزہ پیدا ہوگیا - درو دیوار کی حسرت زا صورت چھوٹی سی موم بتی کی ٹمٹماہٹ، اور ان سب سے دردناک نظارہ ایک مریض کے نحیف و نزار جسم کا تھا جو ایک گوشے میں پڑا ہؤا تھا - وہ مریض کی طرف بڑھا اور یوں مخاطب ہؤا:-

"تمہاری یہ حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہؤا" مریض ایک جوان شخص تھا جس کے ماتھے پر پسینے میں بھیگے ہوئے اور اُلجھے ہوئے سیاہ بالوں کی لٹیں پڑی ہوئی تھیں اور رخسارے شدتِ بخار سے تمتمارہے تھے -

"درست ہے" موخرالذکر نے ہلکے تبسم کے ساتھ جواب دیا "میں اچھا ہو جاؤں گا - اور بالفرض نہ بھی ہؤا تو کیا، بیٹھ جائیے میں ڈر رہا ہوں کہ قوتِ گویائی اب جواب دے رہی ہے - مجھے آپ سے پیشتر ہی ملنا چاہیے تھا، لیکن میں ہمیشہ اس کو ٹالتا رہا"

شیفرڈ نے کہا "تم آہستگی سے باتیں کرو - میں سن لوں گا - اشارہ سے صرف اتنا بتادو کہ میں کس طرح تمہاری

مدد کر سکتا ہوں" تین چار منٹ کے وقفہ کے بعد مریض نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"آپ ایک ماہ سے لندن میں ہیں۔لیکن مجھے دو تین روز ہوئے اطلاع ملی کہ آپ یہاں پورٹر سٹریٹ میں مقیم ہیں۔اس لئے میں نے یہیں یہ کمرہ لے لیا۔علاوہ ازیں مجھے پہلا مکان اس لئے چھوڑنا پڑا کہ وہاں والوں نے مجھے مدقوق سمجھ کر نکل جانے کو کہا تھا۔حالانکہ یہ دق نہیں ہے،پھیپھڑے صرف متورم ہو گئے ہیں اور بہت جلد میں اس مرض پر قابو پا لوں گا۔"

شیفرڈ (تسلی کے لہجہ میں)۔"ہاں!ہاں! اچھا تو تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

بیمار - میں آپ کو آپ کی گم شدہ چیز کا پتہ لگانے میں مدد دینا چاہتا ہوں۔وہ انگوٹھی جو مسٹر گرانڈن نے تمہیں ورثہ میں دی تھی بہت قیمتی ہے۔اور مجھے یہ معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔"

گفتگو کی جدوجہد سے مریض نڈھال ہو رہا تھا۔اُس کی یہ حالت دیکھ کر شیفرڈ اپنی حیرت و استعجاب کو بھول گیا اور اُس کو دلاسا دینے لگا۔

"ذرا دیر دم لے لو۔تاکہ تمہاری حالت سنبھل جائے"

مریض ۔"بجا فرمایا۔مگر ڈر ہے کہ اگر میری حالت نہ سنبھلی۔اور مجھے قبر کا منہ......خیر...میں یہ کہہ رہا تھا۔کہ میں انگوٹھی کے راز سے واقف ہوں۔یعنی وہ میں نے ہی اڑائی تھی۔"

یہ سُن کر شیفرڈ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔اور وہ کسی قدر سکوت کے بعد بولا۔

"تمہیں نے لی تھی؟"

مریض ۔"ہاں میں نے ہی چرائی تھی۔میں اُس وقت مسٹر گرانڈن کا خدمت گار تھا۔میرا نام بریڈلے ہے۔جب یہ واقعہ پیش آیا اُس وقت وہ بڈفورڈسکوئر کے مکان نمبر ۲۲ میں رہتے تھے۔جس کا مالک مسٹر ہیرنگ ہے۔وہ انگوٹھی مجھ کو غسل خانہ میں ملی تھی۔مسٹر گرانڈن نے غسل سے پہلے اتار کر رکھ دی اور غسل کے بعد وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔میری حالت اُس وقت ناداری کی تھی کیونکہ جو کچھ اپنے پاس اندوختہ تھا وہ ایک دن پیشتر میں گھوڑدوڑ میں ہار چکا تھا۔میری باتیں سُن رہے ہو؟"

شیفرڈ ۔"حرف بہ حرف"

بریڈلے ۔"اس مکان کے زیرین حصہ میں پشت پر ایک کمرہ کتب خانہ کا ہے۔اس کمرہ میں آتشدان کے اوپر دو چلبے شمعدان رکھے رہتے ہیں۔جو پہلے مسٹر گرانڈن کے تھے۔لیکن چونکہ مسٹر ہیرنگ اُن کی اکثر تعریف کیا کرتا تھا۔اس

لئے اُس نے ہدیتاً مسٹر ہیرنگ کو دے دیئے۔ میں نے اُن کو بارہا خود صاف کیا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ اُن کے پیندے کھُل جاتے ہیں۔ میں اِس کمرہ میں پہنچا اور انگوٹھی کو روئی میں لپیٹ کر شمعدان کے پیندے میں رکھ دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ موقع پا کر اُس کو وہاں سے نکال لاؤں گا۔ لیکن اس واقعے کے بعد ہی میرے آقا اور مسٹر ہیرنگ آپس میں لڑے اور مجھ کو پھر اس مکان میں جانے کا موقع نہیں ملا۔"

مسلسل باتیں کرنے کی جدوجہد سے تھک کر بیمار نے آنکھیں بند کرلیں اور خاموش ہوگیا۔

اِن باتوں کا علم ہو جانے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ شیفرڈ انگوٹھی کے حصول کی تمنا میں بے قرار نہ ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد اُس نے سوال کیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ انگوٹھی اب تک اُسی مقام پر ہے؟"

بریڈلے۔ "یقین تو کیسے ہو سکتا ہے، البتہ قرین قیاس یہی ہے۔"

شیفرڈ۔ "فرض کرو کہ تمہارے بعد کسی نے شمعدان کو صاف کرتے وقت کھولا ہو اور انگوٹھی اُس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔"

بریڈلے۔ "ہاں ممکن ہے۔"

شیفرڈ۔ "اور اگر وہ شخص بددیانت ہو تو انگوٹھی پا کر خاموش ہوگیا ہو۔"

بریڈلے۔ "ہاں یہ بھی ممکن ہے۔"

شیفرڈ۔ "لیکن اس میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ انگوٹھی میری ہے۔"

بریڈلے۔ "یقیناً آپ ہی کی ہے۔"

شیفرڈ۔ "تو پھر شاید تم یہ نہیں چاہتے کہ میں براہِ راست مسٹر ہیرنگ کے پاس جاؤں اور ان سے سارے واقعات کا اظہار کردوں، کیونکہ اس حالت میں تم مشکلات میں پھنس جاؤ گے۔ کیوں؟"

بریڈلے۔ "قطعی نہیں۔ آپ اگر چاہیں تو مجھ کو کسی نہ کسی طرح صاف بچا سکتے ہیں۔ اور پھر میں ایسا بیمار ہوں کہ مجھے کسی نتیجہ کی پروا نہیں۔ میری خواہش صرف اتنی ہے کہ میں انصاف پر رہوں۔ یقین مانئے کہ اس واقعہ سے پہلے اور اس کے بعد آج تک میں نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ خدا شاہد ہے کہ ہمیشہ میرا ضمیر مجھ کو اس حرکت پر ملامت کرتا رہا ہے اور اُس دن کے بعد آج تک مجھے راحت نصیب نہیں ہوئی۔"

شیفرڈ۔ "اگر تمہیں اتنی ہی ندامت ہے تو پھر مجھے کون سی شے وہاں جانے اور اپنی انگوٹھی کا مطالبہ کرنے سے باز رکھ سکتی ہے؟"

بریڈلے "یہ سچ ہے مگر مجھے اس میں شک ہے۔ میرے آقا اور پیرنگ کی عداوت لین دین سے متعلق تھی۔ اور نوبت عدالت تک پہنچی تھی۔ لیکن فیصلہ مسٹر پیرنگ کے خلاف ہوا۔ لہٰذا وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میرے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ سوا اس کے وہ خلقاً نہایت کنجوس ممسک اور غاصب واقع ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں کسی بہانہ سے ٹال دے۔ یا تم سے کہہ دے کہ کسی دوسرے وقت آؤ۔ یا کم از کم شمعدان کو دیکھتے وقت تمہاری موجودگی کو پسند نہ کرے لیکن مسٹر شیفرڈ خدا عالم الغیب ہے میں اُس کی برائی نہیں کرتا مجھے خوف ہے کہ صرف تمہارے مطالبہ پر وہ چپکے سے بیش بہا زمرد تمہارے حوالے نہیں کرے گا۔ اگر میں تندرست ہوتا تو میرا ارادہ تھا کہ چونکہ میں نے خود انگوٹھی وہاں رکھی تھی جو بہت ممکن ہے اب تک وہیں ہو۔ اس لئے میں خود ہی . . . (کھانسی کی شدت سے جملہ پورا نہیں کرسکا)

شیفرڈ منتظر رہا۔ پریشان کن خیالات میں محو ہوگیا۔ جب مریض کو سکون ہوا تو بولا۔

"تمہارا یہ ارادہ تھا کہ چھپ کر انگوٹھی نکال لاؤ؟"

بریڈلے۔ "ہاں تمہاری خاطر یہی کرتا"

شیفرڈ۔ "اور تم مجھے کیا رائے دیتے ہو؟"

بریڈلے "میں کیسے کہوں۔ میری نیت تو یہی تھی کہ کسی طرح تمہاری چیز تم کو مل جائے۔ اگر میرے امکان میں ہوتا تو آج ہی رات کو یا زیادہ سے زیادہ کل رات تک موقع تھا کیونکہ پیرنگ شہر سے کہیں باہر گیا ہوا ہے اور پرسوں واپس آجائے گا۔ باغ کے اندر سے گذر کر اس کمرہ میں داخل ہونا کچھ دشوار نہیں ہے۔ اگر تم جانا چاہو اور کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو تمہارے بچاؤ کے لئے یہ کافی ہے کہ میں چوری کا اقرار کرلوں لیکن تم کو ایسی رائے دینے کی مجھے جرات نہیں ہوتی۔ صرف بات آپڑی تو اپنا خیال ظاہر کردیا۔

ممکن ہے کہ اس موذی مرض کے پنجہ سے مجھے نجات مل جائے اور . . . . . . اور . . . " دوبارہ کھانسی کی وجہ سے جملہ ناتمام رہا۔ اور وہ اتنا نڈھال ہوگیا کہ شیفرڈ نے اس ملاقات کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آگیا۔

چند منٹ پیشتر جو خیالات اُس کے لئے بے معنی اور مہمل تھے۔ اب وہی معنی خیز ہوگئے۔ وہ پایپ سلگا کر پینے لگا اور سوچنے لگا۔

"اب یہ امر تو واضح ہے کہ اس بدنصیب شخص سے مجھے صرف اس بنا پر مخاصمت نہیں ہوسکتی کہ اُس نے انگوٹھی چرالی تھی۔ کیونکہ اگر وہ اس زمرد کو نہ چراتا تو یقیناً مسٹر گرانڈن کی دوسری جائداد کے ساتھ یہ بیش قیمت انگوٹھی

بھی تلف ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں اس کے ملنے کی بہت کچھ امید پیدا ہو گئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا میں مسٹر پیرنگ کی واپسی کا انتظار کروں؟ نہیں۔ میں اپنی رگ و پے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سخت غلطی کا مترادف ہوگا۔ پیرنگ کے نام سے مجھ کو نفرت سی ہو گئی ہے۔ میں نے کبھی اس نام کے کسی شخص کو ایماندار اور عالی حوصلہ نہیں دیکھا۔ بالمشافہ مل کر اُس سے انگوٹھی کا طلب کرنا محض نادانی ہے۔ وہ بآسانی مجھ کو یہ کہہ کر دھوکا دے سکتا ہے کہ انگوٹھی وہاں ہے ہی نہیں۔ میں اُس نزدیک اجنبی ہوں۔ نہ میں زردار ہوں نہ میرا کوئی دوست ایسا ہے جو اُس پر اپنا اثر ڈال سکے۔ اُس نے اگر موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہا تو میرے بنائے کچھ نہ بن پڑے گا۔ اگر وہ اتنا ہی حریص ہے جیسا کہ برنیڈے کے بیان سے ظاہر ہوا۔ تو بس اُس کا اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ گرانڈن کے مقدمہ میں میرے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی اب خدائی فیصلہ ہوگیا۔ بجائے پیرنگ کے پاس جانے کے قانونی مشورہ لینا زیادہ مناسب ہوتا لیکن اس کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور یہاں ٹکا پاس نہیں۔ بفرضِ محال عدالت میں چارہ جوئی بھی کروں تو پیرنگ کو باقاعدہ اطلاع ہونی ضروری ہے۔ اور اطلاع ملتے ہی وہ انگوٹھی کو ڈھونڈے گا اور عدالت کے اندر اثبات یا نفی میں جو کچھ بیان کرے تسلیم کر لیا جائے گا۔

"لہٰذا یہ صاف ظاہر ہے کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میں خود اس مکان میں جاؤں۔ ممکن ہے کہ اس راہ میں بھی کانٹے ہوں۔ تو کیا انسان اپنی مملوکہ شے کے چرانے کا استحقاق رکھتا ہے؟ جواب تو صریح نفی میں ہے مگر ایسی صورت میں بھی میں اپنی رہائی کے لئے دلیل پیش کر سکتا ہوں ہرچہ بادا باد، دو ایک گھنٹے میں گرینڈے سے سٹریٹ کے مکان نمبر ۲۲ کا ایک سرسری معائنہ ضرور کرنا پڑے گا۔"

× × × × × × × × × × × × × ×

رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ شیفرڈ اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں گرینڈے سٹریٹ میں سے گزر رہا ہے۔ جاتے جاتے وہ ایک مکان کے سامنے ٹھہر گیا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ مکان کے باہر کھڑے ہو کر دیکھ بھال کرنے اور اُس کے اندر چور کی طرح داخل ہونے میں بڑا فرق ہے اُس کی زندگی مصائب کے تھپیڑوں سے محفوظ نہ تھی۔ لیکن نقب زنی کی ابتدائی مشق کے لرزہ انگیز احساس کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ دل کو بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ حقیقی معنوں میں یہ چوری نہیں ہے لیکن دل پر ایسا خوف طاری تھا کہ سر سے پیر تک بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ تین بار ارادہ کر کے آگے بڑھا، مگر ہمت نہ ہوئی آخر اس خیال سے تقویت ہوئی کہ مکان میں اندھیرا ہے اور پرسوں تک کے لئے خالی ہے۔ اگر اب فائدہ نہ اٹھایا تو

پھر ایسا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ اس مکان کے پہلو میں ایک گلی مکان کے اندر جانے کے لئے تھی۔ شیفرڈ دبے پاؤں اس گلی میں داخل ہوگیا اور دروازے پر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک جست میں وہ دیوار پھاند کر اندر اُتر گیا۔ اور پہلا کام یہ کیا کہ دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ تاکہ اگر فرار کی ضرورت پیش آئے تو جلد نکل بھاگے۔

آگے بڑھ کر اُس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا پائین باغ ہے جس کی پختہ دیواریں ہر چہار طرف ہری بیلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ مکان کا پچھلا حصہ بھی تاریک تھا۔ لیکن پڑوس کے ایک مکان کی کھڑکی سے اُس کے کچھ حصہ پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ شیفرڈ اس روشنی کے گل ہو جانے کا منتظر رہا۔

اس روشنی سے اتنا فائدہ اس کو ضرور ہوا۔ کہ اُس مخصوص کمرہ کا پتہ چل گیا جس میں برڈیلے کے بیان کے مطابق شمعدان رکھے ہوئے تھے۔ یہ کمرہ نصف بیضاوی شکل کا تھا اور اُس کے سامنے ایک چھوٹا سا چوبی بالاخانہ تھا جہاں سے پائیں باغ میں اترنے کے لئے زینہ بنا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ روشنی جس کی وجہ سے اُس کے دل پر خوف غالب تھا ناگہاں بجھ گئی۔ آنِ واحد میں زینہ کی راہ سے وہ بالاخانہ پر پہنچا۔ اور کمرے کی کھڑکیوں کے قدِ آدم دروازوں کو ٹٹول کر ایک دروازے کو دھکا دیا۔ دھکا دیتے ہی زور کی آواز ہوئی۔ اور دروازہ کھل گیا۔ آواز سے سہم کر شیفرڈ جھٹ بالاخانہ سے اتر کر پائین باغ میں ہو رہا۔ لیکن ہر سمت خاموشی تھی۔ اس لئے پھر وہ زینہ سے بالاخانہ پر اور وہاں سے کمرے میں جا پہنچا۔ کامیابی اور حصولِ آرزو کی امید سے اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر وہ شمعدان اسی کمرے میں ہے تو یقیناً گوہرِ مقصود ہاتھ آگیا۔ اُس نے جیب سے دیاسلائی نکال کر جلائی۔ اُس کی مختصر سی روشنی میں پہلے اُس کی نظر جس پر پڑی وہ ایک شخص تھا جو لمبا کوٹ اور فلٹ ٹوپی پہنے داہنے ہاتھ میں ایک پستول لئے اُس کے سامنے کمرے کے اندرونی دروازے پر کھڑا تھا۔ جیسے ہی اُس کی نظر اُس شخص پر پڑی دو باتیں اُس کے ذہن میں آئیں اول یہ کہ پیرنگ خلافِ توقع اس وقت یہاں کیسے آگیا۔ دوسرے یہ کہ اگر اُس نے پستول چلا بھی دیا تو صرف میری ٹانگوں میں گولی مار سکتا ہے۔ موخر الذکر خیال کے آتے ہی اُس کے دل کو ڈھارس بندھی۔

اُس کے مقابل نے اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ "دیکھنا دیاسلائی کو بجھنے نہ دینا"۔ یہ الفاظ ایسے ہی حاکمانہ لہجے میں ادا کئے گئے تھے جیسے کوئی مسلح آدمی کسی نہتے شخص کو مخاطب کرتا ہے۔

"اسی دیاسلائی سے اس شمع کو روشن کرو"۔ یہ کہتے ہوئے شیفرڈ کو پستول کی زد میں رکھ کر اُس نے آتشدان پر سے ایک شمع اتار کر میز پر رکھ دی۔ شیفرڈ نے حکم کی تعمیل میں جھٹ جھک کر شمع جلا دی۔

مالک مکان نے اپنے ناخواندہ مہمان سے کہا "میں نے دروازہ کھُلنے کی آواز سنی تھی۔ تم نے دروازہ توڑ ڈالا۔ شاید تم سمجھے تھے کہ مکان خالی ہے۔

شیفرڈ۔ (مایوسی کے لہجہ میں) "ہاں"

اُس وقت اُس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور دل ہی دل میں اپنی حرکت پر نفرین کہہ رہا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ اُس کے پاس جواب تھا۔ لیکن اُس کا اثر کیا تھا؟"

وہی شخص۔ "اور تمھاری قسمت نے تم کو دھوکا دیا۔ بالکل خاموش کھڑے رہو گے تو میں تم کو کوئی ضرر نہیں پہنچاؤں گا"

یہ کہہ کر متکلّم نے آتشدان پر ٹیلیفون کا رسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

شیفرڈ۔ (لجاجت کے ساتھ) "ذرا ٹھیرئیے۔ کیا آپ مسٹر پیرنگ ہیں؟"

وہ شخص۔ "آخر تمھارا مقصد؟"

شیفرڈ۔ "کیونکہ آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ مگر میرے پاس یہاں اس مشتبہ حالت میں آنے کی وجہ ہے"

وہ شخص۔ "یہ وجہ پولیس کو بتا سکتے ہو"

شیفرڈ (گھبرا کر) "ٹھہرئیے۔ خدا کے لئے جلدی نہ کیجئے۔ میں ایک ایسے شخص کا نام لوں گا جس سے ہم دونوں واقف ہیں یعنی اڈمنڈ گرانڈن"

ٹیلیفون کا رسیور ہاتھ میں لئے پیرنگ نے (کیونکہ یہ پیرنگ ہی تھا) چیں بہ جبیں ہو کر شیفرڈ کو گھور کر دیکھا۔

شیفرڈ (کلام جاری رکھتے ہوئے) "وہ کبھی تمہارا دوست تھا اور میرا بھی۔ اپنے وصیت نامہ میں وہ اپنی زمرد اور ہیرے کی انگوٹھی میرے نام لکھ گیا۔ مجھے اب اتفاقیہ طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ انگوٹھی آپ کی لاعلمی میں یہاں پوشیدہ ہے"

پیرنگ۔ "یہ کہو۔ تو تمہارا نام یقینی ...... لیکن فرض کرو کہ تم اپنا نام خود بتاؤ"

پیرنگ کی پیشانی کی شکنیں مٹ گئیں۔ اور اُس نے رسیور کو آتش دان پر رکھ کر، موم بتّی کی روشنی میں آنے والے کی طرف گھور کر کہا "دیکھو جیب کے قریب ہاتھ نہ لے جاؤ۔ معلوم ہو گیا کہ تم افترا پردازی میں طاق ہو"

شیفرڈ۔ "اگر مجھے آپ اتنا وقت دیں کہ میں واقعات کا اظہار کر لوں۔ تو آپ پر یہ روشن ہو جائے گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ حرف بہ حرف سچ ہے"

پیرنگ "گھبراؤ نہیں۔ تمہیں وقت کافی مل جائے گا۔ کم از کم دو سال"

شیفرڈ۔ (لاپروائی سے) مجھ کو اس میں کسی قدر شک ہے۔ میں اپنا نام اور یہاں اس مشتبہ حالت میں آنے کی وجہ بآسانی بیان کردوں گا۔"

پیرنگ "یعنی اس کی وجہ کہ تم میرے مکان میں اس طرح رات کو کیوں گھسے؟"

شیفرڈ "ہاں اتنی ضرور میری غلطی ہے۔"

پیرنگ۔ "خیر مجھ کو تم سے بحث کی ضرورت نہیں۔ تمہارے افسانہ کا اتنا حصّہ ضرور سچ ہے کہ شیفرڈ نامی ایک شخص کو اُس کے دوست مسمی اڈمنڈ گرانڈن نے مرتے وقت اپنے وصیت نامہ میں ایک زمرد کی انگوٹھی لکھ دی تھی، جو اُس وقت غائب ہو چکی تھی۔ اب اگر تم وہی شیفرڈ ہو۔ تو تم کو کون سی شئے انگوٹھی کا علی الاعلان مطالبہ کرنے سے مانع تھی؟"

شیفرڈ۔ "یہ کہ انگوٹھی کھو چکی تھی۔ اور اب اس کے حصول کے لئے یہ ضروری تھا کہ میں پہلے اس کا پتہ لگالوں۔ مسٹر پیرنگ اتنا تو آپ سمجھ سکتے ہیں؟"

پیرنگ "اچھا تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ اس مکان میں آپ اُسی انگوٹھی کی جستجو میں تشریف لائے ہیں؟"

شیفرڈ۔ "ہاں میں نے یہی عرض کیا کیونکہ جس شخص نے وہ انگوٹھی چرائی تھی اُس نے اس کو اسی مکان میں چھپا دیا تھا۔"

پیرنگ۔ "اُسی مکان میں؟"

شیفرڈ۔ "ہاں مسٹر پیرنگ اسی مکان میں۔ بلکہ اسی کمرہ میں"

پیرنگ "اسی کمرہ میں؟"

شیفرڈ۔ "ان وو۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس سے کیا فائدہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ میری باتوں کو باور نہیں کرتے۔"

پیرنگ "اب تک نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ٹھہرو۔ یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ بیش بہا انگوٹھی میرے مکان میں پوشیدہ ہے؟"

شیفرڈ۔ "جس نے اُس کو چُرا کر یہاں چھپایا تھا۔"

پیرنگ "دروغ گویم بر روئے تو۔ اچھا تو وہ کون شخص ہے؟"

شیفرڈ۔ "یہ شخص مسٹر گرانڈن کا ملازم تھا۔ جب میں سفر سے وطن واپس آیا تو اُس نے مجھ کو ڈھونڈ نکالا اور مجھ سے اپنے اس ارتکاب جرم کا اقبال کیا۔ درحقیقت اس سے یہ فعل طمع کے عارضی اثر میں آکر سرزد ہوا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اپنی اس حرکت پر نادم رہا اور اُس کی تلافی کے لئے موقعہ کا منتظر۔ اس وقت وہ سخت بیمار اور

جاں بلب ہے"

پیرنگ "خوب! میں سٹر گرانڈن کے ملازموں سے واقف ہوں۔ اُس شخص کا نام کیا ہے؟"

شیفرڈ "یہ بھی مَیں اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا"

پیرنگ "میں سمجھتا تھا۔ آئے اب گرفت ہیں! کہاں گئی آپ کی سچائی؟"

شیفرڈ "اگر آپ مجھ کو مجبور کریں گے۔ تو میں آپ کو یہاں سے سیدھا اُس آدمی کے پاس لے چلوں گا"

پیرنگ "یعنی تمہارے ہمراز چور کے پاس؟ بس اب زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اتنی دیر تک مَیں تم سے اس لئے سوالات کرتا رہا کہ تمہارے برجستہ سفید جھوٹ میں لُطف آرہا تھا۔ اچھا تو آپ اپنے دعوے پر اب بھی قائم ہیں کہ وہ زمرد کی انگوٹھی میرے مکان میں موجود ہے؟"

شیفرڈ۔ "بہت ممکن ہے کہ اسی کمرہ میں ہو"

پیرنگ۔ "بہت ممکن ہے؟ اچھا کس مقام پر"

شیفرڈ اب تذبذب کی حالت میں تھا۔ اس شخص کا لب ولہجہ، سنگدلی اور حریص نگاہیں بریڈلے کے بیان کی صاف تائید کر رہی تھیں۔ لہذا کافی ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت تھی۔

پیرنگ "میں منتظر ہوں (ترش روئی کے ساتھ) وہ زمرد کی انگوٹھی کہاں ہے؟"

عجب کشمکش اور امید وبیم کا وقت تھا وہ کسی قدر مایوسانہ لہجہ میں بولا۔

"اگر وہ وہیں ہے جہاں مجھے بتایا گیا ہے تو اگر آپ اجازت دیں تو میں اُس کو ڈھونڈ نکالوں"

پیرنگ "میرے بھولے بھالے دوست خبردار! اگر تم نے اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اس پستول کی گولی فی الفور تمہارے سینہ کے پار ہوگی۔ اگر تم محض جھوٹ نہیں بولتے، حالانکہ میرا تو یہی خیال ہے، تو اپنے بیان کے ایک جزو ہی کی تائید میں مجھ کو یہ بتادو کہ وہ انگوٹھی کس جگہ پر ہے۔ بتاؤ۔ جلد بتاؤ"

شیفرڈ (سخت مایوسی اور پیچ وتاب کے لہجے میں) "اس کو چھپائے ہوئے کچھ عرصہ ہُوا۔ کیا عجب ہے کہ کسی نے اُس کو پہلی جگہ سے نکال کر کہیں اور رکھ دیا ہو۔ اُس کا اسی مقام میں ہونا یقینی نہیں ہے۔ بہرکیف اگر جہاں میں بتاؤں وہاں انگوٹھی نہ ہوئی تو آپ میرا بیان صریح جھوٹ سمجھیں گے"

پیرنگ "کچھ بھی سہی۔ تم کو اپنا بیان سچ ثابت کرنے کا ایک موقعہ تو ہے؟ کہاں ہے۔ بولو"

"ان دونوں شمعدانوں میں سے ایک میں" یہ الفاظ شیفرڈ کے لب تک آکر رہ گئے۔ اور وہ اس خیال میں

خاموش کھڑا رہا کہ ایسے وقت میں بھی کسی کو اس کا موقع نہ دینا چاہیئے کہ وہ میری چیز پر قابض ہو جائے۔ اگر میں نے رازافشا کر دیا تو پھر کونسی شے پیرنگ کو اس سے باز رکھ سکتی ہے کہ وہ فوراً مجھ کو اپنے مکان سے یہ کہہ کر نکال دے کہ اسی میں اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ میں تم کو پولیس کے حوالہ نہیں کرتا۔ اور اس طرح میری انگوٹھی پر قابض ہو جائے۔ شیفرڈ کو اس کا کامل یقین بھی تھا کہ اگر موقع ملا تو پیرنگ ضرور ایسا ہی کرے گا۔

شیفرڈ۔ (بآوازِ بلند) "اچھا پھر بلاؤ پولیس کو۔ میں پولیس کا خاموشی کے ساتھ منتظر رہوں گا۔ یہ یقینی امر ہے کہ میں زیادہ دنوں تک حراست میں نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ مجھ کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا۔ کہ میں وہی شیفرڈ ہوں جس کو اڈمنڈ گرانڈن نے مرتے وقت اپنی زمرد کی انگوٹھی دی تھی۔ علاوہ ازیں پولیس میرے مخبر چوکی کی شہادت ضرور لے گی۔ جو میرے موافق ہوگی۔ صرف تمہارے مکان میں گھسنے کے الزام میں سزا پاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد قانون میری جائز وراثت مجھ کو دلائے گا۔ جاؤ میں تیار ہوں۔ تمہاری ایسی تیسی!"

پیرنگ نے اب دیکھا کہ شیفرڈ کے چہرے سے اطمینان اور استقلال کی جھلک نمایاں ہے۔

پیرنگ۔ (شیفرڈ کو بغور دیکھتے ہوئے) "فرض کر لو کہ تم سچ کہتے ہو۔ یہ تو میں کہتا نہیں کہ تم سچ ہی کہتے ہو۔ مگر ممکن ہے کہ تمہارے بیان میں صداقت ہو۔ تاہم اس سے تو انکار ہو نہیں سکتا کہ تم میرے مکان میں چور کی طرح داخل ہوئے ہو۔ اگر میں اتفاقیہ طور پر ایک دن پیشتر واپس نہ آجاتا تو تم یہاں جو چاہتے کرتے۔ تمہارا یہ فعل سخت قابلِ نفرین ہے"۔

شیفرڈ خاموش کھڑا استنا رہا۔ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو معافی مانگتے بھی شرم آتی ہے۔

پیرنگ "پس اگر تم جھوٹ نہیں بولتے۔ تو بھی اگر میں تم کو پولیس کے حوالہ کردوں تو اقدامِ سرقہ کی سزا سے بچ نہیں سکتے"

شیفرڈ۔ "میں نے تو یہ اقرار کر لیا ہے۔ اس کا اعادہ فضول ہے۔۔۔"

پیرنگ۔ اور اگر انگوٹھی یہاں نہ ملی تو تمہاری مایوسی کی کوئی حد نہ ہوگی۔ اور قرینہ ہے بھی یہی۔ ایسی حالت میں تم کو میری بات مان لینی چاہیئے۔ خواہ وہ انگوٹھی یہاں ہو یا نہ ہو۔ ہر حالت میں میں تم کو پانچ سو روپیہ دوں گا۔ اور صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا یہ سلوک فیاضانہ ہے"۔

شیفرڈ اس کی یہ باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ اب اس کو صاف نظر آنے لگا کہ پیرنگ میرے بیان کو سچ تسلیم کرتا ہے۔ مگر میری موجودہ حالت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہے۔ معاملہ کا رخ یوں پلٹ جانا بالکل خلافِ امید

تھا۔اور طمانیت بخش۔کیونکہ اُس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں کشاں کشاں حوالات میں جانے سے محفوظ ہوں۔اس اطمینان کے ساتھ ہی اُس کو یہ محسوس ہُوا کہ ایسے بیش بہا زمرد کے عوض میں پانچ سو کی رقم میرے لئے باعث توہین ہے۔وہ سوچنے لگا کہ ایک شخص کے مکان میں اس طرح داخل ہونا صریح غلطی تھی۔اور اس کے صلہ میں نقصان کے ساتھ رہائی کا موقعہ ملے تو جائے شکر و امتنان ہے اُس نے کنکھیوں سے یہ دیکھ لیا تھا کہ دونوں شمعدانوں پر تازہ ملمع ہے اور یقیناً اِن کو ملازمین ہر وقت صاف کرتے رہے ہونگے۔ممکن ہے کہ انگوٹھی نکل گئی ہو۔پس پانچ سو روپیہ لینے سے انکار کرنا سراسر حماقت ہوگی۔اور اپنی گرفتاری بھی یقینی ہے۔اب رہا یہ دعویٰ کہ اس کے بعد قانوناً میں اپنی انگوٹھی حاصل کر سکتا ہوں بیوقوفی ہے۔

پیرنگ۔" دیکھو سمجھ لو۔میں تمہارے ساتھ بہت نرمی اور نیکی کا سلوک کر رہا ہوں"

شیفرڈ۔" یہ ورثہ میرے لئے بہت گرانبہا ہے۔تم دیکھتے ہو کہ اس کی خاطر میں نے اپنے آپ کو مصیبت میں گرفتار کر لیا ہے"

پیرنگ" صرف اتنا بتا دو کہ وہ انگوٹھی کس مقام پر ہے۔اور پانچ سو روپیہ اسی وقت لے لو۔ممکن ہے کہ تم غلط پتہ بتاؤ۔پھر بھی یہ رقم تم کو دینے کو تیار ہوں۔پانچ سو روپیہ اس چیز کے لئے جو ممکن ہے پہلے ہی غائب ہو چکی ہو اور اس کو بھی مد نظر رکھو کہ ممکن ہے کہ تمہارے مخبر نے تم سے جھوٹ بولا ہو۔تم اُس کی باتوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسا رکھتے ہو"

شیفرڈ۔لیکن انگوٹھی تو بیس ہزار روپے سے کم کی نہیں ہے"

پیرنگ" لیکن اُس کے ملنے کی امید موہوم ہے"

شیفرڈ" خیر اب تو میں تمہارے قبضے میں ہوں"

پیرنگ" اور باوجود اس کے میں تمہارے ساتھ رحمدلی اور فیاضی سے پیش آ رہا ہوں۔اپنے اختیارات کا استعمال کرنے کے بجائے تمہارے ساتھ سلوک کرنے کو تیار ہوں"

شیفرڈ" غالباً تم یہ بھی چاہو گے کہ میں تمہیں ایک تحریر دے دوں۔جس کی رو سے میں اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں"

پیرنگ" ہاں۔صرف ایک سطر اس مضمون کی کہ تم اپنا ورثہ یعنی انگوٹھی میرے ہاتھ بالعوض پانچ سو روپیہ نقد فروخت کر چکے ہو۔

شیفرڈ:- "خوفناک قربانی!"

پیرنگ:- "ہاں اس حالت میں جب کہ تمہیں کامل یقین ہو کہ انگوٹھی کا یہاں وجود بھی ہے"

شیفرڈ:- (مایوسانہ لہجہ میں) "اچھا مجھے منظور ہے"

پیرنگ نے بکس میں سے کاغذ نکال کر شیفرڈ کو دے دیا۔ اور شیفرڈ نے بیٹھ کر لکھنا شروع کیا۔ چند الفاظ لکھ کر پیرنگ سے مخاطب ہوا۔ "تو آپ مجھے روپیہ انگوٹھی کا پتہ بتانے سے پہلے دیں گے؟ اس وقت تو میں آپ کے قابو میں ہوں"

پیرنگ نے "ہاں مجھے منظور ہے" کہہ کر بکس کھولا اور اُس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر شیفرڈ کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اور اُس نے شمار کر کے جیب میں رکھ لئے۔

"لکھنا ختم کرو اور یہ کاغذ مجھے دو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنا راز بھی بتلاتے جاؤ۔ پھر تم جانے کے لئے آزاد ہو۔ راستہ میں شاید اپنی چالاکی پر مسکراؤ گے کہ میں نے خوب دھوکا دیا۔ انگوٹھی کہیں ہے اور بتایا کہیں"

شیفرڈ لکھنے کو پھر جھکا۔ اور دو تین الفاظ اور لکھ کر رک گیا۔ اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اُس نے مجھے روپیہ دینے سے قبل راز معلوم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے پہلے راز بتانے پر مجبور کرتا۔

دِل میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہی اُس نے اُس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اب تک وہ موم بتی کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔ لیکن اس وقت وہ کسی قدر مڑ گیا تھا۔ اور روشنی اُس کے چہرے کے کچھ حصہ پر پڑ رہی تھی۔ نگاہ پڑنی تھی کہ شیفرڈ کے دماغ میں یک بیک بجلی کی سرعت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ پیرنگ اور بریڈلے ایک ہی شخص ہے۔ یہ خیال اتنا تیز اور موثر تھا کہ شیفرڈ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل پڑی۔ وہ چاہتا تھا کہ غور کرنے کا موقع ملے۔ لیکن وقت بہت تنگ تھا۔

ہوٹل کا اندھیرا کمرہ۔ جہاں ایک گوشے میں ایک بیمار پڑا دم توڑ رہا تھا جس کی صورت دھندلی روشنی میں صاف نظر نہیں آتی تھی، اُس کی خوفناک کھانسی اور سر کے اُلجھے ہوئے بال یہ سب کچھ دھوکا اور فریب تھا اور وہ یہی پیرنگ تھا۔ بریڈلے نام کا کوئی شخص نہ تھا۔ اسی شخص نے اُس کو اپنے مکان میں جانے کی ترغیب دی اور اس کے پیچھے پیچھے خود آیا۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی چلا آیا ہو۔ اب شیفرڈ کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب دام اسی کے لئے پھیلایا گیا تھا۔ اب شیفرڈ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں پیرنگ پورٹر سٹریٹ میں ایک ہفتہ تک مقیم رہا اور کیوں اُس نے بریڈلے کا فرضی نام اختیار کر کے اُس کو مصنوعی قصہ سنایا۔ ہونہ ہو زمرد کی انگوٹھی

پیرنگ کے پاس ہے جس کو وہ اب تک چھپائے ہوئے تھا۔ تاکہ موقع پاکر اُس کے مالک کو دام میں لے آئے اور اِس طرح بیس ہزار روپیہ کی انگوٹھی کا صرف پانچ سو روپیہ میں مالک بن بیٹھے۔

اِن خیالات سے اُس کے رگ و پے میں ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ترکیب اختیار کرنا چاہیئے۔ صرف ایک صورت تھی۔ اور وہ اُس کی سمجھ میں آگئی۔ لیکن اگر وار خالی گیا تو کیا ہوگا؟ پہلے اپنی قوت عمل پر کافی بھروسا ہونا ضروری تھا۔

اُس نے لمبی سانس لی، اور قلم رکھ کر کاغذ اور اپنی مکمل تحریر پر نظر ڈالی۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہاتھ سے اُس کاغذ کو پیرنگ کی طرف بڑھایا اور اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ آنکھیں ملتے ہی پیرنگ جھجک کر پیچھے ہٹا۔ اس کا ہٹنا تھا کہ شیرِ غراں کی طرح شیفرڈ نے اِس زور کے ساتھ جھپٹ کر پیرنگ کا گلا پکڑا کہ دونوں زمین پر آرہے۔ پیرنگ نیچے تھا شیفرڈ کے دونوں گھٹنے اُس کے سینے پر تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اُس کی شہ رگ کو دبا رہا تھا۔ پیرنگ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ شیفرڈ نے گھرک کر کہا "او جھوٹے بدمعاش۔ تیری ساری چالیں ظاہر ہوگئیں۔ جلد بتا میری زمرد کی انگوٹھی کہاں ہے ورنہ ...."

پیرنگ "خدا کے لئے رحم! رحم! میں نہیں جانتا۔ میں مر رہا ہوں"

"اگر جان تجھے عزیز ہے تو فوراً بتا انگوٹھی کہاں ہے؟"

"اس صندوقچہ میں جس میں سے نوٹ ...."

شیفرڈ نے اپنی پوری طاقت سے پیرنگ کا کالر پکڑ کر اُس کو کھڑا کیا اور کھینچتا ہوا صندوقچہ کے قریب لے گیا۔ خالی ہاتھ سے صندوقچہ میں سے ایک سبز ریشمی ڈبیہ ملی جس میں وہی زمرد کی بیش بہا زمرد کی انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔ اُس نے ڈبیہ کو جیب میں ڈالا اور ایک زور کا دھکا ایسا دیا کہ پیرنگ فرش پر چاروں شانے چت گر کر کچھ دیر کے لیئے بے ہوش ہوگیا۔ اُس کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہ نہایت اطمینان کے ساتھ جس راہ آیا تھا اُسی راہ نکل گیا۔

گرینڈلے سٹریٹ میں پہنچ کر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس سگریٹ میں اس وقت کچھ عجیب ہی مزہ آرہا تھا۔ اُس نے اپنی جیب کو تھپکی دی جس میں اُس وقت بیس ہزار روپیہ کی بیش بہا زمرد کی انگوٹھی تھی اور کہا "حق بحقدار رسید۔ دوست گرانڈن تمہارا شکریہ!"

شاہ عبدالرحمٰن سیوانی

آہ امیر علی مرحوم

شکوۂ بخت نارسا کیجیے — گلۂ جور ناروا کیجیے
زندگی کا جب اعتبار نہیں — آرزوؤں کو لے کے کیا کیجیے
کیوں الجھیے فریب ہستی میں — کیوں نہ اب ترک مدعا کیجیے
زیست اور اُس کی کیفیت معلوم — دل کو کیوں وقف مدعا کیجیے
زندگی ایک درد پیہم ہے — کیوں نہ اس درد کی دوا کیجیے
ماجرائے حیات کیا کہئے — شرح آلام تا کجا کیجیے
مختصر یہ کہ داغ داغ ہے دل
سوز پنہاں سے اک چراغ ہے دل

اب کسے فکر بادۂ سرجوش — شمع افسردہ اور بزم خموش
اٹھ گیا دہر سے وہ پیکر عقل — کیوں نہ ہو تار تار دامن ہوش
فخر طوسی و رشک دوانی — جس کی ہر بات تھی پیام سروش
اُس کی آنکھیں نشاط فردا پر — اور زباں اُسکی وقف لذت دوش
نہ رہا دہر میں امیر علی — کلک رنگیں تھا جس کا لالہ فروش
بزم نظارہ سوز تھی جس سے
یعنی عالم فروز تھی جس سے

کس لئے دل کو بے قرار کریں — گلۂ عمر مستعار کریں
موت کا بھی جب اعتبار نہیں — زندگی ہی کا اعتبار کریں
مرنے والے کی طرح کانٹوں سے — پہلے ہاتھوں کو ہم فگار کریں
پھر اسی خارزار سے پیدا — اک نیا باغ پُر بہار کریں
زندہ کرنے کا اختیار نہیں — اُس کا مسلک ہی اختیار کریں
آؤ بحر جہاں کی موجوں سے — گرم میدان کارزار کریں
زندگی لالہ زار ہو جائے
یہ چمن پُر بہار ہو جائے

ابوالمکارم سلیم اللہ

آنسو

اے مرے آنسو کبھی بیکار ہو جاتا ہے تُو — اور کبھی دامن پہ بن جاتا ہے اک نقش وفا
تیری قیمت کچھ نہیں رہتی نگاہوں میں کبھی — اور کبھی بنتا ہے تو گنجینۂ صدق و صفا

پرورش پاتا ہے تو قلب حزیں میں اسطرح — جس طرح چشم صدف میں گوہر پارۂ آب دار
تیرے سینے میں ہیں پنہاں رازہائے رنج و غم — تو ہے پچھلی کیف پرور صحبتوں کی یادگار

تو کبھی پھولوں میں بن جاتا ہے قطرہ اوس کا — اور کبھی تاریک بادل میں ستارے کی ضیا
جلوہ گر ہوتا ہے تو بجلی کے پہلو میں کبھی — اور کبھی تو خود ہی بن جاتا ہے شعلہ قہر کا

دیکھ کر تجھ کو کبھی ہوتا ہے سینہ غم سے شق — اور کبھی آنکھوں میں بن جاتا ہے تو وجہ نشاط
ترجمان حال دل ہے غم کی خاموشی میں تو — اک سمندر ہے اگر حاصل ہو تجھکو انبساط

تو ہی مظلوموں کی فریاد دل کا ہے فریاد رس — غم کے شعلوں کو بجھا دیتا ہے دل میں آکے تو
ختم ہو جاتی ہے کلفت تیری طغیانی کے بعد — نغمۂ عشرت سنا دیتا ہے دل میں آکے تو

مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری

ایجادِ عظیم

ایک اتوار کی صبح کا ذکر ہے۔ شیطان خدا کی تلاش میں نکلا اور اُس نے اُسے پا لیا۔ شیطان نے کہا: "اے خدائے بزرگ و برتر! تُو انسانوں کی وجہ سے کیوں پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے؟ . . . . . کیا تو نہیں جانتا کہ یہ کیسی ناکارہ جنس ہیں؟ . . . . . انہیں میرے حوالے کر دے اور ان سے خود کوئی سروکار ہی نہ رکھ! یہ تو ایک فکرِ عبث ہیں؛ بدکردار اور احمق!"

مگر خدا نے جس کی طبیعت اُس وقت کسی ہرزہ درائی کے سننے کے لئے تیار نہ تھی ذرا درشتی سے جواب دیا: "نکل جا یہاں سے، پاجی اور ملعون، مَیں آج کے دن ایسی ناگوار شکایات سننا نہیں چاہتا۔"

"اے قدوس و . . . ."

"بس بس! وہ احمق کیسے ہو سکتے ہیں جب میں نے اُنہیں اپنے نمونے پر پیدا کیا؟ وہ کیوں کر احمق ہو سکتے ہیں؟"

"سچ ہے، تو نے اُنہیں اپنے نمونے پر پیدا کیا، لیکن تو نے ہی اُن کے دماغوں میں ایک کجی بھی رکھ دی۔ اگر تیری عظمت و جبروت مجھے اجازت دے تو میں کہوں کہ . . . . . ."

خدا نے سختی سے کہا: "خاموش! دُور ہو جا یہاں سے . . . . . تنوطی! مجھے غصہ میں نہ لا! . . . . . کیوں تُو یہاں ایسی جھوٹی کہانیاں سنانے آتا ہے؟ میری مخلوق احمق کیوں ہو؟ . . . . . میں تو اُن کو احمق نہیں دیکھتا!"

ابلیس نے کہا: "اے ذاتِ پاک تجھے اِس لئے معلوم نہیں کہ اُس دن سے ——— لیکن پہلے اِس واقعہ کے اظہار کی جرات کے لئے تجھ سے ہزار بار معافی مانگتا ہوں ——— تجھے یاد ہے؟ . . . . جب انہوں نے تیرے رخ انور کی توہین کی تھی تو نے اُن کے ہاں نزول نہیں فرمایا!"

"کیا؟ . . . . میری توہین؟ . . . . . کب؟ خدا نے چیں بہ جبیں ہو کر پُوچھا، اور ایک بناوٹی فراموشی کے آثار اُس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگے ——— یا، کون جانتا ہے کہ حقیقت کیا تھی؟ شاید وہ سچ مچ بھول گیا ہو، کیونکہ خدا سے ہر بات ممکن ہے اور وہ جامع صفات ہے۔

"کیا تجھے یاد نہیں؟ اُن دو چوروں کے ساتھ . . . . . ایک پہاڑی پر جب . . . . . ."

خدا نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "ٹھیک! تھوڑا ہی عرصہ گزرا۔ کیا اُن

لوگوں میں تو بھی تھا ؟"

"ہاں، اے قادرِ مطلق! میرا گزارا ہی اور کس بات پر ہے؟ میں دن رات اُن کے ساتھ ہوتا ہوں، حتی کہ نیند میں بھی۔ ...... میری ہی آغوش میں تو وہ پرورش پاتے ہیں اور میری ہی حفاظت میں وہ جیتے ہیں! میرے سوا اور کون اُن کو سیدھا راستہ دکھانے والا ہے؟ مگر وہ احمق ہیں! اُن کو پڑھاتے ہوئے مجھے صدیاں گزر گئیں مگر سب اکارت گیا، وہ بڑے ہی غبی ہیں!"

پطرس نے دیکھا کہ خدا کو اب غصہ آ رہا ہے اس لئے انہوں نے مداخلت کر کے کہا: "ہاں، ہاں! ہم تجھے اچھی طرح جانتے ہیں! خدا ثبوت چاہتا ہے، صرف الفاظ یہاں کام نہیں آتے۔ ..... ہٹ! اپنی مزخرفات سے ہمارے کانوں کو نہ بھر۔ ..... اپنا راستہ لے ورنہ تیرے کانوں کو کھینچ کھینچ گز گز بھر کا کر دوں گا!"

غریب شیطان کیا کرتا، وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ پطرس نے مذاق نہیں کیا، لیکن اُس نے دل ہی دل میں کہا: "تم ثبوت مانگتے ہو؟ اب تمہیں ثبوت ہی لا کر دوں گا۔ ... اور بہت سے!"

سو وہ چلتا رہا، چلتا رہا، یہاں تک کہ غروبِ آفتاب کے وقت وہ ایک جرمن شہر میں پہنچ گیا جو دو دریاؤں کے درمیان امن سے بستا تھا۔ جونہی وہ شہر کے دروازے میں سے گزرا اُس نے انجیلوس کی آواز سنی۔ شیطان کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا اور وہ ٹھہر گیا۔ ..... اپنی حلقہ دار دم کو لپیٹے ہوئے اور اپنے تیز تیز ناخنوں کو ہتھیلیوں میں چبھوئے ہوئے وہ اُس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک اُس آواز کی گونج فضائے شام میں جذب ہو گئی۔ پھر وُہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہُوا شہر میں داخل ہو گیا اور فی الفور ایک ایسے شخص سے مخاطب ہُوا جس کی داڑھی ناف تک پہنچی ہوئی تھی۔

"گٹن برگ صاحب تسلیم! مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟"

اور ..... وہ دوست بن گئے۔ ایک چیز سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں ہوتے ہوئے آخر وہ ایک لکڑی کے تابوت میں سما گئے۔ یہاں وہ بڑی دیر تک آپس میں گفتگو کرتے رہے لیکن جو کچھ شیطان نے اُس نیک آدمی سے کہا اُسے صرف شیطان جانتا ہے۔ اسی سے اندازہ کر لو کہ گٹن برگ کو اُس رات نیند نہ آئی اور خیالات نے اُس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کئے رکھا۔ اس کے بعد راتیں اسی طرح گزر گئیں اور اُس کی پلک سے پلک نہ لگی۔ وہ ہزاروں منصوبوں اور ارادوں، تدبیروں اور تجویزوں کے ساتھ مصروفِ جنگ رہا، اچھے اچھے منصوبوں کو اُس نے توڑ مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور بُرے بروں کو انتخاب کر لیا۔ اسی طرح بہت سے دن اور بہت سی راتیں گزر گئیں، یہاں تک آخر

بڑی کاوش کے بعد اُس نے چھاپے کا پریس ایجاد کیا!

تو اب ...... کاغذ کو مضبوطی سے تھامے رہو! چھاپو...... اور چھاپو ...... اور چھاپتے ہی چلے جاؤ!

پہلے پہل یہ کارخانہ کسی حد تک آہستہ آہستہ چلتا رہا مگر شیطان کا فکر بلند ہے۔ اُس نے دیکھا کہ پہیے اُس کی منشا کے مطابق تیز نہیں چلتے۔ سو اُس نے پہیے کو اپنی دُم کے پیچ میں لپیٹ لیا اور لو! ــــ سرعت رفتار پیدا ہو گئی...... اب وہ اُس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک فی گھنٹہ دس لاکھ صفحے چھپ کر، گنے جا کر، بند ہو کر، مہریں لگ کر اور ڈاک کے ساتھ شامل ہو کر ریل کی سڑک پر نہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں پھر وہ اپنی دُم کو گاڑی کے پہیوں میں پھنسا دیتا ہے اور اُسے نوّے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلاتا ہے۔ ذرا اپنے مطالب کی اشاعت کے لئے اُس کی عجلت پسندی ملاحظہ کیجے۔

بہت عرصہ نہیں گزرتا کہ پطرس جنت کے دروازے پر ایک خطرناک شور سنتے ہیں، جیسے فتنہ تاتار بیدار ہو کر آ گیا ہو۔ سیٹیوں، نعروں اور گانوں سے آسمان گونج اٹھتا ہے اور فضا غبار آلود ہو جاتی ہے!

"یہ کیا ہے؟...... یہ کیا ہے؟"

یہ شیطان ہے، جو ایک دو دو گاڑی کو الہام، فلسفہ اور قانون کی کتابوں اور نئے پرانے اخباروں اور رسالوں سے لاد کر لایا ہے۔ ملعون ان تمام کو پہلے نیچے اُتارتا ہے اور پھر اس انبار کو اٹھا کر بے تحاشا خدا کی طرف بھاگتا ہے۔

خدا کہتا ہے "ناکارہ، بدمعاش! تو پھر یہاں آ گیا؟

"ہاں اے قادر مطلق!"

"تو کیا خبر لایا ہے؟"

"ایک معمولی سی اے علم و فضل کے مالک۔ یہ گرد گو ڈرے کر حاضر ہوا ہوں۔ ثبوت تو نے مانگا تھا، ثبوت ہی لایا ہوں...... محترم پطرس! مجھے ممنون فرمایئے۔ اپنی عینک لگا لیجئے اور ذرا آپ بھی دیکھئے......" شیطان نے تمام چیزیں خدا کو اور پطرس کو دکھا دیں۔

خدا اور پطرس حیران رہ گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"اے حی و قیوم، کیا میں سچا نہیں ہوں؟"

خدا کچھ جواب نہیں دیتا۔

"جناب پطرس، کیا میں سچا نہیں ہوں؟

پطرس بھی کچھ جواب نہیں دیتے۔

کچھ دیر کے بعد خدا پوچھتا ہے "اچھا، تو تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"یہی کہ انسانوں کو میرے حوالے کر دے، جیسا کہ معاہدہ ہوا تھا"

خدا تنگ آ کر جواب دیتا ہے: "ہاں! لے جا اُن کو اور مجھے تنہا چھوڑ دو"

شیطان خوشی سے اچھلتا کودتا چل پڑتا ہے۔

"ٹھہر!۔۔۔۔۔ بے ہودہ کار۔۔۔۔۔ کہاں جاتا ہے؟"

"اُن پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے"

"کیا؟۔۔۔۔ اور یہ خباثت تو یہیں پھیلا جائے گا؟۔۔۔۔۔ اُٹھا اس سب کو!۔۔۔۔۔ اور اگر مجھے پھر کبھی معلوم ہوا کہ تو ایسی بے ہودگی لے کر یہاں آیا ہے تو میں پطرس سے کہہ کر تیری دُم کٹوا دوں گا۔ سنا؟"

چنانچہ شیطان نے تمام انبار سمیٹ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور دُم دبا کر وہاں سے بھاگا۔

اس طرح نوعِ انسان نے کتاب خانے اور دار العلوم بنانے سیکھے تا کہ زمانہ اُن کی عقل و دانش کو تباہ نہ کر سکے۔

منصور احمد

"ٹیبڈو وینو"

جس طرح رات اپنی تاریکی میں التجائے روشنی پنہاں رکھتی ہے اسی طرح میری بے خبری کے عمق میں یہ آواز گونجتی ہے کہ میں تجھے چاہتا ہوں اور صرف تجھی کو۔ جس طرح طوفان جب وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ امن شکن ہوتا ہے۔ اپنی نہایت بھی امن ہی میں تلاش کرتا ہے، اسی طرح میرا انحراف تیری محبت کو صدمہ پہنچاتا ہے، اور پھر بھی صدا یہی ہے کہ میں تجھے چاہتا ہوں اور صرف تجھی کو۔

ٹیگور

محبت رُوح خاموشی بھی ہے

محبت روحِ خاموشی بھی ہے جانِ سخن بھی ہے
گلستانِ مسرّت بھی ہے صحرائے محن بھی ہے

اِسی سے زیست تریں ہے اِسی سے موت سیمیں ہے
محبت نورِ ہستی بھی ہے تنویرِ کفن بھی ہے

جُدا دنیا سے ہے لیکن ہے اِک دنیا تصوّر کی
محبت کا چمن خلوت بھی ہے اور انجمن بھی ہے

وہ نکہت ہے محبت جس میں دنیا بھر کی خوشبو ہے
محبت بوئے گل بھی عطر بھی مشکِ ختن بھی ہے

جھلکتی ہے ہمیشہ اِس کی یک رنگی میں رنگینی
بیابانِ محبت دشت بھی ہے اور چمن بھی ہے

مری تیری محبت بس کہ ہے تصویرِ عصمت کی
کہ اے دلبر مری، تو میری دلبر بھی بہن بھی ہے

میں تیرے پاس رہتا ہوں تو میرے پاس رہتی ہے
مرا مسکن تری فرقت میں غربت بھی وطن بھی ہے

جدا اُس سے نہ رہ دم بھر جدائی میں تری اے جاں
بہارِ کم سخن بیدل بھی ہے اور خستہ تن بھی ہے

بہار

مفروضہ چینی ققنس کی تحقیق

(نوشتۂ آنریبل۔ ایم، یو، ہاچسوکا)

جو لوگ چینی آرٹ اور لٹریچر سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اُن دو پرندوں سے بھی آشنا ہوں گے جنھیں اہلِ چین "فینگ ہوانگ" اور "لُوآں" کہتے ہیں اور اہلِ جاپان "ہواُد" اور "لوآن" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "فینگ ہوانگ" کو مغربی لغات اور فرہنگوں میں ققنس لکھا گیا ہے۔ مدت سے میرا خیال ہے کہ یہ دونوں پرندے خاکدانِ ارضی میں موجود تھے جس بات نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے وہ وہ فرق تھا، جو چھوٹے اور بڑے "ققنس" میں کیا گیا تھا۔

بڑے پرند کو "یُوٹسو" کہتے تھے۔ عمر کے لحاظ سے اُس کی شکل وصُورت کو پہچان لینا اور لانبی لانبی قامت کے شکاری پرندوں میں اُسے ڈھونڈ لینا ایک مبصر کے لئے کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ وہ بغیر کسی دقت کے اُس کی شناخت کر لیتا ہے۔ میں اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ "ققنس" اور "لوآں" محض خیالی اور مفروضہ پرندے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی ہستی موجود ہے، لیکن وہ آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ خصائص اور مدارج کے لحاظ سے یہ دونوں پرندے آپس میں گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ تشریحاتِ قدیمہ میں "فینگ ہوانگ" کا سر مُرغ کی مانند، گردن سانپ جیسی، ٹھوڑی ابابیل کی سی، پشت کچھوے کی طرح اور دُم مچھلی کی مانند بیان کی گئی ہے۔ پانچ رنگ اور لمبائی چھ فٹ بتائی گئی ہے۔

آؤ اِن تشریحات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔

۱۔ سر مُرغ کا سا۔ "ققنس" کا سر بہت کچھ پالتو مُرغ کے سر سے ملتا جلتا ہے۔

۲۔ سانپ جیسی گردن۔ اُس کی پتلی گردن اس طرح سے گردش کرتی ہے جیسا کہ سانپ کا پھن عالمِ غیظ وغضب میں لہراتا ہے۔

۳۔ ابابیل کی ٹھوڑی۔ البتہ یہ مشابہت اور مماثلت کسی قدر قرینِ قیاس نہیں ہے۔

۴۔ کچھوے کی پشت۔ ققنس کی پیٹھ پر بے ترتیب نقطے اور دھاریاں ہوتی ہیں۔ پروں کے نیچے یہ نقطے شکلِ مسدس کے ضلعوں کی طرح اور بھی بے ترتیب ہو جاتے ہیں۔ پروں کے اوپر جو نقطے ہوتے ہیں وہ لکیروں اور دھاریوں سے مل جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ کچھوے کی کھال ہے۔ بعض قدیم کتابوں میں "ققنس"

کی پیٹھ کو چیتے کی کھال سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۵- **مچھلی جیسی دُم** - "ققنس" کی دُم بالکل اُس مچھلی سے ملتی جلتی ہے جو بغیر کسی حرکت کے زمین پر چپٹی پڑی ہو۔

۶- **پانچ رنگ** - اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ کئی رنگ رکھتا ہے۔

۷- **چھ فٹ لمبائی** - یہ مسلمہ امر ہے کہ پچھلے زمانے میں چین میں جو فٹ رائج تھا وہ عہد حاضر کے فٹ سے بہت چھوٹا تھا۔ اور ملک کے اقطاع واکناف میں اُس کے مختلف اندازے تھے۔ اس لحاظ سے اُن کی پیمائش کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ خصوصیت کے ساتھ اِس پیمائش میں یہ تعیّن نہیں کیا گیا کہ یہ لمبائی سر سے پاؤں تک زمین پر بیٹھے ہوئے کی گئی ہے یا کسی درخت پر بیٹھے ہوئے سر سے دُم تک کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل چین اعداد و شمار میں بہت محتاط نہیں ہیں۔ وہ مبالغہ آرائی کے خوگر ہیں۔

یہ ہے "ققنس" کی ماہیتِ جسمی کا تذکرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی وضع وقطع بہت کچھ تیتر (آرگس) سے ملتی جلتی ہے۔ جیسا کہ ڈارون تیتر کے پروں کے متعلق لکھتا ہے کہ:- "اُس کے پَروں پر نہایت ہی دلربا اور دل کش ٹیڑھی ترچھی کالی لکیریں ہوتی ہیں۔ اور نقاط سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی چیتے اور تیندوے کی کھال ہے"![1]

اب ہمیں اُن کی آوازوں کے متعلق سوچنا چاہئے۔ بدقسمتی سے میں نے نہ تو تیتر کی آواز سُنی ہے اور نہ ہی ققنس کی۔ لیکن "ہیوم اور مارشل" کے صفحہ ایک سو ایک پر بعنوان "ہندوستان، برما، اور سیلون کے شکاری پرند" یہ عبارت درج ہے۔ "نر عموماً دس بارہ دفعہ "ہو ہو" کی آواز نکالتا ہے جب وہ کریز چھوڑتا ہے تو یہ آواز ٹھیر ٹھیر کر آتی ہے جس کا جواب فوراً ہی آس پاس سے مل جاتا ہے۔ بندوق کی آواز اور بندروں کے گزرنے کی چاپ اور آہٹ سے وہ اکثر مشتعل ہو کر بولنے لگتا ہے۔

مادہ کی آواز اچھی طرح سے سمجھ میں آتی ہے۔ "وو" "او"۔ "او"۔ "وو" کہتی ہے۔ آخری "او" پر بہت زور دیتی ہے اور دس بارہ دفعہ سرعت کے ساتھ دہراتی ہے لیکن اس کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ جس کو "او۔ وو" کہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ نر اور مادہ دونوں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ خصوصاً نر کی آواز تو ایک میل سے بھی زیادہ فاصلے پر سنائی دیتی ہے"۔

یہ جماعت تیتر (آرگس) سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن ققنس کی آواز بھی اس کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔

---

[1] Descent of Man, vol. II, P. 141.

میرے خیال میں "فینگ" سے نر اور "ہوانگ" سے مادہ اس لئے مراد لی جاتی ہے کہ اُن کی آواز فینگ اور "ہوانگ" سے میل کھاتی ہے۔ امریکا کا مشہور عالم علم طیور لکھتا ہے کہ "ملایا میں تیتر کی آواز "کوآن" اور "کوانگ" سمجھی جاتی ہے۔ سکائی کے وحشی "لواک"، سیامی "کی اِک" اور سماٹرا کے دیسی باشندے "کوئی ویو" یا "کوآؤ" ترجمہ کرتے ہیں۔ اس لئے اُن ممالک میں اس پرند کا یہی نام پڑگیا ہے۔" [۱]

جب چین کے "ققنس" اور تیتر کی تحقیق ہو چکی تو "ققنس" کی ہستی سے انکار کرتے نہیں بنتی اور جو شبہات اُس کے وجود کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں وہ وہم باطل ہیں۔

تیتر کا شکار بندوق سے بڑی مشکل سے کھیلا جاتا ہے۔ پھر "ققنس" کا تو کیا کہنا۔ وہ ہمیشہ آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے اور اُسے دُور سے بھی ایک نظر دیکھ لینا محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں صرف چار ہی ایسے عجائب خانے ہیں جن میں اُس کے ڈھانچے ملتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر بیبی لکھتے ہیں۔ "اس قسم کے پرندے سب سے زیادہ پوشیدہ رہتے ہیں۔ ہم اُن کے آس پاس رہتے ہیں، اُن کی آوازیں سنتے ہیں اور اُن کی رقص گاہوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوتے ہیں لیکن انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ راتوں کو اکثر اُن کی آوازیں ہمارے کانوں میں آتی رہتی ہیں۔ جس سے اہلِ چین کے خیالی اور فرضی "ققنس" کی اصلیت و واقعیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔" [۲]

اس پرند کی ظاہری شکل و صورت اور اُس کے خصائص کا اندازہ کرکے ایک محقق اُسے تلاش کرسکتا ہے۔

چینی ادبیات میں "سفید فینگ" اور "سفید لُواں" کا ذکر کئی بار ملتا ہے۔

چین میں تیتر کا نظر آجانا نیک شگون اور سعادت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے ظاہر ہونے کو امن و امان اور کسی بڑے پارسا کے پیدا ہونے کی نوید سمجھا جاتا ہے اور یہ عقیدہ اب تک اہل جاپان کے دلوں میں راسخ ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ سفید تیتر شہنشاہ "ٹینجی"، "ٹیمو" اور "شوٹو" کو ہدیۃً پیش کئے گئے تھے۔ [۳]

میں نہیں جانتا کہ مشرقی مصنفین نے "ققنس" اور "لوآں" کے متعلق دادِ تحقیق دی ہے یا نہیں لیکن یورپ میں اُس کی باقاعدہ تحقیق و تدقیق شروع ہے۔ اے نیوٹن سابق پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی جو ممتاز عالم علم طیور تھے [جا]مع العلوم "توشوچی چنگ" میں لکھتے ہیں کہ "فینگ" کی تصویر صرف وہی مصور بنا سکے گا جس نے مور کو دیکھا ہو۔ [...]ک کی وضع قطع بہت کچھ تیتر سے ملتی جلتی ہے [۴]

---

[۱] A monograph of the Pheasants By William Beebe. (Vol. iii, P. 118)

[۲] A monograph of The Pheasant (Vol, iv, P. lxxxi)

[۳] Tori, Vol, ii, No, 9, P, 248. [۴] Giles, Adversaria Sinica, (Vol. I. P. P. 9. 10)

لاآرگس) کے متعلق مجھے پروفیسر نیوٹن سے کلی اتفاق ہے۔ لیکن مجھے اس بات سے قطعًا اتفاق نہیں ہے کہ "ققنس" مور کو دیکھ کر پہچانا جا سکتا ہے۔ میرے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

"گینگ" کے لغوی معنی سوراخ کے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کی دُم پر آنکھوں جیسے نشان ہوتے ہیں۔ یہ خاصیت "ققنس" کے کسی قدیم نام کے ساتھ بیان نہیں کی گئی۔

چینی اور جاپانی زبان میں بعض ایسی اصطلاحیں بھی موجود ہیں۔ جن میں لفظ "فینگ" آتا ہے۔ مثلاً
(۱) "ققنس" کے سر کی سی بط (کلغی دار بط)۔ اُس کی کلغی پیچھے کی طرف مڑی رہتی ہے۔ لیکن مور سے بالکل نہیں ملتی۔ مور کا تاج عمومًا اوپر کو اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔
(۲) "ققنس" کی دم کی مانند کھجور کا درخت۔
(۳) "ققنس" کی دم کی سی سنہری مچھلی۔

ان میں "فینگ" کا استعمال مور کے لئے کہیں نہیں کیا گیا۔ جو دُم اور کلغی کے لحاظ سے اُن پرندوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

آخر میں میری تجویز ہے کہ چین کے اس خیالی پرند کو "ققنس" کہنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس بات کا کہیں ثبوت ملتا ہے کہ یہ مرغِ آتش نفس خود ہی جل بجھ کر ختم ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پرند کو اپنی آواز کی مناسبت سے "ہُو اُو" کہا جائے تو دوسرے ناموں سے کہیں زیادہ موزوں ہوگا۔

صادق ایوبی

خدایا از تو زاہد حُورے طلبد قصورش بیں
بہ جنت می گریزد از سر کوئیت شعورش بیں
بہ ایں زہد و بہ ایں تقویٰ بہ ایں سالوسِ خود، مارا
ز رحمت دور می داند خداوندا شعورش بیں

سرمد

غزل

دلِ حزیں سے خلش کاریٔ ستم نہ گئی! ابھی تک، اُن کی نگاہوں کی خوئے رم نہ گئی!!
ملی، نہ سعیِ برہمن سے زاہدوں کی مراد چراغِ دیر سے تاریکیٔ حرم نہ گئی!
ہنوز عشق سے اندازِ بے کسی نہ چھٹا! ہنوز حسن سے رنگینیٔ ستم نہ گئی!
حرم میں حضرتِ زاہد نے لاکھ سر مارا جبیں سے تیرگیٔ سجدہ صنم نہ گئی!
بتوں کو نکلے ہوئے مدتیں ہوئیں لیکن ہنوز فطرتِ بُت سازیٔ حرم نہ گئی!
مزاجِ حسن سے، بے باکیٔ ستم نہ مٹی دماغِ عشق سے، افسردگیٔ غم نہ گئی
طلوعِ صبحِ حقیقت ہے، ذرہ ذرہ مگر ابھی کشاکشِ بت خانہ و حرم نہ گئی!

وہ میری شوخ نگاری پہ لکھتے ہیں اختر
ابھی تک، آپ کی گستاخیٔ قلم نہ گئی!؟

اختر شیرانی

غزل

قصّہ ہائے سوزشِ غم درجِ عنواں ہی رہے دل میں جو تھے چند قطرے زیبِ مژگاں ہی رہے
شمع پر معصوم پروانوں کا گرنا ہائے ہائے یہ گرفتارِ فریبِ عہد و پیماں ہی رہے
تو ہی بتلا دے کریں اب جستجو تیری کہاں عمر بھر ہم ڈھونڈتے اپنی رگِ جاں ہی رہے
جیب و دامن کی نہ لی وحشت میں تم نے کچھ خبر وائے ناکامی کہ مصروفِ گریباں ہی رہے
گھر میں مجبورِ سلاسل آبلہ پا دشت میں ہم گرفتارِ جنونِ فتنہ ساماں ہی رہے
وائے حسرت جل گئے سب نونہالانِ امید داغہائے سوزِ الفت دل میں پنہاں ہی رہے

ہو گیا اپنا چمن افسوس تاراجِ خزاں
دل کے ارماں اے رسا بس دل کے ارماں ہی رہے

رسا

وقت کے بیش قیمت لمحے

کاروباری لوگ اپنے مال کی ساخت پرداخت اور فروخت کو حتی الامکان موثر بنانے میں، تجارت کو مستحکم کرنے اور اس کو فروغ دینے کے لئے طرح طرح کے طریقے سوچتے ہیں، اور غیر ضروری محنت اور غیر ضروری تفصیلات کے قطع کرنے میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر دیتے ہیں لیکن کتنے کم ہیں وہ لوگ جو اپنی خانگی زندگی میں وقت کو موثر بنانے کے لئے اپنی توجہ خرچ کرتے ہیں۔ اور بیش قیمت لمحے اور گراں بہا ساعتیں بچا لیتے ہیں۔

دنیا میں رہنے کے لئے جو فرصت تمہیں ملی ہے وہ اتنی زیادہ نہیں جتنی تم اسے سمجھ رہے ہو۔ اگر تم اپنی عمر کو ساٹھ سال بھی فرض کر لو تو اُن میں سے بیس سال تم بستر ہی میں صرف کر دیتے ہو۔ گویا تمہاری مختصر سی زندگی کے دو فرن سوتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

اُن بیس اور چار چوبیس گھنٹوں کو جو ہر روز تمہیں خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ گزر جاتے ہیں کسی نے تمہارے عرصۂ زندگی پر خوب پھیلایا ہے۔ اس ساٹھ برس کی مدت میں وہ سال بھی شامل ہیں جو بچپن اور لڑکپن میں گذرے۔

بیس سال نیند میں،
تین سال کھانے میں،
نو مہینے دسترخوان پر کھانے کے انتظار میں،
سترہ سال چھ مہینے کام میں،
سات سال چھ مہینے مسرت کے تعاقب میں۔
چھ سال تین مہینے سیر اور دوسری ورزشوں میں،
دو سال چھ مہینے بناؤ سنگار میں،
دو سال چھ مہینے بالکل کچھ نہ کرنے میں۔

ہر وقت گھڑی کی ٹک ٹک ہمیں یاد دلاتی رہتی ہے کہ وقت گزر رہا ہے اور ہم اپنی زندگی کا اس قدر حصہ اپنے پیچھے اپنی دسترس سے باہر چھوڑ آئے ہیں۔ گھڑی کے ہر کھٹکے کے ساتھ عمر کا ایک لمحہ ٹوٹ کر گرتا ہے اور دوبارہ اُس میں پیوست نہیں ہو سکتا۔ ہم اُسے پھر کبھی استعمال نہیں کر سکتے۔ ہم ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو گئے۔ ہر لمحہ اور ہر

گھڑی اور ہر روز اور ہر ہفتہ جسے ہم بلا استفادہ گزر جانے دیتے ہیں یا اس سے کامل فائدہ حاصل نہیں کرتے، انجام کار ہمارے خلاف ایک شاہد بنے گا۔ یہ زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی چیز کے ضائع کرنے کا الزام ہم پر لگائے گا۔ وہ قیمتی چیز جو درحقیقت خود زندگی ہے، کیونکہ وقت زندگی اور زندگی وقت ہے۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو اپنی عملی زندگی کے اوقات کو ازسرِنو ترتیب دے کر کم از کم ایک گھنٹہ بچا سکتے ہیں۔ ہم میں سے بہت ایسے ہیں جو زیادہ سوتے ہیں۔

یہ لازم نہیں ہے کہ چونکہ بیداری کے وقت ہماری آنکھیں خواب آلود ہوتی ہیں اس لئے ہمیں زیادہ نیند کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نو یا آٹھ گھنٹے بستر میں گزارتے ہیں، بلکہ اگر ہم اس وقت کا اکثر حصہ سوتے ہوئے بھی صرف کرتے ہیں تو اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر ہم ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ اس میں سے وضع کریں گے تو ہم بیمار ہو جائیں گے۔ اس تھوڑے وقت میں قدرتی طور پر ہم پہلے سے اچھی طرح سوئیں گے، کیونکہ گہری نیند ہی قابلِ لحاظ ہے! بچوں کے سوائے سب کے لئے سات گھنٹے کی گہری نیند کافی ہے۔ اور مجھے اس میں شک ہے کہ نوجوانوں کو اس سے زیادہ نیند کی ضرورت ہے۔ اگر وہ لوگ جن کا جسم مضبوط ہے اور جن کی صحت اچھی ہے سات گھنٹے سوئیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی نیند پوری کرلی۔

سوچو کہ کسی شخص کے لئے اپنی عملی زندگی کے زمانے میں ایک گھنٹہ روزانہ بچا لینے کے کیا معنی ہونگے! اُن کی زندگی ان زریں ساعتوں کی دولت سے مالا مال ہو جائے گی!

میں نے لوگوں کو اکثر یہ شکایت کرتے سنا ہے کہ اُنہیں مطالعہ کے لئے فرصت نہیں ملتی اور اُن کا تمام وقت کام کاج اور میل ملاقات میں صرف ہو جاتا ہے۔ وہ اس معاملہ میں متاسف معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اس دماغی کاہلی آورستی کو جو اُن پر مستولی ہو چکی ہے زیر کرنے کی جرات اور حوصلہ نہیں رکھتے سچ یہ ہے کہ اگر اُن لوگوں کو موجودہ فرصت سے دہ چند فرصت بھی میسر آجائے تب بھی انہیں پڑھنے یا کسی اور قسم کی ترقی کرنے کے لئے وقت نہیں ملے گا۔ اگر ہمیں کسی بات سے حقیقی دلچسپی ہے تو یاد رکھو کہ اُس کے لئے ہمیں وقت بھی مل جائے گا۔ کیا ہمیں ہمیشہ اُس کام کے لئے وقت نہیں مل جاتا جس کو ہمارا دل چاہتا ہے؟ کیا تم مجھے کوئی ایسا نوجوان دکھا سکتے ہو جسے دن رات کسی چیز کی لگن لگی رہے اور پھر اُس کے لئے اُسے وقت نہ ملے؟

کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ پندرہ منٹ روزانہ میں جو چوبیس گھنٹوں کی ایک ادنیٰ سی کسر ہے تم کیا کیا کچھ کر سکتے ہو؟ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ ادبیات کا کتنا علم تم اپنے دماغ میں جمع کر سکتے تھے؟ تاریخ، سیاسیات اور ایسے کتنے ہی علوم کو عبور حاصل کر سکتے تھے اگر تم صرف اِن انقلاب پرور لمحات کو کام میں لاتے۔

ہارورڈ کے سابق صدر ایلیٹ کا قول ہے کہ اچھی قسم کے ادبیات کا ہر روز پندرہ منٹ تک بہ غور مطالعہ کیا جائے تو چار سال کے عرصہ میں ایک شخص عمدہ ادیب بن سکتا ہے اور اس میں وسعت قلب اور دقت نظر پیدا ہو سکتی ہے۔
اب اگر پندرہ منٹ روزانہ سے انسان اتنی ترقی کر سکتا ہے تو خیال کرو کہ ساٹھ منٹ کے امکانات کیا ہونگے؟ ایک گھنٹہ روزانہ کام کر کے تو وہ اپنی قابلیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا، اور علم کے موتیوں سے اپنی زندگی کا دامن بھر کر مالا مال ہو جائے گا۔

کیا تمہیں علم ہے کہ ایک گھنٹہ روزانہ کام کرنے سے تھوڑے ہی عرصہ میں تم کئی ایک زبانوں کے ماہر بن سکتے ہو؟ کیا تم جانتے ہو کہ روزانہ ایک گھنٹہ صرف کرنے سے تم معمولی زندگی سے ایک بہت بلند زندگی حاصل کر سکتے ہو؟
تم سمجھتے ہو گے کہ تم غریب ہو اور تمہیں کوئی موقع حاصل نہیں لیکن اگر تم جانتے کہ تمہارے قلب کے اندر کتنے زر و جواہر جمع ہیں اور تمہارے فارغ اوقات میں کتنی دولت پوشیدہ ہے تو تم حیران رہ جاتے ۔آہ کاش کہ میں نوجوانوں کے دلوں پر نقش کر سکتا کہ غریب سے غریب لڑکے اور غریب سے غریب لڑکی کے لئے اُس کے فارغ اوقات میں عظیم سے عظیم امکانات موجود ہیں!

بہت کم لوگوں کو اندازہ ہے کہ ترقی کے لئے اُن کے پاس درحقیقت کتنا وقت موجود ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہمیں کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لئے یا ترقی کے کسی اور طریقے کو اختیار کرنے کے لئے وقت نہیں ملتا۔ واقعی فارغ اوقات کی اصلیت سے ناواقف ہیں۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ کتنا وقت وہ بے مصرف باتوں بے حاصل کاموں اور بے فائدہ خیالوں میں گزار دیتے ہیں۔ میرے دوستو، خیال تو کرو کہ اگر تمہاری جگہ لنکن ہوتا تو وہ ان لمحات سے کتنا کام لیتا جنہیں تم اکارت کھو دیتے ہو۔ اور تمہاری یہ عادت ایک ایسی عادت ہے جو تمہاری تمام زندگی کو بداخلاق بنا دے گی۔

جب نوجوان میرے پاس اس معاملہ میں مشورہ لینے آتے ہیں کہ ہم کیونکر اپنی ذات سے بہتر سے بہتر کام لے سکتے ہیں تو میں ہمیشہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ اپنے وقت کی کس حد تک قدر کرتے ہیں۔ اگر میں دیکھتا ہوں کہ وہ گزرتے ہوئے وقت سے ہر موقع کو جذب کر لینے کے لئے بے قرار ہیں تو میں جان لیتا ہوں کہ اُن میں کامیاب ہونے کی اور قابلیتیں بھی موجود ہیں، کیونکہ یہ صفت کسی شخص میں اکیلی نہیں پائی جاتی۔ کامیابی کی صفات ہمیشہ یکجا ملتی ہیں۔ وہ بے کاروں اور کاہلوں میں نہیں ملتیں، اُن میں جن کا کوئی مقصد اور کوئی مطمح نظر نہیں ہوتا۔

مارڈن　　　　　　　　منصور احمد

محفلِ ادب

امید

۱

فضائے اثیر کی خاموش اور پُر سکون دنیا ہماری ہنگاموں سے معمور اور پر شور دنیا سے بالکل ہی مختلف تھی۔ اس عجیب و غریب دنیا میں صرف ایک عورت آباد تھی۔ اور ہماری دنیا کے کروڑہا دلوں پر اُس کی حکومت تھی۔ اُس کی عمر کا صحیح اندازہ کون لگا سکتا تھا جب سے دنیا پیدا ہوئی وہ اسی طرح موجود تھی۔

ہاں اس کا وجود ہمیشہ سے تھا۔ دنیا اُس کے بغیر قائم نہ رہ سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے نوجوان تھی۔ اور آخر تک ویسی ہی ہی۔ اُس کا نام "امید" تھا۔ اور "امید" کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتی۔

اُس کے بال لمبے اور سنہرے تھے اور اُس کا نور پاش چہرہ حسین اور روشن تھا اگر اُسے کوئی چاند کے بالمقابل بیٹھے ہوئے دیکھ لیتا تو شاید وہ کہہ سکتا کہ چاند اُس کے چہرے سے کسبِ نور کرتا ہے اُس کی زندگی میں لاکھوں قسم کے انقلاب رونما ہوئے لیکن ہمیشہ اُس کے چہرے سے ایک بچے کی سی بے لاگ معصومیت ہویدا رہی۔ کیونکہ وہ امید تھی اور "امید" کو دنیا کی کثافتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہماری دنیا کے ایک ایک ذرہ میں دل موجود تھا۔ اور ان سب پر اُس کی حکومت تھی۔ وہ ہر دل میں دوسرے سے بڑھ کر مسرور نظر آتی تھی۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ خود اُس کا دل بھی ویسا ہی مسرور تھا؟ کیا اُسے وہ شے جسے حقیقی معنوں میں مسرت کہا جا سکتا ہے حاصل تھی؟

اُس کا مسکن نور کے بنے ہوئے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ وہ اکثر اپنا چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپائے رکھتی تھی۔ اُس کے بال اُس کے شانوں پر بکھرے رہتے تھے اُس کے پاؤں کے قریب ایک چشمہ بہتا تھا جس کا پانی جلتے ہوئے آنسوؤں کی طرح گرم تھا۔

(۲)

شاید قیامت بہت ہی نزدیک تھی۔ کائنات کا آخری دن قریب آ رہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی، ایک ملکہ کے انداز میں آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتی ہوئی۔ آج اُس کا چہرہ محزون

اور افسردہ تھا۔ اُس کے اعضا کسی ناتمام محنت سے تھکے ہوئے اور سست معلوم ہوتے تھے۔ اُس نے اپنا رباب ہاتھوں میں اٹھایا اور پھر اُسے دُور پتھروں پر پھینک دیا جب سے دنیا پیدا ہوئی یہ رباب دنیا تک امید کے نغمے پہنچاتا تھا لیکن اب وہ اُسے بے کار چیز سمجھ کر چھوڑ رہی تھی۔ اپنی جائے قیام پر ایک وداعی نگاہ ڈال کر آہستہ آہستہ وہ ہماری دنیا کی طرف نیچے کو اتر آئی۔ اُس کا سفید لباس موتی کی طرح دمکتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اُس کی سیاہ پلکیں آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔

سمندر کے کنارے تک پہنچ کر وہ رُک گئی اُس نے کہا میں دنیا میں امید بن کر آئی تھی لیکن اپنے ہر مقصد سے ہمیشہ کوسوں دور رہی۔ امید کبھی بر نہیں آئی۔ میں ناکام ہوں ہمیشہ سے ناکام۔ میرا وجود دنیا میں صرف ایک سراب کی مانند رہا۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں کیا ہوں اور کون میرے ہر مقصد کو ساتھ ساتھ مٹائے جا رہا ہے۔ مجھے شک ہے کہ میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ کیا میرا کام صرف لوگوں کو فریب میں مبتلا رکھنا ہی تھا۔ اب میں اس پُر اسرار زندگی سے اکتا گئی ہوں۔ میں خود اپنی ہستی سے بھی بے خبر ہوں میں دنیا میں کسی سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکتی۔ میں جو ہر دل کی مونس و ہم راز ہوں۔ میرا کوئی ہم راز نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ میری روح بھی میرے جسم سے بیگانہ ہے۔ اگر میں اپنے دل کی بات کسی ایک متنفس سے بھی کہہ دیتی تو یہ دنیا کبھی کی اجڑ کر رہ گئی ہوتی۔ اُف یہ تنہا زندگی، یہ فریب کی زندگی۔ میں اس سے اکتا گئی ہوں۔"

اُس نے اپنا سر اوپر کو اُٹھایا اور کائنات پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ اب بھی لوگ امید کے فریب میں مبتلا تھے۔ بہت دور ایک بوڑھا اپنے ننھے بچے پر جھکا ہُوا کھڑا تھا۔ اُس کے دل میں امید تھی " میرا بچہ بڑا ہوگا۔ اور میرا خدمت گذار ہوگا۔" یہ امید ہی تھی جو اُسے یہ سمجھنے کا موقع نہ دے سکتی تھی کہ بچے کے بڑا ہونے تک خود وہ دنیا میں موجود نہیں ہوگا۔ کئی لوگ جن کی تقدیر میں عمر بھر کے لئے ناکامی لکھی جا چکی تھی امید کے فریب میں مطمئن نظر آتے تھے۔

سورج کل پھر اسی آب و تاب سے چمکنے کی امید پر اپنی آرام گاہ میں اطمینان کی نیند سو یا پڑا تھا۔ اور چودھویں رات کے جگمگاتے ہوئے چاند کے دل میں بھی ایک امید تھی۔ کل سے اُس کا زوال شروع ہوگا، لیکن آخر ایک دن پھر وہ اسی طرح آسمان پر جلوہ گر ہوگا۔ ستارے اپنے دل کی کسی پُر کیف امید سے خوش ہو کر جھلملا رہے تھے۔

ننھے ننھے پھول گھاس میں سے سر نکال نکال کر جھانک رہے تھے۔ شاید اپنے انجام سے بے خبر انہیں ایک دائمی زندگی کی امید تھی، اور پانی کے کنارے اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے ایک دن بلند ہونے کی امید پر خوش ہو ہو کر جھومتے تھے۔ خاک کے ایک ایک حقیر ذرہ کے دل میں بھی امید جلوہ گر تھی۔

اُس نے کہا " آج یہ فریب ختم ہوتا ہے"۔ وہ پانی میں اتر پڑی اور اب اُس کے پاؤں پانی میں ڈوب چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ آگے کی طرف گہرے پانی میں جا رہی تھی۔ پانی اُس کی گردن کو چھو رہا تھا جب اُس نے مڑ کر دنیا کو الوداع کہی۔

اب تک دنیا نا امید نہ ہوئی تھی۔ آخری بار اُس نے تبسم کیا۔ وہ مسکرانے لگی۔ سمندر کی تیز رو موجوں میں دفعۃً موتی چمک اُٹھے ایک تند و تیز لہر اٹھی اور امید نے اپنے خوبصورت چہرے کو ہمیشہ کے لئے پانی میں چھپا لیا لیکن ابھی اُس کے بال پانی کی سطح پر چمک رہے تھے۔

موت آگے بڑھی اور اُس نے امید کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ سمندر کا پانی دفعۃً رک گیا۔ اب اُس کے دل کوئی امید نہ تھی دنیا صرف امید سے قائم تھی۔

ارض و سما نا امید ہو ہو کر اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ چاند، سورج، اور ستارے اب کس امید سے اپنی جگہ پر قائم رہتے۔

اور وہ لوگ جو خدا جانے کس امید پر قبروں میں گہری نیند پڑے سوتے تھے اب اُٹھ اُٹھ کر باہر آرہے تھے۔

امید مرچکی تھی اور صبحِ قیامت نمودار ہو رہی تھی

"نور جہاں"

اجنبی

صنمِ فرنگ، قمر جبیں، بتِ سیم رنگ، غضب حسیں
وہ عذار نازک و شرمگیں کہ رقیب ساغرِ آتشیں

وہ ہوا میں کاکُلِ عصفریں کہ شہابِ ثاقبِ شب رواں
ورقاتِ غنچہ گلاب گوں، دو لبِ گداز پُر از فسوں

مژہ درازِ کج و نگوں میں نہاں دو دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں

تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ، نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسلِ الم و بلا
مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں، تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم) (بحرِ سفید، جہاز شہر کلکتہ ۱۹۱۴ء)

"اردو"

پیغمبر

اُس دم سے جب کہ منصفِ ازلی نے میرے ضمیر کو روشن کیا اور اپنا پیغام پہنچانے کا حکم دیا مجھے ہر شخص کی [illegible] ارادے لکھے ہوئے نظر آنے لگے۔ (انسانیت پر سے یہ دھبہ مٹانے کے لئے) میں

نے محبت اور حق پرستی کی پاک تعلیم دینا شروع کی جس کے جواب میں میرے عزیزوں اور دوستوں نے سب سے پہلے مجھ پر پتھر مارے۔ میں نے اپنی قوم کے ماتم میں سر پر خاک ڈالی اور ننگے ہاتھ ننگے بدن شہر سے نکل بھاگا۔ اب میں ویرانوں میں بسر کرتا ہوں اور اس غربت میں میرا خدا کسی نہ کسی طرح مجھے روزی پہنچاتا رہتا ہے۔ میرے دل پر خدا کے احکام کا نقش ہے، چڑیاں اور جانور سب میری غزلوں پر داد کرتے ہیں، اور راتوں کو ستارے میری آواز بن کر جگمگاتے ہیں۔ لیکن جب کبھی شہر میں سر جھکائے قدم بڑھائے گذرتا ہوں تو بوڑھے تمام بچوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں اور خود ستائی سے مسکراتے ہوئے کہتے ہیں "دیکھو بچو تمہارے لئے یہ ایک مثال ہے! یہ آدمی مغرور تھا۔ ہماری زندگی اسے نہیں بھائی ہمارے ساتھ رہنا گوارا نہ ہوا۔ بیوقوف یہ ہمیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس کی زبان سے خدا خود بول رہا ہے۔ دیکھو بچو، اسے اچھی طرح دیکھو! دیکھو یہ کیسا غمگین دبلا پتلا، مایوسی سے پیلا پڑ گیا ہے، دیکھو کیسا پھٹے حال کا فقیر ہو کر رہ گیا ہے۔ کیسی حقارت سے سب اسے دیکھتے ہیں۔

لیرمنتوف ——— "جامعہ"

محاسبۂ نفس

بڈھا سونے سے پہلے دار المطالعہ کے ننگے فرش پر ٹہل رہا ہے۔ جب تک اپنی ذات پر آخری محاکمہ نہ کرلے اور جب تک گذشتہ چوبیس گھنٹوں میں سے ہر ایک گھنٹے کا سختی سے جائزہ نہ لے لے اُس وقت تک نیند کہاں۔ روزنامچہ میز پر کھلا پڑا ہے اور اس کا سفید صفحہ چشم ضمیر کی طرح اُسے گھور رہا ہے۔ وہ دن کے ایک ایک لمحے پر تنقیدی نگاہ ڈالتا اور ایک ایک گھڑی کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ اُسے غربت زدہ کسان عورت یاد آتی ہے۔ اور افسوس ہوتا ہے کہ میں ایک حقیر درہم دینے کے سوا اُس کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ اُسے یاد آتا ہے کہ ہیں ایک فقیر کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اُسے اُن درشت خیالات کی یاد ستاتی ہے جو اس کے دل میں بیوی کے متعلق پیدا ہوئے وہ اپنی تمام لغزشیں اور فروگذاشتیں بے کم و کاست روزنامچہ میں درج کرتا ہے اور اس دن کے اندراج کو یوں ختم کرتا ہے۔

"پھر پورا نہ اُترا۔ روح پھر مفلوج ہی رہی۔ کافی نیکی نہ ہو سکی۔ پھر ثابت ہوا کہ عام عالم انسانیت کی بجائے گرد و پیش کے لوگوں کے ساتھ محبت کرنے کا مشکل کام مجھے ابھی آیا ہی نہیں۔

پھر وہ اگلے روز کی تاریخ اور اُس کے ساتھ تین پُراسرار حروف "اگر زندہ رہا" درج کرتا ہے۔

کام ختم ہو گیا۔ دن کا خاتمہ ہوا۔ جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ سونے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اپنے بھاری بوٹ سے پاؤں نکال لیتا ہے۔ کپڑے اتار کر بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔ اب اُسے موت یاد آتی ہے۔ خیالات اُس کے دماغ کی

فضا میں گرمِ پرواز ہیں اور آہستہ آہستہ یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے جنگلوں کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں تیتریاں۔
نیند اُس کے دل کے دروازے پر منڈلا رہی ہے۔

"ہیں! یہ کیا؟" وہ یکلخت اُٹھ بیٹھتا ہے۔ کیا یہ پاؤں کی آواز نہ تھی؟

ہاں ساتھ والے کمرہ میں ایک قدم۔ ہلکا دزدیدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پھرتی سے مگر بے آہٹ بستر سے کودتا ہے اور اپنی شعلہ بار آنکھ روزنِ در سے لگا دیتا ہے۔

ہاں ایک روشنی سی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی چراغ بکف کمرے میں گھسا ہوا ہے۔ اور میز کی تلاشی لے رہا ہے روزنامچہ کی ورق گردانی میں مصروف ہے اور اُسکی روح کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کر رہا ہے۔

یہ اُس کی بیوی صوفیا انڈریونا ہے۔ مشتاق و مضطرب و بے قرار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر طرف چشمِ تجسس اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جانے اور اُس کے نہاں خانۂ دل کے حریمِ قدس تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہے۔

وہ غصہ سے لرزہ براندام ہے۔ ایک حرکتِ اضطراری کے ساتھ وہ زنجیرِ در کو پکڑتا ہے۔ تاکہ یکلخت دروازہ کھولے اور بیوی کی گت بنائے۔ مگر آخری لمحہ میں سنبھل جاتا ہے کہ "شاید یہ بھی امتحان ہی ہو" اور چپ چاپ دبے پاؤں بستر کی طرف لوٹتا ہے مگر نیند کہاں!

ٹالسٹائی، اپنے زمانہ کا سب سے بڑا، سب سے قابل شخص یہاں لیٹا ہوا ہے۔ اُس کا گھر اُس کا پردہ در، اُس کا دل شکوک و شبہات کی روح فرسا کشمکش میں مبتلا، اور اُس کی روح ناقابلِ بیان تنہائی میں غرق ہے +

"مخزن"

شاعری کا مستقبل

"شاعری کا مستقبل نہایت وسیع ہے اس لئے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائیگا۔ ہمیں اس امر کا احساس ہوتا جائیگا کہ ہماری زندگی کے لئے صرف ایک سہارا باقی ہے اور وہ شاعری ہے۔ ایسی شاعری جو زندگی کے اعلیٰ اور برتر مقاصد کے لائق ہو۔ دنیا کے سبھی عقائد متزلزل ہوئے ہیں، کونسا اصول تھا جس پر اعتراض نہیں کیا گیا اور کونسی روایت ہے جو بالآخر بے بنیاد ثابت نہیں ہوئی؟ مذہب نے بھی نشو و نما حاصل کیا ہے تو چند حقائق کی بدولت۔ ہمارے تمام مذہبی جذبات انہیں حقائق سے وابستہ ہیں لیکن یہی حقائق ہیں جو اب ناپائیدار ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ صرف شاعری ہے جس کو سوائے خیال کے اور کسی چیز سے بحث نہیں"

"صوفی"

تبصرہ

دنیا کا محسن - جناب میرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب قادیانی کی وہ طویل وبسیط تقریر ہے جو انہوں نے ۱۷ جون ۱۹۲۸ء کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت، بے نظیر قربانیوں اور عدیم المثال احسانات پر ایک مجمعِ عام میں فرمائی۔ یہ جلسہ اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ ملک کے تمام مذاہب کے پیروؤں تک یہ پیغام پہنچایا جائے کہ وہ دنیا کے تمام ادیان کے بزرگوں اور ہادیوں کا ادب واحترام کریں۔ رسولِ کریم صلعم کی ذاتِ گرامی کے متعلق مخالفین نے جو طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کر رکھی ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے یکسر دور ہو جاتی ہیں۔ ہماری رائے میں اس کی بکثرت اشاعت ہونی چاہیئے۔ حجم ۱۱۱ صفحات اور قیمت چار آنے ہے۔ بک ڈپو دار الاشاعت قادیان سے طلب فرمائیے۔

جین دھرم - مصنفہ مہرشی شوبرت لال جی۔ جین مت دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ہے۔ اور بہ قولِ مصنف اخلاق، پاکیزگی، لطافت اور روحانیت کے نقطۂ خیال سے انسانی کمال کی مجسمہ تصویر بن جانا جینی ہونا ہے۔ خدا کی نسبت جینیوں کا خیال ہے کہ وہ آفریدگارِ عالم نہیں، بلکہ انسان ہی مکمل ہو کر خدا کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کتاب میں جین دھرم کی تاریخ، فلسفہ، عقاید اور بزرگوں کے حالات درج ہیں۔ مذاہب کے ساتھ شغف رکھنے والوں کے لئے دلچسپ کتاب ہے۔ حجم ۷۲ صفحات اور قیمت چار آنے ہے۔ پتہ:- سکرٹری جین منڈل دھلی۔

طفلِ اشک - اِس نام سے مولوی محمد محسن صاحب صدیقی، بی، اے علیگ نے ایک نہایت عمدہ انگریزی ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ افسانہ میں یورپ کی شریفانہ اور کامیاب زندگی کا نمونہ پیش کیا گیا ہے اور جنابِ مترجم نے یہ مقصد پیش نظر رکھا ہے کہ وہ لوگ جو یورپ کی تقلید اندھا دھند کر رہے ہیں وہاں کی اچھی باتوں کی بھی تقلید کریں۔ اور اپنے عادات اور اخلاق کی اصلاح کریں۔ زبان صاف اور شستہ ہے اور اندازِ تحریر دلچسپ ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مطبع رہبر دکن، افضل گنج، حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

سوشیلا - مصنفہ خان قدرت اللہ خاں صاحب دیوانہ بریلوی محلہ کرنیل گنج کانپور۔ ۸۴ صفحے کا ایک دلچسپ اور سبق آموز قصہ ہے جس میں اصول تحفظ زچہ وبچہ پر ضروری باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ تمام اصول، علم طب کی مسلم الثبوت کتابوں اور جدید ترین تحقیقات سے اخذ کئے گئے ہیں اور اُن کو ایسے سادہ پیرائے میں لکھا ہے کہ عورتیں بڑی آسانی سے استفادہ کر سکیں گی اور شوق سے پڑھیں گی۔ ہمارے خیال میں حفظانِ صحت کی انجمنوں کو ایسی کتابیں خرید کر مفت تقسیم کرنی چاہئیں۔ قیمت پانچ آنے مقرر ہے۔ جنابِ مصنف سے ملتی ہے۔

اُردو زبان میں اپنے رنگ کی بہترین کتابیں

ناٹک ساگر - زبانِ اردو میں تاریخ ڈراما کی پہلی اور ایک ہی کتاب جس میں دنیا بھر کے ڈراما نگاروں اور ایکٹروں کا سوانح حیات، جملہ ممالک عالم سٹیج کے عروج و زوال اور فن ڈراما کی ارتقائی کیفیت بیان کر کے ڈراما اور سٹیج کے محاسن و معائب آئینہ کئے گئے ہیں - اس کتاب کے صلہ میں پنجاب یونیورسٹی نے ساڑھے سات سو روپے کی گرانقدر رقم مصنفین کو عطا کی، ہندوستان کے بے شمار اردو اور انگریزی رسائل و جرائد نے نہایت شاندار ریویو کئے ہیں - جنہوں نے بجائے خود ایک کتاب کی صورت اختیار کر لی - کتابت، طباعت و کاغذ دیدہ زیب، حجم بڑی تقطیع کے قریباً پانچ سو صفحات -
قیمت مجلد ... ۴ر بلا جلد ... ۳ر

ناٹک ساگر کے دو باب - آزِ زبانِ اردو کا نصاب قیمت فی جلد عہ ر

موجودہ لندن کے اسرار - لندن کا حیرت انگیز و سنسنی پیدا کرنے والی وارداتوں کا آئینہ ایک فلسفیانہ مضمون میں کہانی کی سی دلآویزی، ایک دفعہ شروع کر کے بغیر ختم کرنے کے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا لندن کی اندرونی زندگی کی مکمل تصویر اس میں عیار یہاں آپ دیکھیں گے جو طلسم ہوشربا کے عیاروں کو بھی مات کر دیں گی، قیمت مجلد عہر

ڈراما بچھڑے دل - فرانس کے زندہ جاوید ڈراما نگار مولئیر کے ظرافت آفرین شاہکار کا ترجمہ - ایک مرتبہ مطالعہ کیجئے - اور اگر ہنسی آپ کا پیچھا چھوڑ دے تو ہمارا ذمہ قیمت ۸ ر

ڈراما تین ٹوپیاں - اگر آپ نے فسانہ آزاد کے خوجی کے خاندان کا نقشہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے - بہترین ظرافت، بہترین مصنف اور بہترین ترجمہ ... بی یونیورسٹی کے طلبا نے اس ڈراما کو نہایت کامیابی سے سٹیج کیا - قیمت ۸ ر

ڈراما فراق - جرمنی کے شہرہ آفاق ڈراما نگار شلر کے ایک نہایت کامیاب ڈراما کا دلآویز ترجمہ - اس تصنیف پر مصنف کو خود ناز ہے - اور یہ مختلف ممالک سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے - ایسی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی تحریر شاید ہی آپ نے ملاحظہ فرمائی ہو - قیمت ۸ ر

ڈراما شہر کی موت - ... کے پایہ دست ڈراما نگار ... کے ایک سنگلاخ ڈراما کا کامیاب ترجمہ - محبت ... کی ... انگیز تصویر

یہ تمام کتب ... کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں - ۲۵ سے زیادہ کتب کے خریداروں کو کمیشن

ملنے کا پتہ :- **محمود برادرس جموں، تاجران کتب جموں** (پنجاب)

شہنشاہ ہند غازی اورنگ زیب عالمگیر (رحمۃ اللہ علیہ)

کے ہاتھ کا لکھا ہوا

قرآن مجید

فوٹو لیکر اور بلاک بنوا کر چھپوایا گیا ہے

اس کا ایک ورق بطور نمونہ ذیل میں درج ہے

یہ نمونہ کچھ صحیح نہیں۔ قرآن مجید بلاک کے ذریعہ چھپا ہے اور یہ بلاک کا چربہ ہے جو لیتھو کے ذریعہ چھپا ہے

(بلاک کی چھپائی اور لیتھو کی چھپائی میں یہی اصل کا فرق ہوتا ہے)

پورے قرآن مجید کا حجم قریباً نو سو صفحے ہیں نہایت خوبصورت سنہری جلد بندھی ہوئی (اور)

ہدیہ پانچ روپے۔ علاوہ محصول

شہنشاہ غازی اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید نواب صاحب لنگروال کے کتب خانہ میں موجود ہے

وہاں سے حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے اسے مستعار لیکر اور بلاک بنوا کر چھپوایا

بہت بڑی اسلامی اور تاریخی یادگار ہے ہر مسلمان کے گھر میں یہ قرآن شریف ضرور رہنا چاہئے

آخری صفحہ پر شہنشاہ اورنگ زیب کے دستخط اور مہر اور سن کتابت بھی موجود ہے

ملنے کا پتہ: مینیجر رسالہ نظام المشائخ۔ کوچہ چیلان۔ دہلی

آیاتِ وجدانی

اب سے پہلے اردو زبان کی واجب الاحترام فلسفیانہ شاعری کا بہترین نمونہ
غالب کا دیوان سمجھا جاتا تھا مگر اب میرزا یگانہ لکھنوی کی آیات وجدانی نے
اس عقیدہ کو باطل کر دیا مصنف کی اس گراں قدر تصنیف نے ذہنیات و نفسیات
انسانی کے گوناگوں مرقعے حکیمانہ ذوق نظر قوت ابداعی و اختراعی اور
شاعرانہ آرٹ کے وہ مکمل نمونے پیش کئے ہیں جن کے سامنے منتقدین
کا کمال نقش اول ثابت ہوتا ہے۔ فلسفیانہ اور وجدانی شاعری کی ارتقا کا
بہترین مظہر آیاتِ وجدانی ہے قیمت مجلد

چراغ سخن میرزا صاحب کی ایک مشہور تصنیف ہے فن عروض و قوافی
پر ایسا جامع و مستند رسالہ اردو زبان میں موجود نہیں ہے
جن لوگوں کو شعر و سخن کا ذوق ہے انہیں اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے
قیمت عہ ملنے کا پتہ میرزا یگانہ لکھنوی عثمان آباد دکن

پردہ

مؤلفہ

ادیب بے ہمتا مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی مرحوم

اس کتاب میں مولانا نے شرعی پردہ کی نسبت مضامین نہایت
مدلل قرآن و حدیث و فقہ کے احکام کے موافق لکھے ہیں اور جو
عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں اُن کو دلانے کی نہایت پُر زور
کوشش کی ہے۔ قیمت عہر

المشتہر
حافظ ابوالحسن سیادات بکڈپو چھتہ لال میاں دہلی

سالانہ رعایتی اعلان

کوئی چیز منگواؤ ایک روپیہ آٹھ میں گھر بیٹھے چیز کا پارسل مل جائیگا

ا۔ **بجلی کا جیبی لیمپ** - یہ بجلی کا لیمپ معہ بیٹری اور بلب روانہ ہوگا۔ جس وقت جی چاہے روشنی کر لو یا بجھا دو بڑی کار آمد چیز ہے۔

۲۔ **بغیر کنجی والے تالے** یہ تالا بغیر کنجی کے کھولا جاتا ہے یہ وہی کھول سکتا ہے جو اس کے متعلق پوشیدہ حالات جانتا ہے۔ دوسرا نہیں۔

۳۔ **چار عدد طلسی سانپ کی ڈبیہ** - اس ڈبیہ میں سے ذرا سا ٹکڑا لے کر دیا سلائی لگا دیجئے۔ فوراً ہی کوڑیا سانپ کنڈلی مارے ہوئے

۴۔ **لڑکا ہوگا یا لڑکی** - یہ آلہ حاملہ عورت کے پیٹ پر رکھنے سے فوراً بتا دے گا۔ کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ بڑی کار آمد چیز ہے۔

۵۔ **آگ جلانے کی مشین** - جب اس مشین کو پتھر پر رگڑو گے تو آگ پیدا ہو کر روشنی ہو جائے گی۔

۶۔ **سگرٹ بنانے کی مشین** - یہ جس قدر چھوٹی ہے۔ اتنی ہی حیرت انگیز اور مفید ہے۔ ہر شخص گھر بیٹھے بٹھائے آسانی سے سگرٹ بنا سکتا
ہے ترکیب استعمال ہمراہ ارسال ہوگی +

۷۔ **سیفٹی ریزر معہ ایک درجن بلیڈ** - حجام کی ضرورت نہیں۔ خود بخود چہرہ کی حجامت بنالو۔ یہ جلد کو ہرگز نہیں کاٹتا۔ ایک عدد ضرور منگوائیے۔

۸۔ **وزن کرنیوالا طلسمی کانٹا** - اب ترازو باٹوں کے رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ نو ایجاد کانٹا نمبروں کے ذریعہ ٹھیک وزن بتا دے گا۔

۹۔ **ناخن کاٹنے کی مشین** - اس کے ذریعہ ہاتھوں، پاؤں کے ناخن بلا کسی تکلیف و اندیشے کے خود بخود کاٹ سکتا ہے۔

۱۰۔ **جیبی چھاپہ خانہ** - یہ چھاپہ خانہ قابلِ تعریف ہے اس سے لفافے اور ملاقاتی کارڈ اور مہریں وغیرہ جو دل چاہے چھاپ لیں۔ اس کا ہر گھر
میں ہونا ضروری ہے۔

۱۱۔ **مہ جبین حسینوں کے دلفریب فوٹو** جس میں حسن اور عشق اور محبت کے جانفزا انداز نہایت خوش اسلوبی سے دکھائے گئے ہیں
مختلف اقسام کے ایک درجن روانہ ہونگے۔

۱۲۔ **ٹوٹ کا سفری گلاس** - مسافری میں یہ سفری گلاس بڑی بھاری خدمت دیتا ہے۔ جب دل چاہے کھول کر پانی پی لیں اور پھر
کر ڈبیہ کی شکل میں جیب میں رکھ لیں ہر پینے والی چیز میں کام آسکتا ہے۔

۱۳۔ **اشٹ دھات کی انگوٹھی** - مختلف امراض اور چھوت کی بیماریاں کافور ہو جاتی ہیں اگر اسے انگلی میں پہن لیا جاوے تو کوئی بیماری پاس نہیں آ

۱۴۔ **کشیدہ کاڑھنے کی مشین** - یہ مشین وہی ہے جسکے ذریعے کپڑوں پر بیل بوٹے۔ ٹوپیاں گدیاں۔ آسن وغیرہ اور دیگر کار آمد چیزیں بناتی ہے۔
قیمت پر معہ محصول ڈاک ہرگز کہیں سے نہ ملے گی۔

۱۵۔ **دودھ ماپنے کا آلہ** - اگر آپ اصل دودھ کے بدلے پانی والا دودھ پیتے ہیں اور گوالا یا حلوائی آپ کو دھوکا دیتا ہے تو آپ اس آلہ
اپنے پاس رکھیں دودھ میں ڈالنے سے فوراً بتا دے گا کہ اس میں کس قدر پانی ہے ایک عدد خود منگوا کر آزمائش کریں

نوٹ - حضرات اوپر لکھی ہوئی چیزوں کی قیمت کسی حالت میں دو روپیہ تین روپیہ چار روپیہ سے کم نہیں ہے مگر ہم ۸؍ معہ محصول ڈاک
میں دے رہے ہیں۔ آرڈر جلد دیں۔ ورنہ سٹاک ختم ہو جائے گا۔

نوٹ - جو صاحب اوپر لکھی چیزوں کو ایک دم خرید فرما سکتے ہیں ان سے ۲۰ روپیہ معہ محصول ڈاک چارج کئے جاویں گے مگر اس حالت
میں پانچ روپیہ پیشگی ضرور آنے چاہئیں۔

دی امپیریل ناولٹی مارٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۷ لاہور (پنجاب)

۱ - "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے +

۲ - علمی و ادبی تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں +

۳ - دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴ - ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے +

۵ - خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے +

۶ - ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے، اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا +

۸ - جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے +

۹ - قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍ نمونہ ۶؍ +

۱۰ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے +

۱۱ - خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے +

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳ - لارنس روڈ لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۳

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگارِ علامۂ فصیحے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر - بشیر احمد - بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں - بی اے
منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۲ بابت ماہ نومبر ۱۹۲۸ء نمبر ۵

تصویر:- پرواز الفت

جہاں نما

جاپان میں تحریکِ خواتین

اب تک جہاں جہاں خواتین کی تحریکیں بارآور ہوئی ہیں اُن میں سے جاپان کی مثال ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ بنگ ایسٹ میں ایم میٹا نے خواتین کی اُن کامیابیوں کو گنایا ہے جو انہوں نے مختلف شعبوں میں حاصل کی ہیں:-

قانونی۔ خواتین ضابطۂ سندِ مختاری اور قانونِ فوجداری میں اس قسم کی ترمیم کرالینے میں پورے طور پر کامیاب ہوگئی ہیں جس کی رو سے آئندہ مختارِ عدالت کا عہدہ اُنہیں مل سکے گا۔ اور حفاظتِ عفت وعصمت جو اس سے قبل صرف عورتوں کے لئے ضروری تھی اب مردوں کے فرائض میں بھی داخل سمجھی جائے گی۔ اس ملک میں اگر عدالت کے سامنے اس قسم کا کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو صرف عورتوں کو مجرم گردانا جاتا تھا لیکن ڈائٹ کے گزشتہ اجلاس میں حکومت نے جو قانون منظور کیا ہے اُس کی رو سے مرد اور عورت دونوں کو جرم کی ایک جیسی سزا ملا کرے گی۔

سیاسی۔ خواتین ڈائٹ کی معرفت حکومت سے اپنی اُس عرضداشت کو منظور کرانے میں کامیاب ہوگئی ہیں جس کی رو سے مستقبلِ قریب میں انہیں شہریتِ عامہ کے حقوق حاصل ہو جائیں گے اور اُن کو ہر ایک سیاسی عضویت میں حصہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔

معاشری۔ ٹوکیو مسلن کمپنی نے کارکن لڑکیوں کی اس آزادی کو تسلیم کرلیا ہے کہ وہ جس وقت چاہیں کارخانہ سے باہر جاسکتی ہیں۔ اب تک وہ شرائطِ ملازمت کی پابندی میں ایک قیدی کی سی زندگی گزارتی رہی ہیں۔ عنقریب دوسرے کارخانوں میں بھی اس مثال کی تقلید کی جائے گی۔ بڑی بڑی جہاز ران کمپنیوں نے محسوس کرلیا ہے کہ عورتوں میں بھی کپتان بننے کی قابلیت موجود ہے۔ چنانچہ اس ملک میں پہلی خاتون کپتان مس سوشی کو کاٹا پاما مقرر ہوئی ہیں۔

تعلیمی۔ خواتین کی تحریک سے آخرکار حکومت کو ترغیب ہوئی ہے کہ وہ عورتوں کی اعلیٰ صنعتی تعلیم کے لئے پینتیس ہزار ین کے صرف سے ایک مدرسہ قائم کرے۔

ڈاکٹر یوشینو اور بعض دوسرے تعلیمِ نسواں کے حامیوں نے غیر سرکاری طور پر خواتین کے لئے ایک کالج کھول رکھا ہے جس میں لڑکیاں مدارسِ فوقانیہ سے سند لینے کے بعد تین سال تک معاشیات کی تعلیم حاصل کیا کریں گی۔ اسی طرح خواتین

کے لئے ایک بڑا تجارتی مدرسہ قائم ہے اور اب حکام کو آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ خواتین کو بھی فضیلت کی سندیں حاصل کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ خاتون پروفیسر کونوکو یوسوئی کو فضیلتِ طبیعیات کی سند مل بھی گئی ہے۔

سیاسیات اور پتلونیں

یہ عجیب بات ہے کہ جب لوگوں کے عقائد تبدیل ہوتے ہیں تو وہ اس کا اظہار لباس کی تبدیلی سے کرتے ہیں اور یہ تبدیلی عموماً ٹانگوں کے پہناوے میں ہوتی ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا بعض اوقات یہ تبدیلی سر کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً اصلاحات کے سلسلہ میں مصطفےٰ کمال نے پہلا قدم یہی اٹھایا کہ فیض پہننے کے متعلق امتناعی احکام جاری کئے اور ہر شخص کو ہیٹ پہننے پر مجبور کیا۔

لیکن عقائد کی علامت کے طور پر پاجاموں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ جارج فاکس نے "انجمن الاخوان کی بنا ڈالی تو اُس نے اپنے لئے چمڑے کی برجیس بنوائی۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ اُس نے دنیا اور اُس کی نمود و نمائش سے قطع تعلق کرلیا ہے۔ اسی طرح جب نیومین نے ظاہر کرنا چاہا کہ اُس نے منفرد مذہب انگلستان سے رشتہ توڑ کر کیتھولک مذہب سے جوڑ لیا ہے تو اُس نے پہلی دفعہ اس کا اظہار یوں کیا کہ دعوت میں ہلکے نیلے رنگ کی پتلون پہن کر آیا۔

انقلابِ فرانس بجائے خود ایک پتلونوں کا معاملہ تھا۔ اگر کوئی گھٹنوں والی برجیس پہنے نظر آتا تھا تو اُسے امراء میں سے سمجھ کر قتل کر دیتے تھے۔ اور اگر پیوست پاجامہ پہنے ہوتا تھا تو اُس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔

روس میں آج کل یہ تحریک زوروں پر ہے کہ کوئی قوم پرست سفید پتلون نہ پہنے ٹینس کھیلنے کے لئے عموماً سفید پتلون پہنی جاتی ہے، لیکن بالشویکوں کا خیال ہے کہ اس کے لئے صرف بنیان کافی ہے۔

موت و حیات کی جنگ

پروفیسر فیوڈور انڈریف جو ملک روس میں علم الحیات کے بڑے ماہر ہیں کہتے ہیں کہ صرف بڑھاپے کی موت طبعی کہی جاسکتی ہے اور کسی خاص مرض سے موت کا واقع ہو جانا غیر طبعی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایسی صورتوں میں قطعی موت واقع نہیں ہوتی۔ گو دل اور اعضائے تنفس اپنے وظائفِ حیات سے رک جاتے ہیں لیکن باقی جسم میں بعض اوقات ہفتوں زندگی موجود رہتی ہے۔

پروفیسر موصوف کا عقیدہ ہے کہ موت جسم پر آہستہ آہستہ وارد ہوتی ہے اور جب جان نکل جاتی ہے تو بہت دنوں تک جسم زندہ رہتا ہے۔ دل کی حرکت اس لئے رک جاتی ہے کہ وہ زہروں سے آلودہ یا محصور ہو جاتا ہے اور اگر اسے صاف کر دیا جائے تو دوبارہ اُس سے کام لیا جا سکتا ہے۔

انہوں نے انسانوں اور حیوانوں کی نعشوں پر تجربات کئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے کئی ایک کتوں کو جن کا تنفس بند ہو چکا تھا اور جن کا دل ٹھہر چکا تھا اپنی دواؤں کے استعمال سے زندہ کر دیا ہے اور پھر وہ سالہا سال تک زندہ رہے ہیں۔

یہ تجربات امید دلاتے ہیں کہ ہم کسی وقت موت کے ساتھ کامیاب جنگ کر سکیں گے۔

بیر کی بجائے دود

ریاست ہائے متحدہ کی حکومت کے شعبۂ زراعت نے اندازہ لگایا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں سالِ ماسبق کی بہ نسبت چار ہزار ملین پونڈ زیادہ دود صرف ہؤا ہے جب سے امریکا میں شراب نوشی کو ناجائز قرار دیا گیا ہے دود کی کھپت بے انتہا بڑھ گئی ہے۔

گوالے اور شیر فروش شراب کی ممانعت سے بڑے خوش ہیں جو روپیہ پہلے بیر پر خرچ کیا جاتا تھا اب دود پر خرچ ہو رہا ہے۔ اور جو روپیہ پہلے شرابی والدین پیدا کرتا تھا اب صحت ور بچے پیدا کر رہا ہے۔

جمہوریہ کے وہ باشندے جو مدتِ دراز تک وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آتے ہیں امریکن زندگی کی یہ خصوصیت دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ گھروں، ہوٹلوں اور کلبوں کے اندر بہت بڑی مقدار میں دود صرف ہو رہا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے شاذونادر ہی کوئی نوجوان دود پیتا دیکھا جاتا تھا لیکن اب مرد و عورت کثرت سے دود استعمال کرتے ہیں۔

بربط نواز چیونٹیاں

اُن تمام جوہروں کے علاوہ جن کے لئے چیونٹی حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے مشہور ہے اس میں موسیقی دانی کا بھی ایک جوہر موجود ہے جس کا انکشاف آج کل کے زمانے میں ہؤا ہے۔ چیونٹیوں کی بعض اقسام ایسی بھی ہیں جو ایک شورانگیز ساز رکھتی ہیں یہ شکم کے اوپر ایک ذرا سا ابھرا ہؤا بربط ہوتا ہے اور قریب ہی مضراب بھی واقع ہوتا ہے۔ جب یہ مضراب بربط سے رگڑ کھاتا ہے تو ایک نہایت ہلکا اور لطیف راگ اس میں سے پیدا ہوتا ہے

اس حقیقت کا انکشاف ڈاکٹر رابرٹ سٹیگر نے کیا ہے جنہوں نے ایک کوہستانی سفر کے دوران میں بڑی بڑی سرخ چیونٹیوں کا ایک گھونسلا دیکھا جس میں سے عجیب وغریب قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔

کوہِ نور کی سرگزشت

ایک انگریزی سینما کمپنی کوہِ نور ہیرے کی دلچسپ سرگزشت کی فلم بنارہی ہے۔ کہانی تاریخی حقائق پر مبنی ہوگی، جسے سر ای ڈینیزن راس لکھیں گے۔ ملکہ معظمہ نے جو اس کی تیاری میں دلچسپی سے حصہ لے رہی ہیں اُن خاص کاغذات میں سے معلومات بہم پہنچائی ہیں جو اُن کے قبضہ میں تھے۔ کوہِ نور جو دنیا کا چھٹا بزرگ ترین ہیرا ہے ۱۸۵۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ کمپنی کے ہاتھ یہ راجہ رنجیت سنگھ کی وفات اور پنجاب کے الحاق کے وقت آیا۔ اُس وقت اس کا وزن ۱۸۶ ۱/۱۶ قراط تھا لیکن امسٹرڈم کے صناعوں نے اُسے ایسی بے شعوری سے تراشا کہ اب اُس کا وزن صرف ۱۰۶ ۱/۱۶ قراط رہ گیا ہے۔

روایت تو اس کی قدامت کے بہت سے افسانے سناتی ہے لیکن اس کی معلومہ تاریخ بھی کچھ کم ہیجان آور نہیں ہے۔ ۱۳۰۴ء میں یہ شہنشاہِ دہلی علاءالدین کے قبضہ میں تھا اور اُس کے دو صدی بعد خاندانِ مغلیہ کے بانی ہمایوں کو ملا۔ وہ غالباً یہی ہیرا تھا جسے اورنگ زیب نے تختِ طاؤس میں آنکھ کے طور پر نصب کر رکھا تھا۔ گو بعض محققین کے نزدیک تختِ طاؤس والا ہیرا "مغلِ اعظم" تھا جو گولکنڈہ کی کانوں سے دستیاب ہؤا اور کوہِ نور جس کا ایک ٹکڑا ہے۔ ۱۷۳۹ء میں کوہِ نور ایرانی فاتح نادر شاہ کے ہاتھوں میں آیا اور اُس کے ورثا سے راجہ رنجیت سنگھ کو ملا۔

سرمایۂ مشترک

مجھے افسوس ہے کہ ہمایوں کے آخری گذشتہ پرچے میں اس عنوان کے تحت میں اہلِ دہلی کے متعلق بعض ایسی سخت چینیاں کی گئیں جن سے ہمارے چند دہلوی دوستوں کو بجا طور پر رنج ہؤا۔ ہمایوں ہمیشہ ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہتا ہے جن سے ذاتیات کی بُو آئے یا جن میں بے جا طعنہ آمیزی کا رنگ غالب ہو۔ اس مضمون کی بعض باتوں کو ایک اور ایسے طریقے میں ادا کیا جاسکتا تھا جن سے اوروں کی دل آزاری نہ ہوتی۔

ب ل

نواہائے راز

مَیں نغمہ سراسر بہ سراے یار ہوں تیرا
وارفتہ ہوں، دیوانہ ہوں، بیمار ہوں تیرا

جیسا بھی ہوں مَیں، خوش ہوں کہ نسبت تو ہے تجھ سے
اے دوست! جو تو گل ہے تو میں خار ہوں تیرا

سو پردہ میں تُو، اور میں ہر پردہ سے باہر
تُو سر بہ سر انکار، میں اقرار ہوں تیرا

"کُن" شرح سے بیگانہ تھا مَیں شرح ہوں کُن کی
تُو معنیٔ مستور، میں اظہار ہوں تیرا

وارستہ پرستش سے کہیں حُسن نہ دیکھا
ڈھونڈا مجھے تُو نے کہ پرستار ہوں تیرا

گھبرا گیا تُو بھی تنِ تنہا دو سرا میں
دمساز ہوں، ہمراز ہوں، غمخوار ہوں تیرا

آتی ہے ترے دل کی صدا میرے لبوں سے
میں پردہ میں گویا لبِ گفتار ہوں تیرا

میرے لئے تُو سر بہ گریباں ہے ازل سے
جو حل نہ ہو، وہ عقدۂ دشوار ہوں تیرا

زندانِ دو عالم سے کہاں بھاگ کے جاؤں
دے مجھ کو رہائی کہ گرفتار ہوں تیرا

اِس دل سے کبھی نقشِ وفا مِٹ نہیں سکتا
سَو بار مٹا مجھ کو، مَیں سو بار ہوں تیرا

حامد علی خاں

مبادئ سیاسیات

باب ۶

قانون - حقوق - آزادی

۱- قانون

پچھلے باب میں دکھایا جا چکا ہے کہ مملکت کا قیام و استحکام اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کوئی ایسی شخصیت موجود نہ ہو جو نہ صرف افراد کے باہمی مناقشات کو طے کرنے اور اپنے احکام کا نفاذ بشرطِ ضرورت بالجبر کرانے کی اہل ہو، بلکہ جو اُس تضاد و تخالف کو بھی دور کر سکتی ہو جو باشندگانِ ملک کے انفرادی احساسات و جذبات اور ملک کی اجتماعی ضروریات کے مابین پیدا ہو جائے۔ وہ شخصیت سیاسی اصطلاح میں مقتدرِ اعلیٰ کہلاتی ہے، اور جس آلۂ کار کے ذریعے سے وہ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتی ہے اُسے "ہیئتِ حاکمیہ" کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس ہیئتِ حاکمیہ سے کوئی ایک شخص مراد نہیں۔ بلکہ وہ جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو از روئے دستور اس مملکت کے سیاسی امور میں تا حدِ اختیار مصروف ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مرکب جماعت میں کوئی نہ کوئی ایسا مرکز ضرور ہو گا جس کے احکام

اثباتی قوانین کے امتیازات

اٹل اور جس کی تجاویز ناقابلِ تردید ہونگی، اس لئے کہ اگر یہ جماعت مختلف المراکز ہوگی تو یقین ہے کہ بہت جلد اِس کا شیرازہ بکھر جائے گا اور مملکت منتشر ہو جائے گی۔ اسی مرکز کے احکام کو قانون کہیں گے۔ اور اگر غور کیا جائے تو اسی پر جماعتِ مملکت کا کلیتہً دار و مدار ہے۔

سب سے پہلا مسئلہ جس پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آخر قانون کسے کہتے ہیں۔ آج کل دو تین اصول ایسے زبان زدِ خاص و عام ہیں جن سے قانون کا التباس نہ صرف ممکن ہے بلکہ اگر نظرِ غائر نہ ڈالی جائے تو اغلب ہے۔ ہم روزمرہ ایسے الفاظ جیسے "قانونِ فطرت" "قانونِ الٰہیہ"، "قانونِ بین الاقوامی"، "فوجی قانون"، "قانونِ معاہدہ"، "قانونِ تعزیر" سنتے ہیں، اور جب ہم اُن پر ذرا بھی نظرِ غائر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان سب "قوانین" کے مابین اصولی فرق نظر آتا ہے، اور اصلی اور واقعی اثباتی "قانون" جس سے مملکت کی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور دوسرے "قوانین" کے مابین امتیاز کرنے کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے اگر اس اثباتی قانون کو پیشِ نظر رکھا جائے تو روزمرہ کی اصطلاح میں اس میں اور انصاف میں بہت ہی کم فرق معلوم ہوگا، تاآنکہ اس محکمہ مملکت کو بھی جس میں اس "قانون" کا نفاذ ہوتا ہے "عدالت" کا لقب دیا جاتا ہے۔ بدیں سبب اس کی ضرورت ہے کہ قانون کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

سب سے پہلے تو اثباتی قوانین کا اس قسم کے قوانین سے جیسے قوانینِ فطرت، قوانینِ الٰہیہ، قوانینِ بین الاقوامی، وغیرہ سے امتیاز کرنا چاہئے۔ اثباتی قوانین در اصل اُن ملکی یا قومی قوانین کا نام ہے جن کا مقتدرِ اعلیٰ نے ہیئتِ حاکمیہ کے کسی جزوِ مجاز کے ذریعہ سے نفاذ کیا ہو، اور جس سے روگردانی کے بعد روگرداں کو یا تو سزا کا مستحق سمجھا جائے ورنہ اُسے کسی قسم کی تکلیف یا دقت کا سامنا کرنا پڑے[۵]۔ اب یہ کیفیت "قوانینِ فطرت" کی نہیں ہے۔ قوانینِ فطرت اُن معروضہ قوانین کا نام ہے جنہیں تمام بنی نوعِ انسان پر حاوی سمجھا جاتا ہے۔ اور جن سے بنی آدم کے باہمی تعلقات کا تعین ہوتا ہے "قوانینِ الٰہیہ" قوانینِ فطرت سے زیادہ متعین ہوتے ہیں، چنانچہ بہت سے ممالک میں یہ اثباتی قوانین کے منابع و مآخذ بھی بن جاتے ہیں۔ "قوانینِ بین الاقوامی" اُن اصول کا مجموعہ ہیں جن پر مختلف ممالک کے باہمی تعلقات و عہد نامجات مبنی سمجھے جاتے ہیں۔ جب تک یہ قوانین کسی ملک کے اثباتی قوانین کی شکل اختیار نہ کریں اُس وقت تک انہیں صحیح معنے میں قوانین کہنا مناسب نہیں، اور ان کی خلاف ورزی پر ملزم کو عام طور پر کوئی ایسی قانونی سزا نہیں دی جاتی جس سے اُسے کسی خاص قسم کی تکلیف پہنچے۔ اسی طرح اثباتی قوانین کو ماتحت قاعدہ ساز ادارات مثلاً مجلسِ بلدیہ یا مجلس ریلوے کے قواعد سے بھی ممیز کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ موخر الذکر قواعد محض کسی نہ کسی اثباتی قانون کے تحت عدم سے وجود میں آئے ہیں، اور ایک دوسرا اثباتی قانون انہیں یک قلم کالعدم کر سکتا ہے۔

اسی طرح عام طور پر قانون اور انصاف کو ہم معنیٰ قرار دیا جاتا ہے اور دونوں کو اخلاق پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ جو قانونِ مروجہ ہو وہ بالکلیہ نام نہاد انصاف پر مبنی ہو۔ مثال کے طور پر اگر زید نے کچھ رقم عمر سے قرض لی اور اُس کے دعوے میں تمادی عارض ہوگئی تو ایسی صورت میں انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ زید عمر کو وہ رقم واپس دے دے، لیکن عمر کسی قانونی چارہ جوئی کا مستحق نہیں سمجھا جائیگا۔ در اصل انصاف کی بنا اخلاق پر ہے، اور جیسا انگلستان کا ایک نامور اور عادل لارڈ کولرج اپنی ایک تجویز میں کہتا ہے۔ "گو قانون اور اخلاق ایک دوسرے کے مترادف نہ ہوں اور بہت سے

---

[۵] ہالینڈ: "اصولِ قانون" باب ۲

ایسے افعال بد سمجھے جائیں جو بالالتزام خلاف قانون نہیں ہوتے تاہم اگر اخلاق کو قانون سے کلیتہً علیحدہ سمجھا جائیگا تو اُس کے نتائج نہایت ہی برے نکلیں گے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص بحیثیت ایک شوہر یا باپ یا بھائی یا استاد کے مکمل اخلاقی معیار پر پورا نہ اُتر سکے لیکن ساتھ ہی اس سے کسی قسم کا خلاف قانون عمل سرزد نہ ہوا ہو اور وہ قانون کی زد میں نہ آتا ہو محض اخلاقی اصول کی ترجیح میں یہ کمزوری رہ جاتی ہے کہ اُس کی خلاف ورزی سے کوئی لازمی نقصان مرتکب فعلِ شنیعہ کو نہیں پہنچتا، بلکہ بعض مرتبہ تو اسے بظاہر مادی فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے درآنحالیکہ خلاف ورزئ قانون کی صورت میں جملہ وسائلِ مملکت اُس کے خلاف استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اگر اخلاقِ مروجہ اور قانونِ جاریہ کے اصول ایک دوسرے سے منطبق ہو سکیں تو یہ مملکت کے لئے بہترین صورتِ حال ہوگی۔

"قانون ساز"۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قانون مملکت کے اُن احکام کو کہتے ہیں جن کا ماننا ہر فردِ مملکت کا فرضِ عین ہے۔ اور اس سے روگردانی کی حالت میں مملکت اپنی قوت وجبروت روگرداں کی سزا اور بدامنی کے دفعیہ میں صرف کردیتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مملکت میں کوئی نہ کوئی ایسا شعبہ ضرور ہوگا جس کے سپرد قانون سازی کا فرض ہوگا۔ یعنی جسے یہ اختیار ہوگا کہ ملک کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ایسے قواعد بنائے جن کے ذریعہ سے بدامنی نہ ہونے پائے اور افرادِ مملکت کے مابین تعلقاتِ دادوستد بے کھٹکے قائم رہ سکیں۔ ساتھ ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مملکت میں، خواہ اس کی حکومت شخصی ہو یا جمہوری، پارلیمنٹری ہو یا صدارتی کوئی نہ کوئی قانون ساز شخصیت ضرور ہوتی ہے بعض مرتبہ یہ منصب شخصِ واحد، مثلاً آمرِ مطلق یا بادشاہ کے متعلق ہوتا ہے، جسے خاص طور پر قانون سازی کا اہم اختیار بوجہ اس کے علم یا ادراک یا موروثی اثر کے باعث دیا جاتا ہے، بعض مرتبہ اسے اہم ترین اختیار تصور کرکے ایک ایسی جماعتِ مقننہ کے سپرد کردیا جاتا ہے جس میں تقریباً ہر شعبۂ زندگی کے نمائندے ہوتے ہیں، تاکہ وہ موجودہ قوانین کی خامیوں کو سمجھ کر اور ملک کی، یا کسی خاص طبقے کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر قانون بنائے یا اس میں ترمیم کرے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قانون ساز شخص یا جماعت خواہ کتنی ہی فہیم و مدرک کیوں نہ ہو یہ ناممکن ہے کہ وہ تمام ایسے واقعات کے لئے قواعد بنا دے گی جو اس وقت تک پیش نہ آئے ہوں۔ مثلاً جس شخص یا جماعت کے سپرد قانون سازی ہو وہ چوری کی سزا مقرر کرسکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ آیندہ جتنی طرح سے چوری کی جائے گی وہ سب اُن مقننوں کے پیشِ نظر ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون ساز شخص یا جماعت کسی جرم کی قطعی سزا مقرر نہیں کرتی بلکہ حاکمِ عدالت کو بہت بڑا اختیارِ تمیزی دے دیتی ہے کہ ایک حد کے اندر جتنی چاہے سزا دے۔ ہمیں ایک اور امر ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ حقیقی قانون ساز یعنی ایسے احکام دینے والا جنہیں قانون کا رتبہ حاصل ہو، کوئی مافوق الفطرت ہستی ہو اور دنیوی حکام کے

سپرد اُن احکام کا نفاذ اور اُن کی تاویل کرنے سے زیادہ اختیار نہ ہو۔ لیکن یہ اختیارِ تاویل یا اُن اصول کو موجودہ صورتِ حال پر منطبق کرنے کا اختیار اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس پر ایک بہت بڑے نظامِ قانونی کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ تمثیلاً جن ممالک میں شرعِ اسلامی کا رواج ہوا اُن کے قوانین کا دار و مدار قرآن مجید اور احادیث نبوی پر تھا، لیکن ساتھ ہی ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے بڑے بڑے علما و ائمہ نے جو اُس کی تاویلیں کیں اور صورتِ حال کو مدنظر رکھ کر جو فتاوے شائع کئے اُن سے وہ عظیم الشان نظامِ قانونی نکلا جسے فی الجملہ شرعِ اسلامی کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ممالک میں جہاں کسی قسم کا الوہی قانون رائج ہو اور جہاں کا حاکم اُس کا پابند ہو، وہاں دو طرح کے حکام ملیں گے۔ ایک وہ جو ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے خود اُس کی توسیع کریں یا علما و ائمۂ وقت سے کرائیں، دوسرے حکامِ عدالت جو اِن توسیع شدہ قوانین کو واقعاتِ حالیہ پر منطبق کریں اور حسبِ حال وقتی احکام شائع کریں۔

قانون اور عادل ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون کو کونسی شکل کا تعلق حقیقتاً افرادِ مملکت سے ہے اور وہ کون سے احکام ہیں جو دراصل مملکت کو انتشار و افتراق سے روکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اصول جو احکامِ الٰہیہ میں منضبط ہوں یا وہ قواعد جو قانون ساز نے منظور کئے ہوں، بہت اہم ہوتے ہیں۔ اور انہیں پر ملکی قوانین کا دار و مدار ہوتا ہے لیکن جیسا اوپر کہا جاچکا ہے، تاوقتیکہ مقدمہ کی واقعی نوعیت نہ معلوم ہو، فریقِ ثانی پر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا جب جان آسٹن یہ کہتا ہے کہ قانون مقتدرِ اعلیٰ کے حکم کا نام ہے[۵۳] تو وہ فوراً اپنی کمزوری محسوس کرلیتا ہے اور ضمناً یہ بھی کہتا ہے کہ جس امر کی مقتدرِ اعلیٰ اجازت دے وہی بمنزلہ اُس کے حکم کے ہے[۵۴] اور ظاہر ہے کہ یہ اجازت ظاہری بھی ہوسکتی ہے اور معنوی بھی۔ اس سے یہ صاف پایا جاتا ہے کہ خود آسٹن کو اپنی تعریف کی کمزوری کا علم تھا، وہ جانتا تھا کہ جماعتِ مقننہ یا شخصِ قانون ساز کے بنائے ہوئے قواعد دراصل ملکی قوانین کا محض عشرِ عشیر ہیں اور بہت سے ایسے معاملات زیرِ بحث آسکتے ہیں (اور درحقیقت روزمرہ آتے ہیں) جن کا حل اُن قواعد و قوانین سے ہونا نہایت دشوار ہے چنانچہ اس کے لئے آزادانہ تاویل کے ذریعہ سے موجودہ قوانین میں ایک بڑی حد تک توسیع و اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اِس قسم کی تاویلات کو محض "اجازت" کا لقب دینا اِس لفظ کو محض خود ساختہ اور غلط معنے پہنانا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب مقدمہ عدالت کے سامنے جاتا ہے تو عادل پہلے یہ دیکھ لیتا ہے کہ آیا معاملہ زیرِ بحث پر موجودہ قوانین کا انطباق ممکن ہے یا نہیں؟ اگر یہ ممکن ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کے مطابق اپنی تجویز دے دیتا ہے، اور (جیسا کہ بیشتر معاملات

---

۵۳ آسٹن: اسباقِ اصولِ قانون Austin; Lectures on Jurisprudence جلد ۱ درس ۶

۵۴ ایضاً

میں جزاً اور بعض میں کلاً پیش آتا ہے اموجودہ قوانین میں سے کسی کا کلیتہً انطباق ممکن نہیں تو وہ فی الفور اس معاملے کو طے کرنے کی غرض سے اپنے فہم وادراک اور اپنی قوتِ تخیل کو کام میں لاکر اور جدید قواعد وضع کرکے اس کے مطابق تصفیہ کردیتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جو جدید قواعد یہ عادل بنائے گا وہ اصولاً موجودہ قوانین کے منافی نہیں ہونگے۔ لیکن اُس کی دماغی کیفیات بجنسہٖ اسی قسم کی ہونگی جیسی کسی نام نہاد "قانون ساز" شخص یا جماعت کی جب وہ چند خاص ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر قواعد بنائے۔ دونوں صورتوں میں جملہ عناصر کم وبیش یکساں ہی ہیں! دونوں کے سامنے ایک یا چند مسائل ہوتے ہیں جن پر موجودہ قانون کا انطباق نہیں ہوتا، دونوں ان مسئلوں کا حل چاہتے ہیں۔ دونوں ضروریاتِ ملک اور معاملۂ زیرِبحث کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اور دونوں ایسے قواعد وضع کرتے ہیں جنہیں وہ اُس کے حل کے لئے مناسب سمجھتے ہیں۔ عادل نام نہاد مقنن سے ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور خود ہی امرِ زیرِبحث کا تصفیہ بھی کردیتا ہے۔

اس اصول کی مزید تفہیم کے لئے ایک مثال دینا ضروری ہے۔ فرض کیجئے زید نے اپنی اراضی میں ایک بڑا تالاب بنا کر اُس میں پانی بھرا اور حتی الامکان اُس کی مضبوطی وحفاظت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن مشیتِ ایزدی میں کسی کو چارہ نہیں، چنانچہ آفتِ ارضی وسماوی کی وجہ سے اس تالاب کا پشتہ پھٹ گیا اور پانی کے زور سے عمر کی اراضی کو، جو اُس کے دامن میں واقع تھی، سخت نقصان پہنچا۔ اب ایسے معاملے کے تصفیہ کے لئے عادل کیا کرے گا؟ زید نے حتی الامکان اپنے پشتے کی حفاظت کی اور کسی قسم کی غفلت نہیں برتی، ساتھ ہی یہ بھی مسلمہ ہے کہ زید کا پشتہ ٹوٹنے سے عمر کا بہت کچھ نقصان ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملے کے تصفیہ کے واسطے کسی قانون ساز کا بنایا ہوا قانون ڈھونڈنا بالکل بے سود ہوگا، اور اس کے لئے عادل کو اپنا اختیارِ تمیزی کام میں لانا پڑے گا۔ گویا کہ ایک جدید قانون وضع کرنا پڑے گا جو معاملۂ زیرِبحث پر منطبق ہوسکے، اور خود ہی اُس کے مطابق تصفیہ کرنا پڑے گا۔ بجنسہٖ اسی قسم کا مقدمہ ممالکِ متحدۂ امریکا کی دو ریاستوں کی عدالتوں میں پیش ہوا، اور جو امر بظاہر محیرالعقل ہے وہ یہ ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کے مخالف تصفیہ ہوا۔ یعنی ایک ریاست کی عدالت العالیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ عمر زید سے ہرجہ وصول کرسکتا ہے۔ لیکن دوسری ریاست میں اس کے برعکس یہ طے ہوا کہ چونکہ زید کسی قسم کی غفلت کا مرتکب نہیں ہوا اس لئے اس سے ہرجہ وصول نہیں کیا جاسکتا۔[۵۵]

یہ تو ایسے معاملات تھے جن کا تصفیہ کسی مروجہ قانون کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا۔ اب ایسے معاملات کو لیجئے جن کے متعلق قوانینِ موجودہ میں اصول تو مدوّن کئے گئے ہیں لیکن چونکہ قانون سازی کے وقت ہر امرِ مستقبلہ کی بابت

---

۵۵ مقدمہ جات رائی لینڈز بنام فلیچر Rylands v Fletcher ۳ دارالامرا صفحہ ۳۳۰ پر ولسن بنام نیو بیڈفرڈ (بقیہ بر صفحہ ۸۰۴)

پیش بینی کرنا ناممکن ہے اس وجہ سے قطعی فیصلے کے لئے حاکم عدالت کو اپنا اختیارِ تمیزی ہی کام میں لانا پڑتا ہے۔ جہاں تک تعزیرات کا تعلق ہے عام طور پر قانون ساز محض زائد از زائد سزا کا تعین کرتا ہے، اور عدم سزا اور اس سزائے متعینہ کے مابین جو فرق ہے اُسے بالکلیہ اختیارِ عدالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی شخص نے چوری کے ارادے سے زید کے گھر کا قفل توڑا، اور بھرا ہوا پستول ہاتھ میں لے کر زید کے پلنگ کے سرے تک گیا اور اُس کو مارنے کی دھمکی دی تاآنکہ زید نے اپنے صندوق کی کنجیاں اُس کے حوالے کر دیں، اور وہ مالِ مسروقہ لے کر جا رہا تھا کہ راستے میں گرفتار ہو گیا۔ اسے عدالت شاید اس شخص سے زیادہ سزا کا مستحق سمجھے گی جس کے گھر میں سے مالِ مسروقہ تو برآمد ہوا ہے لیکن جس کے خلاف چوری کرنے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں۔

حقیقی اثباتی قوانین پس پردہ ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں عدالت کے اختیاراتِ تمیزی کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ بالکل درست ہے کہ پچھلی مثال میں قانونی اصول پہلے سے موجود تھا، لیکن یہ امر ناقابلِ انکار ہے کہ اس سے کم از کم ان لوگوں کو مطلق کوئی مدد نہیں ملی جن کے واسطے وہ وضع کیا گیا تھا۔ اس میں ذرا بھی کلام کی گنجائش نہیں کہ جس وقت چور چوری کرتا ہے یا کوئی فریقِ معاہدہ معاہدے کو فسخ کرتا ہے اُس وقت اُسے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ جب اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے گا تو حاکمِ عدالت کیا حکم دے گا۔ کسی خاص معاملے کے متعلق یہ کسی حالت میں پیش بندی نہیں کی جا سکتی کہ دراصل کونسی قانونی تجویز اُس کی بابت صادر کی جائے گی۔ گویا کہ اس معاملے کی نسبت حقیقی قانون پردۂ خفا میں ہوتا ہے۔ یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ باوجودیکہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے نہایت بدیہی ہے، تاہم کوئی عدالت یا کوئی نام نہاد جماعتِ مقننہ اُسے ماننے کے لئے بظاہر تیار نہیں ہے کہ واقعی قانون سازی دراصل محکمۂ عدلیہ کرتا ہے نہ کہ جماعتِ مقننہ، اور موخر الذکر جماعت محض اصول طے کرنے پر اکتفا کرتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک قدیم قانونی اصول کے بموجب ”ناواقفیتِ قانون کوئی عذرِ معقول نہیں“[۵۶] چنانچہ جب قانون دان دیکھتے ہیں کہ فی الواقع جماعتِ عدلیہ ہی حقیقی قانون کا انکشاف کرتی ہے اور ہم تجویزِ عدالت کے اعلان کے کسی خاص مسئلے کے متعلق واقعی قانون سے بالکل ناواقف رہتے ہیں، تو وہ عدالت کے اس زبردست منصب کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک فاضل مصنف اسی اصول کے متعلق کہتا ہے کہ قانون اُن قواعد کا نام ہے جنہیں عدالتیں تسلیم کر کے اُن پر عمل درآمد کریں[۵۷]۔ اسی اصول

(بقیہ صفحہ ۸۰۳) ۳۸ نیوجرزی صفحہ ۳۳۹ Wilson v. New Bedford ۱۰۸۔ ماچوسٹس صفحہ ۲۶۱؛ مارشل بنام ویل وڈ Marshall v. Welwood

ان تمام مقدمات کا بیان گرے: قانون کی ماہیت اور اُس کے ماخذ Gray: The nature and sources of the law باب ۴ میں موجود ہے۔

۵۶ Ignorantia legis neminem excusat ۵۷ سامنڈ: اصولِ قانون Salmond: Jurisprudence

پر اس مسلمہ قاعدے کا دار و مدار ہے کہ جب عدالت العالیہ کسی خاص مسئلے پر کوئی تجویز صادر کر دے تو پھر اس تجویز کو قانون کا رتبہ حاصل ہو جائے گا۔ اور آیندہ عدالت ہائے ماتحت اس پر عمل کریں گی۔ یہ اصول اس درجہ مسلمہ ہے کہ سلطنت برطانیہ اور ممالکِ متحدۂ امریکا میں تو ان تجاویز کو آیندہ کے لئے نظیر کا رتبہ دیا جاتا ہے اور کسی عدالتِ ماتحت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے، لیکن اکثر دیگر ممالکِ متمدنہ میں ان تجاویز کے الفاظ کی اتنی پابندی نہیں کی جاتی بلکہ اُن کے اساسی اصول کی پابندی کافی سمجھی جاتی ہے[۸]۔

قانون کے مآخذ۔ اب یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ تاوقتیکہ کسی قاعدے پر عدالت کی گویا مہر نہ لگ جائے اس وقت تک اُسے پورے طور پر (جہاں تک امرِ متنازعہ فیہ کا تعلق ہے) قانون کا رتبہ حاصل نہیں ہوتا[۹]۔ اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ وہ کس قسم کے قواعد ہوتے ہیں جو قانون کا اعلان کرنے کے وقت عدالتِ مجاز کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو اُن کی تعداد محدود ہے۔ ان تجاویز کے سب سے پہلے تو وہ مآخذ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی عدالت ہائے عالیۂ مجاز کی تجاویزِ ماقبل۔ دوسرے وہ قواعد ہیں جن کے قانون ہونے کا اعلان ملکی دستورِ سیاسی کے مطابق جماعتِ مقننہ یا دوسری قانون ساز شخصیت نے کر دیا ہے، لیکن (چونکہ قانون ساز کی نظر دُور رس نہیں ہوتی کہ وہ تمام واقعاتِ آئندہ پر حاوی ہو سکے اس لئے) اسے مجبوراً بہت بڑا اختیارِ تمیزی محکمۂ عدلیہ کو دینا پڑتا ہے۔ اور جیسا بیان کیا جا چکا ہے، حقیقی قانونِ متعلقہ کا اُس وقت تک انکشاف نہیں ہوتا جب تک عدالت اپنی تجویز نہ دے دے[۱۰]۔ یہ دو مآخذ تو گویا وہ ہیں جنہیں زیرِ نظر رکھنا دستورِ مملکت کے مطابق ہر عادل کا فرضِ عین ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے قواعد بھی ہیں جن کا عام طور پر دستورِ مملکت میں کہیں ذکر نہیں، لیکن ہر عادل انہیں بھی ملحوظ رکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے جتنا موضوعی قوانین یا نظائر کو، اور یہ مذہبی احکام، رسم و رواج، مستند ائمہ قانون کی کتابیں اور تصنفت ہیں[۱۱]۔

تقریباً ہر ملک پر ایک دور ایسا گذرتا ہے جب وہاں کے قانون کا دار و مدار کلیتہً قانونِ الٰہیہ پر ہوتا ہے۔ خود یورپ میں بھی، جو آج کل دنیوی معاملات میں مذہبی قواعد کی دست اندازی سے اس قدر روگرداں نظر آتا ہے اس قسم کا عہد گزر چکا ہے۔ رومن عہد میں سیاسیات میں مذہب کا بہت بڑا دخل تھا۔ اور تاریخ روما کے ہر طالب علم کو اُس عظیم الشان اثر کا علم ہے جو وہاں کے "آگرون" یعنی پجاریوں کو سیاسیات پر حاصل تھا۔ جب کبھی کسی آگر کو آسمان پر یا زمین پر یا کسی جانور

---

۸ ہالینڈ، اصولِ قانون، باب ۵۔

۹ نیز اس بحث کے لئے دیکھو ولوبی: "قانونِ عامہ" *Willoughby: Public Law* باب ۱۰

۱۰ گرے، باب ۴

۱۱ ہالینڈ۔ باب ۵

کے جسم میں یا کسی اور جگہ کوئی بدشگونی معلوم ہوتی تو وہ اپنے حکم سے تمام موجودہ سیاسی کارروائیوں کو یک قلم موقوف یا ملتوی کرسکتا تھا اور اُس کا حکم ناطق سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس اہم منصب نے بالکل سیاسی پہلو اختیار کرلیا، اور یہ روزمرہ کی بات ہوگئی کہ جب کوئی آگر کسی خاص سیاسی فریق کا ہمنوا ہوتا اور فریقِ مخالف کسی جمعیت یا مجلس پر حاوی ہوتا تو وہ کسی فرضی بدشگونی کا انکشاف کرکے کارروائی کو فی الفور روک دینے میں دریغ نہ کرتا[۱۲]۔ قانون پر مذہب عیسوی کا اثر بھی کچھ کم نہیں پڑا۔ چنانچہ ہنری چہارم شاہِ انگلستان کے زمانے کی ایک نظیر میں صریحاً یہ حکم لگا دیا گیا ہے کہ ”انجیلِ مقدس ایک ایسا قانونِ عامہ ہے جس پر جملہ اثباتی قوانین کا دارومدار ہے“[۱۳]۔ یہی کیفیت منوسمرتی جیسی کتب ہنود اور بعض صحائفِ سماوی کی ہے۔ قرآن مجید میں بھی بعض اصولی اور بعض تفصیلی قوانین مندرج ہیں اور انہی پر تمام فقہ اسلامی مبنی و منحصر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہاں بھی یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کسی ملک میں صرف انہیں احکامِ الٰہیہ کو قانون کا رتبہ حاصل ہوتا ہے جنہیں عدالت ملکی مجاز تسلیم کرلیں۔ سب سے بدیہی مثال شرعِ اسلامی کی ہے۔ شرعِ اسلامی کے عروج کے زمانے میں یہ شرع جملہ معاملاتِ مملکت پر حاوی تھی، لیکن امتدادِ زمانہ سے (خصوصاً جب غیر اسلامی قوانین کا عروج ہوا اور اُن کا دنیا پر رواج ہوگیا تو) رفتہ رفتہ اِس کے بعض حصوں کو نظر انداز کردیا گیا، اور آج شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں اُس کا تمام و کمال رواج ہو۔ ہندوستان میں ۱۸۸۷ء کے ایک قانون کے مطابق شرع شریف اور دھرم شاستر کا نفاذ صرف معاملاتِ وراثت اور مناکحت و ازدواج تک محدود رہ گیا ہے۔ اور تعزیرات و نقصان رسانی کے معاملات پر اس کا مطلق کوئی اثر باقی نہیں رہا[۱۴]۔ بعض اسلامی ممالک اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، اور انہوں نے ضروریاتِ زمانہ کو ملحوظ رکھ کر اپنے قوانین بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیئے ہیں۔ یہ اثر دراصل مذہبی قوانین سے اُس عظیم الشان گریز کا ہے جو اِس وقت یورپ و امریکہ میں جاری و ساری ہے۔ بہرنہج خواہ ہندوستان کی طرح مذہبی قوانین کی جزوی پابندی کی جائے یا ترکی و مصر کی طرح اکثر معاملات میں مطلق پابندی نہ کی جائے اس میں شبہ نہیں کہ مذہبی قوانین کی ترویج کا دارومدار محض اس امر پر ہے کہ آیا عدالتیں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؛ اگر قانون ساز نے اُس کے کسی جزو کو صراحتاً رد کردیا ہے تو لامحالہ عدالتیں اُسے مسترد سمجھیں گی، اگر رد نہیں کیا ہے تو

---

[۱۲] ٹیلر ”روما کی دستوری اور سیاسی تاریخ“ T. M. Taylor: Constitutional and Political History of Rome باب ۵

[۱۳] سالیانہ ۴۴۔ ہنری چہارم صفحہ ۶ جس کا اقتباس ہالینڈ باب ۵ میں دیا گیا ہے۔

[۱۴] قانونِ پارلیمنٹ ۲۱ جارج ۳، باب ۷۰، دفعہ ۱۷۔

پھر اُس کا تسلیم کرنا نظائر اور خود اُس کے اختیارِ تمیزی پر منحصر ہوگا۔[۱۵]

مذہبی قوانین سے گذر کر ہم رسم و رواج تک پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسم و رواج کو اتنا ہی، بلکہ بعضوں کی نگاہ میں تو اس سے زیادہ تقدس حاصل ہے جتنا مذہبی قوانین کو۔ قدیم یونانیوں کا خیال تھا کہ جب کوئی حاکم کسی معاملے کا تصفیہ کرنے بیٹھتا ہے تو ایک دیوتا تھےمس نامی (جسے انصاف کا معبود سمجھا جاتا تھا) اس پر اپنا خیال القا کرتا ہے، اور وہی اس حاکم کی تجویز ہوتی ہے، چنانچہ اِن تجاویز کو تھےمس تیس کا لقب دیا جاتا تھا۔ اور لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بادشاہوں کے پاس ان تجاویز کا گویا کہ انبار لگا ہوتا ہے جس میں سے وہ چن چن کر اُن کے مطابق مختلف معاملات کا تصفیہ کرتے ہیں۔[۱۶] اگر ہم غور کریں اور ان معانی کے بین السطور دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ در اصل تھےمس تیس کا ماخذ وہی رسم و رواج کا ذخیرہ تھا جس کے مطابق بادشاہ یا حکمران تجویزیں صادر کرتا تھا اور خود ہومری اشعار میں بھی تھےمس رسم و رواج کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہندوستان میں رسم و رواج ایک مسلّمہ ماخذِ قانون ہے، اور پنجاب تو اس قسم کے رواجی قوانین سے بھرا پڑا ہے۔ ساتھ ہی مختلف دیہات کے واجب العرضوں کو تسلیم کرکے مملکت نے اس اصول پر اپنی مہر ثبت کردی ہے۔

مستند ائمۂ قانون اور فقہا کی کتابیں بھی تجاویزِ عدالت کا ماخذ ہوتی ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی زبردست اور اہم کتابوں سے، جیسے یوس تی نیان اور گایوس، فتاوئے عالمگیری اور ہدایہ۔ متاکشرا اور دیا بھاگ، بلیکسٹن اور کک ہیں عادل اپنی تجاویز کے اصول اخذ کرسکتا ہے اور اُن کی سند پر اپنے خیالات کو مبنی کرسکتا ہے۔ لیکن تاوقتیکہ کوئی اعلیٰ عدالتِ مجاز ان کتابوں کے کسی اصول کے مطابق کسی معاملے کا تصفیہ نہ کرے انہیں یا اُن کے کسی جزو کو اثباتی

---

[۱۵] شرعِ محمدی، محکمۂ عدلیہ اور جماعتِ مقننہ کے حدود مسئلہ وقفِ اسلامی کے حوالے سے ظاہر ہوجائیں گے۔ جملہ ائمہ اہلِ سنت و اثنا عشری اس اصول پر متفق ہیں کہ کوئی شخص اپنی جائداد وقف علی الاولاد کرسکتا ہے یعنی اس طرح پر وقف کرسکتا ہے کہ جائداد کا منافع اسکی اولاد اور اولاد کی اولاد کو ملے تاآنکہ اُس کی نسل میں سے کوئی باقی نہ رہے؛ اگر کوئی زمانہ ایسا آئے کہ اُس کی نسل بالکلیہ منقطع ہوجائے تو یہ روپیہ کسی کارِ خیر میں لگا دیا جائے باوجود مکمل اتفاق رائے ائمہ رح کے پریوی کونسل نے ۱۹۱۳ء سے پہلے بار بار یہ طے کیا کہ اگر وقف کا مقصد فوراً کسی خیرات میں منافع کا صرف نہ ہوگا تو وقف کالعدم سمجھا جائے گا (محمد احسان اللہ چودھری بنام امرچند، ۱۷ کلکتہ صفحہ ۴۹۸ پریوی کونسل، ابوالفتح محمد اسحاق بنام راس میادھر چودھری ۲۲ کلکتہ صفحہ ۶۱۹ پریوی کونسل) اور قانون کی یہ شکل ہو بہو اس وقت تک جاری رہی جب تک قانون ۶ سنہ ۱۹۱۳ء (قانون جوازِ وقفِ اسلامی) ہندوستان کی مجلسِ مقننہ نے منظور نہ کرلیا جس کی رُو سے اصل شرعی اصول از سرِ نو مروج ہوگیا۔ دیکھو عبدالرحیم: "اصولِ قانونِ اسلامی" (Abdur Rahim, Mohammadan Jurisprudence باب ۲، حصہ ۲ (ب)

[۱۶] مین: "قانونِ قدیم" Maine: Ancient Law باب اول۔

قوانین کا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

قانون کا آخری ماخذ نصفت ہے۔ پروفیسر ہالینڈ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ "نصفت اُن قواعد کا نام ہے جو موجودہ اثباتی قوانین کے دوش بدوش کسی اعلیٰ حاکمِ عدالت کے حکم سے جاری کئے جائیں۔ اگر اثباتی قوانین اور قواعدِ نصفت میں باہمی تخالف نظر آئے تو موخرالذکر کا ہی بول بالا سمجھا جائے[۱۱]۔ اگر دوسرے اعضائے حکومت پر حکامِ عدالت کی فوقیت اس وقت تک مشتبہ تھی تو اصولِ نصفت اور اُس کی ترویج و توسیع کے بعد تو اس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا۔ اثباتی قوانین موجود ہیں، اِن قوانین پر حکماً عمل ہو رہا ہے، لیکن عدالت اُن پر لفظاً یا معناً عمل کرنے کی بجائے از خود جدید قواعد وضع کرتی ہے اور اُن کے مطابق معاملہ کا تصفیہ کرتی ہے۔ اِس اصول کی ابتدا اور ترویج بجائے خود ایک نہایت ہی اہم شاخ مطالعۂ قانونی کی ہے۔ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن ممالک میں ان قواعد کی ابتدا ہوئی اُن میں حکامِ بالادست نے کس طرح سے موضوعہ اثباتی قوانین کو نظر انداز کر کے جدید قواعد کی بنیاد ڈالی اور ان قواعد کے مطابق مقدمات کا تصفیہ کیا۔ قواعدِ نصفت کی بدیہی مثال قاعدۂ حکمِ امتناعی ہے جس کی رُو سے قبلِ تصفیۂ مقدمہ محض ایک فریق کی درخواست پر عدالت فریقِ ثانی کو امرِ متنازعہ فیہ سے دست کشی کا حکم دیتی ہے اور عدولِ حکمی کی صورت میں اُسے مرتکب سزا گردانتی ہے[۱۲]۔

اثباتی قانون کے اقسام۔ قبل اس کے کہ ہم حقوق کی اہم بحث کی طرف متوجہ ہوں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً قانون کے اقسام بیان کر دیئے جائیں۔ یوں تو قانون کی تقسیم مختلف اصول کی بنا پر کی جاتی ہے، لیکن ہمارے مقاصد کے اعتبار سے اسے دو اصول کی بنا پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک تو اس کے مقصد کی بنا پر اور دوسرے فریقِ متعلق کی نوعیت کی بنا پر۔ اگر غور کیا جائے تو قانون کے دو بدیہی مقاصد نکلیں گے۔ ایک تو افرادِ مملکت کے حقوق

---

[۱۱] ہالینڈ، باب ۵

[۱۲] یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام قوانین کے ماخذوں کو شمار کرنے کے ساتھ ہی فقہ اسلامی کے ماخذ بھی شمار کر دیئے جائیں۔ فقہ اسلامی کی تدوین (جسے شرعِ محمدی کا لقب بھی دیا جاتا ہے) تقریباً تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔ اس کے ماخذ مفصلہ ذیل ہیں، قرآن مجید حدیثِ رسولِ اکرم صلعم، مجتہدین یعنی علماو ائمۂ قانون کا اتفاق رائے۔ قیاس یعنی اصولِ ماقبل کو پیش نظر رکھ کر کسی ایک عالمِ فقہ کی ذاتی رائے، استحسان یعنی بغیر اصولِ ماقبل کے پیشِ نظر رکھے ہوئے محض عالمِ فقہ کی رائے کا واقعاتِ متنازعہ فیہ پر انطباق۔ اس کے علاوہ عرف یعنی رسم و رواج کو بھی ماخذِ شرعِ اسلامی قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ اُس کے خلاف کوئی نص صریح نہ ہو۔ اس پر سر عبدالرحیم نے اپنی کتاب "اصولِ قانونِ اسلامی" باب ۳ میں مفصل بحث کی ہے، علاوہ ازیں الخضری کی تاریخ فقہ اسلامی" (مترجمہ عبدالسلام

و فرائض کا تعین اور دوسرے اگر دو شخصوں میں تنازعہ ہو تو اُسے رفع کرنے یا اُس کے طے کرنے کے طریقہ کا تعین۔ پہلی قسم کے قوانین کو "قوانینِ اصلی" اور دوسری قسم کے قوانین کو قوانینِ اضافی" کہتے ہیں۔ قوانینِ موجبہ میں اس قسم کے قوانین جیسے قانونِ معاہدہ قانونِ ازالۂ حیثیتِ عرفی، قانونِ مملوکات قانونِ مالگذاری اور ایسے ہی دوسرے قوانین ہیں جن میں ہر ایک شخص متعلق کے حقوق و فرائض کی نوعیت دکھائی گئی ہو! اِس کے برعکس قوانینِ اضافی میں ایسے قوانین جن کا تعلق اقسامِ عدالت، مدارجِ مقدمہ، نفاذِ تجویزِ عدالت، حدِ اختیار اور وہ قواعد ہوتے ہیں جن کی پابندی ضروری اور لازمی ہے۔ دوسرا اصول جس کی بنا پر قانون کو تقسیم کیا جاتا ہے افرادِ متعلقہ کی شخصیت پر مبنی ہے۔ اگر دونوں فریق کی نوعیت محض خانگی ہو تو اُن کا تعلق "خانگی قانون" سے ہوگا؛ اگر اُن میں سے ایک خود مملکت اور دوسرا محض ایک فرد ہے تو اُس کی نوعیت "قانونِ عامہ" کی ہوگی اور اگر دونوں فریق دو یا دو سے زائد مملکتیں ہوں تو اُن کا تعلق "بین الاقوامی قانون" سے ہوگا۔ خانگی قانون ایسے قانون کو کہتے ہیں جیسے قانونِ معاہدہ، قانونِ مملوکات، جب اُن میں دونوں فریق محض خانگی افراد ہوں؛ قانونِ عامہ میں قانونِ تعزیرات (یعنی وہ قانون جس کے ذریعے سے مملکت ملک میں بدامنی کا انسداد کرتی ہے)، قانونِ دستوری (یعنی وہ قانون جس سے گویا مملکت کا سیاسی مرکزِ ثقل معلوم ہوتا ہے اور یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مملکت کی "ہیئتِ حاکمہ" میں کون کون سے عناصر شامل ہیں) اور قانونِ انتظامی (یعنی وہ قانون جس کے ذریعے سے مملکت اور افراد کے باہمی تنازعات طے ہوں) شامل ہیں۔ قانونِ بین الاقوامی اُن قواعد کا مجموعہ ہے جن پر امن اور جنگ کے وقت مختلف ممالک حتی الامکان کاربند رہتے ہیں۔ لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قانون

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۰۸ ندوی) میں اصولِ اجتہاد کی تاریخ اور جستہ جستہ اُس کی تشکیل کے مدارج واضح کئے گئے ہیں۔ اگر ہم بنظرِ غائر دیکھیں تو آج کل کے مسلمہ ماٰخذِ قوانین کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زمانۂ حال کے اصولِ قانون کے ماٰخذ اور شرعِ محمدی کے ماٰخذ کا مقابلہ مفصلہ ذیل طرز پر کیا جا سکتا ہے:-

ماٰخذِ فقہ اسلامی	ماٰخذِ قانونِ عالیہ
۱) قرآنِ مجید و حدیثِ رسولِ اکرم صلعم	(۱) قانونِ الہیہ و قوانینِ منظور کردہ قانون ساز
۲) اجماعِ مجتہدین	(۲) بڑے بڑے مفسرینِ قانون کی کتابیں۔
۳) قیاس	(۳) نظائر
۴) استحسان	(۴) نصفت
۵) عرف	(۵) رسم و رواج

کے لئے مقتدرِ اعلیٰ کا ہونا لازمی ہے، اور چونکہ کوئی ایسی قوت یا ارادہ موجود نہیں ہے جسے "بین الاقوامی مقتدرِ اعلیٰ" کہا جاسکے اس وجہ سے اکثر سیاس ان قواعد کو قانون کا لقب دینا پسند نہیں کرتے [۱۹]

ہارون خاں شروانی

اصطلاحات باب ۷ حصّہ (۱)

اثباتی قوانین	Positive Law	قانون الٰہیہ	Divine Law
اصولی قانون	Jurisprudence	قانونِ انتظامی	Administrative Law
اخلاق	Morality	قانونِ تعزیری	Criminal Law
ازالۂ حیثیتِ عرفی	Defamation	قانون ساز، مقنن	Law-maker
پارلیمنٹی حکومت	Parliamentary Government	قانونِ عامہ	Public Law
تاویلِ قانون	Interpretation of Law	قانونِ لگان	Law of Rent
جمہوریہ	Republic	قانونِ معاہدہ	Law of Contract
حدِ اختیار	Jurisdiction	قانونِ مملوکات	Law of Property
حکمِ امتناعی	Injunction	قوانینِ اضافی	Adjective Laws
خانگی قانون	Private Law	قوانینِ اصلی	Substantive Laws
شخصی حکومت	Autocracy	مآخذِ قانون	Sources of Law
شرعِ اسلامی	Islamic Law	مافوق الفطرت ہستی	Supernatural Being
صدارتی حکومت	Presidential Government	مجلسِ بلدیہ	Municipal Council
عادل	Judge	مجلسِ ریلوے	Railway Board
عدالت العالیہ	High Court	نصفت	Equity
فوجی قانون	Martial Law	نقصان رسانی	Tort

[۱۹] پروفیسر آموس اپنی کتاب "علمِ قانون" Amos: The Science of Law باب ۵ میں اُن قوانین کا جو اُن کی دانست میں کسی متمدن مملکت کے لئے ضروری ہیں، شمار کرتے ہیں۔ ہم نے اس فہرست میں تھوڑی بہت ضروری ترمیم حسبِ حال کر دی ہے:۔

قوانین

- قوانین جن کے اصول منضبط ہو سکتے ہیں
  - قانونِ دستوری
  - قانونِ ملک
  - قانونِ معاہدہ
  - قوانینِ خصوصی
  - قوانینِ مزیجا
  - قانونِ تعزیری
  - ضابطۂ دیوانی و فوجداری
    - قوانین متعلقہ مدارج مقدمہ
    - قوانین متعلقہ حد انتہائے مملکت
- قوانین جن کے اصول منضبط نہیں ہو سکتے
  - وقتی قوانین
  - مقامی قوانین
  - دقتی و جزوی رسم و رواج جس کی حیثیت قانون کی سی ہے
  - ضابطوں کے مابین ساختہ قوانین

غزل

شکر ہے کہ دل دے کر یارِ دلربا پایا
یعنی جس قدر کھویا اُس سے کچھ سوا پایا

خنجرِ فنا کھا کر ثمرۂ بقا پایا
زیست کی بنا ڈھا کر زیست کا مزا پایا

جبر کرنے والوں نے جبر کر کے کیا پایا
صبر کرنے والوں نے صبر کا صلہ پایا

جس نے ہر دو عالم کو چشمِ غور سے دیکھا
اُس نے ہر دو عالم سے تم کو ماورے پایا

ہم نے بے نشاں ہو کر آپ کا نشاں ڈھونڈا
ہم نے آپ کو کھو کر آپ کا پتا پایا

شاد رہ کے بھی شاکر، رنج سہ کے بھی شاکر
بندۂ محبت کو بندۂ رضا پایا

ہم کو بتکدے میں بھی شانِ حق نظر آئی
ہم نے بتکدے کو بھی خانۂ خدا پایا

صرف اِک غمِ الفت وجہِ صد خوشی دیکھا
ورنہ ہر تعلق کو رنج و غم فزا پایا

ہاں متاعِ راحت بھی قیمتی سہی لیکن
جنسِ دردِ الفت کو جنسِ بے بہا پایا

سچ تو یہ ہے رندوں کا حال پھر غنیمت ہے
اِتّقا پسندوں کو صرفِ اِتقا پایا

اے ندیم دُور اندیش میں نے عشقِ جاناں میں
یہ نہ پوچھ کیا کھویا، اِس کو دیکھ کیا پایا

اِس میں شک نہیں آزاد شوخ بھی ہے منہ پھٹ بھی
کچھ سہی، مگر اُس کو آدمی کھرا پایا

حکیم آزاد انصاری

سرمایۂ مشترک

(بہ سلسلۂ اشاعت گزشتہ)

ہندو اور اُردو - ہندوؤں کے ساتھ جو زیادتی کی گئی اُس کا ذکر مجملاً ضمن گذشتہ میں ہو چکا - اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کا زبانِ اردو پر کیا استحقاق ہے اور انہوں نے زبانِ اردو کی کیا خدمت کی ہم ایک دفعہ پھر کہے دیتے ہیں کہ جب تک ہندو مسلمان متحدہ کوشش اور یک جہتی سے کام نہ لیں گے اردو زبان کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی - اہلِ ہند کو مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شروانی کے یہ الفاظ گوشِ ہوش سے سننے چاہئیں "ریختہ کہو اردو کہو - ہندی کہو - جو نام چاہو رکھو - مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی عام رائج زبان ہندو اور مسلمان اہلِ ادب کی محنتِ مشترکہ کا ثمر ہے - ابتدائے شاعری سے لے کر انتہا تک یہ اشتراکِ محنت عیاں ہے (دیباچہ تذکرۂ میر حسن صفحہ ۱۲) ایسے جید مفتی کی شہادت کے سامنے کسی کم سواد مسلمان کا وراثتِ بلا شرکتِ غیرے کا دعوے دار ہونا بے معنی ہے - اب اردو زبان کے کہنہ مشق ادیب - دیرانہ - محسن - اور اقلیم سخن کے جہاں نورد سیاح ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کی زجر بھی ملاحظہ فرمائیے "متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو ہنوز اُس ذمہ داری کا احساس نہیں ہوا جو اُن پر اپنی زبان کی تحصیل اور اپنی ادبیات کی خدمت کے سلسلہ میں عائد ہوتی ہے - نہایت رنج و کرب سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی ادبیات نے وطنیت کے اُس غلط مفہوم سے بے حد صدمات اُٹھائے ہیں جسے فرقہ وارانہ جذبات سے الگ کرنا مشکل ہے - صوبہ جاتِ متحدہ کے بعض مقامات پر ایسے تعلیم یافتہ ہندو دیکھنے میں آتے ہیں اور انہیں دیکھ کر طبیعت منغص ہو جاتی ہے جن کے دماغ میں یہ بات سمائی ہے کہ ہندی اُن سے متوقع ہے کہ وہ اُس اردو زبان اور اردو ادب سے کلیتاً خالی الذہن ہو جائیں جس میں ایک دو پشت پہلے اُن کے بزرگ دادِ سخن دیا کرتے تھے - اُن مسلمان نوجوانوں سے ملنا بھی کچھ کم انقباضِ خاطر کا موجب نہیں ہوتا جن کے لب پر ہمیشہ یہ شکایت ہوتی ہے کہ ہندو اردو کی طرف ملتفت نہیں ہوتے - اگر ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ حضرت پہلے یہ تو فرمائیے کہ آنجناب نے زبانِ اردو کی کیا خدمت کی ہے تو بغلیں جھانکنے لگیں - اِس پر یہ ادعا کہ آپ ہی زبانِ اردو کے واحد محافظ اور تنہا اجارہ دار ہیں" (تقریب تاریخِ ادبیاتِ اردو مولفہ رام بابو سکسینہ بزبان انگریزی) لالہ سری رام اپنی غیر فانی تصنیف خمخانۂ جاوید جلد (۱) صفحہ ۱۲۶ میں لالہ ٹیک چند بہار کے متعلق فرماتے ہیں "اور نادر شاہی دار و گیر کے وقت

بھی قزلباش سپاہیوں سے فارسی لغات و محاورات کی تحقیق کرتے پھرتے تھے۔ اللہ اللہ ایک وہ سچے قوم اور ملک کی خدمت کرنے والے تھے اور ایک اس زمانہ کے اہلِ علم ہیں کہ اپنی مادری زبان (اردو) کی درستی اور تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے" اس بارے میں گارساں دتاسی کہتا ہے کہ بے شمار ہندو ایسے ہیں جن کی تصانیف اردو میں موجود ہیں اور پہلے تو وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اُس کے اندازہ میں ۸۰۰ خالص اردو کے ہندو شعرا اس وقت موجود ہیں۔ گویا ذی فہم مسلم و ہندو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اردو زبان کو سرمایۂ مشترک سمجھو اس کے حصے بخرے کرنے کا خیال تک دل میں نہ لاؤ۔ ورنہ یہ بزرگوں کے وقت کا اندوختہ خورد برد ہو جائے گا۔ مسلمان کافر نعمت ہیں اگر زبان کے سلسلہ میں ہندو ادبا کی خدمات کا اعتراف نہ کریں۔ ہندو اپنے بزرگوں کے سچے جانشین نہیں اگر وہ بزرگوں کی اس امانت کو سینہ سے نہ لگائیں۔ منشی دیبی پرشاد نے "تذکرۂ شعرائے ہنود" ایک ضخیم جلد میں مرتب کرکے شائع کیا ہے جس میں سینکڑوں ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ لیکن ہم ذیل میں ایسے ہندو ادبا کے اسمائے گرامی درج کرتے ہیں جو یا تو جگت استاد تسلیم کئے گئے ہیں یا صاحبِ دیوان ہیں۔ یا بنوعِ دیگر ناموری کے مستحق ہیں درجۂ اوسط و ادنیٰ کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔

(۱) ولی اورنگ آبادی کی غزلوں میں گوبند لال امرت لال اور کھیم داس کے نام جا بجا آتے ہیں۔ بلکہ ایک آدھ غزل میں تو بعض ناموں کو ردیف قرار دیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اصحاب اگر سخن گو نہ تھے تو بھی اُن کی سخن فہمی میں کلام نہیں۔ ورنہ ولی کیوں ذکر کرتا۔ (دیباچہ کلیات ولی مرتبہ احسن مارہروی صفحہ ۶۳)

(۲) رائے آنند رام مخلص فارسی کے زبردست شاعر بیدل کے شاگرد ریختہ بھی کہتے تھے (تذکرہ میر تقی صفحہ ۹)

(۳) ٹیک چند بہار فارسی میں جگت استاد کا رتبہ رکھتے ہیں فارسی کا ضخیم لغات موسومہ بہارِ عجم محمد شاہ کے زمانہ میں مرتب کیا۔ ریختہ میں کافی ذخیرہ چھوڑا۔ تذکرہ میر تقی صفحہ ۱۴)

(۴) بندرابن راقم شاگرد میر تقی و میرزا سودا۔ جتنا قد چھوٹا تھا اتنا ہی فکر بلند تھا (تذکرہ میر تقی صفحہ ۱۵۳)

(۵) رائے پریم ناتھ موزوں۔ موزوں طبع شاعر۔ فارسی و ریختہ میں کامل۔ خطاطی اور کمانداری میں ماہر تھا۔ (تذکرہ میر حسن صفحہ ۵۱)

(۶) سنتوکھ رائے بیتاب بہت خلوت دوست تھے اُس زمانہ میں یہ رباعی کہہ گئے ؎

یاں آکے ہم اپنے مدعا کو بھولے ۔۔۔ رل مل کے غیروں سے آشنا کو بھولے
دنیا کی تلاش میں گنوائی سب عمر ۔۔۔ اس مس کی طلب میں کیمیا کو بھولے

(تذکرہ میر حسن صفحہ ۶۵)

(۷) آفتاب رائے رسوا۔ آپ کے کلام میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ فارسی و ریختہ ہر دو میں دادِ سخن دیتے تھے۔ دائم الخمر تھے۔ میت کو اُن کی وصیت کے مطابق شراب سے غسل دیا گیا (تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۰۳)

(۸) ہلاس رائے رنگین۔ ریختہ اور فارسی دونوں کے شاعر تھے۔ (" صفحہ ۱۰۵)

(۹) لالہ خوشوقت رائے شاداب۔ میر حسن کہتے ہیں۔ منشی است، نثر خوب مے نویسد۔ یہ شعر

دیکھ اُس کے منہ پہ زلف سیہ فام کے تئیں
کیا زیب دی ہے کفر نے اسلام کے تئیں

بہ داد پاتا ہے۔ مضمونِ خوب یافتہ است (تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۰) رائے بھکاری داس عزیز۔ میر حسن کہتے ہیں۔ شاعرِ زباندان سیلِ طبعش روان و توسنِ خامہ اش دواں۔ (تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۱) رائے لکھرام عاقل۔ شاعر تو خوب تھے مگر پنجابی (تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۲) بدھ سنگھ قلندر۔ میر حسن کے ہمعصر دولت مند تھے۔ عشق کے ہاتھوں قلندری اختیار کی۔ کیا مزے کا شعر کہا ہے۔ ؎

چھپا ہے مانگ میں دل جا کے اب میں ڈھونڈوں کدھر ‌‌ ‌ ‌ ‌ کہ آدھی رات ادھر ہے اور آدھی رات اُدھر

(تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۵۴)

(۱۳) لالہ کاشی ناتھ۔ آپ بھی پنجابی ہیں۔ (تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۶۴)

(۱۴) راجہ رام نرائن موزون۔ حزین کا شاگرد اور فارسی میں صاحبِ دیوان ہے۔ سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کا صوبہ دار تھا۔ جب اِس کی شہادت کی خبر پہنچی تو دیوانہ وار روتا تھا اور اپنا فی البدیہہ شعر پڑھتا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی ‌ ‌ ‌ ‌ دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

(تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۷۳)

(۱۵) عجائب رام منشی مرشد آبادی۔ (" " ۱۸۶)

(۱۶) لالہ نول رائے وفا۔ زیورِ علم و عمل سے آراستہ ہے (" " ۲۰۷)

(۱۷) لالہ سورج نرائن صاحب خاطر۔ ظہیر کے ارشدِ تلامذہ سے ہیں۔

(۱۸) پنڈت سورج پرشاد خورشید۔ وکیل فرخ آباد۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔

(۱۹) منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی - واجد علی شاہ کے متصدی تھے - رامائن اور گیتا کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے - (خمخانہ صفحہ ۸۳)

(۲۰) منشی جیکہ رائے خیال - شاہ نصیر کے ہمعصر تھے -

(۲۱) پنڈت رتن ناتھ دریا لکھنوی - شاگرد حضرت رشک ، فارسی میں عالم بے بدل اور زبردست نقاد تھے -

(۲۲) منشی چندن لال دلگیر - مذہب آبائی کو ترک کر کے مسلمان ہو گئے - ناسخ کے شاگرد تھے مرثیہ کہنا شروع کیا - نواب سعادت علی خاں کے زمانہ کے مرثیہ گو شعرا کے سرتاج تھے - مراثی کا ضخیم مجموعہ طبع ہو چکا ہے - امانت آپ کے شاگرد تھے -

(۲۳) رائے سرب سنگھ دیوانہ بعہدِ شاہِ عالم ثانی چار دیوانِ فارسی اور ایک دیوان اردو ان سے یادگار ہے حسرت استادِ جرأت آپ کے شاگرد تھے -

(۲۴) منشی خوب چند ذکی - شاگردِ نصیر صاحبِ دیوان و تذکرۂ معیار شعرا کے مصنف -

(۲۵) راجہ رام کشن راجہ - صاحبِ دیوان -

(۲۶) مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ - صاحبِ دیوان - موسومہ گلِ ریاض

(۲۷) سروگ بجے سنگھ والیٔ ریاست بلرام پور - شاگرد جواہر سنگھ جوہر صاحب دیوان ۳۰۴

(۲۸) لالہ بھگونت رائے راحت کاکوری امانت سے تلمذ تھا مثنویات زہرہ ، بہرام ، نلدمن ، سوزِ عاشقانہ آپ سے یادگار ہیں -

(۲۹) دیوان جان بہاری لال راضی - صاحبِ دیوان - گلستاں ، بوستاں - اور انوار سہیلی کا اردو نظم میں ترجمہ کیا -

(۳۰) حکیم سکھانند رقم دہلوی نصیر کے شاگرد صاحبِ دیوان -

(۳۱) منشی جگت موہن لال رواں دورِ حاضر کے مشہور شعرا میں شمار ہے -

(۳۲) منشی رام سہائے رونق لکھنوی شاگرد ناسخ

(۳۳) منشی پیارے لال رونق دہلوی شاگرد داغ و راسخ - رونقِ سخن کے علاوہ ایک دیوان اور مرتب کیا - دہلی کے مشہور رسالہ کمال کے آپ ہی ایڈیٹر تھے -

(۳۴) دیوان دیا کرشن ریحان لکھنوی - شاگرد موجی رام موجی و مصحفی و جواہر سنگھ جوہر ان کا دیوانِ اردو "ریحانِ سخن" چھپ گیا ہے -

(۳۵) لالہ بیٹھو لال زار بلگرامی شاگرد منشی طوطا رام عاصی اردو و فارسی میں صاحب دیوان۔ انشائے گلزار فصاحت فارسی کے مصنف۔

(۳۶) راجہ چھنو لال زیب۔ آپ کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔

(۳۷) راجہ جسونت سنگھ پروانہ شاگرد مصحفی صاحب دیوان تھے۔

(۳۸) پنڈت منولال پریشان شاگرد شاہ نصیر۔

(۳۹) رائے ٹیکا رام تسلی۔ ریختہ میں مصحفی اور فارسی میں میرزا ناصر کے شاگرد تھے۔ دواوین کا نایاب کتب خانہ ہزارہا روپیہ کے صرف سے مہیا کیا تھا۔

(۴۰) منشی رام سہائے تسلی۔ حاتم علی مہر کے شاگرد غنچۂ مراد و نغمۂ آرزو دو دیوان مرتب کئے۔

(۴۱) منشی رام سہائے تمنا لکھنوی، فارسی اردو اور بھاشا میں عالمانہ تبحر رکھتے ہیں۔ دوارکا پرشاد افق اور ماتا پرشاد نیسان کے بھائی ہیں اور افضل التاریخ کے مصنف ہیں۔

(۴۲) لالہ مادھو رام جوہری فرخ آبادی شاگرد منیر دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اِن کے فرزند شیو پرشاد جوہری بھی بلند پایہ شاعر تھے۔

(۴۳) منشی جواہر سنگھ جوہر خلف منشی بختاور سنگھ راقم فارسی میں ناطق اور اردو میں خواجہ وزیر سے تلمذ تھا۔ پانچ دیوان تصنیف کئے جو چھپ چکے ہیں۔

(۴۴) سردار کیسرا سنگھ جہانگیر امرت سری شاگرد بیان ویزدانی مخزن کے دورِ اول میں بہت نام پیدا کیا۔ پنجاب میں آج تک کوئی غزل گو اس پایہ کا نہیں ہوا۔

(۴۵) چھبن ناتھ چھبن دہلوی بہار دانش کا نظم اردو میں ترجمہ کیا۔

(۴۶) پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی دورِ حاضر کے اُن جوانمرگ مستند شعرا سے ہیں جن کی ذات سے اردو کو بہت کچھ امیدیں تھیں۔

(۴۷) منشی دنی رام حسرت دہلوی۔ فارسی میں صاحب دیوان اور اردو کے مشہور شاعر۔

(۴۸) پنڈت اجودھیا پرشاد حیرت لکھنوی شاگرد جرأت صاحب دیوان و مثنویات۔

(۴۹) رائے پریم ناتھ دہلوی دو ہزار شعر کا دیوان یادگارِ زمانہ ہے۔

(۵۰) رائے بہادر منشی شیو نرائن شاگرد غالب۔

(۵۱) منشی رام سنگھ آزاد دہلوی ۔ بعد تحصیلِ علم نابینا ہوگئے افسوس دیوان تلف ہوگیا۔

(۵۲) پنڈت امرناتھ آشفتہ دہلوی شاگرد تنویر دہلوی صاحب دیوان۔

(۵۳) ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی۔ پنجاب میں جدید اردو کو آپ کی سعی سے رواج ہوا۔

(۵۴) پنڈت بشن نرائن ابر لکھنوی ۔ دفتر گلزار کشمیر کے مصنف۔

(۵۵) پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی۔

(۵۶) راجہ پرمانند افسر والئی راج۔

(۵۷) منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی ۔ شاگرد منشی شنکر دیال فرحت ٹاڈر اجستان مہابھارت و رامائن کے مترجم

(۵۸) دیوان پنڈت امرناتھ مدن اکبری ۔ دیوان فارسی مع غزلیاتِ اردو شائع ہوچکا ہے۔

(۵۹) راجہ پیارے لال الفتی دہلوی ۔ مثنوی نیرنگِ تقدیر کے مصنف ہیں۔

(۶۰) راجہ گردھاری پرشاد باقی حیدرآبادی ۔ دیوان بقائے باقی، بھاگوت گیتا فارسی ۔ کیشونامہ ۔ کلیاتِ یادگارِ باقی اور قصائدِ باقی آپ سے یادگار ہیں۔

(۶۱) منشی مہاراج بہادر برق شاگرد آغا شاعر نئے طرز کے اچھے کہنے والوں میں ہیں۔

(۶۲) پنڈت چندربھان برہمن ۔ ایک دیوانِ فارسی اور منشیات اُن سے یادگار ہیں۔ ریختہ میں بھی کچھ کہا کرتے تھے۔ شاہجہان کا زمانہ دیکھا ہے

(۶۳) پنڈت سندرلال بسمل لکھنوی شاگرد ناسخ صاحب دیوان۔

(۶۴) پنڈت موتی لال بسمل دہلوی ۔ دو کتابیں فنِ مسمریزم پر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں۔

(۶۵) منشی دیبی پرشاد ۔ بشاش ۔ افسانۂ خردافروز ۔ گلدستۂ ادب ۔ وقائع راجپوتانہ ۔ احکامِ نوشیرواں ۔ تاریخِ ترکانِ ہند ۔ تذکرۂ شعرائے ہنود آپ سے یادگار ہیں۔

(۶۶) لالہ کشن نرائن بیتاب بنارسی صاحب دیوان۔

(۶۷) پنڈت نرائن پرشاد بیتاب مشہور ڈرامانگار۔

(۶۸) راجہ ہرکشن سنگھ بیدار ۔ امرت سر میں دیوان شائع ہوچکا ہے۔

(۶۹) لالہ بالمکند بے صبر بلندشہری شاگرد غالب و تفتہ ، فارسی اور اردو دونوں میں صاحبِ دیوان۔

(۷۰) سالگ رام سالک ۔ دیوانِ ریختہ اور کلامِ نعت شائع ہوچکا ہے۔

(۷۱) منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی۔ آپ کی تصانیف:۔ خلاصۃ المنطق۔ معیار الاملا، محیط المساحت، مراۃ الکلام اور دو دیوان جن میں سے ایک کا نام سحر سامری ہے۔

(۷۲) منشی اقبال ورما سحر۔ زمانہ حال کے نامور شاعر ہیں۔ شکنتلا کا ترجمہ نظم اردو میں کیا ہے۔

(۷۳) منشی اودہم سنگھ سردار امرت سری شاگرد جلال لکھنوی۔

(۷۴) پنڈت رتن ناتھ سرشار اردو میں ناول کے ایجاد کا سہرا آپ کے سر ہے۔

(۷۵) منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی۔ ایک از بس بلند پایہ طبیعت تھی۔ آپ شباب ہی میں اردو کو داغِ مفارقت دے گئے۔

(۷۶) منشی للتا پرشاد۔ شاد۔ میرٹھی ایڈیٹر اخبار ناظم الہند۔

(۷۷) مہاراجہ سرکشن پرشاد۔ شاد

(۷۸) لالہ بالمکند۔ شاد رہتکی۔ مقالہ نگار۔

(۷۹) منشی ٹھاکر پرشاد شاداں لکھنوی۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔

(۸۰) مسٹر پیارے لال۔ شاکر۔ مذہباً عیسائی۔ شاگرد شوکت، اڈیٹر اخبار ادیب مرحوم الہ آباد۔ والعصر لکھنو۔

(۸۱) پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی شاگرد آتش صاحب مثنوی گلزارِ نسیم۔

(۸۲) جوالا پرشاد برق۔ شیکسپیئر کے متعدد ناٹکوں کو اردو میں منتقل کیا۔

(۸۳) راجی بائی سکنہ نارنول ۱۸۴۸ء تک زندہ تھی۔

(۸۴) پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دورِ حاضر کے مسلم الثبوت نقاد۔ شاعر۔ مورخ۔ ڈرامانگار۔ اور کثیر التصنیف ادیب جن کو لکھنو بھی تسلیم کرتا ہے۔

(۸۵) لالہ تلوک چند محروم۔

(۸۶) لالہ بالک رام شاد

(۸۷) منشی نوبت رائے نظر مرحوم۔

(۸۸) منشی دلو رام کوثری نعت میں خوب نام پیدا کیا ہے۔

(۸۹) پنڈت تربھون ناتھ ہجر لکھنوی۔ اودھ پنچ کے نامی نامہ نگار۔

(۹۰) لالہ پریم چند افسانہ مختصر کے طرح انداز

(۹۱) لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی تلمیذ غالب۔

(۹۲) لالہ سری رام جامع تذکرۂ خم خانۂ جاوید۔

(۹۳) لالہ چرنجی لال صاحب مخزن محاورات اردو

(۹۴) بال مکند گپتا المعروف شیسو شنو۔

(۹۵) پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی۔ جن کے دم سے دہلی میں باضابطہ مشاعروں کا نام نمود قائم ہے۔

مزید تلاش سے یہ فہرست اور بھی طویل ہو سکتی ہے۔ مگر مسلمانوں پر جتانے کے لئے کہ ہندو بھی اردو میں معراج کمال حاصل کرنے سے عاری نہیں اور ہندوؤں کو یہ بتانے کے لئے کہ اردو سے تغافل انہیں بزرگوں کی کس قدر وراثت سے محروم کردے گا اتنا ہی بس ہے۔

اردو اور فارسی۔ یہ ہم کئی بار بتا چکے ہیں کہ اردو اُس زبان کا نام ہے جو فارسی اور بھاشا کے ملاپ سے پیدا ہوئی، اس لئے لازم تو یہ تھا کہ اُردو میں فارسی اور بھاشا کا توازن قائم رہتا۔ اور ان سے استمداد میں دامن عدل ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا۔ لیکن ہُوا اِس کے برعکس۔ بھاشا کے اثر کو کم کرنے میں سعی بلیغ سے کام لیا گیا اور اردو کو فارسی کی باندی بنا دیا گیا۔ اُن تلمیحات سے جو خاص ہندوستان سے متعلق تھیں ارادتاً اعراض کیا گیا اور بھاشا کے الفاظ بے سود و بلاوجہ مجلس اردو سے نکال باہر کئے گئے۔ ایسی زبان بازاری قرار پائی جس میں ہندی تلمیحات اور الفاظ نمایاں ہوں۔ ایران اور عرب سے تلمیحات و تشبیہات لائی گئیں۔ عربی بحور اور اوزان میں شعر کہنے لگے۔ فارسی کی صرف و نحو کی بنا پر اردو کی صرف و نحو مرتب ہوئی اردو زبان ایران سے سند لینے لگی اور ایسی زنجیروں میں جکڑی گئی کہ فارسی کے اشارہ کے بغیر ہلنے تک کی سکت نہ رہی۔ اس پر اب یہ شرطیں زیادہ کی جاتی ہیں کہ عربی اور فارسی کے الفاظ اُس صورت میں بولے جائیں جو اُن کی عربی اور فارسی یا ترکی میں ہے۔ صرف عربی اور فارسی کے الفاظ مضاف و مضاف الیہ ہوں۔ واو عاطفہ صرف عربی و فارسی کے الفاظ میں آئے۔ کوئی ترکیب استعمال نہ کی جائے جب تک کہ فارسی سے اُس کی سند نہ ملے۔ فارسی میں تو جھروکا درشن، ڈالی انبہ، کھچڑی بریانی، جائز بلکہ ملوک الکلام لیکن اردو میں ناجائز۔ بہت اچھا اگر آپ فارسی کی واو عاطفہ کو ہندو لول کے مس سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس میں آپ کی فارسی کا کیا ہرج ہے اگر ہندی کے الفاظ میں وہ واو استعمال کی جائے جو اور کی تخفیف ہے اور ہندی میں استعمال ہوتی ہے۔ ہندی کی دیاکرن (صرف و نحو) میں فقرہ آتا ہے "..." ناگر یہ میں ماترا و ورن کی گنتی کا کوئی بندھن نہیں رہتا۔ ماترا اور ورن کے درمیان جو "و" ہے اس کے

استعمال میں آپ کیا اعتراض کرسکتے ہیں۔ وہ ستم شعار جو تحصیلِ زبان کو دہلی یا لکھنؤ کے قیام پر موقوف رکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرمائیں گے کہ فارسی سیکھنے کے لئے ایران جاؤ اور عربی کے لئے حجاز کی زیارت کرو۔ گویا زبان سیکھنے کے لئے پاؤں میں چکر ہونا شرط ہے۔ جو قوم" زبان کی خاطر معانی کی پروا نہ کرے اُس سے زبان کو دولتِ علوم سے مالا مال کرنے کی توقع عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زبان میں ایسی غرابت پیدا ہوگئی ہے کہ اُس کا سیکھنا عربی، سنسکرت اور عبرانی سے کم مشکل نہیں۔ اِس ایک زبان کے سیکھنے کے لئے عربی و فارسی کی مزاولت لازم اور ایران و عرب کی تاریخ میں دستگاہ کامل درکار ہے، اور یہ بھی کم ضروری نہیں کہ ہندی تہذیب کو فراموش کرنے کا ڈھنگ آتا ہو۔ بچوں کے سامنے جو صرف و نحو آتی ہے اُس کی اصطلاحات عربی کے سراسر اغیر مانوس الفاظ میں وضع کی گئی ہیں۔ جن کے معنی بچے تو کیا اُستاد بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اِن اصطلاحات کو بچے رٹ لیتے ہیں اور مارے باندھے ازبر کر لیتے ہیں لیکن اُن کے معنی انہیں اُس وقت تک نہیں آتے جب انہیں یاد رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ علمِ بیان و معانی کا جاننا بھی عربی و فارسی کی تحصیل چاہتا ہے۔ عروض کی تو پوچھئے ہی نہیں کلیتہً عربی میں ہے کیا مزے کی بات ہے کہ اردو کے موتی عربی کی میزان میں تولے جاتے ہیں۔ اور ڈھاکہ کی ململ تازی گز سے ناپی جاتی ہے۔ یہ لچھن تو ملک کی عام زبان بننے کے نہیں۔ وہ زبان جو دنیا و ما فیہا کو خیرباد کہنے کے بغیر نہ آئے اُسے آج کل کے زمانہ میں کون سیکھنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ رسم الخط کی بے عنوانی اور تذکیر و تانیث کے اختلافات دوسرے اسباب ہیں جو زبان کو گورکھ دھندا بنا رہے ہیں۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان عقدوں کا حل کس طرح کیا جائے؟ ہم فارسی کی تقلید میں اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ ایک قدم بھی پیچھے ہٹ نہیں سکتے۔ اور ان لئے اردو کو فارسی کے تاثرات سے پاک کرنا خیالِ خام ہے۔ مگر ان قیود کی گرفت ڈھیلی ہوسکتی ہے اور بھاشا کے عنصر کو شوخ کرنے سے بہت سی آسانیاں پیدا کرنے کے علاوہ مغائرت کی بڑھتی ہوئی رَو رُک سکتی ہے۔

رسم الخط کی اصلاح کے بعد سب سے ضروری کام یہ ہے کہ صرف و نحو کو انگریزی گریمر کے سانچے میں ڈھالا جائے جیسا کہ ہندی میں کیا گیا ہے۔ اصطلاحات کے لئے ایسے الفاظ منتخب کئے جائیں جو مانوس ہوں یا آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔ مروجہ عربی اصطلاحات کو یک قلم ترک کر دینا اگر قرینِ مصلحت نہ ہو تو اُن کے بجائے جدید آسان اصطلاحات لکھ دی جائیں اور اس نئے انتخاب میں ہندی مترادفات کو مدِ نظر رکھا جائے۔ عربی بحور و اوزان قائم رہیں مگر بھاشا کے "ماترا و ورن" کا استعمال بھی ناجائز نہ رہے۔ اضافت اور واو عطف کے متعلق تمام قیود اٹھا دیئے جائیں اور اُن کے استعمال کو ذوقِ سلیم پر چھوڑا جائے۔ وضعِ اصطلاحات کے قواعد ہندی کی طرح صرف و نحو کا جزو بنائے

ہیں اور ان قواعد کے مطابق الفاظ بنانے کا اذنِ عام دیا جائے (پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم اس بارے میں بہت کچھ کام کر چکے ہیں۔ اور اب تھوڑی سی محنت سے قواعد مرتب ہو سکتے ہیں) بھاشا کے وہ الفاظ اور ہندوؤں کے وہ محاورات جنہیں فالن اور سید احمد لغات میں داخل کر چکے ہیں ٹکسالی تسلیم کئے جائیں۔ تذکیر و تانیث کی فرد پر نظرِ ثانی کی جائے۔ اور لاہور حیدر آباد لکھنؤ اور دہلی کے کثرت سے رواج کی بنا پر فیصلہ قرار دیا جائے مثلاً

لفظ	دہلی	لکھنؤ	لاہور	قابلِ قبول
ناک	مؤنث	مؤنث	مذکر	مؤنث
التماس	مذکر	مؤنث	مؤنث	مؤنث
رسم	مؤنث	مذکر	مؤنث	مؤنث
دسترس	مؤنث	مذکر	مؤنث	مؤنث

اس طرح جب اس اصول کو زیرِ نظر رکھ کر قصہ طے ہو جائے تو اُس کے مطابق تذکیر و تانیث کا ایک قطعی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ زبان میں یگانگت پیدا نہ ہوگی۔ مروجہ اصول کو جانے دیجیے ہر قاعدہ کے اس قدر مستثنیات ہیں کہ سنسکرت میں بھی نہ ہونگی۔ اِس کے آسان اور جامع قاعدے نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہر چہار مقاماتِ مذکور پر حاوی ہوں۔ اس طرح متروکات پر غور کیا جائے اور جو الفاظ ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور محض کسی ضد کے باعث گردن زدنی قرار دیئے گئے ہوں انہیں پھر زبان میں داخل کیا جائے۔ عربی و فارسی کے غیر مانوس و ثقیل الفاظ رخصت کئے جائیں۔ سوائے اُن الفاظ کے جو زبان پر چڑھ گئے ہوں۔ الحاق کے لئے عربی "ال" کے بجائے اضافت سے کام لیا جائے۔

اِن خیالات کو اربابِ ذوق کے سامنے پیش کرنے میں محض خدمتِ زبان منظور ہے۔ حاشا کسی صاحب شان کی دل آزاری یا کسرِ شان مدنظر نہیں۔ ہمارے خیال میں اِن تجاویز پر عمل پیرا ہونے سے زبان کا حلقہ وسیع ہو جائے گا، اس میں ہندوستان کی ملکی و قومی زبان بننے کی اہلیت زیادہ ہوگی اور تحصیلِ زبان آسان ہو جائے گی ہندو و مسلم کا تفرقہ کم کرنے کا ایک زبردست آلہ ہاتھ آ جائے گا، تعصب کا عیب دُور ہو گا، زبان ایک سرمایۂ مشترک بن جائے گی جس کی ملکیت میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پنجابی، یوپی والے، دہلوی، لکھنوی، بنگالی، بہاری

اور دکنی وغیرہ کی تخصیص نہ رہے گی۔ اور

قسمتِ بادہ باندازۂ جام ست ایں جا

پھر ناموری اور تفوق کا مدار قابلیت پر ہوگا اس سے آگے تفصیلات ہیں مگر کیوں اور کہاں۔ اور کیونکر کا فیصلہ کرنے کے لئے انجمن ترقیٔ اردو اور آپ کا آرگن موجود ہیں۔ "پنجاب اور اردو" کے علاوہ اور بہت سے مباحث بخوفِ طوالت رہے جاتے ہیں۔ خیر۔ لیکن اگر یہی سطور کوئی فائدہ مند نتیجہ پیدا کریں تو شاید اتنا بھی ناکافی نہ ہو۔ ممکن ہے کہ جو علاج ہم نے بتایا ہے تیر بہدف نہ ہو لیکن اگر نباضان زبان اس طرف توجہ کریں تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری سعی مشکور ہوئی۔

"ڈرامی"

تصنیف

مصنف کا انتخاب کرو جیسے تم اپنے دوستوں کا کرتے ہو۔

اپنے دل میں دیکھ اور لکھ

مصنف کی دو زبردست قوتیں نئی چیزوں کو ہر دلعزیز اور ہر دلعزیز چیزوں کو نت نئی چیزیں بناتی رہتا ہے۔

جو مصنف بنے اس لئے کہ مشہور ہو اُس بیوقوف کی مانند ہے جو بازار میں جائے تاکہ لوگ اُسے دیکھیں

مصنف بنا چاہتے ہو تو پہلے طالب علم بنو

گلچیں

چشم

اے چشم تُو دُرِ بے بہا ہے ‏ ‏ تو جلوۂ قدرتِ خدا ہے
اِنسان کی آبرو ہے تجھ سے ‏ ‏ دیدار کی آرزو ہے تجھ سے
بجلی کی طرح چمک رہی ہے ‏ ‏ ہیرے کی طرح دمک رہی ہے
ہے پھول کنول کا ماند تجھ سے ‏ ‏ شرماتا ہے دیکھ چاند تجھ سے
دو ابرو لئے کماں کھڑے ہیں ‏ ‏ گویا کہ دو پاسباں کھڑے ہیں
جب تک کہ ہیں تیز تیرِ مژگاں ‏ ‏ محفوظ ہے تیرا گنجِ پنہاں
آتے جو نظر ہیں چاند تارے ‏ ‏ تیری ہی نظر کے ہیں اشارے
تُو نورِ خدا کا ایک پارہ ‏ ‏ تُو صبحِ امید کا ستارہ
گر تُو ہے تو جینے کا مزا ہے ‏ ‏ گر تُو نہیں، زندگی بلا ہے
کیا سیرِ جہاں دکھا رہی ہے ‏ ‏ ہستی کا مزا چکھا رہی ہے
ہے رنگ کبھی وفا کا تجھ میں ‏ ‏ ہے قہر کبھی جفا کا تجھ میں
کیا شے ترے جام میں بھری ہے ‏ ‏ جادو ہے کہ سحرِ سامری ہے
مستی سے بھرا ہے جام تیرا ‏ ‏ ہے مستِ سیاہ نام تیرا
گردش سے تری جہان پلٹا ‏ ‏ تُو پلٹی تو آسمان پلٹا
کچھ سوز ہے کچھ گداز تجھ میں ‏ ‏ کچھ ناز ہے کچھ نیاز تجھ میں
کتنے ترے حسن پر ہیں مائل ‏ ‏ کتنے ہیں جہاں میں تیرے گھائل
کُشتے ہیں کئی تری حیا کے ‏ ‏ غمزے ترے تیر ہیں قضا کے
دِل چھین لیا تری ادا نے ‏ ‏ وارفتہ کیا تری رضا نے

ناوک فگنی کہاں سے سیکھی — یہ دل شکنی کہاں سے سیکھی

مستانہ مجھے تو پھر بنادے — پھر جلوۂ بے خودی دکھادے

پھر پیش نظر وہی سماں ہو — پھر عیش کی رات کا گماں ہو

بچپن کی وہ مستیاں کہاں ہیں — وہ بادہ پرستیاں کہاں ہیں

کیا بھول گئیں وہ پہلی باتیں — دن عیش کے بہشتی کی راتیں

دل رنج سے جب نہ آشنا تھا — جانب سے نہ غیر کی گلا تھا

جب دل کو نہ تھی یہ بے قراری — تھی لب پہ کبھی نہ آہ وزاری

تاریکیٔ شب کو دُور کردے
دامن میں سحر کا نُور بھر دے

رام پرشاد کھوسلہ ناشاد

غزل

اب وہ رنگینیٔ بہار کہاں! — آہ! وہ بزم زرنگار کہاں!

ذرے تھے تابِ حسن سے پُرنور — ہائے وہ دشتِ زرنگار کہاں!

آرزو سے رہی نہ دلچسپی — اب فریبِ وصالِ یار کہاں!

کرچکے نذر آپ دل اپنا — اب ہمیں اس پہ اختیار کہاں!

عہد و پیماں تو باندھتے ہیں وہ — بات کا اُن کی اعتبار کہاں!

کیفیت انتظار کی مت پوچھ؟ — دل کو تنہائی میں قرار کہاں!

جوش ایسے خیالِ خام کو چھوڑ
تو کہاں؟ اور وہ نو بہار کہاں؟

جوش

کھویا ہُوا احترام

کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

دو بھائیوں کے متعلق ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ انہیں بکریاں چُرانے کے الزام میں گرفتار کرکے ایک قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جرم ثابت ہو جانے کے بعد قاضی نے حکم دیا کہ وہ چار سال تک اُس نہر پر کام کریں جو رفاہِ عام کے لئے شہر کے باہر کھودی جا رہی تھی۔ چونکہ اُس زمانہ میں جرائم کو روکنے کے لئے عبرتناک سزائیں دی جاتی تھیں تاکہ پھر کسی دوسرے آدمی کو امنِ عامہ میں خلل انداز ہونے کا حوصلہ نہ ہو سکے اس لئے سزا کی میعاد مجرموں کی پیشانیوں پر داغ دی جاتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کی پیشانیوں پر ۴[1] (چار) کا ہندسہ داغ دیا گیا۔

سزا کی میعاد گزرنے کے بعد دونوں بھائی رہا کر دیئے گئے۔ ایک بھائی اُس ذلت کو جو اُس کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے ثبت کر دی گئی تھی، برداشت نہ کر سکا اور شرم کے مارے کسی دور دراز ملک کو بھاگ گیا جہاں کے باشندے اُس کے جرم سے قطعًا ناواقف تھے۔ لیکن افسوس وہاں بھی اُسے اطمینانِ قلب نصیب نہ ہو سکا کیونکہ اُس کی پیشانی پر چار کا عدد دیکھ کر لوگ حیران ہو جاتے پھر اُس سے اس کا سبب دریافت کرتے اور اپنی حیرانی رفع کرنے کے لئے اُس سے مختلف قسم کے سوالات کر کے اُسے پریشان کر دیتے۔ یہ سوالات اُس کے دل کو پارہ پارہ کر دینے کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک وہ مختلف ملکوں میں اپنی اِس دوامی ذلت کو چھپانے کے لئے گھومتا رہا اور عنفوانِ شباب ہی میں مر کر ایک گمنام قبر میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

دوسرے بھائی کو بھی اپنی اس بے عزتی کا احساس ہُوا لیکن وہ اپنے بھائی کی طرح کمزور دل و دماغ کا انسان نہ تھا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا "میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ میں نے بکریاں چُرائی تھیں لیکن مَیں اسی جگہ رہ کر اپنا کھویا ہُوا احترام حاصل کروں گا"۔

زندگی کے دن گزرتے گئے، اُسی خاموشی اور تیزی کے ساتھ جس طرح کہ وہ گزر جانے کے عادی ہیں، اور

---

[1] عربی زبان میں ۴ کا عدد یوں ع بھی لکھا جاتا ہے۔

یہ اپنے عزم میں پکا انسان ایک شریف اور دیانتدار آدمی کی طرح اپنے دن بسر کرتا رہا - وہ نیک نیتی سے اپنے کام سرانجام دیتا اور ہر فرد بشر کے ساتھ نہایت خلوص و محبت سے پیش آتا - وہ ہر بیمار پڑوسی کی تیمار داری کرتا اور ابنائے وطن کی خدمت گذاری کو اپنا نصب العین سمجھتا - ایک دن کوئی اجنبی اُس شہر میں آیا اور بوڑھے آدمی کی پیشانی پر م کا مہندسہ دیکھ کر اُس نے شہر کے ایک باشندہ سے دریافت کیا "کیوں جناب آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس سفید ریش بزرگ کی پیشانی کا نشان کیا معنی رکھتا ہے"؟

یہ سنتے ہی شہری ایک گہری سوچ میں پڑ گیا پھر چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہنے لگا " یہ بہت عرصہ کی بات ہے اس لئے اس کی تفصیل تو میرے حافظہ کی پناہ میں نہیں رہی لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ حرف " علیہ السلام" کا مخفف ہے "

کتنا رحم آتا ہے دوسرے بھائی کی حالت پر جو تمام دنیا کی تلخی، ذلت اور رنج و غم کا احساس لے کر دربدر پھرتا رہا لیکن پھر بھی اپنے جرم کو لوگوں کی آنکھوں سے پنہاں نہ رکھ سکا - جہاں کہیں وہ جاتا لوگوں کی حیرت طلب نگاہیں اس کی طرف اُٹھتیں کیونکہ انسانوں کی آنکھیں ہر نئی اور عجیب شے دیکھنے کی آرزومند ہوتی ہیں اور وہ خود ایک عجیب چیز اپنی پیشانی پر نمایاں کئے ہوئے تھا -

دنیا میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے انسان بھاگ کر اپنی عزت و حرمت بحال رکھ سکتا ہے - مثلاً کسی شخص کے پڑوسی یا ابنائے وطن غیر منصفانہ طور پر اُس کے خلاف ہوں اور یہ مخالفت نتیجہ ہو ناواقفیت یا عقل سوز تجارتی، مذہبی یا معاشرتی تعصب کا تو وہ دیگر محلہ یا ملک میں نقل مکان یا ہجرت کر سکتا ہے اور وہاں اپنی قسم کے لوگوں میں اتنی ہی مسرت یا خوشی حاصل کر سکتا ہے جس کا کہ وہ اپنی خصلت یا عادت کے سبب حقدار ہو - اس حالت میں اُس نے اپنی شہرت کے سوا کچھ نہیں کھویا، اُس کی حرمت اور عزت نفس اُس کے ساتھ ہے -

اگر اُس نے ذاتی اغراض یا نفس پرستی کے جذبات سے مجبور ہو کر کوئی ایسا فعل کیا ہے جس سے اُس کی شہرت اور ذاتی احترام بھی کھویا گیا ہو تو اُس حالت میں بھاگ جانا بُرے حالات کو بدترین صورت میں تبدیل کر دیگا ——— کون نہیں جانتا کہ اس محدود دنیا میں ضمیر کے کچوکوں سے بچنا ازبس محال و ناممکن ہے -

اگر ایسا شخص کسی ہمسایہ ملک میں بھاگ کر چلا جائے اور وہاں اپنی عزت اور وقار قائم کر لینے میں کامیاب بھی ہو جائے تو دو خدشے ہر وقت اُس کی جان کھاتے رہیں گے - اول، یہ خوف کہ اُس کا کوئی واقف حال وہاں آ کر اُس کے گذشتہ حالات سے لوگوں کو واقف نہ کر دے - دوم، اس بات کا احساس کہ وہ بزدل اور کمزور ہے اور وہ لوگ

ابھی تک اُسے نفرت وحقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن سے بھاگ کر آیا تھا۔

کیا کوئی شکست خوردہ پہلوان اُس وقت تک اپنا کھویا ہوا احترام حاصل کر سکتا ہے تاوقتیکہ وہ اُسی جگہ اُسی آدمی کو بچھاڑ نہ دے جس نے اُسے ذلت آمیز زک دی تھی؟ محمد غوری کی سپاہ نے ۱۱۹۱ء میں جب تراوڑی کے میدان میں شکست کھائی اور اُن سپاہیوں کے ساتھ جو میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے تھے، جو سلوک ہوا اُس کا حال تاریخ دان طبقہ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ جَو کے توبرے اُن کے منہ کے ساتھ بندھوا کر غور کے بازاروں میں انہیں پھرایا گیا۔ گویا وہ انسان نہ تھے گدھے تھے لیکن دو سال بعد جب انہیں ہزیمت خوردہ سپاہیوں اور سرداروں نے ۱۱۹۳ء میں پانی پت کے میدان میں پرتھی راج اور اُس کے تمام مددگاروں کی افواج کو شکست دے کر اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم کر دی تو وہی ذلیل گدھے بادشاہ کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے تھے ـــــ گم شدہ چیز اسی جگہ تلاش کی جا سکتی ہے جہاں وہ کھوئی گئی ہو۔ تراوڑی میں اپنی سپاہیانہ حرمت کھو کر غور میں تلاش کرنا نہ صرف غیر ممکن ہے بلکہ جنون کا اظہار ہے۔

اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور یاد رکھو کہ جمہور کا حافظہ نہایت کمزور ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُن کے دماغ کمزور ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ غیروں کی شہرت و احترام کے متعلق وہ زیادہ دیر تک اپنے دل و دماغ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ اس زمانہ میں جب ہر شخص قوت لایموت کی الجھنوں میں الجھا ہوا ہے۔ ٹھنڈی راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریاں تلاش کرنے کے لئے کسی کے پاس بھی وقت نہیں اس لئے کھویا ہوا وقار حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں آج کی رائیں آج کے تاثرات پر قائم کی جاتی ہیں کل کے تاثرات پر پھر نئی آرا قائم ہونگی۔

اگر ایک بدنام کھلاڑی مقابلہ کی دوڑ میں جیت جائے تو بہت کم لوگ ہونگے جو اُس کی گذشتہ ناکامیوں کا تذکرہ کریں گے اور اُن میں بھی زیادہ تعداد اُن حاسدوں اور دشمنوں کی ہوگی جو بلاوجہ اُس کے ساتھ حسد اور دشمنی رکھتے ہیں اور ایسے کم عقل لوگوں کی کسی زمانہ میں بھی کمی نہیں رہی۔ جب بغداد کا مشہور چور ابنِ ساباط بغداد ہی میں رہ کر ایک عالم باعمل اور متقی و پرہیزگار انسان بن سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اور میں اپنے وطن میں رہ کر اپنے قصور کی تلافی نہ کر سکیں۔

محمد ضیاء الدین شمسی

(ماخوذ)

تجلّیات

(۱)

سما گیا ہے کچھ ایسا مری نگاہ میں حسن
کہ میرے نالوں میں ہے حسن میری آہ میں حسن
مثال حسن کی دنیا میں ہے آپ اپنی
ترے عتاب میں ہے حسن تیری چاہ میں حسن

~~~

(۲)

ترے جمال کی رنگینیوں کا شیدا ہوں
ترے کمال کی خودبینیوں کا شیدا ہوں
یہ واہ واہ جو کرتا ہوں لطف لے لے کر
ترے ہی حسن کی رنگینیوں کا شیدا ہوں

~~~

(۳)

تری نگاہ سے سرشتے فنا ہیں سینے میں
ہیں درد مند جو تیرے قضا ہے سینے میں
چبھن سے جو ان کے لگیں ہیں انگلیاں تیری
وہ کام کر گئی محبت خدا ہے سینے میں

~~~

(۴)

کمال حسن ازل کا ظہور ہے عالم
ضیائے یار کی آغوش نور ہے عالم
سب ایک نور ہے جو شش جہت میں پھیلا ہے
امینؔ سمجھے ہوئے ہیں یا ظہور ہے عالم

امین حزیں
~~~

تجربات

(۱) دنیا میں صرف ایک ہی چیز یقینی ہے ۔ موت

(۲) ایک فقیر سے کسی نے پوچھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے ۔ اُس نے جواب دیا "مرنا سچ اور جینا جھوٹ"

(۳) ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ موت کی خواہش کرتا ہے بعض بن چلے تو اس گھڑی جان پر کھیل جاتے ہیں اور بعض نامعلوم عواقب کے خوف سے زندہ درگور زندگی بسر کرنے پر ہی قناعت کرتے ہیں۔

(۴) خودکشی پر دو مختلف پہلوؤں سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے :-

الف ۔ یہ سراسر بزدلی ہے کہ تکالیف سے گھبرا کر موت کی پناہ ڈھونڈی جائے ۔ ہمت و مردانگی کا تقاضا ہے کہ مصائب وحوادث کا مقابلہ کر کے مخالف قوتوں کو زیر کیا جائے ۔

ب ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دلیری ہو سکتی ہے کہ انسان اپنی جانِ شیریں کا خاتمہ خود اپنے ہاتھ سے کر دے ۔ بے وقار زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔

(۵) موت مرنے والے کے لئے پیغامِ راحت ہے اور پس ماندگان کے واسطے نزولِ بلا ۔ ہم اس لئے نہیں روتے کہ مرنے والا جان سے گذر گیا ۔ ہم تو اُن نقصانات پر روتے ہیں جو اُس کی موت سے ہمیں برداشت کرنے پڑیں گے

آہ خود غرض وظاہر دار انسان!!!

(۶) اگر ہماری زندگی دنیا ہی میں ختم ہو جاتی اور مصائب کا کلی خاتمہ موت کے ہاتھوں ہو سکتا تو نوے فیصدی لوگ موت کی ہم آغوشی پر آمادہ ہو جاتے ۔ مگر پہلی بات یقینی نہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ۔۔۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(۷) فلسفیوں میں بھی اختلاف ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ جہانِ آب و گل سراسر دھوکا اور فریب ہے ۔ اس کے دام میں آجانا جہالت ہے ۔ دوسرا گروہ کہتا ہے یہی سب کچھ ہے ۔ لذائذ حیات سے خوب جی بھر کر متمتع ہو لو کیسی حماقت ہے کہ موہوم چیز کی امید پر، جس کا سرے سے وجود ہی نہیں، ہم دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش ہو جائیں ۔ اُس شخص سے زیادہ بیوقوف کون ہوگا جو دریا سے پیاسا واپس آجائے؟

بعض نے میانہ روی اختیار کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں نہ یہ دھوکا ہے نہ وہ جھوٹ ۔ یہ چند روزہ زندگی تیاری ہے

اُس حیاتِ جاوداں کے لئے جہاں نہ موت ہے نہ اختتام۔ زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک سمندر ہے جس کا کنارہ نہ ایک تسلسل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں تکمیلِ حیات کے لئے موت کے دروازہ سے گذرنا ضروری ہے

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یا

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

(۸) انسان دنیا میں آتا ہے تو سینکڑوں کو ہنساتا ہے۔ جاتا ہے تو سینکڑوں کو رلاتا ہے۔

(۹) ہم دنیا میں آتے ہوئے بھی روتے ہیں اور جاتے ہوئے بھی۔

(۱۰) جس چیز سے مفر نہ ہو اُس سے ڈرنا حماقت ہے۔ موت سب کے لئے یقینی ہے۔

(۱۱) موت کے سامنے شاہ و گدا برابر ہیں خوش نصیب ہے وہ جس کی آخری گھڑیاں اطمینان سے گزریں۔

(۱۲) تم قبر کے عذاب سے ڈرتے ہو اور وہ جنہیں زندگی میں عذابِ قبر سے واسطہ پڑ گیا کہاں جائیں؟

(۱۳) موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کب آجائے۔

(۱۴) ہر شے کی ابتدا و انتہا ہے۔ **کل من علیہا فان**

(۱۵) لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

عاشق بٹالوی

مسرت — آہ میں تجھے کن لفظوں میں یاد کروں تیرا نام بھی میرے لئے اجنبی ہو چکا ہے۔ افسوس میں نے تیری بہت ناقدری کی مجھے تیری موجودگی میں تیرا کچھ احساس نہ ہوا۔ میری مثال اُس اندھے کی طرح تھی جو شب کی سیاہی اور صبح کی سفیدی میں کچھ تمیز نہیں کر سکتا۔ لیکن آہ جب تو مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی اور غم کا تاریک بادل میرے دل پر چھا گیا۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تیری موجودگی میں مجھے کس قدر راحت اور اطمینان نصیب تھا۔ تیرے پرتو سے ہر ایک چیز مجھے کس قدر مسرور و شاداں نظر آتی تھی۔ ایک ایک ذرہ مجھے خوشی سے رقص کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ دنیا اب بھی وہی ہے۔ وہی چاند وہی سورج وہی گلشن ساری کائنات وہی ہے لیکن تو نہیں اس لئے یہ سب چیزیں مجھے بے جان اور افسردہ نظر آتی ہیں۔ میں نے تجھے چھوڑ کر اپنا سب کچھ کھو دیا وہ پہلا سا سکون و اطمینان اب مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ میری آنکھیں تیرے لئے خون کے آنسو روتی ہیں۔ . . . . .

لیکن اب وہ تجھے دیکھنے کی آرزومند نہیں کیونکہ میرا دل اب تجھ سے ناآشنا ہو چکا ہے

گمنام
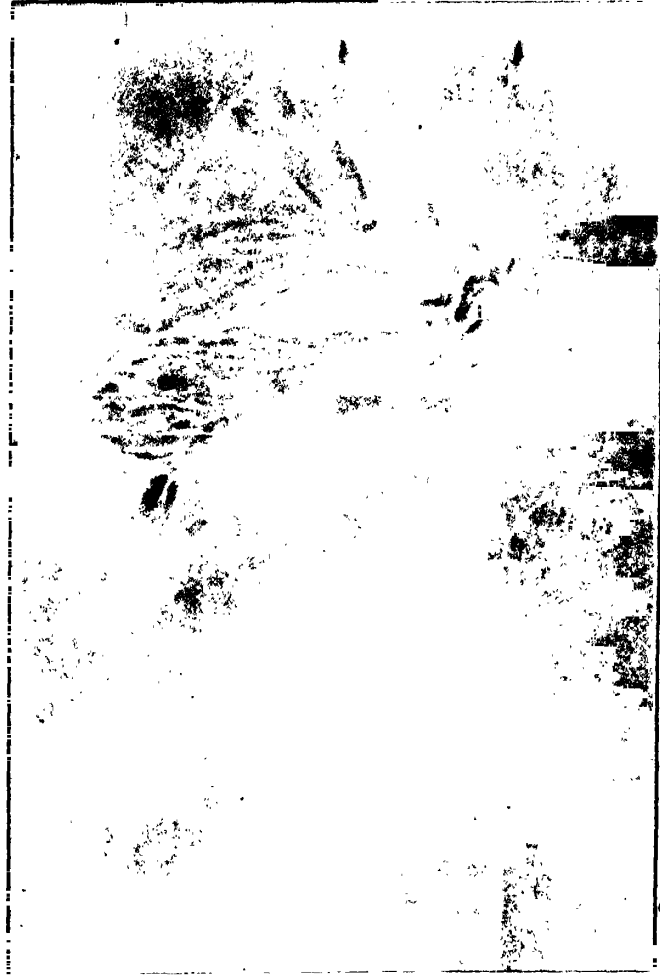
پرواز الفت

اپنی بے باک و بلند الفت کے سوز و ساز سے
ہمدردیِ پرواز سے
وتیوں پر دور یا تاروں میں تو لے چل مجھے

دور ان تاریک راہوں سے مجھے لے چل ذرا
اے مادر شیریں ادا !
اے مادر رنگیں نوا !

CALCUTTA
ART DG WORKS,
LAHORE

To Mother

اپنی ماں سے

ذیل کی نظم میری نوعمر عزیزہ ممتاز جہاں صاحبہ کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے + عزیزہ موصوفہ جو میاں محمد شاہ نواز صاحب بیرسٹرایٹ لا ممبر لیجسلیٹو اسمبلی کی بیٹی اور جناب میاں سر محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا کی نواسی ہیں چند ماہ ہوئے پنجاب کے میٹریکیولیشن کے امتحان میں درجہ اول میں کامیاب ہوئیں + ددھیال اور ننھال کی جودت و ذکاوت کا جو حصہ ان شانزدہ سالہ خاتون نے پایا ہے اور جس طرح ان کی خداداد طبیعت اور ان کے دل ودماغ نے اُسے جلادی ہے اُس کا اندازہ ہمارے قارئین ایک حد تک اس نظم سے کرسکتے ہیں جس میں یہ اپنی والدہ کو خطاب کرتی ہیں + ہرچند کہ وہ تعارفِ عام سے گریز کرتی ہیں تاہم مجھے امید ہے کہ اپنی مفروضہ نام نہاد "بزرگی" کا فائدہ اٹھا کر میں اُن کی بعض بلند تر نظموں کو آئندہ قارئینِ ہمایوں کے سامنے پیش کرسکوں گا۔

Kind Sweet, unselfish as thou art,	نرم و نازک پُر محبت نیک دل جانِ وفا
	اے مادرِ شیریں ادا!
Accept the tribute of my heart,	آ، لے لے تحفۂ ناچیز میرے پیار کا
Mother!	اے مادرِ شیریں ادا!

With thy silver soul divine,	اپنے اُس دل سے حقیقت کی ہی جس کو جستجو
And those God-filled eyes of thine,	حق آشنا آنکھوں سے تُو
Light this darkened life of mine,	کر منور زندگی کا جادۂ ظلمت مرا

Mother!	اے مادرِ شیریں ادا!
With might of dewy, silent tears,	اُن خموش و شبنمیں اشکوں کے لطف و درد سے
Shed through the sorrows of dim years,	جو مدتوں بہتے رہے
Mother!	میرا ایماں پاک کر اور رام کر لے دل مرا
Sooth my rebel heart when aching,	اے مادرِ شیریں ادا!
Calm my faith with terror shaking	ٹوٹ کر دنیا مری اُف ذرہ ذرہ ہو نہ جائے
Hold my world to atoms breaking,	گوہر یہ تیرا کھو نہ جائے
	تھام لینا تھام لینا میری دنیا کو ذرا
Mother!	اے مادرِ شیریں ادا!
With beauty of thy love so pure,	اپنی بے باک و بلند الفت کے سوز و ساز سے
That through the ages will endure,	ہمدردیٔ پرواز سے
Mother!	چوٹیوں پر دور یا تاروں میں تو لے چل مجھے
Lead me to the glorious heights,	دور ان تاریک راتوں سے مجھے لے چل ذرا
Lead me to the starry lights,	اے مادرِ شیریں ادا!
Far away from moonless nights.	

اے مادرِ رنگیں نوا!

ٹوٹتے ہیں زندگی کے مجھ پہ طوفاں ہر طرف
آہ ماں منڈلا رہی ہے یاس و حرماں ہر طرف
دردِ الفت کے مرے چہرے پہ تُو آنسو بہا
سر مرا سینہ پہ رکھ اور پیار سے مجھ کو سُلا
بھول جاؤں تا ترے سائے میں سب جور و جفا
اے مادرِ شیریں ادا!
اے مادرِ رنگیں نوا!

زندگی بھر شمع ہو میرے لئے چاہت تری
لاکھ رنج و غم میں ہو چاہت تری راحت مری
شمعِ الفت سے چمک اُٹھے تری سینہ مرا
تیری الفت ہو تو ہو دل میرا گردوں آشنا
تیری الفت ہو تو مل جائے مجھے میرا خدا
اے مادرِ شیریں ادا!
اے مادرِ رنگیں نوا!

بشیر احمد

Mother !

The storms of life are breaking, see
I bring my restless heart to thee,
Mother !
Soothing tears upon me shed,
Rest upon thy breast my head,
Till my pain and fear have fled,
Mother !

Thy love shall be my light through life,
Thy love shall help me win this strife,
Mother !
With thy love my soul shall fly,
To the vast and azure sky,
Reach at last my God on high,
Mother !

MUMTAZ JAHAN.

مصوّر کا شہکار

مجھے اپنی زندگی کچھ اس درجہ مرغوب و پسند ہے کہ کبھی کسی دوسرے کی زندگی پر نہ مجھے رشک ہوا نہ حسد۔ البتہ رافت اور صرف رافت کی زندگی نے ایک بار مجھے جذباتِ رشک سے آشنا کر دیا۔

رافت سے میری پہلی سرسری ملاقات کانپور کے اسٹیشن پر اتفاقیہ ہوئی تھی لیکن خدا جانے اُس ہستی میں کس بلا کی کشش اور جاذبیت تھی کہ اُسے میں اپنے ذہن سے کبھی فراموش نہ کر سکا۔ میں نے رافت سے یہ بھی نہ دریافت کیا کہ اُس کا وطن کہاں ہے؟ میری بے نیازی کا یہ ایک ادنیٰ ثبوت ہے لیکن رافت سے ملنے کی میرے دل میں ایک خلش تھی اور یہ خلش میرے استغنا کی مستقل توہین۔ میں نے اُس کو بہت بہلانا چاہا مگر میری ہر جدوکوشش نے ردِعمل کی صورت اختیار کر کے اور بھی مشتاق بنا دیا۔ اور کسی طرح اُس کا خیال دل سے نہیں گیا۔ تاہم میں خوش تھا کہ اگر اُس کی یاد میرے استغنا کے منافی ہے تو وہی شانِ بے نیازی اُس کی تلافی کا وسیلہ بن گئی یعنی رافت سے ملنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں اس کا قائل نہ تھا لیکن واقعات اور مشاہدات کو کیا کیجئے کہ جن کا واحد مقصد اجتہادِ قیاسی کی تردید کرنا ہے۔

رافت سے اس ملاقات کے پورے ایک سال بعد کسی ضرورت سے میرا باندہ جانا ہوا۔ جب گاڑی ہمیرپور پہنچی تو میں نے رافت کو ایک چرمی بیگ ہاتھ میں لئے گاڑی کے انتظار میں کھڑا دیکھا مجھے اس اتفاق سے بہت مسرت ہوئی میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ واقعی میرے جذباتِ دلی کے تاثرات کا ایک معجز نما کرشمہ ہے۔ مگر میں نے شانِ تغافل کا پاس کرتے ہوئے خود اُس سے ملنے میں پیشقدمی نہیں کی۔ اُس نے ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور میری ہی گاڑی میں داخل ہوا۔ ایک طرف بیگ رکھ کر اُس نے ٹوپی اتاری اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک وارفتہ نظر مسافروں پر ڈالتے ہوئے رافت نے مجھے پھر دیکھا اور "اچھا آپ ہیں! خوشا قسمت،" کہہ کر مجھ سے بہت گرم جوشی سے ملا۔

مجھے اپنی بے نیازی اور تغافل سے نادم نہ ہونے پر بہت مسرت ہوئی اور پھر تو میں رافت سے بہت جلد بے تکلف ہو گیا۔ شوقِ ملاقات کے اظہار کے بعد میں نے اجمالاً اُس کے حالات معلوم کر لئے۔ اُس کا وطن مہوبا تھا اور وہ وہیں جا رہا تھا۔ جب تک باندہ نہیں آیا بہت دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ باندہ کے اسٹیشن پر ہم دونوں اُترے۔ میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ ہماری یہ پُرلطف ملاقات بہت جلد ختم ہو گئی"۔

رافت نے نہایت متانت آمیز تبسم کے ساتھ کہا "دنیا کی ہر شے کا یہی انجام ہے"

میں نے کہا "یہ سچ ہے مگر کیا کروں مجھے اس ملاقات سے سیری نہیں ہوئی"

اُس نے ہنس کر جواب دیا "سیری نہ ہونا ہی لطف و مسرت کا نام ہے"

میں نے جواباً کہا "آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے لیکن ...."

"دخل در معقولات سے معاف فرمائیے گا۔ مجھے کچھ عرض کرنا ہے" اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"فرمائیے" میں نے جواب دیا۔

رافت نے کہا "میں آپ کی ذرہ نوازی سے ایک ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اگر آپ منظور کریں"

میں نے مجبوراً اپنی عادت کے خلاف عالم امکان کی وسعت پر خیال کرتے ہوئے کہا "بسر و چشم۔ ارشاد"

رافت نے کہا "جب آپ یہاں سے رخصت ہونے لگیں تو کم از کم دو تین روز کے لئے غریب خانہ پر تشریف کر مجھ کو ممنون ہونے کا موقع دیجئے۔

ہر چند میرے پاس کافی وقت تھا مگر ذاتی اہمیت کے نفسی مسئلہ پر غور کرتے ہوئے میں نے جواب دیا "فرصت تو نہیں مگر آپ کی نوازش و عزت افزائی نے مجبور کر دیا"

شکریہ ادا کرتے ہوئے رافت نے دریافت کیا "یہاں آپ کے دن قیام فرمائیں گے؟"

میں نے کہا "بمشکل تین دن ٹھیروں گا"

رافت نے زیر لب کچھ حساب لگاتے ہوئے مجھ سے کہا "تو آپ شنبہ کو تشریف لائیں گے؟"

میں نے کچھ توقف کرکے جواب دیا "انشاء اللہ"

اس مختصر گفتگو کے بعد میں رافت سے رخصت ہو کر شہر چلا گیا۔ رافت کی سادہ زندگی، بے لوث خلوص، ہمہ گیر محبت، استغنا، علمی ذوق اور گفتگو کے مؤثر لیکن نرالے انداز نے مجھے اور بھی گرویدہ بنا لیا۔ اور اس امر کے انکشاف نے کہ وہ بھی میرا مشتاق تھا جس کی صحت و صداقت اُس کی گفتگو اور چہرہ کے تاثرات و انداز سے ہوتی تھی، مجھے اس مقولہ قائل کر دیا کہ واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

کام سے فراغت پانے پر میں شنبہ کو وہاں پہنچا۔

رافت کی قیام گاہ قصبہ سے الگ ایک خوش منظر اونچی پہاڑی کے دامن میں ایک باغیچہ اور صرف تین کمروں پر مشتمل تھی۔ بڑا کمرہ باغیچہ کے وسط میں ایک بیضاوی چبوترے پر تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک میں خواب گاہ تھی

جس میں ایک طرف ایک پلنگ بچھا تھا اور دوسری طرف ایک چٹائی کے اوپر ہرن کی کھال بچھی تھی۔ قبلہ رخ دیوار میں ایک الماری تھی جس کے اوپری درجہ میں چند کتابیں، دوسرے درجہ میں چرمی بیگ، آئینہ کنگھا اور تیل کی دو خوبصورت شیشیاں رکھی تھیں۔ کمرہ کے دو رخوں پر دو دروازے اور تین کھڑکیاں تھیں۔ تیسری جانب ایک بڑی کھڑکی تھی۔ چوتھی طرف ایک دروازہ دوسرے حصہ میں جانے کا تھا۔ دوسرے حصہ کو ملاقات کا کمرہ کہئے یا چھوٹا سا کتب خانہ۔ طول میں یہ خواب گاہ سے بڑا تھا۔ اُس کے دو رخوں پر کھڑکیوں کی بجائے دو خوشنما الماریاں دیوار کے اندر بنی ہوئی تھیں ہر ایک الماری کے پانچ پانچ درجے تھے۔ چاروں الماریوں میں اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی زبان کی مختلف علوم پر چیدہ چیدہ کتابیں حسنِ ترتیب سے چنی تھیں۔ الماریوں کے بیچ میں ایک ایک دروازہ تھا۔ تیسری دیوار میں ایک کھڑکی اور اُس کے دونوں طرف دو الماریاں تھیں۔ ایک میں مصوری کا پورا سامان احتیاط سے رکھا تھا۔ اور دوسری میں بھی کچھ مصوری کا سامان قلم دوات، قلم تراش اور چند اقسام کے رنگین و سفید کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ الماریوں کے پہلوؤں پر مختلف قدرتی مناظر کی تصویریں لگی تھیں۔ نیچے چٹائی کا پورا فرش تھا۔ جس پر موٹے کھدر کی ایک صاف چاندنی بچھی تھی۔ دونوں حصوں کے چاروں طرف پھوس کا برآمدہ تھا جس کے اوپر مختلف بیلیں خوب پھیلی اور چھائی ہوئی تھیں۔ پھول اور پتیوں سے کہیں پھوس نظر نہ آتا تھا۔ برآمدہ کے آگے کھلا ہوا چبوترہ تھا۔

اس چبوترے کے آس پاس مختلف خوشنما پھولوں کی کیاریاں تھیں جن کے کنارے کنارے روشیں بنی تھیں کیاریوں کے بعد چاروں طرف ترتیب اور تناسب کے ساتھ پھلوں کے درخت قطار در قطار لگے تھے۔ بڑے کمرے کے چپ و راست کیاریوں کے بعد دو کمرے تھے۔ راست جانب والے کمرے کے بھی دو حصے تھے ایک میں باورچی خانہ تھا اور دوسرا کھانا کھانے کا کمرہ تھا۔ ان دونوں حصوں میں بہت ہی مختصر لیکن ضروری سامان تھا۔ دوسرے کمرے میں باغبانی وغیرہ کا سامان رکھا تھا تینوں کمروں کی عمارت بہت سادہ تھی اور غیر ضروری نمائشی آرائش کا کہیں وجود نہ تھا۔

پھلوں کے درختوں کے بعد ایک دو بیگہ زمین میں مختلف ترکاریوں کے چھوٹے چھوٹے کھیت تھے اور باغیچہ کے چاروں طرف خاردار سرسبز گھنی جھاڑیوں کا جنگلہ تھا۔

پہاڑی سے ایک چھوٹا شفاف چشمہ جاری تھا جو باغیچہ میں پیچ در پیچ گھومتا، لہراتا ہوا سامنے والے بڑے تالاب میں غائب ہو جاتا تھا۔

یہ تھی رافت کے انہماکات کی مختصر لیکن دلچسپ دنیا۔ چپہ چپہ میں شعریت اور رومان نظر آتی تھی ہر چیز اور ہر بات میں سادگی تھی۔ قدرت کا بھولا پن اور کائنات کی دلفریبیاں ہر شے میں جلوہ نما تھیں۔

رافت کی دلچسپی اور انتہائی انہماک کا ثبوت مجھے اس امر سے ملا کہ اُس نے باغچہ کی ہر ایک شے اور ایک ایک درخت اور پودے کے فرداً فرداً حالات مجھ سے بیان کئے اور بیان کرتے وقت اُس کا چہرہ شادمانی و مسرت سے دمک اُٹھتا تھا۔

وہ مجھ سے اس درجہ خلوص و محبت سے پیش آیا کہ اس سے پہلے میرے خیال میں بھی یہ نہ آتا تھا کہ دنیا والوں میں بھی ایسا خلوص و انس ہو سکتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ باغچہ کے قریب جو غربا اور عوام کا طبقہ رہتا تھا رافت اُن سے بھی ہمیشہ ویسے ہی خلوص و محبت سے پیش آتا تھا۔

رافت ایک کشیدہ قامت، متناسب الاعضاء، خوش رو، چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔ اس وقت اُس کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔ اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تنہا رہتا تھا۔ باغبانی وغیرہ کے کاموں میں اُس کے دیہاتی بھائی شریک و سہیم رہتے تھے اور جو کچھ ترکاریوں وغیرہ سے آمدنی ہوتی تھی وہ انہیں لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اُس کی ذاتی ضروریات بہت ہی مختصر تھیں۔ باغچہ کی مصروفیت کے علاوہ رافت کی دو اور بہترین دلچسپیاں تھیں۔ ایک مطالعہ کتب اور دوسری مصوری۔ مصوری میں اُسے کمال حاصل تھا۔ اُس کے مختصر کتب خانہ کی دیواروں پر جو تصویریں لگی تھیں وہ اُس کی مصوری کا بہترین نمونہ تھیں۔

ایک دن ہم دونوں اسی کتب خانہ میں بیٹھے مختلف مبحثوں پر گفتگو کر رہے تھے کہ مصوری کے موضوع پر بات چیت ہونے لگی۔ رافت نے فنِ مصوری پر ایک مبصرانہ اور مدلل تقریر کی۔ اُس نے بیان کیا کہ فنونِ لطیفہ میں مصوری و نقاشی کا کیا رتبہ ہے۔ اُن کا احاطہ کس قدر وسیع ہے۔ اس فن میں کیا کیا نکات اور خوبیاں ہیں۔ مصوری کو شاعری پر کہاں تک فوق حاصل ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس فن نے کس قدر نشو و نما پائی اور قرونِ وسطیٰ میں کس قدر تکمیل کی۔ دنیا کی کون کون قوموں نے کیا کیا صنعتیں مصوری میں ایجاد و اختراع کیں اور اُن کو کہاں تک کمال پر پہنچایا۔ مشرقی اور مغربی مصوری میں کیا فرق و امتیاز ہے۔ چینیوں نے اس فن میں کیا کیا کمالات حاصل کئے۔ ایرانیوں اور ہندیوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں۔ عہدِ مغلیہ میں اِس فن نے ہندوستان میں کس قدر ترقی کی۔ قدیم یونان، روم اور مصر کے مصوروں اور نقاشوں نے کس درجہ اس میں کمال حاصل کیا۔ اور پھر عہدِ حاضر میں یورپ نے کیا کیا ترقیاں اس فن میں کیں۔ آخر میں مختصر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے اُس نے مصوری اور نقاشی کے مستقبل پر روشنی ڈالی۔ میں حیرت و استعجاب سے اُس کا منہ دیکھ رہا تھا کہ اس شخص کو اس فن میں کس درجہ عبور اور تبحر حاصل ہے۔

تقریر ختم کرنے کے بعد رافت نے کمرہ کی تصویریں اتاریں اور ہر ایک تصویر کو دکھا دکھا کر اُن کے نکات، باریکیاں اور

خوبیاں بیان کرنا شروع کیں۔ میں مجسمۂ حیرت بنا ہوا کانوں سے اُس کے سامعہ نواز الفاظ سن رہا تھا اور آنکھوں سے اُن باصرہ فروز قدرتی مناظر کو جنہیں ایک انسان کے بہترین تخیل نے معمولی قلموں کے ذریعہ سے اپنی انگلیوں کی جنبشوں سے اور زیادہ حسین بنا کر ہمیشہ کے لئے کاغذی پیرہن میں زندہ کر دیا تھا دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اُن تصاویر کو دکھا چکا تو اُس نے ایک الماری کھولی اور تصویروں کا ایک خوشنما مرقع نکالا اور "میری ساری زندگی کا سرمایہ صرف یہ مرقع ہے" کہہ کر اُس نے وہ مرقع میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں کل چوبیس تصویریں تھیں۔ میں ایک ایک تصویر کو دیکھ رہا تھا اور خود عالم تحیر میں تصویر بنا ہوا تھا۔

رافت شادمانی کی تصویر بنا ہوا تبسم کے ساتھ کبھی مجھ پر نظر ڈالتا تھا اور کبھی ان تصاویر پر۔ اس مرقع میں زیادہ تر تصویریں قدرتی مناظر کی تھیں۔ باغیچہ کے مختلف حصص کے مختلف مناظر اور قرب و جوار کے دیگر پُرفضا مقامات کی بھی تصویریں مرقع میں شامل تھیں۔ کئی تصویروں میں دیہاتی زندگی کے بہترین نمونے دکھائے تھے۔ صبح شام اور چاندنی راتوں کے منظروں کے ساتھ مختلف نسائی جذبات اور دلی تاثرات کو بحسن و کمال نمایاں کرتے ہوئے صنفِ نازک کی کئی اعلیٰ تصویریں کھینچی گئی تھیں جن میں امید، وفا، محبت، فراق، رشک اور معصومیت کے اعلیٰ ترین تخیل کے بہترین نقوش صفحۂ قرطاس پر نظر آتے تھے۔ چند روحانی تصویریں بھی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد میری نظر ایک تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر ایک خوش نما فیدک میں رکھی تھی۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور رافت کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرہ پر اس تصویر کے اٹھانے سے پہلے تو عجیب متذبذب کیفیات نمایاں ہوئیں۔ پھر چند لمحات میں ان کیفیات نے نیا رنگ اختیار کر لیا اُس کے لبوں پر تبسم تھا لیکن مصنوعی۔ آنکھوں سے حسرت و شوق کے جذبات نمایاں تھے۔ چہرہ پر رنج و مسرت کے خفیف آثار ساتھ ساتھ ظاہر ہو رہے تھے۔ مجھے رافت کے اس تغیر پر تعجب ہوا اور تصویر کے دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔ میں نے فیدک سے تصویر نکالی۔ تصویر کے اوپر باریک گلابی ابری کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے ابری کو ہٹا کر تصویر کو دیکھا۔ تصویر کیا تھی رافت کا شہکار اور مصوری کا اعجاز تھا۔ پہاڑی منظر دکھایا تھا۔ ایک اونچی پہاڑی سے چشمہ نکل کر اُس کے دامن میں بہ رہا تھا۔ چٹانوں پر سبزہ کا فرش تھا۔ کہیں کہیں جنگلی بوٹیوں کے پھول نظر آ رہے تھے۔ چشمہ کے کنارے ایک درخت لگا تھا۔ اُس کی شاخ پر کوئی پرند بیٹھا تھا۔ آسمان پر گہرے گہرے بادل چھائے تھے۔ چاند کا کچھ حصہ سیاہ بادل کے ٹکڑے میں چھپ گیا تھا۔ چاندنی چھٹکی تھی۔ درخت کے سامنے چشمہ کے دوسرے کنارے پر ایک سرو قد، دبلی، پتلی نوجوان عورت کالی ساڑھی باندھے شفاف رواں پانی میں پاؤں ڈالے ایک پتھر پر عجیب دلفریب انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ پانی میں ماہتاب کا انعکاس اُس کے قدموں پر لوٹ رہا تھا۔ لمبے لمبے سیاہ بال اُس کے شانوں پر بکھرے تھے

سر کے اوپر سے ساڑھی سرک گئی تھی۔ کتابی چہرہ تھا۔ رخساروں اور لبوں پر ہلکی سرخی دوڑی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے اُس کی نظریں نیچے پڑتی تھیں۔ سیدھا ہاتھ دل پر تھا اور دوسرے ہاتھ کا بازو کہنی سے کچھ اوپر سیدھے ہاتھ کے پنجے سے ملا ہوا تھا۔ تین سبک انگلیاں بائیں رخسارہ پر تھیں اور چھنگلی لبوں کے کونہ پر۔ اور انگوٹھا زنخداں والی ہڈی کے نیچے لگا ہوا تھا۔ زیوارت سے سارا جسم معرا تھا۔ چہرہ پر غم کے آثار نمایاں تھے لیکن غور کرنے سے اُن میں امید کی ایک ہلکی جھلک نظر آتی تھی۔ آنکھوں سے حسرت اور انتظار کی کیفیات ہویدا تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کی یاد میں اُس کا دل تڑپ رہا ہے۔ عجب پرکیف اور موثر سماں دکھایا تھا۔ تصویر کے نیچے عربی خط میں سنہرے حرفوں سے "الفت" بہت خوشخط لکھا ہوا تھا۔

میں بہت دیر تک مبہوت بنا اس تصویر کو دیکھا کیا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُس وقت جب کہ میں اس طرح تصور کے دیکھنے میں مدہوش تھا، رافت کے چہرہ پر کیا کیا اثرات مرتب ہوتے رہے۔ تصویر سے یکبارگی نظر ہٹا کر میں نے رافت سے کہا "الفت کی بجائے فراق کیوں نہ لکھا؟"

رافت نے اپنے چہرہ کو متبسم بنا کر کہا "پھر بتاؤں گا"

میں نے کہا "بہتر" اور اُس کے اِس جواب نے خدا جانے کیا کیا اور خصوصیات پیدا کر دیں کہ میں پھر دوبارہ تصویر کے دیکھنے میں محو ہو گیا۔

"رافت!" میں نے کہا "آپ کا کمال اور ارفع تخیل میری تعریف و توصیف سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اُن کی تعریف کرنا آپ کی توہین کرنا ہے۔ مگر مجھے افسوس اور حیرت ہے کہ ایک ایسی یکتا سرمایۂ ناز ہستی اس طرح ایک گوشۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کرے"۔

رافت یہ سُن کر ہنسا اور کہنے لگا "بھائی کیا کہوں مجھے کچھ ایسی ہی زندگی میں سکون اور راحت نصیب ہے، دولت و حشمت اور جاہ و شہرت کی ہوس انسان کو زندگی کے صحیح نصب العین، حقیقی مقاصد، سچی مسرت اور پاکیزگی سے بہت دور لے جا کر گناہوں اور غموں کے خوفناک غار میں گرا دیتی ہے اور وہ شخص زندگی کی بہترین نعمتوں کو کھو بیٹھتا ہے۔ اکثر اوقات اُس کی زندگی اُس کے لئے ایک ناقابلِ برداشت بار ہو جاتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟ میری مصوری پر جو آپ نے اظہار خیال کیا یہ محض آپ کا حسنِ ظن ہے۔ یہ تصویریں جو آپ نے دیکھیں یہ تو محض مصوری کا ایک بہت معمولی کھیل ہے۔ اصل مصوری اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے"۔ آخری جملہ کو ختم کر کے اُس نے فوراً روئے سخن بدل کر مجھ سے کہا "خیر چلیے اُس سامنے والی پہاڑی پر چلیں"۔

میں بغیر کچھ کہے اُس کے ساتھ ہولیا۔ میری نگاہوں میں وہی الفت کی تصویر پھر رہی تھی اور اس میں اس درجہ محویت تھی کہ میں رافت کی گفتگو پر تنقید نہ کرسکا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رافت کی زندگی ,, الفت ،، کی تصویر کے ساتھ یقیناً کوئی تعلق رکھتی ہے اور یہی اُس کی زندگی کا راز ہے اور اس راز کو معلوم کرنے کے لئے میں بہت بے چین اور مضطرب تھا۔

ہم دونوں باغیچہ سے ہوتے ہوئے چشمہ کے کنارے کنارے چلے۔ چڑھائی پر ہم جا رہے تھے۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ ماہتاب ضیا باریاں کر رہا تھا۔ باغ سے کچھ ہی فاصلہ پر چڑھائی ختم ہوئی۔ ہم لوگ کچھ آگے بڑھے اور تھوڑا فاصلہ طے کرنے پر مجھے ہو بہو وہی الفت کی تصویر والا منظر اور موقع نظر آنے لگا۔ یہ ایک بڑا سطح مرتفع حصہ سامنے والی پہاڑی ہی کا تھا چشمہ اوپر سے بہہ رہا تھا شفاف پانی کا پیچ در پیچ چٹانوں پر سے چاندنی میں لہرانا اور میدان میں آہستہ آہستہ بہنا بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی روانی میں ماہتاب کا انعکاس شوخیاں دکھا رہا تھا۔ کرنیں مچل رہی تھیں۔ آس پاس کہیں کہیں ڈھاک اور تیندو وغیرہ دشتی درخت محویت کے عالم میں کھڑے نظر آتے تھے۔ جیسا تصویر میں دکھایا تھا اسی طرح ایک درخت چشمہ کے کنارہ لگا تھا اور اُس کے سامنے چشمہ کے دوسرے کنارہ پر ویساہی ایک پتھر رکھا تھا۔ البتہ آسمان پر بادل نہیں چھائے تھے۔ نہ درخت کی شاخ پر کوئی پرند بیٹھا تھا۔ اور نہ پتھر کے اوپر کوئی عورت بیٹھی تھی۔ میں وہیں پتھر کے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں نے رافت سے کہا ”کیا آپ نے الفت کی تصویر اسی مقام پر کھینچی ہے؟

رافت نے جواب دیا ”آپ کا خیال درست ہے“

”اچھا کچھ دیر اسی چشمہ کے کنارے بیٹھئے“ میں نے کہا۔

رافت نے کہا ”مناسب“ اور ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔

”رافت!“ میں نے کہا ”یہ منظر خود ہی بہت دلفریب اور روح افزا ہے مگر آپ کے قلم کی موز گافیوں نے صفحۂ قرطاس پر اس منظر میں غضب کی شعریت پیدا کر دی“

رافت بولا ”یہ آپ کی ستائش اور قدر افزائی ہے“ اور خاموش ہو گیا۔

”رافت!“ میں نے اُسے مخاطب کر کے اس طرح سلسلۂ سخن چھیڑا ”اُس نام کی تشریح تو کیجئے“

”آپ نے فراق نام محض تصویر کے موضوع پر تجویز کیا ہے اور میں نے اُس عورت کے نام پر“

”کیا اس عورت کا نام ہی الفت ہے؟“

رافت نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا "تو کیا یہ تصویر اُس کی زندگی کا ایک رخ بھی ہے"؟

اس نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا "محبت کے موضوع پر ہم دونوں میں کئی دن متواتر گفتگو ہوتی رہی جس قدر آپ کو اس مبحث سے دلچسپی ہے شاید اسی حد تک مجھے بھی ہے۔ اگرچہ دونوں کے نظریوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ آپ کا یہ فلسفہ کہ محبت کا مقصد، غرض اور غایت صرف محبت ہی ہے اور اس کی ارتقائی معراج محبوب سے بے نیاز ہو جانا ہے، میرے نظریہ کا نقیض ہے۔ آپ کا نظریہ خود غرضی کی تعلیم دے کر محض تخیل کے فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ میرے خیال میں محبت صرف محبوب سے ملنے کا وسیلہ اور اُس کی تسلیم و رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور اُس کی دلیل دلی تاثرات مشاہدات اور واقعات ہیں اور آپ کے نظریہ کا ثبوت محض ظنی اور خیالی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

رافت کی یہ گفتگو میں بہت بے چینی سے سن رہا تھا۔ کیونکہ میں الفت کی زندگی کے حالات سننے کے لئے ہمہ تن شوق بن رہا تھا۔ میں نے پہلے خیال کیا کہ شاید رافت نے الفت کی زندگی کے واقعات بیان کرنے کے سلسلہ میں یہ تمہید شروع کی ہو۔ مگر معاً خیال آیا کہ کہیں وہ میری توجہ کو نفسی اصول کی تحت میں اس بحث پر منعطف تو نہیں کرنا چاہتا! کیونکہ اس درمیان میں وہ میری فطرت کا بہت کچھ رازدار بن گیا تھا۔ اس لئے میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ "اس نظریہ اور فلسفہ پر تو پھر کبھی مفصل گفتگو ہوگی۔ اس وقت تو آپ الفت کی زندگی پر تبصرہ کیجئے"۔ چونکہ میں اُس کی طبیعت سے خوب واقف اور بے تکلف ہو چکا تھا اس لئے اس طرح استفسار کرنے پر مجھے کچھ تذبذب نہیں ہوا۔

رافت نے ہنستے ہوئے کہا "آپ کا اشتیاق بہت بڑھ گیا ہے؟"

میں نے اُس کا جواب صرف تبسم سے دیا۔ رافت نے اپنی نگاہیں زمین پر جما لیں اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے "اچھا سنئے" کہہ کر اس طرح داستان شروع کی:-

کل شام کو جو شخص چبوترے پر بیٹھا آپ سے باتیں کر رہا تھا اُس کا نام کریم ہے۔ الفت اسی کی بھانجی ہے۔ والدین کے سایۂ عاطفت سے وہ غریب چھٹپن ہی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی تھی۔ اُس کی پرورش اور تربیت کی تمام ذمہ دار میری والدہ مرحومہ تھیں۔ الفت کی ماں والدہ صاحبہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس لئے اُس نے آخری وقت الفت کو والدہ کے سپرد کر دیا تھا۔ الفت کا سارا خاندان غریب کاشتکار پیشہ ہے۔ والدہ مرحومہ ان لوگوں کا بہت خیال رکھتی تھیں اسی وجہ سے یہ خاندان مجھ سے اب بھی بہت محبت کرتا ہے۔ میرے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ مرحومہ اس مکان میں رہتی تھیں جو باغچہ کے شمالی جانب ہے اور جس میں اب کریم رہتا ہے۔ ہاں تو والدہ صاحبہ نے الفت کو بہت شفقت اور محبت سے پالا کیونکہ میرے سوا اُن کی کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ میں اُس زمانہ میں ہمیر پور کے انگریزی مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا۔ مدرسہ کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ میں سالانہ امتحان دے کر یہاں آیا۔ والدہ صاحبہ علیل تھیں۔ کئی ڈاکٹروں اور

حکیموں کا علاج ہوتا رہا لیکن مشیت ایزدی کو منظور ہی کچھ اور تھا۔ چند مہینے کی علالت کے بعد انہوں نے مجھے "خدا حافظ" کہہ کر اِس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اُس وقت میری عمر سولہ سال کی ہوگی اور الفت غالباً بارہ تیرہ برس کی تھی۔

چند اعزہ تعزیت میں آئے تھے انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں اُن کے ہمراہ چلوں لیکن میں کسی کے ساتھ نہیں گیا۔ کچھ دنوں کے بعد سب لوگ اپنے اپنے وطن کو چلے گئے اور میں تنہا رہ گیا۔

والدہ صاحبہ کے فراق کا صدمہ کچھ ایسا صدمہ نہ تھا کہ میں اُسے اُس وقت برداشت کر لیتا۔ بیمار ہؤا اور ایسا سخت بیمار کہ زندگی کی کوئی امید نہ تھی۔ شروع میں بخار آیا کیا۔ اُس میں بداحتیاطی سے ہوا لگ گئی۔ پھر کیا! سرسام کا بہت سخت حملہ ہؤا۔ یہی لوگ جنہیں آپ میرے "دیہاتی بھائی" کہتے ہیں میرے معالج اور تیماردار تھے۔ لیکن پھر بھی ان بیچاروں کو چوبیس گھنٹوں کی فرصت کہاں! سب سے زیادہ کریم اور اُس کے عزیز میرا خیال رکھتے تھے لیکن ان سب میں صرف ایک الفت کی ذات تھی جو برابر راتوں جاگتی رہتی اور ہر طرح سے میرا خیال رکھتی۔ اول اس کے دل پر والدہ مرحومہ کا صدمہ ہی کیا کم تھا، اس پر میری علالت۔ اور اس وقت اس کی عمر ہی کیا تھی۔ سرسام کی حالت میں تو مجھے اُس کے اس ایثار، محبت اور خلوص کا احساس نہ ہوسکا لیکن جب میری طبیعت سنبھلی میں نے دیکھا کہ سوائے دن کے چند گھنٹوں کے جب کہ دوسرے لوگ میرے پاس موجود ہوتے ہیں، وہ دن اور رات میرے ہی پاس گذارتی ہے۔ اُس وقت مجھے احساس ہؤا کہ مرض سے اتنی جلدی افاقہ ہوجانا صرف الفت کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ میرا بخار اب بھی نہیں اترا تھا۔ وہ دن رات میں کتنے ہی بار کھانے کو پوچھتی رہتی۔ اور ہر وقت دریافت کرتی رہتی کہ "رافت بھائی! کیسی طبیعت ہے؟"

میں نے جب کئی راتوں سے اُسے متواتر جاگتے اور ہر طرح کی تیمارداری کرتے دیکھا تو مجھ سے اُس کی مشقت اور تکلیف برداشت نہ ہوسکی۔ میں نے ایک دن کہا "الفت اب گھر جاؤ۔ میں اچھا ہوگیا" اس جملہ کو سن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگی "رافت بھائی! کیا تم مجھ سے خفا ہوگئے۔ میں نے کیا کیا؟" میں نے اُس کی سادگی اور خلوص کو محسوس کرتے ہوئے کہا "نہیں الفت! بھلا میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا! کتنے ہی دنوں سے تم جاگتے جاگتے تھک گئی ہو اب کچھ دنوں آرام کرلو ورنہ تم خود بیمار ہوجاؤ گی" یہ سُن کر اُس کے چہرہ پر مسرت کی جھلک دوڑ گئی۔ اُس نے کہا۔ "نہیں میں تو دن کو ایک دو گھنٹے سو لیتی ہوں۔ اگر میں یہاں سے چلی بھی جاؤں تو مجھے رات بھر نیند نہ آئے گی" میں لاجواب ہوگیا۔

وہ بہت مستعدی اور تن دہی سے میری تیمارداری کیا کرتی اور میں دل پر جبر کئے ہوئے اُس کا ممنون ہوتا رہتا۔ خدا خدا کرکے تین ہفتوں کے بعد بخار اُترا لیکن بیماری اور والدہ کے غم کے مارے کمزوری عرصہ دراز تک رفع نہ ہوئی۔ اس

زمانہ میں میری تنہا انیس وغمگسار یہی الفت تھی۔ دیہاتی بھائی بھی صبح شام آکر دیکھ جاتے تھے۔

ایک دن نقاہت اور کمزوری کی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ الفت آئی اور اپنے گھر اور محلہ کے حالات بیان کرتی رہی۔ تذکرۃً اُس نے پوچھا "رافت بھائی! اب تم کہیں جاؤ گے تو نہیں؟"

میں نے کہا "کیوں؟"

وہ بولی "کچھ نہیں۔ میں نے یوں ہی پوچھا"

میں نے کہا "ابھی تک کچھ سوچا نہیں"

اُس نے کہا "بھیا! تم کہیں جانا نہیں۔ یہیں رہنا"

میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا "دیکھا جائے گا"

اِس جملہ کو سُن کر وہ مغموم سی ہوگئی۔ میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے تسلی دینے کے لئے مذاقاً کہا "اچھا الفت میں کہیں نہ جاؤں گا۔ لیکن تم بھی کہیں نہ جانا"

پہلے جملہ سے اُس کے چہرے پر بشاشت آگئی لیکن دوسرے جملہ پر وہ کیفیت زائل ہوگئی۔ میں اُس وقت اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

دو تین مہینوں کے بعد میں بالکل اچھا ہوگیا۔ اب میں پریشان تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ دنیا اور اُس کی دلچسپیوں سے میرا دل سرد ہوگیا تھا۔ مجھے نہ کسی چیز کی تمنا تھی نہ آرزو۔ جوش مٹ چکا تھا۔ ولولے سرد ہوگئے تھے البتہ علمی ذوق کچھ باقی تھا لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا۔ اس لئے میں نے تعلیم کا خیال بھی چھوڑ دیا۔

مجھے لڑکپن سے پھولوں، پودوں اور تصویروں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اور میری دلچسپی کو دیکھ کر ہی والدِ مرحوم نے اس باغیچہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھلوں کے کتنے ہی درخت انہیں کے لگوائے ہوئے ہیں۔ ترکاریوں کی کاشت کی ابتدا بھی انہیں نے کی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی مشاغل میری زندگی کے لئے کافی ہیں۔

ایک دن میرے سب دیہاتی بھائی میرے پاس آکر جمع ہوئے۔ اُن کی غرض اِس اجتماع سے میرے مستقبل پر روشنی ڈالنے کی تھی۔ بڑی طویل بحث وتمحیص کے بعد سب نے مِل کر مجھ سے کہا کہ "رافت بھائی! تم ہم لوگوں کو چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔ اگر کہیں جاؤ گے بھی تو ہم لوگ نہ جانے دیں گے۔ تم یہیں بے فکری سے رہو اور ہم لوگ سب مل کر تمہارا کام کیا کریں گے"

اُن کے اِس خلوص و محبت سے مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میں نے کہا "بھائیو! تم لوگ پریشان نہ ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ اپنی زندگی اسی باغیچہ میں بسر کروں گا۔"

میرے اِس ارادہ سے سب بہت خوش ہوئے۔ سب نے بہت بہت دعائیں دیں۔ اُس دن سے میں نے مستقلاً یہیں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اور باغ کی ترتیب اور تنظیم بھی اُسی دن سے شروع کر دی۔

الفت میرے اس ارادہ سے بہت فرحاں و شاداں تھی۔ باغیچہ کے اکثر انتظامات اور میرے کھانے پکانے کی ذمہ داریاں اُس نے اپنے اوپر خود بخود عائد کر لی تھیں۔

اسی طرح تین سال گذر گئے۔ مصوری کی مشق، چمن بندی، درختوں کی قطع و برید، ترکاریوں کی کاشت اور مطالعۂ کتب میری دلچسپیاں تھیں۔ اس درمیان میں الفت کی بے لوث محبت اور خلوص نے میرے دل پر گہرا نقش کر لیا۔

ایک دن کریم آیا۔ اُس نے مجھ سے تخلیہ میں کہا "رافت بھائی! الفت اب جوان ہو گئی۔ اس کی شادی ہو جانا چاہئے اُس کے چچا نے اپنے چھوٹے لڑکے وزیر کا پیغام دیا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "تمہارا وزیر کے متعلق کیا خیال ہے؟"

کریم بولا "وزیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ چارہل کی کھیتی کرتا ہے۔ میرے خیال میں الفت کو اس سے اچھا گھر نہیں ملے گا۔"

میں نے پوچھا "اُس کی عمر کیا ہوگی؟"

اُس نے کہا "ستائیس اٹھائیس سال کی۔"

میں نے کہا "الفت کی بھی کسی طرح مرضی معلوم کر لیتے۔"

اُس نے ہنس کر کہا "کہیں دنیا میں ایسی باتیں بھی لڑکیوں سے پوچھی جاتی ہیں۔ شریفوں کے یہاں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے؟"

مجھے اُس کی اس سادگی اور شرافت کے معیار پر بہت ہنسی آئی لیکن میں نے ضبط کر کے اُس سے کہا "پھر دوسروں سے رائے لینا بھی بے کار ہے۔"

وہ بولا "دنیا کا یہی طریقہ اور رواج ہے۔ سارے کام کاج بھائی بندوں ہی سے پوچھ کر کئے جاتے ہیں۔"

میں نے اُس کے اس خیال پر کوئی جرح کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے کہا "جیسا تمہیں ٹھیک اور مناسب معلوم ہو کرو۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا۔ ایک دو ہفتہ کے اندر آئندہ ماہ میں نکاح و رخصت کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

ایک دن الفت میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے مذاقاً اُس سے کہا "الفت تمہاری شادی پر میں مبارکباد دیتا ہوں

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرہ پر غم کے آثار نمایاں تھے اور وہ خاموش تھی۔ میں نے بہت اصرار کرکے اُس سے دریافت کیا کہ آیا اُسے اپنی شادی کا علم ہے کہ نہیں اور وہ بھی اس رشتہ سے خوش ہے؟

ہرچند کہ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھی۔ لیکن ان معاملات میں اُس نے مجھ سے کوئی مفصل گفتگو نہیں کی۔ کچھ شرم کے جذبات اور غم کی کیفیات اس پر طاری تھیں۔ بہت مبہم لفظوں میں اُس نے مجھ پر ظاہر کیا کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی۔

میں نے ذرا تفصیل سے اُسے بتایا کہ شادی کی غرض اور ضرورت کیا ہے۔ ازدواجی زندگی کس درجہ دلچسپ اور سکون دہ ہے۔ ایک عورت پر شادی ہونے کے بعد کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ عورت کے کیا کیا فرائض ہیں اور اُن کو کس طرح ادا کرنا چاہیئے اور عورت کو اپنی زندگی خاوند کی زندگی سے کس طرح وابستہ کردینا چاہیئے۔

وہ میری تمام تقریر خاموشی کے ساتھ سنا کی جب میں خاموش ہؤا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ "تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

میں اُس کے اس سوال پر لاجواب سا ہو گیا۔ کیونکہ میں نے مجردانہ زندگی بسر کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر میں نے کہا "الفت تم خوب واقف ہو کہ مجھ پر کیسے کیسے غم و مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے۔ اتنا دل و دماغ کہاں تھا کہ میں اپنی شادی کے متعلق کچھ سوچتا۔ دوسرے تم لوگوں کی محبت اور خیال نے مجھے کبھی دوسرے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہونے دی۔ آئندہ دیکھا جائے گا"

یہ سن کر الفت خاموش ہو گئی۔ میں متعجب تھا کہ اُس نے میری شادی کے متعلق اصرار کیوں نہیں کیا۔ اور نہ میرے جواب پر کوئی نکتہ چینی کی۔ وہ مجھے حسرت و تاسف کے ساتھ جس میں محبت کی رنگ آمیزی تھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے مجھ سے پھر سوال کیا "بھائی! اگر تم شادی کروگے تو کس سے؟"

اُس کے اس سوال پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "اس بارے میں ابھی کچھ سوچا نہیں۔ تمہیں بتاؤ میں کس سے شادی کروں؟"

وہ میرے اس جواب اور استفسار پر ہنسنے لگی۔ اتفاق سے اُسی وقت اُس کی ممانی بھی وہیں آگئیں۔ الفت نے ممانی کو دیکھ کر مجھ سے کہا "یہ ممانی سے پوچھ لو"

اُس کی ممانی نے بہت اشتیاق کے ساتھ مجھ سے پوچھا "رافت بھائی! کیا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ الفت مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میری کس سے شادی ہوگی؟ اس پر میں نے کہا کہ

تمہیں بتادو۔"

وہ بولی "ہاں رافت بھائی! اب تم شادی کرلو تو ہم لوگوں کو بہت خوشی ہو۔"
مَیں نے ہنس کر کہا۔" پھر کیا، تمہیں کہیں نسبت لگا کے کر ڈالو۔"
وہ ہنسنے لگی اور بولی "بھلا ہم غریب تمہاری نسبت کہاں لگائیں گے۔ تمہاری شادی تو تمہارے خاندان والے ہی کریں گے۔"
الفت خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے کہا "نہیں۔ تم لگاؤ تو!"
الفت بیچ میں بول اٹھی۔" اچھا ہم لگائیں گے۔"
اُس کی ممانی ہنس دی۔ اُس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں اور محفل برخاست ہوئی۔
اُسی دن سے الفت کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہر بات میں صلاح و مشورہ مجھ سے لیا جاتا تھا۔ کیونکہ میں شادی کے تمام اخراجات کا کفیل بن گیا تھا اور ہر کام نہایت دلچسپی اور خوشی سے انجام دیتا تھا۔ لیکن میں نے اس درمیان میں الفت کو خوش و خرم نہیں دیکھا۔ میرے پاس وہ روزانہ آتی تھی مگر اُس میں وہ پہلی سی بشاشت نہ تھی خاموش زیادہ رہتی تھی۔ میں حیران تھا کہ کیا بات ہے؟ کئی بار میں نے اس سے وجہ بھی دریافت کی مگر اُس نے کبھی خاطر خواہ دل کا حال نہیں بتایا۔
آخر نکاح کا دن آگیا۔ تمام رسمیں بہت حسن و خوبی کے ساتھ انجام پائیں۔ کھانے وغیرہ کا انتظام اچھا رہا۔ جہیز اگر زیادہ نہ تھا تو ناکافی بھی نہ تھا۔
دوسرے دن اُس کی رخصت تھی۔ میں مکان کے اندر گیا۔ وہ ایک کمرہ میں عروسانہ پوشاک پہنے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے مخاطب کیا" الفت!"
وہ چہرہ پر دوپٹہ ڈالے ہوئے تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ہاتھ سے دوپٹہ ہٹا کر کہا" الفت! تم چپ کیوں ہو؟"
اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور عجیب غمگینی اور شرمندگی کی کیفیات اُس کے نورانی چہرہ پر ہویدا تھیں، یہ دیکھ کر اس خیال سے کہ اگر اس حالت کے متعلق کچھ استفسار وغیرہ کیا گیا اور تسلی تشفی دی گئی تو اُس کے جذبات اور بھی برانگیختہ ہو جائیں گے، میں نے گفتگو کا یہ پہلو اختیار کیا" الفت! تمہیں تین چار دن کے بعد ہمیں بُلا لیں گے۔"

لیکن وہ اِس پر بھی کچھ نہ بولی۔ میں نے پھر کہا۔ "اچھا الفت! سسرال سے کچھ ہمارے لئے لاؤ گی بھی؟"
اس کا بھی اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھوں سے آہستہ آہستہ آنسو نکلنے لگے۔
میں نے اس طرح سے کہ گویا اُس کے آنسو دیکھے ہی نہیں اور غم کی حالت کو محسوس ہی نہیں کیا، اس سے کہا "الفت آج تو تم کچھ ناراض سی معلوم ہوتی ہو"
اس جملہ کو سن کر اُس نے ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس لی اور کہا "ہاں بھائی! سچ کہتے ہو۔ میں ہی تو آپ سے ناراض ہونگی!"
اُس کا مجھے لفظ "آپ" سے مخاطب کرنا ایک نئی بات تھی میں متحیر تھا کہ اس کی یہ کیا حالت ہے۔ میں نے کہا۔ "ناراض نہیں تو یہ کیا کہ تم مجھ سے باتیں ہی نہیں کرتیں"
اتنے میں کریم نے مجھے آواز دی۔ میں نے الفت سے کہا "خدا تمہیں شادماں رکھے۔ جاؤ سسرال میں خوب ہنسی خوشی سے رہنا سہنا۔ ہم اکثر تمہیں بُلا کیا کریں گے"
اُس نے رو کر کہا "مجھے بھول نہ جانا"
میں نے کہا کیسی باتیں کرتی ہو۔ بھلا تم کو میں بھول جاؤں! ایسا کبھی ہو سکتا ہے؛ اچھا خدا حافظ" یہ کہہ کر میں فوراً باہر چلا آیا۔ اور اُسی دن وہ رخصت ہو کر چلی گئی۔ وزیر کی شباہت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اُس کی فطرت سلیم نہیں۔ اس کی روح گناہوں سے ملوث ہے۔ اُس کی سرشت میں بدگمانی اور رشک کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ غصہ انتقام اور حیوانی جذبات کا پتلا ہے۔
مجھے افسوس ہوا کہ ایک پاکیزہ سیرت، معصوم خوبصورت لڑکی لطیف احساسات اور بہترین جذبات رکھنے والی جس کے پہلو میں بے لوث محبت کا نازک آبگینہ ہو ایک بہیمہ صفت، سنگدل اوباش کے سپرد کر دی جائے۔ مگر میں کیا کرتا قضا و قدر کو یہی منظور تھا۔ کریم اور اُس کے تمام عزیزوں کی یہی آرزو اور تمنا تھی۔ میں نے دل کو تسلّی دینے کے لئے سوچا کہ خدا کرے میرا قیافہ غلط ہو اور وزیر اُس کے حسن و عادات پر فریفتہ ہو جائے۔ مگر سرنوشت تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے۔
الفت چلی گئی لیکن اُس کا خیال میرے دل سے نہیں گیا۔ اُس کی شکل آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ میں اپنی اس حالت پر بہت متعجب اور پریشان تھا۔
چوتھی کی رسم ادا ہونے کے لئے وہ بلائی گئی۔ میں نے اُس کی آمد کی خوشی میں بہت سامان اور انتظام کیا۔ وہ آئی اُس نے مجھے دیکھا بہت خوش ہوئی۔ میں نے ایک دن اُس سے کہا کہ "خدا کا شکر ہے کہ تم ہنسی خوشی تو آئیں"

یہ سُن کر اُس کی ساری خوشی غم میں تبدیل ہوگئی۔ میں متحیّر رہ گیا۔ اُس نے کہا "بھائی! میری اس مسرت د
شی کے یہ معنی نہیں کہ وہاں بھی اسی طرح خوش تھی۔ اور نہ یہ وجہ ہے کہ میری شادی ہوگئی۔ میری شادی ہونے
یہاں سے چلے جانے کی تو خوشی آپ لوگوں کو ہوئی۔ آہ! آپ کو کیا معلوم اور آپ کو معلوم بھی کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر
پ کے پہلو میں بھی ویسا ہی دل ہوتا۔ جیسا کہ میرے پہلو میں، تو آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہوتی"۔
میں نے کہا "خیر رہتے سنتے دل بہل جائیگا اور طبیعت لگ جائے گی پھر تو یہاں کا خیال بھی نہ آئے گا"
یہ جملہ اُس سے کہنے کو تو کہہ گیا مگر میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے اس جملہ سے بعد کو کس درجہ کوفت ہوئی۔
اُس نے یہ جملہ سنا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں اُس نے درد بھری آواز میں کہا "دلفت
ھائی آپ نے مجھے چھیڑ ہی دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اپنا غم سُنا کر کسی کو تکلیف دوں اور اسی وجہ سے میں نے اپنے دل
ا حال کبھی کسی سے نہیں کہا۔ جیسا کہ آپ لوگ سمجھتے ہیں مجھے شادی سے خوشی نہیں ہوئی۔ اور کیوں یہ میں نہیں بتا
سکتی۔ اور بتاؤں کیا، میں خود نہیں جانتی۔ میں خوب جانتی ہوں کہ دنیا میں کہیں لڑکیاں گھر میں بیٹھی نہیں رہتیں۔
رمیں کیا کروں میرا دل ہی شادی کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ میں تو آپ کے باغیچے کے ایک کونہ میں اپنی عمر کاٹنا چاہتی
ھی۔ مگر بدقسمت بے بس کیا کرتی۔ کس سے دل کا حال کہتی اور کون مانتا۔ دنیا کی شرم وحیا جان سے لگی تھی۔ خیر
پ لوگوں کی تو خوشی ہوگئی۔ میں آپ کی نصیحتوں کو بھولی نہیں۔ خدا کو منظور رہے تو اپنی انتہائی کوششوں سے بالکل
سی طرح زندگی کے دن بسر کروں گی۔ اُن کی خدمت اور فرمانبرداری سے کبھی منہ نہ موڑوں گی۔ کیونکہ یہی خدا کی مرضی اور
پ کی خوشی ہے۔ ہاں دل پر زور نہیں۔ جانے کیوں ہوکیں سی اُٹھتی ہیں اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ وہاں
ے لوگ مجھ پر ہنستے اور انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ ایک دن میں اپنی قسمت پر رو رہی تھی۔ روکنے پر بھی آنسو نہ رکتے تھے کہ
ہ آگئے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ "تمہاری یہ حالت اچھی نہیں۔ کس کی محبت میں مر رہی ہو۔ رو رو کر تم نے نحوست
پھیلائی ہے۔ اب کی جو آنسو نکلے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔ اب کی گھر ہو آؤ پھر دیکھیں تمہیں کون لے جاتا ہے۔ وہاں
ی صورت بھی نہ دکھاؤں گا۔ اُن کی یہ باتیں سن کر میرے دل پر بہت صدمہ ہوا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ آپ کی
اتیں یاد آگئیں۔ میں نے دل کو بہت سنبھالا اور خوش رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر ہائے کمبخت دل پر بس نہیں، آنسو
کل ہی آتے ہیں۔ اب اس خیال سے دل میں اور ہوک اٹھتی ہے کہ وہ مجھے پھر یہاں نہ بھیجیں گے"۔
میں نے اُس کی گفتگو پر کوئی تنقید کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ میرے دل پر خود اُس کے غم سے بہت صدمہ
ھا۔ میں نے کہا "تمہیں ڈرانے کو یوں ہی وزیر نے کہہ دیا ہوگا۔ تم برابر اُس کی فرمانبرداری کرتی رہنا۔ اور جہاں تک ہو

سکے کوئی بات اُس کی مرضی کے خلاف نہ کرنا۔ اُس کے طعنوں اور سخت کلامی پر دل میں کوئی اثر نہ لینا۔ خاوند کا خوش رکھنا ہی عورت کی سب سے بڑی خوبی اور دین و دنیا دونوں میں فلاح و بہبود کا ذریعہ اور وسیلہ ہے اور خود بھی ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرتی رہنا۔ ورنہ رو دھو کر تو سب ہی زندگی کے دن بسر کر لیتے ہیں"

بہ مشکل تمام اتنا کہہ کر میں اُس کے پاس سے اُٹھ آیا۔ کیونکہ میرا دل خود بھی بھر آیا تھا۔ تین چار روز کے بعد وہ سسرال چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں ایک سال کے لئے مصوری کی تکمیل کرنے باہر چلا گیا۔ باغیچہ کا کاروبار انہیں دیہاتی بھائیوں پر چھوڑ گیا۔

جب میں یہاں واپس آیا۔ میں نے از سرِ نو باغیچہ کی تنظیم کی۔ اور اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل بنا لیا اور اسی معیار کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں۔

یہاں آنے پر الفت کی عجیب پُر الم داستان معلوم ہوئی۔ سوءِ اتفاق، جیسا میں نے وزیر کو قیافہ سے جانا تھا وہ ویسا ہی نکلا۔

وہ ایک آوارہ مزاج شخص تھا۔ اُس کی بیوہ بھاوج کو اُس کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ گھر کے تمام کاروبار پر وہی متصرف تھی۔ الفت کی کوئی ادا اُن دونوں کے تعلقات پر کارگر نہ ثابت ہوتی۔ بلکہ الٹا یہ اثر ہوا کہ وزیر کو الفت سے نفرت ہوگئی۔ اُس کی بھاوج نے لوگوں کے ذریعہ سے الفت کی خوب برائیاں کرائیں۔ اور بے بنیاد اتہام لگائے پھر کیا تھا۔ وزیر کے ظلم و تعدی کے : تو اُس غریب پر کھل گئے۔ اس معصوم کو سخت سے سخت سزائیں دی جانے لگیں۔ مگر وہ خدا کی بندی سوائے صبر و شکر کے زبان سے اُف بھی نہ نکالتی تھی۔ وزیر نے دن رات میری محبت کے طعنے دینا اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔ وہ سنتی اور قسمت کو روتی۔ ڈیڑھ سال ہوگیا لیکن اُس ظالم نے اُسے ایک دن کے لئے بھی یہاں نہ بھیجا۔ اکثر اوقات وہ سنگدل اُس کو سخت سے سخت سزائیں دیتا۔ کئی کئی دن کھانا نہ کھانے دیتا اور اس قدر مارتا کہ وہ بیچاری بیہوش ہوجاتی۔ مگر الفت کو کمال حاصل تھا کہ کبھی زبان سے اُس کی شکایت میں ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔

مجھے جب یہ حالات معلوم ہوئے دل کو سخت صدمہ اور قلق ہوا مگر کرتا تو کیا۔ وزیر کے پاس جاتا تو خدا جانے وہ ظالم اُس کا کیا حال کرتا۔ اور کون میری باتیں سنتا اور کہنا مانتا۔ کبھی کبھی میں کریم کو سمجھانے بجھانے کے لئے بھیج دیتا تھا۔ آخر کو کریم سے بھی ضبط نہ ہوا اور دونوں میں شکر رنجی ہوگئی۔

میں اُس کی تکلیفوں کی یاد سے بے چین اور غمگین اِدھر اُدھر تڑپتا پھرتا۔ کسی طرح دل کو قرار نہ آتا اور نہ کوئی چارہ کار سمجھ میں آتا۔ اسی غم اور پریشانی میں چھ سات مہینے گذر گئے۔

میرے ایک دوست نے جو قدرتی مناظر کی تصویریں لینے کشمیر جا رہے تھے مجھے اپنے ہمراہ چلنے پر مجبور کیا۔ میں نے بھی دل بہلانے کا یہ موقع غنیمت سمجھا اور سفر کی تیاری کر لی۔ اُس دن جب کہ میں یہاں سے روانہ ہو رہا تھا ایک شخص الفت کی سسرال سے آیا اور اُس نے بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت وزیر کی بھاوج نے اُس کو کھانے میں زہر دے دیا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُس نے زہر کیوں دیا۔ اس کے اثر سے وزیر دو تین گھنٹے میں تڑپ کر مر گیا اور اُس کی بھاوج ایسی غائب ہوئی کہ پتہ اور نشان نہ ملا۔

میں نے کہا ”اچھا ہوا۔ اپنے اعمال کی سزا پائی۔ خس کم جہاں پاک۔“

اُسی وقت میں نے کریم کو بلا کر کہا ”اب الفت کو وہاں جا کر لے آنا۔ میں دو تین مہینے میں واپس آؤں گا“ اور اُسی دن میں روانہ ہو گیا۔

پورے تین مہینے کے بعد میں کشمیر سے واپس آیا۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ میں اپنی قیام گاہ پر آٹھ بجے رات کو پہنچا۔ سب دیہاتی بھائی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے میں نے چند جملوں میں اجمالاً سب کی خیریت اور حالات پوچھ کر کریم سے دریافت کیا کہ ”الفت آ گئی؟“

اُس نے کہا کہ ”میں تو جب ہی لوا لایا تھا۔“

میں نے پوچھا ”اس کی طبیعت کیسی ہے اور اس وقت کہاں ہے؟“

کریم کی بیوی نے کہا۔ ”اب تو اچھی ہے۔ ابھی پہاڑی پر چلی گئی۔“

میرے ساتھ کچھ سامان تھا اُسے کمرہ میں رکھ کر سیدھا پہاڑی پر چلا گیا۔

بادل آسمان پر چھائے تھے۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ ماہتاب کے ساتھ ابر کے بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس پتھر پر جس کے قریب آپ بیٹھے ہیں، الفت اسی انداز سے بیٹھی تھی جیسا کہ میں نے تصویر میں دکھایا ہے۔ اُس وقت کے سمے اور کیفیات کو میں نے امکانی کوشش سے تصویر میں ظاہر کیا ہے۔ میں اُسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر سامنے والے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتا ہوا دبے پاؤں اُس کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن اُسے خبر نہ ہوئی۔ میں بڑی دیر تک اُسے اسی محویت اور استغراق کے عالم میں دیکھا کیا۔

جب میں نے دیکھا کہ اُس کی خود فراموشی اور محویت حد سے گزر گئی ہے۔ میں نے اُس کے قریب جا کر اُسے مخاطب کیا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے وفورِ مسرت کے مارے آنسو جاری ہو گئے۔ بڑی دیر تک وہ سکتہ کے عالم میں مجھے خاموش دیکھا کی۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں کے انداز محبت کے پاکیزہ جذبات کی بہترین تفسیر کر رہے تھے۔

الفت کی وہ نگاہیں میرے دل سے کبھی نہ بھولیں گی۔

میں نے سلسلۂ گفتگو اس طرح شروع کیا "الفت کس کی یاد کر رہی تھیں؟"

اُس نے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا "کسی کی نہیں"

میں نے اُس کو چھیڑنے کے لئے پوچھا "کیا مجھے بھی بھول گئی تھیں؟"

یہ سن کر وہ اپنے جذبات کو زیادہ دیر تک نہ ضبط کر سکی۔ وہ بولی "بھائی! تم بہت دنوں میں آئے ہو۔ ایک ایک دن گن گن کر کاٹتی رہی۔ آج جب دل بہت گھبرایا اس طرف آنکلی پپیہا بول رہا تھا۔ دل چھپائے ہوئے تھے۔ میں دل بہلانے کے لئے اس پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس وقت تمہاری ہی یاد کر رہی تھی ۔۔۔۔۔۔"

میں نے قطعِ کلام کرتے ہوئے کہا "جب ہی تو میں آگیا"

بڑی دیر تک وہ اپنے غم کی داستان سناتی رہی لیکن شکایت کا ایک حرف بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ اس کے بعد ہم دونوں یہاں سے اٹھ گئے۔

الفت اب خوش تھی۔ دن رات وہ میرے باغیچہ میں رہتی اور میرے سب کاموں میں حصہ لیتی رہتی۔ ہر وقت اُس پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری رہتا تھا۔ اُس زمانہ میں مجھے اچھی طرح احساس اور یقین ہوگیا کہ الفت کو میرے ساتھ بچپن ہی سے بے غرض اور بے لوث محبت تھی۔ اور اسی محبت نے رفتہ رفتہ عشق کا درجہ حاصل کر لیا۔ وزیر کے ساتھ نکاح ہونے سے بہت پہلے وہ میرے سوا دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ لیکن اُس وقت مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف نہ ہو سکا۔ میں صرف یہ سمجھتا تھا کہ الفت بہ نسبت دوسرے لوگوں کے مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ جب میں نے کئی بار اس کی تمام زندگی کا ناقدانہ تجربہ کیا تو اُس کی ہر بات اور زندگی کا ہر پہلو میری ہی محبت سے مملو نظر آیا لیکن اُس نے بذاتِ خود کبھی محبت کا اظہار یا اقرار نہیں کیا۔ مجھے اُس کی اِس نسائی فطرت پر بہت حیرت اور تعجب ہے۔

میں نے ایک بار اُس سے دریافت کیا کہ محبت کسے کہتے ہیں، وہ بولی، "دنیا کی تمام خوشیوں کا کسی ایک ذات میں اکٹھا ہو جانا!"

میں متحیر رہ گیا کہ اس نے کس درجہ سادگی سے ایک جملہ میں محبت کی جامع تفسیر کر دی۔ میں نے پھر پوچھا "محبت کیا چاہتی ہے؟"

اُس نے ہنس کر کہا "تمام عمر محبوب کا دیدار"

میں نے کہا "اس سے نتیجہ؟" وہ بولی "دل کا سکون۔ زندگی کی راحت"!

میں اُس کے اِن جوابات کو سُن کر محبت کے اعجاز کا قائل ہو گیا کہ ایک غیر تعلیم یافتہ دیہاتی عورت کو محبت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا"۔

یہ کہہ کر رافت بولا "یہ تھی مختصر داستان جس کے سننے کے لئے آپ بہت مضطرب تھے"!

میں اُس کی تمام گفتگو مجسمۂ حیرت و شوق بنا ہوا سنا کیا۔ جب وہ مخاطب ہوا میں نے پوچھا "الفت اب کہاں ہے؟"

رافت نے کہا "ایک مہینہ ہوا اُس کی بڑی بہن آئی ہوئی تھیں۔ وہ بہت اصرار سے اُسے مجبور کر کے اپنے ہمراہ لے گئی ہیں"۔

میں نے کہا "رافت! الفت واقعی الفت کی دیوی ہے لیکن افسوس کہ اس کی زندگی رنج و غم ہی میں بسر ہوئی۔ اُسے وہ راحت نہ مل سکی جس کی کہ وہ مستحق ہے"۔

رافت نے غمگین لہجہ میں کہا "مجھے بھی اسی کا صدمہ ہے"!

میں نے کہا "اب آپ اس سے عقد کیوں نہیں کر لیتے؟"

رافت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر کہا "رافت! اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو یہ آپ کی خود غرضی کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی زندگی کے باقی ایام سکون و راحت سے بسر کرے گی، ورنہ دنیا والے اُسے کسی طرح چین نہ لینے دیں گے۔ آپ کا اس سے شادی نہ کرنا آپ کی زندگی پر ایک بدنما داغ ہوگا۔ شادی نہ کرنے کے جواز میں آپ بہت سی توجیہات اور مجبوریاں پیش کر سکتے ہیں۔ مگر وہ سب بیکار ہونگی آپ ہی کے نظریہ کے مطابق میں آپ کو مجبور کرتا ہوں کہ آپ ضرور اس سے بہت جلد عقد کر لیں"۔

رافت نے کہا "میں اس مسئلہ پر عرصہ سے غور کر رہا ہوں" یہ جملہ ختم کر کے اُس نے روئے سخن بدل کر مجھ سے کہا "دیر ہو گئی اب باغ واپس چلئے"، میں نے کہا "بہتر" اور ہم دونوں اُٹھ آئے۔

دوسرے دن میں اُس سے رخصت ہو کر وطن چلا آیا۔ چند مہینوں کے بعد مجھے رافت کا ایک خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ رافت کی زندگی الفت کی ہستی کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں ہمیشہ کے لئے منسلک ہو گئی۔ ہرچند اس کے تمام عزیز و احباب نے اُسے بہت مطعون کیا، مگر اُس نے بہت جرات اور ہمت سے کام لے کر ان لوگوں کے حملوں کی کوئی پروا نہیں کی۔

شرفی رضوی

نوائے راز

مَیں یہ کہتا نہیں کہ ہوں معصُوم
تیری رحمت سے کیوں رہوں محرُوم!

ہے تغیر پسند فطرتِ دل
شاد ہے یہ کبھی، کبھی مغموم

یُوں ہی دنیا کے کام چلتے ہیں
کوئی خادم ہے اور کوئی مخدوم

جانتا ہوں کہ چند روزہ ہے
قیدِ ہستی میں کیوں رہوں مغموم

چوٹ سی اک جگر پہ لگتی ہے
یاد آتا ہے جب دلِ مرحوم

طلبِ کُل کا ہے یہی حاصل
ہر خوشی دل سے ہوگئی معدوم

کہہ رہا ہوں میں راز کی باتیں
کوئی سمجھے گا کیا مرا مفہوم

آئینہ ہے یہ حسنِ کامل کا
اللہ اللہ مرتبہ دل کا

خلوتِ دل عجیب خلوت ہے
سب کو اس پر گماں ہے محفل کا

آج تجھ کو دکھا دیا اُس نے
میں ہوں ممنون دیدۂ دل کا

پوچھتے کیا ہو، آدمی کیا ہے
اک نمونہ ہے حسنِ کامل کا

بحرِ ہستی میں تیرنے والے!
کچھ پتا بھی ہے تجھ کو ساحل کا؟

خود نمائی ہے راہبر تیری
مل چکا بس نشان منزل کا!

جب سے دیکھا ہے اُس کو میں نے رازؔ
کچھ عجب حال ہے مرے دل کا

ابوالفاضل رازؔ چاندپوری

دیوِ خونخوار

سیر و تفریح کی ایک دخانی کشتی قسطنطنیہ سے ہمیں جزیرہ پرنکی پو کے ساحل پر لے آئی اور ہم وہاں اتر پڑے۔ کشتی میں کچھ زیادہ آدمی سوار نہ تھے۔ ایک پولی خاندان کے چار افراد ماں، باپ، اُن کی بیٹی اور اُس کا شوہر اور اُن کے علاوہ ہم دو، بس۔ ہاں مگر جب ہم لکڑی کے اُس پل پر سے گزر رہے تھے جو شاخ زریں اور قسطنطنیہ کو عبور کرتا ہے تو ایک یونانی جسے نوجوان ہی کہنا چاہئے ہم سے آملا۔ یہ غالباً کوئی مصور تھا کیونکہ اُس نے اپنی بغل میں ایک اُس قسم کا بستہ داب رکھا تھا، جیسا مصوروں کے پاس ہوتا ہے۔ بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اُس کے کندھوں پر پڑ رہی تھیں اُس کا چہرہ زرد تھا اور اُس کی سیاہ آنکھیں گہرے حلقوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لئے مجھے اُس سے دلچسپی پیدا ہو گئی خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ متواضع تھا اور اسے جزیرے کے مقامی حالات کا بھی علم تھا۔ لیکن وہ اتنا باتونی تھا کہ آخر میں تنگ آکر اُس کے پاس سے ہٹ گیا۔

یہ پولی گھرانا بھی نہایت خوش اخلاق واقع ہوا تھا۔ باپ اور ماں دونوں پرتکلف تھے اور اُن کا داماد وجیہ و شکیل ہونے کے علاوہ ایک سلجھی ہوئی اور آزاد طبیعت کا مالک تھا۔ پرنکی پو میں یہ لوگ لڑکی کی خاطر جو کچھ مریض سی معلوم ہوتی تھی گرمیوں کے چند مہینے گزارنے آئے تھے۔ لڑکی حسین تھی مگر اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یا تو وہ کسی سخت بیماری سے صحت یاب ہوئی ہے یا کوئی خوفناک مرض اُس کے جسم پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہے۔ وہ اکثر اپنے شوہر کے بازو کا سہارا لے کر چلتی تھی اور راہ میں عموماً دم لینے کے لئے بیٹھ جاتی تھی۔ اُس کی سرگوشیوں کو بار بار ہلکی ہلکی خشک قسم کی کھانسی منقطع کر دیتی تھی۔ راستے میں اُس کو کھانسی کا دورہ ہوتا تھا تو وہ اور اُس کا شوہر دونوں ٹھہر جاتے تھے۔ وہ اپنی ہمدردانہ تشویش کی نگاہیں اُس پر ڈالتا تھا اور یہ اُس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جو کہتی تھیں "کچھ نہیں، کچھ نہیں، میں اچھی ہوں!" اُن کا یقین صحت اور مسرت میں تھا۔

اُس یونانی کے کہنے پر، جو کشتی سے اُترتے ہی ہم سے جدا ہو گیا، ہم نے پہاڑی پر کے ہوٹل میں قیام کا انتظام کر لیا ہوٹل والا کوئی فرانسیسی تھا اور اُس نے عمارت کو آرام و آسائش کے تمام سامانوں سے فرانسیسی طرز پر منظم و مزین کر رکھا تھا ناشتا ہم سب نے اکٹھا ہی کیا اور جب دوپہر کی گرمی ذرا کم ہوئی تب بھی ہم تقریباً ایک ساتھ ہی پہاڑی پر چڑھے اور وہاں سایہ دار یک چیڑوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر کوہستان کے پر فضا نظارہ سے مسرت حاصل کرنے لگے۔ ابھی ہم جگہ

انتخاب کرکے بیٹھے ہی تھے کہ وہ یونانی پھر نمودار ہوا۔ اُس نے ہمیں آہستہ سے سلام کیا، اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہم سے چند قدم کے فاصلہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنا بستہ کھولا اور تصویر بنانے میں مشغول ہوگیا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر چٹانوں کی جانب پیٹھ کرکے بیٹھا ہے تاکہ ہم اُس کی تصویر کی طرف نہ دیکھ سکیں۔"

نوجوان پول نے کہا "ہمیں اِس کی ضرورت بھی کیا ہے، ہمارے سامنے دیکھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔" ذرا ٹھہر کر اُس نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تصویر میں ہمیں بھی شامل کررہا ہے، اچھا، اسے کرنے دو!"

حقیقت میں ہمارے سامنے دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ پرنکی پو جیسی خوبصورت اور پُرفضا جگہ ساری دنیا میں نہ ہوگی مشہور شہید وطن آئرین نے جو چارلس اعظم کا معاصر تھا اپنی جلاوطنی کا ایک مہینہ یہیں گذارا تھا۔ اگر میں ایک مہینے تک یہاں رہ سکتا تو اپنی تمام بقیہ عمر اِس مقام کے تصور کی مسرت میں گزار دیتا۔ بلکہ میں اُس ایک دن کو کبھی نہیں بھولوں گا جو میں نے وہاں بسر کیا۔

ہوا ایسی صاف تھی جیسے چمکتا ہوا ہیرا! اور ایسی نرم وخوشگوار کہ انسان کی ساری روح اُس کے ساتھ مل کر مصروفِ پرواز ہوجاتی تھی۔ دائیں طرف سمندر سے پرے ایشیائی پہاڑوں کی چوٹیاں اپنے بھورے بھورے سر اٹھائے کھڑی تھیں اور بائیں جانب دُور یورپ کے ڈھلوان ساحلوں پر شفق کے بادۂ ارغواں کا انعکاس ہورہا تھا۔ چاکی، "مجمع الجزائر سلطانیہ" کے نو جزیروں میں سے وہ جزیرہ جو ہماری ہمسائگی میں واقع تھا ایک معصوم خواب کی طرح اپنے سرو وصنوبر کے جنگلوں سمیت آسمان کی پُرامن بلندیوں کے ساتھ باتیں کررہا تھا اور اُس کے سر پر تاج کی طرح ایک عالی شان عمارت تھی جو اُن لوگوں کا مسکن تھی جن کے دل بیمار ہوں۔

بحیرۂ مارمورا کے پانیوں میں سے بلور کے ایک چمکدار ٹکڑے کی طرح رنگ برنگ کی لہریں اٹھتی تھیں۔ دُور پانی دودھ کی طرح سفید تھا، پھر اُس سے ادھر گلابی، دونوں جزیروں کے درمیان نارنگی کی طرح آتشیں اور ہمارے عین نیچے سبزی مائل نیلا جیسے صاف شفاف نیلم ہو اور اُس کے حسن کا پرتو خود اسی میں پڑ رہا تھا۔ اُس کی سطح پر بڑے بڑے جہاز کہیں بھی نظر نہ آتے تھے۔ صرف دو چھوٹی کشتیاں جن پر انگریزی جھنڈے لہرارہے تھے ساحل کے ساتھ ساتھ اُڑی چلی جارہی تھیں۔ ان میں سے ایک جو اتنی بڑی تھی جتنی کسی پہرہ دار کی کشتی ہوتی ہے دخانی کشتی تھی، دوسری کو درجن بھر آدمی چپو دے سے چلارہے تھے اور جب چپو یک لخت پانی سے اوپر اُٹھتے تھے تو پگھلی ہوئی چاندی کے سے قطرے اُن سے گرتے تھے۔ سادہ لوح مچھلیاں پانی سے باہر سر نکال نکال کر جھانکتی تھیں اور بگلے محراب دار اڑانیں لگاتے ہوئے اُن کے اوپر اوپر

منڈلاتے تھے کبھی کبھی نیلگوں آسمان پر دونوں براعظموں کے درمیان خاموش اور مطمئن عقاب مصروفِ پرواز نظر آتے تھے۔

پہاڑی کی ڈھلوان جس کی چوٹی پر ہم بیٹھے ہوئے تھے تمام کی تمام گلاب کے پھولوں سے ڈھنپی ہوئی تھی اور ہوا اُن کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ اُس قہوہ خانے سے جو سمندر کے قریب واقع تھا موسیقی کی لہریں صاف ہوا کے ساتھ مل ملا کر ہم تک پہنچتیں تھیں اور راستے کی دُوری سے دھیمی ہو ہو جاتی تھیں۔

یہ کیفیت مسحور کن تھی۔ ہم سب خاموش بیٹھے تھے اور اپنی روحوں کو ہم نے اس جنت کی تصویر میں غرق کر رکھا تھا۔ وہ نوجوان لڑکی اپنے سر کو اپنے شوہر کے سینے کا سہارا دیئے گھاس کے مخملیں فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے زرد بیضوی نازک چہرے پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی اور اُس کی نیلی آنکھوں سے یک لخت آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ یہ دیکھ کر سب کا دل بھر آیا۔ اُس کی ماں کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں اور میرے دل میں بھی درد کی ایک ٹیس اٹھنے لگی۔

لڑکی نے آہستہ سے کہا یہاں روح اور جسم دونوں کو اچھا ہو جانا چاہیئے۔ آہ، یہ جگہ کیسی فرحت خیز ہے"!

لڑکی کے باپ نے کہا "خدا جانتا ہے میرا کوئی دشمن نہیں ہے لیکن اگر کوئی ہو بھی تو یہاں میں اُسے معاف کردوں"۔

اور پھر سب خاموش ہوگئے۔ ہم پر کچھ عجیب کیفیت طاری تھی۔ ایسی عجیب کہ زبان بھی اُس کے اظہار سے قاصر ہے! ہر ایک اپنے آپ میں مسرت کی ایک دنیا پاتا تھا اور ہر ایک تمام دنیا کو اس دنیائے مسرت میں شریک کر لینے پر آمادہ تھا۔ سب کے دل کی ایک سی کیفیت تھی، اور اسی لئے کوئی ایک بھی دوسرے سے تعرض نہ کرنا چاہتا تھا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اُس یونانی نے اپنا بستہ لپیٹا، ذرا جھک کر ہمیں سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہوگیا ہم وہیں بیٹھے رہے۔ ہم میں سے کسی نے اُس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔

آخر کئی گھنٹوں کے بعد جب جنوبی منظر کی دوریوں پر تیرہ فام اداہٹ کی سحرکاری نمایاں ہونے لگی تو لڑکی کی ماں نے کہا کہ اب واپس جانے کا وقت ہے۔ ہم اُٹھے اور بے فکرے بچّوں کی طرح ہلکے اور سبک قدم اٹھاتے ہوئے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ہم ہوٹل کے نفیس برآمدے میں بیٹھ گئے۔

اتنے میں نیچے سے کسی کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمارا یونانی ہوٹل والے سے دست و گریباں ہو رہا تھا، ہم اُن کی لڑائی کا لطف اٹھاتے رہے، مگر یہ تماشا کچھ زیادہ دیر تک نہ رہا۔ ہوٹل والا اب زینہ کو طے کر کے ہماری طرف آرہا تھا اور غصہ میں کہہ رہا تھا "جیسے میرے پاس اور مہمان نہیں ہیں"۔

جب وہ قریب آپہنچا تو نوجوان پولی نے کہا "ذرا مجھے بھی بتانا یہ شخص کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟"
ہوٹل والے نے زہر آلود نظروں سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا "اس کا نام؟ اس کا نام کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم اسے دیو خونخوار کہا کرتے ہیں۔"
"یہ مصور ہے نا؟"
"بھلی تجارت ہے!" ہوٹل والے نے کہا "یہ مُردوں کی تصویریں بناتا ہے۔ اُدھر کوئی قسطنطنیہ میں یا یہاں گرد و نواح میں مرا۔ اِدھر اُس کے ہاں مرنے والے کی تصویر مکمل ہوئی۔ یہ اُس کی موت سے پہلے ہی تصویر کھینچنی شروع کر دیتا ہے ـــــ اور اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی ـــــ یہ گدھ ہے گدھ!"
دہشت کے مارے پولی عورت کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اُس کی آغوش میں اُس کی بیٹی سرسوں کے پھول کی طرح زرد اور بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اُسے غش آگیا تھا۔
ایک جست میں پولی لڑکے نے سیڑھیوں سے اتر کر یونانی کو جا دبوچا۔ ایک ہاتھ سے اُس نے اُسے قابو کیا اور دوسرے سے اُس کا بستہ چھیننے لگا۔
ہم بھی اُس کے پیچھے اُتر آئے۔ دونوں ریت میں لوٹ رہے تھے۔ بستہ کی تمام چیزیں نکال کر بکھیر دی گئیں ایک ورق پر اُس لڑکی کی تصویر تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور ماتھے پر پھولوں کا ایک ہار تھا۔

منصور احمد

نیرودا

زندگی و عمل

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موجِ ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر مے روم
گر نہ روم نیستم

اقبال

ہجومِ جلوہ

اک جلوہ زارِ حسن تری بارگاہ تھی — چشمِ نظارہ جو میری حیرت پناہ تھی

پہلو میں کوئی چیز تڑپتی تو تھی ضرور — اب جانے دل تھا یا تری برقِ نگاہ تھی

دل میں نہیں ہے نام و نشانِ شکیب و صبر — اُف! کس قدر کسی کی نظر بے پناہ تھی

تاریکیٔ فراق میں عالم تھا نور کا — آنکھوں میں ایک صورتِ زیبائے ماہ تھی

میری جبینِ شوق نے دیکھا نہ اس قدر — کعبہ تھا، دیر تھا کہ کوئی خانقاہ تھی

کچھ اس طرح تھا حسن ترا دل میں جاگزیں — جس جا نظر پڑی وہ تری جلوہ گاہ تھی

تاروں میں ڈھونڈتا تھا کسی کو جنونِ شوق — آوارۂ فلک مری اک اک نگاہ تھی

مضطر کا حال کیا کہیں رنجِ فراق سے
آنکھوں میں اشک تھے نہ کوئی لب پہ آہ تھی

رام رتن مضطر

غزل

یہ وہ فسانہ نہیں جسے ضم کوئی گلستاں کا باب کر دے — اگر لکھو میرا قصۂ غم، تو ختم ساری کتاب کر دے

جہاں تو وقفِ ستم رہا ہے وہاں کی حالت خدا ہی جانے — مجھے یہ ڈر ہے نہ چال تیری نظامِ محشر خراب کر دے

یہ خاک کے بے شمار ذرّے فلک کو حسرت سے تک رہے ہیں — زکوٰۃِ حسنِ ازل سے اُن کو بھی غیرتِ آفتاب کر دے

میں شمع بن کر جلوں تو اچھا، میں سوزِ غم سے گھلوں تو اچھا — مگر تری بزم میں ستمگر، خدا مجھے باریاب کر دے

مشاہدہ خلق کو کرا دوں کہ پستیوں میں بھی ہے بلندی — مرے ارادوں میں آج مجھ کو اگر خدا کامیاب کر دے

حقیر ہے دیکھنے میں لیکن، کچھ ایسا ویسا نہیں ہے شاکی
اگر وہ شکوے کرے تو دونوں جہان کو لاجواب کر دے

شاکی شاہجہانپوری

محفلِ ادب

مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری

جب بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں میرزا غالب کے قدیم کلام کا نسخہ ملا تو انجمن ترقیٔ اردو کی جانب سے اُس کی ترتیب وغیرہ کا کام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بہت سی نئی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں۔ منجملہ اُن کے ایک عجیب چیز خود مرزا صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انہوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انہوں نے اپنی عنایت سے مرحوم بجنوری کو بھیج دیا تھا۔ اگرچہ یہ حالات انہوں نے اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی غیر شخص لکھتا ہے، لیکن عبارت کا ڈھنگ صاف بتا رہا ہے کہ اس پردے میں خود مرزا نوشہ باتیں کر رہے ہیں۔ دوسرے ایک دو باتیں جو وہ لکھ گئے ہیں وہ مرزا کے دل کی ہیں وہ دوسرا شخص کہاں لکھ سکتا تھا۔ تیسرے خط اُن کا ہے۔

اسد اللہ خاں۔ غالب تخلص۔ عرف مرزا نوشہ قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے اُس کا دادا قوقان بیگ خان شاہِ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا پہاسو کا پرگنہ جواب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اُس کی جاداد میں مقرر تھا۔ باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبد اللہ بیگ خاں دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا۔ اسد اللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ سالِ ولادت ۸۔ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری بروز یک شنبہ۔ عبد اللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔ جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا اُس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا ۱۸۰۳ء عیسوی میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا برگڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اُس نے اپنے زورِ بازو سے سونک سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لئے جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریقِ استمرار عطا فرمائے مگر خانِ موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بمرگ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کر مر گیا، جاگیر سرکار میں

بازیافت ہوئی اور اُس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذلت کو اس زرِ معافی میں سے ملتے ہیں اُس نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا ہے۔ نثر کی تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ۔ مہرِ نیمروز دستنبو۔ فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل اردو اخبار لکھنو میں چھاپا ہوا ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدۂ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچے جیغہ سرپیچ موتیوں کے مالا خلعت پاتا ہے۔ اب کے بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباروں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر حصار نے کہ وہیں قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بیچارہ بہ سبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جا سکا۔ مجھ سے کہتا تھا ستر برس کا آدمی کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بمبیل ڈاک لارڈ ڈالن برا گورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے اور اوایل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی بے واسطۂ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔ اب ہم اُن تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اُس کے ذکر کو ختم کرتے ہیں۔

نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ

"اردو"

باقیاتِ فانی

وہ بےخودی کے پیالے پلا دیئے تو نے
مرے حواس ٹھکانے لگا دیئے تو نے

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر
تجلیات کے دریا بہا دیئے تو نے

بنا کے ہجر کی راتوں کو بے نیازِ سحر
تعینات کے پردے اُٹھا دیئے تو نے

دکھا کے تجزیۂ رنگ و بو کا حسنِ کمال
مشاہدات کے ٹکڑے اُڑا دیئے تو نے

دلوں کو دے کے فریبِ سکونِ بے آرام
تغیرات کے نقشے جما دیئے تو نے

یقینِ عشق کی ہلکی سی لہر دوڑا کر
توہمات کے شعلے بجھا دیئے تو نے

عطائے نعمتِ سوز و گداز کی خاطر ۔۔۔ اذیتوں کے خزانے لُٹا دیے تونے
سرورِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر ۔۔۔ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تونے
حجابِ نطق کو معجز نوائیاں دے کر ۔۔۔ نظر کی آڑ میں جادو جگا دیئے تونے
جمالِ یار کا افسانہ چھیڑ کر فانیؔ
شعاعِ نور سے دِل جگمگا دیئے تونے

"طور"

عمل

عملی آدمی کو صرف اُن چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن میں تبدیلی کا امکان ہو۔

ذوقِ عمل دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کو بدلنے کی ضرورت سے اور اس قوت کے احساس سے کہ ہم تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔

بہت سے واقعات و حالات میں سے اُس سادہ سے مسئلہ کو نکال کر الگ کر لینا جو ضروری ہے، اس کا نام عمل ہے۔

ہمارے سینوں میں دینے کو بس ایک دل ہے عمل کو اس میں سے جو کچھ دیا جاتا ہے محبت سے وہ چھیننا پڑتا ہے۔

اگر تم کسی عملی آدمی کو خوش کرنا چاہتے ہو تو اُس کے سامنے اُن کاموں کا ذکر نہ کرو جو وہ کر چکا ہے بلکہ اُن کا جو وہ ابھی اور کر سکتا ہے۔

سچا سردار وہ ہے جو اپنے لئے بس وہی کام رکھے جو سوائے اُس کے کوئی اور نہ کر سکے۔

عملی آدمی اپنے بڑے بڑے ارادوں کے متعلق مشکل ہی سے زبان کھولتا ہے۔

"جامعہ"

رازِ الفت

جب نرگس آغوشِ مرگ میں سو گئی تو چشمہ کا آبِ شیریں آبِ شور میں تبدیل ہوگیا۔ اور بَن کی دیویاں

قلبِ صحرا سے آہ و بکا کرتی ہوئی نکلیں کہ اپنے غم ربا نغموں سے اُس کے دل کو تسکین دیں۔

اور جب انہوں نے دیکھا کہ چشمہ بجائے آبِ شیریں کے تلخ آنسوؤں سے لبریز ہے تو انہوں نے اپنی زمردیں بالوں کی لٹیں بکھیر دیں اور رقت آمیز لہجہ میں کہا "آہ! نرگس اتنی حسین تھی کہ اُس کے غم میں تمہاری یہ قلبِ ماہیت چنداں تعجب خیز نہیں معلوم ہوتی،

"لیکن کیا نرگس حسین تھی؟" چشمہ نے دریافت کیا

"ہاں ـــــ اور تم سے زیادہ اس امر کا کسے علم ہو سکتا ہے"؟

بن کی دیویوں نے کہا "ہماری طرف تو اُس کی نگاہِ التفات کبھی بھول کر بھی نہ پڑی۔ البتہ اُس نے تمہاری جستجو کی۔ تمہارے کنارے قیام پذیر ہوئی اور وہ تمہارے ہی شفاف آئینہ میں اپنے حسن کا مشاہدہ کیا کرتی تھی"

"لیکن چشمہ نے کہا" مجھے تو نرگس اس لئے محبوب تھی کہ جب وہ کنارے سے دیکھا کرتی تھی تو مجھے اُس کی آنکھوں کے آئینہ میں اپنا ہی جمال عکس ریز نظر آتا تھا"

(آسکر وائیلڈ) "نیرنگِ خیال"

حقیقی ترقی کیا ہے؟

دنیا ترقی کے لئے کوشاں ہے ہر شخص جد و جہد کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اُسے نہیں معلوم کہ حقیقی ترقی کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہوتی ہے۔

حقیقی ترقی مادی ترقی نہیں ہے بلکہ روحانی ترقی ہے اور روحانی ترقی انسان کی تکمیل کا پیام ہے۔ مادی دنیا میں لاکھوں ترقی یافتہ انسان تمہیں نظر آئیں گے۔ لیکن جب اُن کی حقیقت پر تم غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ ترقی نہیں کر رہے ہیں بلکہ تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔

ایک مزدور ترقی کرتے کرتے روس کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ ایک سائیس ترقی کرتے کرتے ایران کی حکومت کو قبضہ میں لے سکتا ہے ایک معمولی سپاہی بڑھتے بڑھتے ترکی کا پریسیڈنٹ بن سکتا ہے لیکن پھر بھی تم دیکھو گے کہ حقیقی ترقی سے وہ محروم ہے۔

حقیقی ترقی کے لئے قلب کو نورانی شعاعوں سے منور کرو اور اُن شعاعوں سے پوچھو کہ ترقی کیا ہے۔ تمہیں ترقی کا سیدھا راستہ مل جائے گا۔

"دین و دنیا"

نئی کتابیں

مسیح کی زندگی ۔ یہ کتاب مشہور انگریزی تصنیف "سزلائف" کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ اس میں حضرتِ مسیح علیہ السلام کی مقدس زندگی کے واقعات بہ الفاظِ اناجیل اربعہ لکھے گئے ہیں، اور اناجیل ہدایت و نور کا سرچشمہ ہیں حجم تین سو صفحات سے زائد اور قیمت ۴؍ ہے۔ پادری ایچ ای ایڈرسن صاحب ایم اے سہارن پور سے منگائیے۔

صراط الحمید ۔ مولفہ پروفیسر الیاس برنی صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ اڑھائی سو صفحے کی یہ مبسوط کتاب مقاماتِ مقدسہ واقع عراق، شام فلسطین و حجاز کا سفرنامہ ہے۔ سفر کے تمام ضروری ہدایات، ملک اور شہروں کے حالات مقاماتِ متبرکہ کے عکسی نقشے، زیاراتِ مقدسہ کے انعامات، بیت اللہ کے فتوحات، حج کے احکام و مسائل اور طور طریق نہایت وضاحت سے اس میں درج ہیں۔ قیمت ۲؍۔ حاجی مقتدیٰ خاں صاحب شروانی علی گڈھ سے طلب فرمائیے۔

پارسی علوم اور اسلام ۔ مولفہ پروفیسر محمد مسلم صاحب سینٹ کولمباز کالج، ہزاری باغ (بہار) اس کتاب میں اُن الزامات کی تردید کی گئی ہے جو عرب فاتحین پر پارسی ادبیات کی غارت گری کے متعلق لگائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی پر عربی کے اثرات احسانات کو واضح کیا گیا ہے حجم ساٹھ صفحے اور قیمت بارہ آنے ہے۔ جنابِ مصنف سے مل سکتی ہے

اسلامی مساوات ۔ مصنفہ مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی اس کتاب میں اسلامی اصولِ جمہوریت کی نہایت اچھی تشریح اور ان اکرمکم عند اللہ اتقکم کی نہایت عمدہ تفسیر کی گئی ہے حجم ۸۸ صفحات اور قیمت ۸؍ ہے

اسلام اور غلامی ۔ مصنفِ مذکور کی دوسری کتاب ہے جس میں آزادی مساوات اور اخوت کا اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے حجم ۳۲ صفحے ہے اور قیمت تین آنے۔ دونوں کتابیں مسلم بک ڈپو پھلواری شریف پٹنہ سے ملتی ہیں

تاریخ ملتان ۔ مولفہ لالہ بالکشن صاحب نبرہ، پلیڈر ملتان۔ شہر ملتان اپنی قدامت کے لحاظ سے ایک خصوصیت رکھتا ہے اور ہندوؤں کا تیرتھ اور مسلمانوں کے اولیا کا مدفن ہونے کے اعتبار سے اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں یہاں کے واقعات سلسلہ وار درج ہیں۔ تین عکسی تصویریں بھی کتاب کی زینت ہیں۔ مولف موصوف سے طلب فرمائیے۔

خزینۃ القواعد ۔ فارسی زبان کی گرامر ہے جسے انگریزی طرز پر لکھنے کی کوشش کی گئی ہے ترجمہ، ضرب الامثال۔ محاورات اور اُن کی تشریح کے ابواب کتاب کا مفید حصہ ہیں۔ آخر میں یونیورسٹی کے پیپر بھی دیئے ہیں۔ حجم ۲۳۹ صفحے ہے قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ شیخ الہیٰ بخش رحیم بخش صاحبان تاجران کتب گجرات (پنجاب)

شعر و شاعریِ عصرِ جدیدِ ایران - آقا سید محمد علی صاحب پروفیسر نظا[illegible] آباد دکن کی دلکش تقریر ہے جو انہوں نے ایران کے عصرِ جدید کی شاعری کے خصوصیات و تبد[illegible] بہ جامعۂ معارف کے سامنے کی حجم ۲۲ صفحے ہے - قیمت درج نہیں۔

اقبال و شعرِ فارسی - پروفیسر موصوف کا دوسرا لیکچر ہے جس میں ا[illegible] کی فارسی شاعری سے ایرانیوں کو روشناس کرایا ہے - یہ رسالہ اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، [illegible] پر ایک فاضلانہ تبصرہ ہے حجم ۴۸ صفحے - دونوں کتابیں جناب پروفیسر سے طلب فرمائیے۔

سرودِ بہستان مصنفہ جناب رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) مسلم یو۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں اردو شعر و شاعری پر ایک نظر ڈالی ہے اور شعر کے بلند [illegible] طرح واضح کیا ہے - دوسرا حصہ دیوانِ فانی کی تنقید میں ہے - اس میں جناب [illegible] نزاکتِ بیان کے اعتبار سے غالب کی ارتقا یافتہ شکل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے - لیکن [illegible] میں جنابِ مصنف کے متفق نہیں ہو سکے۔

مجموعہ قصائدِ مومن مرتبہ ضیا احمد صاحب ایم، اے بدایونی - اس مجموعہ میں ہندوستان کے نازک خیال حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے اردو قصائد درج کئے گئے ہیں - قابل مرتب نے مقدمہ اور حواشی میں اچھے نکات پیدا کئے ہیں حجم ۱۰۲ صفحے اور قیمت ۱۲ ر ہے - الناظر پریس لکھنؤ سے طلب فرمائیے۔

دیوانِ ولایت، پنجرقعۂ ولایت اور ملتقط نگارشِ عاری } یہ تینوں کتابیں ان بزرگ کی ہیں جن کی ساری عمر زبانِ فارسی میں کمال حاصل کرنے میں صرف ہوئی یہ وہی ولایت ہیں جنہوں نے ارادت ایرانی کے پنجرقعہ کا جواب لکھ کر غالب کے پاس بغرضِ اصلاح بھیجا تھا - غالب نے کہا تھا کہ "خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں، تمہاری تحریر پنجرقعۂ سابق سے کہیں بہتر ہے اصلاح کی مطلق گنجائش نہیں - موجد سے مقلد بہتر نکلا - یعنی تم نے خوب لکھا، ع نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول" پنجرقعہ کے آخر میں فاضل مصنف کے مختصر حالات بھی درج ہیں تینوں کتابوں کی قیمت علی الترتیب عمہ - ۸ر اور ۲ر ہے ملنے کا پتہ سید اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر، گورکھپور

مسدسِ کریما - ادبِ اخلاق کی کتابوں میں یہ کتاب مقبولِ عام ہے اور مولانا سعدی علیہ الرحمۃ سے منسوب کی جاتی ہے - جناب الٰہی بخش صاحب ناصر محلہ کرار خاں شہر جالندھر نے ہندوستانی بچوں کی سہولت کے لئے نظم و نثر میں اس کا ترجمہ کیا ہے - ہمارے خیال میں نثر کافی تھی نظم تکلف ہے - قیمت چار آنے مقرر کی گئی ہے۔

عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جوان کیلئے

موجودہ لنڈن کے اسرار

اُردو زبان میں ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی جس سے یہ فلسفہ معلوم ہو کہ انسان کو جرم کے ارتکاب کی تحریک کیونکر ہوتی ہے۔ اس کتاب نے یہ کمی اس خوش اسلوبی سے پوری کی ہے کہ ایک خشک فلسفیانہ مضمون میں وہ دل آویزی پیدا ہو گئی ہے کہ حقیقی واقعات پر افسانہ کا گمان ہوتا ہے۔ لنڈن کے وسیع اور گنجان آبادی کو دیکھ کر مصنف کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ ہزار دو ہزار آدمی کس طرح روزی پیدا کرتے ہوں گے۔ یہ خیال کچھ اس طرح اس کے دل میں جاگزیں ہوا کہ اس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ اس امر کی تحقیقات کے لئے وقف کر دیا۔ جس کا ثمرہ یہ لاجواب کتاب ہے۔ گو یہ کتاب لنڈن کی زندگی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے لیکن تھوڑے سے تمدنی تغیر کو مدنظر رکھ کر ارتکاب جرائم کی نوعیت ہندوستان میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ ایک ہوشیار شہری بن جائیں گے۔ اور عیاروں کے چھل فریب سے محفوظ ہو جائیں گے یہ کتاب ایسی نہیں کہ ایک بار پڑھ کر رکھ دی جائے بلکہ ضرورت ہے کہ آپ اسے بار بار پڑھیں۔ بچوں اور مستورات کو پڑھائیں۔ اور جو نہ پڑھ سکیں ان کو پڑھ کر سنائیں۔ غرض یہ وہ حرز جان ہے جس سے کوئی گھر خالی نہ ہونا چاہیئے۔ ترجمہ کی روانی۔ سلاست اور دلفریبی کے لئے اتنی ضمانت کافی ہوگی کہ یہ ہندوستان کے مشہور انشا پرداز نور الٰہی و محمد عمر صاحبان کے زور قلم کا نتیجہ ہے کتاب ۲۰×۲۶/۸ کے ۲۰۰ صفحات پر ختم ہوتی ہے کاغذ ۲۴ پونڈ کتابت دیدہ زیب۔ طباعت بہترین۔ سرورق سہ رنگ بلاک۔ پختہ جلد قیمت عہ۲ فی جلد۔ تاجر کتبوں کو ۱۵ سے زیادہ کتابوں کی خریداری پر ۱۵ فیصدی اور پچاس سے زیادہ کی خریداری پر بیس فیصدی کمیشن دی جائے گی
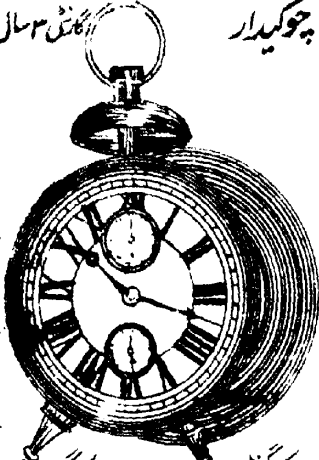
عنوانات ابواب

(۱) تعارف (۲) اقامت گاہ (۳) دریا کے کنارے (۴) امیرانہ ہوٹل (۵) طریق ارتکاب (۶) ٹیچ کے پس پردہ (۷) قتل گاہ (۸) آزاد دیوانے (۹) معتبر اطلاعوں کی بنا پر (۱۰) صرف زر کے اسرار (۱۱) نامعلوم حشر (۱۲) خاندانی اسرار (۱۳) مفلسی کے چرکے (۱۴) مرقع جرائم (۱۵) ننگ خاندان (۱۶) نیچے درجہ جرم (۱۷) چوتھی ویلر (۱۸) اخلاقی نقاب (۱۹) بزرگوں کے گناہ (۲۰) داستان حقیقت (۲۱) آدھی رات (۲۲) سر مکتوم

المشتہر

محمود برادرس تاجران کتب جموں پنجاب